نقوش

اسلم کمال



رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

شمارہ ۱۰۳

ستمبر ۱۹۶۵ء



مدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغ اردو لاہور

قیمت فی پرچہ
۵/۵۰

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۲۵ روپے

ترتیب

مقالے

شخصیت و فن

تفصیلی مطالعہ

نظمیں ، غزلیں

افسانے

حالاتِ حاضر

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر ادارہ فروغِ اُردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا



عمل، عبدالرحمٰن چغتا[ئی]

ایک کشمیری لڑکی



اختر جمال

اسلم کمال



ادا جعفری



خانم، ممتاز مرزا

شگوفے (میری پہلی نظم)

ادا جعفری

غالب نے کہا تھا ؎

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

آج میری گفتگو کا موضوع یہی ہے۔ نوائے سروش سے صریرِ خامہ تک کئی کٹھن منزلیں اور مرحلے ہیں۔ شاعر کو متاثر کرنے کے لیے ایک معمولی سا واقعہ، ایک غلط اندازِ نگاہ اور ایک چھوٹا سا لفظ بھی کافی ہوتا ہے۔ لیکن اس اثر پذیری کا اظہار اتنا آسان نہیں اور پھر میرے لیے جس کے فن کی ناپختگی ہی اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہو۔

خیال ذہن میں رچ بس اور الفاظ کا جامہ پہن کر صریرِ خامہ تک کیونکر پہنچتا ہے یہ بجائے خود ایک دلچسپ داستان ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ کسی فن پارہ کو سمجھنے اور اُس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے اس پس منظر کو دیکھنا اور سمجھنا ضروری بھی ہے جس میں وہ تخلیق ہوتا ہے۔ ہر شعر ایک خاص ماحول، وقت اور رُجحان کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اگر سُننے والا بھی اُس لمحہ سے متعارف ہو جائے جس نے شاعر کی رُوح کو چھیڑا تھا اور جس کی کہانی شعر کے اندر مستور ہوتی ہے تو شعر کی اثر انگیزی اور اثر آفرینی دوبالا ہو جاتی ہے۔

دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے دماغ کے لیے کائنات کے چپّے چپّے میں بے شمار موضوع بکھرے پڑے ہیں۔ مظاہرِ فطرت، صُبح شام، پھُول، پتّے، کانٹے، سمندر، پہاڑ، اور جنگل اور پھر ان سب پر حکمرانی کرنے والے انسان کی زندگی کے اَن گِنت پہلو ایک حسّاس شاعر کے لیے ہر لحہ دعوتِ فکر و نظر پیش کرتے رہتے ہیں۔ انسانی خوشی اور انسانی دُکھ یہ دو پہلو ہی اس قدر ہمہ گیر، وسیع اور گونا گوں حسّیات و جذبات کے حامل ہیں کہ اگر اور موضوعات کو چھوڑ دیا جائے اور صرف انھیں دو کو موضوع بنا لیا جائے تب بھی اگر شاعر کی نگاہ میں گہرائی اور اُس کے اندازِ فکر میں وسعت ہے تو یہ مضامین اور یہ موضوع کبھی فرسودہ اور پامال نہیں نظر آ سکتے۔ لیکن شاعر —— جس کا دماغ متجسّس، رُوح پریشان اور نگاہ نگراں ہے اور جو کائنات میں صبا کی طرح "دلِ ناصبور" لے کر آیا ہے کسی ایک ہی موضوع پر قناعت کر کے دُوسرے موضوعات سے مُنہ نہیں موڑ سکتا۔ اس کے سامنے زندگی ایک سمندر کی طرح بے پایاں

ہے جس میں وہ ایک ماہر غوّاص کی طرح غوطے لگاتا ہے اور پتھّر اور کنکر کو ٹھکراتے ہوئے گہر ہائے گرانمایہ کو چُن لیتا ہے اور پھر غالب کی زبان سے کہتا ہے ؎

گہر افشانم و بہا طلبم
سیم و زر رائیگاں نمی خواہم

اور پھر موضوعات کی اس فراوانی اور بے پایانی کے ساتھ ساتھ ہر شاعر کا اپنا اندازِ نگاہ اور اندازِ تفکّر ہے۔ جو اس کے موضوعِ سخن کو ایک جدّت اور ایک تازگی بخشتا ہے اور جو اس کے کلام کو دُوسروں کے بیان سے ممیّز کرتا ہے اور اسی سے صاحبِ فکر کی انفرادیت کا قیام اور دوام ہے۔

مظاہرِ فطرت ہوں یا انسانی جذبات و حیات کے مرقعے دُنیا میں نہ مسحور کر لینے والے مناظر کی کمی ہے اور نہ تڑپا دینے والے واقعات کی۔ بس دیکھنے والی آنکھ اور دیکھ کر بے چین ہو جانے والا دِل چاہیئے ؏

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ یا ایک نظارہ ہزار بار شاعر کے سامنے آتا ہے اور وہ ہر بار اس سے بے اعتنائی برت کر گزر جاتا ہے اور ایک دن اچانک اُسی ہزار بار کے دیکھے ہوئے منظر سے متاثر ہو کر ٹھٹک جاتا ہے کہ یہ تو میری نظم کا موضوع ہے اور جب تک یہ نظم مکمل نہیں ہو جاتی شاعر کے دل کو قرار نہیں آتا۔ میں آپ کو اپنی ایک نظم شگوفے کی تصنیف کا حال سناتی ہوں۔

میں جس مکان میں رہتی تھی اس کے ایک الگ تھلگ کونے میں نارنگی کا ایک پودا تھا۔ صُبح کو عموماً ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان لے کر اُس کونے کی طرف جا نکلتی تھی اور نارنگی کے پودے کے ساتھ ایک نیچی سی بنچ پر بیٹھ کر فکرِ سخن میں محو ہو جاتی۔ یا کوئی نئی کتاب یا رسالہ آیا ہوتا تو اس کو دیکھنے لگتی اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو اپنے کورس کی کتابیں پڑھا کرتی۔ یہ میرا روزانہ کا دستور تھا لیکن ایک صُبح جب میں اپنے مخصوص گوشۂ عافیت کی طرف جا رہی تھی تو دُور ہی سے حیران ہو کر رہ گئی۔ نارنگی کا وہ پودا سر سے پیر تک سیم رنگ شگوفوں میں لدا ہوا کسی معصوم دُلھن کی طرح شرمایا لیکن دعوتِ نظارہ دیتا ہوا کھڑا تھا۔ میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ میں جو ہر صُبح اسی پودے کے ساتھ والی بنچ پر بیٹھ کر اپنی نئی نظموں کے عُنوان سوچا کرتی تھی آج تک اِس حُسن سے کس طرح بے پروا رہ سکی تھی! ظاہر ہے کہ یہ اتنے بہت شگوفے ایک رات میں تو نہیں پھوٹے ہوں گے۔ مجھے اپنی اس بے اعتنائی پر خود اعتبار نہیں آ رہا تھا ؏

آج سے پہلے نہ کیوں جان سکی

یہ اس نظم کا پہلا مصرعہ تھا جو میرے ذہن میں آیا اور اس کے بعد ؏

آج سے پہلے نہ پہچان سکی،

اور پھر

آج سے پہلے بھی پھوٹے ہوں گے

اور پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ کیا میری شاعرانہ حس سے ان حسین شگوفوں کو بے اعتنائی اور بیگانہ نگاہی کا شکوہ نہ ہوا ہوگا۔ اس خیال کے ساتھ میں نے یہ مصرعہ کہا ع

شکوہ بیگانہ نگاہی کا لیے

اور پھر انھیں حسین شگوفوں کے سایے میں یہ نظم مکمل ہوگئی جس کا عنوان میں نے شگوفے رکھا ہے۔ پوری نظم یوں ہے۔

یہ بہاروں کے سجیلے سپنے
یہ شگوفے، یہ لجیلے سپنے
مسکرائے تو حیا ٹوٹ پڑی
کسمسائے تو ادا پھوٹ پڑی
ان کے مکھڑے کی جنوں خیز پھبک
ان کے لہجے کی فسوں ساز کھنک
ان کی معصوم نگاہوں کی جھجک
یہ نزاکت، یہ لگاوٹ، یہ پھبن
یہ نہائے ہوئے شبنم میں بدن
آج سے پہلے نہ پہچان سکی
آج سے پہلے نہ کیوں جان سکی
آج سے پہلے بھی پھوٹے ہوں گے
یہ شگوفے یہ لجیلے سپنے
یہ بہاروں کے سجیلے سپنے
اسی شوخی، اسی رعنائی سے
یہی لہجہ، یہی لہجے کی کھنک
یہ سجاوٹ، یہ سجاوٹ کی جھمک
یہ نگاہیں، یہ نگاہوں کی جھجک

اسی معصومی و برنائی سے
شکوہ بیگانہ نگاہی کا لیے
شاخ میں پہلے بھی پھوٹے ہوں گے
یہ شگوفے، یہ نجیلے سپنے
یہ بہاروں کے سجیلے سپنے

کبھی کبھی کسی نئے خیال کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے سے پہلے ذہن میں پرورش اور پرداخت کرنا بھی پڑتا ہے اور اس طرح اس کو نظم کا جامہ پہننے میں ہفتے اور مہینے بھی لگ جاتے ہیں۔ لیکن میرے ساتھ ایسا بہت کم ہوا ہے شاید اس لیے کہ مجھ میں اتنا صبر ہی نہیں ہے۔ میں تو اس جذبہ کی زیادہ قدر کرتی ہوں جو اپنی پذیرائی پر مجھے مجبور کرے جب ایسا کوئی بے ساختہ اور ضدی خیال میرے ذہن کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے تو میں ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اس کے استقبال کے لیے تیار ہو جاتی ہوں۔ اور اس وقت تک چین کا سانس نہیں لیتی جب تک میرے خیال کے مطابق نظم تیار نہیں ہو جاتی۔

نظم لکھنے کے لیے مجھے کسی خاص ماحول کی ضرورت نہیں ہوتی ہاں میری ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں فکرِ سخن کے وقت مداخلت نہیں برداشت کر سکتی اور آپ جانیے زندگی کے ہنگاموں میں وہ غالب کی "تصورِ جاناں" والی مثالی فرصت جو خود بے چارے غالب کو بھی میسّر نہ آسکی کسے نصیب ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میری بہت سی چیزیں تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں اور پھر میں انھیں کبھی پورا نہیں کر سکتی۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ میں اپنی نامکمل نظمیں دیکھ رہی ہوں اور اچانک ایک نیا خیال ذہن میں آگیا اور اس نے فوراً ہی نظم کی شکل اختیار کر لی۔

کسی نئے خیال کے ذہن میں آنے کے بعد پہلی چیز نظم کے لیے کسی موزوں بحر کا انتخاب کرنا ہوتا ہے یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہوں لیکن اپنی نظموں کے لیے مترنّم الفاظ اور گاتی ہوئی بحر کے انتخاب کے لیے میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے۔ قافیے کی تلاش میں میں نے کبھی کاوش نہیں کی۔ وہ تو خیال کی روانی کے ساتھ آپ ہی ذہن میں آتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نظم کا پورا ہیولیٰ ایک ساتھ ہی ذہن میں تیار ہو جاتا ہے اور نظم مکمل ہونے پر محض ایک آدھ مصرعے کی ترتیب بدلنے کی ہی ضرورت رہتی ہے۔ لیکن ہمیشہ نظم کے مصرعے اور اشعار اتنی باقاعدگی کے ساتھ نہیں آتے بلکہ برساتی گھٹاؤں کی طرح ذہن پر ایک ساتھ یورش کر دیتے ہیں اور کبھی آخری بند پہلے ہو جاتا ہے۔ کبھی درمیانی اور کبھی کئی بند ایک ساتھ ہی مکمل ہو جاتے ہیں اور بعد میں تسلسل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کو مرتّب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح نظموں کے عنوان کا حال ہے کہ کبھی تو کسی نئے خیال کے ساتھ ذہن میں جو پہلی چیز آتی ہے وہ اس کا عنوان ہی ہوتا

ہے۔ کبھی یہ عنوان نظم کے دوران میں تشکیل پاتا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظم تو آسانی سے مکمل ہو گئی اور اس کے عنوان کے انتخاب میں خاصی کاوش کرنا پڑ جاتی ہے۔

ایک شاعر کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب وہ بڑے بڑے طوفانوں سے بچ کر نکل جاتا ہے اور محض چند قطرے اس کے دامن کو تر کر دیتے ہیں۔ زندگی کے سنگین اور دلگداز حقائق وقتی طور پر اس کو متاثر کرنے سے معذور رہ جاتے ہیں اور ایک چھوٹا سا واقعہ اس کی روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میں آپ کو اپنی ایک نظم سناتی ہوں۔ یہ بنگال کے قحط کی ستائی ہوئی ایک نوجوان بھکارن سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔

یوں تو اس زمانے میں روزانہ ہی قحط کے مارے ہوئے بے چارے ہزاروں لاکھوں انسان رو رو کر اپنی بپتا سنایا کرتے تھے اور کون سا دل ہوگا جو ان کی المناک داستانِ حیات پر دکھتا نہ ہوگا لیکن جس واقعہ نے مجھے نظم لکھنے پر مجبور کیا وہ ان دکھی انسانوں کے آنسو نہیں تھے بلکہ اس بھولی بھالی شکل کی نوجوان بھکارن کی ہنسی تھی۔ وہ سڑک پر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ہنستی ہوئی جا رہی تھی اور میرا ذہن اسی ہنسی کے پیچھے چھپے ہوئے طوفانِ اشک کو دیکھ رہا تھا!

اس نظم کے پہلے مصرعے جو میرے ذہن میں آئے وہ یہ تھے ع

کیوں ڈھلکنے سے بھی معذور رہا کرتے ہیں
وہی آنسو جنھیں مبہم سا سہارا نہ ملا
کسی دامن، کسی آنچل کا کنارا نہ ملا

اور پھر

کتنی معصوم امنگوں کے سجیلے سپنے
چند دانوں کے عوض بکتے رہے بکتے رہے

اور اس طرح یہ نظم مکمل ہو گئی۔

زندگی تیرے لیے خواب سہی گیت سہی
نقرئی گیتوں کی زرکار سجیلی کرنیں
نور برساتی رہیں تیرے شبستانوں میں
زندگی ٹھوکریں کھاتی رہی طوفانوں میں

تو کہاں سوچتی خوابوں کی سجیلی باہوں میں
کیوں ڈھلکنے سے بھی معذور رہا کرتے ہیں
وہی آنسو جنھیں مبہم سا سہارا نہ ملا

کسی دامن، کسی آنچل کا کنارا نہ ملا
کیسے محبوب تمناؤں کی کومل کلیاں
آگ اور خون کے عفریت نگل جاتے ہیں
کیسے تہذیب کے معیار بدل جاتے ہیں
تو کہاں سنتی وہ بے باک نوائی جس کو
لوریاں دے کے سلایا ہے نہاں خانوں میں

انھیں روندی ہوئی، ٹھکرائی ہوئی راہوں میں
کتنی نوخیز امیدوں کے سجیلے سپنے
کتنی معصوم امنگوں کے سجیلے سپنے
چند دانوں کے عوض بکتے رہے، بکتے رہے
بربریت کے ستم سہتے رہے، سہتے رہے
زندگی میرے لیے خواب نہ تھی، کیف نہ تھی

آخر میں اتنا عرض کروں گی کہ واقعات وہی ہیں جو ہمارے آپ کے سب کے سامنے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ہر شاعر کے اپنے احساس کی شدت ہے جو کسی جگ بیتی کو آپ بیتی بنا لیتا ہے اور کبھی اپنے جذبات کو کل کائنات پر محیط کر دیتا ہے۔ اگر شاعر کے پاس احساس کی دولت ہے تو اس کو ذرّوں کے دل کی دھڑکن بھی سنائی دے گی اور وہ یہی شدتِ احساس ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر



ادا جعفری

دل اپنا جلایا ہے کسی نے بھی خوشی سے
بن جاتی ہے جی پر تو گزر جاتے ہیں جی سے

جھوٹوں کبھی پوچھا ہے تو وہم آئے ہیں کیا کیا
مانوس ہیں اتنے تری بیگانہ روی سے

پلکوں کی گھٹاؤں سے برستے رہے نغمے
کس طرح شکایت ہو تری کم نگہی سے

رستہ جسے مل جائے یہ توفیق ہے اس کی
پلٹا نہیں اب تک تو کوئی تیری گلی سے

تاریک ہوں راہیں تو ضیا دیتے ہیں تارے
خورشید بنے اپنے کنول تیرہ شبی سے

خوشبوئے بہاراں کی سُنی چاپ کسی نے
مایوس نہ ہونا مری آہستہ روی سے

بن بن کے بگڑتے رہے امّید کے پیکر
آزر تھے مگر کام رہا بت شکنی سے

چنتے رہے پلکوں سے تری راہ کے کانٹے
تعبیر کیا تو نے بھی ایذا طلبی سے

اندیشہ بس اتنا ہی رہا دشتِ طلب میں
بھر آئے کہیں آنکھ ادا تشنہ لبی سے



ادا جعفری

ذوقِ تقصیر کہو، حیلۂ تعزیر کہو
اور جو چاہو کہو عشق کو تقدیر کہو

یہی آدابِ مروّت، یہی آدابِ وفا
ہو خطا اُن سے تو اپنی اسے تقصیر کہو

ہم تو الزامِ وفا سے بھی بَری ہیں اب کے
کس کے سر جائے گا یہ نالۂ شب گیر کہو

زخم کو پھول کہا، داغ کو مہتاب کہا
اور کچھ کہنا ہے زندانیٔ تقدیر! کہو

حوصلہ دیکھ لیں ہم بھی سرِ خرمن اپنا
اور باقی ہے کوئی شعلۂ تدبیر کہو

اب جنوں کو بھی ہے پابندیٔ آدابِ جنوں
غم کو آسائشِ جاں، آہ کو تاثیر کہو

ہر نفس کتنی تمنّائیں ہیں دامن تھامے
کتنے حلقے ہیں سرِ حلقۂ زنجیر کہو

اپنی دنیا میں صداقت کی کسے تاب اداؔ
چال کو نکہتِ گل، زلف کو زنجیر کہو



ادا جعفری

تھا دل کو انتظارِ بہاراں نہ سو سکے
اب کیا گلہ بہارِ گریزاں نہ سو سکے

تھی زندگی کی رات کڑی بھی، طویل بھی
شب بھر منایا جشنِ چراغاں نہ سو سکے

کس خوابِ دلپذیر کی آنکھوں کو تھی لگن
با وصفِ اہتمامِ فراواں نہ سو سکے

خونابۂ جگر سے گھر ڈھالتے رہے
ہم بھی مثالِ شمعِ شبستاں نہ سو سکے

اک لفظ کہہ گئے تھے سرِ گفتگو کبھی
تا زندگی رہے ہیں پشیماں نہ سو سکے

کیا کیا نہ حشر جھیل گئے انتظار میں
اے اہتمامِ جنبشِ مژگاں نہ سو سکے

دھندلا چکی ہے اب تو ہر اک آس کی کرن
کیوں جستجوئے صبحِ درخشاں نہ سو سکے

چونکے ہیں جس صدا پہ، وہ آوازِ پا نہ تھی
اپنا ہی دل تھا حشر بداماں نہ سو سکے

کس کو نصیب دولتِ غم ہو سکی ادا
اک ہم سے تھے جو رہے ہیں نگہباں نہ سو سکے



ادا جعفری

وہی شعلہ، وہی شعلہ کی لپک ہے کہ نہیں
اب نگاہوں میں غمِ دل کی تپک ہے کہ نہیں
رہروِ شوق! کہو آج بھی تا حدِ نگاہ
کسی ناگفتہ تمنّا کی دھنک ہے کہ نہیں
وہی تقصیر کہ گردن زدنی ہیں جس پر
حاصلِ عمر وہی ایک کسک ہے کہ نہیں
سرحدِ ہوش سے گزرے کہ نہیں دیوانے؟
احتیاط اب بھی روا ہے؟ وہ جھجک ہے کہ نہیں
نغمہ و رنگ کے با وصف محیطِ عالم
اپنے ٹوٹے ہوئے شیشے کی کھنک ہے کہ نہیں
اب تو مدّت ہوئی آدابِ گلستاں سیکھے
کیوں گلو! خار میں اگلی سی کھٹک ہے کہ نہیں
جس نے لغزیدہ تمنّا کے قدم تھامے ہیں
کسی بھولے ہوئے وعدے کی مہک ہے کہ نہیں
کون پوچھے یہ بہاراں سے اداؔ اب کے برس
تیرے پھولوں میں وہ پہلی سی لہک ہے کہ نہیں

ادا جعفری

انعامِ وفا ہے، کہ جفاؤں کے صلے ہیں
ہر وقت یہ احساس ابھی تم سے ملے ہیں

دانائے کم و کیف ہیں گل پھر بھی کھلے ہیں
دنیا میں کبھی چاکِ گریباں بھی سلے ہیں

انجان نگاہوں کی یہ مانوس سی خوشبو
کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے ہیں

کھُلنے نہ دیا ہم نے بھرم جذبۂ دل کا!
دنیا سے شکایت ہے زمانے سے گلے ہیں

لو دینے لگے داغِ جگر شکر کی جا ہے
تائیدِ بہاراں کے لیے پھُول کھلے ہیں

مختار الدین احمد آرزو

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

سب سے پہلی بات جو مجھے بچپن کے زمانے کی یاد آتی ہے وہ اپنے شہر کا وہ مکان ہے جہاں میرا بچپن گزرا۔ یہ ایک وسیع، بلند اور شاندار مکان ہے۔ پورے مکان کی تفصیلات یاد نہیں صرف لوح حافظہ پر ابا جان کے اس کمرے کا نقش اُبھرتا ہے جہاں ان کی نشست گاہ تھی۔ یہ دو منزلہ مکان کا ایک بالائی کمرہ ہے جو سامنے سڑک کی طرف کھلتا ہے۔ کمرے میں ایک تخت رکھا ہوا ہے جس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی ہے الماریوں میں کچھ ضخیم کتابیں بھری ہیں، کچھ کتابیں فرش پر قرینے سے چُنی ہوئی ہیں۔ میں یونہی کچھ کتابیں اور رکھے ہوئے کاغذات بکھیرنے لگتا ہوں، قلم دوات کو چھیڑتا ہوں۔ سیاہی سفید چاندنی پر پھیل جاتی ہے۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف جا کھڑا ہوتا ہوں۔ نیچے سڑک بن رہی ہے اور مزدور کام کر رہے ہیں۔ میں اور آگے بڑھنا چاہتا ہوں لیکن بلندی سے نیچے کی گہرائی دیکھ کر دہشت طاری ہو جاتی ہے اور میں واپس گھر کی طرف مڑ جاتا ہوں۔ اس وقت میری عمر ۲½ سال کی ہوگی۔ دہلی کا قطب مینار ہو یا پیرس کا ایفل ٹاور یا کوئی اور بلند عمارت آخری منزل پر چڑھ کر نیچے کی طرف دیکھنے سے اب بھی وہی دہشت طاری ہوتی ہے جو کبھی بچپن میں ہوئی تھی اور جسے ۳۵ سال سے زیادہ زمانہ گزرنے کے بعد بھی بھول نہیں سکا ہوں۔ اسی طرح آدمیوں سے زیادہ مجھے کتابوں کی رفاقت میں حظ حاصل ہوتا ہے اور کتابیں جمع کرنا اور انہیں ترتیب و حفاظت سے رکھنا میرا بہترین مشغلہ ہے۔

تعلیم چار سال کی عمر میں شروع ہوئی۔ بسم اللہ کس بزرگ سے کرائی گئی یاد نہیں سات سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کر لیا۔ قرآن پاک کے کچھ پارے میں نے ایک ایسے بزرگ سے بھی پڑھے جو اپنے گاؤں کے متمول زمینداروں میں تھے۔ دن رات باہر کے دیوان خانے میں بیٹھے مصروفِ عبادت رہتے۔ زمینداری کس طرح چلتی تھی اللہ بہتر جانتا ہے۔ مجھے اس قدر یاد ہے کہ فصل کے موقع پر ان کے دیہات کے وسیع مکان کے بڑے بڑے دالان، برآمدہ، صحن میں غلوں کا انبار لگ جاتا تھا۔ سفر کرنا ہوتا تو عجیب و غریب اہتمام کرتے۔ زادِ راہ کے بھرپور انتظامات کیے جاتے۔ کئی کئی ٹفن کیریر میں مرغ، پراٹھے، حلوے اور نمکین کلچے بھرے جاتے، ٹوکریوں میں موسمی پھل اور میوے ہوتے۔ اگر صبح کو ٹرین پکڑنی ہے تو ان کا ساز و سامان بکس وغیرہ رات ہی کو درست کیے جاتے۔ حد یہ ہے کہ اپنا بستر بھی اسی وقت بندھوا لیتے۔ عزیزوں کے یہاں جانا ہو جب بھی حقّہ، پاندان، سماوار اور چائے کا سامان ضرور ساتھ ہوتا۔ اسٹیشن پر احتیاطاً دو تین گھنٹے پہلے پہنچ جاتے۔ ویٹنگ روم یا پلیٹ فارم کے کسی اور گوشے میں نوکر چاکر ان کے لیے دری چادر کا فرش لگا دیتے۔ سماوار میں کوئلے دہکائے جاتے اور وہیں چائے دم ہوتی۔ اس زمانے میں بچوں میں چائے پینے کا رواج نہ تھا لیکن ان کی نظر بچا کر کئی بار مجھے اس نعمت سے شاد کام ہونے کا موقع ملا تھا۔ سماوار کی چائے کی مخصوص قسم کی بھینی بھینی خوشبو ہوتی تھی اور چائے کا فلیور ایسا ہوتا تھا کہ خیال ہوتا ہے ہندوستان کی

وہ زمینیں اب بنجر ہو گئی ہیں جہاں اس زمانے میں چائے کے باغات ہوا کرتے تھے۔ چائے پی کر پان کھائے جاتے، یہاں تک کہ ٹرین آ جاتی اور وہ ڈیوڑھے کلاس کے کمپارٹمنٹ میں سوار ہو جاتے۔ فرش فروش گاؤں واپس کر دیے جاتے اور چائے پان کے لوازم ان کے ساتھ رکھ دیے جاتے۔

مکتب کے دو استاد یاد آتے ہیں۔ مولوی مجیب صاحب اور مولوی محمد عمر صاحب۔ اوّل الذکر بڑے نیک مزاج، متواضع اور خلیق تھے۔ شاگردوں پر شاید ہی کبھی چھڑی اٹھاتے ہوں۔ مسجد میں جس دردبھری آواز سے وہ اذان دیتے تھے وہ اب بھی یاد ہے۔ عمر صاحب ان کے برخلاف مضبوط جسم کے مغلوب الغضب آدمی تھے۔ آنکھیں ہمیشہ سُرخ رہتی تھیں اور چہرے پر عجیب جلال برستا تھا۔ میں نے جب بعد میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی اُردو ریڈروں میں حضرت عمرؓ کے اسلام لانے اور بہن پر تلوار کھینچنے کا حال پڑھا تو خیال ہوا کہ حضرت عمرؓ بھی ہمارے مولوی محمد عمر صاحب جیسے کوئی بزرگ ہوں گے۔

کوئی چھ سال کی عمر ہوگی کہ میں والد مرحوم کے پاس رہنے کے لیے عظیم آباد (پٹنہ) چلا گیا۔ وہاں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں حافظ محمد جان صاحب سے حفظ کے درجے میں جا کر قرآن پڑھنے لگا۔ موصوف حافظ تو بہت اچھے تھے ہی ظریف، حاضر جواب اور بڑے معرکے کے بنوٹ اور تلوار جاننے والے بھی تھے۔ میں نے بڑھاپے میں انہیں دیکھا تھا، اس قدر پھرتی سے پینترے بدلتے اور تلوار چلاتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ پُرانے شہر میں جسے پہلے صرف "شہر" کہتے تھے اور اب پٹنہ سٹی کہتے ہیں، وہ مدرسے سے کوئی پانچ چھ میل کے فاصلے پر رہتے تھے۔ روزانہ نماز فجر کے بعد گھر سے روانہ ہو جاتے۔ راہ میں کئی مقامات پر رک کر لوگوں کو قرآنِ پاک پڑھاتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ اس طرح میلوں کی مسافت پیدل طے کر کے مدرسے پہنچتے۔ "لنچ" ہمیشہ حفظ خانے میں لیتے اور اس اہتمام سے کہ کمرے میں چاروں طرف حفاظ قرآن پڑھ رہے ہیں، آپ وسط کمرے میں ایک سوتی قالین پر بیٹھ کر کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ کھانا بھی سُن لیجیے۔ دستار کے ایک گوشے میں کچھ روٹیاں گھر سے باندھ کر لے آتے تھے، یہاں کسی طالب علم کو بازار بھیج کر ایک کورے مٹی کے برتن میں دہی اور کاغذ کی پڑیا میں ویسی کھانڈ منگوا لیا کرتے تھے۔ سکون کے ساتھ روٹی دہی کے ساتھ تناول فرما لیتے اور پھر اللہ کا شکر ادا کر کے ظہر کی نماز کے لیے نوری مسجد چلے جاتے تھے۔ مدرسہ بند ہونے کے بعد چار بجے گھر کے لیے روانہ ہوتے۔ راستے میں پھر متعدد اصحاب کو پڑھاتے ہوئے شب کے ۱۱ بجے گھر پہنچتے۔ کھانا کھا کر عشا کی نماز پڑھ کر سوتے۔ کبھی موقع ہوتا تو تہجد بھی پڑھ لیتے اور صبح کو بنجارے کی طرح پھر اپنی منزل پر روانہ ہو جاتے۔ یہ معمول ان کا دو چار سال نہیں پچیس تیس سال رہا۔

"کریما" اور "گلستان" (باب ہشتم) مولوی ظہور احمد صاحب سے پڑھی۔ انھی سے کچھ خوش نویسی بھی سیکھی۔ خدا ان کی تربت ٹھنڈی رکھے خوب بزرگ تھے۔ بڑے قانع، وضعدار اور دوست نواز۔ مدرسے کے ابتدائی درجے کے استاد تھے۔ صلاحیت فارسی کی بہت اچھی رکھتے تھے۔ والد مرحوم کے دوستوں میں تھے اس لیے فارسی کتابوں کے اسباق انہوں نے مولوی صاحب کے ذمہ کر دیے تھے۔ درجے میں کوئی پچاس ساٹھ بچے ہوں گے۔ ہر ایک کو قاعدہ بغدادی یا پارۂ عم کا سبق دینا اور تختہ لکھوانا ان کا کام تھا۔ جس محنت، شوق اور ذمہ داری سے

پورے احساس کے ساتھ وہ ہجے کرانے، پچھلا سبق سننے اور نیا سبق دینے اور تختہ لکھنے کی مشق کرانے تھے وہ احساس ہماری یونیورسٹیوں کے بہت سے ان پروفیسروں کو بھی شاید نہ ہو جنہیں تنخواہیں ہزار ڈیڑھ ہزار ملتی ہیں ۔ ان کی تنخواہ اس زمانے میں مشکل سے پچیس تیس روپے ہوگی لیکن انہیں ہمیشہ میں نے خوش و خرم پایا ۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے ۔ سادہ غذا اور سادہ زندگی تھی ۔ چاولوں کے ساتھ آم کھاتے میں نے پہلی مرتبہ انہی کو دیکھا ۔ گھر پر حقہ اور کلاس میں موتر سگریٹ پیا کرتے تھے جو اس زمانے میں ایک پیسے میں ایک ڈبیا آتی تھی ۔ عجیب زمانہ تھا ۔ قینچی سگریٹ کی پوری ڈبیا تین آنے کو آتی تھی اور ہر ایرے غیرے کے بس کی بات نہ تھی ۔ مدرسے کے پورے اسٹاف میں صرف سید صغیر الدین صاحب جو بڑے ماسٹر صاحب کہلاتے تھے یہ سگریٹ پیا کرتے تھے ۔ کیا سگریٹ ہوا کرتی تھی اور کیا فلیور تھا اس میں، وہ کلاس میں بیٹھ کر کش لیتے تھے تو پوری کلاس ایک خاص قسم کی خوشبو سے مہک اٹھتی تھی ۔ اب تو یہ بات اچھی سگریٹوں میں بھی موجود نہیں ۔

آج سے کوئی تیس پینتیس سال پہلے پٹنہ شعر و ادب کا ممتاز مرکز تھا ۔ میں نے شاد عظیم آبادی کو نہیں دیکھا لیکن ان کے متعدد تلامذہ، شائق عظیم آبادی، نہال عظیم آبادی، شیدا عظیم آبادی، امداد عظیم آبادی، حمید عظیم آبادی، صبا عظیم آبادی کو دیکھا ۔ ان سے ملاقاتیں رہیں اور انہیں مشاعروں میں پڑھتے سنا ۔ یہ میری بہت کم عمری کا زمانہ تھا لیکن کچھ تفصیلات اب تک حافظے میں محفوظ ہیں ۔

نظیر حسین شائق، شاد کے اہم تلامذہ میں تھے ۔ زبان اور عروض پر بڑی قدرت رکھتے تھے ۔ لفظ لفظ سے علمیت ٹپکتی تھی ۔ طبیعت کے بہت صاف اور کھرے تھے اس سبب شعرا اور خود شاد کے بعض تلامذہ ان سے گھبراتے تھے اور وہ بھی زیادہ تر الگ تھلگ رہنا پسند کرتے تھے ۔ آدمی بڑے دبدبہ کے تھے، آواز بھی بڑی رعب دار تھی ۔ ان سے ملنا ہر ایسے ویسے کے بس کی بات نہ تھی ۔ پتا نہیں کس وقت کیا سوال کر دیں اور جواب اٹ شٹنٹ دینے پر وہ کس وقت ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیں ۔ ان کے بیٹے سید محمد قاسم مجھ سے عمر میں بہت بڑے لیکن میرے دوست اور ہم جماعت تھے ۔ مدرسے میں حدیث، تفسیر پڑھتے تھے اور گھر پر پہلوانی کرتے تھے ۔ شعر بھی کہتے تھے ۔ غالباً شائق مرحوم سے اصلاح لیتے تھے ۔ شعر تو خیر اب یاد نہیں کیسے لکھتے تھے لیکن ایک بات ہے، پڑھتے تھے بڑے گھن گرج کے ساتھ ۔ زبان بہت اچھی بولتے تھے ۔ اس طرف کوئی بیس سال سے ملاقات نہیں ہوئی ۔ معلوم نہیں وہ کیسے ہیں اور ان کی شاعری کس حال میں ہے ۔ شائق زبان بہت صاف اور پاکیزہ لکھتے تھے ۔ ظاہرا شاد کا اثر انہوں نے بہت کم قبول کیا تھا ۔ ایک لحاظ سے وہ اپنے انداز میں منفرد تھے ۔ افسوس ہے کہ انہیں وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے ۔

سید صادق حسین نہال صاحب، نواب نصیر حسین خیال کے چچازاد بھائی تھے ۔ گورے، خوبصورت، دھان پان سے نرم و نازک آدمی، کپڑے پر تکلف پہنتے تھے ۔ شعر خوب نکالتے تھے ۔ یہ بھی مشہور ہے کہ شاد کبھی کبھی کچھ شعر اپنی جیب خاص سے بھی انہیں دے دیا کرتے تھے ۔ اسی طرح شاد کے بعض شاگردوں نے مجھ سے بیان کیا کہ شاد کے آخری زمانے کے شاگردوں میں معین الدین قیس عظیم آبادی عظیم خاص کا بھی انتظار نہیں کرتے تھے اور "جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے" پر عمل کرتے تھے ۔ شاد رات میں غزلیں لکھتے اور اپنے سرہانے تکیہ کے نیچے رکھ دیتے، دوسرے دن ڈھونڈتے اور غزلوں کا کاغذ نہ ملتا تو کہتے ہائے قیس لے اڑا ۔ شاد کی ایک غزل کا مقطع ہے ۔

شاد چڑھتی غزل اس طرح میں کہنی ہی پڑی   کوئی صورت نہیں چوروں کے پکڑوانے کی

انہوں نے آخر عمر میں ایک رسالہ "ڈاکو نامہ" بھی تصنیف کیا تھا جو بقول پروفیسر مسلم "کلامِ شاد کے لٹیروں بالخصوص ایک منہ لگے اور مقرب شاگرد میاں قیس کی چوریوں اور سینہ زوریوں کے خلاف ایک فریاد ہے"۔ لطف کی بات یہ کہ قیس پھر آتے اور استاد کی مذمت شروع کر دیتے اور دوسرے شاگردوں کے خلاف انہیں بھڑکاتے۔ وہ ان کی باتوں میں آ جاتے اور تعلقات معمول پر آ جاتے۔ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے اس لیے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا۔ نواب نصیر حسین خیال، شاد کے بھانجے تھے اور نوجوانی میں شعر و سخن کے دلدادہ تھے شاد سے کلام پر اصلاح لیتے تھے لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد شعر و شاعری ترک کر کے نثر نگاری کی طرف مائل ہو گئے اور اس میں انہوں نے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی۔ ان کا مشہور مضمون "خالاؤں کا مارا آغا" ہے اور مشہور کتابیں "مغل اور اردو" اور "داستانِ عجم" ہیں۔ میں نے اس قدر وجیہہ و شکیل اور جامہ زیب آدمی کم دیکھے ہیں۔ ٹوپی ایک خاص وضع کی پہنتے تھے۔ اندازِ گفتگو بہت دلکش تھا۔ خطوط بھی بہت اچھے لکھتے تھے۔ میرے پاس ان کے کئی خط موجود ہیں۔ شاد کی شاعری کے متعلق ان کی رائے اچھی نہ تھی۔ انہیں اچھا غزل گو ضرور مانتے تھے۔ میں نے خیال کے صاحبزادے سید امیر نواب کو بھی دیکھا تھا۔ معلوم نہیں اور معاملات میں نواب صاحب سے مشابہت رکھتے تھے یا نہیں، لیکن ٹوپی بالکل انہی جیسی پہنتے تھے۔

شیدا کا نام غالباً علی حیدر تھا۔ مادر زاد نابینا تھے۔ حافظہ غضب کا رکھتے تھے۔ عظیم آباد کے مشاعروں میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ خود بھی بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں وہاں رکشا کا رواج نہ تھا۔ ٹیکسی تو اب بھی وہاں عام نہیں ہوئی ہے۔ بڑے منکسر المزاج آدمی تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے کوئی شاگرد ٹکے لے کر ان کے گھر چلا جاتا اور اس پر بٹھا کر ساتھ لے آتا۔ وہ آخر وقت تک مشاعرے میں بیٹھتے اور اکثر پو پھٹے گھر واپس پہنچتے۔ غزلیں بڑی لمبی لمبی لکھتے تھے اور اکثر دو غزلہ سہ غزلہ ارشاد فرماتے۔ کمال یہ تھا کہ مسودہ اور بیضہ سب دماغ میں محفوظ رہتا لیکن پڑھتے وقت کبھی ایک شعر ادھر کا اُدھر نہ ہونے دیتے۔ ان کے شاگردوں میں اس زمانے میں ایک نوجوان حسن عظیم آبادی اکثر مشاعروں میں ساتھ رہتے تھے، یہ پڑھتے خوب تھے۔

میر عنایت حسین امداد عظیم آبادی کو بھی میں نے دیکھا اور سُنا۔ "شہر" میں رہا کرتے تھے۔ بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ ایک مشاعرے میں میں انہیں صدارت کے لیے مدعو کرنے گیا تھا، بیمار اور مضمحل تھے لیکن میرے اصرار پر آمادہ ہو گئے۔ رات کے ۲ بجے تک مشاعرہ رہا، سردیوں کا زمانہ تھا، صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے تھے آخر تک بیٹھے رہے۔ غزل بھی بڑی معرکے کی انہوں نے سنائی۔

حمید صاحب محلہ لودی کٹرے میں رہا کرتے تھے اور اپنے کو جادو کش آستانہ شاد لکھتے تھے۔ ان کا مکان خاص طور پر جب کبھی مشاعرے ہوا کرتے تھے ان کے شاگردوں اور دوسرے شعرا سے بھرا رہتا تھا۔ یاد آتا ہے کہ شاد کے پوتوں سلطان احمد بہزاد اور رفقی احمد آباد سے پہلی ملاقاتیں یہیں ہوئیں۔

سید محمود علی خاں صبا، شاد کے بڑے عزیز شاگردوں میں ہیں۔ محلہ سنگی دالان پٹنہ سٹی میں مقیم ہیں۔ اس طرف کا حال معلوم نہیں، پہلے مشاعروں میں کثرت سے شریک ہوتے تھے اور معاصرین میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ دیوان مرتب ہے۔ شاہ منظور الرحمٰن اختر کاکوی سے تو بہت مراسم رہے۔ وہ اپنے شاگرد ہونے کا حال اور شاد کے دوسرے قصے بہت دلچسپی سے سنایا کرتے تھے۔ اب قصبہ بہار شریف میں مقیم ہیں۔ شعر و سخن کا سلسلہ جاری ہے۔ کیف عظیم آبادی یاد نہیں شاد کے شاگرد تھے یا نہیں، نام سعید الدین احمد تھا اور پیشہ غالباً طبابت تھا۔

ان کے شعر ایک خاص کیفیت اور سوز سے معمور ہوتے تھے پڑھتے بھی تھے بہت اچھا اور مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔
ان سب شعرا سے ملاقاتیں بچپن کے زمانے کی ہیں بعد کو شاد کے جن شاگردوں سے ملاقاتیں ہوئیں وہ پروفیسر محمد مسلم، شاہ ولی الرحمن ولی کاکوی اور پروفیسر عطاء الرحمن عطا ہیں۔ مسلم صاحب شاد کے ایسے چہیتے شاگرد ہیں کہ شاد نے اپنی خودنوشت سوانح عمری کمال عمر کے نام سے لکھ کر ان کی طرف منسوب کر دی۔ اس طرح اپنی اور اپنے بزرگوں کی بڑائی اور مخالفین کی بُرائی میں جو کچھ لکھنا چاہتے تھے بلا تکلف انہوں نے ساری باتیں سپرد قلم کر دی ہیں اور ستم یہ کیا کہ مسلم صاحب کو کتاب بخشنے کے بعد خطوط میں عماد الملک اور ہمایوں مرزا کو اس بات کی اطلاع بھی کر دی کہ میں نے اپنی سوانح حیات لکھ کر اپنے ایک قابل شاگرد کو سپرد کر دی ہے کہ میرے مرنے کے بعد چھپوا کر مشتہر کرنا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جب ریاست بہار کے گورنر تھے تو انہیں شاد کے اس مسودے کی اطلاع ملی۔ انہیں یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوئی کہ ایسی دلچسپ کتاب اس طرح گوشۂ گمنامی میں پڑی رہے۔ چنانچہ انھوں نے انجمن ترقی اُردو ہند سے اس کی اشاعت کے انتظامات کرا دیے۔ یہ کتاب "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہو گئی ہے۔ مسلم صاحب اب کراچی میں مقیم ہیں۔
ولی الرحمن صاحب کاکوی شعر کہتے کہتے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے[1]۔ کچھ عرصہ ہوا ڈپٹی کلکٹری سے انہیں نجات ملی ہے۔ اب اپنے گاؤں کاکو میں مقیم ہیں۔ شعر و ادب کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ شاد کی شاعری اور دوسرے موضوعات پر بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ ان کا ایک مضمون "بہار کی چند ادبی شخصیتیں" نقوش شخصیات نمبر (۲) میں شائع ہو چکا ہے۔ وہ شاد کے شاگرد تو ہیں ہی لیکن اپنی ایک تازہ غزل کے مقطع میں اپنے کو شاد کا جانشین بھی لکھا ہے اور یہ غلط بھی نہیں ؎

جو ہیں رنگِ شاد کے معترف وہ پڑھیں ولی کے کلام کو
کہ ولی ہے شاد کا جانشیں، نہیں شاد اب تو نہیں سہی

ایک ادبی صحبت میں ولی نے یہ غزل سنائی۔ آپ بھی پڑھیے اور دیکھیے شاد کا رنگ کس قدر صاف جھلک رہا ہے ؎

حُسنِ ہیچ ہے غضب قہر ہے گیسوئے دراز — خالِ سیاہ ہے ستم، فتنہ ہے چشم سحر ساز
نعمتِ لازوال سے عشق نے کر دیا غنی — جان ہے وقفِ بے خودی، دل ہے رہینِ سوز و ساز
اشک فشاں ہے چشم زار در پہ ہوں تیرے سجدہ بار — مذہبِ عشق میں یہی اپنا وضو ہے اور نماز
برق بھی سب قرار ہے ہائے رے تیری شوخیاں — حشر بھی پائمال ہے اُف رے ترا خرام ناز
دیر میں وہ حرم میں وہ، مسجد و میکدہ میں وہ — عالمِ عشق میں نہیں فرقِ حقیقت و مجاز
میری جبینِ سجدہ ریز بن گئی جزوِ خاکِ در — تو بھی ہوئی نہ ملتفت تیری ادا رے بے نیاز

---

[1] یہ شعر ان کا نہیں لیکن دیکھیے ان پر کس طرح منطبق ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا!

شاہ و گدا کی کیا تمیز، مسلکِ حسن و عشق میں   ہے دلِ غزنوی یہاں بستۂ گیسوئے ایاز

آخرِ شب ہے اسے وصیؔ اور وہ محوِ خواب ہیں

اپنا فسانۂ الم ختم کر اب زباں دراز

شاہ عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی پٹنہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں۔ پہلے ادارۂ تحقیقاتِ عربی و فارسی میں استاد تھے۔ فارسی کے دو تذکرے انھوں نے مرتب کرکے شائع کیے ہیں۔ شعر و سخن کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ ایک دو انجمنوں کے روحِ رواں ہیں۔ بیدلؔ پر ان کی ایک کتاب "حیرت زار" کے نام سے چھپی ہے۔ ان کی دوسری کتاب کا نام "میخانۂ تغزل" ہے۔ یہ بھی شائع ہو چکی ہے۔ قدیم تہذیب اور شرافت کا نمونہ ہیں۔

شادؔ کے شاگردوں میں نواب بنا صاحب موجؔ، جناب آباد اور رلاڈلے صاحب بیتابؔ مجھے بالکل یاد نہیں۔ بہت ممکن ہے یہ بہت پہلے فوت ہو گئے ہوں لیکن ان کی شاعری کی گونج عظیم آباد کی ادبی محفلوں میں میرے بچپن میں باقی تھی۔

مرزا یگانہؔ جو پہلے مرزا واجد حسین یاسؔ تھے محلہ مغلپورہ پٹنہ سٹی میں رہا کرتے تھے۔ شادؔ کے شاگرد تھے پھر انھوں نے انہیں اپنے شاگرد بیتابؔ کے سپرد کر دیا تھا اور وہ بیتابؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ اصل فیض یگانہؔ نے انہی سے پایا۔ ان سے میری ملاقات ان کی آخری عمر میں ہوئی۔ بیتابؔ سے میرزا یگانہؔ کی وساطت سے بہار کے باہر کے لوگ بھی واقف ہیں لیکن ایسے نغز گو شاعر کا کما حقہٗ ادبی دنیا میں تعارف نہیں ہوا ہے۔ بیتابؔ کی یہ غزل بہت مشہور ہے اور خانقاہوں کی محفلِ سماع میں قوال گایا کرتے تھے ؎

لڑ گئی ان سے نظر، کھنچ گئے ابرو ان کے   معرکے عشق کے اب تیر و کماں تک پہنچے

مار لے وہ نگہِ ناز تو تیور ہو بلند   سر ہو اونچا مرا گر نوکِ سناں تک پہنچے

ساقیا لغزشیں مستوں کی فدا ہوں تجھ پر   ہاتھ تھامے ترے اور پیرِ مغاں تک پہنچے

راہ میں اور بھی دیوانوں سے ملتے جلتے   پوچھتے پوچھتے ہم ان کے مکاں تک پہنچے

لے گئے عشق کی بازی یہ صفائی بیتابؔ

جان پر کھیل گئے جانِ جہاں تک پہنچے

پٹنہ میں جو جگہ ابھی حال تک بانکی پور کہلاتی رہی ہے اس کا نام پہلے باقی پور تھا۔ یہ حصہ نسبتاً جدید ہے اور بعد میں آباد ہوا ہے۔ پہلے زمانے کے شرفا کا مسکن وہ حصہ تھا جو "شہر" یا "اندرِ شہر" کہلاتا تھا۔ اب اسے پٹنہ سٹی کہتے ہیں۔ یہ سارے شعرا جن کا ذکر ہوا وہیں کے رہنے والے تھے۔

پٹنہ میں شادؔ اور ان کے متوسلین کے علاوہ دوسرے شعرا کی بھی خاصی تعداد تھی اور اپنے زمانے کے نامور شاعروں میں تھے۔ میرے بچپن میں وہاں داغؔ، امیر مینائیؔ، تسلیمؔ، شمشادؔ اور رازؔل کے متعدد تلامذہ اور صحبت یافتہ لوگ موجود تھے۔

داغؔ کے شاگردوں میں مبارک حسین مبارک عظیم آبادی، نظام الدین بلخی، نصیر الدین حسین نصیر عظیم آبادی، شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی کو

میں نے برسوں مشاعروں اور نجی صحبتوں میں شعر پڑھتے سُنا۔ ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق بھی بارہا ہوا۔ مبارک صاحب دبلے پتلے چھوٹے قد کے دھان پان سے آدمی تھے لیکن آواز زوردار تھی۔ بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ نجی صحبتوں میں کھل جاتے تھے اور لطائف و ظرائف کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی تھیں۔ ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر تھے اور اونچا سنتے تھے۔ معلوم نہیں مریضوں کا حال کس طرح سُن لیتے تھے۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے تھے اور بہت صاف لکھتے تھے۔ دیوان غزلیات کا انتخاب "جلوۂ داغ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نظام الدین ٹھی مشاعروں کی جان تھے۔ بے خود ہوکر پڑھتے تھے اور شعر سُنانے میں محو ہوجاتے تھے۔ ان کے دو تین شعر سُننے کے بعد یقین ہوجاتا تھا کہ لکھنے والا داغ کا شاگرد ہے۔ انہیں زیادہ تر کالج کے مشاعروں میں پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں پڑھتے سُنا۔ ان کے اسٹیج پر آتے ہی پورے ہال میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور طلبا کی ٹولیاں داد دینے کے لیے تیار ہوجاتی تھیں۔ یہ داد کیا تھی در حقیقت بیداد ہوا کرتی تھی لیکن وہ پڑھنے میں مگن رہتے تھے۔ نصیر عظیم آبادی سے کم ملاقاتیں رہیں۔ وہ مشاعروں میں غالباً شریک نہیں ہوتے تھے۔ کم از کم میں نے انہیں کسی مشاعرے میں نہیں دیکھا۔ ان کی ایک اُردو مثنوی پر سید سلیمان ندوی صاحب نے مقدمہ بھی لکھا ہے۔ غزلیں بہت صاف لکھتے تھے فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو بہت بوڑھے ہوچکے تھے۔ سُرخ سفید رنگ، سر اور داڑھی کے بال بگلے کی طرح سفید تھے۔ عینک لگاتے تھے اور بہت اونچا سُنتے تھے۔ پڑھتے کچھ ایسا تھے کہ صاف سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ سب لوگ اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔ داغ کے شاگردوں میں اب شاہ محمد حسن بسمل کے علاوہ غالباً کوئی اور زندہ نہیں۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں داغ کے رنگ کے شعر اچھے نکالتے ہیں۔ ان شعرا میں مبارک ہر لحاظ سے بہت بہتر تھے۔ ڈاکٹر مبارک کے علاوہ ان میں کسی شاعر کا کوئی مجموعۂ کلام غالباً نہیں شائع ہوا۔ مبارک کی صرف غزلیات کا انتخاب چھپا ہے اور وہ بھی نامکمل۔ حیرت ہے کہ ان کی زندگی میں ان کا انتخاب چھپے اور اس قدر ناقص۔

امیر مینائی کے شاگردوں میں شفق عماد پوری کی بڑی شہرت تھی۔ ان سے ملنے اور ان کی زبان سے کلام سننے کا بھی بارہا اتفاق ہوا۔ ادبی رسالوں میں ان کا کلام خاصا چھپتا تھا۔ مست بنارسی عظیم آبادی بھی امیر کے شاگرد تھے۔ مظفرپور کے دو رئیس اور صاحب ذوق حضرات حکیم محمد ہادی حسن خاں نایاب اور مہدی حسن خاں شاداب امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ نایاب دراصل اسیر کے شاگرد تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد انہوں نے امیر کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ ان کے دو بیٹے ریاض حسن خاں خیال اور اعجاز حسن خاں رسول پور ضلع مظفرپور کے رؤسا میں تھے لیکن پٹنہ میں بھی اکثر مقیم رہتے۔ دونوں بھائی علم و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے اور ایک نفیس کتب خانے کے مالک تھے۔ قدیم شعرا کے کلام پر بھی نظر تھی اور مشکل لفظوں کی قرائتیں بہت صحیح متعین کر لیتے تھے۔ ریاض حسن خاں شاعر تھے۔ دانش اور خیال تخلص کرتے تھے اور غالباً داغ کے شاگرد تھے۔ ان کے اشعار رسالۂ معارف میں کبھی کبھی شائع ہوا کرتے تھے۔ شبلی کے ملنے والوں میں تھے۔ ان کے نام شبلی کے ۲۳ خطوط "مکاتیب شبلی" کے دوسرے حصے میں موجود ہیں۔ شبلی ایک خط میں ان کے فارسی اور اردو اشعار کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"آپ کا کلام بہت شستہ اور صاف ہوتا ہے، مجھ کو اس قدر گمان نہ تھا۔ کل ہی آپ کی ایک نظم اُردو بھی ایک پرچے میں دیکھی، کیا کہنا ہے۔"

نواب صدر یار جنگ اور سید سلیمان ندوی ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر سے ان دونوں بھائیوں کے مراسم بہت گہرے تھے۔ والد مرحوم سے بھی بہت اچھے تعلقات تھے۔ میں ان کے ساتھ کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ امیر مینائی کے سفر عظیم آباد اور ان کے بعض شاگردوں کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ فرماتے تھے امیر مینائی کے سینکڑوں خطوط ان کے پاس موجود تھے جو انہوں نے شاد آب کو لکھے تھے۔ بعض خط چار چار چھ چھ صفحوں کے تھے جن میں شاعری کے متعلق سینکڑوں باتیں ایسی تھیں جو عام کتابوں میں نہیں مل سکتیں۔ یہ خطوط ضائع ہو گئے اور دو چار خط جو انھیں ملے انھوں نے "خطوط منشی امیر احمد" مرتبہ احسن اللہ ثاقب میں چھپوا دئے۔ ان کے پاس ایک فوٹو گروپ بھی تھا جس میں امیر مینائی، ان کے بیٹے صریر مینائی، ضمیر مینائی، اختر مینائی اور ان کے بعض اعزا موجود تھے۔ یہ تصویر خود امیر مینائی نے شاد آب کو بھیجی تھی۔ قاضی عبدالودود صاحب نے یہ تصویر اپنے رسالہ معیار (پٹنہ) میں ایک نوٹ کے ساتھ شائع کر دی ہے۔

وحید الہ آبادی کے شاگردوں میں سید شاہ محمد کمال عظیم آبادی تھے۔ شہر کے رئیسوں میں تھے اور ذی علم آدمی، شعر و سخن کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ وحید کے شاگردوں میں اکبر داناپوری کا ذکر ضروری ہے۔ میں نے انہیں تو نہیں دیکھا لیکن ان کے بیٹے شاہ محسن داناپوری سے پچاسوں بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ شاعر بھی تھے۔ محسن تخلص کرتے تھے۔ ان کی خانقاہ کے ایک مشاعرے میں میں نے غزل بھی پڑھی تھی۔

ازل کے شاگردوں میں اوروں سے بھی ملا ہوں گا لیکن اس وقت بشارت حسین اخقر عظیم آبادی یاد آتے ہیں۔ یہ صورت شکل میں حکیم آزاد انصاری سے مشابہ تھے۔ قیام ان کا قصبہ بہار شریف میں تھا لیکن ایک زمانے میں میرے مکان کے پاس محلہ سلطان گنج میں مقیم تھے۔ میرے ایک رشتے کے بزرگ رشید الحق صاحب ملک اس وقت سلطان گنج تھانہ کے سب انسپکٹر پولیس تھے۔ اخقر صاحب کا وہیں قیام تھا۔ والد مرحوم کے ملنے والوں میں تھے اس لیے گھر پر بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کے اشعار ان سے سننے کا بہت موقع ملا۔

بہار میں ان کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ تصانیف میں "واسوخت اخقر" اور وہ مسدس بہت مقبول ہوا جو انھوں نے مسجد کانپور کی شہادت پر لکھا تھا۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار میں نے خود ان کی زبان سے سنے تھے اور عظیم آباد اور قصبہ بہار شریف میں بہت عام ہیں اور قوالی کی محفلوں میں اکثر گائے جاتے ہیں۔ چند شعر لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

پوچھا جو کسی نے اخقر سے کیوں شغلِ سخن کو چھوڑ دیا
بولے کہ گیا جب موسمِ گل، بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا

دل پھنس کے کسی کی زلفوں میں کس طرح الٰہی چھوٹ گیا
معلوم نہیں کیا پیچ پڑا کالے نے جو من کو چھوڑ دیا

آتے ہیں عجب انداز سے وہ ڈالے ہوئے رخ پر بالوں کو
زلفیں جو ہٹیں اک شور ہوا سورج نے گہن کو چھوڑ دیا

شمشاد لکھنوی کے شاگردوں میں مولانا تمنا عمادی مجیبی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ بڑے زبردست عالم اور ماہر عروض داں ہیں اور شاعری کی سب اصناف پر بھرپور قدرت رکھتے ہیں۔ شاعر سے زیادہ عروض داں ہیں اور اس سے زیادہ دینی عالم۔ فارسی، اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور عربی شاعری پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اسلامیات کے ماہر ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد سے ڈھاکہ منتقل ہو گئے ہیں۔ بہار اور بنگالہ میں کثرت سے ان کے تلامذہ موجود ہیں۔ ان کے یہ شعر بچپن میں میں نے سن رکھے تھے ؎

جس گلی سے لوگ لائے تھے بمشکل مجھے
لو وہیں پھر لے چلا کم بخت میرا دل مجھے

رخ تو میرا پھیر دے اے موجِ دریا اس طرف
دور ہی سے کچھ کہے شاید لبِ ساحل مجھے

لوگ کرتے ہیں تمنا کس لیے کسب ہنر　　　　انتی تحصیلِ ہنر سے کیا ہوا حاصل مجھے

نکارے لوگ جب ہیں تمنا برشے کار　　　　بیکار کار دانیِ مردانِ کار ہے

منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگردوں میں شاہ عطا کریم عطا سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ فارسی میں صوفی منیری تلمیذ غالب کے شاگرد تھے اور اردو میں تسلیم سے مشورہ کرتے تھے۔ ان کا غیر مطبوعہ کلام خانقاہ اسلام پور کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ اب بھی یقین ہے کہ شاہ صاحب کے اخلاف و اعزہ کے پاس ہوگا۔ ان کے دو شعر بچپن سے یاد ہیں ؎

کلیاں نکل رہی تھیں اسیرِ قفس ہوئے　　　　اب کون سی امید رکھیں بال و پر سے ہم

نگاہ کج سہی اے شہسوار دیکھ تو لے　　　　پڑا ہوا کوئی امیدوار راہ میں ہے

بہار کے کہنہ مشق استاد اور شاد کے معاصر فضل حق آزاد اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ہندوستان کے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حالی، شبلی ان کے قدر داں تھے "مخزن" میں تحفہ بہار کے عنوان سے شیخ عبدالقادر اکثر ان کا کلام شائع کرتے تھے۔ ان کے تعلقات شوق نیموی، امداد امام اثر، عبدالغفور شہباز، ریاض خیرآبادی، حفیظ جونپوری اور اکبر الہ آبادی سبھوں سے بہت گہرے تھے۔ شاد سے ان کی کبھی نہیں بنی۔ اخبار "الپنچ" کے مجلدات اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہفتہ وار مزاحیہ اخبار تھا جو محلہ صدر گلی پٹنہ سٹی سے ۱۸۸۵ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید رحیم الدین تھے لیکن بعد کو ان کی صحت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ کام ادارت کا مولانا ابوالخیر خیر دربھنگوی کرنے لگے تھے۔ پھر وہ اس کے مستقل ایڈیٹر ہوگئے تھے۔ اس کے قلمی معاونوں میں فضل حق آزاد، شمس العلماء سید محمد یوسف رنجور عظیم آبادی، مولانا عبدالغنی دربھنگوی، حکیم عبدالحمید پریشاں (ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے والد اور پروفیسر کلیم الدین احمد کے جدِ امجد) شوق نیموی اور عبدالغفور شہباز وغیرہم تھے۔ ان کا قیام بعد کو زیادہ تر ان کے گاؤں شاہو بگہہ میں رہتا تھا اور وہیں انہوں نے ستمبر ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔

ان کے صاحبزادوں میں جنہوں نے شاعری میں شہرت حاصل کی سید عزیز الحق عزیز عظیم آبادی تھے جو اپنے مخصوص رنگ کی رباعیوں کی وجہ سے خیامِ اردو کہلاتے تھے۔ ان کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ ان سے ملاقات بھی تھی اور کچھ دن خط و کتابت بھی رہی تھی۔ فضل حق آزاد کے ایک اور بیٹے جن سے کثرت سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کے بیٹے سید محمود الحق صاحب تھے جو بیرسٹر تھے اور ذوقِ شعری سے بھی بے بہرہ نہ تھے۔ عرصہ تک میرے محلہ شاہ گنج میں میرے مکان کے پاس رہا کرتے تھے۔ بیرسٹری بیتا نہیں کیسی کرتے تھے لیکن حافظہ انہوں نے غضب کا پایا تھا۔ آدمی بڑے خلیق اور خوش گفتار تھے۔ قدیم عظیم آباد کی بھولی بسری داستانیں اور شاد و آزاد کی نوک جھونک کے قصے بڑے لطف لے کر سنایا کرتے تھے۔

پرانے اساتذہ میں مولانا مبین الہدیٰ ثمر اور شاہ محمد قائم قتیل داناپوری کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ مولانا ثمر غالباً بدر آروی کے شاگرد تھے مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔ شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔ قواعدِ فن پر گہری نظر رکھتے تھے۔ شہر کے علاوہ بانکی پور کے مشاعروں

میں بھی شریک ہوتے تھے۔ درگاہِ شاہ ارزانؒ کے مشاعروں میں ضرور شریک ہوتے لیکن مقامی کالجوں کے جدید رنگ کے مشاعروں میں میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ شاہ قتیل داناپور کی خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں اور بڑے قادرالکلام شاعر۔ نثر میں بھی بند نہیں ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ان کے تلامذہ اور متوسلین کی خاصی تعداد ہے۔

ان شعراء کے علاوہ بیرونِ بہار کے اکثر شعراء یہاں آیا کرتے اور اکثر دیر تک قیام کرتے اور لوگوں کو مستفید کرتے۔ قدیم زمانے میں انیس، دبیر، مونس، امیر مینائی، داغ، سائل، جلیل، ریاض، فصاحت، کوثر، آزل وغیرہ عظیم آباد آیا کرتے تھے۔ ان میں بعض شعراء کبھی کبھی آتے اور ان کا قیام بھی مختصر ہوتا، بعض کثرت سے آتے اور دیر تک ٹھہرتے۔ حکیم آغا حسن آزل لکھنوی تو بہت زمانے تک عظیم آباد میں مقیم رہے۔

میرے بچپن میں بے نظیر شاہ وارثی اکثر عظیم آباد آتے۔ والد مرحوم سے بھی ملنے آتے تھے اور اپنا کلام ضرور سناتے تھے۔ میں نے انہیں آخر عمر میں دیکھا تھا۔ دراز قد آدمی تھے اور گیروے رنگ کا وارثیوں کا لباس پہنتے تھے۔ ان کی مشہور نظم "تاروں بھری رات" میں نے خود ان کی زبان سے اپنے گھر پر سنی تھی۔ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دو غزلیں انہوں نے مجھے دی تھیں جو اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کے دو مختصر شعری مجموعے "صحفِ بے نظیر" اور (؟) بھی ان کے عطا کیے ہوئے میرے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

داغ کے شاگرد احسن مارہروی مرحوم بھی کبھی کبھی پٹنہ آ جاتے تھے اور درگاہ شاہ ارزانؒ میں قیام کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کے اعزاز میں مشاعرے ضرور ہوا کرتے تھے۔ ان کا انتقال بھی پٹنہ ہی میں ہوا۔ میری پہلی ملاقات ان سے آج سے کوئی پچیس تیس سال پہلے درگاہ شاہ ارزانؒ میں ہوئی۔ وہ والد صاحب کے ملنے والوں میں تھے۔ انہی کے ساتھ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ کمرے میں فرش لگا ہوا تھا۔ نواڑ کی ایک پلنگ بچھی ہوئی تھی، اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فوراً استقبال کے لیے اٹھے۔ والد صاحب سے معانقہ کیا اور مجھے دعائیں دیں اور فرش کے قالین پر بیٹھ گئے۔ بھاری جسم کے سرخ سفید رنگ کے آدمی تھے۔ ململ کا کرتا اور لٹھے کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے، سر پر تنزیب کی ٹوپی تھی۔ انہوں نے اس وقت کی صحبت میں جو غزل سنائی اس کا مقطع یاد رہ گیا ہے ؎

وصل کی شب ہجر کا دن دونوں احسن یاد ہیں

پھر نہ ایسا عیش پایا پھر نہ ایسا غم ہوا

نوح ناروی کا بھی عظیم آباد میں داغ کے تلامذہ اور اس سلسلے کے شعراء میں بڑا اثر رہا ہے۔ درگاہ شاہ ارزانؒ کے سجادہ نشین شاہ حامد حسین حامد، خواجہ شہرت عظیم آبادی کے شاگرد ہیں لیکن کچھ غزلیں انھوں نے داغ کو بھی دکھائی ہیں۔ میں نے ان کے کلام پر داغ کی اصلاحیں اور ان کے خطوط ان کے پاس دیکھے ہیں۔ شاہ صاحب داغ کی وفات کے بعد ان کے نامور شاگرد احسن مارہروی سے اصلاح لینے لگے تھے۔ ان کے تعلقات نوح ناروی سے بہت گہرے رہے ہیں۔ غالباً ان سے بھی مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ نوح عظیم آباد آتے تو زیادہ تر درگاہ ہی پر مقیم ہوتے اور کبھی کبھی مہینوں قیام کرتے۔ ان کا داغ کے تلامذہ میں بڑا اثر رہا ہے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی بہار میں ہزاروں تک پہنچی ہے۔ ان کے اعزاز میں مشاعروں کی محفل پورے شہر میں منعقد ہوتی تھی۔ نوح کے شاگردوں کی تعداد کا کچھ اندازہ ان مشاعروں سے ہوا کرتا تھا۔ ایک شاگرد داناپور میں مشاعرہ کر رہا ہے تو دوسرا پھلواری

ہیں، تیسرا شہر ہیں اور ہر ایک کی خواہش کہ استاد اس کے مشاعرے میں شریک ہی نہ ہوں بلکہ دو چار روز اس کے گھر پہ قیام بھی کریں۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب شعر خوانی یا کہیں مشاعرہ نہ ہوتا ہو۔ ایسے موقعوں پر وہ پچاسوں تلامذہ کے جھرمٹ میں بڑے تام جھام کے ساتھ مشاعرے میں پہنچتے۔ کبر سن کے باوجود بڑے رنگین لباس پہنتے۔ صبح صبح تک مشاعرے میں بیٹھے رہتے اور صدارت کے فرائض انجام دیتے۔ اکثر "طوفانِ نوح" یا کسی اور دیوان کے کچھ نسخے ساتھ لاتے تھے جو تبرک کی طرح شاگردوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم چھڑ چکی تھی۔ غالباً اگست ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا جب پٹنے میں کرفیو کا نفاذ ہوا اور رات کو باہر کا نکلنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یوں بھی اس زمانے میں تاریکی کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی اور بلیک آؤٹ کی مشق جاری تھی، اس اندھیرے میں گھر سے قدم نکالنا مشکل تھا لیکن یہی زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑے آشوب کا زمانہ تھا۔ ایک طرف جاپان، ہندوستان کے دروازے پر پہنچ کر دستک دے رہا تھا تو دوسری طرف خطرہ تھا کہ محوری فوجیں کب یلغار کرتی ہوئی مشرق کا رُخ اختیار کر لیں۔ یہاں کانگریس نے برطانوی حکومت کے خلاف ایک بڑے پیمانے پر اجتماعی تحریک شروع کر دی تھی۔ حکومت نے اخباروں پر پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ پٹنہ کا مشہور اخبار "سرچ لائٹ" ضبط ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی خبروں اور واقعاتِ عالم کی اطلاع کا اہم ذریعہ ریڈیو رہ گیا تھا۔ آج سے بیس سال پہلے ریڈیو اس قدر عام نہیں ہوتے تھے جتنے اب ہیں۔ ہمارے محلے میں ایک پرانے زمانے کے حکیم صاحب تھے، ان کے پاس ایک بہت پرانا گھسا پٹا ریڈیو سیٹ تھا۔ شب کو روزانہ ۸ بجے سے ۱۰، ۱۰ بجے تک بیٹھ کر اس سے خبریں سنا کرتے تھے۔ پہلے دہلی کی خبریں سنتے، پھر بی بی سی سے سلسلہ ملاتے۔ اس زمانے میں آغا اشرف خبریں سناتے تھے جو کیمبرج میں اُردو کے معلم تھے مگر جنگ چھڑ جانے کے بعد بی بی سی میں آگئے تھے اور اُردو کا پروگرام ان کے ذمے ہو گیا تھا۔ آغا اشرف کا پروگرام ہم لوگ بڑے لطف سے سنتے تھے۔ کوثر و تسنیم کی دُھلی ہوئی زبان بولتے تھے۔ اس زمانے میں خواجہ حسن نظامی نے اپنے روزنامچے میں لکھا تھا کہ میں تو آغا اشرف کے نشریات سن کر اُردو سیکھتا ہوں۔ جاپان سے کوئی پنڈت جی ہندی میں بھاشن دیتے تھے اور اتحادیوں کے خلاف زہر اُگلتے تھے۔ ترکی سے کوئی معمر بزرگ اُردو میں خبریں نشر کرتے تھے۔ پتہ نہیں انھوں نے اُردو کہاں سیکھی تھی اور کن فضلائے زمانہ سے سیکھی تھی عجیب و غریب زبان ہوتی تھی اور اتنے طویل جملے ہوتے تھے کہ ان پر رحم آنے لگتا تھا۔ حکیم صاحب لندن، جاپان اور ترکی پر اکتفا نہ کرتے۔ اب برلن اور روم سے خبریں سنتے۔ برلن سے حبیب الرحمٰن صاحب بڑی زوردار خبریں سناتے تھے اور اتحادیوں پر بڑے غیظ و غضب کا اظہار فرماتے تھے۔

یہ خبر خوانی کی محفلیں مہینوں برپا رہیں اور میں اکثر ان میں شریک ہوتا۔ حکیم صاحب ریڈیو بھی سناتے، خواص کی پان الائچی سے ضیافت بھی کرتے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کیے جاتے۔ یہ بات صبر کا پیمانہ لبریز کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ وہ خبریں سنتے جاتے اور ساتھ میں اپنی عقل و فہم کے مطابق تبصرہ بھی کرتے جاتے۔ وہ تبصرے کچھ ایسے ہوتے تھے کہ خبریں سننے کا سارا لطف کرکرا ہو جاتا۔ ایک دوسری کمزوری ان بزرگوار میں یہ تھی کہ اعلیٰ قسم کی کوئی تقریر ہو رہی ہے یا بہترین نظم سنائی جا رہی ہو، ہٹلر بول رہا ہو

باچرچل کی تقریر ہو رہی ہو انہیں اگر یاد آگیا کہ اس وقت کسی دوسری جگہ سے طمنچہ جان گہیں گا رہی ہیں بس فوراً ریڈیو کی سوئی گھما دیں گے۔ یہاں لوگوں کا یہ حال کہ ذوق وشوق سے آنکھیں بند کیے پورے انہماک سے کانگریس کے مطالبات کے سلسلے میں مسٹر ایمری وزیر ہند کی تقریر کے اقتباسات سن رہے ہیں اور اس طرف ریڈیو سیٹ پہ لہریں بدلنے کی آواز پھٹ پھٹائی اور "دل بڑدل آرا' تیرے نازنے انداز نے گھائل کیا۔"

آپ سوالیہ نشان بن کر حکیم صاحب کا منہ تاکیں گے اور وہ مسکرا کر فرمائیں گے: "یہ طمنچہ جان گا رہی ہیں" وہ عرش منیر اور منور سلطانہ کے گانے بھی بہت پسند کرتے۔ آدمی بہت دلچسپ تھے، ساٹھ سال کی عمر تھی اس وقت لیکن قویٰ بہت عمدہ۔ پان، سگریٹ، حقہ، چائے غرض تمام مشروبات ومسکرات سے سخت پرہیز کرتے۔ صرف افیون کا شغل فرما لیتے تھے۔ پستہ قد، سانولا رنگ، لمبے گیسو، سفید لمبی داڑھی، تنہ بند کرتا، کپڑے کی گول ٹوپی، سنہرا چشمہ لیکن صفر قوت کا، یہ ہے آپ کا حلیہ۔ آپ پہلوان بھی ہیں شاعر بھی، حکیم بھی ہیں ڈاکٹر بھی، ہارمونیم ماسٹر بھی اور روحانی معالج بھی۔ رقص وسرود سے بھی ذوق ہے اور تصوف کی چاشنی بھی۔ خود فرماتے تھے ۱۵ سال کی عمر تک ہارمونیم اور ستار خوب بجایا۔ روزانہ شام کو ان کے یہاں بیٹھک رہتی۔ مجمع جمتا اور محفل گرم ہوتی۔ ہارمونیم اس قدر تیزی سے بجاتے تھے کہ کہنہ مشق سے کہنہ مشق ان کی استادی مانتے تھے۔ فوٹوگرافی کا شوق ہوا تو کئی پیشہ ور مصوروں کو شاگرد بنا کر چھوڑا۔ کہتے تھے میرے البم میں میری کھینچی ہوئی ہزاروں تصویریں موجود ہیں۔

کسرت کا پہلے بھی شوق تھا اور اب بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ صحت بہت اچھی ہے۔ دنگل لڑنے کا شوق ہوا تو محلے کے اکھاڑے کے اچھے اچھے پٹھوں کو چاروں شانے چت کر دیا۔ طب انگریزی میں وہ کمال پیدا کیا کہ ڈاکٹر اصدر علی لوہا ماننے لگے۔ طب یونانی میں طب ہومیوپیتھک سے بھی گہری واقفیت کے مدعی ہیں۔ علاج شوقیہ کرتے ہیں، قیمت کسی سے نہیں لیتے۔ شاعری کا شوق پیدا ہوا تو سینکڑوں دواوین جمع کر ڈالے اور فرصت ملی تو سبھوں کو پڑھ ڈالا۔ ایک ضخیم دیوان اردو کا مرتب ہے جس پر تقریباً بیس سال سے لوگوں سے تاریخی قطعات اور تقریظیں لکھوا رہے ہیں۔ نوح کے شاگرد ہیں اور نوح کو جمیع شعرائے ہند بشمول اقبال، جوش، فراق، جگر سب سے بہتر جانتے ہیں اور ان کے اس شعر پر جھومتے ہیں ؎

دنیا گلے میں ڈال کے پھانسی لٹک گئی
بڑھنا غضب ہوا تری زلفِ دراز کا

زندگی کا پہلا مشاعرہ جسمیں میں سامع بلکہ تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا' مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا مشاعرہ تھا۔ یہ یاد آتا ہے کہ دو دن تک جاری رہا۔ مدرسے کی عمارت "شیش محل" جس میں پہلے درس ہوتا تھا اب یہ جگہ طالب علموں کے قیام کے لیے مخصوص ہے۔ صحن میں شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ مولانا تمنا عمادی مشاعرے کے صدر تھے اور مصرع یہ تھا:۔

عاشق کی زندگی بھی سراسر عذاب ہے

معلوم نہیں یہ مصرع طرح کس دل جلے کا تجویز کیا ہوا تھا۔ بہر حال خوب خوب شعر پڑھے گئے۔ مدرسے کے دو تین قدیم طالب علموں کے نام یاد

اُنتے ہیں جنہوں نے غزلیں پڑھیں۔ اختر کیفی، عبدالرؤف محوی، صادق سیوانی اور اختر کاکوی۔

دوسرا اہم مشاعرہ جو مجھے یاد آتا ہے وہ درگاہ شاہ ارزاں میں منعقد ہوا تھا۔ نوح ناروی آئے ہوئے تھے اور ان کے سینکڑوں شاگرد اور عقیدت مند درگاہ پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ طرح کے دو مصرعے دیئے گئے تھے اور اکثر صاحب ذوق حضرات نے دونوں طرحوں میں طبع آزمائی کی تھی۔ مصرع ہائے طرح یہ تھے:-

محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا

دوسرا مصرع یہ تھا:-

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

پٹنہ میں اس زمانے میں شعر و شاعری کا کس قدر چرچا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ مشاعرہ مسلسل تین روز تک ہوتا رہا یعنی ۷۲ گھنٹے برابر شعرا اپنا کلام ان طرحوں پر سناتے رہے۔ ایک صدر تھک جاتا تو آرام کرنے، کھانے پینے، سونے چلا جاتا۔ دوسرا اس کی جگہ لیتا، وہ تھک ہار کر اٹھتا تو تیسرا مسندِ صدارت سنبھالتا۔ حاضرین کا بھی یہی حال تھا۔ ہزاروں آدمی ہر وقت شامیانوں کے نیچے بیٹھے شعر سنتے رہتے۔ پھر بھی کچھ شعرا کو شکایت رہ گئی کہ انہیں پڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ ان تین دنوں میں معلوم نہیں کتنے ہزار شعر پڑھے گئے ہوں گے، مجھے تو صرف ایک مصرع یاد رہ گیا ہے ع تھا مقدر میں عزازیل کے شیطاں ہونا

غالباً یہ مصرع حضرت سید شاہ حامد حسین حامد سجادہ نشین خانقاہ شاہ ارزاںؒ کے کلام بلاغت نظام سے ہے۔ درگاہ شاہ ارزاںؒ کے سجادہ نشین صاحب کے خاندان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں کا ہر تیسرا آدمی شاعر ہے لیکن مجھے تو یہاں کا ہر شخص شاعر ملا۔ پہلا اور دوسرا شخص جو شاعر نہ ہو مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ سجادہ نشین صاحب شاعر، ان کے والد محترم شاہ واجد حسین شاعر، یہ واجد تخلص کرتے تھے، اپنا کلام خود پڑھتے تھے بعد کو بینائی کی خرابی کے باعث کسی خوش گلو سے غزل پڑھوا دیا کرتے تھے۔ حامد صاحب کے دو بھائی مجاہد حسین مجاہد شاعر، ارشاد حسین ارشاد شاعر، شاہ محمود حسین محمود شاعر، ان کے بیٹے شاہ مقصود حسین مقصود شاعر، شاہ صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی عاشق حسین عاشق شاعر بلکہ ان کا تو دیوان بھی مرتب ہے۔ شاہ صاحب کے عزیزوں میں حکیم مظفر حسین مظفر شاعر — انجم حسین انجم شاعر، یہ شاعر وہ شاعر غرض کہ پورا خاندان شاعر اور یہ سب فیض ہے حضرت نوح ناروی کی ذات با برکات کا۔

سفید جھوٹ

انور

سفید ریچھ کی کہانی ہوتی ہے۔ سفید ہاتھی کی کہانی ہوتی ہے، اب ایک سفید عورت کی کہانی سنو۔

مجھے سفید عورت کا شوق وراثت میں ملا ہے۔ مجھے وراثت میں سفید عورت کے شوق کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ نہ زمین۔ نہ زر۔ نہ کوٹھی۔ نہ کار۔ جائداد کسی بھی شکل میں مجھے وراثت میں نہیں ملی۔ کیونکہ میرا باپ زندہ ہے۔ اور زندگی میں وارثوں کو جائداد تقسیم نہیں ہوتی۔ جائداد حاصل کرنے کے لیے باپ کی موت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مجھے اپنے باپ کی موت کا انتظار کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اور نہ مجھے جائداد کا شوق تھا۔ مجھے تو سفید عورت کا شوق تھا۔ میں اپنے باپ کی زندگی میں ہی اس سے اپنا حق حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن میرا باپ اس معاملے میں بڑا کنجوس تھا۔ اُس کی ملکیت میں سفید عورت کے شوق کی بے حد فراوانی تھی، کیونکہ اُس کی بیوی ایک سفید عورت تھی۔ وہ سفید عورت میری ماں نہیں تھی۔ میری ماں کا رنگ تو پنجاب کی زرخیز مٹی کی طرح سنہری تھا۔ جب سفید رنگ میرے باپ کے گھر میں داخل ہو گیا تو سنہری رنگ مٹی میں مل چکا تھا۔ ہمارے گھر پر ایک سفید عورت کی حکومت تھی۔ اور ہمارے ملک پر ایک سفید قوم کی حکومت تھی۔

میرا باپ ایک آئی۔ سی۔ ایس تھا۔ انڈین سول سروس کو آئی۔ سی۔ ایس اور پراونشل سول سروس کو پی۔ سی۔ ایس کہتے تھے۔ فلاں فلاں ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ فلاں فلاں ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ سی۔ ایس۔ انگریزی حرفوں کی ان زنجیروں میں صدیوں تک ہندوستان کی سنہری چڑیا کے پر اور پیر جکڑے پڑے رہے۔ زنجیروں میں کُتّوں کو بھی پالا جاتا ہے۔ سفید قوموں کو کتّوں کا بہت شوق ہے۔ اُن کے ہاں بچّے کم ہوتے ہیں۔ بچّوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کُتّے پالے جاتے ہیں۔ اس لیے سفید قومیں کُتّوں کو بچّوں کی طرح پیار کرتی ہیں۔ کالے کُتّے، بھُورے کُتّے، بُلی کُتّے، السیشین کُتّے، کُتّے سفید قوموں کے گھروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سفید قومیں کُتّوں کی مدد سے دُور دراز ملکوں پر حکومت کرتی ہیں۔

دراصل میرا سفید عورت کا شوق ہماری سفید قوموں کی غلامی کا نتیجہ تھا۔ اس کی بُنیاد لارڈ میکالے نے ہمارے سکولوں میں انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا کر رکھی تھی۔ پھر سر سید احمد خاں نے اس کے لیے علی گڑھ میں ایک عالیشان کالج بنایا۔ اس کے بعد میرے باپ نے ایک سفید عورت سے شادی کر کے اس کو میرے سامنے لا کے کھڑا کر دیا۔

آخر باپ کی جائداد میں میرا بھی کچھ حصّہ تھا۔ زر، زمین، کار اور کوٹھی کے لیے تو مجھے اپنے باپ کی موت کا انتظار کرنا تھا، لیکن جہاں تک سفید عورت کے شوق کا تعلق تھا، اُس میں سے مَیں اپنا حصّہ ان کی زندگی میں ہی حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

چنانچہ ایک دن میں نے کہا:

"ڈیڈی، میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اوکسفورڈ میں داخلہ لینا چاہتا ہوں۔"

ڈیڈی نے جواب دیا۔
"کیوں چیفنس کالج میں ادنیٰ تعلیم ہے؟"
میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا:
"ڈیڈی! کہاں لاہور کا چیفنس کالج اور کہاں انگلستان کی اوکسفورڈ یونیورسٹی!"
ڈیڈی نے طنز آمیز لہجے میں کہا:
"میرے فرمانبردار بچے، کیا تو جانتا ہے، کہ لاہور کے ایک سرے پر چیفنس کالج ہے اور دُوسرے سرے پر ہیرا منڈی اور جب بھی میں تجھے چیفنس کالج میں دیکھنے گیا ہوں تو مجھے ہیرا منڈی میں ملا ہے۔ اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جب میں تجھے اوکسفورڈ یونیورسٹی میں ملنے جاؤں گا تو تُو مجھے کہاں ملے گا؟"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف چل پڑے۔ میں ان کے جواب سے سخت مایوس ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ میری نظروں سے دُور ہو جائیں۔ لیکن وہ دروازے پر پہنچ کر دروازے سے باہر نکلنے کی بجائے میری طرف لوٹ آئے اور میرے پاس آکر دروازے کی طرف لوٹ گئے۔ اس طرح وہ میرے اور دروازے کے درمیان ٹہلتے رہے۔ پھر وہ میری کُرسی کی بیک پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور بولے:

"میرے بچے، شاید تیرا جنرل نالج بہت کمزور ہے۔ شاید تجھے معلوم نہیں کہ ہندوستان ختم ہو چکا ہے۔ اب ہم پاکستان میں ہیں۔ انگریزوں کا سفید سایہ ہمارے سر سے اُٹھ گیا ہے۔ اوکسفورڈ اور کیمبرج کی تعلیم اب ہمارے لیے کوئی طرۂ امتیاز نہیں ہے۔ جب ہندوستان میں انگریزوں کا راج تھا تو ہم اپنے مشرقی علوم اور تہذیب پر اوکسفورڈ کی تعلیم کی قلعی کر کے انٹرویو میں جایا کرتے تھے اور ہماری ملازمت کے مواقع چمکدار ہو جاتے تھے۔ انگریزوں کے وقت میں مادی اور سماجی فائدے اُٹھانے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ انگریزی تعلیم اور انگریز لڑکی۔ انگریزی تعلیم کے ملمّع سے مُلازمت حاصل کرنے کے بعد ترقیاں پانے کے لیے اور اُونچی سوسائٹی میں رسائی حاصل کرنے کے لیے انگریز لڑکی پاسپورٹ کا کام دیتی تھی۔ میں بھی ایک انگریز لڑکی سے شادی کر کے اپنے صُوبے کے گورنر کا داماد بن گیا تھا کیونکہ وہ لڑکی ایک دُور دراز اور پیچدار رشتے سے ہمارے گورنر کی بھتیجی لگتی تھی۔ اگرچہ گورنر کا داماد ہونے کی حیثیت سے سوسائٹی میں مجھے بہت بلند مقام حاصل ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود ترقی کے ایک اہم موقعے پر میں نے اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی شکست کھائی۔ مجھ سے ایک بہت جونیئر آئی۔ سی۔ ایس۔ کو مجھے نظر انداز کر کے ترقی دے دی گئی کیونکہ وہ وائسرائے کا داماد تھا۔ انگریزی زبان انٹرنیشنل شطرنج ہے جس میں انگریز لڑکی کوئین کا کام کرتی ہے۔ لیکن اب تمام دُنیا میں کوئین کو مات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لیے انگریزی زبان کی شطرنج کی بساط اُلٹ گئی ہے۔ اب انگریزی زبان حاصل کرنے کے لیے اوکسفورڈ اور کیمبرج میں بھٹکتے پھرنا بے سُود ہے۔"

وہ دروازے کی طرف چل پڑے اور میں نے سوچا اب یہ اس کمرے سے دفع ہو جائیں گے۔ لیکن وہ دروازے کے پاس ٹھہر گئے، اور بولے:

"عذرا میڈیکل کالج میں داخل ہو گئی ہے۔ آج شام کو اُس کے ڈیڈی ممی نے ہمیں چائے پر بُلایا ہے۔ ساڑھے چار بجے،

تیار رہنا۔"

ڈیڈی چلے گئے۔

ڈیڈی کے جانے کے بعد اُن کی عدم موجودگی میں میں نے اُن سے کہا:

"مجھے عذرا سے شادی نہیں کرنی۔ میں عذرا سے شادی نہیں کروں گا۔"

عذرا کا رنگ میری ماں کی طرح پنجاب کی زرخیز مٹّی کی مانند سنہری ہے۔ میری ماں کہا کرتی تھی: لڑکی کی صورت نہ دیکھو۔ اس کی سیرت دیکھو۔ میرا باپ کہتا ہے: لڑکی کی صورت نہ دیکھو، اس کی جائداد دیکھو۔ میں کہتا ہوں: لڑکی کی سیرت نہ دیکھو کیونکہ سیرت نظر نہیں آتی، لڑکی کی جائداد نہ دیکھو، کیونکہ جائداد کا کوئی اعتبار نہیں۔ لڑکی کی صرف صورت دیکھو۔ صورت لڑکی کا شوکیس ہے۔ بکنے والے مال کو سلیقے سے سجا کر شوکیس میں رکھ دیا جاتا ہے۔ لڑکی اپنی ساری شخصیت، ساری جاذبیت اور ساری رعنائیاں اپنی صورت کے شوکیس میں رکھ دیتی ہے۔ پھر کوئی خریدار اس شوکیس کو اپنے ڈرائنگ روم میں لے جاتا ہے اور اس کا چوکیدار بن کر بیٹھ جاتا ہے۔

عذرا کی صورت بڑی دلکش ہے۔ لیکن اُس کا رنگ سفید نہیں اور مجھے سفید عورت کا شوق ہے۔ اس لیے میں عذرا سے شادی نہیں کروں گا۔

مجھے ایک سفید عورت کی تلاش تھی۔ وہ سفید عورت جو یورپ اور امریکہ کی سفید قوموں میں پائی جاتی ہے۔ رنگدار قوموں میں بھی سفید عورتیں ہوتی ہیں۔ جیسے ایران، افغانستان اور یمن میں۔ لیکن رنگدار قوموں میں سفید عورت کا وجود ایسا ہوتا ہے جیسے کالے بدن پر پھلبہری کے داغ۔ میں رنگدار قوموں کی سفید عورتوں کو سفید نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک صرف سفید قوموں کی عورتیں ہی سفید عورتیں ہیں۔

شاید یہ میرا کومپلکس ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ میں کشمیر کی گوری چٹی دوشیزہ کو پھلبہری کا داغ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہوں اور لندن میں پکیڈلی کی سڑکوں پر آوارہ پھرنے والی عورت کو سفید عورت سمجھ کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید یہ انتقام کا جذبہ ہے جو میرے تحت الشعور میں اُن سفید قوموں کے خلاف سُلگ رہا ہے جنھوں نے صدیوں تک ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنے پیروں کے نیچے روندا ہے۔ وہ غیر مہذب جذبہ جو اپنے دُشمن سے انتقام لینے کے لیے ان کی لڑکیوں کو اغوا کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کیا کومپلکس ہے۔ لیکن اگر یہ کومپلکس ہے تو بڑا مزیدار کومپلکس ہے۔ میں اس کے تجزیے میں اپنا وقت ضائع کیوں کروں۔

جب چیفس کالج میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ڈیڈی نے مجھے اوکسفورڈ بھیجنے سے انکار کر دیا تو میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوگیا۔ گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے کرنے کے بعد میں نے ڈیڈی سے کہا کہ میں آئندہ تعلیم انگلستان جاکر مکمل کروں گا یا پھر تعلیم چھوڑ دوں گا۔

میں نے کالج چھوڑ دیا۔ اور ایک ایسے بین الاقوامی ادارے میں ملازم ہوگیا جس میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں اور جس میں اُن دنوں میں سفید قوموں کی عورتیں اور مرد بھی تھے۔ یہ ادارہ ایک چھوٹا سا انگلستان ہے جس کے اراکین صُبح سے شام تک انگریزی بولتے ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں اُردو بولتے ہیں، پنجابی بولتے ہیں۔ سندھی بولتے ہیں، گجراتی بولتے ہیں۔ لیکن اس ادارے میں انگریزی بولتے ہیں۔ مرد مغربی لباس پہنتے ہیں اور ایک دُوسرے کو نئے ڈیزائن کی امریکن ٹائی استعمال کرنے پر مبارک باد دیتے ہیں۔

اور ایک دُوسرے سے پُوچھتے ہیں کہ یہ ڈینگ سُوٹ تُم نے سوئزر لینڈ میں کس درزی سے سلوایا ہے ۔ اس ادارے میں کام کرنے والی عورتیں جب اپنے آفس کو آتی ہیں تو اس انداز میں آتی ہیں جیسے کسی فیشن شو پر جا رہی ہوں ۔ جب تمام ملک نے ٹیڈی ازم کو کنڈم کر دیا تو اس نے اس ادارے میں پناہ لے لی ۔ ٹیڈی ازم اصل میں لباس کا نیوڈزم ہے جو پینٹنگ کی کینوس سے نیچے اُتر کر سڑکوں پر آگیا ہے ۔ چونکہ سڑکوں پر مکمل برہنگی کی اجازت نہیں اور مکمل برہنگی بُنیادی طور پر ایک بدصُورت چیز ہے اس لیے ٹیڈی ازم برہنگی کو سلک میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے ۔ اور اب تو انگریزی فلموں نے عورتوں کے لباس کو آگے کی طرف سے اتنا نیچے تک کاٹ دیا ہے کہ معاشرے کے ناسُور صاف نظر آتے ہیں ۔ لڑکیاں اپنی اُنگلیوں کو لمبا اور مخروطی کرنے کے لیے اپنی اُنگلیوں پر چھ چھ اِنچ لمبے ناخن رکھتی ہیں جس طرح شیکسپیئر کے ڈراموں میں جادوگر چڑیلیں رکھتی تھیں اور جو ہر وقت مردوں کے گوشت میں پیوست ہونے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں ۔ لڑکیوں نے اپنے قد لمبے کرنے کے لیے اپنے بالوں کو چائے کی ٹی کوزیوں کی شکل دے دی ہے یا پھر وہ اپنے بالوں کو لڑکوں کی طرح کاٹ کر تیل اور کنگھے سے بے نیاز ہوا میں اٹکھیلیاں کرنے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں تاکہ وہ الھڑ البیلی نظر آئیں ۔ مجھے اس ادارے کی فضا بہت پسند آئی ۔ یہ ادارہ ایک چھوٹے سکیل پر انگلستان ہے ۔ انگلستان میں اور اس میں صرف یہ فرق ہے کہ وہاں سفید قومیں زیادہ ہیں اور رنگدار قومیں کم اور یہاں رنگدار قومیں زیادہ ہیں اور سفید قومیں کم ۔ اور اگر میرے شوق کی شدت مجھے حقیقی انگلستان تک نہ لے جاسکی تو یہ مصنوعی انگلستان بھی غنیمت ہے ۔

میں نے فوراً کسی سفید لڑکی کی تلاش شرُوع کر دی ۔ اور چونکہ لڑکیوں کی تلاش بڑا تھکا دینے والا مشغلہ ہے ، مجھے اس کے لیے ایک کار خریدنی پڑی میں اپنی کار کو جگہ جگہ لیے پھرا لیکن مجھے کوئی سفید لڑکی نظر نہ آئی ۔ سفید لڑکی تو کیا کوئی رنگ دار لڑکی بھی نہ ملی ۔

سفید لڑکی کی عدم موجودگی نے مجھے رنگدار لڑکیوں کی طرف مائل کر دیا ۔ شاید رنگدار لڑکیوں میں کوئی ایسی دلچسپ رنگدار لڑکی مل جائے جو مجھے سفید لڑکی کی تمنّا سے بالاتر کر دے ۔

ایسی ایک لڑکی کی آواز کی موسیقی نے میرے دل کے پردوں سے ٹکرا کر مجھے بے خود کر دیا ۔ لیکن وہ لڑکی صرف اس وقت مل سکتی ہے جب وہ بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوتی ہے لیکن وہ بڑے سڈول اور تندرست جسم والی لڑکی ہے اور کبھی بیمار نہیں ہوتی ۔

ایک لڑکی کے بال اُس کی کمر تک لمبے ہیں اور سروں پر پہنچ کر سنہری ہو گئے ہیں ۔ لیکن وہ ہمیشہ اُن کو چھپا کر رکھتی ہے ۔

ایک لڑکی کی ناک اور اُس کے بالوں کا جوڑا ، دونوں مل کر اس کے چہرے میں اتنا دلکش تناسب پیدا کر دیتے ہیں کہ دُوسری لڑکیوں کے جوڑے پس منظر میں چلے جاتے ہیں ۔

ایک لڑکی ایک دفعہ سٹیج پر نظر آئی پھر معلوم نہیں کہاں چلی گئی ۔

ایک لڑکی ہمیشہ چُپ رہتی ہے لیکن جب وہ بات کرتی ہے تو برسات کا موسم آجاتا ہے ۔ بارش ہونے لگتی ہے اور ندی

نالے چل پڑتے ہیں۔

ایک لڑکی چلتے وقت سر ہلاتی ہے جیسے محبت سے انکار کر رہی ہو۔ اُس کو دیکھ کر کسی مٹن شاپ کا خیال آتا ہے اور شام کو کسی ہوٹل میں بیٹھ کر مٹن چاپ یا مٹن کٹلٹ کھانے کو دل چاہتا ہے۔

ایک رنگدار لڑکی اتنی سفید ہے کہ اُس کو دیکھ کر مری کی برف یاد آتی ہے اور اُس سے باتیں کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن کی ایک پوری بوتل پی لی ہے۔

ایک لڑکی ہمیشہ سفید ساڑی پہنتی ہے اور ایسے باوقار انداز سے نظریں جھکائے ہوئے چلتی ہے جیسے وہ مجھے سفید عورت کے سائے سے بچانے کے لیے آ رہی ہو لیکن وہ چُپ چاپ میری طرف دیکھے بغیر میرے سامنے سے گزر جاتی ہے۔

ایک اور رنگدار لڑکی ہے جو بہت سفید ہے اور بہت خوبصورت ہے اور ہمیشہ اپنی آنکھوں پر چشمہ لگائے رکھتی ہے۔ وہ اپنے حسن کی بے پناہ طاقت سے واقف ہے اور جانتی ہے کہ اگر وہ اپنی پوری رعنائیوں سے بام کی بلندی پر آ جائے تو طور جل کر ہلاک ہو جائے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو انتہائی سادہ کپڑوں میں ملبوس رکھتی ہے۔ اور اپنے ہونٹوں کو مسکراہٹ سے ہمکنار نہیں ہونے دیتی۔ اور اپنی خوبصورت نیلی آنکھوں کو سیاہ چشمے کے پیچھے چھپائے رکھتی ہے۔ جب میں نے اُس کو پہلی دفعہ دیکھا تو مجھے ساری دُنیا کی سفید عورتیں بھول گئیں۔ دُوسرے دن میں اپنا راستہ چھوڑ کر اُس راستے پر گیا جہاں وہ بس کا انتظار کر رہی تھی اور اپنی کار اُس کے سامنے کھڑی کر دی اور نہایت مہذب انداز میں بولا:

"آئیے!"

اُس نے ترش روئی سے جواب دیا۔

"جی نہیں، شکریہ، میری بس آ رہی ہے۔"

یہ میری بڑی ہتک تھی۔ میں نے خفت کو دباتے ہوئے کہا:

"کوئی ہرج نہیں۔ میں بھی وہیں کام کرتا ہوں جہاں آپ کرتی ہیں۔ آئیے۔ میں آپ کو وہاں تک لے جاؤں گا۔"

اُس نے اور بھی ترش رو ہو کر کہا:

"جی نہیں۔ میں کسی سے لفٹ لینا پسند نہیں کرتی۔ آپ تشریف لے جائیے۔"

اُس دن سے لے کر آج تک، میں ہمیشہ اپنا راستہ چھوڑ کر اُس کے راستے سے جاتا ہوں۔ اُس کے سامنے کار کھڑی کرتا ہوں۔ اُس کے پاس اُس کے علاوہ اگر کوئی اور کھڑا ہو، اُس کو اپنی کار میں بٹھاتا ہوں اور اس کو وہیں چھوڑ کر کار سٹارٹ کر دیتا ہوں۔

ان لڑکیوں کے علاوہ مجھے چند ایک اور لڑکیوں نے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے ٹیڈی لباس دیکھ کر جن میں وہ بھری ہوئی بندوقیں معلوم ہوتی ہیں، اور ان کے بڑھے ہوئے ناخن دیکھ کر جن کے ساتھ وہ شیکسپیئر کی جادوگرنیاں یاد آتی ہیں اور اُن کے سروں پر مصری فرعونوں کی بیویوں جیسے بال دیکھ کر جن سے وہ بڑی پرکشش اور سر پھری دکھائی دیتی ہیں، میں نے ان

کے نزدیک نہیں گیا۔

اس وقت عذرا میڈیکل کالج میں اپنے آخری سال میں تھی۔

میرا عذرا سے شادی کرنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن عذرا بڑی اچھی لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے کا سونا دمکنے لگ گیا تھا۔ اور وہ اپنے چھوٹے سے مُنہ سے اتنی بڑی بڑی باتیں کرتی تھی کہ کبھی کبھی اُس کو ملنے کو دل چاہتا تھا۔

اُس دن جب اُس لڑکی نے جو اپنی نیلی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے رکھتی ہے میری لِفٹ سے انکار کر کے میری اِنسلٹ کی، میں شام کو عذرا سے ملنے کے لیے اُس کے گھر گیا۔

جب اُس کی والدہ ہمیں اکیلا چھوڑ کر اندر چلی گئی تو عذرا نے چائے بناتے ہوئے کہا:

"کہیے، آپ کا سفید بخار اُتر گیا۔"

میں نے جواب دیا:

"جب آپ نے اس سفید بخار کو اُتارنے کے لیے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور جب آپ چار سال سے اس کا علاج کر رہی ہیں تو یہ سفید بخار ضرور اُترے گا۔ میرا سفید بخار بالکل اُتر چکا ہے۔ اور اب مجھے صاف نظر آرہا ہے کہ چاندی چاندی ہے اور سونا سونا ہے۔"

اس کے بعد عذرا اور میں اپنا زیادہ وقت اکٹھے گزارنے لگے۔

پھر مارگریٹ زنگولا ہمارے ادارے میں شامل ہو گئی۔

آناً فاناً اس جرمن لڑکی کے حُسن کا چرچا ادارے کے کونے کونے میں پھیل گیا۔ لیکن عذرا کی مسحور کُن باتوں نے مجھے دیوانہ بنا رکھا تھا، اس لیے میں نے مارگریٹ زنگولا کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ لیکن میں متواتر سُن رہا تھا کہ مارگریٹ اس قدر حسین ہے کہ ادارے کے بڑے بڑے افسر اس میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔

ایک شام کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں ادارے کا سالانہ ڈنر اور ڈانس تھا۔ مجھے عذرا کو وہاں لے کر جانا تھا۔ عذرا نے اپنا بہترین ایوننگ ڈریس پہنا۔ میں نے بھی اپنا سب سے اچھا سُوٹ پہنا۔ ہم نے کار کو ہوٹل کے سامنے کاروں کی لمبی قطار میں پارک کیا اور دونوں ساتھ ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئے۔

بال رُوم میں بڑی رونق تھی۔ ہال کے دونوں طرف بُوفے ڈنر کی میزیں سجی ہوئی تھیں۔ سٹیج پر آرکسٹرا ایک ڈانس ٹیون بجا رہا تھا۔ فلور پر چند جوڑے ناچ رہے تھے۔ کچھ وِسکی کے گلاس لیے کھڑے تھے اور بہت سے پلیٹوں میں بریانی اور چکن تکے لیے پھر رہے تھے۔

جُونہی عذرا اور میں ہال میں داخل ہوئے ایک قیامت کی حسین سفید لڑکی نے اپنے پارٹنر سے توجہ ہٹا کر میری طرف دیر تک غور سے دیکھا۔ پھر اس کی نظریں عذرا کی طرف گئیں۔ وہ اس طرح کافی دیر تک باری باری مجھے اور عذرا کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ اپنے پارٹنر کے ساتھ ناچنے میں مشغول ہو گئی۔

یہ مارگریٹ زنگولا تھی۔

ادارے کے ایک بہت بڑے افسر نے مارگریٹ کے ساتھ ناچنے کی درخواست کی تھی اور مارگریٹ نے اس کو منظور کر لیا تھا، لیکن جب اُس افسر نے مارگریٹ کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے ہاتھ پھیلائے، مارگریٹ کی نظر مجھ پر اور عذرا پر پڑ گئی۔ وہ ہمیں دیکھتی رہی اور افسر ہاتھ پھیلائے کھڑا رہا۔

بوفے ڈنر کھاتے ہوئے میں نے عذرا سے کہا:

"یہ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔"

عذرا نے جواب دیا:

"ہاں، سفید ہے۔"

مارگریٹ نے ڈانس کرتے ہوئے کئی دفعہ میری طرف دیکھا۔

میں نے عذرا سے کہا:

"عذرا کیا میں اس لڑکی کے ساتھ ایک ڈانس کر سکتا ہوں؟"

عذرا نے نہایت فراخدلی سے جواب دیا:

"ضرور، کیوں نہیں۔"

مارگریٹ نے میری ڈانس کی درخواست کو بڑی گرمجوشی سے منظور کر لیا۔ اور میرے ساتھ ڈانس کرنے کے بعد اُس نے کسی اور کی ناچنے کی درخواست منظور نہیں کی۔ رات کے دو بجے تک ڈانس جاری رہا۔ اور ڈانس کے آخر میں ہم کو بہترین ڈانس کرنے والے جوڑے کا انعام ملا۔

مارگریٹ کی آواز بڑی سُریلی تھی اور وہ جرمن لہجہ میں انگریزی بول رہی تھی۔

پہلے ڈانس کے دوران میں تعارف کے بعد اُس نے پوچھا:

"یہ لڑکی تمھاری بیوی ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"نہیں۔ میری دوست ہے۔"

اُس نے پھر پوچھا:

"منگیتر ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"نہیں۔ ہمارے ماں باپ چاہتے ہیں کہ ہم شادی کر لیں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا۔ اور نہ اس لڑکی کا کوئی ایسا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں؟ تم ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے؟" اُس نے پوچھا۔

"کرتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ تمہارے ماں باپ رضامند ہیں۔ اب تمہیں کس بات کا انتظار ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"شاید ہم ایک دوسرے سے بہتر رفیقِ حیات کی تلاش میں ہیں۔ اگر ہمیں کوئی بہتر رفیقِ حیات نہ ملا تو ہم شادی کر لیں گے۔"

میں نے جواب دیا۔

مارگریٹ نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور بولی:

"اس لڑکی کو تم سے بہتر شوہر مل سکتا ہے؟"

میں نے مسرت اور حیرت کے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا:

"معلوم نہیں۔"

مارگریٹ کے چہرے پر مسکراہٹ اور بھی پھیل گئی اور اُس کے ہاتھ کی اُنگلیاں میرے ہاتھ کی اُنگلیوں سے اور بھی اُلجھ گئیں اور اُس نے کہا:

"مجھے معلوم ہے۔ وہ لڑکی نہیں بلکہ تم کسی بہتر شریکِ حیات کی تلاش میں ہو، ہے نا؟"

میں نے کہا:

"ہاں۔"

پہلے ڈانس کے بعد جب بینڈ بند ہو گیا۔ ہم سیدھے عذرا کے پاس گئے۔ میں نے تعارف کرایا "مس عذرا فیروز ——— مس مارگریٹ زنگولا۔"

آپ سے مل کر خوشی ہوئی اور آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ان فقروں اور قہقہوں کے درمیان ہم صوفوں پر بیٹھ گئے بیرا شربتوں اور شرابوں کی ٹرے لے آیا۔ مارگریٹ نے وسکی اور سوڈا لیا۔ میں نے بھی وسکی اور سوڈا لیا۔ اور عذرا نے لائم جوس کا گلاس لے لیا۔ مارگریٹ عذرا سے یوں گھل مل گئی جیسے وہ برسوں کی دوست ہوں۔ مارگریٹ نے نہایت بے تکلفی کے ساتھ عذرا سے باتیں شروع کر دیں۔ اُس نے کہا:

"سعید کہہ رہا ہے عذرا شادی کے معاملے میں سیریس نہیں ہے۔"

عذرا نے جواب دیا:

"میں میڈیکل پروفیشن میں ہوں۔ میڈیکل کالج میں پانچ سال کی سٹڈی کے بعد لڑکی لڑکی نہیں رہتی چڑیل بن جاتی ہے۔ اس سے کوئی شادی کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس لیے ڈاکٹری کے پیشے میں لڑکیاں شادی کو اپنے پروگرام سے نکال دیتی ہیں۔ ڈاکٹر کی زندگی اتنی مصروف ہوتی ہے کہ وہ شوہر کے پاس صرف اس وقت جا سکتی ہے جب اس کو بخار چڑھا ہو اور تھرمامیٹر سے درجۂ حرارت دیکھنا ہو ———"

مارگریٹ نے قہقہہ مار کر عذرا کی بات کاٹ دی۔ عذرا کی بات کئی دوسروں نے بھی کاٹی جو مارگریٹ کے ساتھ ناچنے کی درخواست کرنے آئے تھے۔ مارگریٹ انھیں بڑی خندہ پیشانی سے انکار کر دیتی تھی۔ اور جب بینڈ ماسٹر نے دوسرے ڈانس کا اعلان کیا تو مارگریٹ نے مجھ سے کہا :

"آؤ۔"

دوسرے ڈانس کے دوران میں مارگریٹ نے کہا :

"جب تم اور عذرا ہال میں آئے تو میری جان نکل گئی۔ ڈانس میں میرا قدم اُکھڑ گیا۔ اور میرا پارٹنر حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی تمھیں دیکھ رہی تھی اور کبھی عذرا کو۔"

میں خود اس سے یہ بات پوچھنے والا تھا، جب اُس نے یہ بات خود شروع کر دی تو میں دانستہ بولا :

"کیوں؟ کیا بات تھی۔"

وہ بولی :

"میں نے سمجھا میجر ممتاز آ گیا ہے اور اُس کے ساتھ اُس کی بیوی ہے۔"

میں نے پوچھا :

"میجر ممتاز کون ہے؟"

اُس نے جواب دیا :

"میں میجر ممتاز کی تلاش میں یہاں آئی ہوں۔ میجر ممتاز سے میری ملاقات برلن میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں ایک آرمی کورس کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ میں اُس کے ساتھ ہی یہاں آنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس نے کہا وہ پہلے اپنے ماں باپ کو رضامند کرے گا، پھر وہ مجھے یہاں بلائے گا اور مجھ سے شادی کرے گا۔ لیکن یہاں پہنچ کر اُس نے مجھے صرف دو تین خطوں کے جواب دیے۔ پھر چُپ ہو گیا۔ آخر میں اس بین الاقوامی ادارے میں شامل ہو کر یہاں کراچی میں آ گئی۔ میں نے آتے ہی اُسے خط لکھ دیا تھا کہ وہ مجھے فوراً کراچی میں آ کر ملے۔ جب تم اور عذرا ہال میں داخل ہوئے تو میں بوکھلا گئی۔ میں نے سمجھا یہ میجر ممتاز ہے۔ یہ اُس کی بیوی ہے۔ میجر ممتاز نے مجھ سے دھوکا کیا۔ وہ شادی شدہ تھا۔ میں پاگلوں کی طرح تمھیں اور عذرا کو دیکھ رہی تھی۔ میرے پارٹنر نے بڑی مشکل سے مجھے سنبھالا۔"

پھر اُس نے یکایک موضوع بدل دیا اور بولی :

"تمھیں نیند آ رہی ہے؟"

میں نے جواب دیا :

"نہیں۔"

"پھر تمھارے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کیوں ہو گئی ہے؟ تمھارے قدم کیوں ڈگمگانے لگے ہیں؟ کیا تم تھک گئے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اُس نے پھر موضوع بدل دیا اور بولی:

"کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"

مَیں نے پُوچھا:

"کس معاملے میں؟"

اُس نے کہا:

"کیا تم مجھے میجر مُمتاز سے ملا سکتے ہو؟"

مَیں نے جواب دیا:

"مَیں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔"

اُس نے پُوچھا:

"کیا تمھیں میری مدد کر کے خوشی نہیں ہوگی۔"

مَیں نے جواب دیا:

"مجھے ہوگی، تمھیں نہیں ہوگی۔"

اُس نے حیران ہو کر پُوچھا:

"وہ کیوں؟"

مَیں نے جواب دیا:

"میں میجر مُمتاز کو اس گاؤں سے جہاں وہ چھُپا بیٹھا ہے، نکال کر تمھارے سامنے لے آؤں گا اور مار مار مار کے تمھارے سامنے ہڈیوں اور پسلیوں کا ڈھیر لگا دوں گا۔"

وہ چلائی:

"او گڈ لنس می۔ نہیں نہیں نہیں۔ تم تو بڑے خطرناک معلوم ہوتے ہو۔"

مَیں نے کہا:

"ہاں میں بہت خطرناک ہوں۔ میں بہت وائیولنٹ نیچر کا آدمی ہوں۔ نہایت انتہا پسند۔ جب میں کسی لڑکی سے محبت کرتا ہوں تو اس کو دانتوں سے لہو لہان کر دیتا ہوں۔ اور جب کسی شخص سے نفرت کرتا ہوں تو اُس کو چاقو سے لہو لہان کر دیتا ہوں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں بڑی شدّت سے کرتا ہوں۔"

ڈانس ختم ہو گیا۔ بینڈ بند ہو گیا۔ اچھا ہُوا نہیں تو طیش میں آ کر اور بھی نامعقول باتیں کر جاتا۔

میرا خیال تھا کہ اس گفتگو کے بعد مارگریٹ میرے ساتھ ناچنے سے انکار کر دے گی۔ لیکن جب پھر ڈانس شروع ہُوا تو اُس نے بہت

سی درخواستوں کو رد کر کے مجھے ناچنے کی دعوت دی۔ اور ناچ شروع ہوتے ہی اُس نے کہا :

" تم بہت جیلس قسم کے آدمی ہو۔"

میں نے کہا :

" ہاں ۔"

اپنی عادت کے مُطابق اس نے فوراً موضوع بدل دیا اور کہا :

" تم نے اپنے جسم کی رگڑوں سے میرے جسم کے چھلکے اُتار دیے ہیں۔ میرا پہلا پارٹنر جو میرے ساتھ اس وقت ناچ رہا تھا جب تم ہال میں داخل ہوئے تھے بڑا نرم مزاج اور نرم سلوک تھا۔ اُس نے مجھے ایسے تھاما ہُوا تھا جیسے پھولوں کے گُلدستے کو۔"

میں بھڑک گیا اور بولا :

" میرے سامنے اُس موذی کا نام نہ لو۔ اچھا ہُوا تُم نے ناچنے کی درخواستوں کو رد کر دیا نہیں تو جب وہ تمھیں اپنے بازوؤں میں بھینے لگتا، میں اُس کے بازو توڑ دیتا ۔"

وہ حیرت زدہ ہنسی کے ساتھ بولی :

" اوہو ! کیوں ؟ اُس نے تمھارا کیا بگاڑا ہے ؟"

میں نے جواب دیا :

" مجھے اس سے نفرت ہے ۔ وہ میرا بوس ہے ۔"

اس طرح ہر ڈانس میں ہم ایک دُوسرے کو اپنے بارے میں کُچھ نہ کُچھ بتاتے رہے اور عذرا اطمینان سے صوفے پر بیٹھی نٹنگ کرتی رہی۔

ادارے کے ہر ممبر نے مارگریٹ سے ڈانس کرنے کی درخواست کی، لیکن اُس نے سب کو خندہ پیشانی سے انکار کر دیا۔ میں اُس رات ہال کا ہیرو تھا۔ سب مجھے رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ۔ اور میرے بوس کی آنکھوں میں تو خُون اُتر آیا تھا۔

آخری ڈانس کے دوران میں میں انتہائی جذباتی ہو گیا اور بولا :

" میگی ، یہ آخری ڈانس ہے ۔ اس کے بعد پارٹی ختم ہو جائے گی پھر کیا ہو گا ؟"

اُس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا :

" اس کے بعد ہم اپنے گھروں کو چلے جائیں گے اور سو جائیں گے ۔"

میں نے پُوچھا :

" تمھیں نیند آ جائے گی ۔ مجھے تو نیند نہیں آئے گی ۔"

اُس نے کہا :

"اگر مجھے نیند نہ آئی تو میں نیند کی گولیاں کھاؤں گی۔ کیا تمہارے پاس نیند کی گولیاں ہیں؟"

میں نے کہا:

"نہیں۔"

اُس نے سوال کیا:

"کیا تم مجھے میرے ہوسٹل چھوڑنے کے لیے جاؤ گے؟"

میں نے جواب میں کہا:

"ضرور۔"

وہ بولی:

"تو میں تمہیں سونے کی گولیاں دے دوں گی۔"

ڈانس ختم ہوگیا۔ مارگریٹ کو اور مجھے بہترین ڈانس کرنے والے جوڑے کا انعام ملا۔ سب نے ہمیں آکر مبارکباد دی۔ پارٹی ختم ہوگئی۔ سب واپس جانے کے لیے ہال سے نکلنے لگے۔ میں مارگریٹ اور عذرا کو لے کر اپنی کار کی طرف چل پڑا۔ جب ہم ہوٹل کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ میرا لوئس جو مارگریٹ کو اپنی کار میں ڈانس کے لیے لایا تھا دروازے پر کار لیے کھڑا ہے۔ اس نے مارگریٹ کے لیے کار کا دروازہ کھول دیا۔ مارگریٹ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ میرے ساتھ ہوسٹل کو جا رہی ہے۔

میں نے عذرا کو اس کے گھر پر چھوڑا اور پھر مارگریٹ کو چھوڑنے کے لیے اُس کے ہوسٹل کی طرف مُڑ گیا۔

ہوسٹل پر پہنچ کر کار سے اُترنے سے پہلے مارگریٹ نے کہا:

"کیا تم نیند کی گولیاں لے کر واپس جانے سے پہلے میرے کمرے میں ایک کافی کی پیالی پسند کرو گے؟ میں اپنے ہاتھوں سے بناؤں گی۔ بہترین جرمن کافی ہے۔ اس مُلک میں نہیں ملتی۔"

میں نے پیشکش کو مسرّت اور شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔

مارگریٹ کا کمرہ بڑا سادہ تھا۔ مارگریٹ نے بجلی کے چُولھے پر کافی بنائی۔ اور ہم ایک ٹیپائی کے دو طرف آمنے سامنے بیٹھ کر کافی پینے لگے۔

کافی پیتے پیتے مارگریٹ نے کہا:

"ہم نے غلطی کی۔ ہمیں کافی نہیں پینی چاہیئے تھی۔ کافی پینے کے بعد نیند کی گولیوں کا اثر کم ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا:

"میں یہاں نیند کی گولیاں لینے نہیں آیا۔ جب میں نے کہا تھا کہ مجھے نیند نہیں آئے گی تو اس کا مطلب تھا کہ میں جاگتا رہوں گا۔ میں جاگنا پسند کرتا ہوں۔ سونا نہیں چاہتا۔ جاگنا سونے سے بہتر ہے۔ اور آج میں تمہیں بھی نیند کی گولیاں نہیں

کھانے دوں گا۔ ہم دونوں صبح تک جاگتے رہیں گے۔ تمام رات ایک دُوسرے کے سامنے بیٹھے ایک دُوسرے کو دیکھتے رہیں گے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟ کیا تم یہ پسند کرو گی؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چُپ چاپ کافی پیتی رہی۔

میں نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا:

"میگی، انسان کی زندگی کا وہ حِصّہ جس میں وہ تمام رات جاگتا رہتا ہے، بہت مقدّس ہوتا ہے۔ وہ گئے وقت کی طرح کبھی واپس نہیں آتا۔ اور میگی، تم کتنی بے وقوف ہو! تم سمجھتی کیوں نہیں؟"

میگی چُپ چاپ بیٹھی رہی۔

پھر وہ بولی:

"اور کافی پیو گے؟"

میں نے کہا:

"ہاں۔"

اُس نے پیالیوں کو گرم پانی سے صاف کر کے اور کافی بنائی۔ ہم کچھ عرصہ چُپ چاپ کافی پیتے رہے۔ پھر وہ بولی:

"سعید، تمھاری طبیعت میں غضب کی انتہا پسندی ہے۔ تمھارے مزاج کی دہشت پسندی کے پیشِ نظر تمھیں آرمی میں ہونا چاہیئے تھا۔ تم اس ادارے میں کیا کر رہے ہو؟ تمھاری بے پناہ قوتیں تو مُلک کی خدمت اور حفاظت کے لیے موزوں ہیں۔"

"جی نہیں۔ بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں مُلک کی حفاظت کے لیے بالکل موزوں نہیں ہُوں۔ میں تو ان انسانوں میں سے ہُوں جو اپنی محبُوبہ کے لیے تاج اور تخت چھوڑ دیتے ہیں اور جو ایک سیم تن حسینہ کی ایک ادا پر اپنی جان، اپنا جسم اور اپنا مُلک نثار کر دیتے ہیں۔"

میگی پر کُچھ بے خودی کا سا عالم طاری ہو گیا۔ وہ بولی:

"اور وہ لڑکی جس کے لیے کوئی اپنا تاج اور تخت چھوڑ دیتا ہے جس کی ایک ادا پر کوئی اپنا سب کُچھ قُربان کر دیتا ہے، کتنی خوش قسمت ہوتی ہے کیونکہ وہ قوت کے دیوتا کے سائے میں آجاتی ہے۔ قوّت کا دیوتا جو اُس کو تاج اور تخت سے زیادہ قیمتی سمجھ کر اس کی حفاظت کرتا ہے۔ قوّت کے دیوتا کا کام حفاظت کرنا ہے اور حکومت کرنا ہے۔ دریاؤں پر، پہاڑوں پر، مُلکوں پر، جزیروں پر۔ عورت ایک جزیرہ ہے۔ ایک دلفریب، سرسبز، اور زرخیز جزیرہ جس کی سرحدیں غیر محفوظ ہیں۔ جس پر حملہ آور چاروں طرف سے حملہ کر سکتے ہیں۔ جب تم نے پہلے ڈانس کے دوران میں مجھے اپنے بازوؤں میں لیا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے جزیرے میں قوت کا دیوتا آگیا ہے۔ اور اب میں ایک محفوظ جزیرہ ہُوں۔"

میں نے حیران ہو کر کہا:

"مائی گڈنس! میگی، تم تو شاعر ہو۔ کتنی شاعرانہ باتیں ہیں یہ! کیا تم شعر کہتی ہو؟"

میگی نے جواب دیا :
"نہیں ۔ رُومانی ناول پڑھتی ہوں۔ ایک رُومانی ناول میں نے کل ہی ختم کیا ہے ۔ اُس کی ہیروئن بالکل اسی طرح باتیں کرتی ہے ۔ بالکل یہی باتیں !"
میں نے پوچھا :
"تو کیا ہم کسی رومانی ناول کے ہیرو اور ہیروئن ہیں ؟"
اس کا جواب دینے کی بجائے اُس نے کہا :
"اب میں شاعری نہیں کروں گی ۔ میں اس مُلک میں اجنبی ہوں، اکیلی ہوں۔ وعدہ کرو تم ہمیشہ میری مدد کرو گے ہمیشہ میری حفاظت کرو گے ۔"
میں نے کہا :
"میں یہ خوشگوار فرض ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں ۔"
وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پھر شکریہ ادا کرنے کے لیے تھوڑی سی جھکی اور بولی :
"اس خوشی میں ہم کافی کی ایک اور پیالی پئیں گے ۔"
میگی کافی بنانے میں مشغول ہوگئی ۔
ہوسٹل سرد تاریکی میں سویا پڑا تھا ۔
فضا میں غنودگی تیرتی پھر رہی تھی ۔
دُور سے ٹرنٹی چرچ کے مینار نے تین بجائے ۔ گھنٹوں کی آواز کے پیچھے اتھاہ خاموشی کمرے میں داخل ہوگئی ۔ اتھاہ خاموشی کے ساتھ شدید تاریکی اور تنہائی کا احساس ذہن کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔ میرے خون کے آتشکدے میں شعلے اُٹھنے لگے ۔ میرے جسم کی چٹانیں زلزلے کے جھٹکوں سے چیخنے لگیں ۔ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے پہاڑ کو پھاڑ کے باہر نکلنے کے لیے دھاڑنے لگے ۔
اور جب میگی کافی کی پیالی میرے سامنے ٹپائی پر رکھنے کے لیے جھکی، میں نے اُس کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں چلایا :
"میگی، میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا، میگی، خدا کے لیے میگی !"
میگی میری آغوش سے نکلنے کے لیے تلملاتی ہوئی چیخی :
"سعید ! میری بات سُنو ۔ میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی ۔ سُنو میں تمھیں کیا کہنا چاہتی ہوں ۔ میں تمھیں ایک بہت ضروری بات کہنا چاہتی ہوں ۔ میں تمھیں ایک بہت ضروری بات کہنا چاہتی ہوں سعید ! میری بات سُنو سعید ۔"
اس کشمکش میں کافی کی پیالی ٹپائی پر اُلٹ گئی ۔ اور میں نے اپنے سُوٹ کو کافی سے بچانے کے لیے میگی کو چھوڑ دیا ۔ میگی مجھ سے اور کافی سے بچنے کے لیے بھاگ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی ۔

ہم بہت دیر تک، ایک دُوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔

پھر میں نے کہا:

"میگی، میں جانا چاہتا ہوں۔"

میگی نے جواب دیا:

"اچھا۔"

مجھے اس جواب کی توقع نہ تھی۔ میں نے بڑی اِنسلٹ محسوس کی۔ اور پینٹ سے کافی کے داغ مٹانے کے لیے اُس پر رومال رگڑ رگڑ کر اُٹھنے کی تیاری کرنے لگا۔ رومال رگڑتے ہوئے میں نے بغیر کسی ارادے کے میگی سی کہا:

"جانے سے پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ ضروری بات کونسی ہے جو تم مجھے کہنا چاہتی تھیں۔"

وہ جلدی سے بولی:

"ہاں۔ میں تمھیں بتانا چاہتی تھی کہ میں جب سے اس مُلک میں آئی ہوں، ہر وقت، ہر جگہ لوگ مجھے انتہائی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں میں اپنے آپ کو بہت غیر محفوظ محسوس کرتی ہوں۔ میں ممنون ہوں تم نے مجھے اپنی پناہ میں لینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے بعد مجھے یہ بتانا تھا کہ مجھے تمھاری امداد کی فوری ضرورت ہے کیونکہ مجھے ایک شخص کی طرف سے سخت خطرہ ہے۔ وہ کسی وقت بھی میری عصمت پر حملہ کر سکتا ہے ——"

میں طیش میں آگیا اور بولا:

"کون ہے وہ شخص؟ ٹھہرو، میں شاید اس کو جانتا ہوں۔ وہ میرا ایوس ہوگا۔ وہ جو تمھیں پارٹی میں لایا تھا اور جس کی لفٹ لینے سے پارٹی کے بعد تم نے انکار کر دیا تھا۔ ہاں وہ بڑا ذلیل آدمی ہے۔ میں اُس کی گردن توڑ دوں گا۔"

میگی نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"نہیں، تمھارا ایوس نہیں۔"

"پھر کون ہے وہ؟"

"سعید۔"

حیرت سے میری نگاہیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔ وہ مُسکرا رہی تھی۔ میں نے پژمردہ آواز میں پُوچھا:

"میں!"

اُس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا:

"ہاں۔"

میں صوفے میں دھنس گیا۔ میں نے اپنی گردن کو صوفے کے گدّے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر جب میری آنکھیں کُھلیں تو میں ایک نئے عزم کے ساتھ صوفے کے گدّے سے اُٹھا اور بولا:

"میگی، تم بیوقوف ہو۔ تم بالکل جاہل ہو۔ آخر تمھیں کس چیز کی ضرورت ہے؟ تمھیں کیا چاہیئے؟"

میگی نے بڑے اطمینان سے کہا:

"مجھے میجر ممتاز کا انتظار ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا ہے۔ اُس کو حاصل کرنے سے پہلے میں لوگوں کی للچائی ہوئی نظروں سے بچنے کے لیے تمھاری پناہ مانگتی ہوں۔ ایک دفعہ پھر وعدہ کرو، تم میری حفاظت کرو گے۔"

میں نے بددلی سے کہا:

"او کے۔ گڈ بائی۔"

میں ہوسٹل کی لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اُترنے لگا۔ پرانی دقیانوسی لکڑی کی سیڑھی میرے بوجھ سے زندگی کی کشتی کی طرح ڈگمگ ڈگمگ کرنے لگی۔ لکڑی کے تختوں پر میرے پیروں کی دھپ دھپ سن کر ہوسٹل کی دیوار کے ساتھ سوئے آوارہ کتے جاگ اٹھے اور مجھ پر زور زور سے بھونکنے لگے۔ میں نے کہا:

"بجا فرماتے ہیں، جناب۔"

میں چار بجے گھر پہنچا۔

دوسرے دن صبح سے شام تک مجھے مارگریٹ کے فون آتے رہے۔ اور میں متواتر اُسے ہوسٹل میں ملنے سے انکار کرتا رہا۔ لیکن جب شام ہوئی تو میں اس سے ملنے کے لیے ہوسٹل چلا گیا۔ دونوں نے ایک انگریزی پکچر دیکھی، ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور پھر میں اُس کو ہوسٹل میں چھوڑ کر واپس آگیا۔

ایک ہفتہ تک اسی طرح ہوتا رہا۔

ایک دن اُس کا کوئی فون نہ آیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: اچھا ہوا، اگر فون آجاتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جوں جوں میرا ہوسٹل جانے کا وقت نزدیک آتا گیا، مجھے بے قراری کا احساس ہونے لگا۔ اور پھر میں بہت بے چین ہو گیا۔ بہت بے قرار ہو گیا۔ اور اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

کیا مارگریٹ مجھ سے ناراض ہے۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہفتے کو میں اُسے ہوکس بے لے گیا تھا۔ ہم سمندر کے کنارے ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ سوتے وقت ہمارا معمولی سا جھگڑا ہوا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ وہ صوفے پر سوئے گی اور مجھے بستر پر سونا چاہیئے۔ اور میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ اور جب میرے بار بار کہنے پر اُس نے میری بات نہ مانی تو میں نے اُسے ایک تھپڑ جڑ دیا اور بولا:

"بندریا کی بچی! پھر یہ ڈبل بیڈ کا کمرہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ رونے لگ گئی تھی۔ اُس کے گال پر میری اُنگلیاں اُبھر آئی تھیں۔ لیکن میں نے اُسے منا لیا تھا۔ اُس نے اقرار کیا تھا کہ وہ مجھ سے بالکل ناراض نہیں اور اتوار کو ہم سمندر میں ہنستے، کھیلتے، بھاگتے، دوڑتے، نہاتے رہے۔

پھر اُس نے آج ٹیلیفون کیوں نہیں کیا!

اُسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

ہاں، میگی کی آواز تھی۔ میں نے بے قرار ہو کر کہا:

"ہاں، میگی ——— ہاں ——— میگی، تم رو رہی ہو؟ ——— میگی، تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا ہوا، کیا بات ہے؟ جلدی بتاؤ ———"

ٹیلیفون سے آواز آئی:

"سعید، جلدی آؤ۔ میں سخت خطرے میں ہوں۔ مجھ پر زندگی کا سب سے ہولناک حملہ ہوا ہے۔ جلدی آؤ، سعید، اگر تم نے دیر کی، تو شاید مجھے زندہ نہ پاؤ گے۔"

میں نے گھبراہٹ میں کہا:

"میگی، گھبراؤ مت۔ میں آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں۔"

میں نے کار کو طوفانی رفتاروں کی منجدھار میں ڈال دیا اور آناً فاناً ہوسٹل پہنچا۔ لڑکھڑاتی ہوئی لکڑی کی سیڑھیوں پر دوڑتا ہوا چڑھ گیا۔ اور مارگریٹ کے کمرے کا دروازہ کھول کر دروازے کے پاس پتھر بن گیا۔

مارگریٹ اپنے بستر کے کنارے پر اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ تھامے ہوئے بیٹھی تھی، اُس کی آنکھیں رو رو کر سُرخ ہو گئی تھیں اور اُس کرسی پر جہاں میں بیٹھا کرتا تھا ایک لمبا تڑنگا، گورا چٹا، تندرست و توانا آدمی بیٹھا تھا اور اُس کرسی پہ جہاں مارگریٹ بیٹھتی تھی، ایک کم عمر کا خوبصورت اور متناسب اعضا والا نوجوان بیٹھا تھا۔

مارگریٹ مجھے دیکھ کر میری طرف بھاگی اور میرے سینے میں اپنا چہرہ گاڑ کر زار و قطار رونے لگی۔ میں پیار سے اُس کے بالوں کو تھپتھپانے لگا۔ پھر میں نے غضب ناک نظروں سے اُن دونوں آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"تم لوگ کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم نے کیا بداخلاقی کی ہے؟"

وہ دونوں چُپ چاپ بیٹھے رہے۔

مارگریٹ نے میرے سینے سے اپنا سر اُٹھا کر باری باری اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"سعید، یہ میجر مُمتاز ہے۔ یہ اِس کا بھائی کیپٹن اعجاز ہے۔ میجر مُمتاز نے برلن میں مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب یہ کہتا ہے یہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ شادی شُدہ ہے۔ اب یہ چاہتا ہے میں اِس کے بھائی کیپٹن اعجاز سے شادی کر لوں کیونکہ وہ ابھی کنوارا ہے۔"

میجر ممتاز بڑے مہذب لہجے میں مُجھ سے مخاطب ہُوا۔

"مسٹر سعید، کیا آپ میرے ساتھ دس منٹ کے لیے لاؤنج میں جا سکیں گے، میں آپ سے ایک پرائیویٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے چند لمحے تامّل کیا اور پھر مارگریٹ کو ایک آرام کُرسی پر بٹھا کر میجر مُمتاز کے ساتھ لاؤنج میں جانے کے لیے تیار

ہو گیا۔ میجر ممتاز نے کیپٹن اعجاز سے مخاطب ہو کر کہا :

"اعجاز، مس زنگولا کا خیال رکھنا، ہم ابھی آتے ہیں ۔"

لاؤنج میں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ ہم دُوسروں سے ہٹ کر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اُس نے ایک اعلیٰ برانڈ کے سگرٹوں کا پیکٹ نکالا اور مجھے پیش کیا۔ میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ اُس نے ایک سگریٹ سُلگایا۔ ایک بہت لمبا کش لیا اور دھوئیں کے پیچھے چھُپ گیا۔

جب وہ دھوئیں کے بادلوں سے باہر نکلا تو بولا :

"مسٹر سعید، میں نے یہ بداخلاقی کی ہے کہ میں نے مس مارگریٹ زنگولا سے سچ سچ کہہ دیا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ اور جب برلن میں میں نے جھوٹ بولا تھا اور مس زنگولا سے کہا تھا کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں تو میرا اخلاق بہت بلند تھا۔ سب کنواری اور شادی شدہ لڑکیاں مجھ سے بات کرنا پسند کرتی تھیں۔ اُونچی سوسائٹی میں میرا پُرتپاک استقبال ہوتا تھا۔ ہر خاندان مجھے خاندان کا ایک فرد سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ یورپ میں جھُوٹ کی بہت قدر کی جاتی ہے تو میں نے وہاں چھوٹے موٹے بہت سے جھُوٹ بولے ان میں سے ایک یہ تھا کہ میں نے مس زنگولا سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ میرے ایسا کرنے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ یورپ کی سوسائٹی میں وعدہ کوئی معنے نہیں رکھتا۔ دُوسری وجہ یہ تھی کہ یورپ میں کنواری لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ اور نہ شادی شدہ ہوتی ہیں۔ کنواری لڑکیاں اکثر دو دو تین تین دفعہ کی طلاق شدہ ہوتی ہیں یا پھر وہ فرائڈ کے جنسی نظریے کے تحت شادی سے پہلے شادی کی خواہش کو کچلنا اپنی جنسی حق تلفی سمجھتی ہیں۔ اور اس جنسی جبر کے سماجی اور نفسیاتی نتائج سے بچنے کے لیے اس خواہش کو تحت الشعور کی تحت الثریٰ کے اندھیروں میں لے جا کر کھُلا چھوڑ دیتی ہیں۔ اور وہ لڑکیاں جو شادی شدہ کہلاتی ہیں، اس بات سے بالکل بے خبر ہوتی ہیں کہ یہ رات جو اس وقت گزر رہی ہے اس کے گزُر جانے کے بعد صُبح کو وہ طلاق شدہ ہوں گی۔ اور طلاق کے فوراً بعد وہ مس بن جائیں گی۔ یورپ میں مجھے اس قسم کی بہت سی مسیں ملیں جو اپنے مُلک سے نکل کر کسی دُوسرے مُلک میں جانے کے لیے اتنی تڑپ رہی تھیں کہ وہ التجا کرتی تھیں کہ ہمیں اپنی جھُوٹ مُوٹ کی بیوی بنا کر یہاں سے لے جائیں اور اپنے مُلک میں جا کر چھوڑ دیں۔ پھر ہم جو کچھ مرضی کریں —"

اُس نے پہلے سگرٹ کے سُلگے ہوئے سرے کے ساتھ دُوسرا سگرٹ سُلگایا اور اپنی بات جاری رکھی۔

"میں کہہ رہا تھا کہ یورپ میں کنواری یا شادی شدہ لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ یورپ میں صرف گوری لڑکیاں ہوتی ہیں۔ چینی کی گُڑیاں! اگر آپ کو گُڑیاں کھیلنے کا شوق ہے تو آپ یورپ چلے جائیں اور ظاہر ہے گڑیوں کے کھیل حقیقی کھیل نہیں ہوتے جھوٹے ہوتے ہیں اس لیے آپ کو جھُوٹ بھی بولنا پڑے گا ——"

اُس نے ایک بہت لمبا سگرٹ کا کش لیا اور دھوئیں کے بادلوں کے پیچھے چھُپ گیا۔ اور پھر جب وہ بادلوں سے باہر نکل آیا تو اُس نے گفتگو کا سلسلہ پھر شرُوع کر دیا :

"اب مجھے کیا معلوم تھا ان چینی کی گڑیوں میں ایک لڑکی بھی چھُپی ہوئی ہے۔ جب ایک چینی کی گُڑیا ایک حقیقی لڑکی بن گئی

تو مجھے بھی حقیقت بن کر سامنے آنا پڑا۔ اور اب مجھے آپ سے ایک بڑا پرسنل قسم کا سوال کرنا ہے۔ اجازت ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وقفے میں میجر ممتاز نے سگرٹ کا ایک کش لیا اور یہ دیکھ کر کہ میں اُس کے سوال کا کوئی جواب نہ دوں گا اُس نے کہا:

"مسٹر سعید، مارگریٹ زنگولا بہت اچھی لڑکی ہے۔ کیا آپ اُس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ جب میجر ممتاز میرے جواب سے مایوس ہوگیا تو اُس نے کہا:

"میں نے یہ سوال اس لیے کیا ہے کہ اگر آپ مارگریٹ زنگولا سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تو میرا بھائی کیپٹن اعجاز اس کے لیے تیار ہے۔"

میں طیش میں آ کر کھڑا ہوگیا اور بولا:

"میجر ممتاز، میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مارگریٹ اب جھوٹوں، مکاروں اور دھوکے بازوں کے چنگل سے نکل آئی ہے۔ اب وہ میری ہے، اور ہمیشہ میری رہے گی، ہم عنقریب شادی کرنے والے ہیں۔"

میجر ممتاز بھی اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور سگریٹ کو بجھا کر ایش ٹرے میں پھینکتے ہوئے بولا:

"مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی ہے۔ اعجاز اس شادی کے لیے رضامند نہیں تھا۔ لیکن وہ صرف میرے لیے یہ قربانی دینے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ اعجاز آپ کا بہت اچھا دوست ثابت ہوگا۔ وہ آج کل کراچی میں ہی تعینات ہے۔ اور مجھے بھی اپنا دوست تصوّر کیجیے، آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

میں نے کوئی بات نہ کی۔

ہم دونوں لاؤنج سے اُٹھ کر مارگریٹ کے کمرے میں آ گئے۔

مارگریٹ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کے سامنے کچھ فاصلے پر اعجاز اُس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے جواب میں مارگریٹ نے کہا:

"جاؤ، خدا کے لیے جاؤ! میں تنہائی چاہتی ہوں۔"

میجر ممتاز نے اندر داخل ہوتے ہی کہا:

"اعجاز چلو۔ تمام مسائل حل ہو گئے ہیں۔"

اعجاز چُپ چاپ باہر نکل گیا۔ میجر ممتاز نے باہر نکلتے ہوئے کہا:

"گڈ بائی، مِس زنگولا! چیریو، مسٹر سعید۔"

ہم نے کوئی جواب نہ دیا۔

اُن کے جانے کے بعد ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ سورج غروب ہو چکا ہے اور کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اور ہم میں سے کسی نے بجلی کا بلب روشن نہیں کیا اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ جب ہمیں معلوم ہوگیا کہ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا ہے

اور ہم میں سے کسی نے بجلی کا بلب روشن نہیں کیا، تو پھر بھی ہم میں سے کسی نے بجلی کا بلب روشن نہیں کیا۔ اور کمرے میں اندھیرا بالکل نہیں تھا اور مارگریٹ کے جسم کی چاندی پگھل پگھل کر تاریکی کے ذرّوں میں اُتر گئی تھی اور تاریکی کے ذرّے افشاں بن بن کر اُڑنے پھر رہے تھے۔ اور پھر مارگریٹ کے جسم کا مرمر ٹوٹ ٹوٹ کر تاریکی کے غاروں میں گرنے لگا۔ اور فرہاد کے تیشوں کی ضربوں نے تاریک پہاڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور دودھ کی نہر نکل کر بہنے لگی۔

اور پھر مارگریٹ کا جسم رات کو دن بنانے کے لیے سورج کی شعاعیں بن کر مارگریٹ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اور مارگریٹ نے گھبرا کر پکارا:

"سعید! سعید! اُٹھو اب۔ دفتر نہیں جاؤ گے کیا؟"

اس کے بعد میں دفتر سے غیر حاضر رہنے لگا۔ دفتر دیر سے جانے لگا۔ اپنا سارا وقت مارگریٹ کے ساتھ گزارنے لگا۔ اور جب دو مہینے تک میں گھر نہ گیا تو ایک دن میرے باپ نے مجھے ٹیلیفون کیا:

"سعید، یہ مارگریٹ زنگولا کون ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"ڈیڈی، یہ ایک جرمن لڑکی ہے۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اگر آپ اس کو دیکھنا چاہتے ہیں تو میں آج شام کو اُسے لے آؤں گا۔"

"نہیں۔" اُنھوں نے ڈانٹا۔ "میں اُس کو نہیں دیکھنا چاہتا، تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے تین چار مہینے سے تمھاری شکل نہیں دیکھی۔ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں ہو؟"

میں نے کہا: "کراچی میں۔"

اُنھوں نے کہا: "آج شام کو میرے ساتھ چائے پیو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

میں نے ڈیڈی کے ساتھ چائے پینے کا وعدہ کر کے ٹیلیفون کاٹ دیا۔

پھر میں نے مارگریٹ کو اس کے ہوسٹل میں ٹیلیفون کیا اور کہا:

"میگی، ڈارلنگ، آج شام کو میں تمھارے ساتھ چائے نہیں پی سکوں گا۔ آج شام کو ہائی کورٹ میں تمھارا اور میرا مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔"

وہ گھبرا گئی اور پوچھنے لگی:

"کیسا مقدمہ؟ کیا بات ہو گئی؟"

میں نے کہا:

"آج ڈیڈی ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ آج وہ مجھے یہ بتانے والے ہیں کہ میں تم سے شادی کر سکتا ہوں یا نہیں۔"

میگی یہ خبر سن کر تشویش میں پڑ گئی۔ لیکن میں نے اُسے یقین دلایا کہ فیصلہ اگر ہمارے حق میں نہ ہوا تو بھی یہ ہمارے حق میں ہوگا۔

شام کو چائے کی پیالی سے ایک گھونٹ پی کر میرے باپ نے کہا :

"تمھارے ادارے نے شکایت کی ہے کہ تم دفتر کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے، دفتر دیر سے جاتے ہو اور اکثر غیر حاضر رہتے ہو اور اس کی ذمّہ دار ایک جرمن لڑکی مارگریٹ زنگولا ہے۔ کیا یہ سچ ہے ؟"

میں نے کہا :

"ہاں۔"

وہ میرے اس بے خوف، بے ساختہ جواب سے کسی قدر چیں بجبیں ہو گئے، اور تھوڑی دیر سوچ میں ڈوبے ہوئے چائے پیتے رہے پھر بولے :

"اور میں نے سُنا ہے تم اس جرمن لڑکی سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہو ؟"

میں نے جواب دیا :

"ہاں۔"

اب وہ واضح طور پر ناراض تھے لیکن اپنی ناراضگی کو دبا رہے تھے۔ اُنھوں نے پُوچھا :

"عذرا کو معلوم ہے ؟"

میں نے جواب دیا :

"عذرا اور مارگریٹ میں بڑی دوستی ہے۔ عذرا مارگریٹ کو بہت پسند کرتی ہے۔ وہ صاف کہتی ہے کہ مارگریٹ میرے لیے اس سے بہتر بیوی ثابت ہو گی۔ وہ کہتی ہے کہ وہ ڈاکٹر ہے اُس کا زیادہ وقت مریضوں، ہڈیوں، گوشت، خُون اور پیپ میں صرف ہوگا اس لیے وہ صرف پارٹ ٹائم بیوی ہو گی۔ اور اس کے مقابلے میں مارگریٹ ایک مکمل فُل ٹائم بیوی ہو گی۔ عذرا کو ہماری شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ اُس نے بڑی فراخدلی سے میری اور مارگریٹ کی فیملی ڈاکٹر ہونے کی پیشکش کی ہے۔"

ظاہر تھا کہ میرے باپ کو میری چرب زبانی پسند نہیں آئی۔ وہ کُچھ دیر چُپ رہے پھر بولے :

"مُمکن ہے عذرا کو یہ بات پسند ہو لیکن عذرا کے والدین کو تمھاری آوارگی پسند نہیں، اور میں نے تمھیں آج یہاں صرف یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ تمھیں فوراً ان حرکتوں سے باز آنا ہو گا۔ ورنہ ـــــ"

میں نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا :

"ڈیڈی، جہاں تک ورنہ کا تعلق ہے اس کا حق صرف عذرا کو تھا۔ اُس نے مجھے بڑی خندہ پیشانی سے اس کی اجازت دے دی ہے ـــــ"

ڈیڈی کا غُصّہ یکایک چمک اُٹھا اور وہ میری بات کاٹ کر بولے :

"بیوقوف، تم عورت کی نفسیات سے واقف نہیں ہو، تمھاری ماں نے بھی مجھے خندہ پیشانی سے ایک انگریز لڑکی سے شادی کی اجازت دے دی تھی اور پھر وہ چُپ چاپ اپنی زبان کھولے بغیر اسی غم میں گھُل گھُل کر فوت ہو گئی۔"

مجھے یکایک اپنی ماں یاد آگئی۔ اور میں آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگا اور اس کوشش میں دیر تک چپ بیٹھا رہا پھر جب میں نے اپنے آپ پر پوری طرح قابو پالیا تو بولا :

"میں جانتا ہوں، میری ماں بہت نوبل عورت تھی۔ عذرا بھی میری ماں کی طرح نوبل ہے۔ عذرا بھی میری ماں کی طرح خوبصورت، پاکیزہ اور سادہ لوح ہے، عذرا کا رنگ بھی میری ماں کی مانند پنجاب کی زرخیز مٹی کی طرح سنہری ہے۔ اس لیے میں عذرا پر وہ ظلم نہیں ہونے دوں گا جو آپ نے میری ماں پر کیا۔ میں اس کے سنہری جسم پر کسی سفید عورت کے سنگ مرمر کا مقبرہ نہیں بنانا چاہتا۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ سفید قوم کی عورت میرے لیے ایک بے پناہ جاذبیت رکھتی ہے۔ میں اپنے اس کومپلکس کا تجزیہ نہیں کر سکا ہوں۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہے؟ شاید یہ آپ کا وہ سفلہ حیوانی جذبہ ہے جس نے میری معصوم ماں کو ایک سفید عورت کے قدموں میں کچلے جانے کے لیے پھینک دیا تھا اور اب وہ آپ کے خون سے میرے خون میں داخل ہو گیا ہے۔ یا شاید وہ رنگدار قوموں کی وہ انگڑائی ہے جو انھوں نے غلامی کی صدہا سال کی نیند سے بیدار ہو کر لی ہے۔ یا پھر یہ وہ انتقامی جذبہ ہو گا جو دشمن کی عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جانے میں تسکین پاتا ہے۔ یا شاید یہ خواہش اس بات کا سمبل ہے کہ اب رنگدار قومیں سفید قوموں کے نیچے نہیں ہیں بلکہ سفید قومیں رنگدار قوموں کے نیچے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیا ہے؟ لیکن ہے۔ عذرا سے شادی کر کے مجھے خوشی ہو گی لیکن مارگریٹ زنگولا سے شادی کر کے مجھے فتح کا احساس ہو گا۔"

میرے باپ نے طنز یہ لہجے میں جواب دیا :

"تمھاری اس عالمانہ، فاضلانہ اور فلسفیانہ تقریر سننے کے بعد میرا فیصلہ یہ ہے کہ تمھاری شادی عذرا سے ہو گی، اور تمھیں مارگریٹ زنگولا کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے کراچی سے باہر بھیج دیا جائے گا۔"

چنانچہ ادارے نے میرے باپ کی درخواست پر میرا تبادلہ ڈھاکے کا کر دیا۔

تبادلے کی خبر سن کر میں نے استعفیٰ لکھ دیا اور مارگریٹ کو دکھایا۔ مارگریٹ نے اس کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس نے کہا مجھے ڈھاکے چلا جانا چاہیے۔ اگر ضروری ہوا تو وہ ملازمت چھوڑ کر ڈھاکے آجائے گی اور ہم دونوں ڈھاکے میں شادی کر لیں گے۔

میں ڈھاکے چلا گیا۔

ایک ہفتے کے بعد مارگریٹ بھی لمبی چھٹی لے کر ڈھاکے میں آگئی۔

ہمارا ڈھاکے کا قیام رومان کے طوفانوں کا زمانہ تھا لیکن اس طوفانی زمانے میں بھی ہم اپنے شادی کے منصوبوں پر غور کرتے رہے۔ ان منصوبوں میں سب سے اہم خاندانی منصوبہ بندی کا منصوبہ تھا۔ ہم دونوں زیادہ بچوں کے خلاف تھے اور ہمارے پروگرام میں پہلا بچہ شادی کے پانچ سال بعد تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے ڈھاکے کو شادی کے لیے مناسب مقام نہ سمجھا۔ اور یہ طے ہوا کہ مارگریٹ ملازمت نہ چھوڑے گی۔ وہ چھٹی ختم ہونے کے بعد واپس کراچی چلی جائے گی اور میں کراچی کا تبادلہ کرانے کی کوشش کروں گا۔ کراچی میں ہم دونوں سول میرج کر لیں گے۔

لیکن مارگریٹ کے کراچی آنے سے ایک ہفتہ پہلے حالات نے یکایک اپنا رُخ بدل دیا۔
ہزار احتیاط کے باوجود خاندانی منصوبہ بندی ہمیں چکمہ دے گئی۔
ایک دن جب میں دفتر سے اُس ہوٹل میں پہنچا جس کے ایک کمرے میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے، تو میں نے مارگریٹ کو پلنگ پر دہشت زدہ نڈھال لیٹا ہوا پایا۔

میں نے پوچھا:
"میگی، ڈارلنگ کیا بات ہے؟"
میگی نے جواب دیا:
"میں ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ اب ہمیں وقت سے پہلے شادی کرنی پڑے گی۔"
میں نے حیران ہو کر پوچھا:
"کیوں؟"
اس کے جواب میں اُس نے میرے مُنہ پر اُلٹی کر دی۔ جب میں نے اپنا مُنہ پیچھے ہٹا لیا تو اُس نے میرے سوٹ پر اُلٹی کر دی اور جب میں پلنگ سے اُٹھ کر بھاگ گیا تو اُس نے بستر پر اُلٹی کر دی اور پھر نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔
میں نے تولیے سے اپنے سوٹ کو اور بستر کو صاف کرتے ہوئے کہا:
"گھبراؤ مت، میگی، اس کے کراچی میں بہت علاج ہیں۔"
اُس نے ماتھے پر اُلٹا ہاتھ رکھے ہوئے اور آنکھیں بند کیے ہوئے جواب دیا:
"اس کا صرف ایک علاج ہے۔ شادی۔"
میں نے اُس کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:
"پاگل میگی، ہمارے پروگرام میں تو بچہ شادی کے پانچ سال بعد ہے۔ شادی سے پہلے نہیں۔"
اُس نے پوچھا:
"پھر آپ اب کیا کریں گے؟"
میں نے جواب دیا:
"تم کل صبح کے پلین سے کراچی جاؤ گی۔ تمہارا پلین اُڑ جائے گا تو میں عذرا کو ٹرنک کال کروں گا۔ عذرا تمہیں شام کو ہوسٹل میں ملے گی۔ تمہاری چھٹی ختم ہونے میں ابھی ایک ہفتہ ہے۔ تم ایک ہفتہ ہوسٹل میں آرام کرو گی۔"
اُس نے پوچھا:
"اور تم؟"
میں نے کہا:

"میں بھی دو چار دن میں کراچی پہنچ جاؤں گا اور جب میں کراچی پہنچوں گا تو تم تندرست ہو چکی ہو گی۔"

اس نے کوئی بات نہ کی۔ ماتھے پر اُلٹا ہاتھ رکھے ہوئے وہ لیٹی رہی۔ وہ کسی اضطراب میں مُبتلا معلوم ہوتی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ کیا کہے۔

آخر وہ بولی:

"مجھے اُمید ہے آپ مجھے اپنے بچے کو قتل کرنے کے لیے نہیں کہیں گے۔ میں اپنے بچے کی قاتل نہیں بننا چاہتی۔"

میں نے اس بحث کو طول دینا پسند نہ کیا۔ یہ موضوع اس کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ میرا خیال تھا وقت اور میری کوشش آخر اس کو اس پر آمادہ کر لیں گے۔ میں چُپ ہو گیا۔

دُوسرے دن صبح کے پلین سے مارگریٹ کراچی کے لیے پرواز کر گئی۔

تین دن تک مجھے مارگریٹ اور عذرا کے خطوط کا شدید انتظار رہا۔

پہلے عذرا کا خط آیا۔ اُس نے لکھا: میں شام کو مارگریٹ کے ہوسٹل میں گئی تھی۔ وہ بڑی مغموم تھی۔ علاج سے اُس کی اُلٹیاں وغیرہ تو ٹھیک ہو گئی ہیں لیکن وہ تمہاری ہدایت پر کسی صورت میں بھی عمل کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ وہ کہتی ہے تم نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ تم جلدی ہی کراچی میں آ کر اُس سے شادی کر لو گے۔ وہ تمہارے آنے سے پہلے میرے ساتھ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔

عذرا کے ایک دن بعد مارگریٹ کا خط آیا۔ اُس نے لکھا: میں خط لکھنے کے مُوڈ میں بالکل نہیں ہُوں، مجھے تمہارا سخت انتظار ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق شام کو عذرا آئی تھی۔ کتنی اچھی لڑکی ہے۔ اُسی دن سے میرے علاج میں مُنہمک ہے۔ اُلٹیاں بند ہو گئی ہیں۔ کمزوری بھی رفع ہو رہی ہے۔ عذرا کو تم نے جس کام پر لگایا ہے، وہ نہیں ہو گا۔ وہ کام تو صرف تم کر سکتے ہو۔ جلدی آؤ اور مجھے اس مصیبت سے رہائی دلاؤ۔

میں نے عذرا کو لکھا: کوشش جاری رکھو، آخر مان جائے گی۔ اگر ضرورت پڑے تو بے شک یہ بھی کہہ دو کہ میں اس حالت میں اُس سے شادی نہیں کروں گا۔

مارگریٹ کو میں نے لکھا: بیوقوف نہ بنو۔ اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا یہ سوچو کہ اگر شادی کے فوراً بعد ہم ہنی مون پر جانے کی بجائے لیڈی ڈاکٹر کے کلینک کے چکر کاٹنے لگیں تو شادی کا کیا لُطف رہا۔ مجھے ابھی چھٹی نہیں ملی۔ بے حد کوشش کر رہا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے میں جٹ طیارہ بن کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں لیکن میں اس مصیبت سے تمہیں رہائی نہیں دلا سکتا۔ اس مُصیبت سے صرف عذرا انہیں بچا سکتی ہے۔

میں نے لمبی چُھٹی کی درخواست کی۔ وہ منظور نہ ہوئی۔ پھر تبادلے کی درخواست کی۔ وہ بھی منظور نہ ہُوئی۔ میں نے دفتر کے کاموں میں دلچسپی لینا قطعاً بند کر دیا۔ اکثر دفتر سے غیر حاضر رہتا۔ بیمار بن کر اپنے کمرے میں پڑا رہتا اور مارگریٹ اور عذرا کے خطوں کا انتظار کرتا رہتا۔

مارگریٹ کے ہر خط میں میری ہدایت پر عمل کرنے سے انکار اور میرے شدید انتظار کا ذکر ہوتا۔ اور عذرا کے ہر خط میں اس کی ناکام کوششوں کا تذکرہ ہوتا۔

میں ہر وقت اُداس، خاموش اور ناراض رہنے لگا۔ سخت چڑچڑا ہو گیا۔ ذرا ذرا سی بات پہ لڑ پڑتا۔ ایک شخص کو میں نے دھمکی دی کہ میں اس کے دانت توڑ دوں گا لیکن جب میں نے اُس کے دانت توڑنے کے لیے اس کے جبڑے پر مکا مارا تو اُس کے دانت سخت نکلے اور میرا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ اور میں چار دن دفتر نہیں گیا۔

عذرا اور مارگریٹ کے خط آتے رہے۔

میں ان خطوں کا جواب دیتا رہا۔

اُن خطوں میں اصرار، انکار اور انتظار پر مختلف زاویوں سے بحثیں ہوتی تھیں اور میرے خطوں میں مستقل طور پر "مجھے چھٹی نہیں ملتی، مجھے چھٹی نہیں ملتی" کی گردان ہوتی تھی۔

یکایک عذرا کے ایک خط نے مجھے تشویش میں ڈال دیا۔

عذرا نے لکھا: مارگریٹ نہیں مانتی۔ آخر میں نے اُسے کہہ ہی دیا کہ اس حالت میں سعید تم سے شادی نہیں کرے گا۔ اُس نے اس کا عجیب جواب دیا۔ وہ بولی، اس حالت میں وہ اس یتیم بچے کو خود پالے گی۔ اسے یہاں سے جرمنی لے جائے گی اور جب لوگ پوچھیں گے تو کہے گی کہ اِس بچے کا باپ فوت ہو گیا ہے۔

مجھے یہ خط پڑھ کے پہلے تو بڑا صدمہ ہوا پھر غصہ آیا اور اس غصے میں میں سیدھا اپنے افسر انچارج کے پاس گیا اور غصے سے کانپتا ہوا بولا: مجھے ایک مہینے کی چھٹی کی سخت ضرورت ہے۔ میرے افسر انچارج نے غصے کے ساتھ جواب دیا کہ مجھے ابھی چھٹی نہیں مل سکتی۔ میں غصے سے بھرا ہوا واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور مارگریٹ کو ایک طویل خط لکھا جس کے ہر لفظ سے غصہ ٹپکتا تھا۔ اس کے جواب میں مارگریٹ کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے مجھے خط لکھنے بند کر دیے۔

آخر میں نے عذرا سے پوچھا: میگی نے مجھے خط لکھنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ وہ کہیں زیادہ بیمار تو نہیں ہو گئی ہے۔

عذرا نے جواب دیا: نہیں وہ اب تندرست ہو گئی ہے۔ اب اُس کے بہت سے نئے نئے دوست بن گئے ہیں۔ ان کے ساتھ گھومتی پھرتی رہتی ہے۔ تمھیں خط لکھنے کے لیے کہتی ہوں تو جواب دیتی ہے کہ تم نے ایک خط میں اُس کی انسلٹ کی ہے اور جب تک تم اُس سے معافی نہیں مانگو گے وہ تمھیں خط نہیں لکھے گی۔

میں یہ خط پڑھ کے غصے سے لال پیلا ہو گیا۔

میں نے جواب دیا: عذرا، تم میگی کو ایسی حرکتوں سے منع کیوں نہیں کرتیں؟

عذرا نے جواب دیا: میں میگی کو ان حرکتوں سے باز رکھنے کے لیے شروع سے ہی کوششیں کر رہی ہوں، اس سلسلے میں ایک دفعہ اُس نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی جو میں تمھیں نہیں بتا سکتی۔

میں یہ خط پڑھ کے سٹپٹا گیا اور اُسی وقت جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

میں نے لکھا : عذرا فوراً بتاؤ وہ بات کیا ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو؟ اور میگی سے کہہ دو کہ اگر وہ میری اجازت کے بغیر کسی کے ساتھ آوارہ پھرے گی تو میں اس کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔

عذرا نے جواب دیا : میں تمھیں یہ بات بتا رہی ہوں اچھا نہیں کر رہی ہوں۔ بہت دنوں سے میں اس شرمناک بات کو اپنے سینے میں چھپائے پھر رہی ہوں۔ اب جو تم مجبور کر رہے ہو تو لکھ دیتی ہوں۔ میں نے میگی سے کہا : میگی، سعید تمھارا ان لڑکوں کے ساتھ بے تکلفی اور بے حیائی سے گھومنا پسند نہیں کرے گا۔ میگی نے جواب دیا : عذرا، مجھے یقین ہے سعید مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ اس لیے میں ان لڑکوں میں کوئی ایسا جانباز دوست ڈھونڈ رہی ہوں جو اپنے نام و ناموس کی قربانی دے کر میرے بچے کا باپ بننا قبول کرلے اور مجھ سے شادی کرے۔

میں یہ خط پڑھ کے اپنے آپ سے باہر ہوگیا اور بھاگا ہوا اپنے افسر انچارج کے پاس گیا اور بولا :

"جناب، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرا استعفےٰ اجلدی منظور ہوگا یا چھٹی کی درخواست؟"

میرے افسر انچارج نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا :

"چھٹی کی درخواست۔"

میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا :

"شکریہ۔"

اور باہر جانے کے لیے مڑا۔

افسر انچارج نے کہا :

"ہمیں آپکے والدصاحب اور ہیڈ آفس کی طرف سے ہدایت تھی کہ آپ کو رخصت نہ دی جائے لیکن آج معلوم ہوتا ہے کہ مس مارگریٹ ذنگولا کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

میں نے کہا :

"جی ہاں، شکریہ۔ میں رات کے پلین سے کراچی جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اجازت مل گئی۔

پلین پر سوار ہونے سے پہلے میں نے عذرا کو ٹرنک کیا، اور ٹیلیفون پر اُسے کہا :

"عذرا، کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں آرہا ہوں، خصوصاً میگی کو۔ تم اپنے گھر پر میرا انتظار کرنا۔ باہر جانے کے لیے تیار رہنا میں ٹیکسی میں آؤں گا۔ تمھارے بنگلے کے سامنے اُتروں گا۔ اندر نہیں آؤں گا۔ جب تمھاری نظر مجھ پر پڑ جائے تو کسی بہانے سے کار سے کر باہر آجانا۔ لیکن نہیں، ٹھہرو، شاید یہ مشکل ہو۔ تم ایسا کرنا کہ اپنی سہیلی یاسمین کے گھر میں سٹڈی کے بہانے سے کار لے کر پیراڈائز سینما کے سامنے میرا انتظار کرنا۔ نہیں نہیں یہ بھی ٹھیک نہیں۔ میرا خیال ہے تم میٹرو پول ہوٹل کے سامنے آجانا۔ میں اپنا سامان ہوٹل میں رکھ کر تمھارے ساتھ نکل جاؤں گا اور آج مارگریٹ کی حرکات و سکنات کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ تمھیں یہ بتانا ہوگا کہ آج رات کو

مارگریٹ کہاں ملے گی اور تمھیں ہوائی جہاز کی آمد کا وقت تو معلوم ہوگا، ساڑھے گیارہ بجے رات کو (ہیلو، ہیلو، تین منٹ ختم ہوئے) او کے، او کے ——— او کے عذرا، گڈ بائی۔

پلین گیارہ بج کر چالیس منٹ پر کراچی میں پہنچا۔

بڑی اندھیری رات تھی اس لیے ایرپورٹ کی روشنیاں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے زخموں پر پھاہے رکھے ہوئے ہیں۔

ایک لوڈر میرا سامان اٹھا کر گیٹ پرلے گیا۔

گیٹ پر عذرا کار لیے کھڑی تھی۔

میں چیخا:

"او ——— ہیلو عذرا ——— کیسی ہو ——— یہ تمھیں کیسے سوجھی؟"

اس نے ہنس کر جواب دیا:

"کیا میں تمھاری طرح بے وقوف ہوں۔ ٹیلیفون پر چیخ رہے ہیں: پیراڈائز سینما پر آجانا، میٹروپول ہوٹل کے سامنے ملنا۔ ارے بھئی یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایرپورٹ پر آجانا۔"

لوڈر نے سامان ڈگی میں رکھ دیا۔

میرا خیال تھا وہ مجھے کار چلانے کے لیے کہے گی لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ جب میں خود ڈرائیور کی سیٹ کی طرف بڑھا تو وہ مجھ سے پہلے اس پر بیٹھ گئی۔

کار سٹارٹ کرتے ہی اس نے کہا:

"جناب بالکل بوکھلا گئے ہیں اور کار چلانے کے قابل نہیں ہیں، اسی لیے میں جناب کو وہ بات نہیں بتانا چاہتی تھی۔"

میں نے پوچھا:

"میگی، آج کہاں ہے، اپنے ہوسٹل میں یا کہیں اور؟"

اس نے جواب دیا:

"میں آج شام کو اس کے پاس گئی تھی، وہ کہتی تھی آج اس کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ وہ بڑی فکرمند ہے۔ اب تمھیں اس سے شادی کر لینی چاہیئے۔ تم نے اسے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے کہا:

"میں یقیناً اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ میری ہدایت پر عمل کیوں نہیں کرتی۔ اسے خوش ہونا چاہیئے کہ اس کی اور میری ایک دوست لیڈی ڈاکٹر ہے اور ہماری اس مصیبت میں ہماری مدد کرسکتی ہے۔ میں اس سلسلے میں ابھی اسی وقت اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر اس نے عقل سے کام لیا تو کل میدان صاف ہوجائے گا اور ہماری آئندہ زندگی ہنسی اور خوشی سے گزرے گی۔"

میٹروپول ہوٹل پر پہنچ کر میں نے اپنا سامان اپنے کمرے میں رکھا اور پھر عذرا کے ساتھ کار میں آکر بیٹھ گیا اور ہم میگی کے ہوسٹل

کی طرف روانہ ہوگئے۔

ہوسٹل کے گیٹ پر میں نے عذرا سے کہا:

"تم کار میں بیٹھو میں میگی کے فلیٹ میں میگی کو دیکھ آتا ہوں۔ اگر وہ اپنے فلیٹ میں ہوئی تو میں تمھیں اُوپر سے جاؤں گا نہیں تو واپس آجاؤں گا اور ہم اُس کو کسی اور جگہ ڈھونڈیں گے۔"

میں لکڑی کی سیڑھی سے آہستہ آہستہ اُوپر چڑھنے لگا۔

میگی کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے پھر گھنٹی بجائی، کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دیر تک گھنٹی کا بٹن دبائے رکھا گھنٹی دیر تک بجتی رہی۔ میگی غصّے میں چلّائی:

"کون ہے؟ میں سو رہی ہوں۔"

اس کے جواب میں میں نے دیر تک گھنٹی کا بٹن دبائے رکھا۔

کھٹک سے سوئچ آن ہوا۔ کمرے میں روشنی ہوگئی۔ میگی نے دروازے کا بولٹ کھول کر تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ کمرے سے روشنی نکل کر میرے مجسّمے سے ٹکرائی۔ میگی ڈریسنگ گاؤن میں میرے سامنے آگئی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران پریشان ہوگئی۔ وہ چلّائی:

"اوہ ـــــ سعید ـــــ ٹھہرو میں ننگی ہوں۔"

اُس نے دھڑاک سے دروازہ بند کر لیا اور بولٹ لگانے لگی۔ میں نے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ دروازہ پُوری طرح کھُل گیا۔ میگی تیزی سے کھُلنے والے دروازے کے ساتھ ٹکرا کر فرش پر جا گری اور ڈریسنگ گاؤن جو اُس نے باندھنے کی بجائے اپنے ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا، اُس کے جسم سے الگ ہو کر فرش پر پھیل گیا۔

اب میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر کمرے کا جائزہ لیا اور میرے خون کے لاوے میری کھوپڑی کو پھاڑ کر باہر نکلنے کے لیے گڑگڑانے لگے۔

میرے سامنے میگی کے پلنگ پر کیپٹن اعجاز اپنے ننگے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں کسی خونخوار بھیڑیے کی طرح اُس کی طرف بڑھا۔ اُس کے جبڑے پر ایک زور کا مکّا لگایا جب میں نے اُسے دُوسرا مکّا مارنے کی کوشش کی تو وہ پلنگ کی دُوسری طرف اُتر گیا اور میں اپنا توازن کھو کر پلنگ پر گر گیا۔ اس مہلت کا فائدہ اُٹھا کر وہ بھاگتا ہوا سیڑھیوں سے اُتر گیا۔

اس اثنا میں میگی نے اُٹھ کر اپنا ڈریسنگ گاؤن باندھ لیا اور کہنے لگی۔

"سعید ڈارلنگ، تمھیں کیا ہوا ہے؟ ہوش میں آؤ؟"

میں نے اس کو ڈریسنگ گاؤن کے کالروں سے پکڑ لیا اور اس کے پیٹ پر پاگلوں کی طرح دھڑا دھڑ مکّے مارنے لگا۔ میگی پہلے چند مکّوں کے عذاب میں درد سے کراہی پھر اُس کی آواز اُس کے گلے میں پھنس گئی۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی اور اُس کا

خُون جاری ہوگیا۔
عذرا نے کیپٹن اعجاز کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ بھاگتی ہوئی میگی کے کمرے میں آئی اور انتہائی غصے میں مجھ سے مُخاطب ہو کر بولی:
"سعید کے بچے، بیوقوف، احمق، یہ تُم نے کیا کیا؟"
اُس نے میگی کو اُٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔
میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح کھڑا ہوگیا اور گرجدار آواز میں بولا:
"عذرا، آج میں نے ایک سفید عورت سے اپنی ماں کا انتقام لے لیا۔ آج میں نے سفید قوموں سے سیاہ قوموں کا قرضہ وصول کر لیا۔"
عذرا نے مجھے غضب آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا:
"بکواس بند کرو۔ کبھی سستے ناول کا ہیرو بننے کی کوشش مت کرو اور پولیس کے آنے سے پہلے یہاں سے بھاگ جاؤ۔ میں ایمبولنس کے لیے ٹیلیفون کرتی ہوں۔ میگی کو ہسپتال لے کر جا رہی ہوں، ابورشن کا کیس رجسٹر کرا کے اس کے علاج کا انتظام کروں گی۔"
عذرا نے ایک ہفتہ تک انتہائی تن دہی سے ہسپتال میں مس مارگریٹ زنگولا کی تیمار داری کی۔ ہسپتال کے پہلے دن مارگریٹ کی جان بچانے کے لیے تازہ خُون کی ضرورت تھی۔ ٹیسٹ میں معلوم ہوا کہ عذرا اور مارگریٹ کا خُون ایک ہی کیٹیگری کا ہے۔ عذرا نے مارگریٹ کو ایک پاؤنڈ خُون دیا۔ اوکسیجن اور گلوکوز دیا گیا۔ عذرا نے اپنا تین دن کا آرام اور تین راتوں کی نیند بھی مارگریٹ پر نچھاور کر دی۔ مارگریٹ بچ گئی۔
اس دوران میں جرمن سفارت خانے کو اس جرمن لڑکی کی علالت کی خبر مل گئی۔ اس نے اس کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کے تمام اخراجات اپنے ذمے لے لئے اس لیے جب وہ اچھی ہوگئی تو وہ ہمارے ادارے میں واپس نہیں آئی۔ جرمن سفارت خانہ کے ذریعے جرمنی واپس چلی گئی۔

* * *

سعید اپنی شادی سے ایک دن پہلے ایک ہوٹل کی پُر فضا لان میں اپنے چند دوستوں کو یہ کہانی سُنا رہا تھا۔ دوسرے دن عذرا سے اُس کی شادی ہونے والی تھی۔

———

کچھ باتیں، کچھ یادیں

ابوالفضل صدیقی

مغلوب کرنے اور جسمانی طاقت اور دماغی قوت کے ذریعہ دوسرے پر غلبہ پانے کا جذبہ بڑا خوش آئند ہے۔ یہ ہر جاندار میں خلقی طور پر ودیعت ہے۔ انسانی خمیر میں یہ یوں زیادہ شدید ہے کہ تمام تر مخلوق میں تنہا وہی زیورِ عقل سے آراستہ ہے۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ عہدِ ماورا التاریخ میں آدمی کو شکاری بننے اور شکار کو معاشی مشغلہ کے طور پر اختیار کرنے پر اسی جذبہ نے اکسایا ورنہ جنگل میں نباتاتی غذاؤں کی کمی نہ تھی۔ اس کی عقل کی رسائی جوں ہی پتھر کی نوک کے عمل تک ہوئی اس نے جنگلی جانور کو للکار دیا اور اس طرح نباتات کے ساتھ گوشت کی لذت سے آشنا ہوا اور اس کو بھی اپنی غذا میں شامل کر لیا۔ اس سے ہم خرما و ہم ثواب فطری جذبہ کو بھی تسکین پہنچی اور مجرب مال بھی کھانے کو ملا۔ آج بھی مذاقِ سلیم رکھنے والے صحت مند اور خوش فکر انسان اکثر و بیشتر اپنے اندر ذوقِ طلب و جستجو، مناظرِ فطرت سے دلچسپی، جنگلوں، دریاؤں، پہاڑوں سے دلبستگی، صحرائی جانوروں کے رہن سہن اور ان کی جبلت کے متعلق معلومات سے تھوڑا بہت لگاؤ، خالص اور صحیح موسمی کیفیات کے مطالعہ کا رجحان رکھتے ہیں اور حالات کے اجازت دینے پر اپنی فکر و استعداد کے مطابق اس شوق کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کے اس پہلو کی یوں بھی تاویل کی جاسکتی ہے کہ انسانی تمدن کا قافلہ ابتدائی اشتراکیت کا فطری نظام لے کر یہیں سے چلا تھا اور پُرخلوص دیہات اور شاداب کھیتیوں سے گزرتا اور آدمی کو صالح انسانیت میں منظم کرتا، قومیت کی تشکیل میں ڈھالتا، جگمگاتے شہروں سے ہوتا اب ستاروں کی راہ پر گامزن ہے لہٰذا جنگل انسان کی جنم بھوم ہیں۔ ان کے اندر آج بھی معصوم سادگی اور شوخ حُسن کا پیارا امتزاج ہے، غضب کی ندرت اور بلا کا سکون ہے، دل آویز شیرینی اور سچی مسکراہٹ ہے، سناٹا اور ہُو ہے۔ یوں کہئے پتہ پتہ سے لے کر کیڑے کیڑے مکوڑے مکوڑے تک خلوص ہی خلوص ہے اور فطرت اپنے اصلی اور نسلی روپ میں دکھائی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم سچے فلسفیوں نے جب فکر و جستجو کی اک ندرا خاص اور قدرے بلند منزل کی جانب قدم بڑھایا تو انھوں نے جنگل ہی کی جانب رُخ کیا جہاں انھوں نے معرفت اور تلاش کے مدارج طے کیے اور علمِ لدُنّی سے مالا مال ہو کر بنی نوع کے لیے بہت کچھ دے کر پلٹے۔ اسی سلسلہ کی نادر سی کڑی شکار کا جذبہ بھی ہے۔ یہ پوری زنجیر کی اور سب کڑیوں سے بظاہر مختلف نظر آتی ہے اور شاید بہت سے پڑھنے والے یہ بات سُن کر چونک بھی پڑیں جو میں کہہ رہا ہوں لیکن مشرقی مفکرِ اعظم اور دانائے راز فلسفی کی عقابی نگاہ بڑی کامیاب پہنچی ہے۔ اس نے اس کڑی کو بھی فلسفہ کی کسوٹی پر پرکھ کر پوری طرح سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ اقبال کے یہاں شہباز و شاہین کی تمثیل فلسفہ کا ایک پہلو ہے بلندی پرواز

ان کے یہاں بلندیٔ جبلت ہے۔ وہ چکوروں کی دنیا کے بھی محرم تھے اور شاہین کی راہبانہ فطرت کے بھی شناسا تھے اور آشیانہ بندی سے بے نیازی کے ساتھ لہو گرم رکھنے کے بہانے شکار کھیلنے کے جذبہ سے بھی آشنا تھے اور کبوتر کے لہو کے مزے اور کبوتر پر جھپٹنے کے ولولے دونوں کی لذت کی تفریق کو اتنی ہی اچھی طرح پہچانتے تھے جتنا شاہین و شہباز خود۔ علامہ مرحوم کے ایک خط میں جو انہوں نے کسی دوست کو لکھا ہے مجھے شہباز و شاہین کے یہ فلسفیانہ پہلو پڑھ کر بڑی طمانیت محسوس ہوئی اور میں نے کبھی کبھی اپنی فکر و استعداد کے مطابق یہ محسوس کیا کہ یہ فلسفۂ عبادت و ریاضت کا جلالی پہلو ہے۔ پتہ نہیں کہ علامہ مرحوم نے یہ فلسفہ کس جگہ سے اکتساب کیا ورنہ وہ عملی طور پہ شکاری تو نہ تھے مگر ان کی بات میرے اندر گونجتی ہے اور جب میں شہباز و شاہین کے ساتھ پَر ملا کر ان کی برادری میں شامل ہوتا ہوں تو علامہ کی بات ایسی محسوس ہوتی ہے کہ ؏

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

ایک سچا شکاری پورا پورا اسپورٹس مین ہوا کرتا ہے یوں کہئے کہ جس جذبہ کو انگریزی اصطلاح میں "اسپورٹس مین لائک اسپرٹ" کہا جاتا ہے اور جو میرے تجربہ میں درویشیت، قلندریت کے ساتھ تھوڑی سی ملکوتی صفات کے مرکب کا نام ہے شکاری اس سے پوری طرح مالا مال ہوتا ہے اور انسانی ہمدردی کے جذبہ سے اتنا چُور ہوتا ہے اور بعض اوقات غریب سے سوسائٹی کے آداب و مصالح اور آئین کے فرائض تک کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہو جایا کرتی ہے۔ یوں تو ہر کھلاڑی میں ماحول اور حالات کے تحت اسپورٹنگ اسپرٹ پائی جاتی ہے مگر چونکہ شکار اسپورٹ کی ارفع ترین قسم ہے اور عسکری جذبہ کی پیداوار بلکہ یوں کہئے کہ ایک رُخ ہے اور خارجی طور پر بھی عسکریت سے بہت کچھ مماثل ہے لہٰذا اس کو بجائے شکار کے شہکار کہنا زیادہ مناسب ہے بلکہ ممکن ہے کہ لفظ شکار "شہکار" کی مسخ شدہ شکل ہو۔ کیونکہ اس عمل میں اسپورٹ اور عسکریت دو پاک جذبوں کا امتزاج ہوتا ہے جو اس کو بہت وقیع اور سنجیدہ چیز بنا دیتا ہے اور بہت کچھ ٹھوس اور اصلی ہوتا ہے۔ دوسرے کھیلوں کی طرح اس میں خود ساختہ اور بے معنی مفروضوں پہ مبنی آئین و ضوابط نہیں ہوتے جن کے سہارے تماشائی اور کھلاڑی اپنا دل بہلایا کرتے ہیں۔ شکاری، سپاہی، اسپورٹس مین اور فلسفی کے متناسب امتزاج کی تشکیل ہوا کرتا ہے۔

بعض کم فہم لوگ شکاری کی شدت کے ساتھ بڑھتی ہوئی اسپورٹنگ اسپرٹ اور جذبۂ انسانی ہمدردی کی یوں تاویل کرتے ہیں کہ چونکہ وہ جنگلی جانوروں کا خون بہاتا ہے لہٰذا یہ جذبہ اس کے ردِ عمل کی پیداوار ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو قصاب اور مچھیرے سب کے سب اولیا کے درجہ کے لوگ ہوا کرتے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا انسانی ہمدردی کے تحفظ میں کبھی کبھی وہ حقائق میں تمیز نہیں کر پاتا۔ مشہور و معروف شکاری جم کاربٹ کی زندگی کے ایک واقعہ سے اس جذبہ کی شدت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ موصوف نے کم و بیش بارہ سال کی عمر سے شروع کر کے پچھتر سال کی عمر تک شمالی ہند کے جنگلوں میں شکار کھیلا جس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ہمالیہ کی بلندیوں سے لے کر دامنوں تک اور اودھ فاریسٹ اور نیپال کی ترائی تک اور بڑی بڑی مہمات میں افریقہ کے خوفناک جنگلوں تک آدم خور درندوں کی بیخ و بُن مٹادی اور سب کچھ اپنا سر ہتھیلی پہ رکھ کر تنہا اپنی بے پناہ قوتِ بازو اور اپنی ہلکی جیب کے بل پر کیا۔ کسی راجے مہاراجے، نواب، جاگیردار تاجر سرمایہ دار کا ایک کارتوس بھی کبھی لینا گوارا نہ کیا حتیٰ کہ برٹش گورنمنٹ سے بھی بجز تھوڑی بہت چھوٹے اہلکاروں کی رہنمائی کے کوئی امداد نہ لی۔ خالص اور تنہا شکاری پیدا ہوا اور خالص اسپورٹس مین ہی اپنی طبعی موت مرا۔ اس کو ایک مرتبہ عجیب آزمائش سے گزرنا پڑا جو میرے اس دعو

کی بہترین "تائید ہے کہ ایک سچا شکاری انسانی ہمدردی کے جذبہ میں، کبھی کبھی سوسائٹی کے آداب اور آئین کی پابندی میں کوتاہی کر جاتا ہے اور فلسفی سا نظر آنے لگتا ہے۔ ہوا یہ کہ رسوائے عالم "سلطانہ ڈاکو (۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۹ء تک) ضلع بجنور — ایک خاص قسم کے قید خانہ سے، جو ایک مخصوص جرائم پیشہ خانہ بدوش قبیلہ کے لیے بنایا گیا تھا، فرار ہوا اور یوپی کے شمالی اضلاع سے لے کر پنجاب کے مشرقی حصوں تک ہندوستان کے ایک بڑے اہم حصے میں لوٹ مار اور آتشزدگی، قتل اور غارت گری سے قیامت برپا کر دی جس کی سرکوبی کے سلسلہ میں پورے ہندوستان کی پولیس حرکت میں آ گئی۔ فوج کے مخصوص حصّوں کی مدد بھی لی گئی جو اس کام کے لیے موزوں تھے مگر بڑے بڑے عیّار اور تجربہ کار پولیس والے اور مانے ہوئے بہادر فوجی افسر ناکام رہے۔ یہاں تک کہ اس کے مظالم کی آواز انگلینڈ کے پریس تک میں گونج اٹھی اور برٹش پارلیمنٹ کے سامنے مسئلہ کی شکل میں آ گئے اور بعض سیاسی مبصّرین اور فوجی ماہرین یہاں تک قیاس آرائی کرنے لگے کہ برٹش گورنمنٹ کو اس کے سامنے جھک کر صلح کی پیشکش کرنی پڑے گی اور اسے اس کی جولاں گاہ کا والی قرار دے کر اطاعت کر لینے پر آمادہ کرنا پڑے گا لیکن ایک آخری کوشش کے طور پر برٹش گورنمنٹ نے ایک نہایت ماہر تجربہ کار اور جری پولیس افسر فریڈی ینگ کو اس کی گرفتاری کے لیے متعین کیا اور تقریباً لامحدود اختیارات سونپ کر ہندوستان بھیجا۔ سلطانہ اور اس کے گینگ کے کئی آدمیوں کے سر کی قیمت ہزاروں روپیہ مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا۔ جم کاربٹ یوں تو جنگل کا کیڑا تھا لیکن مخصوص طور پر یہ جنگل جو سلطانہ ڈاکو کی جولاں گاہ تھا، جم کاربٹ کی شکارگاہ رہا تھا۔ چنانچہ انگریز یا انگریز GWTISY کے طور پر فریڈی ینگ نے جنگل میں رہنمائی کے لیے جم کاربٹ کی امداد حاصل کر لی اور اس سلسلہ کی ایک مہم پر جم کاربٹ کی معیت میں پولیس والے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں جنگل کے ایک نہایت گھنے ٹکڑے کے اندر ڈاکوؤں کی پارٹی چھپی ہوئی آرام کر رہی تھی۔ جنگل کے اس گھنے ٹکڑے کے اختتام پر ایک بلند درخت کی شاخوں میں ڈاکوؤں کا ایک دیدبان اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا حقّہ پی رہا تھا جس پر حسنِ اتفاق سے پولیس والوں کی نگاہ پڑ گئی اور وہ انہیں نہ دیکھ سکا۔ مگر یہ کم بخت اتنی بے ڈھب جگہ اور ایسے بے ڈھنگے زاویہ پر بیٹھا تھا کہ پوری پولیس پارٹی میں مع فریڈی ینگ کے ایک بھی ایسا قادر انداز نہ تھا جو یقینی طور پر اس کے گولی مار سکے لہٰذا فریڈی ینگ نے جم کاربٹ سے درخواست کی کہ وہ گولی مار دے۔ کم سے کم اس کے سر کی قیمت پانچ ہزار روپیہ ہوگی یا ممکن ہے کہ یہ دس ہزار والوں میں سے ہو مگر جم کاربٹ نے ٹھیک ٹھیک اسپورٹس مین والی قلندرانہ بیباکی سے جواب دیا "اگر آپ کہیں تو میں اس کے حقّہ کی چلم اڑا سکتا ہوں بلکہ سو فیصدی اس کے جوتے کی نوک پر گولی لگا سکتا ہوں لیکن اس کے جسم پر بندوق اٹھانے سے قاصر ہوں۔ یہ ایک آدمی کا جسم ہے" خیر یہ تو حد سے بڑھی ہوئی جذباتی سی مثال ہے، انگریزی اصطلاح میں جسے 'ٹرو اسپورٹس مین لائک اسپرٹ' (TRUE SPORTS MAN LIKE SPRIT) یہ چیز بہترین مجلسی شعور اور اعلیٰ ترین سماجی اقدار کی حامل ہوتی ہے اور چونکہ شکار اسپورٹ کی ارفع ترین قسم ہے لہٰذا اسی معیار کے مطابق یہ اسپرٹ اس کھیل کے اندر بدرجۂ اُتم موجود ہوتی ہے۔ اس عمل کے فلسفیانہ پہلو کو چھوڑیئے یوں بھی شکار نہایت ہی مخصوص آئینی پابندی اور بہی بے رحم جمالیاتی جذبہ کے تحت کیا جاتا ہے اور اس کے لطف کا راز جہاں اس کی مشکل پسندی اور ندرت میں ہے وہاں ان قواعد و ضوابط کی سخت پابندی میں بھی ہے جس میں ایک عامی کی نگاہ میں تو صرف چند موٹی موٹی چیزیں آ سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر چوپایوں اور حتی الوسع ان چڑیوں میں بھی جن میں نر و مادہ کی تمیز نمایاں طور پر ہو سکے خاص طور پر نر کا ہی شکار کرنا، جفتی اور پیدائش کے زمانہ میں

شکار ترک کر دینا ، مارنے سے قبل جانور کو اپنے بچاؤ اور مدافعت کا پورا موقع دینا ، اوچھی چوٹ سے پرہیز کرنا وغیرہ پابندیوں میں شکار کا حقیقی لطف پنہاں ہے۔ شکار ذرا سے " FOUL " میں اسپرٹ سے ہٹ کر قصابیت بن جاتا ہے۔ پھر شکاری میں جنگلی زندگی کی مشکلات اور تکالیف اور قباحتوں سے بجائے تکدر کے لطف اندوز ہونے کا مزاج ، مشاہدہ و باریک بینی ، مناظرِ فطرت اور جنگلی مخلوق و نباتات سے والہانہ لگاؤ ، ذکی الحسی وغیرہ جملہ امور کے ڈانڈے فلسفیوں کی زندگی سے جا ملتے ہیں۔

عکسی تصویر کشی کو جب ذرا ترقی اور مقبولیت حاصل ہوئی تو صحرائی زندگی اور مناظرِ فطرت کے شائقین کا اک ذرا کم سواد اور کوتاہ بیں گروہ یورپ کے اندر ایسا ابھرا جس نے بجائے ہتھیاروں کے صرف کیمرے سے تصویریں اتارنے کا مشغلہ ایجاد کیا۔ انگریزی زبان میں بندوق سے شکار کھیلنے اور کیمرے سے تصویریں اتارنے دونوں کے لیے ایک ہی لفظ " شوٹنگ " استعمال ہوتا ہے۔ لیکن دراصل جذبہ کے معاملہ میں دونوں میں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک صحرائی زندگی اور مناظرِ فطرت کے ذوق کا تعلق ہے انہیں اپنی فکر و استعداد اور زاویۂ نگاہ کے مطابق اس میں یک گونہ طمانیت ہو جاتی ہوگی لیکن یہاں پر پھر اسی مفکرِ اعظم فلسفی کا حوالہ دینا پڑتا ہے ع

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

کیمرے کی شوٹنگ بہت سیدھا سادہ ٹھنڈا اور بے جان سا عمل ہے اور بڑی حد تک اسپورٹ کی روح سے عاری ہے کیونکہ اس میں کھیل کا حرکی پہلو تقریباً مفقود ہے۔ اسپورٹ کا مخصوص ہیجان جو انسانی فطرت کے عین مطابق اور اس کی دلچسپی کا نقطۂ نظر ہوتا ہے اس کے اندر اگر پایا جاتا ہے تو بہت ہی کم اور تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہوتا ہوگا صرف عکاسی کرنے والے کی تنہا ذات تک محدود رہتا ہوگا ، حالانکہ ہر دو افعال میں بعض چیزیں بالکل مطابق بلکہ مماثل ہیں۔ صحرا نوردی اور دشوار گزار مقامات تک رسائی اور جنگلی درندوں کے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچ کر کامیاب سے کامیاب فوٹو اتارنے یا مہلک سے مہلک ضرب مارنے کی کوشش بلکہ کیمرے کی شوٹنگ میں برا وقت پڑنے پر مدافعت کا بھی سامان نہیں ہوتا اور ایک عکس کے ذریعہ ایک لمحہ کی یادگار ریکارڈ کر کے چپکے سے چلے آتے ہیں اور بس اس طرح اپنے ذوق کو تسکین دے لینا کچھ بے جان سی خود فریبی ہے ، اس کو اسپورٹ کا درجہ کیسے دیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات جانور کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کوئی آدمی میری تصویر چرا کر لے گیا۔ بندوق سے شوٹنگ میں شکار تک پہنچنے کے لیے تقریباً وہی یا اسی قسم کی ذرا مختلف صورتیں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ بالعموم شکاری کے حملہ سے پیشتر ہی جانور کو چیلنج ہو جاتا ہے ورنہ حملہ کے وقت تو بندوق کی آواز ہی چیلنج کر ہی دیتی ہے۔ پھر بندوق کا عمل ، ضرب ، دھماکہ اور چوٹ پڑنے یا نہ پڑنے دونوں صورتوں میں ادھر شکاری اور اس کے ساتھیوں کا ہیجان ادھر جانور کا ردِعمل جنھوں نے دیکھا ہے ان کا تو ذکر ہی کیا جنھوں نے نہیں دیکھا اس کا تصور کر کے ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ چیز جو اس ہنگامہ آرائی کے ساتھ دشوار گزار مقام پر پہنچ کر اور خود اپنی جان کو بھی تکلیف اور خطرہ میں ڈال کر پیدا ہوتی ہے کس قدر محرکِ جذبات اور عین منشائے فطرتِ انسانی ہوتی ہے اور پھر غلبہ و قوت اور فن کی فضیلت کا احساس ایک معرکہ کے شکار کے بعد کئی کئی روز تک ہلکے ہلکے سرور کی شکل میں رگ و پے کے اندر محسوس ہوتا رہتا ہے جیسے سچ مچ ساعت بھر میں تمام بدن کا خون نیا ہو گیا ہے۔ کیمرے کی شوٹنگ کو صرف مشکل اور نادر تصویر حاصل کرنے کا درجہ دے کر عام تصویر کشی سے ذرا امتیاز سطح دی جا سکتی ہے۔ اس

چیز نے بھی سرکس قسم کے فلموں کے سہارے اور سنیما کے طفیل کچھ ترقی کر لی حالانکہ فلم کے دھوکوں میں سے یہ بھی اکثر ایک قسم کا دھوکا ہی ہوتا ہے اور ناداں تماشائیوں کو احمق بنا کر جیب سے پیسہ حاصل کرنے کا ذرا نادر سا طریقہ ہے۔ تاہم ہمارے شہروں کے اندر مصنوعی ہی سہی صحرائی زندگی اور جنگلی جانوروں کی جبلت اور مناظرِ فطرت کی کچھ کچھ جھلک تو پہنچ جاتی ہے۔

قدیم قصے کہانیوں میں اکثر کوئی نوجوان شہزادہ یا بادشاہ یا سردار گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل میں شکار کا (بالعموم ہرن کا) پیچھا کرتے ہوئے بھٹک کر کسی صحرائی حسینہ کی کٹیا یا پھر کسی مافوق البشر نیم پری نیم شہزادی نسل کی حسینہ کے محل کے خیالی پائیں باغ میں سے گزرتا اس کے یاقوت و زمرد کے عالیشان خوبصورت محل میں بھوکا پیاسا تھکا ہارا جا پہنچتا ہے اور یہیں سے ہیرو ہیروئن جنم پا کر عشق و رومان کا سلسلہ چلنے لگتا ہے۔ ہماری بعض مثنویوں، داستانوں حتیٰ کہ عظیم فن پارہ شکنتلا کے ہیرو ہیروئن کو بھی شکار اور جنگل ہی نے جنم دیا ہے اور پھر یہاں تک کہ رامائن کے مصنف کو بھی بات آگے بڑھانے کے لیے شکار ہی کے چکر کا سہارا لینا پڑا ہے اور آ ہوئے زرنگار کی آڑ لے کر لنکا ڈھانی ہے، اور کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مہابھارت کا جمال شکاری ہی کے جلال کا ردِّ عمل ہو؟ بہت سی چیزیں دیو مالائی اور رجحیٹ افسانوی ہیں، لیکن مستند تواریخ کے تقریباً جملہ ادوار اور اکثر سلاطین اور امرا کے کردار شکار کے شوق کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ انقلابِ فرانس سے قبل ملک کے اندر جہاں اور بہت سی عوامی بے چینیوں کے مستند تذکرے ملتے ہیں ان میں ایک فروعی چیز میری نظر سے یہ بھی گزری کہ کسانوں کی کھڑی فصلوں میں جاگیردار خرگوشوں کا شکار کھیلتے تھے جس کی وجہ سے فصلوں کو نقصان پہنچتا تھا اور بہت سے اہم بنیادی مسائل کے ساتھ فصلوں کے اندر خرگوشوں کے شکار کی وجہ سے کسانوں کو شکایت ہونا بھی دونوں طبقوں میں مابہ النزاع امر تھا۔

ایشیا کے اندر مہیب جنگلات کے لامتناہی سلسلے تھے، ایسے ناقابلِ گذر کہ جن کے اندر ابتدائے آفرینش سے نہ انسان کا قدم ہی پہنچ سکا تھا اور نہ سورج کی کرن ہی نے جن کی زمین کو چھوا تھا لہٰذا اس دور کے سلاطین اور فاتحین کو ان کے متعلق معلومات کی بڑی ٹوہ لگی ہوتی تھی کیونکہ اُن کے مقبوضہ علاقہ میں ہونے کے باوجود سربستہ راز تھے، شاید باوجود فاتح ہونے کے ان کا فتح کا کچھ ایسا ہی جذبہ اور جستجو تھی جیسا کہ آج کے کوہ پیماؤں کو برف کی چوٹیوں تک پہنچنے کی تمنا ہوتی ہے۔ ان کے متعلق طرح طرح کی توہماتی قسم کی باتیں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں جن کے سبب ہر کسی کو ادھر رُخ کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور توہمات اپنی جگہ پر ایک حد تک حق بجانب بھی تھے۔ سب سے بڑی چیز گھنی نمو کے سبب ان کے اندر راستوں کا فقدان تھا، جو راستے تھے بھی وہ جنگلی جانوروں کی چال سے بن گئے تھے۔ پھر ان میں ہاتھی جیسے عظیم الجثہ اور گینڈے جیسے سخت جان جانوروں تک کو نگل لینے والی بڑی بڑی ولدلیں تھیں، خشمناک اُبلتے ہوئے دریا تھے، سنگِ خارا کی چٹانوں کے بنے ہوئے فلک بوس پہاڑوں کے سلسلے تھے اور کہیں کہیں بے آب و گیاہ میدان اور تپتے ہوئے ریگستان بھی تھے اور گھنے جنگلوں میں بھانت بھانت کی زہریلی نمو تھی جس میں بعض نباتات جسم کو چھوتے ہی سوزش پیدا کر دیتی تھیں اور کچھ درخت ایسے تھے کہ ان کی زد میں جو آدمی یا جانور آ جاتا مکڑی کے جالے کی طرح کھینچ کر چوس لیا کرتے تھے اور پھر اس سب کے ساتھ چپہ چپہ پر ہزاروں اقسام کے چوپائے، چڑیاں، چرندے، درندے اور لاکھوں قسم کے حشرات الارض لاتعداد بھرے پڑے تھے۔ جب ایشیا کے فاتحین اور سلاطین کو جنگ سے اک ذرا سانس لینے کا موقع ملتا یا چھوٹی موٹی جنگوں کے درمیان فوج کا کوئی حصہ آرام کرنے کے لیے چھاؤنیوں میں منتقل ہوتا اور کچھ مدت آرام کر لیتا اور جنگی ضروریات سے فاضل ہوتا تو یہ اس کی چستی اور جرأت برقرار رکھنے اور فنونِ جنگ

کی بعض مخصوص ترتیبیں دینے کے لیے عظیم الشان شکاری پروگرام بنایا کرتے جس میں سلاطین و امرا بذاتِ خود بڑے شوق کے ساتھ شریک ہوا کرتے۔ تاتاریوں، مغلوں اور پٹھانوں کے دور میں ایسی شکاری مہمات کا مستند تاریخی ثبوت ملتا ہے۔ فوج کے جوانوں کی جماعتیں مختلف کاموں پر متعین کی جاتیں اور طریقۂ شکار میں سب سے زیادہ اہمیت ناکہ بندی اور ہانکے کو ہوتی۔ ہانکا، جو بظاہر ایک عامی کو چیخنی چنگھاڑتی شور مچاتی بھیڑ کا ایک بے ترتیب سا عمل معلوم ہوتا ہے دراصل شکار کا سب سے زیادہ فنی اور حربی پہلو ہے اور بڑی تنظیم اور کچھ مشینی قسم کی شیرازہ بندی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور آج بیسویں صدی کے وسط تک کے طریقۂ شکار میں ہانکے کی اہمیت برقرار ہے اور اس کے قواعد و ضوابط میں کوئی خاص ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکی ہے اور آج ہائی ولاسٹی اور میگنم رائفلوں کے ذریعہ شکار کھیلنے کا ایک کامیاب ذریعہ ہانکا اور ناکہ بندی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قدیم دور میں ہتھیاروں کی لاچاری اور کمزوری کے سبب ہانکے پر بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ تاتاریوں کے زمانہ کی ایسی ایسی تفاصیل ملتی ہیں جن میں ہزاروں مربع میل جنگلوں کے اندر شدید ناکہ بندی اور فنکارانہ ہانکے کے ذریعہ جنگلی جانوروں کے ریوڑ کے ریوڑ خائف کر کے اور تھکا کر ایسے زچ کر لیا کرتے تھے کہ بڑی بڑی تعداد میں جگہ جگہ جمع ہو جایا کرتے تھے اور تکان اور وحشت کا یہ عالم ہو جاتا تھا کہ چرندوں کو درندوں کا خوف اور درندوں کو چرندوں کا احساس نہ رہتا تھا اور نفسی نفسی کے عالم میں اپنی اپنی جبلت بھول جایا کرتے تھے۔ مختلف النوع نسل کے برق رفتار ہرن، بہادر ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دینے والے، وحشی بیل اور جنگلی بھینسے، پھاڑ پھوڑ کر اور سب کچھ اُلٹ پلٹ کر پھینک دینا ہی جاننے والے جیالے سؤر، بھڑنے ہی بھڑنے کے مسلک والے پتھریلے گینڈے، جھومتے جھامتے پہاڑ سے ہاتھی، صاعقہ کی طرح پڑنے والے شہنشاہِ صحرا شیر اور ان کے وزرا و امرا (گلدار، تیندوے) چور بھیڑیے، پوری طرح بھڑکے ہوئے گھیرے میں ہوتے تھے۔ اِدھر برچھوں، تیروں، تیروں اور کمند پھندوں کے ذریعہ چھوٹے بڑے سب ساتھیوں کو اذنِ عام ہوتا تھا کہ جوہرِ مردانگی اور فنِ شکار اور سپہ گری کا کمال دکھائیں اور ع۔ "در بد و برید و شکست و بہ بست" کے عملی ڈرامہ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں۔ یہاں تک کہ صید افگنی کا بخار اس حد تک چڑھ جایا کرتا تھا کہ سرسامی کیفیت ہو جاتی تھی حتیٰ کہ سربراہ اور سلاطین بھی جو نہایت محتاط قسم کے شریکِ کار یا بالعموم صرف تماشائی ہونے کی حیثیت میں ساتھ ہوتے تھے اس بخار میں مبتلا ہو کر میدان میں بہ نفسِ نفیس اُتر آتے تھے اور یہاں پر سیکیورٹی اور باڈی گارڈ کے سب ضوابط بالائے طاق رکھے رہ جایا کرتے تھے۔ حالانکہ کھیل شروع ہوتے وقت یہ خود نہایت ٹھنڈے ہوتے تھے کیونکہ یہ شکار ان کی نگاہ میں کچھ ایسی ہی چیز ہوتا تھا جیسے آج کل کے شیم فائٹ کے مظاہرے یا جنگی مشقیں، مگر ظاہر بات ہے کہ کتنا سخت اور خطرناک ہوتا ہوگا کیونکہ آدمی تو اس زمانہ میں بھی گوشت پوست اور ہڈی کے بنے ہوتے ہوں گے اور ہتھیار آج کل کے مقابلہ میں صفر، جنگلی جانور بھی اتنے ہی خونخوار اور تیز رفتار ہوں گے جیسے آج کل ہیں۔ یہ خونیں کھیل فرد فرد یا چند افراد کے اجتماع سے جا بہ جا تو بہ تو مہم کی شکل میں کھیلا جاتا ہوگا۔ جس ہاتھی، شیر، گینڈے، بھینسے کے مقابلہ میں ہم آج میگنم اکسپریس اور ہائی ولاسٹی رائفل استعمال کرتے ہیں اور اپنی حفاظت کا اس قدر مکمل سامان پہلے سے مہیا کر لیتے ہیں کہ خطرہ کا ادنیٰ سا شائبہ بھی باقی نہیں رہتا، ان سب کا مقابلہ یہ بہادر سادہ تن، نیزہ اور تیر سے کرتے تھے۔ خالص اپنے بازو پر تکیہ کر کے اور صرف اپنی بیباکی اور فن کے ذریعہ شکار کھیلا کرتے تھے۔

از خود حملہ کرنا تو درکنار جنگلی جانوروں میں سے کسی ایک میں بھی انسان کے مقابلے پر اپنی مدافعت یا انتقام کی بھی جبلت نہیں پائی جاتی ۔ سلطانِ صحرا شیر اور ان کے اہلِ خاندان بیچارے "پتہ کھڑکا اور بندہ سٹکا" آدمی کے سانس کی آواز میل بھر سے سن کر بھاگ جاتے ہیں اور پہاڑ کے پہاڑ ہاتھی میلوں سے ہوا میں مانس گندھ کی ہلکی سی رمق پاکر فرار ہی میں عافیت سمجھتے ہیں ۔ ہاتھی کا خونی اور شیر اگلدار، بھیڑیے کا آدم خور ہو جانا آئینِ صحرا میں غیر فطری عمل ہے لہٰذا یہ مستثنیات میں ہے۔ ایسے جانور بعض وجوہ کی بنا پر اپنی اصل جبلت مسخ کر بیٹھتے ہیں اور جتنے دنوں زندہ رہتے ہیں (ظاہر بات ہے کہ بہت کم دنوں) ایک مجرمانہ گھبراہٹ اور ہیجان میں مبتلا رہتے ہیں اور ایک دن بھی چین سے نہیں بیٹھتے ۔

شیر کو جنگل کے اندر کوئی جانور چیلنج کرنے والا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ خود اس کی تخمیر میں ڈر کا احساس قدرت نے ودیعت کیا ہی نہیں ہے ۔ سامنا ہو جانے پر ہاتھی شیر سے اور شیر ہاتھی سے اک ذرا شانِ استغنا کے ساتھ کٹ کر نکل جایا کرتے ہیں۔ کبھی ہزاروں میں ایک آدھ ہاتھی سے کسی شیر کے دو دو ہاتھ ہونے کی خبریں کان میں پڑی ہیں جو کبھی تو ہاتھی کے سر پھرے پن کی وجہ سے ہوتے ہیں یا شیرنی کی غلط فہمی کی بنا پر جب دھوکے سے ہاتھی اس کے نوزائیدہ بچوں کی کچھار کی جانب چلا گیا ہو، تو بے پناہ حملوں اور سنگ خارا جیسے مدافعتوں کے مظاہرے ہوتے ہیں ۔ ہاتھی سونڈ میں دبا کر پٹخنے اور ستون سے پاؤں تلے کچل دینے کے حملے کرتا ہے اور شیر بجلی کی طرح لپک لپک کر وار بھی خالی دیتا ہے اور جہاں تہاں سے ایک ایک دھباٹے میں دھڑی دھڑی بھر گوشت بھی نکال کر پرخچے اڑاتا جاتا ہے ۔ اگر سونڈ کی گرفت میں آگیا تو ایک پٹخ اور پھر ایک دھمک میں قصہ پاک ہو جاتا ہے ورنہ بالعموم من ڈیڑھ من گوشت نچوا کر ہاتھی دُم دبا کر بھاگ ہی جاتا ہے ۔ دوسری چیز جو شیر کو چیلنج کرتی ہے وہ سون کتوں کا غول ہوتا ہے، ان کے مقابلہ میں شیر کی ایک نہیں چلتی اور یہ موذی دس بیس مر کر جینی زندگی شیر پر بھڑوں کی طرح لپٹ جاتے ہیں اور مرنے سے قبل ہی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھانے کو پڑ جاتے ہیں اور جب شیر کو ختم کر لیتے ہیں تو شیر کے مارے ہوئے ہم جنسوں کو نوش کر جاتے ہیں ۔ شیر ان کی آواز سن کر جنگل چھوڑ جاتا ہے اور جانور دغریب کس شمار قطار میں ہیں؛ اس غولِ بیابانی کی بُو سے بدحواس ہو کر راہِ فرار اختیار کرتے ہیں ۔

اوچھی گولی پڑنے کے بعد شاذ و نادر شیر بشرطیکہ شکاری اس کے پنجہ کی زد میں ہو حملہ کرتا ہے ورنہ جان لے کر بھاگ ہی جایا کرتا ہے ۔ البتہ شیر کے کامیاب اور شدید حملے تب ہوا کرتے ہیں جب زخمی ہونے کے بعد گھنی نمو میں اس کی تلاش کے لیے شکاری اپنی پارٹی لے کر نکلتے ہیں لیکن جنگلی بھینسا چوٹ پڑتے ہی حملہ کرتا ہے اور کبھی کبھی بغیر چوٹ پڑے بھی اگر قریب سے یکدم سامنا ہو جائے تو حملہ آور ہو جاتا ہے اور اپنے چٹان سے سر اور کٹیلے سینگوں سے پینا اور پچھاڑتا ہے ۔ اس کے حملہ کا جواب گولی اور پھر گولی، بس گولی ہی گولی ہو سکتی ہے ۔ ایک مرتبہ حملہ کے بعد یہ پلٹنا نہیں جانتا۔ جنگلی سور بھی آدمی کے سایہ سے بھاگتا ہے مگر زخمی ہو کر بری طرح بپھرتا ہے، یا گھوڑے سے نیزہ کے شکار میں زچ ہو کر بہ سر مقابلہ آتا ہے تو کم و بیش جنگلی بھینسے کے حملوں کو پہنچ آتا ہے ۔ قدرت نے اسے بے پایاں قوت دے کر ذرا کٹیلے ہتھیاروں سے آراستہ کیا ہے ۔ اگر کہیں موذی کے دانت جن کو کانپیں کہتے ہیں ذرا تیز اور صحیح رُخ کے ہوتے تو غضب ڈھا دیتا۔ جثّتاً اتنا جری، طاقتور اور سخت جان واقع ہوا ہے کہ غضبناک ہونے کے بعد مار کر یا مر کر ہی ہٹتا ہے اور جو کچھ سامنے آتا ہے اُلٹ پلٹ، پھاڑ پھوڑ کے پھینک دیتا ہے ۔ شیر کا شکار قدیم دور میں

برائے شکار نہ ہونا ہوگا۔ ہانکے، ناکہ بندی یا کبھی ہاتھی کی سواری میں شکاری کے سامنے پڑ جانے پر اکثر مدافعت کے طور پر شکاری اس پر تیر، برچھا وغیرہ مارتا ہوگا اور اگر آدمی بچ گیا اور شیر مر گیا تو شیر افگن کا خطاب پاتا ہوگا۔ کچھ ایسی ہی دھینگا مشتی قسم کے شکار کی روایتیں توزکِ جہانگیری وغیرہ میں ملتی ہیں۔ شیر کا شکار وسیع پیمانہ پر اسپورٹس کی شکل میں میگزین اور ہائی ولاسٹی رائفلوں کی ایجاد کے بعد ایشیا اور افریقہ میں سفید فام اقوام نے رائج کیا، حتیٰ کہ اب سے بہت قبل مشرق میں سفید فام اقوام کے دور ہی میں یہ نوبت آگئی تھی کہ اندیشہ ہونے لگا کہ شیر اور ہاتھی کے بلکہ جملہ شکار پر پابندی نہ لگائی گئی تو ان کی نسل منقطع ہو جائے گی اور اب انسانی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور غذائی پیداوار کا مسئلہ دردِ سر کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اور طریقۂ کاشت ان ممالک میں وہی بابا آدم والا چل رہا ہے لہٰذا جنگلات کاٹ کر وسیع پیمانہ پہ کاشتکاری کرنا ناگزیر ہے، جنگلوں کو محدود کر کے جگہ جگہ انہیں ایک قسم کے صحرائی پارکوں کی شکل دی جا رہی ہے اور ان کے اندر بڑے اہتمام کے ساتھ جنگلی جانوروں کا تحفظ کیا جا رہا ہے تاکہ ان کی نسل کا حال ابتر نہ ہو جائے۔ مگر چیتوں (گلدار، پینتھر، لیپرڈ) کے ذریعہ مغل دور میں شکاری کتوں کی طرح پال کر ان سے ہرن کے شکار کھیلنے کا ذکر غالباً توزکِ جہانگیری میں ملتا ہے اور اکبری دور میں بھی آج کے دور میں پھندے اور جال کے ذریعہ شکار کھیلنا شکاریوں میں بھی سخت معیوب ہے اور قانوناً بھی ممنوع ہے مگر اس زمانہ میں یہ شکار کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ جو شکاری چیتے مغل دور میں شکار پہ لگائے جاتے تھے وہ نوزائیدہ بچے بسا اوقات یہاں تک کہ آنکھیں بند حالت میں جنگل سے پکڑ کر لائے جاتے تھے کیونکہ جوان اور نوجوان تو درکنار پٹھورا شیر چیتا بھی گرفتار کرنے کے بعد ناقابلِ تربیت ہوتا ہے اور چھوٹے بچے بھی جن کا ذکر اوپر کیا گیا مکمل تربیت پا جانے کے باوجود بھی ناقابلِ اعتبار ہی رہا کرتے ہیں اور انسان کے ساتھ اُنسیت کی اس منزل پہ کبھی نہیں پہنچتے جس پہ کتا ہوتا ہے۔ سرکس اور چڑیا گھروں کے آئے دن کے حادثات شاہد ہیں سلاخوں کے اندر پیدا ہونے والے شیر اور گلدار پوری طرح مانوس نہیں ہوتے۔ مگر ہاتھی کا معاملہ تقریباً اس کے برعکس ہے۔ بہت کم لوگ شاید یہ جانتے ہوں گے کہ ہاتھی کی نسل کشی اور مویشیوں کی طرح انسانوں میں رہ کر نہیں ہو سکتی اور شاید ہی کوئی مثال ایسی ہو کہ کسی فیل خانہ میں کسی ہتھنی نے بچہ دیا ہو لہٰذا ہاتھی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ جنگل سے پکڑنا ہے۔ ہر دور میں مختلف طریقوں سے ہندوستان کے طول و عرض میں ہاتھی پکڑے جاتے رہے ہیں۔ اب تو ہاتھی ایک مدِ فاضل ہے اور چڑیا گھروں کی زینت اور خانہ پری، مگر پچھلی صدی کے نصف تک ہاتھی کو ملک کے اندر گھوڑے، بیل اور اونٹ کے بعد چوتھا درجہ رہا۔ بادشاہوں اور امراء کی شان و شوکت کی نمود کے علاوہ میدانِ جنگ میں بھی اس کی ذرا نمایاں حیثیت تھی۔ چونکہ یہ جبلتاً ہر عمر میں تربیت پذیر ہوتا ہے حتیٰ کہ جنگل سے بوڑھے ہاتھی پکڑے جانے کے بعد اطاعت قبول کر لیتے ہیں اور ہر قسم کی تربیت کے سانچے میں ڈھل کر اور آدمی سے مانوس ہو کر کام پر لگ جاتے ہیں، لہٰذا اس کی جانب پچھلی صدیوں میں خوب توجہ رہی اور اس سے خوب کام لیا گیا۔ مختلف النوع طریقوں سے پکڑنے والے، پھر انہیں ان کی جبلت کے مطابق تربیت دینے والے اور پھر ان سے کام لینے والے علیحدہ علیحدہ پیشہ ور کہیں کہیں آج بھی برِ عظیم کے اندر مل جائیں گے، آخر الذکر دونوں کو علی الترتیب سانٹھ مار اور فیل بان کہتے ہیں۔ پکڑنے والے ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہوا کرتے تھے۔ جنوبی ہند میں بعض خانہ بدوش قبائل زنجیر کے پھندے کے ذریعہ پکڑا کرتے تھے گڑھے میں گرا کر پکڑنے کا بھی بے رحمانہ طریقہ رائج تھا۔ مشرقی پاکستان میں "کھیدا" کرنے والے مخصوص قبائلی لوگ ہیں جو بڑے ہنگامہ زا طریقہ

سے ہاتھیوں کے غول کے غول گھیر کر بند کر لیا کرتے تھے۔ پتہ نہیں کہ اب یہ ہوتا ہے یا نہیں، شاید تقسیم کے بعد تک بھی یہ دار و گیر کا سلسلہ چلتا رہا۔ مگر یہ سب سادتی دور کی باتیں تھیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہاتھی کی اگر ضرورت ہے تو چڑیا گھر کے لیے اور شیر کا شکار روا ہے تو آدم خور کا، کیونکہ اوپر بیان کی ہوئی وجوہ کی بنا پر جنگلی زندگی کے استیصالِ کُلّی کا شدید اندیشہ پیدا ہو گیا ہے اور ہمارے صاحبِ ایٹم اور موجدِ ہائڈروجن بم ممالک بے زبان جانوروں کے ساتھ اتنا شدید جذبۂ ہمدردی اختیار کیے ہوئے ہیں کہ تحفظ کے سخت قوانین کے ساتھ شکاری ہتھیار ساز کارخانوں میں خودکار اور تیز مار نے والی بندوقوں اور مہلک تر شکاری رائفلوں کی ساخت پر پابندی لگا دی ہے اور جدید کارخانوں کے قیام کی ہمت شکنی کر رہے ہیں۔ ہمارے یہ ایٹم بم اور ہائڈروجن بم ساز ممالک جنگلی جانوروں کی آزادی اور تحفظ کے لیے وہ ہمدردی کر رہے ہیں کہ نسلِ حیواناتِ صحرائی تا قدِ جنگل کا کیڑا کیڑا مکوڑا مکوڑا تا قیامت انہیں تحسین و مرحبا کہتا رہے گا۔

ہاں تو بات تو ہو رہی تھی نیزہ اور تیر کے میدان کی اور پھسل کر جا پڑی ایٹم اور ہائڈروجن کے گڑھے میں۔ پچھلے دور کو بھی چھوڑیے جب آدمی ایک نوکیلا پتھر ہاتھ میں لے کر جنگلی بھینسے کو للکار دیا کرتا تھا۔ بات کچھ اسی کے لگ بھگ کرنی ہے اور کل ہی کی ....

برٹش گورنمنٹ نے غالباً فوجی ضروریات کی بنا پر انیسویں صدی کے وسط کے بعد ہندوستان کے اندر اعلیٰ قسم کے غیر ملکی گھوڑوں کی افزائش کی پالیسی اختیار کی اور عرب، انگلش اور آسٹریلین وغیرہ نسل کے بے عیب اور بیش قیمت سانڈ گھوڑے خاص طور پر انہیں ممالک سے جو ان کی جنم بھوم تھے ہندوستان میں امپورٹ کیے اور بجائے براہِ راست گورنمنٹ کی تحویل میں رکھنے کے یہ سانڈ ان زمینداروں کی سپردگی میں دیے جو ان کی قرارِ واقعی حفاظت اور پوری پوری پرورش کے اہل تھے۔ خاص طور پر ایسے لوگ درمیانی حیثیت کے زمیندار اور بہت بڑی حیثیت کے کاشتکار ہوا کرتے تھے اور اپنی مقبوضہ و مملوکہ اراضی کے وسیع اور بہترین رقبہ پر خود کاشت کیا کرتے تھے جس کو انگریزی اصطلاح میں (Extensive farming) کہتے ہیں۔ ایسے زمینداروں کو یو۔پی کے قانون قبضۂ اراضی میں سیر دار کہا جاتا تھا اور غالباً آج کل روسی یا کسی اور مغربی زبان میں "کُلک" (CULLIK) کہتے ہیں۔ یہ درمیانی حیثیت کا زمیندار طبقہ قانونی طور پر اپنی اراضیات کا مالکِ کُلّی تو اتنا ہی ہوا کرتا تھا جتنا اونچا طبقہ ہوتا تھا صرف رقبۂ اراضی کی کمی بیشی کا فرق ہوتا تھا اور یہی چیز ان کی ذہنیت میں تفریق کر دیتی تھی۔ ان کے گھروں میں بالعموم ان کی محدود ضروریات اور لوازمات اور منتظمانہ ذہنیت کے سبب ہمیشہ فارغ البالی اور خوشحالی رہا کرتی تھی جس کا ان کے بڑے بھائی بندوں کے یہاں تقریباً سال کے بارہ مہینے فقدان رہا کرتا تھا اور اپنی ناہموار ضروریات اور ناہموار مصائل اور غیر منتظمانہ طرزِ عمل کے ہاتھوں مجبور ہو کر غریبوں کا ہاتھ مہاجن کے سامنے پھیلا ہی رہتا تھا۔

ایسے متوسط طبقہ کے زمیندار جن کی تحویل میں یہ سانڈ رکھے جاتے تھے اس زمانہ کی سرکاری اصطلاح میں "وارندہ" کہلاتے تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر سے اس صدی کے ربع تک میرے باپ دادا "وارندہ" رہے اور میری یاد سے قبل نہ معلوم کتنے سانڈ گھوڑے بوڑھے، از کار رفتہ ہو کر آتے جاتے بدلتے رہے ہوں گے مگر میرے بچپن اور عنفوانِ شباب میں تقریباً آدھی درجن عرب، انگلش اور آسٹریلین سانڈ گھوڑے تحویل میں رہے لہٰذا میں نے آنکھ کھولتے ہی گھر کے اندر ہر ایک کو اور دور اعزاء اور دوستوں کو گھڑ سواری اور شکار کا شوقین پایا اور ہر ایک کو اپنے اپنے ذاتی تجربے اور علم سینہ کے ذریعے گھوڑوں کی شناخت کا ماہر۔ سب کے سب

عیب و ثواب کی پہچان اور علاج معالجہ میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ میرے یہاں ایک بلند ٹیلہ پر بستی سے باہر ایک بڑی لمبی چوڑی عمارت جس میں میدان کی وسعت کے صحن اندر گھیر تھے سرکاری سانڈوں کے لیے مخصوص تھی جو سرکاری اصطبل کہلاتا تھا اور گھوڑوں کا اچھا خاصا ڈیپارٹمنٹ کہلا رہتا تھا۔ سائیسوں، چابک سواروں اور بیطاروں کا اجتماع رہا کرتا تھا۔ نت نئی گھوڑیاں دور دور سے روزانہ آیا کرتی تھیں اور نخلِ مراد سرسبز کر کے واپس جایا کرتی تھیں۔ اس طرح ملک کے طول و عرض میں ایسے نہ معلوم کتنے شاید سیکڑوں ہزاروں مرکز نسل کشی کے رہے ہوں گے جن میں لاتعداد جانور رکھے جاتے ہوں گے جس کے ذریعے ہمارے ملک میں سچ مچ سات سمندر پار کے گھوڑوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ نسلیں پھیلیں اور جگہ جگہ کی آب و ہوا، ماحول اور غذا کے اثرات کے تحت پروان چڑھیں اور گھوڑے کی نسل میں نمایاں ترقی ہوئی۔ ایسے متوسط الحال زمینداروں نے جنہیں "دارندہ" بنانے کے لیے گورنمنٹ نے انتخاب کیا شروع میں تو اسے ایک قسم کا اعزاز سمجھا ہوگا لیکن جلد ہی انہیں پتہ چل گیا کہ زمینداری اور خود کاشت فارمنگ کے پیشہ کے ساتھ ساتھ یہ ان کا اچھا خاصا "سائڈ بزنس" بن سکتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ ان گھوڑوں کی پرورش اور خوراک کے سلسلہ میں ماہ بہ ماہ گورنمنٹ اخراجات کے بل ادا کیا کرتی تھی جس کے ذریعہ معقول آمدنی ہوتی تھی اور گھوڑوں کی خوراک کے سلسلہ میں ان فاضل اجناس اور چاروں کی بڑی اچھی قیمت ہاتھ آ جاتی تھی جو زمیندار کے نزدیک بہت ہی کم وقعت و تقریباً بے کار ہوتے تھے۔ پھر ہر گھوڑے پر ایک سائیس اور ایک گھاس کاٹ کر لانے والے دو ملازموں کی تنخواہ دی جاتی تھی۔ یہ ملازم تقریباً بغیر تنخواہ کے بخوشی کام کرنے پر مل جایا کرتے تھے اور ان کی معقول روزانہ آمدنی کا ذریعہ نسل کشی اور گابھن ہونے کے لیے آنے والی گھوڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ ہر گھوڑی کا مالک اپنی حیثیت کے مطابق یا پھر اچھے سانڈ کی شہرت کے اعتبار سے انعام کے طور پر یا نیک شگون سمجھ کر روپیہ دو روپیہ تین روپیہ بخوشی دے کر جایا کرتا تھا، جبکہ اس زمانہ میں سرکار سے فی سائیس چار روپیہ ماہوار اور فی گراس کٹ پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ "دارندہ" کو ملا کرتی تھی۔ اس تنخواہ کی سائیسوں اور گراس کٹوں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ وہ تو سال میں گیارہ مہینے اپنے سانڈ کے ذریعے دو تین روپیہ یومیہ جیب میں ڈال کر جایا کرتے تھے حالانکہ گورنمنٹ کی جانب سے مفت سانڈ ڈالنے اور گھوڑی کے قد و قامت، رنگ ڈھنگ اور نسل کے چند مقررہ قاعدوں کے مطابق سانڈ تجویز کرنے کی ہدایت تھی۔ لہٰذا ماہ بہ ماہ سرکاری خزانہ سے وصول شدہ بل کی کل رقم تخرجی دارندہ کی جیب میں پہنچ جایا کرتی تھی اور پھر ان مفت کے نوکروں کی پوری ایک درجن بیگار اور کام کے لیے حاضر رہا کرتی تھی کیونکہ گراس کٹ کو صرف زمیندار کے فارم سے سبز چارہ کاٹ کر لانے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ ہوتا تھا اور سائیس تو بس اتنی دیر کے لیے دن میں ایک مرتبہ مصروف ہوا کرتے تھے جتنی دیر مخصوص بریڈنگ کے گھیر میں جفتی کے لیے گھوڑا گھوڑی جمع کیے جاتے تھے۔ سازگاری حالات کے مطابق دارندوں نے ایک اور بزنس اس کے ذریعہ اختیار کیا۔ تقریباً ہر دارندہ ایسی گھوڑیاں جو بالعموم کسی چوٹ یا ہاتھ پاؤں کی کسی وقتی بیماری کے سبب تقریباً از کار رفتہ ہو جایا کرتی تھیں اور جن کی بازار میں کوئی وقعت نہیں رہتی تھی کوڑیوں کے مول یا کبھی کبھی یوں ہی مفت حاصل کر کے اپنے تھان پر جمع کر لیا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ گھوڑا وہ جانور ہے جو خاص طور پر باپ کی خصوصی توریث اور خون کے اثرات سب سے زیادہ قبول کرتا ہے۔ دارندہ کوڑیوں کے مول خریدتے وقت اس چیز کا بھی تھوڑا بہت خیال رکھتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو گھوڑی بھی اچھی نسل کی ہو۔ چنانچہ ان گھوڑیوں پر سال بہ سال اعلیٰ سے اعلیٰ سانڈ چھوڑ کر ان سے بہترین بچے حاصل کیا کرتا تھا جن کی قیمت چھ سات مہینہ کے اندر دودھ چھوٹتے ہی بازار میں بڑی اچھی مل جایا کرتی تھی۔ گھوڑیوں کی پرورش اور دیکھ بھال یہ

سائیس اور گراس کٹ کیا کرتے تھے اور زمیندار اپنی ذاتی سواری کا کام انہی گھوڑیوں سے لیا کرتا تھا اور چونکہ یہ بالعموم کم بھی ہوتا تھا اور کبھی کبھی گھوڑیوں پر بٹا بھی رہتا تھا لہٰذا ایام حمل ہوں یا رضاعت کسی گھوڑی پر گراں نہ گزرتا تھا اور بہ آسانی چلتا رہتا تھا لہٰذا ہر پہلو سے معاملہ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام ہوتا تھا۔

اور کل کی بات ہے کہ جارج اسٹیفن کے انجن کے پہیہ سے لے کر چاند پر دوڑنے والے راکٹ کے پرَ تک ہر چیز کا تصور گھوڑے کی باگ تھا اور ابتدائے آفرینش سے اس صدی کے شروع تک زمین کے طناب گھوڑے ہی کی ٹانگوں کے بل پر کھنچتے رہے تھے اور قطب شمالی سے قطب جنوبی کا رشتہ اسی کی باگ کے ذریعے ملا رہا تھا۔ گھوڑے کا دور بہت طویل ہے، اتنا طویل کہ مؤرخ بھی اس کی لمبائی ناپنے سے قاصر رہا ہے اور یقین کرنا پڑتا ہے کہ ماورائے تاریخ اور تاریخ کا ہر دور اس کی ٹاپوں سے گونجتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ملک عرب نے جو گھوڑے کی جنم بھوم ہے اس کو خوب اچھی طرح پہچان کر "اشرف الجیوانات" کا خطاب دیا گویا خود اپنے بعد دوسرا درجہ۔ مگر مشینی دور کے تقاضے کے تحت بہت سی چلتی پھرتی ٹھوس مادی چیزیں معدوم ہو گئیں اور بہت سی اقدار بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ مگر آج جو بات کہنی ہے وہ گھوم پھر کر پھر گھوڑے ہی کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ ابھی پچھلی صدی کے اواخر تک اور اس صدی کے شروع تک جہاں اور بہت سی اقدار زندہ تھیں وہاں کچھ قابل قدر کھیل بھی تھے اور ان میں پگ اسٹکنگ (گھوڑے پر سوار ہو کر نیزہ سے سوٗر کا شکار) بھی تھا ——— اور جب گھوڑے کو جنگ، سیاحت، چوگان بازی، شکار اور نہ معلوم کتنے میدانوں سے ہنکا کر ریس کورس میں دھکیل دیا گیا اور گھوڑا گھوڑا نہیں جوئے کا پانسہ بن گیا تو ایک دم تمدن بھی آخری ہچکی لے گیا اور ہماری ران تلے سے گھوڑا بھی سرک گیا، پگ اسٹکنگ بھی ساتھ گیا اور انگریز پہلے تو بغلیں ہی جھانک گیا پھر چپکے سے سرک گیا۔

مگر آج عہد پیری شباب کی باتوں کے رنگین خواب بیان کرنے کو جی چاہتا ہے ——— اور پھر "ان کی باتیں جن میں گلوں کی خوشبو کی بھینی بھینی رمق آج بھی شامہ نوازی کرتی ہے" ——— اور وہ رنگین خواب جن سے آج پیری کا بے نور سا باصرہ تابناک ہے اب بھی دل کے کونوں کھدروں میں سے کبھی کبھی جھانک پڑتے ہیں ——— اور رنگ و بو تو یادوں کے بڑے محرک ہوتے ہیں۔ اور سب کچھ چلا جاتا ہے مگر یادیں تو تڑپتی ہی ہیں اور ذہن کے دھندلائے ہوئے پردے پر بار بار رنگین خطوط اور تابناک نقوش سے چمک اٹھتے ہیں اور کبھی کبھی تو سینے کے اندر جیسے کچھ پھڑپھڑا اٹھتا ہے اور پھر حال سے بے نیاز ہو کر اور مستقبل پر لات مار کر آپ ہی آپ گردن پیچھے کو مڑ جاتی ہے اور الٹی قلابازی سی کھا کر ماضی کی جنت میں جا پڑتا ہوں ——— اور کوئی ذریعہ نہیں تو قلم ہی سے سر دھننے لگتا ہوں۔

کھلاڑی، مبصرین تقریباً تمام اس پر متفق ہیں کہ دنیا کے جتنے اسپورٹ ہیں ان میں پگ اسٹکنگ سب سے زیادہ جرأت آزما جسمانی طاقت اور اعصاب کی کہربائی تیزی کے ساتھ فن شہسواری اور نیزہ بازی میں اعلیٰ مہارت کا کھیل ہے اور سب سے زیادہ اس حرکت زندگی سے بھرپور اور بہادری کے جذبات سے لبریز سخت کھیل میں زود فیصلہ، ذکی الحس بلکہ حواس خمسہ کے ساتھ چھٹی حس کے امتزاج کی ضرورت ہے۔ اس کے ڈانڈے بعض اوقات کھیل ہی کھیل میں پتھر اور لوہے کے عہد سے جا ملتے ہیں، ایسی نازک ساعت میں

ہمارا ایٹم کے دور والا نیزہ باز سوار قرنوں پیچھے جا پڑتا ہے اور شکاری آدمی کے دور کو چھو آتا ہے۔ کیونکہ شکار کے طریقے اور سامانِ شکار دونوں عہدِ مادر راج والے اور آج والے بھی زیادہ رنگ روپ والے ہوتے ہیں اور ٹھیک ٹھیک وہ انہی ہتھیاروں سے مزین ہو کر اور اسی ٹھاٹھ کے ساتھ شکار گاہ کے میدان میں اترتا ہے جنہیں اس کا پتھر اور لوہے کے دور والا صرف شکاری دادا باندھ کر جایا کرتا تھا۔ لہٰذا یہ بندوق کے شکار کی طرح ہر شکار کے شوقین کے بس کا روگ نہیں ہے کہ "کانا اور لے دوڑیں" بندوق ہاتھ میں پکڑی اور ٹھائیں ٹھائیں شکاری بن گئے اور پھر ذرا اور بڑھے تو بال باندھے صحیح نشانہ پر پڑنے والی نئی رائفلوں اور دوربینوں سے مزین تھوڑی بہت مشق کر کے اک ذرا ہاتھ رواں کیا اور پھر سیکڑوں من کی جھوک سے نکلنے والی اور ہزاروں میل کی رفتار سے اڑنے والی گولیاں لے کر جنگل میں جا پہنچے جن کی معمولی سی اوچھی چوٹ بھی مضبوط سے مضبوط اور سخت جان سے سخت جان جانور کے اوپر موت کا طمانچہ بن کر پڑتی ہے۔ یوں تو آج کا ماہرِ نفسیات یہ کہتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جس کا اکتساب کرنے کی صلاحیت ہر آدمی میں موجود نہ ہو۔ مگر جس طرح دیگر معمولاتِ زندگی میں بہت سے تجربے اس کے بالکل منافی ہوتے رہے ہیں اور بس ان کی توجیہہ ہی ہوتی رہی ہے۔ اسی طرح تجربہ نے بتایا ہے کہ پگ اسٹکنگ کا کھیل کھیلنے کے لیے پہلے تو مخصوص تناسب کے ہاتھ پاؤں اور قد و قامت کے ساخت والے تنومند آدمی کی ضرورت ہے جو بڑی حد تک قدرت کا عطیہ ہوتا ہے پھر شیر کا دل اور شاہین کی پرواز ـــ اور ذکی الحسی کے سلسلہ میں خود اپنے مرکب جیسا ـــ یہ تھوڑی حد تک بنانے سے بن سکتے ہیں ورنہ یہ بھی قدرت ہی کا عطیہ ہوتے ہیں۔

سؤر کے شکار میں کھلاڑی اپنی نازک پوزیشن اور کمزوری کو خوب سمجھتا ہے اور کرکٹ، ہاکی، فٹ بال وغیرہ جملہ فیلڈ اسپورٹوں سے کہیں زیادہ اس کو اپنے اس عمل کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے جو کھیل کہلاتا ہے۔ مگر سچ پوچھیے تو جنگ ہوتی ہے دو پھلوں کے درمیان جو ایک تو چند فیٹ لمبے بانس پر چڑھا ہوتا ہے اور دوسرا سؤر کے منہ میں دانتوں کی شکل میں دبا ہوتا ہے اور بس یہی چند فیٹ جو بانس کی لمبائی ہوتی ہے اور گھوڑے کی دو تین فیٹ زیادہ اونچائی شکاری کی فوقیت کی چیزیں ہوتی ہیں ورنہ بے چارہ آج کے دور کے ہائی ولاسٹی رائفل تو درکنار سترھویں اٹھارویں صدی کے طمنچہ تک سے محروم ہوتا ہے لہٰذا کھیلتے وقت اس کے تحت الشعور میں ایک قسم کا خوف چھپا رہتا ہے جو احساسِ مدافعت، عمل کے وقت انتہائی دقیقہ رسی اور ذمہ داری اور فن کے بہتر سے بہتر مظاہرہ، قواعد و ضوابط کی پوری پوری پابندی اور اپنی صلاحیت کے کماحقہٗ استعمال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے رائفل سے شیر، گلدار اور خود سؤر کے ہی شکار کے طریقہ میں اتنی مکمل احتیاطیں برتی جاتی ہیں کہ شکاری کی اپنی مدافعت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ع "زشمشیرِ دشمن نہ لرزیدہ بود" شکار کی اصل روح اور اسپورٹ کے سچے راز سے شکاری نا آشنا سا رہتا ہے اور اگر کچھ شناسا ہوتا بھی ہے تو اس کا معیار بہت نیچا ہوتا ہے۔ احتیاطوں اور پیش بندیوں کے علاوہ یہ ہتھیار اتنے مہلک ہوتے ہیں کہ ان جانوروں کی بساط سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں جن پر یہ استعمال کیے جاتے ہیں لہٰذا بندوق رائفل کا فیر اوچھا پڑے، خالی جائے، کارتوس آگ نہ پکڑے شکاری کو گزند پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا اور کبھی کبھی جو حادثات ان شکاروں میں ہو جاتے ہیں وہ ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے دو ریل گاڑیوں میں ٹکر ہو جاتی ہے۔ لیکن سؤر کا برچھے سے شکار! "براتِ عاشقاں بر شاخ آہو" کے بھاؤ پر ہوتا ہے اور "جنگ دو سر دارد" معاملہ اکثر "ہم ہی رہیں گے یا تم ہی" کے مقام پر آ لگتا ہے۔ یہاں نہ رائفلوں کے بور اور گولیوں کے وزن، ساخت

قوت اور رفتار کا ماپ ہوتا ہے نہ بارود کی قوتِ ہلاکت اور ضرب اور دھمک کا پیمانہ، یہ خالی اپنے قوی بازو کی طاقت، مزاج کی جرأت، مرکب کی شائستگی اور رفتار اور ایک نیزہ کے فن کارانہ وار کا مرہون ہوا کرتا ہے۔ اس کی ذراسی فروگذاشت گھوڑے اور شکاری دونوں کی یا دونوں میں سے ایک کی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے ورنہ شدید زخم آ جانا۔ کبھی کبھی ایسی چوٹ کہ ساری عمر کے لیے از کار رفتہ ہو کر زندہ درگور ہو جانا بھی ممکن ہو جاتا ہے اور سؤر کے شکار کی بہت کم پارٹیاں پوری طرح بخیریت انجام کو پہنچتی ہیں۔ ہر پروگرام میں ایک دو چھوٹے بڑے حادثے یا ایسے بال بال بچ جانے کے واقعات جو ساری عمر یاد رہیں ظہور پذیر ہو کر ہی رہتے ہیں۔

ماہرینِ حیوانات اور تجربہ کار شکاری اور جنگلی زندگی کے شائقین سے لے کر خانہ بدوش شکار پیشہ قبائل تک تقریباً سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ سختی میں سؤر بہ استثنائے چند ہر جنگلی جانور سے بڑھا ہوا ہے۔ یوں بھی ایک پورا جوان اور کانپوں سے پوری طرح آراستہ سؤر جبلتاً شیر سے کترا تا تو ضرور ہے لیکن شاید ڈرتا بہت کم ہے اور بھپرنے کے بعد تو جرأت اور سختی کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ شیر کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ مجادلہ میں ظاہر بات ہے کہ تیز پنجوں اور نوکیلے دانتوں کی فوقیت اور بے پناہ پھرتی کے سبب میدان شیر ہی کے ہاتھ رہتا ہے لیکن بس برائے نام ہی رہتا ہے۔ سؤر تو اکثر وہیں مرجاتا ہے اور شیر زندہ درگور ہو کر اور سسک سسک کر ایک آدھ دن مرتا رہتا ہے۔ اک ذرا سا موقع ملنے پر سؤر شیر کے پیٹ میں اتنا لمبا شگاف لگاتا ہے کہ سب کچھ باہر لٹک پڑتا ہے۔ ویسے خالق نے شیر کو آٹھ نو من وزن دے کر اور دھار دار ہتھیاروں سے سجا کر طاقت، پھرتی، خونخواری، شرافت اور راکتفا کی انتہا کا مجسمہ بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ وہ سچ مچ سلطانِ صحرا ہے جس کے کان بہت تیز ہیں، نگاہ بڑی دقیق اور دور رس ہے لیکن شامہ تقریباً بالکل غائب۔ اگر شرافت جبلی اور شامہ کا فقدان نہ ہوتا تو چرندوں کا وجود جنگل سے ختم ہو جاتا۔ کبھی کبھی ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے کہ زبردست مجادلہ کے بعد سؤر ایک جگہ مردہ پڑا پایا گیا اور تھوڑی دور پر شیر مردہ یا نیم مردہ سسکتا، گھسٹتا، کچھ آنتیں اوجھڑی کٹیلی جھاڑیوں میں الجھی کچھ میں خود لپٹا پڑا ہے۔ لہٰذا ایک پختہ کار شیر جبلتاً سؤر کے گوشت کا شائق ہونے کے باوجود بہت سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر ہاتھ ڈالتا ہے اور گرانڈیل بڑی کانپوں والے سؤر، یا چڑچڑائی ہوئی بچوں والی سؤرنی سے کترا کر نکل جانا ہی قرینِ مصلحت سمجھتا ہے۔ یہ بالعموم چھوکرے اور ناپختہ شیر اور گلدار ہوتے ہیں جو تگڑے کانپوں والے سؤر سے جا بھڑتے ہیں اور جو نتیجہ ہوتا ہے وہ وہ نہیں ہوا کرتا جو بھاری سے بھاری سانبھر، نیل گائے پر ہاتھ ڈالنے کے بعد ہوا کرتا ہے البتہ نٹے پٹھورے سؤر شیر اور گلدار کی محبوب غذا ہوتے ہیں اور سؤرنیوں کو بھی خیریت کے ساتھ مار لیتا ہے۔

جنگلی جانوروں میں گلدار جس طرح حسین ترین چوپایہ مانا جاتا ہے اسی طرح یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ یہ عیار ترین درندہ ہے۔ یہ درخت کے اوپر چڑھنے پر بھی قادر ہوتا ہے۔ جنگل میں چوپایوں پر ہی منحصر نہیں مور، جنگلی مرغی جو کچھ بھی ہاتھ آ جائے مار لیتا ہے۔ پھر جنگل ہی تک محدود نہیں رات میں چور کی طرح بستی تک بھی دھاوا بولتا ہے۔ پالتو مرغیاں، بطخیں، بکریاں کتے جو کچھ بھی دسترس میں آ جائے لے بھاگتا ہے۔ لہٰذا بعض مخصوص موسموں میں مخصوص جبلت سے شکار کرنے والے گلدار بڑی آسانی سے بڑے سے بڑے جنگلی سؤر کا شکار کر لیتے ہیں۔ بالعموم ایسے موسموں میں جب برگد، گولر، جامن، انجیر اور مہوا وغیرہ جنگلی درخت پھلتے ہیں تو ان کے نیچے پھلوں کا فرش رہتا ہے جو ٹپ ٹپ کر تقریباً ہمہ وقت گرتے رہتے ہیں لہٰذا تقریباً تمام جنگلی چرندے بڑے شوق کے ساتھ انہیں کھانے آیا کرتے ہیں۔

پیسے میاں چھپے گھنے درختوں کی شاخوں میں گلدار دبک کر بیٹھ جاتا ہے اور منتظر رہتا ہے اور جیسے ہی جانور اس کے داؤ پر آتا ہے ایک خوفناک غوں لگاتا ہوا اوپر سے پھاند کر اسے دبوچ لیتا ہے۔ اس قسم کا حملہ اتنا غیر متوقع (بے ساختہ) بھرپور اور بے پناہ ہوتا ہے کہ بھاری سے بھاری جانور نہایت ہی بے ڈھب گرفت میں آجاتا ہے لہٰذا معمولی سے قد و قامت کے گلدار بھی اس طریقہ سے بڑے سے بڑے بہادر اور گرانڈیل سؤر کو بہ آسانی مار لیتے ہیں۔ پیلی بھیت کے جنگل میں خوش قسمتی سے ایک ایسا مجادلہ دیکھنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ میرے ایک رشتہ کے بھائی ناصرالدین خاں عرف اچھو میاں جو بڑے قادر انداز اور تجربہ کار ہونے کے علاوہ بڑے جری شکاری ہیں اور نہ معلوم کتنے شیر اور لاتعداد گلدار مار چکے ہیں اپنی پارٹی کے ساتھ جنگل میں کیمپ کئے ہوئے تھے۔ دوپہر کے وقت ایک شفاف اور ٹھنڈے پانی کے کنارے کھانا کھا رہے تھے، اور سب لوگ تو صبح کے بھوکے لمبے لمبے ہاتھ کباب پراٹھوں پر جھاڑ رہے تھے مگر بھائی صاحب ذرا سستی سے کھا رہے تھے اور ان کی نگاہ بار بار تھوڑی دور پر کھڑے ہوئے برگد کے ایک درخت کی جانب اُٹھ جاتی تھی۔ لقمہ آہستہ سے نگلتے ہوئے وہ کچھ بڑبڑائے جیسے ان کے اندر چھٹی حس بیدار ہوئی اور اپنے قیاس کا جواز ڈھونڈھا اور پھر برگد کی جانب اشارہ کرکے، بغیر کسی سے مخاطب ہوئے جیسے خود کلامی کے انداز میں آہستہ سے بولے "اس برگد پر چڑیاں کیوں نہیں ہیں؟ اوں، ہوں، ایں؟ کھانا کھا کر ذرا ٹٹولیں گے۔" اور ہم لوگ کھانا پوری طرح ختم بھی نہ کر پائے تھے کہ برگد کے نیچے تو جیسے یکایک بھونچال آگیا۔ ایک شامت زدہ معمولی قد و قامت کے سؤر سے کہیں زیادہ بڑا اور خوفناک کانیوں والا سؤر جنگل میں پھرتا پھراتا برگد کے پھل کھانے کے لیے درخت کے نیچے آمرا، اور بس جیسے اس پر بجلی سی گر پڑی۔ بھائی صاحب چونکہ پہلے سے متوجہ تھے لہٰذا انہوں نے تو برگد کی گھنی شاخوں میں سے سؤر کی پیٹھ تک گلدار کی جست کا شاید پورا کھیل دیکھا۔ جب ایک خوفناک غوں کے ساتھ ہماری نگاہیں اُدھر اُٹھیں تو ہم نے دیکھا کہ زلزلہ کا سماں ہے۔ جیسے ایک ٹائم بم پھٹا جس کے تصادم میں دوسرا بم بھی پھٹ گیا۔ جہاں پر ہم بیٹھے تھے وہاں سے فاصلہ زیادہ تھا ورنہ ہم میں سے بعض صفراوی المزاج لوگ ماننے والے نہیں تھے اور وہ ضرور اپنے رائفلوں سے بیچ بچاؤ کرکے بندر بانٹ کر دیتے اور اُدھر بڑھنے سے بھائی صاحب نے روک دیا اور کھلکھلا کر بولے "اماں تماشہ دیکھو!" ——— اور باوجود پوری طرح گرفت میں آجانے کے اور تقریباً بالکل ہی بے بس ہو جانے کے سؤر نے بڑی شدت کا مظاہرہ کیا، چنگھاڑ چنگھاڑ کر زور زور سے پچھاڑیں اور پٹخیاں کھا کھا کر اور اکھیڑیں اور جھٹکے دے دے کر گلدار کو اپنی پیٹھ پر سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ قلابازیاں سی کھانے لگا اور زمین کو دھمک ڈالا مگر "قطب جنبد نہ جنبد گل محمد" وس میں گز زمین تو ہل گئی، شاید برگد کا درخت بھی کانپ گیا مگر گلدار ٹس سے مس نہ ہوا۔ چاروں پنجے مضبوطی کے ساتھ چوڑی چکلی پیٹھ پر گاڑے ہر صورت میں جما ہی رہا، یہاں تک کہ شاید اسی اُچھل کود میں ذرا سا موقع پا کر اور گردن بڑھا کر نہ معلوم کیسے پیٹھ پر جمے ہی جمے اس نے سؤر کا ٹیٹوا دانتوں میں دبا لیا اور بالآخر زیر کر ہی لیا۔ ہم سب تو بہت ہیجان اور جوش کے ساتھ دیکھ رہے تھے مگر جب ہم نے بھائی صاحب کی جانب دیکھا تو وہ بڑے ٹھنڈے انداز میں مسکرا رہے تھے اور گھڑی پر نظر ڈال کر بولے "آٹھ منٹ لگے، بہت دیر چلی۔" پھر ایک اطمینان کا سانس لے کر کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ذرا خوش ہو کر بڑے خود اعتمادانہ انداز میں کہا "چلو ٹھیک ہوا۔ اب اس بلوٹے (گلدار) کو ہم گھڑی بھر میں لا دلیں گے۔" ہمارے اُدھر بڑھتے ہی گلدار، سؤر کی لاش چھوڑ کر سامنے جھاڑیوں میں گھس گیا اور بھائی صاحب نے

ہمیں تو کیمپ رخصت کیا جو وہاں سے میل بھر کے فاصلے پر نصب تھا اور خود اسی برگد کی شاخوں میں رائفل لے کر بیٹھ گئے۔ ہم کیمپ پہنچ کر سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ دھماکہ سُنائی دیا۔ ہم ویسے ہی اُٹھ کر اُدھر چلے تو راستہ میں بھائی صاحب آتے ہوئے ملے اور بولے "کہاں جا رہے ہو؟ چلو واپس، پاسیوں کو بھیج دیں، لٹکا لائیں گے۔ وہ تو دیر بھی نہ لگی۔ سؤر تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے نکلتے ہی اُلٹ دیا۔" اور جب گلدار کیمپ پر آ گیا تو مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر بولے "بچہ ہاتھ آ گیا آسمان کی گھات سے ورنہ تم کیا چیز تھے تمہارے تایا میاں کی بھی مجال نہ تھی جو اسے مار پاتے۔ نہ وہ ہوتا نہ یہ۔"

ممکن ہے کہ انگریزی دورِ حکومت سے قبل گھوڑے اور نیزہ کے ذریعہ ہندوستان کے راجپوت ساونت شکار کھیلتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اور شکاروں کی طرح سؤر بھی مارتے ہوں مگر جسے انگریزی اصطلاح میں پگ اسٹکنگ کہتے ہیں اس کو یقینی طور پر انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کے اندر حالات اور ماحول کی مناسبت دیکھ کر پُرانے دور کی چوگان بازی اور اپنے زمانہ کی پولو سے اکتساب کر کے باضابطہ اسپورٹ کی آئینی شکل میں انگریزی نے ڈھالا اور ہر بازی گاہ کی جائے وقوع نوعیت اور حالات کے مطابق تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ اس کے ضوابط ترتیب دیے اور ہاکی، فٹ بال وغیرہ کھیلوں کی طرح اس کو باقاعدہ ٹیم اسپورٹ کی شکل دی، حالانکہ اس دور میں میگزین اور ہائی ولاسٹی رائفل عمومیت پا چکے تھے مگر اس کھیل میں جدید ایجادات کو مطلق دخل نہ تھا۔ ایک جاندار، میانہ قد کا شائستہ گھوڑا، ایک سیدھا سادا نیزہ بالکل ویسا ہی جیسا ہزاروں سال قبل پہلی مرتبہ آدمی نے بنایا ہوگا اور خالص اپنے بازو کی قوت پر بھروسہ اور فنِ شہسواری اور نیزہ بازی پر پورا عبور ——— یہ بڑا دقت طلب امر تھا کہ اس کھیل کے قطعی ضوابط مرتب ہو سکیں۔ کیونکہ ہاکی، فٹ بال، کرکٹ خود ساختہ کھیلوں میں اپنے وضع کردہ ضوابط کے تحت آدمی کے ساتھ آدمی کھیلا کرتا ہے مگر یہاں مدِ مقابل جانور ہوتا ہے اور جانور بھی کون سا؟ سؤر ——— جس کے ساتھ آدمی تو اپنا کھیل کھیلتا ہے اور وہ اپنی جان پر کھیل کر آدمی کا مقابلہ کرتا ہے اور مقابلہ کے وقت بپھر کر کبھی کبھی اپنی مقررہ اور قطعی جبلّت سے بھی ہٹ کر عمل کر بیٹھتا ہے تو پھر یہاں پر آدمی کے بنائے ہوئے ضابطے جو اس کی جبلّت کے گہرے مطالعہ کے بعد مرتب ہوتے ہیں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ پھر دوسری طرف اس کا بہت بڑا انحصار گھوڑے پر ہے جو تربیت پذیری اور انسان کی اطاعت شعاری میں اس حد تک جھک چکا ہے کہ انسان "اشرف المخلوقات" نے اسے "اشرف الحیوانات" کا درجہ دے دیا ہے۔ تاہم "اشرف" سہی مگر ہے تو غریب جاندار ہی کبھی کبھی سؤر کے شکار میں وہ بھی کوتاہی کر جاتا ہے اور ضابطے دھرے رہ جاتے ہیں۔ پھر بھی بڑی حد تک مستثنیات کو چھوڑ کر ادائیگیٔ فرض میں اپنے ساتھی راکب کے دوش بدوش رہتا ہے۔

خاص چیز یہ کہ اس انتہائی اسپورٹ کا مزاج کلیتاً ساونتی تھا اور بہت بڑی حد تک گھوڑے کا مرہونِ منت تھا۔ انگریز جب اس ملک میں آیا بلکہ یوں کہیے کہ آیا ہی یوں کہ ساونتی تمدن دم توڑ رہا تھا پھر بھی انیسویں صدی کے وسط میں جو انگریز آئے ان کا مزاج کلیتاً سوداگرانہ نہ تھا بلکہ وہ ایک حد تک ساونتی ذہنیت کے ساتھ قدیم عسکری مزاج کے حامل تھے جو بین بین قسم کی چیز تھا اور جدید ہتھیاروں کی ایجاد کے ساتھ ساتھ کچھ روایتی اور تاریخی تہوّرانہ طریقۂ فکر تھا لہٰذا اپنی افتادِ طبع کے تقاضے کے بموجب انہوں نے مشرقی تمدن کے بہت سے روشن اور بعض تاریک پہلو بھی اختیار کیے اور اسپورٹ کے معاملہ میں انہوں نے پگ اسٹکنگ کا کھیل ایجاد کیا۔ ہندوستانی جاگیردار طبقہ قطعاً ساونت ذہنیت رکھتا تھا پھر انگریزوں کا نقّال بھی تھا اور ان کو اپنا ولی نعمت بھی سمجھتا تھا۔ شکار اور شہسواری

دونوں کے درمیان قدرِ مشترک تھی لہٰذا انہوں نے بھی اس کھیل کو شوق کے ساتھ کھیلا اور یہاں تک کہ اپنی صلاحیتوں اور ذرائع کی مدد سے اتنی ترقی کی کہ جس طرح کرکٹ، ہاکی میں آج اپنے استادوں سے بڑھ گئے ہیں اس کھیل میں بھی سبقت لے گئے۔

میں جب پہلی مرتبہ سوّر کے شکار کا تماشہ دیکھنے گیا تو میری عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ ہانکے اور ناکہ بندی اور شکار کے رستخیز کے ہنگامہ میں مجھ کو اتنا لطف نہ آتا مگر میرے ساتھ ہاتھی پر اور دوسرے دو ہاتھیوں پر جو تماشائی بیٹھے تھے وہ اتنے زیادہ محظوظ ہو رہے تھے کہ میں بھی توجہ دے کر لطف لینے لگا۔ ایک سیاہ سی چیز کے بے ترتیب سے تعاقب میں چار پانچ سوار رواں دواں ہیں۔ کہیں پر گھوڑوں کی رفتار ذرا سست ہو جاتی ہے اور کہیں پر انتہائی تیز۔ کبھی بجلی کی طرح لپکتے ہوئے گھوڑے یکدم راسیں کھینچنے سے دوہرے ہو جاتے ہیں اور کہیں پر پرندے کی طرح اُڑ کر جا پڑتے ہیں۔ وہ سیاہ چیز تھوڑی تھوڑی دیر بعد بل کھاتی گولے کی طرح لڑھکتی سی ہے۔ کبھی چھدری گھاس کے اندر غائب ہو جاتی ہے اور کبھی کھلے میدان کے پٹوں میں لوہیا رنگ کے سوّر کی شکل میں نمایاں ہو جاتی ہے کبھی کبھی کسی سوار کے نیزے کا پھل دھوپ میں چمک اٹھتا ہے۔ ریفری اور ہارس مین فاضل گھوڑے لیے کبھی کھڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بدل دیتے ہیں۔ ریفری کے ہاتھ میں دوربین ہے۔

جس وقت کھیل شروع ہوا تھا تو پہلے گھاس کے ایک قطعہ میں ہانکا کرنے والوں نے شور کر کے اس سوّر کو نکالا تھا جس کو غالباً گھاس کے اندر چھپا ہوا انہوں نے پہلے ہی بھانپ رکھا تھا۔ جب یہ سوّر میدان کی جانب آیا تو گھوڑوں سے اس کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ دو سو گز تھا۔ ضابطہ کے مطابق ہر سوار نے اپنے اپنے داؤ پر تعاقب کیا اور سوّر کے رُخ بدلتے ہی سواروں کے رُخ بدلتے رہے۔ آناً فاناً ایک سوار نے سوّر کو جا لیا، برچھا بڑھایا، سوّر اک ذرا مڑا یا جیسے ایک جانب کو جھٹکا سا لیا اور اس سوار — اور سوّر میں پچاس گز کا فاصلہ ہو گیا مگر دوسرے سوار کی زد میں پہنچ گیا۔ اس نے یکدم گھوڑے کو مہمیز کر کے بڑا تیز حملہ کیا لیکن شاید برچھا مارنے کے لیے گھوڑے کو اک ذرا کنٹرول نہ کر سکا، پلک مارتے گھوڑا کہیں نظر آیا اور سوّر کہیں، جیسے بُعد المشرقین ہو گیا اور ابھی نگاہ اُٹھ کر سیدھی بھی نہ ہو پائی تھی کہ سوّر پھر کسی اور کی زد میں آ گیا، اس کے برچھے کا وار ذرا اوچھا پڑا تاہم سوّر زخمی ہو گیا اور بپھر گیا اور اس سوار کی زد سے باہر ہو گیا۔ یہ سوار شکار کا میدان چھوڑ کر برچھے کی خون آلودگی دکھانے اور غالباً اپنا گھوڑا بدلنے کی غرض سے ریفری اور ہارس مین کی پارٹی کی جانب چلا اور اُدھر دوسرے سوار نے زخمی سوّر پر بڑا کاری زخم مارا جس سے سوّر اُلٹ کر جا پڑا اور جب تک سنبھلے دوسرا اور تیسرا برچھا گھونپ دیا۔ قاعدہ کے مطابق ٹرافی کا حقدار وہ سوار رہا جس نے پہلے زخم مارا تھا مگر شکار پوری چار آدمیوں کی پارٹی کا مانا گیا۔ ہاتھیوں پر بیٹھے ہوئے ساتھیوں نے گھڑیاں دیکھیں۔ کُل انیس منٹ پورے معرکہ میں صرف ہوئے اور بات تو چند سطروں اور تھوڑے لفظوں میں ہو گئی اور انیس منٹ کی بات ہی کیا مگر دیکھنے والوں کا خون شاید ہر منٹ میں ایک مرتبہ بنا ہوا۔ سوار تو تازہ دم ہی نظر آتے تھے مگر گھوڑے سب گرد ہو گئے تھے اور جس نے پہلا وار کیا تھا وہ سوار ریفری کو برچھے پر لگا خون دکھانے کے علاوہ دوسرا گھوڑا بدلنے گیا ہی تھا کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سب گھوڑوں کے کس بل ٹوٹ چکے ہیں۔ یہ جب تماشائیوں کے ہاتھیوں کے قریب آیا اور شکریہ ادا کر رہا تھا تو میں نے اندازہ کیا کہ اس کے چہرے پر ایسے آثار ہیں جیسے گڑھ فتح کر کے آیا ہے کیونکہ اس کے بقیہ تینوں ساتھی انگریز فوجی تھے اور وہ روہیلکھنڈی راجپوت زمیندار ——— اور یہ تھا میرا

پگ اسٹکنگ کا پہلا تجربہ جس نے مجھے اتنی چھوٹی سی عمر میں اس کا شوق دلایا مگر کیا پدی کیا پدی کا شوربہ، مجھے میدان میں اترنے کے لیے آٹھ سال انتظار اور مشق کرنی پڑی۔

پہلی مرتبہ جب میں پگ اسٹکنگ کے میدان میں اترا تو اپنی پارٹی کا سب سے نوعمر شکاری تھا۔ یہ پرانے روہیلکھنڈی راجپوتوں اور کچھ پرانے فوجی انگریزوں کی ملی جلی پارٹی تھی۔ دراصل یہ طریقہ شکار ملک سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس زمانہ میں جو فوجی انگریز آنے لگے تھے وہ بھی صرف رائفل ہی کے شکاری ہوتے تھے مگر کچھ پرانے روہیلکھنڈی راجپوت خاندان تو ریث اور روایت کے طور پر اسے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ خال خال ان میں ایسے بوڑھے باقی تھے جو پیرانہ سالی کے باوجود میدان میں اترتے تھے۔ انہوں نے اس صدی کے شروع اور پچھلی صدی کے اواخر سالوں میں بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے اور متھرا سے لے کر میرٹھ تک گنگا کپ اور کھادر کپ کے ٹورنامنٹ قسم کے مقابلوں میں حصہ لیا تھا اور بڑے بڑے فوجی انگریزوں سے لوہا منوا لیا تھا۔ ان کے بیٹے اور پوتے جن میں سے اکثر میرے ملاقاتی اور بعض دوست اور شکار کے ساتھی تھے پگ اسٹکنگ کو آبائی روایات کے طور پر اختیار کیے ہوئے تھے اور میرے یہاں گھوڑوں کا ڈیپارٹمنٹ دیکھ کر اور مجھے سواری کا شوقین پا کر انہی لوگوں نے مجھے سؤر کے شکار کا شوق دلایا اور انہی کے بزرگوں کے مدعو کرنے پر میں بچپن اور لڑکپن میں ہاتھی پر سؤر کے شکار کا تماشہ دیکھنے گیا تھا جس کا میں نے تذکرہ کیا تھا۔

میرا ضلع دو دریاؤں کے درمیان میں ہے۔ خاص شہر سے جنوب کی سمت بارہ چودہ میل کے فاصلہ پر مشہور دریائے گنگا بہتا ہے اور شمال کی جانب اٹھارہ بیس میل کے فاصلہ پر ایک غیر معروف مگر کافی بڑا دریا رام گنگا بہتا ہے۔ دریا کے کنارے گھاس زیادہ بلند نہیں ہوتی، گھاس زیادہ سے زیادہ گھٹنوں تک ورنہ بالعموم ٹخنوں تک ہی اٹھتی ہے اور درخت بشرطیکہ انہیں درخت کہا جائے بمشکل قدِ آدم اونچائی تک بڑھتے ہیں اور آدمی کی پنڈلی سے زیادہ موٹے نہیں ہوتے جس کو مختلف علاقائی زبانوں میں شاید مختلف ناموں سے پکارتے ہیں اور عام طور پر یو۔پی اور خاص طور پر روہیلکھنڈ میں جھاؤ کہتے ہیں۔ بے رنگ و روپ سا مٹیالا سبز، مٹھرایا ہوا، روڑھا روڑھا سخت پودا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں اکا دکا کٹیلی جھاڑیاں اور خال خال ذرا بلند سی جگہ پر ببولوں کے جھنڈ نظر آتے ہیں۔ البتہ جو دو چار قسم کی گھاسیں ہوتی ہیں وہ جانوروں کی بڑی اچھی قسم کی خوراک ہوتی ہیں۔ زیادہ تر جھاؤ میلوں تک دریا کے کنارے بڑا گھنا اگتا ہے جس کے نیچے سایہ میں چھوٹی چھوٹی بچھی بچھی سی نرم و شاداب گھاس جمی ہوتی ہے جو گھاس کے قطعے جھاؤ سے علیحدہ جگہ جگہ میدان میں ہوتے ہیں وہ ذرا سخت قسم کی ہوتی ہے اور اونچی بھی، لہٰذا اس تمام کو جنگل تو یوں نہیں کہہ سکتے کہ جنگل کوئی اور چیز ہوتا ہے، میدان یوں نہیں کہہ سکتے کہ یہ میدان نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسے صحرا کو کٹری، کھادر، ترینٹی اور فارسی میں وادی کہتے ہیں۔ یہاں نمو اس لیے زیادہ نہیں پنپ سکتی کہ برسات میں جب دریا چڑھتے ہیں تو میلوں تک تمام علاقہ زیرِ آب آ جاتا ہے لہٰذا سیلاب کے وقت تو خواہ جھاؤ کا پودا ہو یا کوئی اور سخت جان گھاس ہر چیز برباد ہو جاتی ہے لیکن جوں ہی پانی اترتا ہے اور اکتوبر کی دھوپ پڑتی ہے جیسے پلک مارتے یہ سب سخت جان سبزی ابل کر نکلتی ہے اور آنِ واحد میں ساڑھے تین ہو کر بہ حیثیت شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تقریباً تمام دریاؤں کے کناروں پر یہی صورت ہوتی ہے، اپنے مخرج سے نکلتے ہوئے جب تک یہ پہاڑی ڈھلوانوں اور پھر نیچے اتر کر ذرا بلند پتھریلے میدانوں میں چلتے ہیں تو رفتار تو بہت تیز ہو جاتی ہے مگر اپنے پتھریلے اور ناہموار

کناروں والے برتن کے اندر ہی رہتے ہیں اور آگے بڑھ کر میدان ملتے ہی پھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ پہاڑوں اور پہاڑ کے دامنوں کی نمو پر ان کے پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن میدانوں میں جہاں جہاں تک ان کا پاٹ ہوتا ہے چند سخت جان مخصوص اقسام کی ہی نمو مرمر کر اُگا کرتی ہے۔ میدانوں میں پہنچ کر ان کے پانی میں بھانت بھانت کی مٹیاں اور طرح طرح کی چیزیں شامل ہو کر نہایت اعلیٰ درجہ کی کھاد بن جایا کرتی ہیں لہٰذا سیلاب اُترتے وقت چونکہ پانی کی رفتار ہلکی ہوتی ہے یہ کھاد آہستہ آہستہ زیرِ آب زمین پر تہ نشین ہو جاتی ہے جس کو مختلف علاقائی زبانوں میں مختلف ناموں سے پکارتے ہیں اور یو۔پی کے اندر اکثر جگہ "بان" کہتے ہیں۔ بان زمین کو نہایت طاقتور بنا دیتا ہے۔ چنانچہ دریاؤں کے کنارے جتنے جتنے جو میدان ہوتے ہیں ان کے اوپر بشرطیکہ سیلاب مناسب وقت پہ اُتر جائے اور تخم ریزی کا زمانہ باقی ہو تو بعض بعض سال ربیع کی اعلیٰ اجناس اور معقول رقبوں پر گنے اور کہیں کہیں چاول کی مخصوص اقسام کی بڑی بھاری کاشتیں ہوتی ہیں کیونکہ "بان" (دریا کی چھوڑی ہوئی مٹی) بہترین کھاد ہونے کے علاوہ کٹریوں کے نشیب و فراز درست کر کے مسطح میدان بھی بناتی ہے اور اس کے تہ نشین ہونے کا قدرتی طریقہ بڑی حد تک زمین کو جتائی گڑائی وغیرہ کے عمل سے تقریباً بے نیاز کر دیتا ہے۔ تخم ریزی کے بعد بڑے زور سے فصل اُبلتی ہے مگر یہاں کی کاشتکاری میں سب سے اہم مسئلہ جنگلی جانوروں سے رکھوالی کا ہوتا ہے جن میں سب سے زیادہ تباہ کرنے والا جانور سؤر ہے۔ غریب کاشتکار جن کے گھر ان کی اس کاشت سے بالعموم کافی دور بلند مقامات پہ آباد دیہات میں ہوتے ہیں تخم ریزی سے لے کر کٹائی تک اپنی فصل کو سینہ سے چمٹائے کٹری ہی پڑے رہتے ہیں اور کھیت کھیت مچان باندھ کر اور جھونپڑیاں ڈال کر بندھے سے رہتے ہیں۔ یہ کاشتکار دن کو خاص خاص مال مویشی کی سیوا اور فصل کے اندر ہلکا پھلکا کام کرتے ہیں اور تمام رات آگ جلائے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں، پھر بھی اک نیند کی جھپکی یا ذرا اِدھر اُدھر ہو جانے کی روایت کے ساتھ دوسرے تیسرے دن چک کے چک صاف ہو جانے کی خبر آتی ہی رہتی ہے۔ سؤر کی ایک داڑھ جس چک پہ جا پڑتی ہے ذرا دیر میں صفایا کر دیتی ہے۔ کیونکہ سؤر جتنا کھاتا ہے اس سے ٹھیک دس گنا اکھیڑ کر برباد کر دیتا ہے۔ ویسے کٹری کے اندر قدرتی چارہ کی افراط ہوتی ہے لیکن جنگلی جانور جبلتاً سبز فصل اور جنگلی گھاس وغیرہ کی اعلیٰ و ادنیٰ سطح میں خوب تمیز کرتے ہیں اور باوجود سب خطروں کے چوری کرنے کے لیے اِدھر رجوع ہوتے ہیں۔ جن کٹریوں کا ذکر ہے ان میں بکثرت جنگلی سؤر اور وحشی گائیں جنہیں مقامی زبان میں ہیل کہتے ہیں، ملتی ہیں اور نیل گائے بھی کافی ہیں۔ جگہ جگہ اِکا دُکا ہرنوں کے ڈار ہیں اور کہیں خال خال ایک آدھ پاڑھا نظر آجاتا ہے مگر سب سے عجوبہ چیز کبھی کبھی وحشی گھوڑوں کے ریوڑ نظر آتے ہیں۔ ویسے برِصغیر میں سؤر ہی ایک ایسا چوپایہ ہے جو ہمالیہ کی چھ سات ہزار فیٹ کی بلندیوں سے کلی ترائیوں اور دامنوں میں اور پھر راس کماری تک میدانوں میں ہر قسم کی آب و ہوا اور ماحول کے اندر پایا جاتا ہے اور کراچی کے مضافات سے لگا کر برہما کی مشرقی سرحد تک اس کا منحوس وجود ہر جگہ موجود ہے، بس خوراک، ماحول اور آب و ہوا کے لحاظ سے جبلت اور ڈیل ڈول میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان جنگلوں کے سؤر جو شیر کی بازی گاہ اور مسکن ہوتے ہیں کٹریوں کے سؤروں سے جبلت میں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ سؤر کا گوشت شیر کی مرغوب غذا ہے اور باوجودیکہ ان کا شکار چیتل، سانبھر پاڑھے وغیرہ کی طرح آسان نہیں ہے پھر بھی شیر انہیں بڑی رغبت کے ساتھ مارتا اور کھاتا ہے، لہٰذا یہ بجید چوکنے بھی ہوتے ہیں، ساتھ ہی چونکہ بے پایاں طاقت کے ساتھ اس کے مطابق پھرتی نہیں ہوتی اور نہ چھپنے کی ہی اچھی جبلت ہوتی ہے لہٰذا

کچھ اکھڑ ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ کچھ عجیب سا چوپایہ ہے جو سولہ آنے سبزی خور ہونے کے علاوہ پورا پورا گوشت خور بھی ہے لیکن شکاری نہیں ہے۔ پڑا گرا مُردار جانور خوب کھاتا ہے۔ جب شیر گلدار وغیرہ سے ٹکراؤ ناگزیر ہو جاتا ہے تو اس آسانی کے ساتھ ہاتھ نہیں آتا جس طرح اور جنگلی چرندے یا پالتو بیل، گائے، بھینس، بکری بھیڑ کی طرح سے تھوڑی بہت مدافعت کر کے مرتے ہیں اور بڑی کانٹوں والے گرانڈیل سوّر پر تو اگر شیر گلدار پڑ جائے تو مدِّ مقابل کو بھی آگے پیچھے مار کر مرتا ہے یا مر کر مار دیتا ہے۔ مگر کنڈی کے سوّر کو تاحدِ نگاہ اپنی ہی ملکیت نظر آتی ہے اور اس کی بازی گاہ کے اندر اسے کوئی چیلنج کرنے والا نہیں ہوتا، اور "غوں" سننا تو درکنار کنڈی کے سوّر کی ناک بھی شیر گلدار کی بُو سے آشنا نہیں ہوتی۔

آدمی کو صرف یہ اتنا پہچانتے ہیں کہ اگرچہ ان میں سے کوئی خطرہ والی بدبو نہیں سنگھائی پڑتی پھر بھی یہ دو ٹانگ والے ہیں، بچ کر نکل جانا ہی مناسب ہے۔ نوجوان و نوخیز چرواہوں کا، جو اکثر ان کاشتکاروں کے بھائی بیٹے ہوتے ہیں، ان کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اگرچہ جس وقت کنڈی کے اندر چرواہے اپنے ریوڑ لیے ہوئے چراگاہوں اور جھاڑیوں میں گھومتے ہوتے ہیں اس وقت یہ بالعموم ناگ پھنی یا جھاؤ کی گھنی جھاڑیوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی نم زمین کے اوپر تمام رات کے مارے لتاڑے تھکے تھکائے اطمینان کے ساتھ پیٹ بھر کے سوتے ہوتے ہیں یا موسم ذرا زیادہ گرم ہوا تو کہیں سایہ دار کنجوں میں کو بڑھی ہوتی دریا کی چھانڑ کے چھپ چھپے زیادہ پانی میں یا کسی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے کیچڑ پانی، دلدل کے گڑھے اور جوہڑ میں لوٹیں لگاتے ہوتے ہیں لہٰذا تمام دن متحرک رہنے والے چرواہے کے قدم دن میں ایک نہ ایک مرتبہ کسی ایسی جگہ پر پہنچ ہی جاتے ہیں اور سامنا ہو ہی جاتا ہے۔ غروبِ آفتاب کے بعد جب سوّروں کی چرائی کا وقت آتا ہے تو چرواہے چراگاہیں خالی کر کے جا چکتے ہیں اور اپنے مویشیوں کو لکڑی اور کانٹوں کے گھرے ہوئے باڑھوں میں بند کر دیتے ہیں اور سوّروں کے لیے چراگاہیں بالکل سنسان اور پُر امن ہو جاتی ہیں حالانکہ یہ لطف کی بات ہے کہ زیادہ تر یہی چرواہے وہ کاشتکار ہوتے ہیں جنہیں دن میں تقریباً تمام جنگلی جانور بے ضرر مخلوق سمجھتے ہیں اور ان سے بے غرض سے رہتے ہیں۔ رات کو وہ ان کے اور یہ اُن کے سخت مخالف بن جاتے ہیں۔ سوّر شاید یہ سوچتے ہیں کہ یہ اور ان کے کٹ کھنے کتّے شور مچا مچا کر، بھونک بھونک کر اور آگ جلا جلا کر ہمیں خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں اور میٹھے میٹھے ہرے بھرے خوشبودار چارہ پر نہیں جانے دیتے اور ادھر کو ہنکا دیتے ہیں جدھر کنڈی کڑی گھاس اور کٹیلی روکھی جھاڑیاں اور سرکنڈے اور کانس کے دھاردار نوکیلے جھنڈ ہیں اور کیچڑ جڑیں ہیں جہاں ہمیں بڑی مشکل سے تمام رات ناک رگڑ رگڑ کے پیٹ بھر ملتا ہے، پھر اس میں وہ لذت کہاں اور نہ وہ بات کہ اک ذرا منہ جھکایا اور بھرے پرہی ہاتھ پڑا۔ ہونٹوں سے لے کر حلق تک رس کی پچکاریاں چھوٹتی چلی گئیں اور ادھر سے اُدھر تک پہنچتے پہنچتے چارہ کے ڈھیر ہی ڈھیر لگ گئے اور ذرا دیر میں پیٹ بھر گیا۔ خیر یہ تو رات کو شور مچا کر بھگا ہی دیتے ہیں لیکن یہ جو کبھی کبھی بدبودار دو ٹانگوں والے آیا کرتے ہیں یہ بڑے ہی بدمعاش ہوتے ہیں۔ دن دہاڑے بلٹہ مچا مچا کر یہ اور ان کے ساتھی اور ان کے کتّے ہمیں جھاڑیوں اور کنجوں میں گھس گھس کر باہر بھگاتے ہیں اور یہ بدمعاش دھماکے کرتے ہیں، چوٹ مارتے ہیں اور نہ معلوم کتنوں کو مار ڈالتے ہوں گے، ہر مرتبہ میں دس پانچ کو ہاتھ پاؤں توڑ کر لولا لنگڑا کر کے چھوڑ جاتے ہیں۔ جب تک ان کی گندھ پھیلی رہتی ہے دل دھڑکتا رہتا ہے۔

جنگلی گائیں بوجہ تقدس کے شکار سے مستثنیٰ خیال کی جاتی ہیں اگرچہ بڑی وحشی ہوتی ہیں اور اگر کبھی کسی شکاری کو مارنے کا موقع مل جائے

تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہر پہلو سے بہترین اسپورٹ ہے اور گوشت کی لذت کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ کسی صحرائی چرندہ کا گوشت اس کا مقابلہ کرہی نہیں سکتا۔ جب کسی مخصوص حصّہ میں ان کی کثرت ہو جاتی ہے تو مظالم اور غارت گری انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور ہندو کاشتکار یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ براہِ راست اس کے پیٹ پر لات مار رہی ہیں تو مذہبی عقیدہ اور روایتی احترام پاش پاش ہو جاتا ہے اور مسلمان بھائی شکاریوں کو ان کے استیصال کے لیے مدعو کرتے ہیں تو کبھی کبھی ان کے شکار کا لطف اور گوشت کا مزا چکھنے کو مل جاتا ہے۔ ہرنیوں سے زیادہ خوبصورت آنکھیں، تیز تیز تیکھے تیکھے چتون، تقریباً سب کے سب یک رنگ سیاہ سپیدی کبرے چکنے چپڑے دمکتے جسم جو پالتو گائے سے قدرے مختلف ساخت کے ہوتے ہیں۔ خوب کھنچے ہوئے اور اچھی طرح چست اور تنے ہوئے سے مکمل فربھی اور اس سے زیادہ رونق جیسے سر سے پاؤں تک تیل میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ہر گلہ کے ساتھ تندرستی، چستی اور تنومندی کی انتہا کو پہنچے ہوئے موٹی موٹی سیاہ تاب گردنیں اور ریچھلے ہوئے بھاری نوکدار سینگ اٹھائے ہوئے شاہانہ انداز میں اینٹھتے سب سے نمایاں بلند و بالا سانڈ بیل ہوتے ہیں ——— اور پھر کہیں کہیں جنگلی گھوڑوں کے ریوڑ، بالعموم آدم قد ٹٹو، آٹھوں گانٹھ کمیت یا سُرنگ "اسپِ گشتہ" کی فارسی ترکیب کی زندہ اور بے چین تشکیل، پیارے پیارے تیور، کوہلی آنکھیں، پتلی لمبی کھنچی ہوئی گردن سے فٹ بھر نیچے تک کھیلتے ہوئے ایال اور رگاچی پر لوٹتی ہوئی زہین کو چھوتی گپھاسی سیاہ چکدار دُمیں اور ایسے متناسب تن و توش اور مکمل رنگ ڈھنگ جیسے کسی صانع بت تراش نے بڑے شوق کے ساتھ انہیں سنگ سُرخ سے تراش کر مرتب کیا ہے اور پھر کسی ماہر انجینئر نے کسی ترکیب سے ان کے اندر بجلی کے تار پھیلا کر رَو دوڑا دی ہے۔ کبھی کوئی گلّہ نظر آ جاتا ہے تو تماشہ دیکھنے کے لیے دو سو گز کے اندر اندر تو آدمی کو آ لینے دیتے ہیں اور کنوتیاں بدل بدل کر نتھنے پھلا پھلا کر ترچھے ترچھے بانکے بانکے انداز میں گردنیں جھٹکتے ہیں اور کوئی کوئی ناکتد بچھیرا بچھیری دفورِ بیتابی میں ایک آدھ خوبصورت پھرکی سی بھی لے جاتا ہے اور کوئی بزرگ نانی دادی قسم کی بڑی بوڑھی حلق سے ایک ہلکی سُریلی سی اشتباہ ظاہر کرتی ہوئی مخصوص آواز بھی نکالتی ہیں ایک دو قدم تماشہ دیکھتے ہوئے دو ٹانگ والے کی جانب بڑھاتی ہیں اور سوالیہ انداز میں ذرا استعجاب و اجنبیت کے ساتھ گردن کو مخصوص حرکت دیتی ہیں جس میں دیکھنے والوں کو وحشت کے بجائے ایک قسم کا شائستگی کا طور محسوس ہوتا ہے اور صریحاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محترمہ باوجود اپنی تمام تر گھبراہٹ اور سیماب صفتی کے دریافت فرما رہی ہیں "جناب کی شانِ نزول؟ ا ——— " اور حضور کی تعریف ——— ؟" اور یہ وحشی ادائیں دیکھ کر کوئی جنگلی زندگی کا دلدادہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اگر جمالیاتی ذوق سے اک ذرا آشنا کوئی شکاری ہو تو اس کے حسیات آرٹ اور شعر کی منزل کو چھونے لگتے ہیں اور صانعِ قدرت کے اس آزاد و بے لگام حسن کے نظارہ میں ایسا گم ہوتا ہے کہ اندر سے جذبۂ عبودیت سا بیدار ہونے لگتا ہے اور ایک والہانہ سے انداز میں شاید انہیں چومنے یا سجدہ کرنے کے لیے یا نہ معلوم کیوں شاید وفورِ شوق میں نزدیکیٔ حُسن کے لیے اک ذرا اور قدم بڑھاتا ہے تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے اور سارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے جیسے بجلی کی رو کے ایک جھٹکے نے بیک وقت ہر ایک کی رگ و پے میں ایک ضرب لگا دی۔ گھبراہٹ تڑپ کے ساتھ ایک مشینی سی فضا پیدا ہو گئی۔ شاہ گام، پوقدم، دلکی، پوئیا، سرپٹ، گھوڑے والی کسی چال کی تمیز کہاں، نگاہ کو تعاقب کرنا ہی مشکل ہو گیا، جیسے پورے کا پورا گلّہ چھلاوہ ہو گیا۔

جنگلی گھوڑے کے شکار کا تو کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا البتہ کہیں کہیں بعض اوسط طبقہ کے دیہاتی زمیندار اپنی شہسواری اور کمند بازی کے خود ساختہ قسم کے فن سے جنگلی گایوں اور جنگلی گھوڑیوں کے بچوں کو پکڑا کرتے تھے جو شاید پکڑتے وقت تو خالص کھلاڑی جذبے کے تحت ہوتا ہوگا لیکن بعد کو یہ عجیب سی چیز بن جایا کرتا تھا اور انہیں پال کر یہ اپنے اس سخت کھیل کی زندہ اور کارآمد یادگار سے مدتوں محظوظ بھی ہوا کرتے تھے اور ان سے سواری کا آرام بھی اٹھایا کرتے تھے۔ وحشی گھوڑیوں اور گایوں کے شیر خوار بچے انسانوں اور انسانوں کے درمیان رہنے والے اپنے بھائی بندوں کے ساتھ پروان چڑھ کر بھی باوجود غیر معمولی توجہ اور تربیت کے تازیست مکمل بیل اور پورا شائستہ گھوڑا نہ بن سکتے تھے۔ ان کے اندر بڑھاپے تک یک گونہ وحشت اور غیر معمولی تیزی اور کچھ خود سری جیسا عنصر باقی رہتا تھا جو ان کے دیہاتی شائقین کو بہت بھاتا تھا۔ کیونکہ اس میں بیزاری یا کام چوری اور شرارت کو دخل نہ ہوتا تھا اور ان کے اس مزاج سے جو ان کے خلوصِ تخمیر کا جبلی نتیجہ ہوتا تھا بڑا پیار پیدا ہو جاتا تھا۔ تربیت کے دور میں یہ عام پالتو گھوڑی یا گائے کے بچے کی طرح آسانی سے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے تھے اور ان کا اسپورٹس مین طبیعت والا مالک ان کے ساتھ معاملت میں جتنا زیادہ آتا جاتا تھا اتنا ہی ان سے زیادہ محظوظ ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مخصوص دائرہ کے اندر ان کی تربیت پوری ہو جایا کرتی تھی اور ساری زندگی ان کے اور ان کے مالک کے درمیان ایک ہلکی جدوجہد چلتی رہتی تھی جس میں راکب کو تو ہمیشہ لطف ہی آیا کرتا تھا اور مرکب اگر لطف اندوز نہیں تو مکدر تو ہرگز نہ ہوتا تھا اور کام کے وقت کبھی یہ اور کبھی وہ اپنی من مانی کر کے بات بنا لیا کرتے تھے اور راکب اور مرکب میں عام آدمی اور اس کے پالتو جانوروں سے زیادہ محبت اور لگاؤ ہوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ بظاہر تو یہ تھی کہ ایسے کھلاڑیوں کے نزدیک ایسے جانوروں کی شاید غیر معمولی اہمیت ہوتی تھی جو اپنی نوعیت کی ندرت اور اس تہوّرانہ روایت کے ساتھ انہیں حاصل ہوتے تھے جن سے ان کے اسپورٹ کی ایک تاریخ وابستہ ہوتی تھی لہٰذا وہ اسے مثل کھلونے کے سمجھتے تھے اور ناز و نعم کے ساتھ پالتے تھے اور بڑی اچھی داشت اور دیکھ بھال کیا کرتے تھے اور شاید اس کے ردِ عمل میں جانور کو بھی غیر معمولی لگاؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ گرد و نواح میں یہ جانور عجوبہ تصور کیا جاتا تھا اور اپنے مالک کے اعلیٰ اسپورٹس مین اور بانکے کھلاڑی ہونے کا زندہ ثبوت، لہٰذا مالک کے لیے باعثِ فخر ہوتا تھا اور شہرت کا ذریعہ ہو جاتا تھا جو شاید ایک اسپورٹس مین کا صرف حق ہے اور اس کی طلب اس کی جائز کمزوری۔ دیہات میں مخصوص اجتماع شادی بیاہ، میلے ٹھیلے کے مواقع پر ایسی سواری پر نکلنا ہر خاص و عام کی نگاہوں کا مرکز بنا دیتا ہے اور ہم چشموں میں اک ذرا ممیز کر دیتا ہے۔ شاید اس احساس کو آجکل کے ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، ٹینس کے اسپورٹس مین اچھی طرح پہچانتے ہیں جو سینوں پر اپنے جیتے ہوئے مقابلوں کی یادگار تمغے اور نشان سجا کر اور سترھویں اٹھارویں صدی کے "بانکوں" والے رنگ برنگے شوخ ملبوس پہن کر روایتی بانکپن کے ساتھ سوسائٹی کے اندر فخریہ انداز میں چہکتے ہیں اور اپنے ڈرائنگ روموں کو قرنِ اولیٰ اور نشاۃِ ثانیہ والی یادگار ڈھالوں اور برچھوں کی نقل سے مزین کر کے فخریہ نمائش کرتے ہیں جن پر ان کی اس مہم کے سر کرنے کی تواریخ بھی کندہ ہوتی ہیں۔ انہیں یہ اپنی زبان میں "ٹرافی" کہتے ہیں۔ بس کچھ ایسی ہی جیتی جاگتی، اچھلتی کودتی، ہنہناتی ڈکراتی ٹرافیاں یہ جانور ہوا کرتے ہیں اور شاید اپنی اپنی ٹرافی کے متعلق شہری اور دیہاتی اسپورٹس مین دونوں کا جذبہ بھی ایک ہی ہوتا ہے، فرق اپنی اپنی توفیق اور پرواز کا ہے۔

پہلی مرتبہ جب میں پگ اسٹکنگ کے میدان میں اُترا تو اپنی چار آدمیوں پر مشتمل ٹیم کا سب سے نو عمر ممبر تھا۔ یہ روہیلکھنڈی راجپوتوں اور کچھ پُرانے فوجی انگریزوں کی ملی جلی پارٹی تھی اور وہ دور آ لگا تھا جب یہ طریقۂ شکار رخصت ہوتے ہوتے غائب سا ہو رہا تھا۔ عام طور پر جو فوجی انگریز پہلی جنگِ عظیم کے بعد آئے وہ ساونتی ذہنیت سے محروم تھے اور معاملہ بہت آسان تھا۔ ان کا شکار کا شوق جدید ترین ہتھیاروں اور مہلک ترین ایمونیشن کے ذریعہ ہی پورا ہو جایا کرتا تھا۔ برچھا لے کر سؤر سے بھڑنا ان کے بس کا روگ نہ تھا اور جسے شاید وہ FOOL HARDINESS کہا کرتے ہوں گے مگر میرے قرب و جوار کے کچھ روہیلکھنڈی راجپوت اور پٹھان خاندان اسے توریث اور روایت کے طور پر زندہ رکھنا چاہتے تھے اور شاید یہ اسپورٹ کے لطف کی سچی روح سے آشنا تھے اور چونکہ بریلی چھاؤنی بالکل قریب تھی لہٰذا وہاں سے چل کر ہمیشہ دو ایک پُرانے انگریز فوجی افسر بھی ان کا کھوج لگا لیا کرتے تھے جو اس کھیل کے رسیا ہوتے تھے۔ لہٰذا بات سال میں آٹھ نو مہینے بنی ہی رہا کرتی تھی۔ دونوں ایک ہی سے تھے۔ امن کے زمانے میں فوجی بھی مست ہوتے تھے اور یہ تو پنڈتوں کے مست ہوا ہی کرتے تھے اور ایک ان دونوں سے زیادہ کچھ ازلی مست قسم کا طبقہ ان نیم خانہ بدوش نیم کھیت مزدور قسم کے کنجڑوں، پاسیوں اور لودھوں کا تھا جو ان کے قرب و جوار میں ہی ڈیرہ ڈالے رہا کرتے تھے، ہمیشہ سے ایسے سخت قسم کے شکاروں میں بالخصوص پاسیوں اور کنجڑوں کے قبائل کا بڑا اہم رول رہا تھا۔ بھرپور جوش و خروش کے ساتھ کھوج لگانے، ہانکا اور ناکہ بندی کرنے میں دوش بدوش رہا کرتے تھے اور گوشت کے بڑے حصے کے شریک ہوتے تھے۔ اگرچہ شکار کے وقت اسپرٹ میں کسی سے پیچھے نہ ہوتے تھے بلکہ نازک موقع پڑ جانے پر اپنی جان پر کھیل کر بروقت بے اندازہ جرأت کا مظاہرہ کر جاتے تھے۔ یہاں تک کہ اس زمانہ میں خال خال بوڑھی عمر مگر قابلِ رشک اسپرٹ اور نوجوان قویٰ والے شکاری ایسے بھی موجود تھے کہ ساٹھ ستر کے پیٹے میں ہونے کے باوجود میدان میں آ دھمکتے تھے اور ایک آدھ کارِ نمایاں دکھا جاتے تھے۔ انہوں نے اس صدی کے شروع اور پچھلی صدی کے اواخر میں بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے اور متھرا سے لے کر میرٹھ تک "گنگا کپ" اور "کھادر کپ" کے مقابلوں میں بڑے بڑے فوجی جرنیلوں اور راجوں مہاراجوں پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی اور ٹرافیاں جیت جیت کر اپنا لوہا منوا لیا تھا، ان میں سے ہر ٹرافی کے ساتھ ایک بڑے شدید معرکہ کی روایت وابستہ تھی جو میں نے بالتفصیل ہر ایک سے ڈرامائی انداز میں سُنی تھی۔ ان میں سے اکثر سے میرے پشتینی تعلقات تھے اور ان کے بیٹے پوتے میرے شکاری ساتھی اور خاندانی دوست تھے جو اس دور کے ساونتی طبقہ میں اسی طرح توریث کے انداز میں چلتی تھی جس طرح زمین ——— انہی بزرگوں کے مدعو کرنے پر میں آٹھ سال قبل ہاتھی پہ بیٹھ کر شکار کا تماشہ دیکھنے جایا کرتا تھا جس کا میں نے مفصل تذکرہ پہلے کیا ہے اور جو شاید ٹریننگ کی پہلی سیڑھی تھی اور انہی بوڑھوں اور ان نوجوانوں کی ہمت افزائی نے مجھے اس شکار کے شوق سے آشنا کیا جو انہوں نے میرے یہاں گھوڑوں کا ڈیپارٹمنٹ اور مجھے بچپن سے گھوڑسواری کا شوقین پا کر دلایا تھا۔

میں اپنے خانہ زاد گھوڑے "بچّہ" نامی پر سوار تھا۔ یہ جوان عمر کا پختہ کار گھوڑا تھا۔ بلا کا مضبوط، غضب کا شائستہ، جبلتاً اتنا ذکی الحس کہ بغیر اشارہ کے ہی جیسے سوار کی مرضی بھانپ کر کام کرنے والا اور موقع اور ضرورت کے وقت اتنا تیز کہ بجلی کو ماند کر دے۔ رنگ ڈھنگ، عادت خصلت، صورت شکل ہر پہلو سے مکمل جانور تھا۔ نسلی اعتبار سے نجیب الطرفین عرب اور خالص کاٹھیاواڑی گھوڑی کا میل تھا۔ استاد شہامت خاں چابک سوار نے اس کی خداداد ارفع جبلّت کا اندازہ کر کے بڑی توجہ اور خاص شوق کے ساتھ

تربیت کی تھی جس پر انہیں ناز تھا۔ استاد شہامت خاں چابک سوار کی زیادہ عمر میرے تایا اور باپ کی خدمت میں کٹی اور ہمارے یہاں جتنے جانور زین، ٹمٹم، چوپہیے گاڑیوں وغیرہ میں اپنی سواری کے لیے رہے ان کا انہی کی رائے سے انتخاب ہوا اور انہی نے تربیت کیے اور میرے باپ اور سب بھائیوں اور تمام اہلِ خاندان کو انہوں نے ہی سواری کی تعلیم دی اور ہر ایک نے ان کا روایتی استاد والا ادب کیا۔ پگ اسٹکنگ کا تجربہ ان کا پرانا تھا۔ آدمی طبیعت کے شوقین لیکن خرچ سے تنگ تھے لہٰذا اِس صدی کے اوائل اور اُس صدی کے اواخر میں کبھی کبھی اچھی رقم کمانے کے لیے شکار کے زمانہ میں بڑے انگریز فوجی افسروں یا ذی حیثیت راجپوت زمینداروں کے یہاں " ہارس مین " کی معقول اُجرت پر وقتی خدمت کرنے پہنچ جایا کرتے تھے جو اس زمانہ میں ہر شکاری کا اپنا علیحدہ مشغلہ تھا اور اس کی ڈیوٹی پگ اسٹکنگ کے وقت شکار میں مالک کے تازہ دم گھوڑے لیے میدان کے اندر مناسب مقامات پر تیار کھڑے رہنا تھی آدمی بلا کے ذہین اور پیشہ ور اسپورٹس مین تھے لیکن سوّر کی صورت اور نام سے خلقی نفرت اور رجعت تھی۔ "بد جانور" کہہ کر پکارتے تھے لہٰذا عملی طور پر برچھا کبھی ناپاک نہ کیا ورنہ بڑے اچھے شکاری بن سکتے تھے لیکن جہاں تک فن کا تعلق ہے دیکھ دیکھ کر اور ساتھ رہ رہ کر انہیں بڑا اچھا عبور ہو گیا تھا۔ خیر "ہارس مین" کی حیثیت سے شکار کے میدان میں مناسب جگہ بدلنا تو ان کی ڈیوٹی ہی تھی جس میں وہ طاق تھے مگر کسی کسی وقت چلاّ چلاّ کر ہدایتیں بڑی اچھی اور مناسب دینے جاتے تھے۔ گھر میں چھوٹے بڑے کسی نے بھی میرے اس شوق میں پڑنے کو پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھا مگر استاد نے میری ہمت افزائی کی اور یہاں تک کہ ان میدانوں پر "بچّہ" کو ہفتہ عشرہ پیچھے لجا کر اس ماحول سے مانوس کیا جس کے اندر ایک قسم کے مقابلہ میں وہ اُترنے والا تھا ——————— اور دوسرے گھوڑے گھوڑیاں بھی تھے لیکن بچہ کے قد و قامت اور اس کٹری کے سوّروں کی بلندی، نیزے کے بانس کی لمبائی کو ہر پہلو سے خوب ٹھونک بجا کر استاد نے ہی تجویز کیا۔

اپریل کا مہینہ تھا جب ہم کیمپ پر پہنچے تو خاصی رات ہو گئی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر جلد ہی آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے کیونکہ علی الصبح شکار کو جانا تھا۔ یہ کوئی بڑا کیمپ نہ تھا تاہم تھے سب ہی لوازمات۔ ہانکا کرنے والوں کی پارٹی نے کئی جگہ سوّروں کی بیٹھکیں رات ہی سے بھانپ رکھی تھیں۔ ناشتہ کے بعد صبح ہی صبح قرعہ اندازی ہوئی۔ مقدّر کی بات دیکھیے پہلا نام میرا نکلا اور تین اور نام جو میرے ساتھ نکلے ان میں ایک وہیلر (WHEELER) نامی انگریز فوجی میجر تھا اور دو ٹھاکر راجپوت جن میں ایک بالکل نو وارد تقریباً میری ہی طرح اور دوسرا اچھا تجربہ کار خوب کھیلا ہوا شکاری۔ دریائے گنگا کی ایک چھانٹ کو پار کر کے سورج نکلتے نکلتے ہم اسی بازی گاہ میں پہنچ گئے اور قاعدہ کے مطابق ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ ریفری کی مخصوص آواز والی سیٹی پر سامنے گھنے جھاؤ میں ہانکا کرنے والوں نے شورِ محشر بپا کر دیا۔ بڑا باقاعدہ جھاڑا ہوا اور ناکہ بندی کے لیے دو ہاتھی داہنے بائیں دونوں سروں پر جن کا فاصلہ تقریباً میل بھر ہو گا ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک ہاتھی ہانکا کرنے والوں کے بیچوں بیچ چل رہا تھا اور اس کا فیل بان اور اس کے ساتھ دو آدمی اور کبھی اشاروں سے اور کبھی آواز سے بھاگتے ہوئے سوّروں کو دیکھ دیکھ کر ہانکا کرنے والوں کو مخصوص ہدایتیں دیتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی فیل بان کی ہدایت پر یہ ہاتھی سونڈ بلند کر کے رُخ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ باوجود مکمل انتظامات کے سوّر اس ہموار میدان کی جانب نہ نکلے جدھر کو امید تھی اور ہم لوگ تیار کھڑے تھے۔ دوسری جانب جدھر زمین ناہموار تھی اور جگہ جگہ گھٹنوں گھٹنوں گھاس کے

ٹاپو بھی کھڑے تھے ایکٹ سؤر نکلے۔ بہر حال ہمیں ریفری کے اشارہ پر گھوڑے دوڑاکر اُدھر جانا پڑا۔ ناہموار زمین اور جگہ جگہ گھاس نے قاعدہ کی پوری پابندی نہ ہونے دی۔ میجر صاحب گھوڑے سے گرے، ٹھاکر صاحبان جمے رہے لیکن ان کی زد پر کوئی سؤر نہیں آیا۔ تقریبًا تمام گھاس اور زمین کے نشیب و فراز میں چھپتے چھپاتے دریا کی جانب بھاگ گئے۔ یکدم ایک گھبرائے ہوئے سؤر نے گھاس کے ایک چھوٹے سے قطعہ سے نکل کر ایک ٹھاکر صاحب کی رکاب پر اُچھل کر منہ مارا۔ ایسا حملہ سؤر شاذ و نادر ہی کبھی کرتا ہے بلندی پر اُچھل کر بھرپور منہ بھی نہ پڑ سکا تھا، پھر وہ اُونی دبیز پٹیاں باندھے ہوئے تھے، خیریت گزری کہ دانتوں کا معاملہ پٹی کی تہوں تک ہی رہا اور دھجیاں اُڑ گئیں۔ ٹھاکر صاحب نے بھی برچھا مارا، وار خالی گیا اور سؤر پلٹ کر ذرا مڑتا ہوا میری جانب سیدھے ہاتھ پر بڑھا اور اس مڑتی ہوئی توپ کے گولے کی سی حرکت کو میں نے بچہ کو ایڑھ دے کر پوری رفتار سرپٹ میں برچھے کی اَنی پر لیا۔ غپ سے برچھا اندر گیا۔ پنجہ سے بازو تک ایک سرد ر سا دوڑ گیا اور وہ اُلٹ کر اُدھر گرا اِدھر بچہ نے رفتار میں ایک ذرا جھٹکا سا لے کر ذرا رُخ بدلا۔ سؤر کے ایسے شکار میں یہ چیز مستثنیات میں ہے۔ برچھا قلب کو پوری طرح چھید کر باہر آیا تھا، کچھ دور لڑھکتا تو رہا مگر دوسرے وار کی ضرورت نہ رہی۔ بس کوٹیں سی لگاتا، چیختا چنگھاڑتا اُدھر ذرا نشیب میں جا پڑا جہاں پہنچ کر کھڑے ہو کر نکلتا تو دم کنارے ٹوٹنے کی بھی گنجائش نہ رہی۔ بہت سستے چھوٹے۔ پہلا وار اور وہ بھی ایک ہی۔ اس دن دوپہر کے کھانے میں بڑا مزا آیا۔ استاد شہامت خاں نے گھی شکر ملا کر بچہ کی تواضع کی۔ بار بار بوسے لیے۔ لڑکپن کی اس مہم کو اس ٹھاٹ کے ساتھ جیت لینے پر میرا سر پرانے پرانے ساتھیوں کے درمیان فخر سے اونچا ہو رہا تھا اور درحقیقت سب کی نگاہیں مجھ پر بار بار اٹھتی تھیں۔ استاد شہامت خاں اینڈے اینڈے پھرتے تھے۔

دوسری صبح کئی میدان منتخب ہوئے۔ ایک قرعہ میں میرا نام بھی آ گیا۔ استاد رضا خاں جو روہیلہ پٹھان تھے میرے ساتھ میں پڑے۔ باقی دو فوجی انگریز تھے۔ صبح سے کئی ٹپیاں ہوئیں۔ لیکن یہاں بھی زمین ناساز گار تھی، ویسے بچہ کو ناہموار اور گھاس پھونس سے گھری ہوئی زمین پر ہر رفتار سے چلنے میں پوری مہارت تھی اور سؤر پر خوب لگتا تھا۔ دونوں انگریز فوجی اپنے گھوڑوں سے گرے۔ سؤر کثرت سے تھے لہٰذا کسی ایک پر ہی انحصار نہ تھا۔ ٹیم میں کسی قدر طوائف الملوکی اور کتابی قاعدہ کی خلاف ورزی کے آثار پیدا ہو گئے تقریبًا ہر ایک نے اپنا ایک ایک سؤر سامنے رکھ کر کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک صاحب بہادر تو اُٹھ ہی نہ سکے۔ دوسرے نے سنبھل کر گھوڑا پکڑا اور برچھا اٹھا لیا۔ پورے میدان میں استاد رضا خاں اور میں رہ گئے اور گھبرائے بوکھلائے ہوئے تین سؤر جو کبھی چھدری گھاس میں ذرا غائب ہو جاتے تھے اور کبھی اونچے نیچے میدان میں باہر نکل آتے تھے، ہمارے سامنے تھے۔ نہ معلوم کس وقت ایک فوجی انگریز ہم میں پھر شامل ہو گئے اور دوسرے بیچارے کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور ان کا "ہارس مین" بڑی مشکل سے انہیں اٹھا کر لے گیا۔ قسمت کی بات دیکھئے میدان کے بالکل مسطح اور چھچھوری مٹی کے ایک حصہ پر جیسے ہی میں نے ایک بڑا کامیاب حملہ کرنے کے لیے بچہ کو پوری سرپٹ دوڑایا، وہ ٹھوکر کھا گیا اور میں نے آگے کو پوری قلابازی کھائی اور بچہ اُدھر گھٹنوں کے بل آکر رفتار میں سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے لوٹ پوٹ سا ہو گیا۔ میں سب کچھ بھول گیا اور خود اپنے اس تیزی کے ساتھ اٹھ کر صحیح و سالم کھڑے ہو جانے پر متعجب سا ہو گیا۔ بچہ بھی صحیح و سالم اسی معیار کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہوا جو اس وقت اس کی رفتار کا تھا۔ بات بن گئی۔ وہ مجھ سے تقریبًا سو گز دور

جا پڑا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھا اور وہ میری جانب۔ برچھا اٹھا کر بغیر رکاب میں پاؤں دیے جھٹ سے پھر زین پر پہنچ گیا۔ اب جائزہ لیا تو دو سؤر میدان میں باقی تھے۔ صاحب اور خاں صاحب دونوں علیحدہ علیحدہ تعاقب میں تھے۔ میں نے نئے سرے سے کھیل شروع کیا اور چند ساعت میں دریا کی ایک چلتی ہوئی شاخ کے کنارے میدانِ کارزار گرم ہوگیا۔ ایک سؤر نے سیدھا پانی کے اندر رُخ کر دیا اور صاف تیر گیا۔ دوسرے نے بھی کچھ ایسا ہی رُخ کرنے کا انداز بنایا۔ میں نے پانی کے کنارے پر راستہ روک کر حائل ہونے کے لیے بچہ کو بڑی تیزی سے بڑھایا۔ پیچھے سے خانصاحب اور صاحب بہادر بڑھے۔ سؤر زچ ہو کر ہمارے مثلث حصار کے اندر کھڑا ہو گیا، گھوڑے آپ ہی آپ ہلکے پڑ گئے اور جب انتہائی مدافعانہ انداز جارحانہ سا ہو گیا تو خاں صاحب اور صاحب بہادر کے گھوڑوں نے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا، دھاڑتے چنگھاڑتے سؤر پر جس کی توجہ میری جانب بہت کم تھی اور ان دونوں کی جانب زیادہ بچہ کو پوری باگ چھوڑ کر اور بھرپور مہمیز کر کے بڑھایا مگر عین زد پر پہنچ کر بچہ نے غالباً ڈر کر اک ذرا رُخ بدل سا دیا، برچھا پڑا لیکن اوچھا۔ قاعدہ کے مطابق شکار میرا ہو گیا۔ بدحواسی میں برچھے کی نوک چھو جانے سے انتہائی غیض و غضب میں پھر کر سؤر نے صاحب بہادر پر حملہ کیا جو اتفاق سے اس کے عین سامنے زد پر تھے۔ برابر سے بجلی کی طرح خانصاحب نے گھوڑا بڑھا کر بڑا بھرپور ہاتھ ڈالا مگر وہ اُلٹ کر سنبھلا۔ سنبھلتے سنبھلتے صاحب بہادر نے دوسرا اس سے زیادہ بھرپور وار کیا۔ اب کی مرتبہ اُلٹ کر قلابازیاں کھاتا لڑھکتا پانی میں جا گرا اور پھر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک بہتے ہوئے پانی میں اس کے خون کی آمیزش کا تماشہ دیکھتے رہے۔ دوپہر کو جب سب جمع ہوئے تو ضابطہ پر بحث ہوئی۔ ریفری صاحب جو پُرانے فوجی اور نیم انگریز تھے اور اب بریلی چھاؤنی میں کافی شاپ چلاتے تھے کہہ رہے تھے کہ چونکہ شروع سے ہی قواعد کی پابندی نہیں ہوئی لہٰذا یہ شکار کسی کا بھی نہیں مانا جائے گا حالانکہ ساتھیوں نے میرا تسلیم کر لیا اور ٹرافی کا حق دار مجھ کو قرار دیا۔

اس کے بعد اس پروگرام میں مجھے کوئی قابلِ ذکر چانس نہ مل سکا۔ بہرحال پہلی شو نہایت کامیاب رہی اور پارٹی کے چمکدار اراکین میں آ گیا۔ دوسرا پروگرام جس میں میں نے شرکت کی اسی سال اکتوبر میں بنا۔ موسم تقریباً ویسا ہی تھا البتہ دوپہر کے وقت دھوپ میں تمازت پیدا نہ ہوتی تھی۔ یہ رام گنگا کی کٹری میں تھا۔ ہوا یوں کہ سننے میں آیا کہ ایک مست سؤر نے کہیں پر گاؤں والوں کی بیل گاڑی جسے مقامی زبان میں ادّھا اور وہ مردہ کہتے ہیں اور جس سے سواری اور تھوڑی بار برداری دونوں کام لیتے ہیں، خشمناک ہو کر اُلٹ دی بیلوں کو زخمی کیا جن میں سے ایک تو جان بچا کر بھاگ گیا، دوسرے کا پیٹ پھاڑ دیا۔ کسانوں کے پاس صرف دو کھٹل قسم کے برچھے تھے، باقی کے پاس لاٹھیاں تھیں، انھوں نے شروع میں تو فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ایک کے مقابلہ پر سؤر آ ہی گیا تو پھر سب گھوم پڑے۔ لاٹھی والے پر ہاتھ ڈالتے رہے مگر سنگ خارا کی چٹان پر ضربیں تو کیا کارگر ہوتیں مگر ان کھٹلے برچھے والوں نے بمشکل سب کی جان بچائی اور سؤر کو مار دیا۔ کہتے ہیں کہ اس پورے مجادلہ میں تقریباً ڈھائی تین گھنٹے لگے۔ یہاں تو ویسے ہی تیار بیٹھے تھے۔ آگ کی طرح دو دن کے اندر تمام پارٹی میں خبر پھیل گئی اور جب تک ہم لوگ سنبھلیں دوسری خبر آئی کہ رات کے وقت ایک کسان کو مار ڈالا جو اپنی دھان کی فصل کے کھلیان میں الاؤ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کئی سؤروں نے کھلیان کی جانب رُخ کیا۔ کھٹکے پر اس نے شور مچایا اور اُدھر لاٹھی ہاتھ میں لیے بڑھا۔ سؤروں کی پوری ڈاڑھ تھی، اور تو سب بھاگ کھڑے ہوئے، اس بڑے مست سردار نے جو سب ڈاڑھ سے علیحدہ دوسری

جانب گھٹنوں کے اوپر سے دھان کی بالیاں کتر کتر کر کھا رہا تھا بے خبری میں حملہ کر دیا۔ اس کا ایک اور ساتھی جو دوسرے کھیت پر گنے کی فصل میں مچان باندھے اوپر سے دیکھ رہا تھا مدد کے لیے شور مچاتا دوڑا۔ اس کے پاس دیہاتی کٹشل برچھا تھا مگر یہ کچھ کر نہ سکا۔ چاندنی رات میں سؤر کسان کو چیتھڑے کی طرح الٹ پلٹ رہا تھا اور اس کا بیان ہے کہ شروع میں تو چند چیخیں سنائی پڑیں پھر تو سؤر کی خشمناک غراہٹ اور سرسراہٹ اور ہڈیوں کی آواز کے سوا اور کچھ سنائی ہی نہ پڑا۔ یہ الٹے پاؤں بھاگ آیا اور اپنے مچان پر چڑھ گیا۔ صبح کو جب پولیس نے پنچایت نامہ بھرا تو اس کی لاش پر اسّی زخموں کے نشان تھے اور پیٹ میں دو جگہ لمبے لمبے شگاف تھے اور کل آنتیں اوجھڑی باہر —— اس خبر پر بڑی جلدی پارٹی منظم ہو گئی۔ کٹری میں پہنچے تو اندازہ ہوا کہ اس مرتبہ سیلاب کچھ اس طرح سے چڑھا اترا ہے کہ یہاں سب جنگلی جانوروں کی کثرت باقی رہ گئی ہے اور سیلاب اترنے کے بعد یہ کسی اور جانب منتشر نہیں ہوتے ہیں۔ جنگلی گائیں، نیل گائیں بھی ہمیشہ سے بہت زیادہ ہیں اور کھیتی کے لیے دردِ سر بن گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہم نے بعض خانہ بدوش قبائل کے ڈیرے کثرت سے دیکھے ویسے تو کسی مخصوص سؤر کا پتہ چلا کر اسے برچھے سے مارنا ایسا تھا کہ بھوسے کے ڈھیر میں ایک سوئی تلاش کرنا۔ لہٰذا پروگرام تو پگ اسٹکنگ ہی کا تھا لیکن ہم لوگ اپنی رائفلیں بندوقیں بھی ساتھ لے گئے تھے جس طرح بھی ہو خونی سؤر کا خاتمہ کرنا ہی تھا۔ رات کو قیام کیا اور صبح ہی کو پتہ چلا کہ کنجڑوں نے رات جال میں وہ مخصوص سؤر پھانس لیا۔ ناشتہ کر کے ذرا دیکھنے پہنچے تو وہاں علی الصبح ہی حصے بخرے ہو چکے تھے انہوں نے جال میں پھنسنے ہی اپنے بڑے لمبے لمبے پھل والے برچھوں سے فوراً ہی مار ڈالا کیونکہ انہیں اس کے ڈیل ڈول اور شہ زوری کے انداز سے اندیشہ ہوا کہ کہیں جال کی رسیاں توڑ نہ دے جو پاؤں کے انگوٹھے برابر موٹی ہوتی ہیں اور ڈھاک کی جڑ کے چھوڑ ریشہ سے بٹی جاتی ہیں جس میں کوٹنے پیٹنے کے بعد فولاد کی سی لچک اور سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے جال کو مقامی زبان میں کھابڑ کہتے ہیں۔ اس میں تقریباً تمام چوپائے پھانسے جا سکتے ہیں۔ بڑی شہرت تھی اس سؤر کے ڈیل ڈول کی، کانپیں تو خانہ بدوشوں نے اس ڈر کے مارے وہیں کھائی نہیں کہ کہیں ٹھاکر لوگ ہتھیا نہ لیں مگر گوشت انہوں نے حصہ برابر تول کر آپس میں تقسیم کیا تھا لہٰذا وزن بتایا جو پونے تین من تھا۔ پاؤں کی نلیاں دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کٹریوں کے عام سؤروں سے کہیں زیادہ بلند بھی تھا۔ بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ اگست ستمبر کے کسی سیلاب میں رام گنگا یا کسی اور معاون دریا کے ذریعہ بہتا ہوا کمایوں کی ترائی سے یہاں تک زندہ آ پہنچا تھا ورنہ کٹری کے سؤر کی اونچائی شاذ و نادر ہی کبھی تیس انچ سے اوپر جاتی ہے اور یہ سؤر یقیناً چھتیس انچ بلند تھا اور اس کا وزن ڈھائی من سے بھی دس سیر زیادہ تھا جبکہ کٹریوں کے سؤروں کا وزن کبھی ڈیڑھ من سے اوپر نہیں جاتا۔

چلیے جس شکار کی بڑی شہرت تھی اور جس کے لیے بڑے اہتمام اور شوق کے ساتھ چلے تھے وہ یوں گیا لیکن یارانِ میکدہ جمع تو ہو ہی گئے تھے اس بہانہ، پھر ملا جلا معاملہ تھا بندوقیں اور رائفلیں بھی ساتھ تھیں، گھوڑے برچھے ریفری استاد سبھی کچھ تھے اور سؤروں کی کثرت تھی۔ نیل گائے، ہرن وغیرہ بھی تھے۔ جگہ جگہ گڑھوں اور جوہڑوں میں مرغابیاں بھی بھری پڑی تھیں۔ دریا کنارے کھلے ریت کے میدان پر ٹانگ اٹھائے قازوں کے تنگ بھی سوتے نظر آتے تھے، سرخاب تو ہر وقت دردناک آواز میں بولتے ہی سنائی پڑتے تھے۔ اس مرتبہ میرے ساتھ بچہ اور اس کا معاون دوسرا گھوڑا رخش نامی تھا۔ رخش، بچہ کا مختلف البطن بھائی تھا۔ اس کی ماں پنجاب کے علاقہ تھل کی گھوڑی تھی۔ یوں تو رخش بڑا مکمل جانور نکلا تھا، ہر اعتبار سے بچہ کا جواب معلوم ہوتا تھا لیکن ایک خاص چیز یہ تھی کہ اس کی

پیدائش حساب کی رُو سے دو ہفتہ قبل ماں کی غذا کی بے احتیاطی کے سبب ہوگئی تھی جس کے صدمہ سے ماں تو چند ہی روز بعد مر گئی، یہ بچ گیا۔ کلیتاً بکری اور گائے کے دودھ پر پلا تھا اور چونکہ آختہ کرا دیا تھا لہٰذا مالک، سائیس، بہشتی اور رگراس کٹ ہر ایک آدمی اور مویشی خانے کے اندر ہر جانور حتیٰ کہ بھینسوں تک سے جو گھوڑے کی ازلی دشمن ہوتی ہیں دوستی رکھتا تھا۔ پگ اسٹکنگ میں پہلے بھی ساتھ آیا تھا، مگر بچہ ہی کافی رہا تھا۔ میخیں اکھاڑنے اور ٹٹیاں پھلانگنے پر میں نے اس پر بڑی اچھی مشق کی تھی اور پچھلی مرتبہ جب آیا تھا تو استاد شہامت نے پگ اسٹکنگ کی تربیت اپنے طور پر دے دی تھی اور انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ رخش سؤر پر بچہ سے بھی زیادہ اچھا لگے گا اور بہترین کام کرے گا۔ ویسے بچہ سوتیلا بھائی ہونے کے باوجود اس سے کہیں بڑھا ہوا جانور تھا۔ پہلے تو عمر کا پختہ تھا اور کم و بیش دس بارہ دیہاتی گھوڑ دوڑیں اچھے اچھے فاصلوں سے جیت چکا تھا اور رخش لایا تھا تھوڑے بہت ڈھنگ باپ بھائی کے، مگر پہلے تو نو عمر تھا اور شائستگی میں پورا نہ اُترتا تھا۔ تاہم پچھلی مرتبہ اگرچہ رخش کی ضرورت نہ پڑی اور کوتل ہی رہا لیکن استاد چوری چھپے کیمپ اور بازی گاہ سے دور لے جا کر جب موقع ملتا اس کو سؤر کے تعاقب میں ڈال کر ٹریننگ دیتے رہے تھے اور کم سے کم وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بھی زندگی کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ بعض گھوڑے سؤر کے شکار میں لطف کا اسپورٹ لیتے ہیں۔ بچہ اور رخش دونوں کو تجربہ کے بعد میں نے ایسا ہی پایا۔ بچہ ایک پختہ کار تابعدار خادم کی طرح جیسے دل کے اندر کی بات پہچان کر ڈیوٹی کرنے کے جذبہ سے سؤر کے پیچھے چلا کرتا تھا اور بہت جلد شکار کی جملہ تکنیک سمجھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ رفتار کی پوری تیزی جاری رکھتے ہوئے برچھا پڑنے کے بعد نکالنے کیلئے بھی پورے جسم کو ایک مرتعش انداز سے متحرک کر کے باہر نکالنے کے عجیب فن سے بھی آشنا تھا جس میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گھوڑا، سوار اور برچھا کل کا کل ایک یونٹ ہو گیا، جیسے بعض اوقات اپنی پوری طاقت سوار کے بازو اور برچھے کے اندر بھر دیتا تھا اور پھر ایسے ہی فنکارانہ انداز میں اسی مرتعش قسم کے جھٹکے کے ردِعمل میں برچھا نکال بھی لیتا تھا۔ دیکھنے والے اور ساتھی اس کا اندازہ کر کے عش عش کر گئے اور بچہ کی بے پناہ حسّاس اور تیز جبلّت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ جیسے اس نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ برچھے کا عمل کیا ہوتا ہے اور سوار کی مرضی کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سؤر کی جانب سے کچھ خشونت اور دشمنی کا جذبہ ہوتا تھا، وہ اسپورٹ والی بات نہیں تھی۔ رخش کو استاد نے صرف سؤر کے پیچھے کُتّے کی طرح دوڑنے کے شوق سے آشنا کر دیا تھا۔ استاد برچھا تو مارتے ہی نہ تھے، حتیٰ کہ ایسی ٹریننگ کے وقت ہاتھ میں وہی اپنا فتحپوری ساخت کا کوڑا رکھتے تھے جو ان کے ہاتھ میں ساری عمر رہا حتیٰ کہ کسی بھی قسم کے اجتماع کے وقت بھی ساتھ جایا کرتا تھا۔ رخش تیزی کے لحاظ سے بارود کی پوٹ تھا۔ اک ذرا سے اشارہ میں بھک سے اُڑ جانے والی جبلّت، بڑی توجہ کے باوجود پانچویں سال میں پہنچنے پر بھی اس کی تیزی پر تربیت غالب نہ آ سکی تھی۔ ویسے ہر اعتبار سے نسلی شرافت میں اپنی نظیر آپ تھا مگر جبلّت کے ہاتھوں مجبور سا تھا۔ عمر میں بچہ سے تین سال چھوٹا تھا اور سب کو امیدیں تھیں کہ بچہ کا صحیح جانشین بنے گا۔

اس ٹرپ میں بہت طوائف الملوکی رہی اور قواعد و ضوابط کی پابندی بالکل نہ نبھ سکی۔ چلنے تو پہلے کی طرح قرعہ اندازی کے ذریعہ چار چار پانچ پانچ سواروں کی ٹیمیں بنا کر اس مرتبہ بھی، مگر کئی وجوہات کی بنا پہ وہ فیلڈ میں کھیلتی ہوئی ٹیم کا انداز قائم نہ رہ سکا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ سؤر بہت کثرت سے تھے، ہانکا اکثر جگہ بے معنی سا ہو گیا۔ تقریباً ہر جھاڑی یا ذرا سے نشیب میں، کیچڑ کے اندر سے دو ایک سؤر اُچھل پڑتے تھے۔ اس افراتفری سے وہ نیم گورے فوجی ریٹائرڈ افسر جو ہمیشہ سے رہبری کی خدمت انجام دیا کرتے تھے اور اس

کے گوشت کا اچھا حصہ اور مسلمانوں کا شکار کل کا کل سمیٹ کر اور نمک سود کر کے غالباً اپنی کافی شاپ میں بیچنے کے لیے لے جایا کرتے تھے، بہت ہنر مند ہوتے ۔ شروع میں کچھ دیر ان کی چلی پھر انہوں نے میدان چھوڑ دیا۔ صرف اپنے اپنے ہارس مین رہ گئے ۔ بعض لوگوں کے بڑے اچھے ہاتھ رہے ۔ کبھی ایسا ہوا کہ ایک سوار اپنی ٹیم چھوڑ کر دوسری ٹیم سے جا ملا اور کبھی کوئی من چلا تنہا ہی کام کرتا رہا۔ انگریز ساتھیوں نے اسے بہت محسوس کیا ۔ بعض تو ناراض ہو کر اور میدان چھوڑ کر کیمپ میں جا کر بیٹھ گئے ۔ ڈٹا کر بچے خوب خوب ہاتھ دکھاتے رہے۔ مجھ کو دو مرتبہ اِدھر یا اُدھر کا سامنا ہوا ۔ میں نے ایک معقول سے سؤر پر برچھ کو لگایا مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ ہم تین ساتھی تھے ۔ ایک کسی اور جانب رم گئے تھے اور کہیں اور وار کیا بلکہ یوں کہئے بیداد شجاعت دعجب مردانگی دکھا رہے تھے ۔ بڑی سخت محنت پڑی اور بعض جگہ جیسا کہ بیان کیا کہ خطرہ کا بھی سامنا ہوا لیکن کچھ نہ بنا ۔

شام کو جب کیمپ پر جمع ہوتے تو صاحب لوگ بہت شاکی تھے اور ہم سب کو ضابطہ میں پکڑ رہے تھے ۔"کالے با کالے" معاملہ ہوتا تو ہم میں سے ایک بھی ایک کے ضابطہ کی پکڑ میں نہ آتا مگر یہ لوگ آدمی کم ضابطہ کے اسپیچو فوجی افسر زیادہ تھے ۔ پھر کالوں کے یہاں گوروں کے مہمان "حسن اور اس پر حسنِ ظن" ہم سب نادم تھے اور میزبانِ خاص تو پانی پانی ہوتے جا رہے تھے ۔ ساتھ ہی ساتھ حاکم والا مخصوص اندازِ شکایت جس میں سے حکومت کا بڑا خوبصورت اور سنگین پہلو بھی کسی کسی وقت اچھل اچھل پڑتا تھا ۔ اس میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ انہوں نے اپنی فوج کے اس ضابطہ کا بھی حوالہ دے دیا جس میں بے ضابطگی کی سزا موت ہے اور کیمپ چھوڑ کر مخصوص انداز میں رُوٹھ کر چلے جانے کی دھمکی بھی دے دی جس میں حاکم اور مہمان دونوں فریقوں کا جلالی و جمالی امتزاج تھا مگر اللہ بھلا کرے منشی سلامت رائے کا انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ رو براہ کرا دیا ۔ منشی سلامت رائے عرف سکینہ بابو پرانے خاندانی کا یستھ زمیندار تھے اور اپنی جاگیر اور فارسی دانی دونوں چیزوں کا سلسلہ مغل دور سے ملایا کرتے تھے اور پرانی اسناد اور قدیم وثیقوں کے ذریعہ ان کے جدِ امجد منشی الفت رائے بارہا یہ ثابت کر چکے تھے کہ یہ جاگیر اور اس کے ساتھ منصب انہیں عسکری خدمات کی بنا پر شہنشاہ جہانگیر نے عطا فرمایا تھا جو مرورِ زمانہ کے ہاتھوں اب ایک درمیانی حیثیت کی زمینداری میں تبدیل ہو گیا ہے لہٰذا اس پہلو سے وہ منشیوں کی صف سے نکل کر شمشیر زنوں کی صف میں آ چکے تھے لہٰذا شکار کا شوق انہیں تو ریث میں ملا تھا اور روہیلے پٹھانوں اور ٹھاکروں میں سربلند یوں نظر آتے تھے کہ زیورِ علم سے آراستہ تھے اور پرانے فارسی داں تھے ۔ علمِ مجلسی سے واقف ، پرلے درجہ کے لستان اور زبانونی ، ساتھ ہی ساتھ بڑے موقع شناس اور چابک دست ابن الوقت ، مغلوں کے دور میں رائے رایان کے خطاب سے جدِ امجد سرفراز رہے اور انگریزوں کے دور میں منشی جی کے والد اور پھر منشی جی خود رائے بہادر قرار پائے ۔ پھر اپنے جدِ امجد کے آباد کردہ جہانگیر نگر نامی گاؤں میں بسے ہوئے تھے جس کو وہ اس کی لمبائی چوڑائی کے لحاظ سے کبھی گاؤں نہیں کہا کرتے تھے بلکہ قصبہ کہا کرتے تھے اور بتایا کرتے تھے کہ تمدن قصبوں میں پیدا ہوا کرتا ہے اور شہروں میں جا کر فنا ہوتا ہے لہٰذا ایک تمدن کے بانی ہونے کے داعی بھی تھے جس پر فخر کیا کرتے تھے ۔ کچھ تاریخی پس منظر ، کچھ علمی وقار کا دعویٰ اور پھر ماشاء اللہ معقول سی مالی حیثیت اور سب پر طرّہ ان کی چرب زبانی خود کو اپنے سے بہت زیادہ بڑا شکاری بھی ثابت کر دیا تھا ۔ حالانکہ جانتے بہت کچھ تھے اور آتا کچھ بھی نہ تھا ۔ ہر شکار میں نہایت

اہتمام کے ساتھ جایا کرتے تھے لیکن شکار کھیلنے سے زیادہ شکار دیکھ کر مزا لوٹا کرتے تھے اور اپنے فن کے متعلق (گویا جس کے پوری پارٹی میں تنہا وہ خود ہی ماہر تھے) مظاہرہ کرنا اک ذرا جیسے کچھ بچوں کے ساتھ کھیلنے کے انداز سے دیکھا کرتے تھے۔ ادھر یارانِ میکدہ بھی ان کے ظرف سے اچھی طرح واقف تھے مگر دونوں ہی خود فریبی اور تجاہلِ عارفانہ میں گرفتار رہنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے۔ صاحب لوگوں نے منشی جی کو بھی باڑھوں پر رکھ کر کل کے شکار میں حصہ لینے پر آمادہ کر لیا جو اکثر معاون ریفری کی یا جگہ جگہ ماہرانہ کی بخیریت قسم کی خبر پہنچانے کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ ویسے یہ بات نہیں کہ منشی جی اناڑی ہوں۔ ہر پہلو سے خاصے شکاری تھے لیکن شاعر صفت اور سخن فہم ہونے کے سبب شکار میں مناظرِ فطرت سے زیادہ لطف اندوز ہوا کرتے تھے اور "بحمد اللہ بندہ بخیریت تمام غریب خانہ واپس پہنچ گیا" وغیرہ قسم کے لکھنے والے لوگ تھے۔ خلوص، روایت، فن، وضعداری اور مصلحت اور دور اندیشی اور نہ معلوم کس کس چیز میں بڑا متناسب مجموعہ منشی جی کی تشکیل میں ڈھل گیا تھا۔ پہلے تو پرانے اکھاڑے کے پٹھے باز کی طرح منشی جی نے بنوٹ کے سے ہاتھ دکھا کر گلو خلاصی کی بہت کوشش کی مگر فوجی انگریز کا اصرار ان کی راتب بہادری پر غالب آ ہی گیا۔ راتب حذف کر کے صرف بہادری پر تکیہ کرنا ہی پڑا، اور ایسے گئے گزرے بھی نہ تھے۔ بہتوں سے اچھے نیزہ باز اور بال باندھی گولی چلانے والے قادر انداز تھے مگر رائفل، بندوق، نیزہ سب پر عقل کی کارفرمائی بہت زیادہ غالب تھی۔ نہ معلوم کتنی مصلحتیں انہیں کھل کر شکار میں حصہ لینے میں مانع رہا کرتی ہوں گی۔ ویسے یہ بات نہیں۔ اپنے دو گھوڑے اور دو رائفل، ایک بندوق سبھی لوازمات کے ساتھ آئے تھے لیکن میزبانِ خاص ٹھاکر گلاب سنگھ کے معاونِ خاص تھے۔ کیمپ کا انتظام، انگریزوں کا کچن، ہندوؤں کی رسوئی اور مسلمانوں کا باورچی خانہ بیک وقت آگ، پھونس اور پانی والی ذات پات اور چھوت چھات کی تمام تر احتیاطوں کے ساتھ سب انہی کے حسنِ انتظام اور دیکھ بھال سے ایسی خوبصورتی کے ساتھ چلا کرتا تھا جیسے ہر ایک اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔

قرعہ اندازی رات ہی میں ہو گئی تھی اور منشی جی نے بجائے چار کے پانچ والی ٹیم میں کمال چابک دستی کے ساتھ اپنا نام شامل کرا یا جس میں ان کے ساتھ "قرعۂ فال میں مجھ دیوانہ کا نام بھی آیا"۔ سب چھوٹے بڑے منشی جی کا بڑا احترام کیا کرتے تھے مگر ان کے پاس "داہنے سے" "بائیں سے" "واہ ہاتھ ڈالو" "کیا کہنے واہ" "بہت اچھے" "بہت اچھے" "سبحان اللہ سبحان اللہ" وغیرہ ہمت افزا الفاظ کی ترکیبیں ہوا کرتی تھیں اور موقع بموقع کھیل کے میدان میں ان کی زریں ہدایات اور بارہیں سننے کی حد تک انہیں بہت کام کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ پانچوں سواروں میں اپنے ساتھ ان کا نام دیکھ کر میں دل ہی دل میں جزبز ہو کر رہ گیا۔ بقیہ دو ساتھی راجپوت ٹھاکر تھے جن میں ایک ہمارے میزبانِ خصوصی کنور گلاب سنگھ عرف سنگھ بابو میرے دیرینہ ساتھی اور اچھے شکاری تھے۔ ایک نوزائیدہ قسم کے نیزہ باز شکاری فوجی کپتان بھی تھے جو ان بوڑھے انگریزوں کے ساتھ لگے چلے آئے تھے اور پرانی پگ اسٹکنگ کی کتابیں پڑھ کر اور بریلی چھاؤنی کے کمسریٹ کے گھوڑوں پر چڑھ کر شہسوار بنے تھے البتہ پولو کے چیمپین تھے اور اسی نے ان کی ہمت پگ اسٹکنگ کے میدان تک بندھا دی تھی۔ ہاں شاید دو ایک مرتبہ ہاتھی اور ایک دو مرتبہ گھوڑے پر سوار ہو کر تماشہ دیکھنے میں بھی شرکت کر چکے تھے ——— اور اپنے خاں صاحب رضا خاں۔

رات کو میں کچھ بے اطمینانی کے انداز میں بستر پر لیٹا۔ شکاری اور جواری بلا استثنائے قوم و عقیدہ ایک حد تک توہمات اور شگون کا شکار رہا کرتے ہیں اور ایسے موقع پر اور بھی جب حالات میں اک ذرا بے اطمینانی ہو۔ سویا تو خوب گہری نیند لیکن خواب کچھ ایسے ہی ویسے نظر آئے۔ آنکھ جو کھلی تو اندازہ کیا کہ طبیعت میں تکدر سا رہا چاہوا ہے اور دس گھنٹہ کی گہری نیند بھی کل کی بے تکی تکان نہیں اتار سکی ہے۔

ناک پر ہاتھ گیا تو الٹا نتھنا چل رہا تھا۔ خیر تکان تو چار انگڑائیوں نے ہی رفع کر دی۔ منہ اندھیرے رفع حاجت کے لیے باہر گیا تو کہار پر نظر پڑی جو خالی کنستر کندھے پر لٹکائے دریا کی جانب پانی لینے جا رہا تھا۔ اونہہ، سب بکواس! توہمات! حالانکہ جی میں آیا کہ ٹھوکر ماروں اس کے کنستر پر اور اس پر بھی۔ آگے جو پھونس کی ٹٹی کے بنے ہوئے بیت الخلاء کی جانب بڑھا تو یک چشم حلال خور اندر سے نکلا۔ بس دھک سے ہو گیا۔ بھلا یہ حرام خور صبح ہی صبح یہ دیکھنے گیا تھا کہ کوئی بیت الخلاء گندہ تو نہیں ہے۔ میرے ہی سامنے پڑنے کو رہ گیا تھا؟ لاحول ولا قوۃ! بیکار باتیں سب! میں نے جیسے اپنے توہمات پر نادم ہونے کی کوشش کی مگر یہ تو دل کا معاملہ تھا، جی میں آیا اس کانے کا منہ نوچ لوں —— اور پھر حرام زادے نے چوکیدارہ والے انداز میں اکڑ کر سلام بھی کیا۔ میں جواب دیئے بغیر منہ پھیر کر بیت الخلاء میں چلا گیا اور وہاں جتنی دیر رہا ایسے طفلانہ بلکہ جاہل عورتوں والے واہمہ پر اپنے اوپر نفرین کرتا رہا۔

اور جب باہر آیا تو یوں تو ذہن سے ہر چیز محو ہو چکی تھی اور قرعہ اندازی کی مقرر کردہ ٹیم کے دو ساتھیوں کی غیر اعتباری اور نامانوسیت، پچھلے روز کی تکان اور طوائف الملوکی، صبح ہی صبح یکے بعد دیگرے دو بدشگونیاں ہر چیز بھول چکا تھا، پھر بھی میرے اندر ہلکا ہلکا تکدر سا تھا جو شکار کو جاتے وقت بالکل منافی بلکہ برعکس تھا۔ اپنے اپنے خیموں میں تیاریاں ہو رہی تھیں، ساتھ ہی ساتھ خیمہ خیمہ چاء اور ناشتہ لگایا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ خیمہ میں خانصاحب رضا خاں تھے۔ وہ نماز سے فارغ ہو چکے تھے اور کپڑے پہن کر پنڈلیوں پر پٹیاں کس رہے تھے۔ استاد شہامت خاں کی مدد سے ہم نے کپڑے پہنے اور رفل بوٹ کے فیتے باندھ کر جب دوسرے گیٹرس کا آخری بکسوا لگا رہا تھا تو بے اختیار مجھے چھینک آگئی، جس پر روایتی الحمد للہ منہ سے نکلنے کے ساتھ دل میں واہمہ گزرا اور جب استاد نے یک گونہ تعجب کے ساتھ میری جانب دیکھا تو ان کا چہرہ دیکھ کر جیسے ڈر سا لگا۔ پھر وہی بکواس! —— جیسے میں نے چھینک کے ہی انداز میں دماغ سے اس غلط واہمہ کی ریزش جھاڑی اور تن کر کھڑا ہو گیا مگر دل کی بات تو دل میں رہی۔ اتنے میں استاد نے برچھوں کے جھرمٹ میں سے دو برچھے چھانٹے اور میرے پیچھے پیچھے دروازہ کی جانب بڑھے۔ ادھر استاد کا برچھا خیمے سے الجھا اور باہر میرا پاؤں اک ذرا سے جگہ سی گڑی ہوئی میخ سے ٹھوکر کھا کر طناب میں الجھا۔ استاد مجھ سے زیادہ وہمی واقع ہوئے تھے بلکہ نظرِ بد لگ جانا، ہوا کا اثر ہو جانا وغیرہ اور نیک و بدشگون لینے کے تمام طریقے انہی کے بتائے ہوئے تھے اور اس قسم کے تمام توہمات انہی نے میرے اندر بچپن سے ڈال رکھے تھے۔ ان پر تو وہ پہلی چھینک ہی تازیانہ سا بن کر پڑی تھی، خیر وہ پی گئے تھے مگر اب ضبط نہ کر سکے۔ بزرگانہ انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر کیمپ کے اندر واپس لے آئے اور کیمپ چیئر پر بٹھا دیا۔ جو برچھا الجھا تھا وہ رکھ دیا اور پھر بانس چومتے ہوئے دوسرا اٹھا لیا۔ پھر کچھ پڑھ کر میرے اوپر دم کیا اور پھر برچھوں پر دم کرتے ہوئے بہ احتیاط باہر آئے۔ مجمع تقریباً پورا ہو چکا تھا، ہر جانور اپنے مالک کو کیمپ سے باہر نکلتا دیکھ کر بڑے جوش کے ساتھ ہنہناتا تھا۔ ہمارے باہر آتے ہی بچہ نے بڑا بڑا پُر جوش استقبالیہ نعرہ مارا اور رخش نے اس کے دوش بدوش اپنی مخصوص پُر زور ہنہناہٹ میں خوش آمدید پکارا، جیسے انہیں سن کر ہی ایک مرتبہ کو خون نیا ہو گیا اور رہیں تو خیر جوان تھا گھوڑوں کی یہ معصوم ہنہناہٹیں بوڑھے بوڑھے کھائے کھیلے ٹھنڈے شکاریوں اور شاید سپاہیوں کے خون میں بھی سنسناہٹ دوڑا دیتی ہیں —— اور آج بڑا باقاعدہ انتظام تھا۔ چار میدان منتخب ہوئے تھے، ایک کی جگہ چار ریفری مقرر کیے گئے تھے جو قاعدہ کے مطابق برچھے کی پہلی نوک سوٗر کے جسم میں داخل کرنے والے کے حق میں فیصلہ دیتے ہیں اور ٹرافی کا تعین کرتے ہیں۔ برچھے چلانے والے شکاریوں کے دو گروہ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اوپر سے نیچے کو مارتے ہیں، پھر

بیٹھیں یا برچھا تقریباً کھڑا کر کے عمودی انداز میں شانہ کے بالائی حصّہ سے نوک گھسیڑتے ہیں اور ذرا چھوٹا برچھا استعمال کرتے ہیں، دوسرے وہ جو کچھ قدرے نیچے جھکا کر اور خود بھی ذرا جھک کر اُفق کی جانب رُخ کر کے نیچے سے اُوپر کو گھسیڑتے ہیں، ان کا برچھا نسبتاً لمبا ہوتا ہے اور ان کے وار میں خاص چیز یہ ہوتی ہے کہ سؤر کو آگے کھسکاتا ہوا ہوتا ہے جو خطرہ کو دُور رکھتا ہے۔ یہ وار بھی بائیں شانہ پر ہوتا ہے اور براہِ راست قلب کو فگار کرتا ہے۔ اوّل الذکر میں ایک مرتبہ ایسا تماشہ ہوا کہ بیٹھ میں برچھا گھسیڑنے کے بعد سوار کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سؤر کھڑا ہوا چھ فیٹ اونچا بانس لیے بھاگا چلا گیا۔ میں آخر الذکر طریقہ پر شکار کھیلتا تھا اور سب پارٹی کے اراکین کے مختلف طریقے تھے۔ ہماری ٹیم کے چار ساتھی تو ایسے ہی کھیلتے تھے جیسے میں مگر پانچویں سوار منشی جی ماشاء اللہ دونوں طریقوں پر بھرپور قادر بتائے جاتے تھے اور ہمارے مقدر میں لکھ گئے تھے۔ بجز اس انگریز کیپٹن کے بقیہ ہم چاروں ان کی جانب شبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور استاد شہامت تو بہت جز بز تھے کہ آج یہ کہاں پھاند پڑے میدان میں۔

سب کو اپنے اپنے فیلڈ میں اُترنے کے بعد بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ کل کی ہڑ بونگ نے جانوروں کو بھڑکا کر کٹری کے اس حصّہ سے جہاں ہم نے اپنا پروگرام بنایا تھا دُور بھگا دیا ہے۔ کئی ہنکے بالکل کورے گئے کہیں خرگوش کا بچہ بھی نہ اٹھا۔ تمام شکار جو کل تک بظاہر بہت کثرت سے تھا، خانہ بدوشوں کے ہاتھوں پہلے ہی سے چوکنّا تھا اور پا بہ رکاب سا رہتا تھا، کل کی ہڑ بونگ میں بیچ بچ منتشر ہو کر بالکل جنگل چھوڑ گیا البتہ ایسے غدر کو بھی بعض نرالی جبلّت والے اکھڑ نر سؤر خاطر میں نہیں لاتے ہیں جو بالعموم گلّہ سے علیحدہ تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ خانہ بدوشوں کا طریقۂ شکار ایسا سلامت روی کی چال اور دھیما و پُرسکون ہوتا ہے کہ جانور چوکنّے اور ذکی الحس تو ضرور ہو جاتے ہیں لیکن اپنی بان چھوڑ کر منتشر نہیں ہو پاتے۔ وہ لوگ ایک کسان کی طرح آہستہ آہستہ اپنی فصل کاٹنے کے سے انداز میں شکار کرتے اور اپنی ضرورت کے مطابق مارتے ہیں۔ جنگلی جانور سچ مچ ان کی فصل ہی ہوا کرتے ہیں۔ کل کے غدر نے تو بالکل ہی میدان صاف کر دیا تھا جس کا صبح ہی بہت شروع میں ہی اندازہ ہو گیا تھا، پھر بھی مختلف رُخوں سے ہانکے جاری رہے جن کی رفتار میں کبھی خروش اور کبھی مدّھم پن پیدا ہو جایا کرتا تھا۔ ہم بھی ڈھیلے ہو کر ناامید سے ہو چکے تھے اور دوپہر ہو گئی تھی کہ ہماری پوری ٹیم یک نظر متحیّر سی ہو کر رہ گئی۔ ایک پُرخروش ہانکے کی آوازوں کے ساتھ ہمارے وہم و گمان سے بھی کہیں زیادہ گرانڈیل سؤر اتنا بڑا کہ ہم میں سے کسی نے اپنی عمر میں دیکھا بھی نہ تھا، بالکل ایک خلافِ امید سمت اور مقام سے نکل کر میدان میں آیا۔ اس کی رفتار کی شان ایک قسم کا استغنا ظاہر کر رہی تھی جیسے نہ اسے پیچھے شور مچانے والے آدمیوں سے ہی کوئی خوف ہے اور نہ میدان میں کھڑے ہوئے درجن بھر سواروں سے ہی ڈر معلوم ہو رہا ہے، شور سے پریشان ہو کر میدان کے دوسرے سرے پر کھڑی ہوئی جھاڑیوں کا رُخ کیے ہوئے اپنی مخصوص، پُراطمینان رفتار میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کا قد و قامت دیکھ کر میرے دماغ میں خیال آیا کہ جس سؤر کی افواہ تھی وہ تو معلوم ہوا کہ کنجڑوں نے پھانس کر مار لیا، یہ چھتیس انچ کا اور کہاں سے آمرا۔ اپنے دیسی سؤروں سے فٹ بھر اونچا! اور ابھی ہم دیکھ ہی رہے تھے کہ استاد شہامت خاں نے میٹھی میٹھی آواز میں خطرہ کا کاشن دیا ——"نرالی والا ہے ——" "بہا ہوا، سیلاب کا لایا" —— "اکّڑا (اکیلا رہنے والا)" —— "ہاں جوانو! ذرا جانچ کے ہاتھ ڈالنا جانچ کے" —— اور ہم سب نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی اونچائی ہمارے برچھوں کی لمبائی اور سابق تجربوں اور ضابطہ کے معیار پر کسی طرح پوری نہیں اُترتی البتہ اس کی شانِ استغنا اور سُست رفتاری نے ہماری ہمتیں بندھا دیں، ہرچہ بادا باد، شکار کھیلنے آئے تھے یوں آسانی سے کیسے نکل جانے دیتے

قسمت کی بات دیکھئے منشی جی کے چانس پر آیا اور منشی جی اپنی عقل و فراست، دور اندیشی اور عیاری کی سب سیڑھیوں سے اُتر کر خالص شکاری بنے میدان میں اُتر آئے اور نہایت فنکارانہ انداز میں یک گونہ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑھ کر انہوں نے اپنا چانس لیا۔ سؤر کی رفتار سُست تھی، منشی جی نے سامنا بچاتے ہوئے اپنے نجیب الطرفین مشکی عرب کو ایک ذرا چکر سا دے کر سؤر کا بایاں شانہ لینا چاہا۔ منشی جی کا گھوڑا پگ اسٹکنگ کے بیسیوں میدان مارے ہوئے پختہ کار جانور تھا۔ جُوں ہی اک ذرا کاوا دے کر منشی جی بائیں شانے کی جانب پہنچے، جبلّت کے خلاف کم بخت نے گھُوم کر مشکی کے سامنے سے اگلی ٹانگوں کے درمیان حملہ کر دیا۔ اب برچھے کی نوک سے روکنے کا تو کوئی سوال ہی نہ رہا مگر تجربہ کار مشکی نے مشینی انداز میں پہلا حملہ تو ماہر پٹے باز کی طرح پینترا سا کاٹ کر بچایا اور دوسرے پیہم حملہ میں الف ہوکر اپنا سینہ اور اگلے پاؤں بچاتے اور پھر دولتی جھاڑ کر پیٹ اور پچھلی ٹانگیں بچائیں۔ سچ مچ جیسے بجلی کی طرح کوندگیا، حملہ سے لے کر بچاؤ میں چار پانچ سیکنڈ لگے ہوں گے اور جب ہم نے دوسری نظر اُدھر دیکھا تو باوجود شہسوار ہونے کے منشی جی بے تُکی جست، الف اور دولتی کی عجیب النوع سخت اور بے سان گمان غیر متوقع دو تین متضاد حرکتوں کی تاب نہ لاسکے اور پُشتِ زین سے اُچھل کر پُشتِ خنزیر پر لاحول پڑھتے لڑھکتے نظر آئے۔ منشی جی کے اس بے تُکے انداز میں اوندھے منہ سؤر جیسے خونی جانور کے اُوپر آپڑنے کا شکاری اور شکار دونوں ہی کی تاریخ میں نادر واقعہ تھا ——— منشی جی تو سمجھنے سے بہت زیادہ سمجھ گئے...... مگر سؤر شاید یہ سمجھا کہ عجیب زندہ بھُوت سوار تھا کہ گھوڑے سے کُود کر مجھ پر چڑھ بیٹھا۔ جیسے حادثہ کی ندرت سے کچھ ہکّا بکّا رہ گیا اور حملہ وغیرہ بھُول کر راہِ فرار اختیار کرنی چاہی اور کیپٹن صاحب کے واڑ پر آگیا ——— اب منشی جی اور ان کے مشکی کے درمیان دو سو گز کا فاصلہ تھا اور دونوں کے درمیان منشی جی کے ہاتھ سے اُچھلا ہوا برچھا مٹی میں بغیر پھریرے کے جھنڈے کی طرح کھڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی جانب بڑھے اور منشی جی پھر سوار ہو گئے۔ اِدھر سفید فام کپتان صاحب اور سیاہ فام سؤر میں چند جنبیں اور کچھ چوکڑیاں پٹے بازوں جیسی حرکتیں ہوئیں اور سؤر زچ سا ہو کر کھڑا ہوگیا اور حملہ بھُول کر مدافعت میں بپھر گیا....... اور اب کھیل بیسویں صدی عیسوی سے پیچھے اُچھل کر نہ معلوم پانچ ہزار یا دس ہزار قبل مسیح کے دور میں جا پڑا ——— آدمی، نیزہ، گھوڑا اور بپھرا ہوا وحشی خشمناک خونی جانور..... سب کچھ احساسِ مدافعت میں اُلٹ کر پھینک دینے پر تُلا ہوا، دھاڑ دھاڑ کر، گرج گرج کر جیسے آٹھ انچی ڈھلنے والی خود کار توپ ناچ رہی ہے اور اپنے چاروں مدِ مقابلوں کو چیلنج کر رہی ہے کہ اگر بڑھے تو خیریت نہیں ہے۔ ہر گھوڑے نے ٹھنی کہ میرے بچہ تک نے بڑھنے سے انکار کر دیا...... چار پانچ منٹ، جیسے ایک یُگ بیت گیا۔ ہر گھوڑا بے پناہ بیتابی کے ساتھ نس نس پھٹا پھٹا پھڑک پھڑک کر حملہ کرنے کو بڑھتا تھا لیکن دل کے پاؤں نہ بڑھنے دیتے تھے۔ غصہ میں کف در دہان، نتھنے پھُلا پھُلا کر تھوڑا سا کاوا کاٹ کاٹ کر رہ جاتا تھا، اُدھر سؤر کا رقص، اِدھر ان کا جہاں کا تہاں کاوا، دونوں جانب خروش و غیض کا عالم، جانبین کی حرکتیں ایسا احساس پیدا کر رہی تھیں جیسے کرۂ ارض بجائے گردش کے مٹک سا رہا ہے۔ گھوڑے ہماری ایڑیوں اور ٹٹکاریوں پر صرف گانفی میں سر ہلا ہلا کر جواب دے رہے تھے لیکن یہ بھی تھا کہ سؤر کو راہِ فرار بھی نہ دیتے تھے اور کُود کر حائل ہو ہو جاتے تھے اور صحیح صحیح معنی میں زچ کر رکھا تھا جس کے سبب وہ بھرپور خشمناک تھا اور اس کے بے پناہ نوکیلے سخت ہتھیار دیکھ دیکھ کر یہ کانپ کانپ کر بڑھنے سے انکار کرتے تھے اور دُور ہی دُور رہ جاتے تھے۔ سؤر اور گھوڑوں کے طور میں تو کوئی فرق نہ آیا مگر سواروں اور ساتھیوں کو اک لمحہ فکر میسر آگیا۔ استاد شہامت خاں نے بھانپ لیا

کہ بچّہ بڑھنے سے انکار کر رہا ہے اور کس بَل یوں بھی کل کے ٹوٹتے ہوتے ہیں، ادھر مجھے بھی اندازہ ہوا جیسے میں ان کا منتظر ہی تھا اور انہوں نے تازہ دم رخش کو بڑھا کر منٹ بھر سے بھی کم میں مجھے اس پر سوار کرا دیا۔ نووارد و نوجوان رخش کے تیور اور ڈھنگ سب سے جدا تھے۔ میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ برچھے کی بھاری شام اور راس سے آگے تقریباً فٹ بھر بانس بغل میں مضبوطی کے ساتھ دبا کر آگے سے مضبوط پکڑا اور اس طرح اندازہ کر کے سوّر کی اونچائی کے مطابق فٹ کیا اور تقریباً ڈیڑھ سو گز پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے چانس دینے کے لیے جوں ہی کنور گلاب سنگھ نے ایک ڈانٹ دے کر سوّر کو اپنی جانب متوجہ کیا میں نے رخش کو ایڑھ دی اور پوری سرپٹ دوڑا کر چارج کیا۔ چربیلے پُر گوشت شانہ میں برچھا غپ سے اس طرح گھسا جیسے گیلے ریتے میں اور سوّر الٹ کر اُدھر جا پڑا ——— اور ابھی برچھا سونت کر اچھی طرح احساس بھی نہ کر پایا تھا کہ میرے بائیں جانب سے جیسے سنگِ خارا کی چٹان ٹکرا گئی، منشی جی نے بہت دور سے حملہ کیا تھا اور ان کا منشکی سوّر کے عین قریب پہنچ کر ڈر کے مارے کترا گیا اور بدحواسی میں رخش سے ٹکرا گیا۔ رخش اور میں ساتھ ہی ساتھ بھنڈا سا بنے ہوئے گرے اور میں کلیتاً اس کے نیچے آ گیا اور وہ رولر کی طرح میرے تمام وجود پر سے لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ پہلی نگاہ میں تو ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ اس پوری دیوار کے لڑھکتے ہوئے ملبے کے نیچے سے میرا بھُرتا نکلے گا۔ کیونکہ جب میرے حواس مجتمع ہوئے تو پہلا احساس تحیّر ہی تھا کہ بارہ من کے لڑھکتے رولر کے نیچے سے زندہ کیسے بچ گیا۔ پھر اندازہ ہوا کہ تمام بدن سُن ہے ———

چھ ہفتہ بعد جب اسپتال سے ڈسچارج ہو کر آیا تو پورے تین مہینے گھر آرام کیا۔ ڈاکٹروں کو تعجب تھا کہ دو پسلیاں پچک جانے کے علاوہ ہڈی پر ذرا سی بھی ضرب نہیں آئی ہے، البتہ جسم کا کوئی پٹھا اور نس ایسی باقی نہیں رہی ہے جو کُچلی نہ گئی ہو۔ منشی جی میرے برابر والے کمرے میں تھے۔ ان کا منشکی بھی قلابازی کھا کر چاروں شانے چت گرا تھا مگر وہ خود بیس گز دُور اُچھل کر گرے تھے، کئی ہڈیاں ٹوٹی تھیں ——— پہلی ہیٹ کی رفتار اور نوعیت تو ایسی تھی کہ ہم لوگ تو درکنار اگر کوئی علم الحرکات کا ماہر دوربین لگائے بھی دیکھتا ہوتا تو وہ بھی شاید بجز منشی جی کے مقدّر کی تیزی کے اس ضمن میں اور کچھ تمیز نہ کر پاتا کہ کتنے اور کن کن عملوں اور ردِّ عملوں نے منشی جی کو پُشتِ زین سے اُچھال کر بخیریت تمام سوّر کی کانپوں کے اوپر یا زد میں گرانے کے بجائے اس کی رُوئی کے بورے ایسی پیٹھ پر سوار کر دیا اور منشی جی آنِ واحد میں پھر اسی ٹھاٹ سے پُشتِ زین پر نظر آئے۔ چند ساعت بعد دوسری ہیٹ کے نتیجہ میں جس میں وہ ......"یار کو بھی لے ڈوبے" تقریباً بارہ ہفتے تو اسپتال میں لیٹے رہے اور گھر پہنچ کر تقریباً بارہ ہی مہینے بیساکھیوں پر ٹنگے رہے، تب کہیں سوا برس بعد پھر سے زمین پر قدم رکھا۔ ان کا منشکی عرب غریب تو تقریباً بے کار سا ہو کر رہ گیا۔ اس کی نہ بڑھ کے کسی گُربہ میں ایسا جھٹکا آیا کہ کسی قابل نہ رہا۔

میرے متعلق کانا پھوسی اور چہ میگوئیاں تو اسپتال کے قیام کے دوران میں ہی شروع ہو گئی تھیں۔ گھر پہنچ کر جوں جوں رُو بہ صحت ہوتا گیا بزرگوں کی نصیحتوں اور بیوی کی طنز بہ حکیمانہ استدعاؤں کا لہجہ اسی رفتار سے تیز تر ہوتا گیا اور جب ہٹّا کٹّا ہو کر اور خوب کھا پی کر پھر سے اینڈنے لگا تو ان ناصحین کے انداز میں تندی اور کرختگی پوری طرح نمایاں ہو گئی اور میں نے صدقِ دل سے تائب ہو کر مشکل جان چھڑائی۔ ادھر معلوم ہوا کہ محترم استاد شہامت خاں تو پہلے ہی روز سے ہدفِ ملامت بنے ہوئے ہیں جنہوں نے ایسے "خطرناک" و "بے سُود" کھیل میں پڑنے سے مجھے روکا نہیں لیکن وہ آدمی پکے کھلاڑی تھے اور باوجود ملازم ہونے کے استاد بھی فراغ

ہوئے تھے، تو بہ تو در کنار انہوں نے سرے سے یہی تسلیم نہیں کیا کہ یہ خطرناک اور بے سود کھیل ہے اور فنی و منطقی دلائل سے گھوڑ سواری کے فن کا اعلیٰ ترین کمال ثابت کر دیا ——— اور ہماری بی کی توبہ ہر سیزن کے شروع ہوتے ہی ٹوٹتی رہی اور اختتام پر ہوتی رہی اور ساری عمر نس پٹھے کچلتے رہے اور کبھی کبھی ایک آدھ ہڈی بھی ٹوٹتی اترتی رہی مگر بے غیرتی تیرا ہی آسرا ہے۔ "بڑھاپا آگیا حرکتوں سے باز نہ آئے۔" بیگم کا اور "واہی تواہی خدائی خوار گدھے سوار" اماں کا پیٹنٹ جملہ سنتے سنتے کان ایسے عادی ہو گئے تھے کہ سنائی بھی نہ پڑتا تھا۔ کیونکہ بڑھاپا کس مسخرے کو آیا تھا ——— اور ہم تو گھوڑے سوار تھے ——— بچہ اور رخش کے بعد انصاف، بجلی، سمند خاں، قاضی جی، دلدل، فراٹا نہ معلوم کتنے ران تلے آئے اور نکل گئے اور اپنی مہریں ہمارے چھ فٹے قد و قامت پر کہیں نہ کہیں ثبت کر گئے .... البتہ اب پینتیس ۳۵ سال بعد جب بھی پُروائی چلتی ہے تو رگ رگ ریشہ ریشہ پر ایک ایک یاد بن کر اچھلتی ہے "جسے یاد کر کر کے آج بھی اُچھل سا پڑتا ہوں جیسے شیریں خواب دیکھتے ہوئے گہری نیند میں کوئی کھٹکا ہو جائے ....

دانت کا دستہ

بانو قدسیہ

لوگوں کی بات چھوڑیئے۔ خواہی نخواہی اچھے بھلے اشرافوں میں کیڑے نکال کے دھر دیں گے۔ میں تو آپ سے کہوں گی اور ضرور کہوں گی کہ بلقیس آپا کے خاندان جیسا بھینترا باہر ہم نے تو کوئی دیکھا نہیں۔ اُن کی تو گویا ہر بات ہاتھی دانت کا دستہ لگا ہوا تھا۔ لوگوں کا بس چلے تو ملکہ الزبتھ سے لے کر کلبائی خان تک سارے بھلے مانسوں کو توم کر طعنوں کی ہوا میں توڑی بنا کر اُڑا دیں۔

پر میرے سیلے اُن کے پھاٹک سے لے کر پچھلے احاطے کی آخری اینٹ تک ساری جگہ ایک زیارت گاہ تھی۔ اُن کا پھاٹک گو پُرانی وضع کا تھا۔ ہلکی سی دستک پہ سر سے پیر تک لرز اُٹھتا۔ بائیں پہلو نرسلوں میں چھپے ہوئے پرانے کھمبے میں آغاجی مرحوم کا بورڈ نصب تھا۔ سنگِ مرمر کی سِل پہ آغا بختیار علی کے نام کے ساتھ بی اے کا سیاہ حرف یوں لگتا جیسے سفر سے لوٹتے ہوئے اٹیچی پر ایر ٹریول کی پرچی ۔ ! مجھے اس مرمر کی سِل سے بڑا پیار تھا۔ میں نے کئی بار نرسلوں کے جھنڈ کو پرے کر کے اپنے دوپٹے سے یہ سِل صاف کی تھی۔

بلّی آپا بھی جب کبھی آغا مرحوم کی اس ڈگری کا ذکر کرتیں تو باقی گھر والوں پہ مراقبے کا سا عالم طاری ہو جاتا۔

”ہمارے آغاجی نے سن اٹھائیس میں بی اے کیا تھا۔ سن اٹھائیس میں ! اُن دنوں ابھی پڑھنے کا ہوش ہی کس کو تھا۔ ہمارے آغاجی تو اتنے جیّد عالم، ایسے . . . . . ایسے نامور فاضل تھے کہ . . . . . داستان امیر حمزہ، سندبی نامہ، طلسم ہوشربا — فسانۂ آزاد، گلستان بوستاں جانے کیا کیا زبانی یاد تھا —“

جب کبھی بلّی آپا ہمارے آغاجی کی بات کرتیں تو اُن کی تعلیمی عظمت کے سامنے مجھے اپنے اباجی کا ڈاکٹر ہونا بڑی معیو[ب] بات لگتی۔ یوں احساس ہوتا جیسے ڈاکٹری بھی کسی حلوائی، درزی، نانبائی یا بڑھئی جیسا ایک پیشہ ہے یعنی پڑھ لکھ کر آدمی رو[پیہ] کمانے کے قابل تو ہو جاتا ہے لیکن لیاقت خاک نہیں آتی۔ گو میں نے آغاجی کو کبھی نہ دیکھا تھا لیکن بلقیس آپا کی باتوں سے ایک تصو[یر] میرے ذہن میں تشکیل پا گئی تھی۔ شلوار قمیص شیروانی، سر پہ تُرکی ٹوپی، چھوٹی چھوٹی تراشیدہ فرنچ کٹ ڈاڑھی اور بائیں طرف گا[ل] کے نشیب پر ناک کی جانب ایک بڑا سا مسّا۔ چلتے چلتے رک جاتے اور پوچھتے — ایں یہ شور کیسا ہے، خیر خبر ہے [؟] رہا تھا —

دراصل آغاجی پر فصاحت ختم تھی۔ باتوں کے دھنی جب منہ کھولتے تو برشگالی کیفیت طاری ہو جاتی۔ الفاظوں کا برساؤ ہوتا، باتوں کی وہ برسات پڑتی کہ سننے والا ایک بار اس ریلے میں میلوں بہہ جاتا۔ ایک تو گفتگو میں تابڑ توڑ ہلّہ بو . . . .

دوسرے آواز نہ تھی منطقۂ حارّہ میں گرنے والی آبشاروں کی گھن گرج تھی جو ٹھاوٹ بن بن کر سامعین کو بھگوتی اور برسوں اس کی خنکی جی سے اُتر نہ پاتی۔

آواز کا یہ جادو اجل بھائی میں بھی تو تھا لیکن بلقیس آپا کہتی ہیں کہ آغاجی کے سامنے تو اجل بھائی بالکل باجگذار ہیں۔ نہ وہ الفاظ کا چناؤ، نہ وہ مطالعہ، نہ وہ منطقۂ حارّہ میں گرنے والی آبشاروں جیسی گھن گرج۔ پھر آغاجی کے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت میں کچھ نقص تھا۔ یہ اُنگلی پوری طرح سیدھی نہ ہوتی تھی۔ دورانِ گفتگو جب آغاجی دہنی ہاتھ بڑھا بڑھا کر باتیں کرتے تو یہی اُنگلی سب سے پیاری لگتی ——— کسی اور کے ہاتھ میں یہ کجی ہوتی تو کیسی بُری لگتی لیکن تنہائی میں بیٹھ کر میں سوچتی ہائے کہیں خدا نخواستہ آغاجی کی انگلی سیدھی ہوتی تو بس ——— اللہ نہ کرے اللہ نہ کرے۔ یہ خیال جلدی سے مجھے ذہن سے نکالنا پڑتا کیونکہ اسی انگلی میں تو آغاجی کا سارا حُسن تھا۔ اسی کے سہارے تو وہ فصاحت کی کھیتی کے مستاجر تھے۔

لوگ چاہے کیسی ہی گیجھے دار باتیں بنائیں میں آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ بلّی آپا کے خاندان کی ہر بات کو ہاتھی دانت کا دستہ لگا ہوا تھا اور اس دستے پر بھی جانے کس بزرگ کا دستِ مبارک پھر چکا تھا کہ نظر پڑتے ہی یہ آپ کے دل کا تعویذ بن جاتا۔

مجھے معتقد فتنۂ محشر بلّی آپا کے قد آور خاندان نے بنایا۔ اس سے پہلے میں اَن سلا کپڑا تھی جس کی لمبائی چوڑائی تو ضرور ہوتی ہے پر تن پر نہ تو جچتا ہے نہ پہنا جاسکتا ہے۔ جو کچھ میں نے سیکھا، جو تمیز مجھ میں آئی۔ جو بھی آدابِ محفل گرہستی طور طریق میں نے سیکھے وہ سب میں نے بلّی آپا کے خاندان سے مستعار لیے۔ میرے لیے تو ان کی باتیں وہ فلسفہ تھیں جس کو پڑھ کر ایک بانگڑ بلّو ٹڈا پارکھ بڑا بن جاتا ہے۔ کھانا پینا اوڑھنا، گفتگو کا رنگ ڈھنگ، نشست و برخاست کے اصول، غرضیکہ زندگی کے سارے رمز و کنائے سب اُن کی ہی طفیل سمجھ میں آئے۔

میں تو بلّی آپا کی کاربن کاپی تھی اور جس طرح کاربن کاپی میں وہ صفائی نہیں ہوا کرتی میں بھی ہنس کی چال چلنے میں کامیاب تو ہو چکی تھی لیکن کوّے کی طرح مجھ میں مکمل خود اعتمادی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ کبھی کبھی اپنے گھر میں بیٹھ کر مجھ پر عجب قسم کا احساسِ کمتری طاری ہو جاتا۔ مانگے کے سارے مور پنکھ اُتر جاتے اور نیچے سے سیدھا سادا کوّا نکل آتا۔ اس وقت مجھے احساس ہوتا کہ میں تو ایک بزاخفش ہوں جو احمق پن سے سر جھلانے کے سوائے اور کچھ نہیں جانتا۔ بلّی آپا کے اصطرلابی خاندان سے میرا کیا مقابلہ! وہ تو ایک زمانے کی سمتیں متعین کرنے والے ہیں۔ ایسے لمحوں میں جب مجھ پر احساسِ کمتری کا شدید دورہ پڑتا تو میں اللہ سے شکایتاً پوچھتی ——— یہ ساری مخلوق ایک سی کیوں نہیں؟ کوئی بندر کوئی گدھا اور کوئی ریچھ کیوں ہے؟ رفتہ رفتہ یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی کہ اللہ نے تو سب کو خاکستری ٹٹو ہی بنایا تھا لیکن کچھ بلّی آپا جیسے سیانوں نے اپنے اوپر دھاریاں ڈال کر اپنے آپ کو زیبرا بنالیا اور اسی ایجادِ بندہ کے باعث صرف وہی لوگ اب اشرف المخلوقات کہلاتے تھے جن میں زیبرے جیسا انوکھا پن موجود ہوتا ہے۔

بلقیس، تجمّل، پروین آغا بختیار علی خان مرحوم ریٹائرڈ ڈی۔ ایس۔ پی صاحب کی بیٹیاں تھیں۔ پاٹلی پتر سے لائے گئے ہار سنگار کے یہ پیوندی پودے ایسے بوقلموں تھے کہ ہر موسم میں ان میں بیک وقت چنبیلی، گلاب اور کامنی کے پھول لگتے۔ اگر معمولی ہار سنگار کا درخت ہوتا تو اس کی ڈالیوں میں زعفرانی ڈنڈی والے پھول آتشبازی کی طرح پھوٹ نکلتے۔ لیکن یہ تو پیوندی پودے تھے

جن پر جانے کون منتروں کا اثر تھا کہ ان کی ڈالی ڈالی پر بھانت بھانت کے شگوفے نکلتے۔ خوبی یہ تھی کہ گو سارے پھول ہارسنگار کے تھے لیکن دیکھنے والے کے دماغ کا ٹیکا کچھ اس طرح گرتا کہ اُسے ہر شاخ پر نیا پھول اور نئی مہک نئے سرے پھیلاتی نظر آتی۔

آغاجی مرحوم کی سب سے بڑی وراثت اُن کی فصاحت تھی۔ فصاحت کا دریا کٹ کر اب تین نہروں میں بہنے لگا تھا۔ یہ نہریں ہاتھ کی لکیروں کی طرح آپس میں مڑتی کٹتی ملتی بچھڑتی پچھلے باغ میں ٹہلا کرتی تھیں۔

ننھے منے قہقہے، کھٹی میٹھی گولیوں جیسی چٹکیاں اور چھدری بدلیوں جیسی آبی آبی باتیں۔ کون کہتا ہے آغاجی بی۔ اے مر چکے تھے، وُہ تو جادو کی گیند تھے ہاتھ سے نکلے تو ایک تھے۔ ہوا میں پہنچے تو تین، جانے کیسے تین گیندوں میں بدل چکے تھے؟

تینوں لمبی کبوتریاں دیکھ کر میرے سامنے فسانۂ آزاد کی حسن آرا، سپہر آرا اور اللہ رکھی نکھر جاتیں۔ میں بُت بن کر ایک ایک کو تکا کرتی۔ اس تریبنی کے سامنے تو مجھے اپنا آپ اس طرح بھولتا جیسے نون کو نون غنّہ بن کر اپنا نقطہ بھول جایا کرتا ہے۔

اُن کی باتوں کے گرد بیچارہ نون غنّہ چکّر کاٹتا رہتا۔ کئی قوسی دائرے اور ادھ دائرے کاٹ لیتا لیکن اپنے نکتے تک پذیرائی نہ ہوتی۔

باتوں کے گیس بھرے غبارے اُوپر چڑھتے۔

بلّی آپا کہتیں ——— "توبہ! دیکھا تھا تم نے کل شام کلثوم کو! کاٹن کی قمیص پر لیس لگا رکھی تھی؟"

تجمّل کا جسم پھریری میں بدل جاتا ——— "سچ کہو بلّی آپا! کاٹن کی قمیص پر نائیلون کی لیس؟"

مجھے بھی یک دم خیال آتا ——— ہائے کلثوم گدھی نے بھی کیا ظلم کیا، کاٹن کی قمیص پر نائیلون کی لیس ——— لاحول ولا۔

"قمیص کا رنگ کیا تھا؟ ———" ہیروشیما کی تباہی پر مکمل رپورٹ پروین مانگتی۔

"کاسنی ——— !"

کاسنی . . . . . کاسنی . . . . . کاسنی۔ فصاحت کی لہروں میں طوفان آجاتا۔

"اور کیا! کاسنی رنگ پر سیاہ لیس تھی! میں نے خود دیکھی ہے۔" بلّی آپا مابدولت کی سی رعونت سے کہتیں۔

"توبہ توبہ ——— توبہ توبہ . . . . ."

ہارسنگھار کی ڈالیوں سے توبہ کے پھول جھڑنے لگتے۔ مجھے کاسنی رنگ اور سیاہ لیس سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہو جاتی!

ہمارے گھر میں رواج ہے کہ جو چیز پسند آئی بس اُسی کا جھگڑا چل گیا۔ بلّی آپا کے خاندان میں پسند کو پہلے فیشن اور قیمت کے ترازو میں تولا جاتا پھر بازار کے حاشیے تک بات پہنچتی۔ ویسے بھی خرید و فروخت کے معاملے میں تینوں بہنوں کا سلیقہ اور معاملہ فہمی بے مثال تھی۔ دوکاندار اُنھیں وہ چیز دکھاتے جو ساری مارکیٹ میں نایاب ہوتی جس کی قیمت واجبی، رنگ پکّا، وضع قطع نرالی اور جا بجا دیسی مہر ہوتی۔ کپڑے کے معاملے میں تو ان کی پسند آخری حرف تھی۔ وہی کاٹن اگر کلثوم کے تن پر ہوتا تو بے جوڑ گھٹیا اور بے آب نظر آتا۔ وُہی کپڑا اگر بلّی آپا کے گھر آجاتا تو بار بار صندوق کھُلتا بلّی آپا کے ہاتھوں سے تجمّل کے کندھوں تک اور تجمّل کے شانوں سے اُتر

کر، پر دین کے ٹخنوں تک کچھ انداز سے طواف کاٹتا کہ وہی ٹکڑا ماڈرن، ہلکا پھلکا، ملایم کم خرچ اور بالانشین نظر آنے لگتا۔

بہت سال بلّی آپا کے ہمسایے میں رہی۔ برسوں اُن کی صحبت میں بسر کیے۔ کئی کئی گھنٹوں کی نشستیں فسانۂ آزاد کی حُسن آرا، سپہر آرا کی نذر کیں لیکن خدا قسم رہی پھوہڑ کی پھوہڑ۔ وہی ان سِلا کپڑا ——— وہی نِرا نخفش!

وہ لوگ لاکھ سمجھاتیں کہ کنجری سٹائل واسکٹ سے زیبائش کے کیسے کیسے دائرے سنبھلتے ہیں اور شلواریں ازار بند کی جگہ اگر الاسٹک ڈالا جائے تو کمر کس طرح نقطۂ موہوم بن جاتی ہے۔ لیکن اپنے دماغ کا ٹپ ہمیشہ ڈھکار ہتا اور تمیز سے کپڑے پہننا نہ آئے۔

بلّی آپا کے گھر درزی کا آنا بڑے اہتمام کا باعث بنتا تھا۔ باہر والے برآمدے میں سیاہ اور سفید سلوں والے شطرنجی فرش پر دری بچھوائی جاتی۔ پھر تینوں بہنیں جاپانی گیشاؤں کی طرح زانو تہہ کر کے بیٹھ جاتیں۔ آسنی پر موٹے موٹے امریکی رسالے پھیل جاتے۔ ان دوہرے بدن کے رسالوں میں بچوں کے کپڑوں سے لے کر منتھوڑی برمے تک اور غسلخانے کے رنگین فلش اور نائیلون پردوں سے لے کر عورتوں کے چھوٹے بڑے کپڑوں کی رازداری بڑی علانیہ فہرستوں میں درج ہوتی تھی۔ ایسے رسالوں کو درزی کی نگاہ سے بچا بچا کر وہ قمیصوں کے نمونے نکالتیں۔ پھر کپڑے کی پیمائش، رنگوں کے جوڑ بے جوڑ کا قصہ چلتا۔

"بروائل کیسی ہے ماسٹر ———" فصاحت کا باب بلّی آپا کھولتیں۔

ٹیپ اور قینچی کی نپی تُلی سطح سے نکل کر ماسٹر کے ہاتھ وائل پر مساس کرنے لگتے۔ کپڑے کی داد دیتے ہوئے جانے کیسے وہ تینوں بہنوں کی پسند کو بھی سراہنے لگتا ——— "بی بی جی آپ کا چوائس ہی بہت اچھا ہے جو بھی کپڑا لائیں گی کمال کا ہوگا۔ کینال بنک میں بیگم اشرف علی ہیں نا؟ ہمیشہ انڈیا سے کپڑا لاتی ہیں۔ پر آپ جیسی بات نہیں ہے سرکار ———"

بہنیں اُس کی بات کو بار بار انگریزی میں دُہراتیں جیسے کسی گیت کا یہ ٹکڑا ہی حسین ٹکڑا ہو۔ کینال بنک والی بیگم اشرف علی سے گو اُن کی واقفیت نہ تھی لیکن درزی کی باتوں سے وہ اُس کے نیچے ہونے کا اندازہ لگا چکی تھیں اور اسی رعایت سے اُنھیں اَن دیکھی بیگم اشرف علی سے بڑی گہری نفرت بھی ہو چکی تھی۔

جب ماسٹر ایکبار پھر قینچی اور ٹیپ کی دُنیا میں مستغرق ہو جاتا تو فصاحت کی نہروں میں طغیانی آجاتی، تر بینی کا پانی اُچھلنے لگتا۔ بلّی آپا کہتیں ——— "ماسٹر فرنچ کالر تو ہوگا ہی لیکن بیک پر ٹیپ ضرور لگی ہو اور ہاں وہ رُومال والا گریبان تم نے بیگم عارف کی قمیص میں کیوں بنایا؟"

ماسٹر تیر ہوائی چھوڑتا ——— "ہیں جی کون سا گلا جی؟"

"رومال والا وہی جس کے سامنے جھول میں موتی ٹکے تھے؟"

"کسی اور نے بنا کر دیا ہوگا جناب۔ میں نے تو جی پچھلی گرمیوں سے اُن کی سلائی چھوڑ دی ہے۔ مری جاتے وقت پورے بیس بلوز سلوا کر لے گئیں اور جی ایک سے ایک ودھیا ——— سلائی آج تک نہیں دی ——— ہاں۔"

تینوں بہنوں کی نظریں آپس میں مصافحہ کرتیں۔ بیک وقت تینوں پر مکاشفہ ہوتا کہ ماسٹر صریحاً جھوٹ بول رہا ہے۔ بے بسی سے ایک دُوسرے کو تکا جاتا۔ پروین تو نہایت صوفیہ یورپینی انداز میں کندھے بھی جھٹک دیتی۔ ان ننھی منّی فصاحتوں سے جب دل نہ بھرتا تو پھر درزی کی عیاری ہیرا پھیری اور بد باطنی کا قصّہ بزبانِ انگریزی جاری ہو جاتا۔

"جھوٹ بولتا ہے سراسر!ـــــ" تجمّل کہتی۔

"خدا قسم ہمارا نمونہ عام کر دیا ہے کم بخت نے!" پروین شانے جھٹک کر ایک بار پھر ہالی وُڈ کی نازنینوں میں شامل ہو جاتی۔

"بات یہ ہے تجمّل اس کے سامنے رسالے مت لایا کرو مس صاحبہ" بلّی آپا تنبیہہ کرتیں۔

"درزی بدلو درزی ـــــ خدا قسم چور آدمی ہے ہمارے نمونے چُرا چُرا کے دُوسروں کو دیتا ہے ـــــ" تجمّل کا ننھا سا دہن اگلتا۔

"ہاں جی درزی بدلو ـــــ درزی ـــــ" پروین بھی ہاں میں ہاں ملاتی۔

اب درزی بدلنے کے متعلق دیر تک اس طرح اصرار رہتا جیسے کرکٹ کے میدان میں باؤلر چینج کی فرمائش پڑ رہی ہو۔ ہر بار ماسٹر بدلنے کا فیصلہ تو ضرور ہوتا لیکن اس پہ دفتری کاروائی ہو کر رہ جاتی اور فیصلے پر نفاذ نہ ہو سکتا۔ اسی طرح کئی آئندہ آئے اور گئے لیکن ماسٹر نہ بدلا۔ اور بھلا ہو درزی کا اُس نے بھی امریکی نمونوں کو پاکستانی بیبیوں تک پہنچانے میں کبھی بخل سے کام نہ لیا۔

ہمارے گھر کی بدسلیقگی کا یہ عالم تھا کہ درزی اور کپڑا دونوں کی اہمیت صفر تھی۔ اماں اپنی قمیص نیچے سے آڑی ترچھی پھاڑ کر بغیر کسی کتر بیونت کے میری چھوٹی بہن کو پہنا دیتیں۔ ہاتھی کا یہ جھول پہنکر وہ بیچاری شاہ دولے کی چوہی لگتی۔ لیکن اماں بی پر یہ انکشاف کبھی نہ ہو پایا کہ پرانی قمیصوں کو نئے مصرف میں لانے کے لیے ماسٹر صادق کی مدد ناگزیر تھی۔ ہمارے ہاں درزی کو محض کپڑے سینے کے استعمال میں لاتے تھے۔ بلّی آپا کے گھر سے پتہ چلا کہ درزی تو مولی کے نمک کی طرح بہت سے امراض کا واحد علاج تھا۔ آپ کی شخصیت کو بنانے والا، امارت کا سائین بورڈ، ماڈرن ہونے کی کھلی دلیل، جسم کی کوتاہیوں کو چھپانے والا....... وغیرہ وغیرہ۔

پہلے پہل جب میں نے ماسٹر صادق سے کپڑے سلوانے پہ اصرار کیا تو اماں جانی بہت جِز بِز ہوئیں۔ اُن کے نزدیک یہ سرکشی سکندر کی اُن فوجوں سے کسی طرح کم نہ تھی جو پورس سے جنگ کے بعد یکدم بغاوت پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ لیکن بالآخر اماں نے بھی سکندر کی طرح ہماری بات مان لی اور ماسٹر صادق ہمارے برآمدے میں بھی قینچی اور ٹیپ کی دُنیا بسانے لگا جو نمونے میں بلّی آپا کے رسالوں سے دیکھ آتی تھی وہ چوری چوری ماسٹر سے بنواتی اور جو کوئی نمونہ کہیں مجھے بھول جاتا تو ماسٹر بلّی آپا کے کپڑے دکھا کر میری رہنمائی کر دیتا۔

آپ مانیں نہ مانیں ہر گھر کی ایک مُہر ہوتی ہے ایک سانچا ہوتا ہے جس میں گھر والے ڈھل ڈھل کر نکلتے ہیں جو تہذیب

اور سمجھ بوجھ بلّی آپا کے گھر والوں کو تھی وہ بیچاری ہماری امّاں کو سرے سے نصیب نہ ہوئی۔

بلّی آپا کی بوبوجان جیسی ماں ہر گھر میں ہوتی بھی کہاں ہے۔ کھُربھُرے بالوں کو سفید دوپٹے میں چھپائے ناک کی جانب نظریں جھکائے وہ کسی گارڈ کی طرح اپنی تینوں لڑکیوں کی گاڑیاں روکتی اور چلاتی رہتی تھیں۔ ویسے کم گو تھیں۔ لیکن اُن کی آن دیکھی لال اور سبز جھنڈی میں بلا کا زور تھا۔ ایک نظر میں تینوں بہنوں کو اُن کے عندیے کا خوب علم ہو جاتا۔

کبھی کبھی ترنگ میں آکر بوبوجی بڑی پرانی باتیں کرنے لگتیں۔ "آغاجی کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ اللہ اتنی محبت تھی۔۔۔۔ اتنی محبت تھی کہ۔۔۔۔ اُن دنوں ہم گورداسپور میں رہتے تھے۔ آغاجی تمہارے سٹی انسپکٹر تھے۔ ترمور وڈ پہ تین منزلہ مکان ہوا کرتا تھا ہمارا ——— حویلی کے ماتھے پہ ھٰذا من فضلِ ربی لکھا ہوا تھا۔ اجمل گودی میں تھا میری۔ اُسی کے نام پہ حویلی کا نام اجمل منزل رکھا تھا۔۔۔۔۔"

تین منزلہ مکان۔۔۔۔۔۔ سُرخ سُرخ اینٹوں والی حویلی!

میری آنکھوں میں اجمل منزل پھرنے لگتی۔

بوبوجی کہتیں ——— "آخری منزل پر بیت الخلا تھا۔ جب کبھی مجھے سیڑھیوں کی طرف جاتا دیکھتے ہمیشہ پانی کا بدھنا پکڑ کر مجھ سے آگے آگے چلتے۔ میں جھینپ جایا کرتی تھی لیکن وہ کہا کرتے تھے "لو میری خانم تم سی عورت ملے اور مرد اُس کی قدر نہ کرے۔ ایسی بدذوقی ہم سے تو ہوتی نہیں۔"

مجھ سے عموماً احمقانہ سوال سرزد ہو جایا کرتے تھے۔ میں پوچھتی ——— "بوبوجی ——— لوٹا آغاجی کیوں لے کر جاتے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں تکلیف تھی کیا؟"

پروین میری عقل پر سو پھٹکار ڈالنے کے انداز میں کہتی:

"ارے محبت تھی آغاجانی کو بوبوجانی سے ——— محبت۔"

"تم بیچ میں وضاحت نہ کرو جی ——— ہاں ———" بلّی آپا بوبوجی کے مُنہ کی طرف دیکھ کر کہتیں ——— "ہاں بوبوجانی پھر ———؟"

"چلو اُٹھو کام کرو اپنا اپنا ———"

گارڈ رخصتی کی سبز جھنڈی دکھاتا۔ لیکن لڑکیوں کا تو پہلا آنسو پالتی مارے بیٹھا رہتا۔ کیا مزہ آتا تھا بوبوجی کی باتوں میں۔ ایک ہماری امّاں اور ابا کا گھر تھا۔ یوں لگتا جیسے ان دونوں کا رشتہ تنخواہ لانے اور تنخواہ خرچنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ نہ کچھ میٹھی میٹھی باتیں کبھی ہوتی تھیں نہ ہو سکنے کا امکان ہے۔ خالہ جان کبھی کبھار اپنے مرے ہوئے شوہر کا ذکر کرتی تھیں لیکن وہ بوبوجی والی بات کہاں؟ ایسی بے حیائی سے مرنے والے کا ذکر کرتیں کہ جمعدارنی جھاڑو بہارو چھوڑ فوراً گول میز کانفرنس میں شامل ہو جاتی۔

ادھر بوبوجی فصاحت کا ریشمی تھان سینتی، سینت کر رکھتیں اور سنبھال سنبھال کر کھولتیں۔ "میرا پلنگ ساس کے پاس بچھا کرتا تھا۔ اللہ بخشے دمے کی مریض تھیں۔ فولنج کے دورے پڑتے تھے۔ ہڈی ہڈی میں درد رہتا تھا لیکن بہت سال ہمارا ساتھ

دیا اُنھوں نے ——— ساری رات ہونکتی رہتی تھیں۔ جب کبھی میری جانب کروٹ نہ ہوتی تو آغاجی خاموشی سے میرے پلنگ پہ آ بیٹھتے۔ ہمیشہ پشاوری چپّل پہنا اُنھوں نے دن کو کیسا چرچراتا تھا ——— پر رات کو ایسے گربہ پائی سے آتے کہ ذرا بھی جاگ نہ ہوتی۔ میں آنکھیں موندے سوئی ہوئی بن جاتی۔"

"وہ کیوں لوبوجی ———" احمق پن سے میں پوچھتی۔

بلّی آپا جھڑکتیں۔ "سُننے دو جی ——— ہاں"

بوبوجی پر میرے بد اخفش ہونے کا کچھ اثر نہ پڑتا وہ کہے جاتیں۔ "آغاجی تمھارے آہستہ آہستہ میرے پیروں کو چھوتے پھر بھی جب میں چُپ رہتی تو وہ اپنا سر میرے پیروں میں دھر دیتے۔ اُن دنوں ابھی آغاجی نے ڈاڑھی نہیں رکھی تھی۔"

"ہائے اللہ ———"

آغاجی کا سر اماں جی کے پیروں میں پڑا دیکھ کر تینوں کو ٹھیس لگتی۔

"پھر اچانک ساس ہونکنے لگتی تو وہ پلنگ کے نیچے گھُس جاتے۔"

اب بوبوجی ساس بیٹے کے اس ناٹک پہ بہت محظوظ نظر آتیں لیکن بہنوں کا تز شول نہایت تیکھا ہو جاتا۔

آزردہ ہو کر بلّی آپا کہتیں۔ "آغاجی پلنگ کے نیچے کیسے گھُستے ہوں گے بوبوجی؟"

بوبوجی کو اس بات کا خیال نہ رہتا کہ آغاجی مرحوم بی اے اُن لڑکیوں کے بھی ہیرو تھے اور کسی ہیرو کو بزدلی سے پلنگ کے نیچے گھُستے دیکھ کر ہر ہیروئین کا دِل دُکھتا ہے خاص کر جب وہ پلنگ اپنا نہ ہو۔

وُہ بے خیالی سے کہے جاتیں۔ "چوہیا بھر تو وزن تھا اُن دنوں ——— کوئی درشنی ہنڈی ٹھوڑی دکھائی پڑتی تھی۔ دو قدم کا فاصلہ تھا۔ ٹڈّے کی طرح پھُدک جاتے۔ تب عُمر ہی کیا تھی؟ اجمل نے کھچڑی کھانا شروع کی تھی بلّی گود میں تھی۔ . . . تب آغاجی تمھارے کوئی موٹے تھوڑے ہوتے تھے۔ بڑی دیر تک اللہ بخشے وہ ہونکتی رہتیں یہ سعادت مندی سے چھپے رہتے جب ساس کا دم برابر ہوتا۔ انھیں جانے کون بولا کرتا۔ جھٹ آن کر پاؤں پکڑ لیتے ———"

"لیکن پاؤں کیوں پکڑتے تھے آپکے؟ آپ ناراض تھیں کیا؟"

میں پھر بیوقوفی سے پوچھ بیٹھتی۔ لیکن بوبوجی ایسی باتوں پہ کان دھرے بغیر کہے جاتیں ——— "جب ساس بیچاری کی آنکھ لگ جاتی تو ہم دونوں تیسری منزل پہ چلے جاتے۔"

"لیکن بوبوجی رات کو کیوں اُٹھاتے تھے آغاجی ———؟" میں پوچھتی چلی جاتی۔

"جاؤ جاؤ اپنا اپنا کام کرو۔ . . . . . تم سب کی کھوپڑی میں تو بھوسہ بھرا ہے ———"

ہری جھنڈی کے پھڑ پھڑاتے ہی تینوں گاڑیاں اپنی اپنی لائنوں پر رخصت ہو جاتیں اور ایک اجاڑ سٹیشن کی طرح بوبوجی تیسری منزل کی یادوں میں کھو جاتیں۔

بے شرمی کی باتوں پر ٹوکنا، گھٹیا قسم کے فلمی رسالوں سے بچا بچا کر رکھنا اور عورتوں کی باتیں کو سُن کر نہ سمجھنے کی ساری

تعلیم بوبوجی نے ان بہنوں کو دی تھی۔ اگر بوبوجی کا دم باقی نہ ہوتا تو چھوٹی عمر میں یہ تینوں معصوم بہنیں گنوں کی پوری نکل آتیں۔ ہمارے ہاں تو یہ رواج دیکھا ہے کہ جمعدارنی سے لے کر ہر ملنے والی عورت سے گھر کی عورتیں بڑی بے تکلفی اور تُلطف سے زچگی کی باتیں کرتی ہیں۔ یہ باتیں کچھ ایسی پچھے دار، رس بھری اور پُراسرار سی ہوا کرتیں کہ زچگی سے دل ہی دل میں بڑا گہرا پیار ہو جاتا۔ زچگی کے بعد چوری چکاری کے معاشقے، دُوسری عورتوں اور لڑکیوں کے آبرو سوز واقعات کا کھلا بیان، شوہروں کی ایسی باتیں جو تخلیئے میں بھی ہوتے ہوئے کھلتی ہوں باآواز بلند نہایت تفصیل سے بے نقاب کی جاتیں۔ ہم سی گُھنّی لڑکیاں بظاہر سوئی سلائی کے کام میں مصروف رہتیں لیکن کانوں میں ان کی باتوں کا ٹیپ بھرتا رہتا۔

بلّی آپا کے گھر میں اوّل تو بوبوجی نے کبھی بے شرمی کی کوئی بات کی ہی نہیں تھی۔ اگر گھر میں کام کرنے والی ماما کوئی ذکر لے بھی بیٹھتی تو گاڑیاں فوراً شنٹ کر دی جاتیں۔ تعجّب ہے تو اس بات پر کہ پھر بھی تینوں بہنوں کو اُن ساری باتوں کا علم تھا جنھیں میں نے اپنی دانست میں ایک زمانہ کھنگال کر جمع کیا تھا۔ اُن کا ماسوتزا کا علم مجھ سے بہت زیادہ وسیع اور گہرا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ اُن کی فطری ذہانت تھی جو باتوں کی تہہ کو پہنچ گئی تھی اور پھر یوں سمجھیے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے اُن کے انداز اس قدر معصوم تھے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہوں۔ تجمل تو دسویں میں ہونے کے باوجود بھی کبھی کبھی تو تُلا کر بولنے لگتی تھی۔

سچ پوچھیے تو سارا قصور تربیّت کا ہے۔ اگر اُن کی تربیّت بھی مجھ ایسی ہوتی تو تینوں معصوم رُوحوں پر اُسی طرح ٹوٹ کر جوانی آتی جیسے مجھ پر آئی تھی یا شاید اُن کی نسل ہی بہتر تھی۔ ورنہ کیا بات تھی کہ فصاحت کی ان مہروں میں کبھی بھرپور طغیانی نہ آئی۔ لوگوں کو اپنے شجرۂ نسب پر اتراتے دیکھا ہے۔ جھوٹے قصّے گھڑ کر اپنے آباؤاجداد کو سونے کے فریم میں جڑتے بھی دیکھا ہے۔ لیکن بلّی آپا کے خاندان کی تو بات ہی اور تھی۔ ہر چیز کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ ہر واقعے کا اپنا سٹو پا کہیں نہ کہیں گڑا تھا۔ تین منزلہ مکان کی سوانح میں کتنے حملہ آور ہٹے اور کیسے کیسے پسپا ہوئے۔ آغاجی مرحوم نے کن کن مقامات پر کس کس سن میں حکومت کی۔ علاقے کے جملہ افسران کیسے کیسے ان کے کفش بردار بنے اُن کی ذرہ ذرہ بھر تفصیل سب کو یاد تھی۔ آغاجی کے پڑدادا کس طرح دیگ میں سفر کر کے گجرات پہنچے تھے اور اُن کے ساتھ دیگ میں کون کون سی کتابیں، کیسی کٹار اور کس رنگ کا قالینچہ تھا۔ اس کی بھی داستان کچھ ایسی زبان زد تھی کہ بہنوں کی نکھوٹے میں کہانی کا زاویہ کبھی بھی نہ بدل پاتا۔

لوگوں کی بات تو چھوڑیئے رائی کا پہاڑ بنا لیں۔ لیکن ایسے چھچھورے تھوڑی تھے وہ لوگ۔ وہاں تو اتراہٹ نام کو نہ ہوتی۔

"بھئی ہم تو آریائی ہیں ———" اُلٹا اُن کے لہجے میں اُکتاہٹ ہوتی۔

"جرمن بھی آریائی ہوتے ہیں ناں آپا؟" تجمّل جان پوچھتی۔

"ہاں اور کیا؟ ———"

"آپا ہمارے پڑدادا ولی اللہ تھے ناں؟ گجرات تک دیگ میں سفر کیا تھا۔ ہے ناں آپا؟"

بلّی آپا کو ایسی باتوں سے اُلجھن ہوتی تھی۔ منہ بنا کر کہتیں:

"سو بار بتایا ہے آدھا بٹالہ اُنھوں نے مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ جہانگیر بادشاہ ننگے پیر زیارت کو آیا کرتا تھا۔" اللہ! جہانگیر زیارت کو آتا تھا اور بلّی آپا کے نزدیک جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں۔ لوگوں کے لگڑ دادا کے کسی واقف کے پاس کسی راجواڑے کے مالک کا رُقعہ بھی آجائے تو وہ اُسے شیشے میں مڑھوا کر کارنس پر رکھیں ——— اور یہاں خود جہانگیر! واللہ منکسر المزاجی ایسی نہ دیکھی نہ سُنی۔

لوگوں کے پاس رواج تو کوئی ہوتا نہیں۔ فیشن کی طرح اِدھر اُدھر سے دیکھ کر دو چار رواج ہاتھ لگ جاتے ہیں تو ڈنکے کی چوٹ اُن کو نشر کیا جاتا ہے۔ ادھر بلّی آپا کے خاندان میں برس ہا برس سے جو رواج تھے وہ اُن سے بھی بیزاری ظاہر کیا کرتی تھیں۔

کہتیں ——— "کیا گندا رواج بن گیا ہے ہمارے گھر کا ——— آج تک کبھی خاندان سے باہر کسی کی شادی ہی نہیں ہوئی۔"

"گندا کیوں ہے آپا؟ ٹھیک تو ہے نسل خراب ہوتی ہے ملاوٹ کے ساتھ۔" نجّل کہتی۔

بلّی آپا شاید میرا دل رکھنے کو ایسے کہتی تھیں کیونکہ میری نسل آریائی نہ تھی اور ہمارے گھر میں شادی کے معاملے میں ایسی کوئی پابندی نہ تھی۔ لڑکا کلمہ گو ہوتا، برسرِ روزگار ہوتا۔ محلّے والے اُسے اچھا سمجھتے تو گھر کی سب سے پیاری لڑکی فٹ سے اُسے مل جاتی۔ خدا قسم دل رکھنے کی اتنی پیاری رسم بھی میں نے اُن ہی کے ہاں دیکھی ورنہ لوگ تو دل کا پلیتھن بنانا جانتے ہیں۔

شادی بیاہ کی بات چل نکلتی تو قصّہ دُور تک پہنچتا۔ ایک روز ایسی باتوں کے بل کھولتے ہوئے پروین نے مجھے بتایا تھا۔
"ہماری پڑ پھوپھی نے اپنے گھر میں غیر ذات کی بہو کو داخل کر لیا تھا۔ سبھی نے اُن سے ناطہ توڑ لیا۔ بیچاری پھوپھی کلپ کلپ کر مریں۔ گھر گھر سندیسہ بھیجا۔ کسی نے قدم نہ رکھا اُن کے گھر۔ ذات برادری سے باہر ہی شمار رہا اُن کا ——— ہے ناں بلّی آپا؟"

بلقیس آپا آہستہ سے کہتیں ——— "اور کیا؟ لوگوں کے رواج تو قیامِ پاکستان کے بعد سے بننے لگے ہیں۔ ہمارا تو پشت ہا پشت سے یہی رواج ہے۔"

جس طرح راجپوتوں کی آن کے قصّے سُن کر اور سہراب مودی کی فلمیں دیکھ کر جوشِ حمیّت، غیرت اور خاندان کی عظمت کا تصوّر بندھا کرتا تھا اسی طرح بلّی آپا کے گھر کی باتیں سُن کر میرا دل چاہتا کہ کاش ہماری بھی کوئی پڑ پھوپھی کلپ کلپ کر مرتیں۔ کاش ہمارے گھر میں بھی کوئی روایتیں ہوتیں جن کے پیچھے ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیتے۔

اپنے گھر میں تو بس ایک ننگا بوچا اسلام تھا۔ بالکل ایسا بے رونق جیسے بن محمل کی لیلیٰ۔ ابّا ڈاکٹری کم کرتے تھے اور تبلیغی پارٹیاں زیادہ بنانے میں مگن رہتے۔ مجھے کچھ اُن کی سرگرمیوں سے چڑ نہ تھی۔ لیکن جب انسان محض مشغلے کی خاطر ایسے کام کرے تو عافیت رہتی ہے اگر وہ واقعی جی سے انقلاب پسند یا اسی قسم کی کوئی اور شے بن جائے تو سمجھ لیجیے سب سے پہلے شامت گھر والوں کی آئے گی۔

ٹھیک ہے تنگ نظری بُری شے ہے۔ لیکن رواج تو رواج ہوتے ہیں، ان کا تنگ نظری سے کیا تعلق؟ اور ابّا کی وسیع نظری تو ایسی عجیب تھی کہ انسان گھڑی بھر میں اپنی نظروں سے ہی گر جاتا۔ ہم لوگوں کو لیکچر ملتا ——— "اسلام بیٹا ساری دُنیا کا مذہب ——— سیاہ اور سفید کی اس میں گنجائش نہیں۔ آخر میں یہی مذہب رہ جائے گا کیونکہ یہ ہر مذہب کی ترمیم شدہ کاپی ہے۔ یہ اللہ کی آخری ہدایت ہے۔ اگر تم لوگوں نے تعصّب اور کم نظری کو اپنایا تو پھر یہ دین کاہے کو پھیلے گا؟ شادی جہاں جی چاہے کرو۔ بیوقوفو! تم پر تو اہلِ کتاب بھی حرام نہیں۔ اتنی کھُلی چھُٹی کسی اور مذہب میں کبھی دیکھی ہے ——— ارے احمقو! اگر تنگ نظری برتو گے تو اسلام کیسے بڑھے گا؟"

لیجیے اسلام کو فروغ دیتے ہوئے ہمارے گھر میں ایک جاپانی، ایک بلوچی، ایک کشمیری اور ایک جرمن بھابی آگئی۔ اچھا خاصا فلم ایک بنتی چار راستے بن گیا۔ اب اسلام کے نام لیواؤں کی ایسی ٹیم گھر میں تیار ہو چکی ہے کہ جی چاہتا ہے ابّا سے پوچھیں۔" ابّا ہمارے بھائیوں کی یہ انٹرنیشنل نسل ——— یہ سفید، براؤن، سیاہ، گندمی، زرد، کندنی چہروں والے بچّے کون سی گوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کونسا وحدانیت کا رسّہ ہے جس سے آپ ان سب کو باندھ لیں گے؟"

سچ پوچھیے تو امّاں ٹھیک ہی کہتی ہیں ابّا جب سے ریفارمر ہوئے گھر کو حلیم کی دیگ بنا ڈالا۔ جو دال ہے اسی دیگ میں ڈال دیجیے جو مسالہ ہے اسی میں کھپ جائے گا۔

اللہ جانے کیوں لیکن ہمیں تو مذہب اسلام پھیلانے کا شوق کبھی نہیں چرایا۔ آپ چاہے اسے تنگ نظری سمجھیں لیکن اشرافوں میں کسی کے کردار کے متعلق گوت پوچھ کر ہی قیافہ لگایا جاتا ہے۔ بلّی آپا کے خاندان نے بھی ایسے ٹھقہ بند اصول بنا رکھے تھے کہ کسی کی ذات سے کھٹ اُس کا سرٹیفکیٹ بن جاتا۔

ایکبار کلثوم نے کہا تھا۔ " ہماری پلیٹ سے کھانا اُلٹا ثواب ہے سب کے لیے۔ ہم تو سیّد زادی ہیں۔ ہماری رکابی کی کوئی شے جھوٹی نہیں۔"

کلثوم نے تو بلّی آپا کو اپنی پلیٹ کی روغنی ہڈّی کھلانے کے مارے یہ سب کچھ کہا تھا۔ لیکن خدا قسم چیز کھلانے کا بھی کیسا بھونڈا طریقہ اختیار کیا۔ اللہ کبھی لوگوں کو بات کرنے کا سلیقہ ہی آ نہیں پاتا۔

تب، تو بلّی آپا خاموش رہیں دل آزاری کا سبق تو اُن لوگوں نے سیکھا ہی نہیں۔ گھر پہنچ کر بڑے رسان سے بولیں۔" کلثوم سیّد ہے۔ چہرے مہرے سے سیّد لگتی ہے نہ عادات سے۔ سیّدوں والی کوئی بات ہو۔"

ٹھیک تو کہتی تھیں بلّی آپا کوئی بات تو سیدّوں والی ہونا؟ تجمّل برقعہ اتارتے ہوئے بولی ——— " صدیاں گزر گئیں اب کوئی سیّدوں کی خصوصیات باقی رہ گئی ہیں۔"

پروین جیسلی چارپائی تلے دھر کر پاس ہی بیٹھ گئی اور گو وہ کم گو تھی لیکن گفتگو میں نُقل پیش کرتی رہتی تھی جھٹ بولی " سب بناوٹی سیّد بازی ہے بناوٹی، سُنا ہے میراثی ہیں میراثی۔"

پروین کی اس بات پہ مجھے فوراً یقین آ گیا کیونکہ جانے کیا بات ہے ہمیشہ ایسی باتیں دل میں گھر کر لیتی ہیں۔

اس روز جب ابا ہسپتال جا رہے تھے تو کہنے لگے ——— "شاہ صاحب کی بھی کیا بات ہے ۔ سید ہو تو ایسا ہو ——— "

میں چمک کر بولی ——— "ابا جی بناوٹی سید ہیں بناوٹی ۔"

ابا نے ہاتھ میں سے بیگ دھر دیا اور مجھ پر نظریں گاڑ کر بولے ——— "اب بیٹا باطن کا علم تو اللہ کو ہے جو کلمہ گو ہے وہ مسلمان ہے جو اپنے آپ کو سید کہتا ہے وہ سید ہے ۔ تم اور میں فیصلہ کرنے والے کون ہیں ؟"

لیجیے اب اپنی قوتِ فیصلہ کو ہی جواب دے دیں ۔ دراصل ابا تو ہمیں شیخ سعدی کی گلستان بوستاں بنانا چاہتے اور انسان بہر کیف کتاب بننا نہیں چاہتا ۔

"لیکن ابا ——— ابا جی . . . . "

اب ابا کی خوش اعتقادی ملاحظہ ہو کہنے لگے ۔ "بی بی ہم درود پڑھنے والے ہیں ۔ آلِ نبی پر سلام بھیجنے والے ہیں ۔ تم آلِ نبی کو کچھ نہ کہو ——— "

جی ہاں کچھ نہ کہو ! یہ بھی کوئی انصاف ہے !

دین کا صحیح تصوّر تو میں نے بلّی آپا کے گھر دیکھا بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ جو بھی درست ، طیب صالح نظریہ آج میرے پاس موجود ہے بلّی آپا کے گھر کی چھاپ اس پر لگی ہو گی ۔ ان کے نظریوں نے شروع دن سے کچھ ایسا چو مینا گاڑا کہ پھر اٹھنے کی ہمت باقی نہ رہی ۔ یوں تو میں بلّی آپا کے خاندان سے مرعوب تھی ہی لیکن مرعوبیت کے کفن میں آخری کیل اجمل بھائی نے ٹھونک دی ۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ آغا جی مرحوم بی اے ایک عدد بیٹے کے باپ بھی تھے ۔ مجھے تو فصاحت کی نگو گم کا ہی علم تھا ، برسوں ہمسائے میں رہی لیکن پتہ نہ چلا کہ فصاحت کے بٹّے دار اجمل بھائی بھی ہیں ۔ علم بھی کیونکر ہوتا ۔ کوئی ہمارے گھر جیسے حالات تو تھے نہیں کہ گھڑی کی پرپیت میں عمر بھر کی حکایت سنا ڈالتے ۔ بو بو جی کی وضع داری کے کیا کہنے ۔ کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی اجمل بھائی کے ساتھ ، برسوں نام نہ لیا کسی نے ان کا ۔ حتیٰ کہ ہر وقت کی ساتھ رہنے والی کو بھی پتہ نہ چلا کہ بلّی آپا کا بھائی راولپنڈی میں بزنس کرتا ہے ۔ بہنیں اندر ہی اندر ضرور بھائی کا ذکر کرتی ہوں گی لیکن بالکل ایسے ہی جیسے کوئی جنسی کتاب چوری چوری پڑھی جاتی ہے ۔

گھرانہ ہوتو ایسا رقیق القلب ۔ کہاں تو اجمل بھائی کا ذکر ہی شجرِ ممنوعہ تھا اور کہاں وہ ایک بار سُرخ سُوٹ کیس اُٹھائے تانگے سے اُترے ۔ بو بو جی کے پاؤں پر سر دھرا ، بہنوں کو گلے سے لگایا تو سب گلے جانتے رہے ۔

اب جنسی کتاب پر ریشمی غلاف چڑھا لیا گیا اور ہر وقت اس کا ورد کھلے بندوں ہونے لگا ۔ ہر بات میں اجمل بھائی کا حوالہ ہر بحث میں اجمل بھائی کی دلیل ۔ بہنیں ہوں تو ایسی محبت والی ۔ اور بھائی ہو تو اتنا اچھا ۔ مجھے ان لوگوں کی زندگی پہ رشک آنے لگا ۔ کوئی ہمارے گھر کا سا نقشہ تھوڑی تھا کہ بھائی کہیں رہتے ہیں اور بہنیں کہیں ۔ بھائیوں کو بھابھیوں نے ہڑپ کر لیا ۔ ایک بڑی بہن تھی سو اس کے گلے میں بھنوئی پٹا ڈال کر چلتا بنا ۔ اللہ اللہ خیر سلّا ۔ گھر میں رہ گئے اماں اور ابا اور میں اور ایک

مجھ سے چھوٹی۔ کبھی عید بقر عید پر جب بھائیوں کی انٹرنیشنل نسل اور بہن کا پیارا شوہر آجاتا تو بڑے معرکے کی لڑائیاں ہوتیں۔ بڑے پرانے قضیے نکلتے۔ آدھا دن لڑنے اور آدھا دن کسی نہ کسی کو منانے گزر جاتا۔

اُدھر بلّی آپا کے خاندان میں اگر کوئی لڑائی تھی تو وہ آبدوز کشتی کی طرح اندر ہی اندر چلتی تھی۔ باہر پانی کی سطح ہمیشہ صاف ستھری رہی۔ بلّی آپا جس طرح بھائی کی مدح سرائی کرتی تھیں اُس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اجمل بھائی کوئی بہت بڑا بزنس کرتے ہیں۔ کئی بار جی میں آئی کہ پوچھوں بلّی آپا اُن کا بزنس کیا ہے۔ لیکن جرأت نہ ہوئی۔ ضرور کوئی بڑھیا قسم کا کاروبار کرتے ہوں گے۔ بڑے ہی نفیس سوٹ پہنتے تھے۔ مُنہ میں لمبا سا پائپ یا سگار ہر دم ہوتا۔ پیروں میں پیٹنٹ لیدر کے جوتے رہا کرتے۔ ایسے چمکی جڑے بوٹ بھلا کسی نے کاہے کو دیکھے ہوں گے۔ آئینے کی طرح ہر دم شفّاف رہتے تھے۔

بلّی آپا کے گھر سے ہی پتہ چلا کہ ٹائی پن، نوکدار جوتے اور فارن سوٹ پہننے والا مرد ضرور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تمام اشرافوں کی کھلی نشانیاں ہیں۔ اگر کار اور بنگلا بھی رکھتا ہو تو سمجھیے اُس کی نجابت میں کسی کو کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ اپنے ابّا کو تو نہ جانے کیوں اجمل بھائی سے چڑ ہو گئی تھی۔ کبھی اجمل بھائی کی بھلی بات کی ہی نہیں۔ شاید بڑھاپے کی وجہ سے اُن کی جوانی زہر لگتی تھی۔ جب بھی کوئی بات ہوتی کہتے ——— "اس اجمل کے بچے نے آغا بختیار کی ناک کٹوا دی۔ مردود سلیقے کا ایک کاروبار نہ کر پایا۔ اب فلموں میں لڑکیاں بھرتی کراتا ہے کم بخت!"

"بڑے ریفارمر بنے پھرتے ہیں ابّا!" میں جی میں کہتی۔ ذرا سا بھی اندازہ نہیں شریف لوگوں کا۔ اونہہ! ابّا دراصل آغا مرحوم بی اے سے جلتے تھے ــ اُن کے خاندان سے جلتے تھے۔ جب بلّی آپا اپنے مُنہ سے کہتی ہیں کہ اجمل بھائی کوئی بہت اعلیٰ بزنس کرتے ہیں تو کیا وہ جھوٹ کہتی ہیں؟ اور لیجیے بالفرض محال میں جان بھی جاؤں کہ وہ بقول ابّا فلموں میں لڑکیاں سپلائی کرتے تھے تو جناب اس میں برائی کیا ہے آخر؟ بزنس از بزنس ——— چاہے وہ جوتوں کا ہو چاہے لڑکیوں کا!

ابّا میاں کی باتیں تو ایسی تھیں جیسے فلیش کا لمبا زنجیر کھینچنے پر گھر گھر پانی نکلا اور لمحہ بھر بعد سکون ہو گیا۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ بلّی آپا کے خاندان جیسا نہ ہم نے دیکھا نہ سُنا۔ جس روز اجمل بھائی پر نظر پڑی میں نے اپنی پچھلی زندگی کو گندی سلیٹ کی طرح صاف کر دیا۔ یہاں پہنچ کر میں سمجھ چکی تھی کہ شرافت، عالی نسبی، اور حُسن کا مجسّمہ صرف اجمل بھائی ہیں۔ رنگت کا وہ سانولا پن، مونچھوں کی ننھّی سی لٹ، کندھوں کا خمیدہ پن، کنپٹیوں پر آئے ہوئے وہ اوّلین سفید بال ——— اُن کے حُسن کی ایک ایک چنوَن کھال بن کر میرے احساس کے ڈھول پر تن گئی اور پھر خدا جانے کہاں سے اس ڈھول پر ایک ہی تھاپ پڑنے لگی ———

اجمل . . . . . . اجمل . . . . . . اجمل . . . . . . اجمل . . . . . . اس تھاپ کی آواز کبھی اتنی آہستہ ہوتی کہ بلّی آپا اور تجمّل کے سامنے یہ ہلکی سی چٹکی میں بدل جاتی اور کبھی اس نقّارے کی آواز اتنی بلند ہو جاتی کہ میں سوتے میں جاگ پڑتی اور سارے گھر میں یوں گھومتی جیسے میرے کپڑوں کو آگ لگ گئی ہو۔

اجمل بھائی کے وجود کا احساس مجھے ہر وقت رہنے لگا۔ اُن کی ہر بات مجھے بے حد مرعوب کرتی۔ جس طرح وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے اخبار پڑھتے اور اُن کے بائیں ہاتھ کی اُنگلیاں کُرسی کی پٹّی کو تھپکتی رہتیں۔ روٹی کا نوالہ توڑنے سے پہلے وہ

نہایت باریکی کے ساتھ پپیاتی کا پھلوندا اُتارتے اور پھر مسل مسل کر اسے گوبیوں میں بٹتے رہتے چھوٹی بڑی گوبیاں اُن کی پلیٹ سے اُٹھا کر مجھے کتنی خوشی ہوتی۔ کھیرے کاٹنے میں جس اہتمام اور حسن کا مظاہرہ کرتے تھے وہ آج بھی میری آنکھوں میں گھومتا ہے پہلے باورچی خانے کی سِل پر چھری تیز کی جاتی ۔ بار بار اس کی آب کو پرکھا جاتا۔ پھر نہایت نفاست سے کھیرے کی آدھ انچی قاش اُتار کر بڑی دیر تک جھاگ نکالتے رہتے حتیٰ کہ کھیرے کی ساری کڑواہٹ نکل جاتی اور وہ کدو جیسا میٹھا نکل آتا۔

کبھی کبھی مجھے یُوں لگتا جیسے یہ آدھ انچی قاش میری کھوپڑی پر ملی جا رہی ہو اور آہستہ آہستہ نہایت سلیقے کے ساتھ مجھ میں سے دُنیاوی کثافتوں کا کڑوا مادہ رس رس کر نکالا جا رہا ہے۔ پھر جب وہ کھیرے کی لمبی لمبی قاشیں کاٹ کر پلیٹ میں رکھتے تو میرا جی چاہتا کہ کاش وہ میرے جسم کو بھی ایسے ہی قتلوں میں کاٹ لیں اور اسی پرِیت سے نمک مرچ لگا لگا کر کھائیں۔

اُن کی چھوٹی چھوٹی باتیں، بولتی جاگتی ادائیں، برسوں استعمال شدہ عادتیں بظاہر نہایت معمولی تھیں لیکن میرے لیے یہ سادہ پانی بہت جلد برف کی اُن ٹکڑیوں میں تبدیل ہوگیا جو فریج کے برف خانوں میں جمتی ہیں۔ میں نے عرض کیا ناں کہ ویسے تو بلّی آپا کے گھرانے کی ہر ہر بات مجھے مرعوب کرتی تھی لیکن اجمل بھائی نے تو اس مرعوبیت کے کفن میں آخری کیل ٹھونک دی۔

اپریل کی شام تھی۔

گرمی یک دم آگئی جیسے رات کے پچھلے پہر گاؤں سے کوئی مہمان آجائے۔ نجّل اور پروین ٹھنڈے پانی سے نہا کر بھی گرمی کی شکایت کر رہی تھیں۔ صرف بلّی آپا سوچ رہی تھیں کہ اپریل کے مہینے میں ٹھنڈا پانی حفظانِ صحت کے لیے مفید ہے کہ مُضر۔ وُہ دوپٹے سے پنکھا جھلتی کبھی باورچی خانے کی طرف جا نکلتیں اور کبھی غسلخانے کی طرف۔

کوٹھی کے پچھواڑے فاسے کے پودوں سے لے کر اُس سِل تک جہاں آغا بختیار علی مرحوم بی اے کا بورڈ نصب تھا۔ نئی نئی گرم ہوا اور چڑیوں کا شور پھیلا تھا۔ کوٹھی پُورے آٹھ کنال میں تھی۔ ایک سرے سے لے کر دُوسرے سرے تک کھٹے کی باڑ کا اُونچا اُونچا پردہ تھا۔ پھاٹک سے کچھ ہٹ کر لمبے لمبے بوتلی شہتوتوں کا درخت تھا۔ گو بلّی آپا مجھے درختوں پر چڑھنے سے کئی بار روک چکی تھیں۔ لیکن کیا کروں جب کلیجی مائل یہ لمبے لمبے شہتوت منہ میں جاتے تو اُن کے شہد سے حلق میں خوشبو اور رس کی ایک پچکاری چل جاتی اور پھر ہم میں اتنا صبر کہاں کہ کب مالی شہتوت توڑے اور طشتری میں لگا کر لائے اللہ اللہ ہمیں تو درختوں پر چڑھ کر اٹک اٹک، لٹک لٹک کر شہتوت کھانے کا چسکا تھا۔

جب اجمل بھائی پھاٹک کھول کر اندر آئے تو نرسلوں کی اوٹ میں سے اُن پر میری نظر اچانک جا پڑی۔ میرا خیال تھا کہ اُنھوں نے مجھے نہیں دیکھا اور وہ اپنا تھیلا اُٹھائے اندر چلے جائیں گے لیکن پھر وہ پیٹنٹ لیدر کے جوتے احتیاط سے کیاریوں میں دھرتے میری طرف بڑھنے لگے۔ اُن کے چہرے پر عجیب دلکش مُسکراہٹ تھی۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا مُسکرا رہے ہیں یا مُسکرا چکے ہیں یا ابھی کھُل کر مُسکرائیں گے۔ دراصل اس بھینی بھینی مُسکراہٹ کے آگے تو کوئی بھی لڑکی ہتھیار ڈال دیتی۔ لیکن میرے دل میں اس مُسکراہٹ کو قریب اور واضح صُورت میں دیکھنے کا اشتیاق ٹھاٹھیں مار کر اُٹھا۔

"شہتوت کھا رہی ہو عائشہ ؟" اُنھوں نے میرا نام لے کر سوال کیا۔ اس سے پہلے اس بے تکلفی کے ساتھ اُنھوں نے

اپنی بہنوں کے سامنے کبھی مجھے نہ بلایا۔

"جی !——"

"آئس کریم کھاؤ گی ؟" اب اُن کی مسکراہٹ گہرے رنگوں کی تصویر بن گئی۔

"جی نہیں ——"

اُنھوں نے مجھے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا اور بریف کیس گھاس پہ رکھ کر بازو پھیلا دیئے۔ اس وقت اُن کے ہاتھ میرے ٹخنوں تک پہنچتے تھے۔ میں لمحہ بھر کو ٹھٹھکی لیکن خیال آیا کہ ڈرنے کی کیا بات ہے اجمل بھائی جس طرح کبھی کبھی پروین کو اُٹھا لیتے ہیں شاید اُسی نیت سے مجھے اُتار کر سیدھا گھاس پر پھینک دیں۔ شاید بوبو جی سے شکایت بھی کریں کہ میں درختوں پر چڑھ کر شہتوت کھا رہی تھی۔

میں چھ سال کی ہلکی پھلکی بچی کی طرح اُن کے بازوؤں میں اُتر گئی۔ میرے بالوں میں شہتوت کی ایک ٹہنی اس بُری طرح پھنس گئی کہ کتنی ہی دیر وہ بالوں کو چھڑاتے رہے۔ پھر اُنھوں نے اس اُلجھ جانے پر ایک جنسی سا مذاق بھی کیا جیسے ہم دونوں مدتوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے ہوں۔ یا ہو سکتا ہے یہ میرے گندے ذہن کی پیداوار ہو۔ دراصل میں خالہ کی باتیں بچپن سے سنتی آ رہی تھی اور باتوں کے درپردہ مطالب سے مجھے بڑا عشق ہو چکا تھا۔

بریف کیس وہیں شہتوت تلے پڑا رہ گیا۔

اجمل بھائی کی مسکراہٹ اب فاتح فوج کا جھنڈا بن چکی تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے ٹہنیاں اُٹھاتے رستہ دکھاتے اُس طرف لے چلے جہاں لوکاٹ کے درختوں کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں تھی اور پرانے رہٹ کی اینٹیں گھاس میں یوں بکھری پڑی تھیں۔ جیسے پکنک پر آئے ہوئے لوگ۔ درختوں پر نارنجی مائل زرد پھلوں کے گچھے تھے اور فضا میں سیاہ بھونروں اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ تھی۔

"کالر والی قمیص نہ پہنا کرو عائشہ۔"

"جی ؟ ——"

"اس طرح عورت کا سینہ مردانہ لگتا ہے۔"

"جی اچھا ——"

پھر اُنھوں نے آگے بڑھ کر میرے کالر کے دونوں بٹن کھول دیے اور اپنے لب میری ہنسلی کی ہڈی پر چسپاں کر دیے اگر —— یہی حرکت کسی اور مرد سے سرزد ہو جاتی تو وہ مجھے آوارہ، بے شرم اوچھا اور بداخلاق نظر آتا لیکن میں آپ کو بتا چکی ہوں، ناں بلی آپا کے خاندان کی تو بات ہی اور تھی اُن کی تو ہر بات کو ہاتھی دانت کا دستہ لگا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے اجمل بھائی بے سہارا نہایت مسکین اور بھولے بھالے نظر آئے۔

محبت میں جو لوگ نظر سے لمس تک اور لمس سے وصل تک برسوں میں پہنچتے ہیں اُن کی ساری منزلیں، رت جگے اور

انتظار مجھے مُہمل سے نظر آئے۔ جب دو شخص ایک دُوسرے کے ہو ہی چکے تو پھر خواہ مخواہ کرب کی کٹھالی میں تپنے سے کیا فائدہ!
دراصل یہ نقطہ کبھی میری سمجھ میں ہرگز نہ آتا اگر اجمل بھائی اس نقطے کی وضاحت نہ کرتے اور میری گھبراہٹوں کی جلتی استری پر منطق کے یہ ٹھنڈے چھینٹے نہ ڈالتے تو شاید ہم ایک دُوسرے کے اس قدر قریب نہ ہو سکتے۔ لیکن جب اُن کی بات مجھے سمجھ آ گئی تو ہمارا قرب نہایت فطری قابلِ فہم اور اخلاقی نظر آنے لگا۔

"ہم دونوں ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہیں نا؟ ———"

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"سُنو عائشہ ہماری محبت بے لوث ہے نا؟"

پھر اثبات میں سر ہلا۔

"پھر ہم کسی سے کیوں ڈریں ———؟"

"بس ایسے ہی ———"

"محبت میں کسی سے ڈرو گی تو میں سمجھوں گا کہ تمھیں مجھ سے محبت ہی نہیں ہے ———"

"جی؟"

"پگلی! جو کچھ میرا ہے تمھارا ہے۔ جو کچھ تمھارا ہے کیا وہ میرا نہیں ہے؟"

خدا جانے اس دلیل میں کیا بات تھی کہ میرے ضمیر نے اپنی چابک قریب والے کنوئیں میں پھینک دی اور میں آنکھیں موند اُن کے کندھے سے لگ گئی۔

جب ہم درختوں سے نکلے تو شام بہت گہری ہو چکی تھی۔ چڑیاں جانے کہاں جا چکی تھیں۔ کوٹھی پر بڑی خاموشی طاری تھی۔ کوئی کوئی جھینگر گرمیوں کی اس نئی شام کو اور بھی اُداس بنا رہا تھا۔ درختوں سے نکلتے وقت اجمل بھائی نے پُوچھا "اور وہ تمھاری سہیلیاں کہاں تھیں اس وقت؟"

"نجمی اور پروین نہا چکی تھیں اور ——— بلّی آپا شاید پانی گرم کروانے کا سوچ رہی تھیں۔"

"ٹھیک ہے ——— ٹھیک ہے کسی سے ذکر نہ کرنا کہ میں گھر میں آیا تھا اس وقت ——— میں دفتر واپس جا رہا ہوں ———"

میں درختوں سے نکل کر گھاس پر بیٹھ گئی وہ مجھے ویسے ہی بیٹھا چھوڑ کر چلے گئے۔

پہلے تو اُن کی یہ بات مجھے بہت بُری لگی۔ اگر ہماری محبت اتنی ہی اٹل اور بے لوث ہے جیسا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے پہ ثابت کر دیا تھا تو پھر اُسے یُوں چھپانے کے معنی؟ لیکن رفتہ رفتہ دل نے اُن کی عقل مندی کی خُوب داد دی۔ کتنی وضاحت سے کہا تھا اجمل بھائی نے ——— کسی سے ذکر نہ کرنا۔ محض میری عزت بچانے کے لیے، مجھے بدنامی کے دُکھ سے محفوظ کرنے کے لیے وہ اس گربہ پائی سے چلے گئے تھے۔ خدا قسم بلّی آپا کے گھر والوں جیسی سنتر پوشی ہم نے دیکھی نہ سُنی۔ ہمارا گھر ہوتا تو غالب

کا طرزِ بیان لے کر ایسی ایسی حاشیہ آرائی ہوتی کہ گھر کی بات کوٹھوں جا نکلتی۔
میں بہت دیر تک گھاس پر بیٹھی رہی۔ مجھ پر چوری کی پہلی چوری کا لرزہ طاری تھا۔ پتہ پتہ بُوٹا بُوٹا حال ہمارا جانے ہے کی سی کیفیت گھوم پھر کر دماغ پر مسلّط ہو جاتی۔ کچھ خوف، کچھ خوشی، کچھ ہجر مجر کرتے وسوسے مجھے گھیرے ہوئے تھے، اتنی دیر ہو جانے پر بھی جب میں بلّی آپا کے گھر پہنچی تو تینوں لڑکیاں ادھر سے اُدھر ——— گھوم پھر کر صحن میں بستر بچھا رہی تھیں۔
گھڑونچی کے پاس ہی اجمل بھائی کا بریف کیس پڑا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔
تجمّل نے پُوچھا۔ "ہائے اللہ تم اتنے عرصے کہاں غائب رہیں عائشہ ؟"
شہتوتوں کا شہد آگیں مزہ نہ جانے کیوں حلق میں دھتورے کی طرح کڑوا بن گیا۔ میں گھڑونچی کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔
"شہتوت کھا رہی تھی۔"
"اتنی دیر تک ———" پروین نے تکیے پر پٹّے کے ہاتھ مار کر پُوچھا۔
اب بلّی آپا نے گردن موڑ کر بڑے غضب سے بات کی۔
"اللہ یہ پولیس کا محکمہ کب سے کُھلا ہے گھر میں۔ کوئی آئے جائے تم سے مطلب ؟ دیوار سے دیوار ملی ہے اپنے گھر چلی گئی ہو گی۔ کیوں عائشہ ؟"
اب تجمّل کو بھی اپنے فوجداری رویّہ پر ندامت ہوئی فوراً بولی ——— "بابا میں تو اس لیے پُوچھ رہی تھی کہ بلّی آپا تمھیں ڈھونڈنے پچھواڑے تک گئی تھیں ———"
میں گرتے گرتے بچی۔
"خواہ مخواہ ! میں تو گیٹ تک دیکھنے گئی تھی۔ یونہی تم لوگ تو بات کا یہ بڑا سارا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔"
لمحہ بھر کے لیے میرا دل دھڑکنا بند ہو گیا۔ لیکن جی ہی جی میں بلّی آپا کی عالی حوصلگی سے نڈر بھی ہو گئی۔
"شہتوت کھا رہی تھی بلی آپا ——— کیوں کوئی بُری بات کی ہے کیا ؟"
بلّی آپا ناں ناں کرتی ہوئی ٹرنکوں والی کوٹھڑی میں غائب ہو گئیں۔ اُن کے جاتے ہی تجمّل اور پروین نے ایسی لمبی باتیں شروع کیں کہ درختوں والا وارنٹ گرفتاری بھی میرے ذہن سے اُتر گیا۔
اجمل بھائی کے عشق میں مُبتلا ہوئے مجھے بمشکل دُوسرا دن تھا کہ ایک عجیب سا واقعہ ہُوا۔
بلّی آپا تو ایف اے کے بعد گھر بیٹھ گئی تھیں لیکن تجمّل اور پروین کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ سکول ختم کرتے ہی وہ ایف ایس سی کریں گی اور اُس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم لے کر ایک بڑا سا ہسپتال کھولیں گی ——— اُن کے ایسے نیک خوابوں کے سامنے کبھی مجھے اپنے خواب بیان کرنے کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ یہاں تو چھوٹا سا گھر تھا۔ ننھے منّے بچّے تھے اور ایک پیارا سا شوہر تھا جس نے پیٹنٹ لیدر کے جُوتے پہنے ہوئے تھے۔

تجمّل ان دنوں دسویں میں تھی اور سکول کے بعد اپنی کسی اُستانی کے گھر پڑھنے جایا کرتی تھی اس روز وہ شام گئے تک نہ لوٹی۔ بوبوجی پھاٹک سے برآمدے تک ایسے چکّر لگا رہی تھیں جیسے کسی جمگادڑ کا راڈر خراب ہوگیا ہو اور وہ کمرے میں اُلٹے سیدھے طواف کر رہی ہو۔ پروین اور بلقیس آپا شوجی کی طرح غصّے میں تنی تھپا تھپا کبھی ادھر جاتیں کبھی ادھر۔ شام میں اُس کی کیفیت نہ تھی۔ بلکہ بڑی بغلگیر ہونے والی گرمی سی پڑ رہی تھی۔ میں شہتوت کے درخت پر چڑھی تھی۔ پر آج میری نظریں قرمزی موم بتیوں پر تھیں۔ نظریں بار بار نرسلوں کے جھنڈ کی طرف اٹھتی تھیں۔ ذرا سا کھٹکا اجمل بھائی کا ہیولا بن کر میری طرف بڑھتا آتا تھا۔

اپریل کی شام جب چڑیوں کے شور سے خالی ہوگئی تو اجمل بھائی بریف کیس اُٹھائے مجھ تک آپہنچے۔

"لائین کلیر ہے ناں ؟ ———" اُنھوں نے پوچھا۔

میں نے احاطہ کی سیدھی دیوار پر نگاہ ڈال کر کہا ——" جی ؟"

"تم بہت گوون ہو عائشہ —— باقی سب کہاں ہیں ؟"

"بوبوجی بار بار پھاٹک تک آتی ہیں اور پروین اور بلّی آپا برآمدے میں چکّر کاٹ رہی ہیں اور . . . . ."

وہ چونکنے ہو گئے۔ " وہ کیوں ؟ بوبوجی کیوں چکّر کاٹ رہی ہیں پھاٹک کے ؟ ——"

"تجمّل نہیں آئی اُستانی جی کے گھر ——"

"کیا کہا ابھی تک نہیں آئی ——— ؟ کیا کہہ رہی ہو عائشہ ——"

"جی ——"

"لیکن —— ؟ ——"

اس لمحے ہم سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر بوبوجی اتھا پوچھتی ہوئی گزریں۔ اُن کی آنکھیں پھاٹک پر جمی تھیں ورنہ اُن کی نگاہ ضرور پڑتی۔ یا شاید وہ بھی بلّی آپا کی طرح ستر پوش تھیں۔ جھپاک سے نکل گئیں۔ گو اجمل بھائی اس وقت میرے بالکل قریب کھڑے تھے لیکن مجھے محسوس ہُوا کہ وہ کہیں سفر پر جا چکے ہیں۔ کسی ایسے ایکٹر کی طرح جسے سارا پارٹ بھول چکا ہو وہ گم سُم سے کھڑے تھے۔

ابھی بوبوجی بمشکل تمام پھاٹک تک پہنچی ہوں گی کہ اجمل بھائی رکشے کی سی رفتار کے ساتھ اُن کی طرف لپکے۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی آہستہ آہستہ اُن کے تعاقب میں پہنچی۔

"تجمّل کہاں ہے بوبوجی ؟ ——" وہ کڑکے۔

سُنا ہے ہر انسان کے دو رُوپ ہوتے ہیں۔ یہ گرج چمک کا رُوپ میرے لیے نیا تھا۔

"اُستانی جی کے گھر گئی ہے ——" بوبوجی خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

"یہ —— اس وقت ؟ یہ کون سا وقت ہے ؟"

"شام کو جلد آجاتی ہے آج بس نہیں ملی ہوگی۔"

بس بھی اب دیر سے ملنے لگی تھی تجمّل کو —— اور سُنا تھا اُستانی جی کا بھائی بھی امریکہ سے آیا ہُوا ہے۔ وہ کم بخت

ایک آواز بھرنے والا ٹیپ ریکارڈ بھی ساتھ لے آیا تھا جس کی وجہ سے بھی تجمّل کو کبھی کبھی شام پڑ جاتی تھی۔ بلّی آپا کے گھر کی تو بات ہی اور ہے۔ کہیں ہماری اُستانی جی کا بھائی امریکہ سے لوٹتا تو ہم سارا دن اُن کی دہلیز توڑا کرتیں۔ ٹیپ ریکارڈ اور کیمرہ دیکھنے کی تمنّا میں مرا کرتیں پر بلّی آپا کے خاندان کی تو بات ہی اور ہے تجمّل کہا کرتی تھی —— "اللہ اُستانی جی کا بھائی لاکھ لاکھ منتیں کرتا ہے ہم سیدھے مُنہ بات تک نہیں کرتیں۔"

مجھے بوبوجی کی بات کا فوراً اعتبار آگیا کہ تجمّل کو بس نہ ملی ہوگی۔ لیکن اجمل بھائی آخر بھائی تھے تلملا کر بولے —— "اُسے روز اُستانی صغریٰ کے گھر کیوں بھیجتی ہو بوبوجی؟"

"پڑھائی میں کمزور ہے۔ ویسے بھی اُستانی جی ایک پائی نہیں لیتیں۔ ٹیوشن دینی نہیں پڑتی۔ آخر ہرج ہی کیا ہے ——"

اب اجمل بھائی تڑاق سے بولے —— "ہرج! تم مجھ سے پوچھتی ہو؟ کل کلاں کو کوئی گُل کھلا بیٹھی تو تمام عمر روتی رہیں گی اُستانی جی کی جان کو — ہاں!"

میں لمحہ بھر کو ٹھٹھکی —— ہائے اللہ کہیں اجمل بھائی ہماری محبت کو بھی تو گُل کھلانے میں شمار نہیں کرتے، پھر خیال آیا کہ اُستانی جی کا بھائی کہیں اجمل جیسا شریف تھوڑی ہوگا۔ اجمل بھائی زمانے سے خوفزدہ ہیں اسی لیے گھبرا رہے ہیں۔

بوبوجی آہستہ سے بولیں ۔ "اچھا میں کہہ دوں گی اُسے کل سے جلدی آجایا کرے گی۔ دُعا کرو آج خیریت سے آجائے ——"

اجمل بھائی چیتے کی طرح بوبوجی پر لپکے اور اُن کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے بولے —— "کوئی ضرورت نہیں اُستانی جی کے گھر بھیجنے کی —— آج سے ختم ہے اس کا نکلنا وکلنا ——"

دُور برآمدے میں بلّی آپا اور پروین ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر پھاٹک کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن کسی میں جرأت نہ تھی کہ ہم تک آجاتی۔ بس پیپل کے پتّوں کی طرح ڈول سی رہی تھیں۔

اسی لمحے تجمّل آگئی!

اب جی کہیں ہمارا گھر ہوتا تو اپنے پرائے کا لحاظ نہ ہوتا نہ چھوٹے بڑے کی پرواہ کی جاتی۔ سب پاگل کتّے کی طرح اُس کے پیچھے پڑ جاتے۔ وہ وہ جھانپڑ پڑتی، ایسی ایسی انکوائری بیٹھتی کہ تجمّل کو سارے گُل کھلانے بھول جاتے۔ لیکن بلّی آپا کے خاندان کی ہر بات میں ہی نو ڈھنگ اور سلیقہ تھا جس کی نہ میں کافی تعریف کر سکتی ہوں نہ وضاحت۔

تجمّل کو دیکھتے ہی اجمل بھائی بریف کیس اُٹھائے باہر چلے گئے۔

بوبوجی آہستہ سے بولیں ۔ "اتنی دیر بیٹا؟ ——"

"بوبوجی بس نہیں ملی تھی ——"

"اچھا!"

بوبوجی ہم دونوں کو چھوڑ کر لمبے لمبے قدم بھرتی برآمدے کی طرف چل دیں۔ اُن کے جاتے ہی تجمّل نے برقع اُتار دیا۔ اس

کے گریبان کے بٹن بے ترتیبی سے اُوپر نیچے ملے ہوئے تھے اور گردن پر مچھر اہو کا ننھا سا دھبّہ تھا۔ بقول تحمل ان بہنوں کی جلد ہی اتنی نازک تھی کہ ذرا مچھر نے کاٹ کھایا اور زخم بن گیا بڑا سا ——

اس روز کے بعد تحمل پھر سکول نہ گئی۔

کئی دن وہ اپنے بند کمرے سے باہر نہ نکلی۔ چونکہ ہم دونوں دسویں میں اکٹھی پڑھا کرتی تھیں اور ڈاکٹر بننے کے خواب بھی سانجھے تھے اس لیے میں اُس سے بے تکلف بھی زیادہ تھی۔ کئی بار تحمل سے ملنے گئی لیکن کسی نے اُسے بلا کر نہ دیا۔ تحمل کے نام پر سب اپنے اپنے کاموں میں کچھ اس طرح مشغول ہو جاتے کہ میں عجیب طرح سے پوچھ ہی نہ پاتی کہ آخر اس نے اندر سے کمرہ کیوں مقفل کر رکھا ہے۔

کوئی ماہ بھر بعد وہ اچانک مجھے گیلری میں مل گئی۔ سفید گال پر مچھلی کی گلابی جلد جیسا تین انچی لمبا نشان تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تحمل نے گال پر دوپٹہ ڈال لیا۔

"ہائے تحمل یہ ...... یہ تمہارے گال پر داغ کیسا ہے؟"

تحمل نے مُنہ پرے کر لیا اور آہستہ سے بولی —— "شہتوت کھا رہی تھی ایک ٹہنی ایسی ظالم لگی کہ ..... کہ گال ہی ادھیڑ کر رکھ دیا اب کہیں جا کر زخم مندمل ہوا ہے ——"

تحمل کا تو سکول چھوٹ گیا، لیکن ہمارے ابا میاں کے اصلاحی خیالات کا بھلا ہو ہمارے لیے کچھ اور راہیں کھول دیں۔ پہلے بی آپا کے گھر آنے جانے پر روک ٹوک ہوا کرتی تھی۔ اب یہ پوچھ گچھ محض رسمی "اطلاعاً عرض ہے" میں تبدیل ہو گئی۔ اماں جب غصے سے ٹوکتیں ہم فوراً گڑ گڑا کر ابا سے التجا کرتے۔ ابا ایسے موقعوں پر خوب آڑے آتے —— اماں کی خوب مرمت ہوتی۔ ابا کہتے۔ "تم جاہل ہی رہو گی۔ رشیدہ نے کہہ روٹیاں لگائے جاؤ تنور میں۔ تم کو بس ایک ہی کام آتا ہے۔ صبح خمیری روٹیاں لگا لیں رات فطیری روٹیوں سے معدے ٹھونس لیے۔ اپنا دیس بن گیا۔ آزادی مل گئی۔ زمانہ کہاں سے کہاں آ پہنچا۔ تم ابھی بچوں کو غلام سمجھے بیٹھی ہو۔ سیانی لڑکی ہے اپنا نیک و بد خوب سمجھتی ہے اور اگر نہیں سمجھتی تو سمجھاؤ پا بہ زنجیر رکھنے سے فائدہ۔ ڈنڈے کے زور چلانے سے حاصل؟ جس روز زنجیر کھلی یہ سر زور اپنی من مانی کرے گی۔ یہ انسانی فطرت ہے —— ہاں ——"

اماں چڑ کر کہتیں۔ "انسانی فطرت! او نہہ دیکھتے نہیں پہلے لڑکوں نے گھر میں کیا بھانت بھانت کے پنچھی جمع کر لیے ہیں اب لڑکیوں کو کھُلی چھٹی دے دیجیے یہ بھی نگر نگر کے ڈھور ڈنگر سمیٹ لائیں گی۔ اللہ اتنی آزادی بھی کس کام کی؟ آوارہ ہو جائیں گی لڑکیاں آوارہ۔"

ابا میاں کہتے —— "آوارگی تعلیم کی کمی اور ناقص تربیت کی وجہ سے ہوتی ہے ——"

اماں بپھر جاتیں۔ "جو ہم سے ہو سکا کر دیا۔ ہم تنور میں روٹیاں لگانے کے قابل تھے سو صبح و شام روٹیاں لگاتے لگاتے پھول سے ہاتھ کوئلہ کر لیے اب جو باپ کی شفقت چاہے کرے —— ہاں ——"

"تم چاہتی کیا ہو آخر" ؟ ——— " ابا یک دم اماں کے ہاتھ دیکھ کر نرم پڑ جاتے۔

"میں ؟ ——— ——— میں چاہتی ہوں کوئی اچھا سا نیک گھر دیکھ کر اس عائشہ کے ہاتھ پیلے کر دوں ——— کل کلاں یہ بھی اپنی پسند کا دولہا لے آئی تو ———"

ریفار مرابّا آخری کیل اماں کے کفن میں ٹھونکتے۔ " اوّل تو پسند کی شادی گناہ نہیں۔ دوئم تم خاطر جمع رکھو تمھاری لڑکیوں کی شادی تمھاری پسند کی ہوگی۔ یہ سوُر نیں اس قابل ہی کہاں ہیں کہ اپنی پسند کی شادی کر سکیں"۔

اور کچھ نہیں تو اتنی بات ابا کی ضرور درست نکلی کہ ہماری شادیاں اماں کی مرضی سے ہوئیں۔ لیکن وجہ وہ نہ تھی جو ابا میاں نے بیان کی۔ اگر میری صورت ایسی ہی اُجاڑ ہوتی تو کیا اجمل بھائی اس طرح جی جان سے مجھے چاہتے ؟ یہ اور بات ہے کہ شادی اُن سے نہ ہو سکی۔ لیکن شادی تو ستاروں کا کھیل ہے قسمت کی چال ہے۔ تقدیر کے آگے کسی کا کیا زور ہے ناجی ؟

جب سے تجمل کا سکول چھوٹ گیا تھا وہ پالان بنی ہر دم مجھ گدھے کی پیٹھ پر سوار رہتی ہے۔ اُس کی اس قربت کے باعث اجمل بھائی کی مسکراہٹ جو کبھی انتہائی دلفریب تھی بالکل بدل چکی تھی۔ اور اب وہ مجھے دیکھ کر یوں مسکراتے تھے گویا کسی پرس کی زپ خراب ہو چکی ہو اور بٹوہ کھلا کا کھلا رہ گیا ہو۔ تجمل کہا کرتی ۔ " عائشہ جان ! ہم نے تو سکول چھوڑ دیا۔ ہمارے گھر میں لڑکیوں کو زیادہ تعلیم نہیں دیتے۔ آخر فائدہ کیا ہے ؟ آخر تو دُہی چولہا اور بچے ہوں گے ——— ان کے لیے تو علم ضروری نہیں کیوں عائشہ ———"

" بالکل ! "

میرا اپنا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہو جاتا اور اپنے بچے اور چولہا نظروں کے سامنے آؤٹ آف فوکس تصویر کی طرح منڈلانے لگتا۔

" کالج جانے والی لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں۔ کیوں ؟ ٹھیک ہے ناں ؟ "

وہ کچھ اس انداز سے کہتی کہ مجھے کچھ اپنے آوارہ ہو جانے کا یقین ہو جاتا۔

" بلّی آپا کو بھی بوبو جی نے ایف اے میں سے اٹھا لیا تھا ———"

" ایف اے سے ہی خطرناک ———" میں اثبات میں جواب دیتی۔

بلّی آپا کے گھر والوں کا فلسفہ سمجھنے کے بعد ابا میاں کی بات خاک سمجھ میں آتی۔ وہ کہتے ——— " ہماری بیٹی تو ایم اے کرے گی ایم اے ۔ ایک شمع روشن ہوگی سارے خاندان میں ۔ تمام محلے والیوں کو پڑھائے گی۔ ثواب بھی ملے گا اور نیک نامی بھی ———"

یعنی ابا میاں کو تو عاقبت کی فکر لگی تھی۔ شمعیں روشن کرنے کا خبط سوار تھا اُن پر۔ گھر گھر ایسی موم بتیاں جل اٹھیں تو چولہا چوکا تو گیا ناں بھاڑ میں۔

ابا میاں کی تمنا چاہے کچھ بھی ہو مگر ہمارا منصوبہ قطعی کچھ اور تھا ! ———

شہتوت کے پیڑ پر اب نام کو پھل باقی نہ رہا تھا۔ لوکاٹ کے درخت بھی ننگے ہو چکے تھے۔ لیکن آٹھ کنال میں کوٹھی تھی آغا جی مرحوم کی۔ پچھواڑے فالسے کے پھولداری جیسے بوٹوں پر خوب پھل لگا تھا۔ ان کی کھٹائی ایسی رس بھری کہ منہ میں ڈالتے ہی پیروں کے انگوٹھوں تک جھرجھری آجاتی۔ آم کی کیریاں کھٹے رس کا گھر تھیں۔ چڑیوں کے جھلڑ شام کو درختوں پر ہلڑ مچاتے۔ کوئل دوپہر کو املتاس کے برص زدہ پتوں میں منہ چھپائے کوکتی رہتی۔ ان پرندوں کے ساتھ ساتھ تجمل اور میں بھی درختوں پر موجود رہتی تھیں۔ سکول سے لوٹتے ہی نمک اور تتیا مرچوں کی پڑیا باندھ کر چھوٹا سا کند چاقو ساتھ لے کر میں باغ کے پچھلے حصے میں پہنچ جاتی۔ دوپہر کے ڈھلتے ہی جب ذرا ذرا سا خنک اندھیرا پھیلتا کہیں سے اجمل بھائی بھی آن نکلتے۔ پہلے وہ نہایت سادہ طور آواز میں بڑی بے تعلقی سے پیش آتے۔ بڑے بھائیوں کی طرح مجھ سے آم تڑواتے اور چکھ چکھ کر پھینکتے رہتے لیکن جب تسلی ہو جاتی کہ گھر والیوں کا کوئی خدشہ نہیں تو وہ دونوں بازو اٹھا کر مجھے ڈال سے یوں اتار لیتے جیسے میں پانچ چھ سال کی بچی تھی۔

لیکن مشکل یہ آن پڑی تھی کہ تجمل کا سکول چھوٹ گیا تھا اور وہ بھی اب میری جان نہ چھوڑتی تھی۔ اجمل بھائی اسے پاکر چند منٹ ٹھہرتے لیکن میرا غصہ کئی گھنٹے چڑھا رہتا۔

اس روز ہم دونوں اشرافوں اور رذیلوں میں حدِ فاصل قائم کر رہی تھیں کہ اجمل بھائی آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں موتیا کے گندھے ہوئے یہ موٹے موٹے گجرے تھے۔

ہمیں اکٹھے پاکر وہ فوراً بڑے بھائی بن گئے اور انگلی نچا کر بولے ——— "بری بات ——— بری بات . . . کچا پھل نہیں کھایا کرتے۔"

تجمل نے اپنی رس بھری کیری دور پھینک دی۔

"گلا خراب ہو جائے گا ہاں ———"

یہ کہہ کر انھوں نے بڑے دلار سے دونوں گجرے تجمل کی کلائیوں پر باندھ دیے اور میری طرف دیکھے بغیر لوٹ گئے۔ اس وقت تک میں بحث میں تجمل کا ساتھ دے رہی تھی اب جانے کیوں مجھے تجمل زہر لگی اور میں نے اس سے الجھنا شروع کر دیا۔

تجمل بولی ——— "عائشہ کپڑا خریدنا اور بات ہے سنہری گوشت خریدنا اور بات ہے ——— یہ نوکروں کے کام ہیں۔"

گجرا باندھتی اجمل بھائی کی انگلیاں میرے سامنے تھیں اور عجب طرح سے مجھے چڑا رہی تھیں۔ میں جل کر بولی۔

"کیوں بات تو وہی ہے سنہری گوشت بھی بازار سے آتا ہے اور کپڑا بھی۔ یا تو انسان سرے سے بازار ہی نہ جائے ناں ؟ ———"

تجمل ابرو اٹھا کر نفرت سے کہنے لگی۔ "واہ ایک ہی بات کیسے ہوئی۔ اب کل تم کہو گی کہ چونکہ میں بازار سے زیور کپڑا لاتی ہوں اس لیے تنور سے روٹیاں بھی لگوانے جا سکتی ہوں ——— کیوں ؟ ———"

بات اُس کی سچّی تھی اور میں خود اُس کے نظریے سے متفق تھی لیکن گجرا باندھنے والے ہاتھ تو اب بھی تجمّل ہی کی کلائیوں کو چھو رہے تھے میں چہک کر بولی۔" لیکن آخر حرج بھی کیا ہے؟ دونوں کے پیسے بازار ہی جانا پڑتا ہے ناں۔"

"حرج؟ واہ کہیں عزّت دار بھی ایسا کرتے ہیں۔"

"اگر تو پردہ کرنا ہے تو مکمل پردہ ہونا چاہیے۔ عورت کہیں نہ جائے نہ زیور پہنے اور نہ روٹیاں لگوانے ____ اور اگر مغرب کی عورت بننا ہے جناب والا تو وہ تو سارا سودا سلف لاتی ہے بیچاری ____" میں نے کج بحثی کی۔

اب تجمّل مماس کے رُخ پر بحث کو کھینچ لے گئی۔

"کمال ہے یعنی مجھے مغرب کی عورت سمجھ لیا ہے کیا؟ وہ لوگ تو پکّی بے شرم ہوتی ہیں پکّی بے شرم ____"

بات اُس کی سچّی تھی فوراً میری سمجھ میں آگئی اور ہم دونوں ایکبار پھر گلبیّاں ڈال کر کیریاں کھانے لگیں۔

اس بحث بحثا کے دُوسرے دن کا واقعہ ہے کہ بڑی رازداری کے ساتھ تجمّل سے بچ بچا کر میں پُرانے کنوئیں تک پہنچی۔ اس کنوئیں کی منڈیر جا بجا سے ڈھے چکی تھی اور اند موبلائیل جیسا پانی بڑا خوفناک لگا کرتا تھا۔ اجمل بھائی پیپل سے ٹیک لگائے تیتر کے منہ جیسی کا سا منہ بنائے بڑے خُفیہ بیٹھے تھے۔ میں دبے پاؤں اُن تک پہنچی اور تنے کے پیچھے چُھپ کر زور سے تالی بجائی وہ اس طرح اُٹھے جیسے نیچے سے آتش فشاں پہاڑ پھُوٹ نکلا ہو اب جس قدر مجھے ہنسی آرہی تھی اُسی قدر وہ تلملا رہے تھے۔ بڑی دیر کے بعد جب میری ہنسی کو قیام ہُوا اور اجمل بھائی کے غصّے پر محبّت کے ٹھنڈے چھینٹے پڑ گئے تو وہ آہستہ سے بولے ____" عائشہ سنو اس طرح چھُپ چھُپ کر ملنے میں کوئی لُطف نہیں سچ!"

مارے خوشی کے میرا دل مُنہ میں آکر بجنے لگا۔ آہ! اسی دن کا تو انتظار تھا کہ اجمل بھائی اپنے مُنہ سے کہیں کہ یوں ملنے میں کوئی لُطف نہیں آؤ شادی کرکے اس رشتہ کو معاشرے کی زینت بنا ڈالیں۔

میں نے کئی بار جی ہی جی میں اس بات کا جواب دیا تھا اس لیے کھٹاک سے تیار شدہ بات کی ____" آپ ابّا میاں سے کہیے ناں پھر؟ ____"

اجمل بھائی میری بات سن کر کچھ ایسے خوفزدہ ہو گئے کہ میں اپنے کیے پر نادم ہو گئی۔ وہ بڑی دیر سُوکھے پتّوں پر ٹہلتے رہے آخر درخت سے ٹیک لگا کر بولے۔

"دراصل تم میرا مطلب نہیں سمجھیں عائشہ۔ مجھے تو ہر لمحہ اُن چڑیلوں کا خدشہ لگا رہتا ہے۔"

اچھّا تو وہ بات غلط نکلی شادی والی۔ اپنی جلدبازی پر مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ میں نے سر جھُکا کر پوچھا ____

"جی پھر؟"

"تم رات کو آجایا کرو میرے کمرے میں ____"

میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی ____

"ہائے اللہ رات کو!"

"کوئی دُور تو نہیں ہے تمھارا گھر جو یُوں ڈرتی ہو۔ دیوار بیچ کا فاصلہ ہے۔ میں منتظر رہوں گا۔"
میں دائیں بائیں سر ہلا کر بولی ——— "نا جی ——— امّاں نہیں آنے دیں گی رات کو۔"
اب اُنھوں نے میرے کندھوں پہ ہاتھ رکھ لیے اور مٹھار کر بولے ——— " اور یہ کون احمق کہہ رہا ہے کہ اُنھیں بتا کر آنا ——— ہیں ؟ "
"چوری آؤں ؟ رات کو ——— ؟ جی چوری تو میں کبھی آئی ہی نہیں۔"
اجمل بھائی ٹوٹی ہوئی مینڈھ پر بیٹھ گئے اور موبلائیل جیسے پانی میں کنکر پھینک کر بولے ——— "سُنو عائشہ ہمیں ایک دُوسرے سے محبت ہے۔ پاک محبت ——— بے لوث محبت۔ لیکن بوجوہ یہ محبت ابھی سب کے سامنے نہیں آسکتی اور مجھ میں اتنی تاب بھی نہیں کہ تمھارے بغیر زندہ رہ سکوں۔ تم بتاؤ اب کیا کرنا چاہیے ——— ؟ "
حل تو مجھے کوئی نہ سوجھا محض ایک چمگاڈر ذہن کے گنبد میں جا گھُسی کہ اجمل بھائی میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس چمگاڈر نے ایسے ایسے چکّر لگائے کہ میرا دماغ شل ہو گیا۔
"تم بہت بیوقوف ہو عائشہ ——— "
"جی ؟ ——— جی ہاں ——— جی ہاں۔"
"اگر کہیں تمھاری اماں کو شک ہو گیا تو وہ ہماری محبت پر اعتبار کرنے کے بجائے ناخوش ہوں گی ——— "
وہ بدھ کی طرح مکمّل تیاگی بن گئے اور آہستہ سے بولے "عائشہ ماں باپ کی دل شکنی کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ماں کے قدموں میں جنت ہے . . . . . جنت۔"
اجمل بھائی کس قدر مشرقی تھے۔ کتنے مشرقی اور کتنے عظیم انسان۔ اب جب کہ زمانہ کہاں نکل آیا تھا وہ ماں باپ کو رنج دے کر گناہ کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اُن کی عظمت کے سامنے میں بالکل خاموش ہو گئی۔
"تو کیا تم اپنی امّاں کو دُکھ دو گی عائشہ ؟"
"جی نہیں۔ میں بھلا امّاں کو کیوں دُکھ دوں گی ——— ؟"
وہ میرے کندھے کو شاباش کے انداز میں تھپتھپاتے ہوئے بولے ——— " ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اپنی محبت ظاہر کر سکیں۔ ابھی ہمیں ظالم سماج سے چھُپ کر ہی ملنا ہو گا عائشہ ——— بولو آؤ گی رات کو۔ میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا نہیں رہ سکتا ——— "
چمگاڈر اس زنّاٹے سے ذہن میں گھُومی کہ گنبد کی دیواریں ہل گئیں۔
"تمھارا میرا ملنا کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ کوئی نئی بات ہے کیا ؟ "
"جی نہیں ——— "
"پھر سوچ کیا رہی ہو۔ میں تو محض تمھاری بدنامی کے خیال سے تمھیں رات کا مشورہ دے رہا ہوں۔ ورنہ . . . ."

بات معقول تھی فوراً میری سمجھ میں آگئی۔

جب میں نے آنے کا وعدہ کر لیا تو وہ بولے ۔" سنو عائشہ بڑی رازداری سے کام لینا ۔ بزرگوں کا دل دکھانا اچھا نہیں ہوتا ——"

یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی اور میں نے بڑی احتیاط سے کام لینے کا وعدہ بھی کر لیا ۔

" سنو میں اپنی کھڑکی میں ٹارچ جلاؤں گا ۔ تمھارے پاس ٹارچ ہے ؟ "

" ہے جی ——"

" اگر تمھیں آنا ہوا تو کوٹھے پر جا کر چار بار ٹارچ جلانا ۔ تمھاری بالکنی سے میرا کمرہ نظر آتا ہے ناں ؟ "

" جی ہاں —— صاف ۔"

" میری طرف سے لائن کلیر ہوئی تو تین بار ٹارچ جلے گی ۔ سمجھ گئیں جب تک دونوں کا شن پورے نہ ہوں ہرگز دیوار پر نہ چڑھنا ۔"

" جی ہاں میں احتیاط سے کام لوں گی ۔ چار بار اپنی ٹارچ جلاؤں گی اور جب تک آپ کی ٹارچ تین بار نہ چمکے گی ہرگز دیوار نہ پھاندوں گی ۔ ٹھیک ——"

" میں نے سرخ ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا ہوگا ۔ سن رہی ہو ناں ؟ "

سرخ گاؤن والے کے ساتھ جھپٹ کر میں نے دلبری سے کہا —— " اب میں اتنی احمق بھی تو نہیں ہوں اجمل بھائی —— ! "

جب رات کو میں اجمل بھائی کی کھڑکی کے پاس پہنچی تو اُنھوں نے اپنے بازو پھیلا کر مجھے ایسے کھڑکی سے اُٹھا لیا جیسے میں کوئی چھ سال کی چھوٹی سی لڑکی تھی ۔

" شاباش ! —— کسی کو پتہ تو نہیں چلا ؟ "

" جی نہیں ۔"

" گھبراؤ نہیں جیسی تم وہاں اماں کے پاس محفوظ تھیں ویسے یہاں میرے پاس رہو گی ——"

میں نے اپنے آپ کو اُن کی عافیت کے سپرد کر دیا ۔

یہ راتیں بھی عجیب راتیں تھیں ۔

جو تربیت بی آپا کے گھر والوں نے شروع کی تھی وہ اجمل بھائی نے ختم کی ۔ بیعت بی آپا کے ہاتھ پر کی تھی کشف اجمل بھائی کی وجہ سے ہوا ۔ اُنھوں نے تو جیسے کھانے پینے ، سوچنے سمجھنے ، پڑھنے لکھنے ، نشست و برخاست جیسے سوچ کا دھارا ہی ملکے میں تبدیل کر دیا ۔ میری کینچلی اُتار کر جب عائشہ سامنے کھڑی کی اُسے دیکھ کر اماں خواہ مخواہ خوفزدہ رہنے لگی تھیں حالانکہ میرا ارادہ ہرگز ماں باپ کو دُکھ دینے کا نہیں تھا ۔ اُن کی یہ فکر اس قدر رنگ لائی کہ بالآخر وکیل صاحب کے رشتے پہ اُن کا دل جم گیا ۔

جس قدر اماں وکیل صاحب کی تعریفیں کرتی تھیں اُسی قدر میرا دل بُجھے ہوئے فانوس کی طرح اُجاڑ ہوتا جاتا تھا۔ میں تو اعتراف کر چکی ہوں کہ مجھے اگر انسان بنایا تو آپ ہی آپا کے گھرانے نے۔ پہلے میں ٹوٹی تھی خاکستری ٹٹو۔ مجھے زیبرے کی لکیروں سے آراستہ کرنے والے وُہی محسن تھے۔ میز پر بیٹھ کر چھُری کانٹے سے کھانے کا شعور سکھلایا۔ کار میں گھُسنے، دروازہ بند کرنے اور گھٹنے جوڑ کر بیٹھنے کے آداب سمجھائے۔ مہمانوں سے گفتگو کا سلسلہ توڑنے اور جوڑنے کے جملہ طریق سمجھائے۔ میں کیا کچھ گنواؤں بیوں سمجھیے میں تو اب بالکل اُن کا سایہ بن چکی تھی۔ پھر اُن سے بچھڑنے کا رنج کیسے نہ ہوتا ؟

اس رات جب اجمل بھائی نے مجھے بازوؤں میں لے کر کھڑکی میں اُٹھانا چاہا تو میں نے اُن کے ہاتھ پرے کر دیے اور خود کود کر رسل پر جا بیٹھی۔ چاند کی پہلی تاریخیں تھیں اور جلدی میں شیو کی ہوئی اجمل بھائی کی جلد پہ جا بجا ننھے ننھے زخم بڑے مدّھم نظر آرہے تھے۔

میں نے ایک ہی سانس میں وکیل صاحب کا سارا قصّہ بیان کر دیا۔ وہ خاموشی سے سگریٹ پینے لگے۔

"جانی! میری شادی وکیل امجد علی سے ہو رہی ہے۔ سن رہے ہو وکیل امجد علی ———"

وہ اب بھی خاموش رہے۔

"ہماری پاک محبّت کا کیا یہی انجام ہے ؟" میں نے آنسو بہاتے ہوئے پُوچھا۔

ان کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ بیچارے اجمل بھائی کو اس صدمے نے گنگ کر دیا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے اُن کی سمجھ نہ آئی اور میں سمجھی کہ شاید اُنھیں اب میری پرواہی نہیں رہی۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں اُن کے پاؤں پکڑ لیے اور سُرخ گاؤن کے ریشم میں اپنا سر ڈبو کر بولی ——— "خدا کے لیے ——— خدا کے لیے ——— کچھ کیجیے اجمل بھائی ——— خُدا کے لیے۔"

بڑی دیر تک میں روتی رہی اور وہ خاموش کھڑے رہے۔

آخر جب گجردم کمیٹی کے نلکے چلنے لگے اور اجمل بھائی کے غسلخانے کی ٹونٹی آپ سے آپ بالٹی میں پانی گرانے لگی تو ہم دونوں چونکتے ہو گئے۔ ہمیشہ پانی کے آتے ہی میں گھر چلی جایا کرتی تھی۔ لیکن آج اس گھر سے نکلنا ناممکن ہو رہا تھا۔ اجمل بھائی وہی بیتر کے منہ پھُمی والے انداز میں پلنگ پر بیٹھے تھے۔ اتنے گھنٹے گزر جانے کے باوجود اُن کے مُنہ سے ایک لفظ نہ نکلا تھا۔

جب میں رُخصت ہونے لگی تو انھوں نے بڑے رسانٹن سے کہا ——— "عائشہ! آج تک ہمارے گھر میں کبھی غیروں میں شادی نہیں ہوئی۔ عائشہ! ہماری ایک بڑ پھوپھی غیر ذات کی بہو گھر لے آئی تھیں۔ سارے گھرانے سے اُن کا ناطہ ٹوٹ گیا بیچاری کلپ کلپ کر مریں ——— عائشہ!"

ٹونٹی میں سے ٹپ ٹپ آنسو نکل کر بالٹی میں جمع ہو رہے تھے۔

"تو اس کے یہ معنی ہیں . . . . . اجمل بھائی کہ . . . . . . کہ میری شادی وکیل صاحب سے ہو گی ——— جی ؟"

وُہ پھر غائب غُلّا ہو گئے۔

"ہماری پاک محبّت . . . . . ہماری . . . . . . یہ زندگی . . . . . . ہماری محبّت . . . . "

ٹونٹی پر پانی کا دباؤ جانے کیسے پڑا اور پانی کی موٹی سی دھار بالٹی میں گرنے لگی۔ ادھر میرے صبر کی ٹھلیا ایک ہی ہچکولے میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی اور سارے میں آنسوؤں کا جھالا پڑنے لگا۔

اُنھوں نے اپنے سُنہری گندم گوں ہاتھ میرے سر پر رکھ دیے اور آہستہ آہستہ تھپکتے ہوئے بولے ——"عائشہ جان ہر بات میں کچھ بہتری ہوتی ہے۔ تم سوچتی ہو مجھے غم نہیں ہے اس جُدائی کا —— اللہ جانتا ہے کہ میرا دل غم سے فگار ہے۔ لیکن عائشہ جانی یہ ہماری آزمائش کا وقت ہے —— آزمائش کا، وہ لوگ سچّے عاشق نہیں ہوتے جو ایسے وقت میں حوصلہ توڑ دیں ——"

اُن کا توکّل دیکھ کر میرے آنسو ہچکیوں میں بدل گئے۔

"عائشہ اللہ کارساز ہے۔ وہ ظالم نہیں صرف آزماتا ہے لوگوں کو —— اگر ہم نے صبر سے کام لیا تو وہ آپ ہی کوئی ملاپ کی صُورت پیدا کرے گا اور سوچو تو سہی عائشہ اگر ہمیں یہ محبّت بھی نہ ملتی تو زندگی کس قدر اُجاڑ ہوتی! کس قدر سونی! —— عائشہ رو رو کر اُس کی نعمتوں کو نہ جھٹلاؤ یہ کیا کم عنایت ہے کہ اُس نے کم از کم اس زندگی میں ہمیں ایک دُوسرے کو جاننے کا موقع دیا۔ توکّل کرو عائشہ توکّل . . . . . صبر کرنے والوں کا بہت بڑا درجہ ہے ——"

اجمل بھائی کی بات میں جانے کیا جادو تھا کہ یک دم میرے آنسو سُوکھ گئے اور میں خُدا کا شکر ادا کرنے لگی کہ کم از کم اُس نے ہمیں ایک دُوسرے کو جاننے کا موقع تو دیا۔

وکیل صاحب سے جس دن میری منگنی ہوئی اس سے پُورے تین دن بعد بلّی آپا کا نکاح ہوُا۔ تب تک مجھے علم نہ تھا کہ وکیل صاحب سے میری منگنی ہو کر رہے گی۔ دِل میں اجمل بھائی کا بھروسہ اور اللہ کے کارساز ہونے کا کُچھ ایسا پُختہ یقین تھا کہ جی مانتا ہی نہ تھا کہ وکیل امجد علی سے میرا رشتہ طے بھی ہو سکتا ہے۔

بلّی آپا کے نکاح پر میں اور امّاں سارا دن اُن کے گھر رہیں۔ اُس روز تجمّل اور پروین نے لمبے لمبے بالوں کی چوٹیاں گوٹے کی آڑی ترچھی بندشوں سے باندھ رکھّی تھیں۔ کندھوں پر چُنے ہوئے دوپٹّے تھے جو بدبخت کریپ کے کندھوں سے کھسک کر بار بار چوڑیوں تک جاتے تھے۔ سانپ جیسے پھن والے رستے حنائی اُنگلیاں سنبھالتیں تو چھناکے سے چُوڑیاں بج اُٹھتیں اُونگھتے مرد بھی برآمدوں سے کمروں کی طرف دیکھنے لگتے۔ مردوں کی تو ذات ہی بے حیا ہے۔ کوئی لاکھ ان سے چھپے یہ دیکھ کر رہیں گے۔ بھلا کوئی ان کے خوف سے ڈھنگ کے کپڑے بھی نہ پہنے —— ہاں

تینوں بہنوں نے ماتھے پر قم قم، انگوٹھوں میں آرسی اور پاؤں میں ریشمی پھُندنے والی پشاوری چپلیاں پہن رکھّی تھیں۔ بلّی آپا نے نوگوٹے کے جال کا لہنگا کرتی ہی پہنا تھا لیکن چوڑی دار پائجاموں میں تجمّل اور پروین کے کولہے فیف کی طرح نمایاں اور سڈول نظر آرہے تھے۔ سارے گھر میں اُن کے حُسن، زیبائش اور نزاکتوں کا چرچا تھا۔ ایک ہماری امّاں تھیں کہ ٹسر کی

کلیوں والا کرتا پہنا کر ہمیں ساتھ لائی تھیں۔ وہ بھی نہ سفید نہ پیلا ——— ان دونوں کے درمیان روتا ہوا سا رنگ۔ تجمل جیسے مور کے ساتھ مجھ مورنی کو بہت سی باتیں سننی پڑیں۔ پھولوں کا زیور تھے کہ جب ہم بی آپا کے کمرے میں پہنچے تو لباس پر زردوں کی بحث چل رہی تھی۔

تجمل کہہ رہی تھیں۔ " توبہ ایک بھی کام کی صورت نہیں نہ مردانے میں نہ زنانے میں ——— اللہ ———"

بی آپا شیشے پر نظریں جمائے ابرو کو پنسل سے کٹاری بنا رہی تھیں۔ بولیں ———" لوگ تو سمجھتے ہیں کپڑا سارے عیب ڈھانپ لے گا ———"

پروین کو نئی پشاوری چپل تنگ کر رہی تھی اور وہ انگوٹھے اور انگلی کے درمیان روئی کا پھاہا جمانے میں مصروف تھی۔ لیکن بات سن کر اس نے سر اٹھایا اور چمک کر بولی ——— " آپا بوبوجی ہم پر کس قدر سختی کرتی ہیں ذرا باہر نکل کر تو دیکھیے لوگوں نے چولیاں پہن رکھی ہیں ساڑیوں کے ساتھ ——— ہاں ——— !"

بی آپا کے ہاتھ سے پنسل چھوٹ گئی ——— "سچ ؟"

اب تجمل نے پوری رپورٹ دی۔ " اپنی منور آپا نے تو جالی کی ساڑھی پہن رکھی ہے۔ خدا قسم ساری ننگی ہو رہی ہیں اور بار بار منے کو لے کر برآمدے تک جاتی ہیں۔ بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے انھیں دیکھ کر ——— اللہ !"

"برآمدے تک کیوں جاتی ہیں ؟ بی آپا نے باہر کی خبر پوچھی۔

" کہتی ہیں اندر عورتوں میں منا گھبراتا ہے۔ اجی ایسے ہی بہانہ ہے مقصد ہے منے کے بہانے سب کو اپنی جیب دکھائیں شادی کے بعد جسم تو چھوٹ گیا بیچاری کا حوصلہ نہیں چھوٹا ———"

تینوں ہارسنگار کی ڈالیوں سے ننھے منے ہنسی کے شگوفے گرنے لگے۔

پروین کا ذوقِ زیبائش ابھی نوآموز تھا اور کوئی پابندی نہ چاہتا تھا۔ وہ منور آپا کی کھلی نمائش سے بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ جل کر بولی۔ " اور میں نے بوبوجی سے ساڑھی کا پوچھا تھا تو کیسے ناراض ہوئی تھیں ؟

بی آپا بولیں ——— " توبہ ! منور جیسی بے شرمی کون کرے ؟ بوبوجی ٹھیک ہی تو کہتی تھیں۔"

" توبہ کرو آپا توبہ ——— توبہ "

فصاحت کی نہروں میں توبہ کی ننھی ننھی لہریں اٹھنے لگیں۔

بات بھی سچ تھی بوبوجی گو بظاہر نہ لگتی تھیں لیکن تھیں سخت گیر۔ ہمیشہ سلیقے اور ڈھب کے کپڑے پہننے پر اصرار کرتیں لڑکیوں کو صرف تقریبات پر میک اپ کرنے کی اجازت تھی اور اپنی اماں جان کا مقولہ تھا کہ ادھر کوئی شادی بیاہ آ نکلا ادھر فقیرنی بنا کر مجھے ساتھ لے جائیں۔ ہماری اجاڑ صورت کو کوئی نہ پوچھتا تو جدا بلکتیں ——— ارے سب کی لڑکیوں کے رشتے ایسی تقریبات پر طے پاتے ہیں۔ اللہ جانے عائشہ کو کیا ہے ؟ کوئی پوچھتا ہی نہیں۔

بی آپا کے نکاح پر چلتے وقت میں نے نائیلون کی فیروزی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اماں کہیں گھڑے سے ایک ٹسر کی بادا

قمیض نکال لائیں جب میں نے پہننے سے انکار کیا تو کہنے لگیں ." عائشہ تقریبات پر بے ہودگی ہوتی ہے - بڑبونگ مچتی ہے - پردے کا ذرا بھی لحاظ نہیں ہوتا - تم جی سیدھی سادی بن کر چلو ——— "

بوبو جی کتنی سمجھدار ہیں کہا کرتی ہیں تقریبات پر بھی لڑکیاں نہ سجیں گی تو ان کے دل میں ارمان رہ نہ جائے گا - بوبو جی کی عقلمندی سے تلّی آپا کے حُسن کی داستان بنی - تجمّل اور پروین کے نکھار کی کہانیاں چلیں - ادھر ہماری اماں جان کی پالیسی کی بدولت ابّا میاں اس بات کے قایل ہو چکے تھے کہ یہ صورتیں ہی کب اس قابل ہیں کہ پسند کی شادی کر سکیں ! اللہ کبھی یہ بھی سُنا ہے کہ باپ بیٹی کو بدصُورت سمجھے چاہے وہ باپ ریفارمر ہی کیوں نہ ہو ؟

ساری رات حق ہمسایہ ادا کرتے ——— بوبو جی کا ہاتھ بٹاتے اماں اس قدر تھک گئیں کہ بخار آ گیا - رات کو جب بالاخانے کی کھڑکیوں پر ٹارچ کی روشنی پڑتی تو اماں بخار میں تلملا کر کہتیں ——— " بجلی کوندرہی ہے عائشہ ؟ بارش کے آثار ہیں کیا ؟ "

" ہاں اماں ——— "

وہ اچھا کہہ کر پھر کروٹ بدل لیتیں -

اجمل بھائی شاید بے قراری کے عالم میں دیوار پر چڑھ آئے تھے ورنہ ٹارچ کا ہالا میری کھڑکی پر بہت ہلکا سا عکس ڈالا کرتا تھا - اس روز اماں کو بھی جانے کیا سوجھی کہ میرے کمرے میں آ کر لیٹ گئیں اور ایسی بے سُدھ ہوئیں کہ یہیں سو رہنے کا عزم بھی کر لیا -

اماں نے شاید اس لیے میرے کمرے میں بسرام کرنے کا ارادہ کیا ہو کہ وہ مجھے میری منگنی کے لیے ہموار کرنا چاہتی تھیں اس سے پہلے مجھے یقین تھا کہ منگنی اگر ہوئی بھی تو چھ ماہ سال بعد ہو گی - لیکن اماں کی باتوں نے مجھے لوکھلا دیا - وہ تو تین دن بعد بات پکّی کرنا چاہتی تھیں - میرے سارے جسم میں لال چیونٹیاں رینگنے لگیں -

اماں نے لاکھ منع کیا لیکن میں دیر تک بیٹھی اُن کے پیر دباتی رہی اور جب دو چار بار چٹکیاں کاٹنے پر مجھے تسلّی ہو گئی کہ وہ گہری نیند سو گئی تھیں تو میں دبے پاؤں سیڑھی اُتری اور اجمل بھائی کے گھر چلی گئی -

کمرے میں پہنچتے ہی اُنھوں نے میرا دوپٹّہ اُتار کر پرے پھینک دیا اور کالر کے بٹن کھول کر بولے ———

" خدا کے لیے کالر والی قمیص نہ پہنا کرو - اس سے عورت مرد لگنے لگتی ہے - "

مجھے رونا آ گیا -

وہ گھبرا گئے اور جلدی سے میرا چہرہ اُٹھا کر بولے - " بُرا مان گئیں عائشہ ؟ "

" کالر والی بات پر نہیں روئی میں . . . . . . وُہ . . . . وُہ وکیل صاحب سے . . . . تیسرے روز ——— جی . . . . . وہ منگنی . . . . دکیل صاحب کے گھر سے عورتیں آئی تھیں آج ——— "

" اس میں رونے کی کیا بات ہے عائشہ ؟ ان کو تو آخر آنا ہی تھا ——— "

میں جل گئی۔ کچھ تو سارے دن فمیس سے گلہ رہا تھا۔ شام کو وکیل صاحب کے گھر سے عورتیں آگئیں۔ اُن پر بیٹھی کڑھتی رہی۔ رات کو اماں میرے کمرے میں آپڑیں۔ غصّے کا پارہ ہوتے ہوتے بہت چڑھ چکا تھا۔ میں نے تنک کر جواب دیا۔ "جی ہاں آپ کے لیے تو خوشی کی بات ہی ہے ناں۔ جتنی جلدی میں دفان ہوجاؤں اتنی ہی آپ کو خوشی ہو گی . . . . . "

اجمل بھائی نے گاؤن کی جیب سے سُرخ رومال نکالا اور آنکھوں پر دھر لیا۔

اب میرے آنسوؤں کو جیسے سیاہی چوس نے خشک کر دیا۔ سارے دن کا غصّہ یوں اُترا جیسے ملیریے کا بخار ——— پل بھر میں غائب۔

میں اُن کے پیروں میں بیٹھ کر منّتیں کرنے لگی ——— "اجمل بھائی خدا کے لیے اجمل بھائی ——— آپ کیوں روتے ہیں؟ ہائے اللہ مجھ میں ہے ہی کیا جس کے کھو جانے کا آپ رنج کریں۔ اللہ جی چُپ بھی کریں اجمل بھائی ——— خدا کے لیے ——— "

اُنھوں نے ایک ہاتھ سے آنکھیں چھپائے رکھیں اور ایک بازو میرے گرد حمائل کر دیا۔

"بڑی مصیبت میں جان پھنس گئی ہے عائشہ . . . . . . ہائے میں کیا کروں ——— کیا کروں عائشہ ؟"

"آپ میری فکر نہ کریں اجمل بھائی ——— " میں نے اُن کی تسلی کے لیے کہا گو میرا دل یہی چاہتا تھا کہ وہ میری فکر اس قدر کریں اس قدر کریں کہ اسی اندوہ نہانی کو سہتے سہتے انھیں ٹی بی ہو جائے اور وہ گھُل گھُل کر مریں۔

وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگے۔

"فکر تو ہو گی ——— اور رہے گی عائشہ"

"اجمل بھائی ——— جانی! خدا کے لیے . . . . ہائے اللہ نہ روئیے ناں ——— خدا کے لیے جی۔"

ان کا دل کس قدر نرم تھا۔ وہ کس شدّت سے آنکھیں ڈھانپے رو رہے تھے۔ اُن کے لرزتے ہوئے جسم کو دیکھ کر مجھے خوف سا آنے لگا۔ اللہ کہیں واقعی اجمل بھائی میرے غم میں گھُل گھُل کر نہ مر جائیں؟

میں نے لجاجت سے پُوچھا۔ "آپ نے بوبو جی سے بات کی تھی؟"

اجمل بھائی بولے ——— "کی تھی ——— اشارۃً۔"

"جی؟"

"میں نے باتوں ہی باتوں میں کہا تھا۔ بوبو جی اگر میں برادری سے باہر شادی کر لوں تو . . . . . تو؟"

"پھر اُنھوں نے کیا کہا؟"

اجمل بھائی نظریں جھکا کر بولے ——— "بوبو جی کہنے لگیں میں ——— میں زہر کھا لوں گی!"

اب وہ پھر ہُوں ہوں کر کے رونے لگے۔

"زہر ——— ؟ ہائے اللہ بوبو جی زہر کھا لیں گی؟" میری آنکھوں میں تلی آپا کی پڑپھوپھی آگئیں جو غیر ذات کی بہو لانے

پر کلپ کلپ کر مری بھتیں ۔

"پھر؟ ـــــــ"

بالآخر وہ اپنے آپ پر قابو پاکر بولے ـــــــــ" میں نے اُن سے کہا بوبو جی مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے ـــ"

اُف اللہ اجمل بھائی نے بوبو جی کے سامنے میری محبت کا اقرار کیا ۔ میں بھی کیسی خوش نصیب تھی ؟ کتنی خوش نصیب!

"پھر؟ ـــــ پھر جی ؟ ـــــــ"

اجمل بھائی بولے ـــــ" بوبو جی کہنے لگیں بیٹے محبت بڑا اعلیٰ جذبہ ہے اللہ کی دین ہے ۔ شادی ایک فریضہ ہے بندھن ہے ہمارے معاشرے میں انھیں گڈ مڈ کرنے کا رواج نہیں ہے "

کتنی عقل مندی کی بات تھی ۔ محبت اور شادی کو آپس میں گڈ مڈ کرنا واقعی انتہا کی حماقت تھی ۔

اجمل بھائی کی طبیعت اب ٹھہراؤ پر آگئی تھی اور فصاحت کا دریا بلا روک ٹوک بہہ رہا تھا ۔" وہ کہہ رہی تھیں تمھاری شادی کرنا میرا فرض ہے مجھے اس فرض سے سبکدوش ہو لینے دو ۔ محبت کرنا تمھارا پیدائشی حق ہے وہ تم کیسے جاؤ میں ہرگز منع نہیں کرتی ـــــ"

"یعنی آپ .... یعنی آپ محبت مجھ سے کریں اور ... اور ... شادی کسی اور سے ؟ یعنی ؟

ـــــ" میں نے وضاحت چاہی ۔

بی آپا کے گھرانے کی یہی تو بات ہے جو بات لوگوں کے منہ سے مہمل لگتی ہے وہ اُن کے کہنے سے ایسی بامعنی ہو جاتی ہے کہ فوراً آپ کا ایمان بن جاتی ہے ۔ وہ لوگ تو چھان پھٹک کر بات کا مغز نکال لایا کرتے تھے ۔

اجمل بھائی آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے ۔" دیکھو عائشہ اسّی فی صد عورتوں کو شادی سے پہلے کسی نہ کسی سے پیار ہوتا ہے ۔ ان سب کی شادیاں اپنی پسند سے ہو تیں تو گھرانے تباہ ہو جاتے معاشرہ تیزاب کا مٹکا بن جاتا ۔ تیزاب کا مٹکا ! ـــــ"

"اجمل بھائی ــــــ لیکن ـــــــ"

اُنھوں نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے اور بولے ۔

"محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے عائشہ میرا دل ہمیشہ کے لیے تمھارا ہو چکا ہے "

"اور میرا بھی اجمل بھائی ـــــــــ" میں جلدی سے بول لی ۔

"اب اس حقیقت کو نکاح کی سند پہنائیں تبھی یہ حقیقت ہوگی ؟ ـــــ"

بات اتنی معقول تھی کہ فوراً میری سمجھ میں آگئی ۔ شادی ماں باپ کا فریضہ تھی ۔ محبت ہر انسان کا پیدائشی حق تھا اسّی فی صد عورتیں محبت کسی اور شخص سے کرتی تھیں اور منکوحہ کسی اور کی تھیں ۔ یہ بہت بڑی تسلی تھی ۔ اتنے بڑے گروہ کو اپنی جیسی حالت میں مبتلا دیکھ کر خواہ مخواہ سکون آگیا ۔

اس دن کے بعد میں نے اپنی شادی کا ذکر اجمل بھائی سے کبھی نہ کیا۔ دن بھر میں جہیز کی تیاری میں مصروف رہتی اور رات کو اجمل بھائی اور میں اسے اپنا پیدائشی حق سمجھ کر ایک دُوسرے سے محبّت کرتے۔

صرف شادی سے دو دن پہلے مجھ پر عجیب طرح کی رقّت اور خوف طاری ہو گیا۔ سُرخ گاؤن والا پچھلے پہر کے چاند جیسا زرد نظر آ رہا تھا۔ آج تک وہ میری بدنامی کے خوف سے صبح کبھی مجھے باہر چھوڑنے نہ نکلے تھے۔ لیکن اُس روز وہ میرا ہاتھ تھامے دیوار تک آگئے اُن کے لب پر ایک ہی بات تھی "عائشہ مجھے بھول نہ جانا —— —"

کمیٹی کے نلکے کبھی کے چل رہے تھے اور اجمل بھائی کے غسل خانے میں کھُلی ٹونٹی کی دھار خالی فرش پر پڑ رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر کھڑی روتی رہی اور جب گھر پہنچی تو برآمدے میں اماں کو کھڑے پایا۔ شُکر ہے کہ اُن سے بات نہ ہوئی ورنہ میرا جی بہت بھرا ہوا تھا۔

شادی سے ایک رات پہلے میں نے عجیب حساب، آور کرب میں وقت کاٹا۔ بالاخانہ کی کھڑکی میں بیٹھی بیٹھی میں کوئی پُرانا مقبرہ بن گئی۔ کئی بار قلم کاغذ نکالا اور لڑکیوں کی نظر بچا کر اجمل بھائی کو خط لکھا۔ اپنی محبّت کے واسطے دیے اُنھیں بھاگ جانے پر اُکسایا۔ لیکن پھر خیال آیا۔ اجمل بھائی انتہا کے مشرقی ہیں۔ وہ عظیم آدمی ہیں۔ ماں باپ کے پیروں تلے ہاتھ دھرنے والے ہیں۔ اتنے عرصے میں مَیں نے اُن سے کچھ بھی نہ سیکھا۔ ہر خط لکھا اور بتّی بنا کر جلا ڈالا۔ کبھی خیال آتا زہر کھا لو —— ٹنکچر آیوڈین کی شیشی سامنے میک اپ کے سامان کے ساتھ دھری تھی۔ اُسے کئی بار کھولا، سونگھا اور پھر بند کر دیا۔ موت سے حاصل؟ کوئی اجمل بھائی تھوڑا ہی مل جائیں گے مر کر؟ کبھی سوچتی، قہقہے لگاتی کپڑے پھاڑتی نیچے اُتر جاؤں۔ آپی بیاہ رُک جائے گا۔ پھر اجمل بھائی نظروں میں گھوم جاتے شرافت و نجابت کا کیا یہی سبق پڑھایا تھا اُنھوں نے؟ ساری رات ..... سارا دن عجیب سوچوں میں گزرا لیکن جس وقت میں سہرا باندھ کر کار میں نئے دولہے کے ساتھ رخصت ہوئی اُس وقت میری آنکھیں خشک تھیں اور دل کو عجیب بے سہارا سا سکون آگیا۔

ہم دونوں کا ارادہ تھا کہ ایک دُوسرے کی یاد کو دِل سے لگائے رکھیں گے لیکن افسوس میں اس امتحان میں پُوری نہ اُتر سکی۔ شادی کے بعد میں لاہور سے اتنی دُور چلی گئی کہ بلّی آپا کے خاندان کی خبر تو درکنار اپنے گھر والوں کا خط پتر بھی کبھی کبھی آنے لگا۔ اماں جیسے بیاہ نہیں بلکہ قتل عمد کر چکی تھیں۔ سرے ہی سے کبھی خط نہ لکھا۔ بلّی آپا کی رُخصتی ہوئی میں نہ جا سکی کیونکہ گھر میں ایک نند کی شادی تھی۔ اجمل بھائی کی یاد کو تازہ رکھنا بالکل ایسے تھا جیسے فسانۂ آزاد کی سپہر آرا قبر سے ہمایوں فر کے اُٹھنے کا خواب دیکھ رہی ہو۔ پہلے پہل میں نے مُردہ محبّت کی قبر پر ہر روز پھولوں کی چادر چڑھائی۔ اسے آنسوؤں کے فوارے سے نم رکھا۔ اس سے لپٹی روتی گلے پیٹے، واسطے دیے لیکن رفتہ رفتہ یہ قبر اُس سنگِ مرمر کی سِل جیسی ہو گئی جس پر آغا اختیار علی مرحوم کا نام کندہ تھا اور جس کو نسلوں نے ایسے چھپا رکھا تھا کہ خود گھر والوں کو یاد نہ رہا تھا کہ ایسی کوئی سِل پھاٹک کے پاس موجود بھی ہے۔

اجمل بھائی کو بھُول لینے کی یہ وجہ نہ تھی کہ مجھے وکیل صاحب سے عشق ہو گیا تھا۔ بلکہ سارا کرشمہ وقت اور فاصلے کا

تھا۔ پہلے پہل تو اجمل بھائی کی یاد میں خوب خوب رومال پر رو مالی بھگویا۔ پھر رفتہ رفتہ اُن کی شکل دھندلانے لگی۔ ایسے میں کبھی کبھی خوب جھنجھلاتی لیکن اُن کی صورت نے رحم نہ کھایا اور دھندلاتی چلی گئی۔ گرمی کی دوپہروں میں پنکھے کی ریشمی ہوا میں لیٹ کر میں تصور میں انھیں لانے کی کوشش کرتی۔ جس قدر اُن کا تصور دھندلاتا اُسی قدر اُن کی باتیں ہلا دیتیں۔ رفتہ رفتہ یہ باتیں بھی نوکروں کی طرح نظریں چرانے لگیں۔ جی میں سوچتی ——— اللہ اجمل بھائی یہ کہا کرتے تھے کہ ——— وہ گرمیوں کی شام کو پہلی بار ملے تھے کہ سردیوں کی دوپہر کو؟ اُن دنوں امرود کا درخت پھل آور تھا کہ؟ . . . . . کہ ماسٹے کا؟ باتیں بھولیں تو بھولیں، لیکن اُن کی وہ ادائیں اور عادتیں بھی رفتہ رفتہ ذہن سے اُترنے لگیں جنھوں نے پہلے پہل میری مرعوبیت کے کفن میں آخری کیل ٹھونکی تھی۔ وہ کھیرا کیسے اہتمام سے کاٹتے تھے؟ کچلونددوں کی گولیاں کیوں کر بنتی تھیں۔ سُرخ گاؤن کی ڈوری میں ڈھیلی سی گانٹھ دائیں پہلو پر پڑتی تھی کہ درمیان میں؟ اللہ اللہ وہ کلا بتونی یاد ہیں ایسی ——— گھس پٹ گئیں کہ پرانے فٹ رجٹر کی سی صورت ہو گئی۔ اب تو گھنٹوں یاد کرنے بھی نہ یاد آتا کہ اجمل بھائی پیٹنٹ لیدر کے جوتے پہنتے تھے کہ سینک لیدر کے؟

ویسے یہ بات اجمل بھائی کی درست تھی کہ محبت انسان کو صرف ایک ہی بار ہوتی ہے۔ ایسی والہانہ محبت مجھے واقعی صرف اُن ہی سے ہوئی۔ وکیل صاحب اچھے آدمی تھے۔ کلفی دار حیثیت کے مالک تھے۔ مجھ سے اپنی طرز کی محبت بھی کرتے تھے اور اگر کہیں میری زندگی میں اجمل بھائی کا کلس نہ اُبھرتا تو شاید میں اس محبت میں کھو بھی جاتی۔ لیکن جانے کیا بات ہے میں نے اُن کی قدردانی اور عزت افزائی کی تعریف تو کھلے دل سے کی لیکن اس محبت کا ویسا نعم البدل انھیں نہ دے سکی جو اسی فی صد عورتیں محبت کہیں اور بیاہ کہیں اور کے بعد دیا کرتی ہیں۔

دراصل ہماری شادی نظریاتی اختلافات کی نذر ہو گئی! رفتہ رفتہ میں اجمل بھائی کو تو بھول گئی لیکن جو نیک و بد کی تمیز انھوں نے سکھائی تھی۔ جو دنیا کی پونجی اُن سے پڑھ کر چلی تھی۔ جس حجامر پر میری شخصیت کا نکلا تیز ہوا تھا اُس کی یاد دل سے نہ اُتر سکی۔ میں تو آپ سے پہلے ہی عرض کر چکی ہوں کہ مجھے انسان ہی بلّی آپا کے خاندان نے بنایا ورنہ میں گھامڑ ڈانگرو تو وہ بڑا نقش تھی جو سر ہلانے کے سوائے اور کچھ جانتا ہی نہیں۔

پہلے ہی دن ایک طرح سے وکیل صاحب میری نظروں سے گر گئے۔

میں مچھر دانی لگا کر سونا چاہتی تھی۔ انھیں اس کی شکل سے نفرت تھی۔ بحث خواہ مخواہ طول کھینچ گئی۔

"مچھر دانی کے بغیر پلنگ سُونا لگتا ہے ———" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میرا دم گھٹتا ہے مچھر دانی میں۔ میں کھلے آسمان تلے سونے کا عادی ہوں ———" وکیل صاحب بولے۔

"میں مچھروں کے خوف سے ساری رات نہ سو سکوں گی اور پھر ———" لیکن جملہ میں نے ایسے بند کیا جیسے سگریٹ لائیٹر بجھایا ہو۔ میں کہنے ہی والی تھی کہ اتنی کھلی لان میں مچھر دانی کے بغیر سونا عین بے شرمی ہے۔ شریفوں کی زندگی کے منافی ہے۔ لیکن پھر اس خیال سے خاموش ہو رہی کہ اجمل بھائی نے کہا تھا دیکھنا عائشہ کہیں شادی میں اُس آزادی کی توقع نہ رکھنا جو محبت میں جائز ہوتی ہے۔

میری خاموشی کا یہ نتیجہ نکلا کہ وکیل صاحب بھی گم سُم ہو گئے۔ لمبے لمبے مونگے کے ہار پہنے زری کی شیروانی سجائے پہلے تو وہ کچھ دیر تک کچھ ڈھونڈتے رہے۔ کبھی کسی سٹول پر چڑھ جاتے کبھی کسی کرسی پر سوار الماریوں میں تاکتے جھانکتے۔ میں گھونگھٹ کے ادھ کھلے پٹ سے اُن کی اس چھپا چھپی ایسی حرکتوں کو دیکھتی رہی لیکن جب بالآخر وہ کہیں سے فلِٹ کی پچکاری نکال لائے تو میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ "خدا کے لیے کہیں یہ نہ چھڑک دیجیے گا۔ مجھے اس کی بُو سے allergy (الرجی) ہے۔"

شادی کا تجربہ ہم دونوں کے لیے نیا تھا۔ اس لیے کچھ انھوں نے سمجھوتہ کیا کچھ میں نے اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ تکلف تکلف میں آدھی رات مچھردانی لگی رہی اور میں نہایت آرام سے سوتی۔ پھر جب دُوسرے پہر میں نے بتی ورتا بن کر مچھردانی ہٹوا دی تو باقی ساری رات مجھ پر نیند حرام ہو گئی اور وکیل صاحب جرّابوں سمیت سوتے رہے۔

میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میری شادی میں یادِ مخالف اچل بھائی نہ تھے بلکہ اُن سے غداری کر کے تو کبھی کبھی مجھے خود پشیمانی ہوتی تھی۔ میری شادی تو نظریاتی اختلافات کی نذر ہو گئی۔ بظاہر یہ تنگ نظری کے حامل اختلافات نہایت فروعی تھے۔ لیکن ہمارے لیے اُن کی اہمیت کشمیر کے مسئلے سے کسی طرح کم نہ تھی۔ وکیل صاحب چولہے کے پاس چوکی بچھا کر ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی گرم گرم روٹی کھانے کے عادی تھے۔ انھوں نے تو شادی ہی اس لیے کی تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد روٹی پکا کر دینے والا کوئی باقی نہ رہا تھا۔ مجھے کلف شدہ میز پوش پر ڈھنگ سے آراستہ کیے ہوئے میز کی تلاش تھی۔ اس میز پر کھانا خانساماں کا پکا ہوا ہو اور بیرا خوان پہنچائے تو زندگی سپھل ہوتی تھی۔ وہ قالینوں سے محبت کرتے تھے۔ مجھے ڈبل بیڈ کا شوق تھا، صوفوں سے محبت تھی۔ وہ عدالت سے واپسی پر کالا کوٹ اُتار کر گھیروں والا پائجامہ پہن لیتے اور دونوں ٹانگیں کرسی پہ رکھ کر جاسوسی ناول پڑھتے۔ میرا دل چاہتا کہ وہ پیٹنٹ لیدر کے جوتے پہنیں۔ اُن کے ہاتھ میں بریف کیس ہو، وہ گھر آ کر سُرخ ڈریسنگ گاؤن پہنیں اور ٹانگیں ہلا ہلا کر اخبار پڑھیں۔ بڑی پریت سے کھیرا کاٹیں۔ اُس کی قاشیں بنائیں۔ اُن کے پاس ایک ٹارچ ہو جس میں رات کے وقت وہ مجھے آنگن کا راستہ دکھائیں۔

وکیل صاحب کو میری ان ننھی ننھی تمناؤں کی رتی بھر پروا نہ تھی!

اُدھر اُن کی تمنا تھی کہ اُن کی مری ہوئی ماں کی جگہ میں لے لوں۔ بھلا اب ایسے کہیں ہو سکا ہے آج تک! وہ توقع رکھتے تھے کہ جب عدالت سے واپس لوٹیں تو میں بڑھنا سلفچی لے کر اُن کے ہاتھ دُھلانے نکلوں۔ چولھے پر توا چڑھا پٹّے کے ہاتھ مار مار کر پلک جھپکنے میں اتنی چپاتیاں پکا دوں کہ سارا گھر سیر ہو جائے۔

انھیں میری ہنسی سے شکایت تھی۔ میرے سنگار سے شکوہ تھا۔ میری باتوں پہ وہ بُرا مان جاتے تھے۔ ایک عرصے تک ہم دونوں نے بگڑ بگڑ کر سنورنے کی کوشش کی۔ کئی سمجھوتے کر کے توڑ ڈالے۔ ایک دُوسرے کے سر کی جھوٹی سچی قسمیں کھائیں۔ کچھ انھوں نے بات نبھائی کچھ میں نے لاج رکھی۔ لیکن سال بھر بعد جیسے قطرہ قطرہ بھرنے والا پیالہ چھلک گیا اور ہماری راہیں یوں پھٹ گئیں جیسے کاغذ دو ٹکڑوں میں بٹ کر ہوا میں اُڑ جائے۔

وکیل صاحب اپنی پھوپھی کے پاس پندرہ دن کے لیے جا رہے تھے۔ سامان باندھا جا رہا تھا۔ انھیں صبح رخصت ہونا تھا اور خدا جانے کیا بات تھی وہ گھبرا کر بار بار میری طرف دیکھتے تھے۔ جب ملازم بستر بند باندھ چکا اور میں پلنگ پر لیٹ گئی تو وہ لکیروں والا پاجامہ اور قمیص پہن کر غسلخانے سے نکلے۔ اس وقت وہ مجھے بچھڑے سے دکھائی دیے۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ اسی وقت انھوں نے بات کی "عائشہ کیا بات ہے؟"

"کہیے ———"

"پھوپھی میری ماں کی جگہ ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ میرا رشتہ لینے آئی تھیں۔"

"اگر وہ تمھارے متعلق پوچھیں گی تو......... تو.........!" وہ لجاجت سے یوں بیٹھے جیسے لیڈی ڈاکٹر سے پیٹ چھپا رہے ہوں۔

"تو کہہ دیجیے گا کہ میں خوش ہوں ———"

"میرا مطلب ہے بچے کے متعلق؟ ———" وہ دائیں پیر کے انگوٹھے سے بایاں ٹخنا کھجانے لگے۔ میں آگ بگولا ہو گئی۔ "آپ کو جانے کیا ہے۔ کون سی عمر گزر گئی ہے جو آپ ہر وقت بچے بچے کی رٹ لگائے رکھتے ہیں ———"

"مجھے بچوں سے عشق ہے عائشہ!"

"مجھ سے بھی زیادہ؟ ———"

"شاید ——— !"

"لیکن ذرا سوچیے تو ابھی میری عمر ہی کیا ہے آخر؟ ابھی سے آپ چاہتے ہیں کہ میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑ جائیں؟ واہ خوب!"

وہ خاموش ہو گئے ———

بات بھی درست تھی۔ بلی آپا بھی کہا کرتی تھیں شادی کے بعد کم از کم تین چار سال تک عورت کو زندگی کا لطف اٹھانا چاہیے زیور کپڑا ابھی میلا نہیں ہو چکتا اور پیٹ پھولنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھرنے پھرانے، کھانے پہننے کا لطف تو بچوں کے بغیر ہی آتا ہے کولہے سے رُوں رُوں کرتا بچہ لٹک رہا ہو تو لہنگا ساڑھی پہننے سے حاصل، پائینچے بھیگے ہوں ہاتھوں میں دودھ کی بوتل اور گریبان سے سیفٹی پن لگے ہوں تو زندگی کا لطف آ چکا!

وکیل صاحب نہایت سرد مہری سے رخصت ہوئے اور بیس دن بعد جب مجھے رجسٹری لفافے میں طلاق نامہ ملا تو میں بغیر کسی ملال کے حیل و حجت کیے بنا وکیل صاحب کے گھر کو کھلا چھوڑ کر گھر آ گئی۔

ہمسائے میں بلی آپا کی کوٹھی ویسے ہی سلامت تھی، اماں کو میں نے طلاق کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ لیکن جب میں آغا جنتیار علی مرحوم بی اے کی سِل کے پاس پہنچی تو شہتوت کے پیڑ پر نظر پڑتے ہی جیسے پرانی یادوں کا بند فوارہ کسی مقبرے میں پھوٹ بہا ہے

دِل میں یہ تمنّا کلبلا اُٹھی کہ بلّی آپا کے سامنے بیٹھ کر اپنی بدنصیبی کا رونا روؤں اُن سے کہوں کہ اس جہان میں کیسے کیسے اندھے اور احمق لوگ بستے ہیں جنھوں نے مجھ جیسوں کی قدر نہ جانی میں روئے جاؤں، آنسوؤں کا جھالا بہے جائے اور کہیں سے اجمل بھائی آ نکلیں اور دیکھیں کہ میں کیسے لوٹ آئی ہوں ۔ وہ مجھے گلے سے لگا لیں اور کہیں عائشہ محبّت انسان کا حق ہے، اللہ کارساز ہے آزمائش کا وقت ختم ہُوا ۔ آؤ نئی زندگی شروع کریں ۔

سارے گھر پر مکمل خاموشی چھائی تھی ۔ املتاس میں ایک کوئل نہ جانے کیوں سائرن بن کر ہوک رہی تھی ۔ میں اجمل بھائی کی کھڑکی کے پاس سے گزری ۔ اندر سے کنڈی چڑھی تھی اور باہر کی سل پر مٹّی کی تہہ یوں پڑی تھی جیسے وارنش ہو چکی ہو ۔ میں پچھلے برآمدے میں پہنچی ۔ تجمّل مشین کو چوکی پہ دھرے چھوٹے سے قالین پر کپڑوں کا انبار پھیلائے بیٹھی تھی ۔

مجھ سے اُٹھ کر بغل گیر ہو گئی ۔

" باقی لوگ کہاں ہیں ؟ "

" بوبوجی تو خالہ کے گھر گئی ہیں اور بلّی آپا اور پروین بازار گئی ہیں ۔ ابھی موڑ تک پہنچی ہوں گی بمشکل تمام ———— "

اجمل بھائی کا نام میرے حلق سے رگڑ کھا کر نکلا ۔ " اور اجمل بھائی ؟ ———— "

" اُن کی تو شادی ہو گئی پچھلے دنوں، وہ تو پنڈی چلے گئے ہیں ———— "

میرا دل دھک سے رہ گیا ۔ شادی ہو گئی اجمل بھائی کی !

تجمّل نے چوکور لائینوں والا کپڑا سیدھا قالین پر بچھا لیا ۔ اور اس پر قینچی چلاتے ہوئے بولی ———— " بڑی خوبصورت ہے بھابی ہماری ۔ ہماری برادری سے نہیں ہے لیکن برادری ورادری فضول باتیں ہیں ۔ انسان اچھا ہونا چاہیے ۔ خدا قسم تم بھابی کو دیکھ لو تو آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ جائیں بھابی تو ایکٹرس بننے کے خواب دیکھ رہی تھیں ————

پروین اور بوبوجی کے متعلق جو کچھ وہ بتاتی رہی وہ میرے ذہن تک نہ پہنچ پایا ۔ اجمل بھائی کی خوبصورت بیوی ٹارچ کا کوندا بن کر میرے ذہن کی کھڑکی پر لپک رہا تھا ۔

" عائشہ کیا سوچ رہی ہو، سُن نہیں رہیں میری بات ؟ "

" سُن رہی ہوں ———— "

" بھلا میں نے کیا کہا تھا ابھی ———— " اُس نے شطرنجی مونے کے کپڑے کو دیکھ کر پوچھا ۔

" تم ؟ ———— تم کہہ رہی تھیں اجمل بھائی نے کسی ایکٹرس سے شادی کر لی ———— "

وہ ہنس کر بولی ———— " وہ تو دس منٹ پہلے کہا تھا ۔ میں کہہ رہی تھی بلّی آپا کو طلاق ہو گئی ———— "

" طلاق ؟ بلّی آپا کو . . . . . " میں بیٹھے بیٹھے سکڑ گئی ۔

" طلاق کوئی بُری بات تھوڑی ہے، ہمارے مذہب میں بالکل جائز چیز ہے ۔ خدا قسم ہم تو بہت خوش ہیں ۔ وہ لوگ اس قابل ہی نہ تھے ۔ بلّی آپا کا نباہ کیسے ہوتا ۔ جو ہمارے نزدیک اچھا ہے وہ اُن کے نزدیک بُرا ہے ۔ ہر لمحہ اختلاف، ہر لمحہ ضد ۔

وہ لوگ ہماری بلّی آپا کا کیا مقابلہ کریں گے۔ ہم تو دعوت دیں گے اتنی بڑی دعوت ...... ہماری آپا کو تو آزادی ملی ہے آزادی !——"

وہ بلّی آپا کا طلاق نامہ مجھے اس طرح دکھا رہی تھی جیسے کالج کی لڑکیاں شیلڈ دکھایا کرتی ہیں۔ طلاق کا لفظ اُس کے مُنہ سے حمد و ثنا کی عبارت بن گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے بلّی آپا کو طلاق نہیں ملی کہیں سے خلعت دیا ہے کسی شہزادے نے۔ مجھے بھی حوصلہ بندھ گیا اور اپنے طلاق سے شرم نہ آئی۔ میں قالین پر اُس کے قریب ہو بیٹھی اور آہستہ سے بولی ——" تجمّل.... مجھے بھی طلاق مل گئی ہے۔ بس نظریاتی اختلاف تھے..... اور کچھ نہ تھا——"

وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے آگ کا شعلہ چھو گیا ہو۔ چند لمحے حیرت سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ " عائشہ تمہاری تیزی سے یہی خدشہ تھا ہمیشہ۔ ہم نے تو سُنا ہے وکیل صاحب نہایت نیک آدمی ہیں؟ یہ تم نے کیا کیا عائشہ؟ ایسی بات کہیں سُنی ہے کہ بلا وجہ طلاق ہو جائے؟"

میں نے سر جھکا لیا——

میں نے آپسے کہا ناں بلّی آپا کے خاندان کی ہر بات کو ہاتھی دانت کا دستہ لگا ہوتا تھا۔ لوگ چاہے کچھ بھی کہیں میں تو یہی کہوں گی جو کچھ بھی نے سیکھا اُن سے سیکھا مجھے انسان بنانے والے وُہی لوگ ہیں۔ ساری زندگی اُن کے ہمسائے میں کاٹی لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو آغا مختیار علی مرحوم بی اے کے گھرانے میں تھی !

———

فرشتہ

عرش صدیقی

(۱)

"قبول کیا!"

دو لفظوں کے اس مجموعے میں یوں تو سبھی کے لیے افسون وسحر اور امید و آرزو کا ایک عالم آباد ہوتا ہے لیکن مُراد میاں پر ان دو چھوٹے چھوٹے اور بظاہر معصوم لفظوں کا اثر بہت مختلف اور شدید تھا۔

نکاح پر جب مولوی صاحب نے ایک لمبے سے فقرے میں ان سے سوال کیا تھا کہ "گلرخ ولد احمد کلیم کو تم نے بعوض حق مہر شرعی اپنے نکاح میں قبول کیا؟" تو ان کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ آج اس واقعے کو کم و بیش سترہ برس ہو رہے ہیں۔ ان کی شادی میں شریک ہونے والوں کو تو شاید یہ واقعہ یاد بھی نہ رہا ہوگا لیکن مراد میاں کے ذہن میں تو ایک ایک بات محفوظ تھی، اس دن کا ایک ایک لمحہ نقش تھا اور مٹائے نہ مٹتا تھا۔ نکاح مرضی سے ہو یا بغیر مرضی کے اس واقعے کی تفصیلات بھلائی نہیں جا سکتیں کہ یہ واقعہ زندگی کا سب سے بڑا اور اہم ترین واقعہ ہوتا ہے۔

وُہ منظر بظاہر مضحکہ خیز تھا لیکن مُراد میاں کے دل پر جو گزر رہی تھی اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ اُدھر مولوی صاحب جواب کے منتظر تھے اور اِدھر مُراد میاں زور لگا رہے تھے۔ "قبول کیا" کے لفظ گلے کی رگوں سے کشتم کشتا ہو رہے تھے مگر راہ فرار نہ تھی۔ زبان اور ہونٹ اس انتظار میں تھے کہ کب گلے کے اُدھر بیٹھے ہوئے دو بے چین مہمان، دو معصوم لفظ، قید سے رہائی پائیں اور کب وہ اس گو مگو کی کیفیت سے آزادی حاصل کریں۔ مہمان دیر تک نہ آئے تو زبان اور ہونٹ کسمسا کر رہ گئے۔

تھوڑا بہت تامل نکاح کی روایات کا حصہ ہے۔ یہ تامل جہاں دولہا یا دلھن کی شرافت اور حیا کا مظہر ہوتا ہے وہاں اہل محفل کے لیے دلچسپی اور فقرے بازی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے اور کوئی پریشان نہیں ہوتا۔

مولوی صاحب نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا "کہو، قبول کیا!"

مُراد میاں نے پھر زور مارا مگر طاقت جواب دے چکی تھی۔ گلے کی رگیں بے بس معلوم ہو رہی تھیں۔ زبان ہونٹوں پر بار بار یوں آ رہی تھی جیسے کسی اہم مسئلہ میں مشورہ ہو رہا ہو، مُراد میاں نیم وا آنکھوں سے دو زانو بیٹھے مولوی صاحب کی ناف پر نظریں جمائے یوں بیٹھے تھے جیسے حریف کا مورچہ یہیں نصب ہو۔

اکثر چہرے مُسکرانے لگے۔ دو چار قہقہے بھی بلند ہوئے اور پھر فقرے چُست ہونے لگے۔

"بڑے میاں شرما رہے ہیں!"
"ابھی سے ہوش اُڑ گئے!"
"آہ نا تجربہ کاری!"

ایک نیم بزرگ قسم کے صاحب نے بڑی سنجیدگی اور غُصّے سے کہا "یہ کیا مذاق ہے؟ عجب بدتمیزی ہے۔ واہ صاحب! واہ صاحب!!"

ایک نوجوان نے دُوسرے کے کان میں کہا۔" ان کی بے چینی دیکھتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے لڑکی کی طرف سے آئے ہیں!"

مُراد میاں کے والد شیخ باقر علی جو موقع' واردات پر موجود تھے آگے بڑھے۔ پرانی وضع کے یہ سیدھے سادے بزرگ نہ صرف لرزہ براندام تھے بلکہ غصّے کے مارے اُنھیں قدم اُٹھانا مُشکل ہو رہا تھا۔ خدا جانے وہ کیا کچھ سوچ رہے تھے۔ شاید یہی کہ لونڈا خاندان بھر میں رسوائی اور جگ ہنسائی کا سبب نہ بن سکے۔ وہ تو پہلے ہی شادی پر تیار نہ تھا ابھی یہ نہیں ہوا، ابھی وہ نہیں ہوا۔ ابھی یہ باقی ہے ابھی وہ باقی ہے۔ اس کم بخت کے پروگرام ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے اور شیخ صاحب جانتے تھے کہ جوانی اس انتظار میں بیٹھی نہیں رہتی کہ صاحبزادے اپنے تمام پروگرام پورے کر لیں پھر شیخ صاحب کو اب یہ یقین ہو چکا تھا کہ یہ لونڈا کوئی کام نہ کر سکے گا۔ ایم۔ بی ایس کے شوق میں اُس نے کئی برسوں کا خُون کر دیا تھا لیکن میڈیکل کالج کے اس دروازے سے بھی کوسوں دُور رہ گیا تھا جس سے داخلہ کی اجازت ملتی ہے۔ داخلہ کی ایک صُورت ضرور باقی تھی یعنی بیمار ہو کر، لیکن یہ بات کسی کو نہ سوجھی۔ پھر مُراد میاں نے کہیں سے سُن لیا تھا کہ ہومیوپیتھی بڑی آسان شے ہے۔ چند مہینوں میں ڈاکٹر بن جاؤ۔ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ آئے چوکھا۔ سو اب کئی برس سے ہومیوپیتھی کا بھُوت سوار تھا۔ وہ حیران بھی تھا کہ یہ کام جو چند ماہ میں ہو جانا چاہیے تھا اتنا طول کیوں پکڑ گیا تھا۔ ابھی چند روز پہلے وہ اپنی ماں سے شادی کو غیر معیّن عرصہ کے لیے ملتوی کرنے کی درخواست کرتا ہوا پکڑا گیا تھا اور بہانہ یہ تھا کہ ابھی تک وہ ہومیوپیتھی میں طاق نہ ہوا تھا۔ شیخ صاحب نے اس کی وہ خبر لی تھی کہ پھر اُسے ایسی درخواست کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

"ہم مر گئے تو تم جیسوں کو پُوچھنے والا کوئی نہ ہو گا۔" اُنھوں نے غُصّے سے کہا تھا۔ "اب تو جو فیصلہ ہو چکا ہے وُہی قائم رہے گا۔ تمھاری عُمر کے لوگ پوتے پوتیوں والے ہونے کو ہیں۔"

غُصّے سے شیخ صاحب کا گورا چٹّا چہرہ سُرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ دُور سے ایسے لگتا تھا کہ سردی ہو تو اس چہرے کی آگ سے ہاتھ بآسانی تاپے جا سکتے ہیں۔ شیخ صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اولاد سے یہ نہیں پُوچھتے کہ میاں آخر تمھیں تامّل کیوں ہے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ اولاد واقعی کسی قابل ہو بھی گئی ہے یا نہیں۔ وُہ تو یہ جانتے تھے کہ ہر جوان آدمی کی شادی ہوتی ہے اس لیے مُراد علی کی بھی ہونی چاہیئے اور وہ وہیں اور اُسی وقت ہونی چاہیئے جہاں اور جب والدین طے

کر چکے ہیں ۔ وہ اولاد کو یہ حق دینے کو تیار نہ تھے کہ صاحبزادے خود دُلھن تلاش کر کے لے آئیں۔ شادی سے پہلے عشق اُن کی نظروں میں گناہ سے کم نہ تھا۔ اُنھوں نے بیٹے کو ایک بار یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ شادی ہماری مرضی سے ہو گی اور عزیزوں میں ہو گی اور بالکل قریبی عزیزوں میں ہو گی۔ چنانچہ وہ یہ رعایت دینے پر آمادہ ہی نہ تھے کہ اگر اس بیٹے تامل ہے کہ کوئی ماہ لقا دِل میں سما گئی ہے تو ہم کوشش کر لیتے ہیں۔ انھیں تامل کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی اسی لیے وہ آپے سے باہر ہونے کو تھے ۔

مُرادمیاں نے شیخ صاحب کو آتے دیکھا تو ان کے گلے کی تمام رگیں ایک جھٹکے سے کُھل گئیں اور مولوی صاحب کے تقاضے کے بغیر ہی ان کی زبان سے خاصی بلند آواز میں نکلا :

"قبول کیا ! ——— قبول کیا !"

اور پھر اُنھوں نے ایک طویل سانس چھوڑ کر ایک طویل تر سانس یوں لی جیسے شیخ صاحب کو سمجھانا چاہتے ہوں "لو باباجان، آپ کا کہا مان لیا ہے اور ایک مصیبت سے چھٹکارا پاکر ایک بلا کو گلے سے لگا لیا ہے ۔"

مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں لیکن مُرادمیاں نے کچھ نہ سُنا ۔ ان کو ایسے لگا جیسے ہر طرف "قبول کیا ——— قبول کیا" کا شور ہو رہا ہے لیکن ان کی اپنی آواز اس شور میں شامل نہیں ہے۔ وہ سوچ رہے تھے :- میری مرضی کے خلاف میری شادی کیوں کر دی گئی ہے ——— باباجان یہ ظلم کیوں کر رہے ہیں ——— میری عمر بڑھ گئی ہے لیکن میں ابھی اس قابل کہاں ہوا تھا کہ یہ بوجھ اُٹھا سکوں ——— کاش میں ہومیو پیتھی کی تعلیم پُوری کر لیتا . . . . مگر اب کیا ہو سکتا ہے ——— میں کیا کروں ——— کتنا اچھا ہوتا کہ میں ڈوکٹری سیکھ لیتا ——— اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا اور کوئی غم نہ ہوتا . . . . . !"

لوگ شور مچا رہے تھے اور احمقوں کی طرح بے معنی خوشی کے عالم میں ایک دُوسرے کو چھوارے اور چھواروں کی گٹھلیوں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ مُرادمیاں پر بھی کئی وار ہوئے لیکن وہ کسی جوابی حملے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک بار تو ان کے دماغ میں لہر آئی کہ ان سے پُوچھیں "اے لوگو ——— تم کیوں خوش ہو ؟ . . . . کیا تمھاری شادی ہوئی ہے ؟ . . . . بیوقوفو مجھے سمجھاؤ یہ ہنگامہ کیا ہے ——— احمقو جانتے ہو تم کتنے بڑے ظلم میں شریک ہو ؟ . . . . " لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف اس نے دِل ہی دِل میں اُنھیں بُرا بھلا کہہ لیا: "بیوقوف کہیں کے ——— احمق !"

"احمق !" مُرادمیاں نے آہستہ سے کہا اور خود بخود اس کی نظریں شیخ باقر علی کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ہنس ہنس کر لوگوں سے مُبارکباد وصول کر رہے تھے "احمق ! احمق ! احمق . . . ." یہ لفظ مُرادمیاں کے دماغ میں کُودنے پھلانگنے لگا یوں جیسے کسی برین گن کی میگزین پُوری کی پُوری یہیں خالی ہو گئی۔ خود مُرادمیاں کو بھی یہی احساس ہو رہا تھا جیسے وہ برین گن اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھے ہوں اور گولیاں تڑ تڑ نکل رہی ہوں "احمق ! احمق ! احمق !

احمق! . . . ." اچانک اُنھیں احساس ہوا کہ اب تک کُشتوں کے پُشتے لگ چکے ہوں گے۔ اُنھوں نے خوفزدہ ہو کر آہستہ آہستہ چاروں طرف نظر دوڑائی اور یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ سب ٹھیک ٹھاک تھا اور شیخ صاحب زندہ تھے۔ اُن کی نظریں چند لمحوں کے لیے مولوی صاحب پر آکر رُک گئیں اور وہ سوچنے لگے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ بڑی مُشکل سے اُنھیں یاد آیا کہ اُنھوں نے "قبول کیا" کہا تھا اور ذہن پھر بے چین ہو گیا "قبول کیا ——— قبول کیا ——— میں نے کیا قبول کیا؟ ——— میں نے کیا قبول کیا؟ ——— یہ تو بابا جان کا قصور ہے ——— اُنھوں نے قبول کیا ہو گا ——— میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے ——— میں بے قصور ہوں . . . . بابا جان کو کون سمجھائے کہ۔ کہ میں ہومیوپیتھی کا کورس پُورا کر لیتا تو شادی ہو جاتی مگر . . . . . . آہ بابا جان!"

مُراد میاں کی خاموشی کو دُولھا کی روایتی خاموشی سمجھا گیا اور کسی کو ان کی اصل حالت کا علم نہ ہوا۔ چہرے کی پریشانی کو سہرے کی چند ہمدرد لڑیوں نے پُوری طرح آشکارا ہونے سے محفوظ رکھا۔ مُراد میاں چاہتے تھے کہ لوگوں کو بہت کچھ سمجھائیں لیکن کسی کے دماغ میں اُترنا اُن کے بس میں نہ تھا۔

(۲)

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا اور لوگ بہت جلد بھُول گئے کہ مُراد میاں اپنی شادی پر کتنے پریشان تھے۔ ان کے دوستوں کی تعداد بہت کم تھی۔ گھومنے پھرنے کے وہ عادی نہ تھے بس بیوی کے ہو کر رہ گئے۔ گلرُخ کلیم بڑے فخر سے گلرُخ مُراد بنی اور پھر اس کا نام بیگم مُراد کچھ ایسا چلا کہ لوگ بھُول گئے کہ اس کا کوئی اور نام یعنی ایک اصلی نام بھی ہے جس کا مُراد میاں کی ذات سے کوئی تعلق نہیں۔ بات عجیب اس لیے تھی کہ انفرادیت اور شخصیّت تو مُراد میاں کی اپنی ختم ہو گئی تھی اور وہ بیوی کے ساتھ یوں نتھّی ہو کر رہ گئے تھے جیسے اکثر بیویاں اپنے سخت، جابر اور خود غرض خاوندوں کی مرضی اور شخصیت کو ہی اپنی مرضی اور شخصیت بنا لیتی ہیں، لیکن نام گلرُخ کا بھُلا دیا گیا تھا۔ مُراد میاں کا ہومیوپیتھی کا شوق برابر قائم رہا، وہ چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج بھی کرنے لگے تھے لیکن وہ مطمئن نہ تھے۔ وہ تو بڑی بڑی بیماریوں کا علاج کرنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے ہومیوپیتھی کی کتابوں اور دواؤں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اپنے دفتر سے جہاں وہ بحیثیت کلرک کے کام کرتے تھے فارغ ہو کر وہ بیشتر وقت گھر پر گزُارتے۔ محلّے کی عورتوں اور بچوّں کا علاج وہ آسانی سے کر لیتے تھے لیکن وہ خوش نہ تھے۔ وہ دوائیں جن کی ان کو تلاش تھی ابھی تک اُنھیں میسّر نہ آ سکی تھیں۔

بیگم پرستی کی اُنھوں نے وہ مثال قائم کی تھی کہ محلّے کی تمام عورتیں بیگم مُراد پر رشک کرتیں اور تمام مرد مُراد میاں کو گالیاں دیتے۔ گو کامیاب ڈاکٹر نہ بن سکنے اور بڑی بڑی بیماریوں کا علاج کرنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے ان کا دل نامطمئن رہتا تھا تاہم بظاہر وہ بڑے اطمینان سے زندگی گزُارتے نظر آتے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر یا مل کر یہ خیال کبھی نہیں آتا تھا کہ وہ اب بھی بابا جان سے ناراض ہیں۔ گھر کے کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹانے اور ہومیوپیتھی کے چکرّ میں مُنہمک رہنے سے ایسے لگتا تھا جیسے ان کے سامنے کوئی واضح نصب العین ہو۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نصب العین گلرُخ کی خوشنودی کے

علاوہ کچھ نہ تھا۔ اسی لیے تو بیگم مُراد کی بیشتر پڑوسنیں اس کی خوش بختی پر دل ہی دل میں جلا کرتیں۔ مُراد میاں کیسے "بیگم — بیگم" کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ "آپ" سے چھوٹا لفظ استعمال نہیں کرتے اور کس طرح گھر کی آسائشوں کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ موضوع آس پاس کی عورتوں میں زیرِ بحث رہتا اور کبھی ختم نہ ہوتا۔ مُراد میاں کی محبت کی مثالیں دی جاتیں اور سب کچھ درست معلوم ہوتا کیونکہ گھر سے باہر تو وہ صرف دفتر جانے یا سودا سلف لانے کے لیے نکلتے تھے۔ باقی سارا وقت وہ گھر پر گزارتے، حقہ پیتے اور کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹاتے۔ کبھی کبھی اس کی خواہش پر اس کے ساتھ سینما بھی چلے جاتے۔ باہر سے دیکھنے والوں کو ان کی زندگی میں ایک عجیب طرح کا اطمینان نظر آتا تھا، یہ اطمینان اتنا گہرا، اتنا بوجھل تھا کہ اس پر مُردہ اطمینان کا گمان ہو جانا کچھ عجب نہ تھا۔

بیگم مُراد کو جاننے والیوں میں کچھ ایسی بھی تھیں جو دل ہی دل میں کُڑھنے کی قائل نہ تھیں۔ انھوں نے اپنے اپنے خاوندوں سے باقاعدہ احتجاج کیا اور مطالبہ دائر کیا کہ ان کو بھی اسی طرح صاحبِ اختیار اور قابلِ احترام سمجھا جائے جیسے بیگم مُراد تھیں۔ ان کو اس بات پر شدید اعتراض تھا کہ ان کے خاوند گھر کی فکر بہت کم کرتے تھے اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا تو ایک طرف وہ تو بعض اوقات بازار کا کام بھی بیویوں پر ہی ڈال دیتے تھے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا کہ ان بے چاریوں کو سبزی گوشت بھی یا تو خود لانا پڑتا یا پھر محلّے کے چھوکروں کی خوشامد کرنا پڑتی اور چھوکرے بھی ایسے خود سر اور بدمعاش کہ اوّل تو کہا نہ مانیں اور اگر مان لیں تو آدھ سیر گوشت کا ڈیڑھ پاؤ الگ لائیں اور جتانے کی اکنّی الگ وصول کریں۔

ان عورتوں میں سے ایک نے غصے میں ایک روز گھر کا کوئی کام نہ کیا اور جب میاں رات بارہ بجے شطرنج کی کسی محفل سے اُٹھ کر آئے تو خوب جھگڑا ہوا۔ بیوی نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو بوڈھے سو کا لوٹے۔ جیسا سلوک تم ہم سے روا رکھو گے ویسا ہی سلوک ہم تم سے کریں گے۔ پھر اُس نے مُراد میاں کی تعریفوں کے پُل جو باندھنے شروع کیے تو میاں کو غصّہ آ گیا۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ کون سے خاوند کا جگر ہے کہ اپنی بیوی کی زبان سے دُوسرے مرد کی تعریفیں سُنتا رہے اور کچھ نہ بولے۔ چنانچہ خاوند بپھر گیا اور شطرنج میں کھائی ہوئی ماتوں کا غصّہ بھی بیوی پر ہی اُترنے لگا۔ بیوی کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کر اس جوانمرد خاوند نے مُراد میاں کو وہ گالیاں دیں اور ان کے بارے میں ایسے ایسے راز افشا کیے کہ آئندہ بیوی نے خاوند کے سامنے مُراد میاں کا نام نہ لیا۔ اور اُس وقت بھی ہوشیاری سے کام لے کر بھاگم بھاگ باورچی خانے میں گھس گئی اور پھر دس پندرہ منٹ میں تلے ہوئے انڈے اور پراٹھے میاں کے سامنے رکھے تھے۔ اِسی بات پر ان کی صلح ہو گئی۔

وُہ وقت تو گزر گیا لیکن مُراد میاں کے بارے میں اس آدمی کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ایک ایک انسان بن کر نہ صرف زندہ رہا بلکہ اس گھر کی دہلیز سے نکل کر یہ سب لفظ یہ تمام داستانیں یوں پھیلیں جیسے خشک کاغذ کے ڈھیر میں لگی آگ۔

بیگم مُراد سے بھی کوئی بات چھپی نہ رہتی تھی۔ ہر ایک پڑوسن کسی دُوسری کا نام لے کر سب اچھی بُری باتیں اس کو بتا جاتی۔ اچھی کہنا تو تکلف ہی ہے۔ یہ سب باتیں بُری ہی ہوتی تھیں۔ ایک نے ذمہ داری حسبِ معمول کسی اور کے سر منڈھ

کر اسے بتایا کہ فلانی رشتہ دار کے آبا کو زن مرید کہتی ہے۔ فلانی نے اس کا نام جورو کا بھائی رکھا ہے اور فلانی خود بیگم مراد کو اُلّو کی آیا کہتی ہے۔

بعض عورتیں ایسی بھی تھیں جو بیگم مراد کے حوصلہ اور صبر و ضبط سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ "آفرین ہے اس عورت پر!" وہ کہتیں "اتنا بڑا جگرا ہے اس کا۔ بڑی ہمت والی ہے کیا کیا سنتی ہے اور برداشت کرتی ہے! بات بھی بھی حیرانی کی۔ عورت اور سب کچھ سُن کر خاموش رہے۔ تعجب ہے عورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں۔

پھر بیگم مراد تو وہ عورت تھی کہ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد سے اُس پر کسی کا حکم چلنے کے تمام امکانات یکسر ختم ہو گئے تھے۔ وہ ہمیشہ ہر بات میں اپنی مرضی کرنے لگی تھی اور اس کے ماں باپ بھی اُس کے سامنے بے بس تھے۔ ایسی عورت کا سب کچھ خاموشی سے سُن لینا واقعی حیران کُن تھا۔ جو چند عورتیں اس کی مدّاح تھیں اُن کا خیال تھا کہ وہ بڑی دانائی کا ثبوت دیتی ہے۔ اگر وہ ایک عورت سے بھی جھگڑ بیٹھتی تو اپنے سارے گھر کا سکون برباد کر دیتی۔ سمجھ دار عورتوں نے اسے داد دیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہی تو کرتی ہے۔ ایک چپ ہزار سکھ۔"

بات یہ بھی درست تھی۔ شاید وہ خود مرکزیت کا شکار بھی تھی۔ اگر ایسا تھا تو یہ بات اُس کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ عورتیں اس سے کیوں جلتی ہیں۔ بعض عورتوں نے تو اپنی مصیبتوں اور غلامی کا رونا اس کے سامنے بھی رو دیا اور اُس سے پوچھا "اے بہن تم نے کیا کھلایا ہے مراد بھائی کو؟ کس سے تعویذ لے کر پلایا ہے انھیں؟ میں نے تو بہت کچھ کر دیکھا پر اُلٹا ہی اثر پڑتا رہا۔"

بیگم مراد مسکرا کر کہتی "میں نے کچھ نہیں کھلایا پلایا ——— اللہ نے جس کو جیسا چاہا بنا دیا۔"

دل ہی دل میں وہ ان عورتوں کی جہالت اور سادگی پر ہنستی۔ تعویذ گھول کر پلانے سے کچھ ہو سکتا تو اب تک نہ معلوم وہ کیا کیا کر چکی ہوتی۔ بعض اوقات، ان عورتوں کی باتیں سُن کر ایک تلخ سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل جاتی جس کا ترجمہ الفاظ میں یوں ہی ہو سکتا ہے۔

"بھاگ جاؤ، دُور ہو جاؤ ——— ذلیل کمینی عورتو ——— بڑی آئیں مراد بھائی کی بہنیں!"

یہ لفظ اس کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہوئے لیکن اس کے ماتھے پر اور ہونٹوں پر لکھے ہوئے صاف نظر آجاتے تھے۔ بیزاری کا یہ حملہ شدید تو ہوتا تھا لیکن دیر پا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں وہ ایک لمبی خوفناک چپ سادھ لیتی تھی اور عورتیں خاموشی سے رخصت ہو جاتی تھیں لیکن گھر سے باہر قدم رکھتے ہی تجسّس کی فطری خواہش انھیں بولنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ان موقعوں پر ان کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی تھی:

"یہ اس کو کبھی کبھی ایک دم سے کیا ہو جاتا ہے! بھول ہی جاتی ہے کہ کوئی پاس بیٹھا ہے!!"

"مجھے تو اس کی صورت سے ڈر لگتا ہے ——— ہائے جیسے کھا ہی جائے گی!"

"بس ڈائن ہی تو لگتی ہے!"

"سایہ ہے سایہ ———— مُراد بھائی کو تعویذ پلا کر اُلو بنایا ہے نا تو اس کا کچھ اُلٹا اثر ہونا ہی تھا!"
اور پھر دیر تک اور دُور تک "ہُوں ہُوں۔ ہاں ہاں۔" کی آوازیں یوں اُبھرتی اور ڈوبتی رہتیں جیسے کوئی کسی کی بات کو پُوری طرح سمجھنے کا اظہار کر رہا ہو۔

(۳)

ان کے چار بچے تھے۔ دو لڑکے دو لڑکیاں۔ لڑکیاں دو نو بڑی تھیں۔ راشدہ کی شادی پار سال ہو گئی تھی اور بانو کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ نور احمد کا رشتہ بیگم مُراد نے یوں منظور کر لیا جیسے اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی یعنی ادھر سوال پڑا ادھر منظوری ہوئی۔ بنا بات یا بات بات پہ باتیں بنانے والیوں کو ایک اور موضوع مل گیا اور وہ لے اُڑیں:

"دوبھر ہو گیا تھا بچّی کا وجود ———— دوہاجو سے باندھ دی!"

"ہائے دوہاجو سے!؟"

"اور نہیں تو کیا، سارا شہر جانتا ہے بس ایک تُو ہی رہ گئی ہے بے چاری انجان۔ پہلی تو شادی کے اگلے سال ہی چل بسی تھی۔ سُنا ہے بڑا ظلم کرتا تھا اس پر ———— اور اب ———— ہائے میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے یہ سوچ سوچ کر کہ چودہ سال کی گڑیا کو پینتیس برس کے بڈّھے سے باندھ دیا اور بھی دوہاجو ———— اللہ پُوچھے گا اسے اتنی پیاری بچّی کی زندگی تباہ کر دی۔ میں تو بس سوچتی ہی رہ گئی کہ اپنے مبشر کے لیے سوال ڈالوں گی۔ ہائے میرا کتنا جی تھا کیا بتاؤں۔"

اور اس نے ایک سرد طویل سانس یوں لی جیسے بہت بڑے نقصان کا احساس ہو رہا ہو۔ ادھر سب عورتوں نے اپنی اپنی جگہ معاملے کی تہہ میں جانے کی کوشش کی اور حسبِ توفیق تحقیق و تجسّس سے کام لے کر اور کچھ اپنے اندازے کے سہارے بزعمِ خویش اس معمّے کو حل کر ہی لیا اور یہ کہانی کچھ یوں بنی کہ اس رشتے کی منظوری کا سب سے بڑا محرّک نور احمد کے بڑے بھائی شبیر علی سے مراد میاں کی پرانی اور گہری دوستی کا جذبہ تھا۔ کہتے ہیں شبیر علی واقعی شبیر کی طرح دلیر اور باحوصلہ تھا۔ مُراد میاں سے اس کا بہت گہرا یارانہ تھا۔ وہ لنگوٹیے یار مشہور تھے۔ شبیر علی تجارت کے سلسلے میں گھومتا پھرتا رہتا۔ لیکن سال چھ مہینے بعد جب بھی وہ لاہور آتا مُراد میاں کے ہاں قیام کرتا۔ دونوں گھروں کا آپس میں کوئی پردہ نہ تھا۔ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ایک ساتھ سینما جاتے اور کبھی کبھار اکٹھے سیر کا پروگرام بھی بنا لیتے۔
شبیر علی اور بیگم مراد علی کے بارے میں بھی بہت سے قصّے مشہور تھے۔ یہ شکایت عام تھی کہ وہ بیگم مراد کو ہمیشہ "گُل رُخ" یا "بھئی گل رُخ" کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شبیر علی مراد میاں کا لنگوٹیا دوست ضرور رہا ہوگا لیکن اب ایک عرصہ سے یہ دوستی محض ایک ڈھونگ تھا اور اصل میں شبیر علی نے یہ تعلق گلرُخ کے لیے قائم کیے رکھا تھا ورنہ ان دونو آدمیوں میں کوئی بات مُشترک نظر نہ آتی تھی۔ یہ سب باتیں بیگم مراد تک پہونچتی رہتی تھیں مگر وہاں تو ایک چُپ کی ڈھال تھی جو ہر وار کو ناکام بنا دیتی تھی۔ اُس نے کبھی کوئی بات نہیں اُلٹی۔ جو سُنا وہ سیدھا دل کے کنوئیں میں ایسا

گیا کہ پھر کوئی ڈول اس کو نہ نکال سکا۔ یہ دوستی اور یہ قصّے ساتھ ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ شبیر علی افریقہ چلا گیا اس کو شیر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ کئی بار بنگال کے جنگلوں میں خطرات سے دوچار ہو چکا تھا۔ افریقہ جانے کا بڑا مقصد تو تجارت ہی تھا لیکن افریقہ کے شیر ببر کا شکار بھی اس کے لیے ایک بڑی کشش تھی۔ جلد ہی احباب کا اس سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور پھر یہ خیال عام ہو گیا کہ شیروں کا یہ شکاری ضرور کسی شیر ببر کا لقمہ بن گیا ہے۔ شبیر علی کی جرأت کے پیشِ نظر ایک ستم ظریف نے کہا تھا کہ اب وہ دوبارہ کسی شیرنی کے بطن سے ہی پیدا ہوگا۔

نور احمد شبیر علی کا بھائی تھا لیکن اس سے بالکل مختلف تھا۔ شبیر علی جتنا تیز و طرّار اور جری تھا نور احمد اتنا ہی خاموش اور بودا تھا۔ اس کو شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا اور خطرات اور جہاں گردی سے گویا اُسے فطری لگاؤ تھا اور اِس کو اپنی چیزوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نور احمد کی پہلی شادی شبیر علی نے خود کی تھی لیکن یہ بیوی جلد ہی مر گئی اور پھر ایک عرصہ اس کو شادی کا خیال نہ آیا۔ پھر شبیر علی بھی افریقہ چلا گیا تو نور احمد کو اکیلے پن کا احساس مارنے لگا۔ شبیر علی کی موجودگی نور احمد کے لیے کچھ ایسی مستقل نہ تھی کیونکہ اس کا اپنا گھر بار نہ تھا۔ شادی اُس نے کی نہیں تھی۔ جانتا تھا کہ بیوی بچّوں کی موجودگی میں شیر کا شکار ناممکن ہوگا۔ رہی جنسی گھٹن سے بچنے کی بات تو پیسے اور جرأت سے کیا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی نور احمد کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسا اس کے سر پہ کوئی ہے اور وہ لاہور ایسے بڑے شہر میں تنہا رہنے کے باوجود خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ ماں اس کی اسے چند برس کا چھوڑ کر مر گئی تھی اور باپ بٹوارے کا شکار ہو گیا تھا۔ بہت سے رشتہ داروں کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ تھوڑے سے بہت رشتہ دار جو باقی تھے وُہ یا تو ہندوستان میں تھے یا وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں تھے۔ اس کو جب کوئی اپنا دکھائی نہ دیا تو اُسے شبیر علی اور مُراد میاں کی دوستی کی روشنی میں مُراد میاں کا گھر نظر آیا۔ نہ روشنی تیز تھی اور نہ راستہ واضح تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ صحرائے لاہور میں اگر کوئی نخلستان ہے تو یہی ہے۔ اس بیاباں دل و جاں میں کوئی جائے پناہ ہو سکتی ہے تو صرف یہی۔ سو اس نے ڈرتے ڈرتے گھبراتے گھبراتے مُراد میاں کے نام ایک خط لکھ ہی ڈالا جو اُنھوں نے فوراً بیگم کے سپرد کر دیا اور بیگم نے نور احمد کو فوراً بُلا بھیجا، جو شرماتا، گھبراتا آیا اور آتے ہی رشتے کی منظوری کا مژدہ سُن کر اور زیادہ گھبرا گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ چکرا سا گیا اور سوچتا رہا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔ یُوں یہ واقعہ گویا ایک حادثے کے کردار کا حامل تھا۔

اس گھر پر بیگم مُراد کی حکومت تھی۔ مُراد میاں کی حیثیت تو تصویر کے پس منظر یا کسی اہم کردار کے ساتھ ایستادہ کسی غیر اہم کردار کی سی تھی۔ بیگم مُراد جب بیگم مُراد نہ تھی اور گُل رخ کلیم کہلاتی تھی تب اس کے حُسن کے چرچے دُور دُور تک تھے۔ اس کی سعادت مندی اور سگھڑپن کا شہرہ تھا لیکن شادی کے چند ہی ماہ بعد اس نے ماں باپ ماموں چچا سب کو ٹھینگا دکھانا شروع کر دیا۔ کئی بار ذرا ذرا سی بات پہ اُس نے سب کو جو زبان پر آیا کہا۔ یہ بزرگ لوگ اولاد سے محبّت کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتے تو کب کے اس عورت سے دُور جا چکے ہوتے ورنہ اس عورت نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ نہ صرف کسی کا کہا نہیں ماننا بلکہ موقعہ مل جائے تو ان بزرگوں کو جلی کٹی سُنانے سے بھی گریز نہیں کرنا۔ وہ لوگ اس کے معاملات

میں دخل ضرور دیتے تھے گو ہر بار مُنہ کی کھانی پڑتی تھی اور ہوتا وہی تھا جو وہ خود چاہتی تھی۔ اس کی پہلی بیٹی راشدہ کی شادی پر بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ سب اس رشتے کے خلاف تھے لیکن بیگم مُراد ایسی با اختیار تھی کہ یہ شادی ہوئی اور سب دیکھتے رہ گئے۔ رہے مُراد میاں تو وہ تو اس کی رائے کو رد کرنا یا اس کی راہ میں آنا گویا گناہ سمجھتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بیگم کو مجسمۂ عقلِ کل سمجھتے ہوں۔ چنانچہ بانو کے بارے میں بھی فیصلہ وہی رہا جو خود اُس نے چاہا۔ بڑوں نے حسبِ عادت اب بھی احتجاج کیا۔ "کبھی تو ہماری کوئی بات مان لو۔"

"کچھ تو سُنو"

"آخر کوئی حد ہوتی ہے۔"

"کچھ سوچ تو لو۔"

اس قسم کے اُس نے بہت سے جملے سُنے مگر وہ جانتی تھی کہ ان کا خاموشی سے بہتر کوئی جواب نہیں۔

—— (۴) ——

مولوی صاحب نے نور احمد سے سوال کیا۔ "بانو بنت شیخ مُراد علی کو بعوض حق مہر پانچ ہزار معجّل پانچ ہزار غیر معجّل بسکہ رائج الوقت تم نے اپنے نکاح میں قبول کیا؟"

نُور احمد نے ایک تجربہ کار آدمی کے سے تیقن اور اطمینان سے جواب دیا "جی، قبول کیا۔"

مُبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں تو مُراد میاں کے ذہن میں ایک دم سے جیسے ڈھول بجنے لگے۔ "قبول کیا ——— قبول کیا ——— دھم دھما دھم ——— دھم دھما دھم ——— قبول کیا قبول کیا ——— دھم دھما دھم، دھم دھما دھم ...."

"قبول کیا" ——— یہ دو لفظ وہ کبھی نہ بھلا سکتے تھے اور اب دیواریں کہہ رہی تھیں۔ "قبول کیا" دروازے چلا رہے تھے۔ "قبول کیا۔"

بانو کے جہیز کی ایک ایک چیز پکار رہی تھی۔ "قبول کیا۔"

دُولھا کے سہرے کی ہر لڑی گا رہی تھی۔ "قبول کیا"

سجی سجائی دُلھن کی چادر کا ایک ایک تار گنگنا رہا تھا۔ "قبول کیا"

سترہ برس پہلے کی ایک ایسی ہی محفل اُن کے ذہن میں برپا تھی اور وہ سوچ رہے تھے۔ "قبول کیا؟ میں نے کب قبول کیا؟ ——— میں نے کیا قبول کیا؟ ——— یہ تو سب باباجان کا قصور تھا ———" اور یہ سوچتے سوچتے وہ ایسے گم ہوئے، ایسے چپ ہوئے اور کچھ دیر یوں خلا میں گھورتے رہے جیسے محفل ان کے ارد گرد نہیں بلکہ اوپر ہوا میں قائم ہے۔ ان کی حالت دیکھ کر کچھ دیر کے لیے لوگ پریشان ہو گئے لیکن وہ جس تیزی سے پریشان ہوئے تھے اسی تیزی سے سنبھل بھی گئے۔

کچھ اسی قسم کا دورہ ان کو راشدہ کی شادی پر بھی پڑا تھا لیکن وہ اتنا شدید نہ تھا۔ ان کی حالت پر مختلف قسم کے تبصرے ہوئے۔

"اولاد ——— ہائے اولاد کتنی پیاری ہوتی ہے!"

"خدا لڑائی کی گھڑی لائے جدائی کی گھڑی نہ لائے"

"یہ صدمہ تو سب کو سہنا ہی پڑتا ہے"

دو لفظوں کے اس مجموعے "قبول کیا" پر بھی دیر تک گفتگو جاری رہی۔ اس قسم کی بہت سی باتیں کہی گئیں کہ کس طرح ذرا سی دیر میں یہ دو لفظ ماں باپ سے بیٹی کو جدا کر دیتے ہیں اور کس طرح وہ لاتعداد ماں باپ جو اپنی شادی پر بڑے شوق سے "قبول کیا" کہتے ہیں۔ اپنی بیٹی کو جدا کرتے وقت ان دو نازک لفظوں کی سنگینی سے مجروح ہو جاتے ہیں۔

مراد میاں کی حالت دیکھ کر بڑے بڑے سنگدل اداس نظر آرہے تھے اور جب بینڈ باجے کے شور میں عورتوں اور لڑکیوں نے مل کر وہ گیت گایا جو لاکھوں بار گایا جانے کے باوجود تازہ ہے، جو کبھی پرانا اور فرسودہ نہیں ہوگا تو بہت کم آنکھیں تھیں جو پرنم نہیں ہوئیں آنسو گرتے رہے اور گیت دلوں میں اترتا رہا اور پھر اور آنسو گرتے رہے۔ کوئی ایسا دل نہ تھا جو اس گیت میں شریک نہ ہو۔

لکھّی بابل مورے

او ــ و ــ و ۔ لکھّی بابل مورے

کاہے کو دینو بدیس!

بیٹی تو بابل اک چڑیا جو پنکھ لگے اڑ جائے

رے جو پنکھ لگے اڑ جائے

رے اڑ جائے

رے اڑ جائے

رے اڑ جائے......

....

عورتیں چلّا چلّا کر روئیں۔ مردانے سے بھی کراہوں اور آہوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ مراد میاں پر بھی گریہ کا زبردست دورہ پڑا لیکن لوگ پریشان نہ ہوئے۔ جانتے تھے کہ باپ ہے اور غم بہہ نکلے تو آرام ملتا ہے۔

بیگم مراد سب کے لیے ایک معمّہ بنی ہوئی تھی۔ وہ کبھی کبھی سوچ میں گم نظر آتی لیکن سوچ کے یہ وقفے بہت مختصر ہوتے تھے۔ بیشتر وقت وہ روزمرّہ کی طرح خوش ہی نظر آتی رہی۔ بیٹی وداع ہو رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔

واضح ہے کہ عورتوں نے اس کے بارے میں ڈھیروں باتیں کی ہوں گی ——— اور یقیناً کیں۔ اس کی

بدنامیوں کے تذکرے چھیڑے گئے اس کی بے حسی پر اظہار افسوس کیا گیا، اس کے حوصلے کو سراہا گیا، اس کی بشاشت پر حیرانی کا اظہار کیا گیا اور اس کے دل کی سختی پر اسے لعن طعن کیا گیا۔

کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ اور بات سے بات نکلتی رہی۔

"اُسے یہ فکر تو ضرور ہوگی کہ نور احمد بالکل اکیلا ہے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔"

"واہ بھئی واہ — اس میں دُکھ یا فکر کس بات کا ——— یہ تو خوشی کی بات ہوئی ناکہ نہ ساس ——— نہ نند ——— مزے سے رہو اور سُکھ کی کھاؤ ——— بہن ہم سے پوچھو جن پر گزرتی ہے۔ ایک سے ایک بڑی آفت سے پالا پڑا ہے۔ ہتھیلی پر رکھی گاجر کو اس صفائی سے کاٹتی ہیں کہ بس دیکھتے ہی رہو ——— تم کیا جانو ——— وہ اتنے اچھے نہ ہوتے تو میں کب کی اس گھر کو آگ لگا چکی ہوتی۔"

"پر میں سوچتی ہوں یہ جو اس نے اتنی عمر کا بڈھا چنا ہے تو جی ہی جی میں پچھتاتی تو ضرور ہو گی۔ بیس بائیس سال کا فرق ہے۔ ہائے اللہ ہمارا ان کا صرف دس سال کا فرق ہے۔ بس اسی پر لے دے رہتی ہے۔ میں کہتی ہوں کہ پانچ سال کا فرق ہونا چاہیے۔ بس۔"

"اپنا بدلہ نکال رہی ہے۔" ایک تیسری آواز قریب سے آئی اور پہلی دو نو عورتوں نے یہ بھان کر کہ کوئی تیسرا شخص ان کی باتیں سُن رہا تھا پہلے تو حیرانی کا اظہار کیا، پھر انھیں دلی مسرت ہوئی کہ ان کی باتیں سُن لی گئیں۔ چنانچہ اب انھیں باتوں میں زیادہ مزا آنے لگا۔ اُنھوں نے مشتاقانہ اور بے تابانہ اس تیسری عورت کی طرف دیکھا اور انتظار کرنے لگیں کہ وہ کچھ اور کہے کچھ دیر تک جب اُس نے کچھ نہ کہا تو ان میں سے ایک کو صدیوں کی سی یہ خاموشی بڑی صبر آزما معلوم ہوئی اور اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

"بدلہ!؟"

"ہاں بدلہ!" اس آواز میں وہ یقین، وہ زور تھا جو کسی بات کا صحیح علم حاصل ہونے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے مراد بھائی اپنی بیوی سے پورے ستائیس برس بڑے تھے ——— بھلا کوئی لڑکی باپ برابر دُولھا پا کر بھی خوش رہ سکتی ہے۔ اس کی خوشی بس دکھاوے کی ہے۔ مہمان آ جاتے تھے تو گندے پلید بستر پر دُھلی صاف چادر ڈالنا ہی پڑتی ہے۔"

باتیں ہوتی رہیں اور وقت گزرتا گیا۔ پھر شام ہو گئی۔ ایک ایک دو دو کر کے مہمان بھی چلے گئے اور آخر میں بانو بھی رُخصت ہو گئی۔

(۵)

نور احمد کا گھر مختصر ضرور تھا لیکن اس میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ برآمدہ، باورچی خانہ، غسل خانہ، سٹور، صحن اور دو کمرے۔ اسے اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ بیگم مراد نے پہلے ہی موقع کے مطابق گھر کی

صفائی کا انتظام کروا دیا تھا۔ اس گھر پر کئی برس سے عورت کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ نور احمد کے بعض دوست اسے کہا کرتے تھے کہ محض اسی وجہ سے وہ خود اور یہ گھر تباہ ہونے سے بچا ہوا ہے۔ دوستوں کا اکٹھ عموماً مولوی حمید کی بیٹھک میں ہوتا تھا اس لیے اس گھر پر عموماً خاموشی طاری رہتی تھی۔ نور احمد کچھ ایسا سادہ مزاج تھا کہ اس نے ریڈیو سیٹ تک نہ خریدا تھا۔ وہ گھر میں بھی ہوتا تو گھر خاموش ہی رہتا۔ وہ سونے کو لیٹتا تو گھر پر چھایا ہوا سناٹا جس کا وہ عادی ضرور ہو گیا تھا، کبھی کبھی اسے پریشان بھی کر دیتا اور عجیب عجیب باتیں سجھاتا۔ وہ شاعر یا فلسفی نہیں تھا لیکن اس نے کئی بار محسوس کیا کہ جیسے خاموشی بھی ایک آواز ہے۔ اس نے کئی بار اس آواز کو سنا تھا لیکن اس کے ذہن نے اسے اہمیت نہ دی تھی۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ خاموشی بہت بڑی حقیقت ہے اور کہ خاموشی ہی زندگی کا سرچشمہ ہے اور زندگی کا دریا خاموشی کے سمندر میں ہی جا گرتا ہے اور درمیان کا یہ مختصر سا وقفہ

زندگی کہہ لیں جسے

مختصر سا یہ سفر چھوٹی چھوٹی خوشیوں بڑے بڑے حادثوں، احمقانہ خواہشوں اور لاعلاج پریشانیوں سے اٹا پڑا ہے۔ اسے اپنے ماں باپ تو اکثر یاد آتے تھے جو ماضی کی خاموشی کا حصہ بن چکے تھے۔ مرحومہ بیوی یاد آتی تھی جس کی آواز کبھی کبھی خاموشیوں کے بے صدا گیتوں کے قافلے کے ہمرکاب ہوتی تھی۔ یہ خیال اس کے ذہن میں اپنی انتہائی سادہ صورت میں آتے اور کبھی کسی قسم کی شدید الجھن کا سبب نہ بن سکے۔ صبح کی روشنی میں یہ خیالات، ماضی کی یہ تصویریں، گم ہو جاتیں۔ رات کی تاریکی کی یہ خصوصیت کہ وہ انسان میں بہت کچھ دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے نور احمد کی سوچ بچار کا مرکز کبھی نہیں بنی۔ اور ان سب باتوں کے باوجود اس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ایک روز فطرت کا دستِ نہفتہ جو ہمہ وقت سرگرم کار ہے، اسے بھی ہنگاموں کے کمزور ہاتھوں سے چھین کر لے جائے گا اور موت کی خاموشی کے حوالے کر دے گا۔

اس کے ذہن میں کوئی خاص الجھن، کوئی واضح کمپلکس نہ تھا تاہم وہ اِدھر کچھ عرصہ سے گھر کی تنہائی سے زیادہ ہی گھبرانے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ اس گھر میں ہنگامے پھر واپس آ جائیں اور ایک کمزور سی امید کا سہارا لے کر اس نے مراد میاں کو خط لکھ دیا تھا اور جب وہ ان سے اور ان کی بیگم سے مل کر گھر واپس آیا اور اپنے بستر پر لیٹا تو دیر تک سوچتا رہا کہ خاموشی کا تکلیف دہ پہلو چھپ جائے گا اور بہت جلد نغموں کی سحر آ جائے گی۔

نغموں کی سحر آ گئی اور نور احمد سج سجا کر اپنے دوستوں کی معیت میں بیگم مراد کے گھر گیا۔ شام کو وہ واپس آیا تو اس کی جھولی مرادوں کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی اور اس کے ماتھے پر سہرا ابھی تک سجا ہوا تھا۔ وہ بانو کو لے کر گھر میں داخل ہوا اور محسوس کرنے لگا کہ یہاں خوشیاں اور ہنگامے قافلہ در قافلہ اس کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔

(۶)

واپسی پر نور احمد کے ساتھ اس کی دلہن اور دوستوں کے علاوہ اور چند لوگ بھی تھے۔ ان میں بیگم مراد بھی شامل تھی۔ نور احمد کے دوست جلد ہی چلے گئے اور پھر باقی لوگ بھی رخصت ہوئے۔ بس بانو اور بیگم مراد رہ گئے۔ بیگم مراد نے

بہت جلد جہیز کا تمام سامان نہایت سلیقے سے سجا دیا اور مختصر سا یہ گھر اب بھرا بھرا اور گنجان آباد سا نظر آنے لگا۔

شام کو یہ خبر جلد ہی عام ہو گئی کہ بیگم مُراد بیٹی کے ساتھ گئی ہے تو اس کے رشتہ داروں کو سخت غصّہ آیا لیکن وہ سب خود کو بے بس پاتے تھے اور سوائے اس کے کچھ نہ کر سکے کہ جمع ہو کر ایک بار پھر اس کو بُرا بھلا کہہ لیں۔

"دیکھ لیا بہن۔ کیا زمانہ آن لگا ہے۔" دُور کی ایک پھُوپھی نے دُور کی ایک خالہ سے کہا اور بغل میں دبائی ہوئی گٹھڑی کو چھپانے کی کوشش میں بالکل سامنے کر دیا۔

"کل جُگ ہے آپا کل جُگ ——— یہ عورت تو بس سب سے انوکھی ہے۔ ہائے تو کبھی یہ بھی ہُوا تھا کہ ماں ہی بیٹی کے ساتھ چلی جائے۔ یہ تو رشتہ داروں کا فرض ہوتا ہے۔ اسے نہ بڑوں کا لحاظ ہے نہ رسموں کا خیال نہ بدنامی کا ڈر۔ ماموں چچا سب یونہی تو ناراض نہیں ہیں۔"

"آنکھ کا پانی مر گیا ہے بہن ——— توبہ توبہ ——— وہاں بیٹھی بھی کہہ رہی تھی کہ نور احمد اکیلا ہے اس کا تمام سامان مجھے خود ہی جا کر سنبھالنا پڑے گا ——— بڑی ہی کمینی عورت ہے۔ عورتوں کو بدنام کر دیا ہے۔ مجھے تو ترس آتا ہے بے چارے مُراد بھائی پر ——— ٹُک ٹُک دیدم دم نہ کشیدم ——— بے چارے بے بس پڑے رہتے ہیں ——— جال کی طرح ان کے گرد لپٹ گئی ہے ——— ابھی سگائی پر مجھے کہا کہ بس بانو کے ساتھ تو تم ہی جائیو۔ پر اس کو کس کا لحاظ ہے۔ اپنا کہا بھی بھُول گئی۔ سگی نہ سہی سگیوں کے بعد تو میرا ہی نمبر آتا ہے اور سگے اس کو گھاس ہی کب ڈالتے ہیں۔ لو دیکھو میں تو کپڑوں کی یہ گٹھڑی اُٹھائے اُٹھائے تھک بھی گئی اور اس کٹنی نگوڑی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ بہن یہ کیا بوجھ لادے پھر رہی ہو۔"

"اب آپا اس کے مُنہ کون آئے! میں تو کہتی ہُوں اچھّا ہی ہوا نہ تم گئیں نہ میں۔ لوگوں کا کیا ہے یونہی اس کی بدنامیوں کا کچھ حصّہ ہمارے نام ڈال دیں اور پھر ایک بات ہو تو کوئی کہے ——— اب وہ راشدہ کا قصّہ تو تمھیں یاد ہی ہوگا۔"

"ہاں ہاں ——— یاد کیوں نہ ہوگا۔"

"اور نہیں تو کیا ——— کوئی بھُولنے کی بات تھوڑی ہے۔ تم نے راشدہ کے میاں کو دیکھا ہے نا کتنا سعادتمند لڑکا ہے۔ شادی کے بعد اِس بے حیا نے ضد کی کہ وہ گھر جوائی رہے۔ پہلے تو وہ ہنس ہنس کر ٹالتا رہا۔ پر جب اس نے دیکھا کہ یہ مری جا رہی ہے تو بے چارے نے ماں باپ کو راضی کر لیا کہ چلو تھوڑے دنوں کو اس کی خوشی بھی کر دو۔ پر ایک مہینہ میں نہ جانے کیا دنگا فساد ہوا کہ بے چارہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

"مجھے سب یاد ہے ——— کل ہی کی تو بات ہے ———"

"ہاں ——— کوئی بھُولنے کی بات تھوڑی ہے ——— آگے تو سنو ——— بٹیا کو تو اس نے روک ہی لیا تھا۔ کہتی تھی کہ جانے نہ دوں گی۔ پر ایک روز یُوں ہوا کہ یہ راشدہ کو ساتھ لے کہ بازار ہو گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ

انارکلی کے نکڑ پر راشدہ ' دُولھا یوں کھڑا ہے جیسے انھی کی راہ تک رہا ہو۔ اُس نے راشدہ کا ہاتھ پکڑ کر ٹیکسی میں بٹھایا جا وُہ جا —— یہ بے چاری کھڑی دیکھتی رہی، کر بھی کیا لیتی —— اور کوئی بیچ میں بھی کیسے آتا آخر وہ اس کا دُولھا تھا —— اور پھر وہ دن اور آج کا دن اُس نے راشدہ کو اِدھر نہیں آنے دیا۔"

"ہائے تو یُوں ہوا؟! مجھے تو کہنے لگی کہ میں نے آپی آپ بھیج دیا۔ پرائے دھن پر کیا زور۔ جھوٹی۔ مکّار۔"

"لپاٹن۔"

"کمینی۔ رذیل ——" دُور کی پھُوپھی نے غصّہ اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے خُوب گالیاں دیں۔

"بس دیکھ لو آپا ——" دُور کی خالہ نے بڑے عالمانہ فخر سے کہا۔

"اے بہن یہ تم نے آپا آپا کیا لگا رکھی ہے۔ خدا جھُوٹ نہ بلوائے تم سے سات برس چھوٹی ہوں۔ تمھاری شادی پر میں بارہ برس کی تھی"؟ دُور کی پھُوپھی کو غصّہ نکالنے کا ایک اور بہانہ مِل گیا۔

"ہائے آپا۔ یہ تم پر بھی اس لپاٹن کا رنگ چڑھ گیا۔ مجھے تو صاف یاد پڑے ہے کہ تُمھاری شادی پر میں دو مہینے کم گیارہ برس کی تھی۔" دُور کی خالہ نے اپنے چھوٹے پن کی حفاظت ضروری سمجھی۔

"اے بس رہنے دو یہ جھُوٹ۔"

"جھُوٹی تم ہو کہ میں۔"

اور وہ لڑتی جھگڑتی دُور نکل گئیں۔

(۷)

نُور احمد نے خوابگاہ کا دروازہ بند کیا تو اُسے ناصرہ یاد آ گئی۔ آج ان تمام باتوں کا اعادہ اس پر فرض تھا جو اُس نے اس روز کی تھیں جب وہ ناصرہ کو بیاہ کر لایا تھا اور اِسی خوابگاہ میں اس سے پہلی بار مِلا تھا۔ آج جو لفظ اس کی زبان سے ادا ہوتا جو حرکت اس سے سرزد ہوتی اس کی ایک واضح تصویر اسے اپنے ماضی کی کتاب کے ایک باب میں واضح طور پر روشن نظر آتی۔ چھوٹے چھوٹے ان واقعات کا دامن اب اسے پھیلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ واقعات کی یہ تکرار اُسے بہت عجیب سی لگی۔ کمرہ وہی تھا صرف بعض اشیا اور ان کی ترتیب بدل گئی تھی۔ باتیں وُہی تھیں وہ خود بھی وُہی تھا صرف ناصرہ کی جگہ بانو نے لے لی تھی اور دورانِ گفتگو الفاظ میں معمولی سا رد و بدل ہو گیا تھا۔ واقعات اور حادثات کی یہ تکرار ہی زندگی ہے لیکن نُور احمد اس قسم کی گہری فلسفیانہ باتیں سوچنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسے یاد تھا کہ ناصرہ سے بات کرتے ہوئے وہ خاصا پریشان تھا لیکن اب تجربے کا عطا کردہ حوصلہ اس کے ساتھ تھا۔ اب وہ تنہا نہ تھا اس لیے بڑے پُراعتماد، مُربیانہ اور بزرگانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں بات کرتے ہوئے اپنی اور بانو کی عمروں کا فرق بھی اُسے یہ انداز اختیار کرنے پر اُکسا رہا ہو۔ ایک بات کا اُسے پُوری طرح یقین تھا اور وہ یہ کہ اُس نے ناصرہ سے بھی محبّت اور خلوص سے باتیں کی تھیں اور آج بانو سے بھی اسی سچّے جذبے کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ عموماً شادی بلکہ سگائی ہوتے ہی دونو متعلقہ اشخاص ایک دُوسرے

کو اپنے دل میں اُترتا ہوا سا محسوس کرنے لگتے ہیں اور جب ان کی مُلاقات ہوتی ہے تو یگانگت کے لیے راستہ پہلے سے ہموار ہوتا ہے۔ کم از کم اپنے بارے میں تو اس کا یہی تجربہ تھا۔

اُنھوں نے ایک دُوسرے کو بتایا کہ وہ ایک دُوسرے کے اور مستقبل کے بارے میں کیا سوچا کرتے تھے۔ اُنھوں نے ہونے والے بچوں کا ذکر چھیڑا۔ ماضی کے اوراق بھی اُلٹے اور دیر تک جاگتے اور باتیں کرتے اور مزید جاگتے اور مزید باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ نیند نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

(۸)

برآمدے میں کھٹکا ہوا اور بانو کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے سامنے دیوار پر لگے کلاک کی طرف نگاہ کی۔ زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں اُس نے دیکھا کہ رات کے تین بج رہے ہیں۔ پھر اُس نے پہلو میں سوئے ہوئے نُور احمد کے چہرے پہ پہلی بھرپور نظر ڈالی۔

"یہ ابّا جان سے کتنے مُختلف ہیں۔" اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور چلا گیا۔

نور احمد کے بال اُس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اطمینان سے سویا ہوا وہ اس کو بہت سیدھا، معصوم اور اچھا لگا۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر بال ایک طرف ہٹا دے اور اس کی پیشانی کا پُوری طرح نظارہ کرے لیکن ابھی اس میں اتنی بے باکی نہیں آئی تھی اس کا ہاتھ ذرا سی حرکت کرکے رُک گیا۔

نُور احمد کا سر ریشمی لحاف سے باہر تھا۔ پلنگ کے آخری کونے پر ایک اُبھار بتا رہا تھا کہ یہاں اس کے پاؤں ہیں۔ بانو نے اس کے سر سے پیر تک نظر دوڑائی۔

"یہ کتنے لمبے ہیں!" اُس نے سوچا۔ "مجھ سے تو کم سے کم دو بالشت اُونچے ہوں گے۔" وہ مُسکرانے لگی۔ "خیر اسٹول کام آجایا کرے گا۔" وہ اور زیادہ مُسکرائی۔

"مرد عموماً عورتوں سے لمبے کیوں ہوتے ہیں"، اُس نے پھر سوچنا شروع کیا۔ "اور زیادہ مضبوط بھی تو ہوتے ہیں ——— شاید اسی لیے مرد اچھے ہوتے ہیں۔ ابّا جی بھی کتنے لمبے ہیں۔ وہ کتنے چُپ چاپ اور دُبلے سے ہیں پر امّی پھر بھی ان سے ڈرتی ہیں۔"

اُس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے سونے لگی ہو لیکن پھر باہر کھٹکا ہوا اور قدموں کی آہٹ یوں آئی جیسے کوئی اندر چلا آرہا ہو۔ اُس نے گھبراہٹ میں نُور احمد کو جھنجھوڑ دیا۔ نُور احمد جاگ اُٹھا اور بانو گھبراگئی کہ کیا کہے۔ اُسے یہ بتاتے ہوئے حجاب آرہا تھا کہ وہ ایک معمولی سے کھٹکے سے ڈر گئی ہے، وہ کیا سوچیں گے۔ اتنی بڑی ہو کر ڈرتی ہے۔ عین اس وقت پھر قدموں کی مدھم سی آواز آئی لیکن اب کے یوں لگا جیسے یہ آواز دروازے سے دُور جارہی ہو۔ بانو کی مشکل آسان ہوگئی۔ "یہ سُنا آپ نے؟ باہر کوئی ہے!" اُس نے کہا۔

نور احمد مُسکرانے لگا۔ وہ بانو کی گھبراہٹ سے لُطف لے رہا تھا۔ "امی جان کے سوا کون ہوسکتا ہے"، اُس نے کہا۔

"ماما! سمجھتی ہو نا! شاید ابھی نہیں سمجھتیں۔ ابھی تم اس فکر کا اندازہ نہیں کر سکتیں جو تمھاری امی جان کو تمھارے بارے میں ہو سکتا ہے ——— خیر سو جاؤ ——— سو جاؤ۔" اور اس نے لحاف اچھی طرح اس کے گرد لپیٹ دیا۔

اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی شرارت سے بانو نے اندازہ کر لیا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ امی جان کو کیا فکر لاحق ہو سکتی تھی۔

اگلی صبح بانو کو بہت اچھی بھی لگی اور عجیب اور نئی بھی۔ وہ حیران تھی کہ صبحیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں۔ اس نے پہلو میں خوابیدہ نور احمد کی طرف دیکھا اور ایک انگڑائی لے کر ڈرتے ڈرتے بازو پھیلائے اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کلاک آٹھ بجا رہا تھا۔ کمرے میں نئی قسم کی روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ سورج کی یہ روشنی عام نہ تھی آج اس روشنی میں کسی اور نئی روشنی کی خوشگوار آمیزش تھی۔

"زندگی کتنی اچھی ہے" اس کے اندر سے ایک آواز آئی۔

"زندگی کتنی عجیب ہے" در و دیوار نے کہا۔

"زندگی کتنی خوبصورت ہے" کمرے میں رکھی ہوئی ہر شے نے سرگوشی کی۔

"آج کی نماز قضا ہو گئی" اس کو اس خیال سے دکھ ہوا۔ اس نے نور احمد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے جلد بیدار ہونے کے امکانات عیاں نہیں تھے۔ "ان کے جاگنے سے پہلے نماز پڑھ لوں" اس نے سوچا وہ اٹھنے لگی تو اچانک اسے چند باتیں یاد آئیں جو شادی سے ایک روز پہلے اس کے کان میں ڈالی گئیں تھیں اور اسے خیال آیا کہ آج وہ نماز نہیں پڑھ سکتی۔ وہ لیٹی رہی اور پھر نور احمد کو نظروں میں تولنے لگی۔

"کیا یہ کام کاج میں اسی طرح میرا ہاتھ بٹائیں گے جیسے ابا جان امی جان کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"ابا جان آج تک کسی سے سختی سے نہیں بولے۔ نہ جانے یہ کیسے بولا کریں گے ——— لگتے تو بہت اچھے ہیں۔ ابا جان سے بھی اچھے۔"

"ان کو بچوں کا کتنا شوق!"

نو بجے کے قریب ایسے لگا جیسے نور احمد جاگ جائے گا۔ اس نے آنکھ کھولی اور بند کر لی۔ چند منٹ کے بعد پھر اس نے یہی عمل دہرایا اور پھر تیسری بار اس نے پہلو میں ہاتھ مارنے کے بعد گھوم کر دیکھا۔ بانو آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے ہاتھوں سے اپنے بال درست کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں وہ مصرعہ گھوم گیا جو پہلی شادی کی دوسری صبح اس کے دوستوں نے ایک قوالی کی صورت میں گا گا کر اسے سنایا تھا:

تمری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

وہ باہر آئے۔ بیگم مراد نے ناشتہ تیار کیا ہوا تھا اور غسل خانے میں ٹب گرم پانی سے بھرے رکھے تھے۔

نور احمد نے آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور دل ہی دل میں کہا "اے خدا ——— اے مہربان خدا! میں تیرا شکر

کیونکر ادا کروں!"

(۹)

رواج کے مطابق بانو اپنی ماں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ نورُ احمد کو یہ رواج کچھ اچھا نہ لگا۔ بیگم مُراد یہ بات سمجھ گئی تھی۔ وہ تو خود کسی لمبی چوڑی پابندی کی قائل نہ تھی۔ اُس نے نورُ احمد سے کہا "تم بھی وہیں ہمارے ساتھ چل رہو۔" لیکن نور احمد کو یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ پھر گھر کو اکیلا چھوڑنا بھی درست نہ تھا۔ یقیناً اس وقت تک آس پاس بلکہ دُور دراز کے چوروں کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اس گھر میں شادی کا نیا نیا سامان آیا ہے۔ آخر طے یہی ہوا کہ نور احمد رات گھر پر ہی گزارے گا۔ دو دن کی تو بات تھی۔

دوستوں نے شام کو اُسے سسرال ہی میں آگھیرا۔ مولوی حمید کہ "سرخیلِ حلقۂ یارانِ طریقت" کہلاتا تھا، مولوی ضرور تھا لیکن تھوڑا جدید قسم کا مولوی تھا یعنی داڑھی رکھنے اور نماز پڑھنے کے باوجود سیر سپاٹے اور فلموں کا خاص شوق رکھتا تھا۔ اس وقت سب فلم کا پروگرام بنا کر آئے تھے اور چلتے چلتے وُہ یہ بھی کہتے گئے کہ رات کے کھانے پر نورُ احمد کا انتظار نہ کیا جائے۔

ایبٹ روڈ کی مشہور دُوکان سے نان کباب اور تکّے کھا کر اُنھوں نے فلم دیکھی اور اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ نورُ احمد کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ سیدھا اپنے گھر جائے۔ گھر پہونچ کر اُس نے دروازہ کھلا پایا۔ اندر روشنی بھی ہو رہی تھی۔ پہلا خیال جو اُس کے ذہن میں آیا یہ تھا!

"لو ہو گیا چاندنا! بٹیا اور جاؤ فلم دیکھنے!"

وہ چوروں کے ڈر سے ڈرتے ڈرتے چوروں ہی کی طرح دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ بُھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔ باورچی خانے سے کوئی نکلا اور نور احمد ٹھٹک کر رُک گیا۔

"آپ —— ! —— اوہ!" اس نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لے کر کہا "میں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

"ہاں —— دُوسری چابی میں ساتھ ہی لے گئی تھی۔ تم تو اپنے دوستوں کے ساتھ چلے گئے اور مجھ پر یہ فکر سوار ہو گئی کہ نہ جانے کیا الّم غلّم کھا لو۔ سو میں کھانا ساتھ لے آئی۔ گرم ہے اور بالکل تیار ہے۔ اب صبح ناشتہ کر کے گھر جاؤں گی —— پھر کل شام کو تم بانو کو لے آنا۔"

"اوہ، آپ کتنی مہربان ہیں —— میں آپ کا شکریہ اور خدا کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی قسمت پر ناز ہو جائے گا، ایسا ہو تو اے خدا مجھے گُنہ گار نہ سمجھ لیجیو۔" اس نے یہ کہہ کر ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیے۔

اسے بُھوک نہ تھی پھر بھی اُس نے تھوڑا سا کھانا کھا ہی لیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت کچھ نہ کھانا گُناہ ہو گا۔

شب خوابی کا لباس پہن کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ تکیہ عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ دُلھن کا جسم طرح طرح کی خوشبوؤں سے مہکا کر پیش کیا جاتا ہے اور دُولھا سمجھنے لگتا ہے کہ یہ خوشبو اس عورت کے پیکر کی خوشبو ہے اُس کی ذات کا حصّہ ہے اور وہ اسے گُل بدن کہتا ہے اور جب وہ قریب نہ ہو تو اس خوشبو کے احساس سے اسے قریب محسوس کرنے کی کوشش کرتا

ہے۔ زیادہ حساس ہو تو شاعروں کی طرح پھولوں کی خوشبو کو اُسی کا مرہونِ منت قرار دیتا ہے۔ یہ خوشبو بانو کی نہ تھی یہ خوشبو تو ہر اس دُلھن کے جسم سے آتی ہے جس کے ماں باپ کے پاس اتنا پیسہ ہوتا ہے کہ اُسے کسی نہ کسی خوشبو میں بسا دیں۔ یہ خوشبو کچھ اتنی تیز تھی کہ نور احمد کو یہ بات پُوری طرح یاد نہ آئی کہ ناصرہ کے وجود سے بھی اسی قسم کی خوشبو کی لپٹیں اُٹھا کرتی تھیں۔ مگر وہ خوشبو اب دُور ماضی میں جا چکی تھی اور وہ جسم مٹی میں مل چکا تھا اور گو نُور احمد نے اس جسم سے بھی محبت کی تھی تاہم اب وہ سب کچھ وقت کا ایک خاصا طویل فاصلہ طے کر کے اتنی دور جا چکی تھی کہ اب اسے اس پرانی خوشبو کا احساس بہت کم ہوتا تھا۔

تکیے کی خوشبو کو ذہن میں اُتارتے ہوئے اسے مسلسل یہ احساس تھا کہ یہ خوشبو بانو اپنے ساتھ لائی ہے اس لیے یہ اُسی کی خوشبو ہے اور وہ خود خوشبو کا پیکر ہے اور نیم غنودگی کی حالت میں وہ محسوس کرتا رہا جیسے اس خوشبو کے واسطے سے وُہ خوشبو کا پیکر اس کے پاس موجود ہے اور وہ اس پیکر کو اپنے ذہن کی آغوش میں لے کر سو گیا۔

ابھی نصف شب نہ گُزری تھی کہ باہر برآمدے میں کچھ آہٹ ہوئی اور اس کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے اپنے پہلو کی جانب ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے کہا!

"بانو!"

لیکن ہاتھ یُوں واپس آ گیا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو اور ایک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا۔ "باہر کون ہے؟ بلّی یا امّی جان؟" اور وہ بار بار دل میں "بلّی یا امّی جان ——— بلّی یا امّی جان" کے الفاظ دُہرا کر مُسکراتا رہا اور پھر سوچنے لگا۔ "بلّی ہی ہوگی ——— آج امّی جان کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے!" اس کے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے پھر اپنے پہلو کی طرف دیکھا جیسے بانو سے داد کا طالب ہو کر دیکھو ہم نے کیا مزے کی اور کتنی معنی خیز بات کی ہے۔

"بلّی ہی ہوگی۔" اُس نے دِل میں فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کر کے سو جانا چاہا لیکن پھر وُہی آہٹ پیدا ہوئی اور ایسے لگا جیسے کوئی اندر کی طرف چلا آ رہا ہے۔ اُس نے اُٹھ کر ایک دم سے دروازہ کھول دیا۔ باہر بیگم مُراد کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے سے صرف معمولی سی پریشانی عیاں تھی۔

"اکیلے سونے کی عادت نہیں ہے نا ——— بھرے کمرے میں سو سو کر عادت بگڑ گئی ہے۔ دِل گھبرانے لگا اور نیند بھاگ گئی۔" انہوں نے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" نور احمد نے تسلّی دی۔ "آپ بے فکر ہو کر سوئیں۔ ضروری سمجھیں تو بیچ کا دروازہ کھول لیں۔ آپ کا احساسِ تنہائی جاتا رہے گا۔" نور احمد نے دیکھا کہ بیگم مُراد مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

بیچ کا دروازہ کھُل گیا اور وہ بستر پر آ لیٹا۔ تکیے سے مُنہ لگا کر اس نے کئی لمبی لمبی سانسیں یوں لیں جیسے بستر کی تمام مہک کو پی جانا چاہتا ہو۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور دایاں بازو یوں بڑھایا جیسے اپنے قریب اُسی پیکرِ خوشبو کو محسوس کرنا چاہتا

ہو جسے وہ اپنی بند آنکھوں میں چھپائے لیٹا تھا اور جس کا یوں وہ مسلسل نظارہ کر رہا تھا۔ اسے پھر ان تکلیف دہ رسوم ورواج پر غصّہ آنے لگا جو دُوسرے ہی دن بیوی کو میاں سے الگ کر دیتے ہیں۔ اُسے آج یہ بات بہت اچھی لگی کہ یورپ کے لوگ شادی کرتے ہی ایک مہینے کے لیے سب لوگوں سے دُور چلے جاتے ہیں تاکہ ہنی مون کا مہینہ بغیر کسی طرح کی مداخلت کے گزر رے۔ بستر اور بالشو کے نیچے میں بسی ہوئی خوشبو جہاں اس کے ذہن کو خوابوں کی دُنیا میں لے جاتی تھی وہاں مسلسل بانو کا خیال بھی پیدا کرتی تھی۔

اُس نے تھکن سی محسوس کی اور نیند کے انتظار نے تھکن کے احساس میں اضافہ کیا اس کا سر بھاری ہو گیا اور وہ بانو اور بانو کی خوشبو کے بارے میں سوچتا ہُوا کچھ دیر بعد سو ہی گیا۔

وہ سو گیا اور خواب دیکھنے لگا ——— ایک گھر ہے، چھوٹا سا گھر۔ خوشبوؤں سے مالا مال، سکون و راحت کا گہوارہ ——— وہ دفتر سے تھکا ہارا آیا ہے۔ سر میں گرانی ہے۔ وہ لیٹ جاتا ہے۔ بانو فکر مند سی نظر آتی ہے اور پاس آکر سر دبانے لگتی ہے۔ وہ اُس کے سرہانے پلنگ کے کونے پر بیٹھی ہے اور سر دباتے دباتے ذرا اور قریب ہو جاتی ہے۔ نور احمد کو بڑا آرام ملتا ہے اور اس پر نیم غنودگی کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ وہ خواب ہی خواب میں اس خیال سے خوش ہوتا ہے کہ بانو اتنی جلدی واپس آ گئی۔ خوشی سے اس پر نشہ سا طاری ہو جاتا ہے اور وہ بانو کے ہاتھ کی پُشت کو اپنی پیشانی ہی پر اپنے ہاتھ سے دباتا ہے اور کوئی محبت کی بات کہہ کر اس کے ہاتھ کو اپنے رُخساروں پر کھینچ لاتا ہے۔ بانو مزاحمت نہیں کرتی۔ وہ اسی طرح چارپائی پر سرہانے ایک کونے پر مگر اُس کے بہت قریب بیٹھی رہتی ہے۔ نور احمد اب اُس کے دُوسرے ہاتھ کے ساتھ بھی وُہی سلوک کرتا ہے جو پہلے ہاتھ کے ساتھ کر چکا ہے۔ پھر وہ اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں یوں ملا دیتا ہے جیسے دیو داسیاں اپنے دیوتاؤں کے حضور ملاتی ہیں۔ پھر وہ اُس کی اُنگلیوں کے پوروں کی حنا کو چُومتا ہے، ہاتھوں کی پُشت پر پیار کرتا ہے۔ کلائیوں پر اپنے رُخسار ملتا ہے اور پھر اُس کے ہونٹ بانو کی گردن پر جا پہونچتے ہیں۔ وہ اُس کی قمیص سرکا کر اُس کے شانوں پر بوسوں کی بارش کر دیتا ہے اور پھر بانو اس کی آغوش میں آگرتی ہے اور اس کا دماغ سو جاتا ہے، چُپ ہو جاتا ہے اور جسم پُوری طرح جاگ اُٹھتا ہے۔

(۱۰)

جلد ہی نُور احمد کے جسم کو نیند آ گئی اور اس کا دماغ جاگنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں ماحول کا جائزہ لینے لگیں جیسے جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب خواب تھا یا حقیقت۔ اُس کا ہاتھ خوشبو کے پیکر کو اپنے قریب پا رہا تھا اور اس کا جسم اسے اپنے جسم سے مس کرتا معلوم ہو رہا تھا۔

"بانو!" اُس نے آہستہ سے کہا۔ "تم آگئیں! تم! تم کب آئیں؟!"

"میں تو نہیں تھی۔ تمھارے پاس۔ میں تو کہیں بھی نہیں گئی ——— تمھیں یاد ہے، خوشبو کا پیکر ——— خوشبو کا پیکر ——— میں ہی تو ہوں وہ خوشبو کا پیکر ——— خوشبو کا پیکر۔ . . . . . ." اُس کے اپنے اندر سے آواز آئی۔

"اوہ! خوشبو کا پیکر!" اُس نے سوچا "خوشبو کا پیکر ——— تو یہ خواب ہی ہے ——— یہ خواب ہی ہے ———

میں خواب دیکھ رہا ہوں۔" اور اُس نے آنکھیں بند کرلیں لیکن قریب پڑے ہوئے جسم کے لمس اور اس کی گرمی کا احساس ایک حقیقی احساس کی صورت میں قائم رہا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اب اُسے یقین ہوگیا کہ وہ جاگ رہا ہے اور اُس نے تیزی سے گھوم کر اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی بانو کی طرف دیکھا اور اُس نے محسوس کیا کہ در و دیوار کانپ رہے ہیں۔ زیرو کا بلب بڑی تیزی کے ساتھ دُور اندھیرے میں چلا گیا اور دُور تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پھر وہ بہت دُور ایک ننھے سے ذرّے کی طرح نظر آنے لگا۔ اس اندھیرے میں اُس نے دیکھا کہ جہاں کمرے کی اکثر چیزیں نظر آنا بند ہوگئی تھیں اور ایک دم اندھیرے کے سمندر میں ڈوب گئی تھیں وہاں سامنے دیوار پر ایک روشن تحریر بڑی آب و تاب سے چمک رہی تھی

"یہ تم نے کیا کیا؟"

نور احمد کو حالات کی اجنبیت اور نزاکت کا احساس ہونے لگا تھا۔

"نور احمد، یہ تم نے کیا کیا؟" سرہانے۔ دائیں جانب رکھی ہوئی سنگار میز کے شیشے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" اندھیرے میں چھت نے جیسے نیچے اُتر کر سوال کیا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" خوشبو سے مہکتے ہوئے تکیے نے سرگوشی کی۔

"یہ کیا ہوگیا؟ کیسے ہوگیا؟" اُس نے سوچا اور چاہا کہ اُٹھ کر حالات کا جائزہ لے اور اُس دور جاتے ہوئے زیرو کے بلب کو، اس مدھم روشنی کے سرچشمے کو غائب ہونے سے پہلے روک لے، واپس لے آئے اور دیکھے کہ اس کمرے کو کیا ہوگیا ہے۔ مگر اس کے جسم میں اُٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ اس کا بستر گھوم رہا تھا اور دیواریں گھوم رہی تھیں اور چھت گھوم رہی تھی اور دماغ میں لال پیلی تحریریں گھوم رہی تھیں۔ "تو یہ خواب نہ تھا —— اوہ —— یہ کیا ہوا —— یہ میں نے کیا کیا —— یہ کیسے ہوگیا —— گناہ —— سزا —— موت —— جہنّم —— موت —— گناہ —— جہنّم —— گناہ —— خودکشی —— ذلّت —— خودکشی —— اوہ!"

اس کا سر چکراتا رہا اور اس کے سر کے ساتھ تمام چیزیں چکر کھاتی رہیں۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل کر دروازے کی جانب بڑھیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔ کان بھی آنکھوں کے پیچھے پیچھے گئے اور دروازے پر آ کر رُکے اور اندر ہی بیٹھ رہے اور آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا کہ باہر ایک مجمع کھڑا ہے اور قہقہے لگا رہا ہے عجیب عجیب آوازیں آرہی ہیں۔ لوگ مسلسل بول رہے ہیں! "ہاں —— یہی ہے —— یہی ہے —— نُور احمد یہی ہے —— ہاہاہا —— ہاہاہا —— یہ نور احمد ہے —— اس کا نام دیکھو اور اس کے کرتوت دیکھو —— یہ اس کو امّی جان کہا کرتا تھا —— امّی جان . . . . ہاہاہا . . . . ہاہاہا . . . . . ."

کانوں کے لیے یہ الفاظ ناقابلِ برداشت تھے اور آنکھوں میں گلی والے انبوہ سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہ تھا۔

پس آنکھیں واپس آگئیں اور پھر کان بھی واپس آگئے۔

نور احمد کے ہاتھ کبھی اپنی بند آنکھوں کی طرف اُٹھتے اور کبھی کانوں کی طرف لیکن بند آنکھیں مسلسل باہر کا منظر دیکھتی

رہیں اور کان، جن میں بعد میں نور احمد نے اُنگلیاں ٹھونس لی تھیں، باہر سے آنے والی ہر آواز کو اپنے بالکل قریب محسوس کرتے رہے۔ نور احمد نے بیزاری اور بے بسی کے عالم میں اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ تاریکی میں بھی وہ اُسے دیکھ سکتا تھا۔ ایک خیال آسمانی بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا اور اس کو جیسے ایک راستہ اس تاریکی میں باہر نکلنے کا نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ تیزی کے ساتھ پہلو میں آرام سے لیٹی ہوئی عورت کی گردن کی طرف اُٹھے لیکن گردن سے ایک اِنچ اِدھر رُک گئے اور پھر اسی تیزی سے واپس آ گئے۔

"نہیں نہیں ـــــ یہ ٹھیک نہیں ہے --- اس کو مار ڈالنے سے کیا ہو گا" اُس نے سوچا۔ اسے خود سے نفرت سی ہونے لگی اور اب اُس کے ہاتھ اس کی اپنی گردن کو مسلنے لگے "میں کیا کروں ـــــ کیا کروں ـــــ موت ہی بہتر ہے ـــــ مجھے مرجانا چاہیے" لیکن اس کے ہاتھوں میں نور احمد کو مارنے کی ہمت نہ تھی۔ یہ نور احمد ایک نئی نویلی دُلھن کی ملکیت تھا۔ "مگر اب کیا ہو گا ـــــ مجھے کیا کرنا چاہیئے ـــــ مجھے کیا کرنا چاہیے" یہ الفاظ اس کے ذہن میں یوں گھومنے لگے جیسے گراموفون کی سُوئی ریکارڈ کے ایک ہی دائرے پر گردش کرنے لگی ہو۔

اس کا دل ڈوبنے لگا اور جسم سرد پڑ گیا۔ وہ ڈرا ڈرا، سہما سہما بستر سے نکلا اور کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ اُسے وقت کے گزرنے یا نہ گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

"اُف! کس قدر تاریکی ہے" اُس نے ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا "یہ میری قبر ہے ـــــ روشنی دُور جا چکی ہے ـــــ وہ چمکتا ہوا ذرّہ، میرے کمرے کا مدّھم روشنی دینے والا بلب اتنی دُور کیوں چلا گیا ہے ـــــ میں دُنیا سے دُور کیوں چلا گیا ہوں ـــــ میں .... مگر یہاں اتنی سردی کیوں ہے؟ ...." اور اُس نے اپنے سردی سے کانپتے ہوئے جسم پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا "اوہ ـــــ تو لوگوں نے مجھے پورا کفن بھی نہیں دیا ـــــ اب میں کیا کروں .... کیا کروں .... اس حالت میں ـــــ"

"ساتھ والے کا کفن چرا لو" تاریکی میں کہیں سے ایک آواز آئی۔

"میں نے کبھی چوری نہیں کی ـــــ میں چور نہیں ہوں، میں بُرا آدمی نہیں ہوں" اس نے جواب دیا۔

"اچھا! تم بُرے آدمی نہیں ہو؟ اس واقعے کے بعد بھی یہ کہنے کی جرأت رکھتے ہو؟"

"میں ـــــ میں ـــــ میں نہیں جانتا ـــــ"

"ٹھیک ہے تم کچھ نہیں جانتے۔ سردی سے بچنا ہے تو میرا مشورہ مانو۔ یہ دیکھو تمھارے سامنے ایک اور لاش پڑی ہے نا ـــــ غالباً یہ لاش ہی ہے اور اگر لاش نہیں ہے تو اسے لاش بنانا ایسا کیا مشکل ہے۔ ایک عورت کے جسم کی گرمی ختم کرنا کچھ ایسا دُشوار کام بھی تو نہیں ـــــ بس اس کا کفن اُڑا لو ـــــ آگے بڑھو۔ ڈرو نہیں ...."

اور چند لمحوں کے لیے اُس کا جسم تن گیا۔ گردن اکڑ گئی اور ہاتھ سامنے اندھیرے میں ترازو ہو گئے۔ پھر اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا لیکن اگلے ہی لمحے دو قدم واپس آ گیا۔

"نہیں نہیں ——— یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا" اُس نے سوچا۔

"اچھا تو پھر کھڑے کانپتے رہو۔ تم ایسے بزدلوں کی یہی سزا ہے" اس آواز نے حقارت سے کہا۔ "جو شخص حالات کے مطابق خود کو نہیں ڈھالتا اور دوسروں کی حماقتوں سے فائدہ اُٹھانا نہیں جانتا وہ تمھاری طرح پریشان ہی رہتا ہے۔"

وہ دیر تک کھڑا کانپتا اور تاریک خلا میں گھورتا رہا۔

اچانک اُس نے محسوس کیا جیسے قبر کی چھت ہٹا دی گئی ہے اور آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں جن کی مدھم روشنی میں اندر کا منظر دھندلا سا نظر آ رہا ہے۔ پھر دائیں بائیں اور آگے پیچھے کی دیواریں بھی گر گئیں اور گلی کا مجمع اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس کے جسم میں اچانک چستی کی ایک لہر دوڑ گئی اور اُس نے تیزی سے بڑھ کر قریب کرسی پر پڑے ہوئے کمبل کو اُٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا اُس نے اپنا سر بھی کمبل میں چھپا لیا۔ پھر اُس کے چاروں طرف دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ چھت اپنی جگہ پر واپس آ گئی اور اُس کے جسم نے کانپنا بند کر دیا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے کمبل سے مُنہ نکالا اور اپنے ارد گرد دیکھا۔ سامنے دیوار پر زیرو کا بلب واپس آ چکا تھا۔ مدھم روشنی میں کمرے کی ہر چیز دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔ سامنے کلاک میں تین بج رہے تھے۔

اُس نے جسم میں طاقت عود کرتی محسوس کی۔ وہ آگے بڑھا۔ اُس نے بڑا بلب روشن کر دیا اور غور سے اس عورت کے چہرے کو دیکھنے لگا جو اس کے بستر میں بظاہر سکون سے محوِ خواب تھی۔

"یہ کون ہے؟ ——— یہ عورت کون ہے؟" وہ سوچنے لگا "یہ چہرہ کس کا ہے؟ یہ اس عورت کا چہرہ تو معلوم نہیں ہوتا جس نے رات مجھے بڑی شفقت سے کھانا کھلایا تھا ——— وہ ——— وہ تو اس سے مختلف تھی ——— یہ ایک ننگی عورت کا چہرہ ہے ——— ایک بے حیا بیسوا کا چہرہ ہے ——— ایک طوائف کا چہرہ ہے"۔ اُس نے کبھی کسی طوائف سے ملاقات تو نہ کی تھی لیکن سُننے اور پڑھنے سے جو علم حاصل ہوا تھا اس کی روشنی میں ——— اس علم کی مدھم روشنی میں ——— اس کا ذہن بھٹک رہا تھا اور بہت سی درست باتیں سوچ رہا تھا" یہ جنس کا چہرہ ہے ——— جنس کا جس کو رشتوں کا لحاظ نہیں ہوتا ——— اس چہرے کے دو رُوپ ہیں ——— اس کا اصلی رُوپ کونسا ہے ——— اگر یہی اس کا اصل رُوپ ہے تو . . . . کیا ہر عورت کے دو رُوپ ہوتے ہیں؟ ——— کیا بانو ——— کیا بانو بھی ——— اِس ہی نے تو اُس کو جنا ہے ——— اِس ہی نے تو اُس کو جنا ہے ——— اِس ہی نے تو اُس کو پالا ہے ——— مگر نہیں ——— نہیں ——— بانو تو بہت نیک ہے ——— وہ تو بہت اچھی ہے . . . . مجھے جرأت سے

کام لینا چاہیئے ——— جرأت سے ——— میں مرد ہوں ———"

اور پھر اُس کے ذہن میں ایک خوفناک خیال نے سر اُبھارا اور اُس کے ہاتھ اس عورت کی گردن کی طرف بڑھے لیکن اب پھر گردن سے ایک اِنچ اِدھر رُک گئے اور واپس آ گئے۔ اُس نے محسوس کیا جیسے اس چہرے کا ایک ایک نقش کہہ رہا ہو "تم مجھے نہیں مار سکتے ——— مجھے کوئی نہیں مار سکتا ——— وہ روپ جس کے لیے موت ہے وہ تو کب کا مر چکا ——— میں اپنے اصلی رُوپ میں تمہارے سامنے موجود ہوں ——— کوئی ہے جو اس رُوپ کو اصل تسلیم کرنے سے انکار کی جرأت رکھتا ہے ——— مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔ میں اُس وقت بھی زندہ تھی جب تم نہ تھے، میں اُس وقت بھی زندہ رہوں گی جب میں نہ ہوں گی ——— مجھے کون مار سکتا ہے ——— کیا تم مجھے نہیں پہچانتے ——— دیکھو میں کون ہوں ——— میں ——— بیگم مراد ——— بیگم وِلسن ——— بیگم ایشور سنگھ ——— بیگم مرلی دھر ——— میں یہ سب ہوں ——— میں جنس ہوں ——— کوئی مجھ سے میرا حق چھین سکتا ہے ——— اخلاقی ضابطے اور معاشرتی پابندیاں میرے لیے بے معنی ہیں ——— میں نے بڑی بڑی دیواروں کو گرا دیا ہے ——— تم کیا ہو ——— ایک کمزور تنکا ——— میں تمہاری کمزوری ہوں ——— میں تمہاری کمزوری کی سزا ہوں ——— میں ——— میں بیگم مراد ——— بیگم وِلسن ——— بیگم ایشور سنگھ ——— بیگم مرلی دھر ——— میں ——— میں ——— بیگم نور احمد ——— بیگم نُور احمد ——— بیگم نُور احمد ———"

اور اُس نے محسوس کیا جیسے پھر گراموفون ریکارڈ کی سوئی ایک ہی دائرے پر گھومنے لگی ہو۔

"نہیں نہیں ———" وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخا اور بیگم مُراد نے آنکھیں کھول دیں اور نور احمد خود کو ایک طُوفان کے مقابل کھڑا محسوس کرنے لگا۔ وہ مُسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں فاتحانہ غرور تھا۔ "یقیناً عورت کا یہی رُوپ ہے جس نے ہر زمانے میں مرد کو زیر کیا ہے"۔ نور احمد نے سوچا، وہ اس عورت کی فاتحانہ شانِ بے اعتنائی سے مُسکراتی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور بھاگ کر دُوسرے کمرے میں داخل ہو گیا اور اندر سے کنڈی چڑھا کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔

بیگم مُراد بھی چند لمحے مسکراتی اور سوچتی رہی۔ پھر وہ لباس درست کرتی اُٹھی۔ زیرو کے بلب کو اُس نے بجھا دیا اور معنی خیز انداز سے کہا "اب زیرو کے بلب کی ضرورت نہیں رہی"۔ پھر وہ بانو کی سنگار میز کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے ایک انگڑائی لی اور بازوؤں جھٹکے کے ساتھ پھیلائے جیسے تمام غم و فکر اُتار کر پھینک دیے ہوں۔ وہ چند لمحے آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھتی رہی پھر بیچ والے دروازے کے قریب آئی اور ایک آرام کُرسی پر بیٹھ گئی۔

دروازے کے اُدھر نُور احمد فرش پر بیٹھا کراہ رہا تھا۔ جیسے کسی کرب میں مُبتلا ہو۔ بیگم مُراد نے دروازے کو ذرا سا چھیڑا اور پاؤں سے ہلکی سی آہٹ پیدا کی اور نور احمد دم بخود ہو کر سوچنے لگا " وہی آہٹ ——— بالکل وہی ———"

"نور احمد" ——— بیگم مُراد نے کہا ۔" جو ہونا تھا ہو چکا ۔ اب پریشان ہونے کی بجائے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرو ۔"

اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا تو بیگم مُراد نے پھر کہا ۔" نور احمد میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ تم اس قدر پریشان کیوں ہو ۔ یہ واقعہ اگر کسی پریشانی کا سبب ہو سکتا ہے تو صرف میرے لیے ہے ——— لیکن مَیں پریشان نہیں ہوں ——— میں نادم بھی نہیں ہوں ۔"

ان الفاظ سے نُور احمد کو یہ اطمینان تو ہو گیا کہ وہ تنہا قصوروار نہیں ہے اور اس کا یہ خدشہ بھی جاتا رہا کہ یہ عورت جاگ کر نہ جانے کیا اُودھم مچائے گی لیکن وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ دُنیا کے سامنے جا سکے ——— اس دُنیا کے سامنے جو باہر گلی سے شروع ہوتی تھی اور پھر جس کا کوئی دُوسرا کنارہ نہ تھا ۔

دِل سے ایک خوف کم ہوا تو اس کی جگہ شدید نفرت نے لے لی ۔

" نور احمد کیا تم سو گئے ہو ؟" بیگم مُراد نے سوال کیا ۔

" اس جاگنے سے بہتر تھا کہ میں سویا رہتا ——— آپ نے مجھ پر ظلم کیا ہے ——— میں گُناہ کے احساس سے مر جاؤں گا ———"

" نہ میں نے کوئی ظلم کیا ہے اور نہ تم نے کوئی گناہ ———"

"جی !؟"

"تم نے کوئی گُناہ نہیں کیا ——— تُم نے ایک ایسے شخص کی پیاس بُجھائی ہے جو کوسوں پیدل چل کر تمھارے پاس آیا تھا ——— ایسے لوگوں کا درجہ فرشتوں کے برابر ہوتا ہے ۔"

" یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ۔" نُور احمد چکرا گیا ۔ اسے توقع تھی ایک طُوفان کی ۔ مگر یہاں طُوفان سے دُور ساحل پر ایک پُرسکون ہوا سے سامنا تھا ۔

" ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں ۔" پُرسکون آواز آئی ۔

" مگر ——— آپ نے ——— آپ نے بانو سے میری شادی کی ہے ——— اور وہ آپ کی بیٹی ہے ۔"

" عورت اتنی بڑی قُربانی بہت کم دیتی ہے ۔"

" قُربانی !؟؟؟"

" ہاں ——— قُربانی ——— کیا تم نہیں سمجھتے ——— یا جان بُوجھ کر انجان بن رہے ہو ؟"

" آپ نے اپنے علاوہ بانو پر، مجھ پر اور مُراد میاں پر، سب پر ظلم کیا ہے ——— آپ ہم سب کی گُناہ گار ہیں ۔ آپ خدا کی گُنہ گار ہیں ——— آپ نے مُراد صاحب ایسے فرشتہ آدمی سے دغا کی ہے !"

" مُراد صاحب اور فرشتہ ؟" بیگم مُراد کی آواز ایک دم طنزیہ ہو گئی اور اُس نے ایک نفرت بھرا مختصر سا قہقہہ لگایا

ـــــ "ہاں، کہتے تو ٹھیک ہو۔ جو شخص مرد ہو کر کبھی مردوں والا کام نہ کرے وہ فرشتہ ہی ہو سکتا ہے ــــ تم نے ان کو باہر سے دیکھا ہے اور میں ان کو اندر سے جانتی ہوں۔ تم سوچ رہے ہو گے مجھے کیا ہوا ہے ــــ تم نہیں جانتے لیکن میرے گھر کی دیواریں جانتی ہیں مجھے کیا ہوا ہے ــــ اور اب تو شاید تم بھی جان گئے ہو گے ــــ اور سمجھ گئے ہو گے کہ آدمی کا وقار آدمی بننے میں ہے نہ کہ فرشتہ بننے میں ــــ تمھاری طرح فرشتہ بننا اور بات ہے تم نے تو گویا غیبی سہارا دیا ہے ــــ"

"آہ! آپ کس قدر خود غرض ہیں ــــ آپ نے مجھے جہنم کی آگ میں جھونک دیا۔ حالانکہ میرا کوئی قصور نہ تھا ــــ آپ نے مراد میاں اور بانو کے حقوق غصب کیے ــــ میں ذہنی پریشانی میں پھنس گیا ہوں حالانکہ میرا کوئی قصور نہ تھا۔ کوئی قصور نہ تھا ــــ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

"تمھارا کوئی قصور نہیں؟؟ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" بیگم مراد نے پینترا بدلا۔ "سب قصور تمھارا ہے۔ ایسے معاملات میں قصور ہمیشہ مرد ہی کا ہوتا ہے۔ میں نے تو صرف یہ دیکھا کہ تم تھکے تھکے سے ہو اور میں تمھارا سر دبانے لگی مگر تم نے میرے ہاتھ کو پہلے ذرا سا دبایا پھر اپنی جانب کھینچ لیا۔ میں نے کچھ نہ کہا اور دوسرے ہاتھ سے تمھارا سر دباتی رہی مگر تم نے اس ہاتھ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ پھر تم نے میرے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو یوں آپس میں ملا دیا جیسے میں کسی دیوتا کے حضور میں کھڑی ہوں ــــ آخر تم نے خود کو کیا سمجھا تھا ــــ تم نے میری حیثیت اور میرے رتبے اور میرے رشتے کی پروا نہ کرتے ہوئے میری انگلیوں کو چوما، میری کلائیوں پر اپنے گال رگڑے، میری گردن اور شانوں پر بوسوں کی بارش کر دی ــــ پھر تم نے مجھے پوری کی پوری کو اپنی طرف کھینچ لیا ...... پھر تم نے ...... پھر تم نے تمام حدوں کو توڑ دیا ...... اور اب بھی تم کہتے ہو کہ تمھارا کوئی قصور نہیں!"

"بس بس ــــ شیطان صفت عورت، میں اپنی ذلت کا بدلہ تجھ سے ضرور لوں گا۔" نور احمد نے چیخ کر کہا اور غصے سے دروازے کی کنڈی کھول کر زوردار جھٹکے کے ساتھ دروازے کو کھولنا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایسا کر سکے بیگم مراد نے انتہائی پھرتی اور چالاکی سے اپنی جانب کی کنڈی چڑھا دی۔

دروازے کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ بیگم مراد کا ہلکا سا قہقہہ بھی اس کو سنائی دیا اور وہ غصے میں بولتا رہا "اخلاق باختہ عورت تو ایک روز ضرور اپنی سزا پائے گی ...."

"یہ اخلاق و خلاق کی باتیں میں نہیں جانتی ــــ ویسے تمھیں بھی یہ باتیں کچھ ایسی زیب نہیں دیتیں۔ میں اخلاق باختہ تھی تو تمھیں کیا ہوا تھا ــــ غور سے سنو، یوں پریشان ہونا فضول ہے۔ اگر میں ابھی شور مچا دوں تو جانتے ہو تمھارا کیا حشر ہو گا ــــ آرام سے لیٹ جاؤ اور زندگی سے سمجھوتا کرنا سیکھو۔"

یہ کہہ کر بیگم مراد واپس بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

اس نے بستر کو لپیٹ دیا۔ کنڈی چڑھانے کا ہوش بھی نہ رہا۔ وہ بستر کی طرف گھوما مگر اس کے قریب رک کر سوچنے

لگا "یہ بستر بھی پلید ہے ——— اس پر کل رات اور آج رات شروع کے حصہ میں ایک شیطان صفت عورت کا قبضہ تھا ——— میں اس بستر پر نہیں سو سکتا۔ یہ جہنّم کی آگ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے ———"

اس نے بستر کو لپیٹ دیا اور کمبل ہی میں لپٹ لپٹا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ یہ اس کا پرانا پہلی شادی والا صوفہ تھا جو نیا سامان آنے پر اس کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے ذہن کا گرداب وقفوں سے زندہ ہو جاتا تھا اور بیگم مُراد کے الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہے تھے "تم نے ان کو باہر سے دیکھا ہے۔ میں انھیں اندر سے جانتی ہوں . . . . . . میرا بستر جانتا ہے کہ مجھے کیا ہوا ہے ! . . . . مُراد اور فرشتہ ! . . . . آرام سے لیٹ جاؤ اور زندگی سے سمجھوتہ کرنا سیکھو . . . . سمجھوتہ کرنا سیکھو . . . . سمجھوتہ . . . . . . سمجھوتہ سمجھوتہ . . . ."

اذیت ناک خیالات میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ ان میں یوں اور اضافہ ہوا کہ یہ ایکبارگی وہ تمام ناخوشگوار باتیں بھی اس کے ذہن میں اُبھر آئیں جو اُس نے اس عورت کے بارے میں سُنی تھیں اور جن پر اُس نے کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ وہ سوچنے لگا "تو یہ سب کچھ سچ ہے . . . . تو کیا اس کے چاروں بچوں میں سے کوئی بھی مراد میاں سے نہیں ہے . . . . اور مراد میاں واقعی ——— واقعی بے بس ہیں، مجبور ہیں . . . . مگر وہ سب کچھ کیسے برداشت کرتے رہے . . . . جانتے بُوجھتے وہ اس آرام اور خاموشی کیسے زندگی گزار رہے ہیں . . . . کیا اُنھوں نے بھی زندگی سے کوئی سمجھوتہ کر رکھا ہے ——— سمجھوتہ . . . . . . کیا واقعی سمجھوتہ کرنا ضروری ہے . . . . مگر اُنھوں نے شادی ہی کیوں کی . . . . یہ ظُلم ہی کیوں کیا . . . . اور اب ظُلم کے دریا کے راستے میں میرا چھوٹا سا گھر کیوں آگیا ——— میرا کیا قصور تھا . . . . مُراد میاں کو اس جُرم کی سزا ملنا سمجھ میں آسکتا ہے کہ اُنھوں نے ایک عورت پر ظلم کیا . . . . لیکن میرا کیا قصور تھا ! میرا کیا قصور تھا ——— کیا نیکی کا یہی صلہ ہوتا ہے . . . . . کیا فطرت واقعی اندھی ہے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں . . . . اوہ !"

اس کا سر درد کرنے لگا تھا۔ اُس نے سر کو گھٹنوں میں زور سے دبایا اور دونو ہاتھوں سے سر کی پُشت کو اپنی پُوری طاقت سے سہلانے لگا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک اور خوفناک خیال نے سر اُٹھایا۔

"بانو کا باپ کون ہے ؟؟؟"

اور اس کے سر میں تیز و تند آندھیاں سی چلنے لگیں۔

یہ سوال سخت تکلیف دہ تھا۔ بانو ایسے شخص کو باپ سمجھے ہوئے تھی جس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پہلے تو نُور احمد کو یہ اطمینان تھا کہ اکثر لوگ جھُوٹ بولتے ہیں بالخصوص عورتوں کے سلسلہ میں رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں لیکن اب تو سب پردے اُٹھ گئے تھے اور عریاں، بدشکل، کریہہ المنظر حقیقت سامنے کھڑی اس کا مُنہ چڑا رہی تھی۔ اس کی

شرافت پر ہنس رہی تھی اور تکلیف دہ خیالات تھے کہ اُمڈے ہی چلے آتے تھے "ہمارے بچّے ہوں گے ——— وہ مُراد صاحب کو ہی نانا کہیں گے ——— میں انھیں اصل حقیقت کیسے بتا سکوں گا ——— کیا میں بانو کو بتا سکوں گا کہ اُس کا مُراد سے کوئی تعلق نہیں اور اُس کی ماں آوارہ عورت ہے جس نے بیگم مراد نام کی ایک نقاب اوڑھ رکھی ہے۔ ابھی شاید اُس کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ وہ ابھی بالکل معصوم معلوم ہوتی ہے۔ کیا یہ اطلاعات اس کی زندگی کو زہر آلود کر دیں گی ——— کیا میں اس کو ——— ؟ . . . . . . نہیں نہیں میں اُسے چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا اُس کا کیا قصور ہے ——— تو پھر کیا خاموش ہی رہنا پڑے گا ——— کیا ضمیر کو مار ڈالوں ——— حقائق سے سمجھوتہ کر لوں کیا مجھے واقعی یہ سمجھوتہ کر لینا پڑے گا ———"

اُس نے سر کو کئی بار جھٹکے دیے اور اسے دونو ہاتھوں میں یوں تھام لیا جیسے کوئی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے رہا ہو۔ دماغ میں ایک گرداب تھا ——— ایک طوفان تھا ——— ایک شور تھا کہ تھمنے کا نام نہ لیتا تھا ——— ریل گاڑیاں، جہاز، سڑک کوٹنے کے انجن اس کے سر میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے اور سر تھا کہ سلامت تھا۔

اور وہ سوچ رہا تھا "بانو بہت اچھی ہے۔ بہت نیک ہے ——— وہ تو ان تلخ حقائق سے واقف ہی نہیں ہے۔ میں اُس سے یہ راز چھپائے رکھوں گا ——— میں اس کی زندگی کو تلخ نہ ہونے دوں گا ——— سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں۔ سب مرد بھی تو ایک سے نہیں ہوتے۔ مجھے اس سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں ——— مجھے اس کی حفاظت کرنا چاہیئے ——— وہ میری ہے ——— وہ مُراد علی کو باپ سمجھتی ہے ——— سمجھتی رہے ——— کیا فرق پڑتا ہے ——— کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

اُس نے اطمینان کا ایک مختصر سا سانس لیا ہی تھا کہ پھر اذیّت ناک خیالات کا ایک ریلا آیا۔ "مگر لوگ ——— لوگ تو بہت کچھ جانتے ہیں ——— ایک نہ ایک دن بانو کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا ——— پھر ——— پھر کیا ہو گا ؟ ——— لوگ بہت ظالم ہوتے ہیں ——— تکلیف پہنچا کر تماشہ دیکھتے ہیں۔ علیحدگی ہی بہتر ہے کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جائے گا ——— اور اگر اُس کے ہاں میرا بچّہ ہو گیا تو ——— اور اگر بچّی ہو گئی تو ؟ ——— تو کیا ہو گا ؟ ——— اس کی پرورش اُسی گھر میں ہو گی . . . . نہیں نہیں ——— وہ میرے پاس رہیں گے ——— میں ان کا محافظ ہوں ———"

انہی خیالات میں غلطاں وہ کچھ دیر کے لیے سو گیا اور جب اُس کی آنکھ کھلی اُس وقت روشندانوں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ روشندان سے صُبح کے سورج کی پہلی کرنیں سامنے پلنگ پر گول لپٹے ہوئے بستر پر پڑ رہی تھیں۔ رات کے واقعات اُسے خاصی دُور اُفتادہ شے معلوم ہونے لگے لیکن یہ احساس زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا تاہم روشنی میں وہ خود کو کچھ باحوصلہ ضرور پا رہا تھا۔ اُس نے بیچ کے دروازے کی جانب نفرت اور بے چارگی سے دیکھا اور پھر لباس میں بغنوڑ اسارڈو بدل کرکے کمرے کا گلی والا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ دُوسرے کمرے میں موجود عورت بھی جاگ

چکی تھی اور اس کی توجہ برابر ادھر لگی تھی۔ اس کو معلوم ہو گیا کہ نور احمد گلی میں نکل گیا ہے۔ وہ بھاگم بھاگ چھت پر پہونچی اور دیوار کے جنگلے سے اسے جاتا دیکھنے لگی۔ وہ گلی سے گزر کر سڑک پر پہنچا اور پھر دائیں جانب گھوم کر غائب ہو گیا جیسے مکانوں اور دوکانوں کی دیواریں اسے ایکدم نگل گئی ہوں۔ اُس نے رُخ پھیرے بغیر زیرِ لب کہا:

" نورُ احمد اگر تم بانو کے باپ کے بارے میں پریشان ہو تو میں تمھیں بتا دینا چاہتی ہوں ——— میں تمھیں بتا دوں گی کہ شبیر علی اس کا باپ نہیں ہے۔"

وہ کمرے میں واپس آئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپا کا نظارہ کرنے لگی۔

"گناہ!" اُس نے آہستہ سے کہا۔ "ہونہہ گناہ!" وہ مسکرادی۔ "بیوقوف ناشکرا!"

اُس نے دیکھا آئینے میں وہ تنہا نہیں تھی۔ اُس کے پیچھے ایک قطار میں چار مرد کھڑے تھے مُراد علی، افتخار علی (یہ نام آج اُسے کتنے ہی برس بعد یاد آیا تھا) شبیر علی، اور نورُ احمد، اور وہ سوچنے لگی۔ "مذہب نے اجازت دی ہے کہ اگر بیوی مستقل بیمار رہے یا کوئی اور جائز وجہ ہو تو مرد اور شادی کر سکتا ہے ——— چار تک اجازت ہے ——— !" اور وُہ اپنے پیچھے کھڑے ہوئے چار آدمیوں کو دیکھ کر اور زیادہ مسکرائی۔

وہ پلٹی تو سامنے مینٹل پیس پر رکھی ہُوئی نورُ احمد کی تصویر پر اس کی نظر جا پڑی۔ اُس نے آگے بڑھ کر اُس کو اُٹھایا۔ چند لمحے اُسے غور سے دیکھ کر مسکراتی رہی پھر اُس کے چہرے پر ایکدم سنجیدگی کا بادل چھا گیا اور اُس نے تصویر کو زور سے سنگار میز کے شیشے پر دے مارا۔

اس ایک واقعے سے قطع نظر بیگم مُراد کو اس صُبح نے بالکل ویسا ہی پایا جیسی وہ عام طور پر نظر آتی تھی۔ اُس نے اطمینان سے نہا دھو کر ناشتہ کیا اور پھر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خود بازار جا کر ایک آدمی کو بُلا لائی جس نے سنگار میز اور نُور احمد کی تصویر کے ٹوٹے ہوئے شیشے اُٹھا کر ان کی جگہ نئے شیشے لگا دیے اور پھر اس گھر کو مقفل کیا اور اپنے گھر کی طرف چل دی۔

وُہ جانتی تھی کہ نور احمد فوری طور پر اس کے گھر نہیں آئے گا، اس لیے اُس نے آتے ہی کہہ دیا کہ افسران نے اُس کی چُھٹی منسوخ کر دی ہے اور کسی ضروری کام کے سلسلہ میں چند روز کے لیے فوری طور پر باہر بھیج دیا ہے ——— یہ کوئی تسلّی بخش بات نہ تھی لیکن اس بات کو اُلٹنا اس گھر میں ممکن نہ تھا۔ بانو کو دفتر والوں کی یہ سختی بہت بُری لگی لیکن وُہ کُچھ نہ کر سکتی تھی۔

—(۱۱)—

نُور احمد کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کرے۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ان جگہوں سے دُور رہے جہاں اُس کے دوستوں اور واقفوں کے ملنے کے امکانات زیادہ تھے۔ رات وہ ایک گمنام سے ہوٹل میں جا رہا۔ وہ گھر سے دُور چلا گیا تھا مگر اذیت ناک خیالات نے اس کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ ایک وفادار کُتّے کی طرح اُس کی خُوشبو سونگھتے اس کے تعاقب میں

چلے آئے تھے۔

وُہ یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا کہ کسی مولوی سے فتویٰ لے یا دوستوں سے مشورہ کرے۔ ہر طرح بات پھیلنے اور بدنامی کا خدشہ تھا۔ اِسی اُدھیڑبُن میں دو دن گزر گئے۔ دوست اس کی اچانک گمشدگی پر حیران تھے۔ مُراد میاں کے ہاں سے خاطر خواہ جواب نہ پاکر اُنھوں نے دفتر سے بھی پتہ کیا لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ دوست محمد کی اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دوست محمد اپنے کسی عزیز سے ملنے جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے نُور احمد نظر آ گیا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا اور زرد تھا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے کا ایک ایک نقش اذیت کا اشتہار تھا۔ دوست محمد نے محسوس کیا کہ وہ اس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتا ہے اس لیے وہ زیادہ تیز، مُستعد اور مُحتاط ہو گیا اور اس تک جا ہی پہونچا۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب نُور احمد کو اپنے ساتھ لیے بغیر واپس نہ ہو گا۔

اُس کے مجبور کرنے پر نُور احمد نے بہزار دِقّت اور بہت تامّل کے بعد تمام حالات اس کو سُنائے۔ کچھ دیر تو دوست محمد کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ آخر اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ مولوی حمید سے بات کی جائے۔ وُہ جانتا تھا کہ بات پھیلے گی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کو پھیلنے سے روکنے پر بھی کوئی قادر نہیں۔

وہ حمید کی بیٹھک پر پہونچے اور چق اُٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ وہاں حمید کے علاوہ اختر راٹھور اور حیدر گنجا بھی موجود تھے۔ دوست محمد نے نُور احمد کو ان کے سپرد کیا اور خود چائے کا آرڈر دینے کے لیے ہوٹل کی طرف چل دیا۔

اُس کے باہر نکلتے ہی سب لوگ نُور احمد پر پل پڑے۔

"ارے تو کہاں تھا، اتنے دنوں سے ہے؟"

"کیا شکل بنا لی ہے!"

"واہ رے میرے قیس عامری ——— یہ تجھے کیا ہوا ہے۔ یہ دوست محمد تجھے کس دشتِ جنوں سے پکڑ لایا۔"

"اسے کچھ نہ کہو بے چارے کی بیوی بھاگ گئی ہے"۔ حیدر گنجے نے مصنوعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اور اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہیں!؟ کب!؟ کیوں!؟ کس کے ساتھ!؟ تو نے پہلے کیوں نہ بتایا؟" ان سب آوازوں سے مِل کر بنی ہوئی ایک آواز اُبھری۔

"پہلے کیا بتاتا" حیدر نے وضاحت کی "مجھے خُود ابھی ابھی خیال آیا ہے ——— مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں" حیدر نے لُطف لیتے ہوئے کہا "وہ ذرا میکے گئی ہے اپنی ماں کے ساتھ"

اور سب قہقہے لگانے لگے مگر نُور احمد افسردہ اور خاموش بیٹھا رہا۔

"کوئی کہہ سکتا ہے کہ تیری شادی کو صرف چار روز ہوئے ہیں ۔ اپنی صورت تو دیکھ ۔ مہینوں کا بیمار لگتا ہے ۔ سبھی کی بیویاں شادی کے فوراً بعد میکے جاتی ہیں ۔ تیرے ساتھ کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی ۔ آخر تو سنیاس لینے پر کیوں آمادہ ہے ؟" اختر راٹھور نے کہا

"تجھے کیا پریشانی ہے ؟" حیدر گنجے نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ۔ "کون تیرے راستے میں آیا ہے تو اشارہ کر دے باقی ہم خود سمجھ لیں گے ۔ تو اپنی مشکل ایک بار ہم سے کہہ تو دے تو پھر دیکھ یاروں کے حوصلے ——— کچھ بول تو سہی ——— بول کہ تھوڑا وقت بہت ہے ——— بول"

نور احمد خاموش رہا ۔

"اسے کچھ بکے گا بھی !" اختر راٹھور چلایا ۔

نور احمد پھر خاموش رہا ۔

اچانک مولوی حمید کے بستر میں پڑے ہوئے لحاف میں زلزلہ آیا اور اندر سے کسی نے یا علی کا نعرہ لگا کر کہا ———

دیکھ اب اے اختر راٹھوڑ
پھر سے ماتھا مت پھوڑ

اور پھر سب قہقہے لگانے لگے ۔ یہ عاشق مزنگی تھا جسے سردی کچھ زیادہ ہی لگتی تھی اور جو آتے ہی مولوی حمید کے بستر پر قبضہ جما لیتا تھا ۔ اگر کبھی مولوی حمید بستر میں ہوتا تو بھی وہ بے دھڑک گھستا ہی چلا جاتا یہاں تک کہ مولوی حمید بستر چھوڑ کر ایک کمبل میں لپٹ لپٹا کر آرام کرسی پر جا بیٹھنے پر مجبور ہو جاتا ۔ وہ اس اونٹ کی طرح تھا جو سر چھپانے کی جگہ مانگ کر پورے خیمے پر قابض ہو گیا تھا ۔ وہ مولوی حمید، اختر، نور احمد اور دوست محمد کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا مگر چوتھی جماعت سے ہی بھاگ نکلا تھا ۔ پرانی دوستی پر وہ جان دیتا تھا ۔ یہ کسی کے بس میں نہ تھا کہ اس پر کوئی پابندی لگا سکے ۔

عاشق مزنگی کو وہاں پا کر نور احمد کو بہت دکھ ہوا ۔ وہ اس کی بے ہودگی سے ہمیشہ نالاں رہا تھا اور اس وقت اس کی موجودگی اسے جرم کی تشہیر کا یقینی اور مکمل سامان معلوم ہو رہی تھی ۔

نور احمد کی خاموشی اب پریشانی کا سبب بنتی جا رہی تھی ۔ سب کو خیال ہونے لگا تھا کہ ضرور کوئی خطرناک بات ہے ۔ چنانچہ مولوی حمید نے اسے شانے سے جھنجھوڑ کر کہا ۔ "تو بولتا کیوں نہیں ——— آخر ماجرا کیا ہے ۔"

"ارے بھئی یہ کیا بولے گا ۔" لحاف میں پھر زلزلہ آیا ۔ "ہم سے پوچھو، سالا نامرد ہے ——— ورنہ عورت کی مجال ہے کہ شادی کے دو روز بعد بھاگ جائے اور پھر خود سے واپس نہ آئے !"

اب کے ایک بے جان سا قہقہہ بلند ہوا ۔ ایسے لگتا تھا جیسے صرف ماحول کو ٹھیک کرنے اور پریشانی

سے بچنے کے لیے یہ قہقہہ لگایا گیا ہو۔

عاشق مزنگی کے الفاظ نے نورُ احمد سے برداشت کی قوّت چھین لی۔ اس کا چہرہ ایکدم زرد پڑ گیا۔ پھر اُسے اتنی ہی تیزی سے غصّہ آیا اور چہرے پر آگ سی پھیل گئی اور وہ بلند آواز سے چیخا ———

"بکواس مت کرو۔"

اس کی آواز میں دُکھ تھا۔ چند لمحے وہ فرش کی طرف دیکھ کر کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ مولوی حمید فوراً راستے میں آکھڑا ہوا اور اُسے پھر اپنی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔

"لو دوستو توڑ دی ہے اس کی چپ ——— سالا بڑا اکڑتا تھا ——— وہ کون سا کام ہے جو ہم نہ کر سکیں ———" عاشق مزنگی نے بڑے فخر سے کہا اور پھر زیر لب بڑبڑایا "کتابوں کی بات دُوسری ہے ——— پڑھنا لکھنا بھی کوئی کام ہے!"

مولوی حمید نے اب سمجھانے کے انداز میں گفتگو شروع کی "دیکھو بھائی تمھاری پریشانی سے ہم بھی پریشان ہیں۔ جب تک تم اپنے حالات ہم پر واضح نہیں کرو گے یہ لوگ اسی طرح تمھیں پریشان کرتے رہیں گے۔"

"اگر تمھیں واقعی کوئی ایسی ویسی بیماری تھی تو شادی سے پہلے ہی کہہ ڈالتے۔" حیدر نے ایک آنکھ بند کر کے اپنے گنجے سر کو شرارت سے کھجاتے اور اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی بیماری نہیں ہے ——— تم سب پاگل ہو گئے ہو۔" نورُ احمد نے دُکھ سے کہا۔

"تو وہ کیوں بھاگ گئی تیری ماں؟" عاشق مزنگی نے ایک اور رندوقی داغی۔

نورُ احمد کا جی چاہا کہ اُٹھ کر عاشق مزنگی کا گلا دبا دے۔

"میں تمھیں مار ڈالوں گا حرامزادے۔" اس نے غصّے سے کہا اور ہاتھ ہوا میں اُٹھا کر پلنگ کی طرف بڑھا۔

"باپ رے باپ ——— اس کے سر پر تو خون سوار ہے ——— بچاؤ بھئی بچاؤ ———"

عاشق مزنگی نے لحاف کو اچھی طرح مضبوطی سے اپنے سارے جسم کے گرد لپیٹ کر شرارت سے کہا۔

نورُ احمد پلنگ کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ سامنے ریشمی لحاف سے سر باہر نکالے بیگم مُراد لیٹی تھی . . . . . اس کا سر چکرانے لگا۔ اب ذہن ایک زبردست گرداب کی گرفت میں تھا "تم مجھے نہیں مار سکتے ——— مجھے کون مار سکتا ہے ——— مجھے کوئی نہیں مار سکتا . . . . زندگی سے سمجھوتا کرنا سیکھو ——— سمجھوتہ . . . . ہاہاہا ——— وہ اسے امی جان کہا کرتا تھا . . . . اور اب بھی تم کہتے ہو کہ تمھارا کوئی قصور نہیں . . . . تو وہ کیوں بھاگ گئی تیری ماں . . . . تیری ماں . . . . ہاہا . . . . وہ اسے امّی جان کہا کرتا تھا . . . . مجھے کوئی نہیں مار سکتا . . . ."

قریب تھا کہ نورُ احمد چکرا کر گر جاتا کہ اختر راٹھوڑ نے اُٹھ کر اس کو سنبھالا اور واپس لا بٹھایا۔ عین اس وقت

دوست محمد داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ ہوٹل کا مُلازم تھا جو چائے رکھ کر چلا گیا۔ دوست محمد نے گفتگو کا آخری حصہ سُن لیا تھا اور اب نُور احمد کی شکل دیکھ کر اُس نے اندازہ کر لیا کہ اُسے بہت دِق کیا گیا ہے چُنانچہ اسے مزید پریشانی سے محفوظ رکھنے اور اصل پریشانی کا حل تلاش کرنے کی غرض سے اُس نے مختصراً سارا واقعہ سُنا دیا جسے سُن کر حمید رنجیدہ ہوگئے۔ میز پر لخت کُھلی ہونے لگی اور کمرے میں ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ سب کو ایک دُوسرے کی سانسوں کی آواز قریب چلتی ہوئی آندھی کی طرح معلوم دیتی تھی۔

"کیا یہ سب سچ ہے ؟" مولوی حمید نے حیرانی سے پُوچھا۔ "ہم سب تمھیں نیک فرشتہ سمجھتے تھے۔ مجھے تم سے یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ نُور احمد تم نے بہت بُرا کیا۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا ——— میں نہیں جانتا یہ کیسے ہو گیا ——— میرا کوئی قصور نہیں۔" نور احمد نے عاجزی سے کہا ——

"کچھ کرنا اور کسے کہتے ہیں۔" مولوی حمید نے برہمی سے کہا۔ "ہر گنہ گار اور ہر مُجرم یہی کہتا ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ تم چاہتے تو خود کو بے قابو نہ ہونے دیتے۔"

نُور احمد کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کا چہرہ صاف کہہ رہا تھا۔ "کاش میں یہاں نہ آتا۔"

"اِس بحث سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" دوست محمد نے کہا۔ "حمید تم کچھ زیادہ ہی کٹّرپن کا ثبوت دے رہے ہو اس معاملے میں تو زلیخا ایسے نام ———"

"بس ——— رہنے دو ——— نیک لوگوں کے ناموں کو اس معاملہ میں نہ لاؤ۔" مولوی حمید نے احتجاج کیا۔

"تمھارے اس غلط احتجاج پر تو یہ ذکر اور ضروری ہو گیا ہے۔ تمھیں سُننا ہی پڑے گا۔ تم جانتے ہو کہ زلیخا نے کیا کیا اور یہ جانتے ہو کہ خدا نے اُسے معاف کر دیا ——— تم یہ بھی جانتے ہو کہ نور احمد نے دانستہ غلطی نہیں کی اور اس کے باوجود اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے اور دُکھ پہونچا رہے ہو۔ میں اس کو یہاں اس لیے لایا تھا کہ سب مِل کر اُسے اس مصیبت سے نجات دلائیں ——— تم دیکھتے نہیں وہ کس قدر شرمندہ ہے، کتنا نادم ہے ———" دوست محمد نے بڑے اعتماد سے کہا۔

ان الفاظ کا حمید پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کس قسم کی عورت ہے ؟ یہ کیسی ماں ہے ؟ یہ عورت ہے یا ڈائن ؟ مائیں ایسی نہیں ہوتیں۔"

"دُنیا میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔" دوست محمد نے سمجھانا چاہا۔ "آئے دن اخباروں میں ایسی خبریں آتی رہتی ہیں کہ کوئی عورت چھ بچوں کو چھوڑ کر آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی اور کسی نے آشنا کی مدد سے خاوند کو مروا دیا اور چار بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اس مسئلے پر بحث کا وقت نہیں ہے کہ کوئی ماں ایسی ہو سکتی ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت

ایک ماں ہے جو ایسی ہی ہے اور ایک دوست ہے جو بے قصور ہے اور یہ واضح ہے کہ ان حالات میں بانو کا اپنی ماں کے پاس رہنا درست نہیں ہے۔"

"گناہ بہرحال گناہ ہے" مولوی حمید نے قدرے نرمی سے کہا۔" اور گناہ گار کی رعایت کرنا بھی گناہ ہے ـــــ میں کہتا ہوں اگر مُراد میاں کسی کام کے نہ تھے تو ان کی شادی ہی کیوں کی گئی ؟"

"یہی تو اصل سوال ہے" اختر راٹھور نے کہا۔" اور اس کا جواب ہی بیگم مُراد کو ایک حد تک اور نور احمد کو بڑی حد تک قابلِ معافی ثابت کرتا ہے۔"

"یعنی ؟"

"یعنی یہ کہ تم اصل حالات کو نظرانداز کر رہے ہو" اختر پھر گویا ہوا۔" تم اس عورت سے واقف نہیں ہو اور نہ ہی اُس کے حالات کا علم رکھتے ہوئے نہ ہی تم نے ان حالات کو جاننے کی خواہش کا اظہار کیا اور یکطرفہ کارروائی عمل میں لے آئے ہماری بیگم مُراد سے دُور کی رشتہ داری ہے۔ تعلقات تو نہ ہونے کے برابر ہیں مگر ہم ایک دُوسرے کے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا پوشیدہ رہنا ہی درست ہوتا ہے مگر حالات پردے اُٹھا ہی دیتے ہیں ـــــ مُراد میاں واقعی صرف نام کے آدمی ہیں لیکن کسی کے ماتھے پہ تو نہیں لکھا ہوتا کہ مجھے فلاں بیماری ہے۔ اس نے اپنے انداز میں ڈرتے ڈرتے شادی سے انکار کیا مگر کسی نے نہ سُنی۔ وہ چُپ ہو گیا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ ہومیو پیتھی کے ذریعے اپنا علاج کرے گا۔ وہ ڈاکٹر اِسی لیے بننا چاہتا تھا۔ شرم کے مارے وہ کسی سے بات کرتا تھا نہ ملتا تھا۔ اس کو صحیح راہ نمائی بھی نہ مل سکی ان حالات میں بیگم مُراد کا گمراہ ہو جانا گو اچھا نہیں ہے مگر اس میں کچھ زیادہ حیرت کی بات بھی نہیں ہے ـــــ اس مراد علی کو بھی داد دو جو چار عدد ایسے بچّوں کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ بظاہر ان سے محبّت بھی کرتا ہے جن سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ شاید وہ یہ سب کچھ رضائے الٰہی سمجھ کر قبول کیے بیٹھا ہے۔ میں نے نہیں سُنا کہ اس نے آج تک کسی سے کوئی شکایت کی ہو۔ شادی پر وہ زیادہ جرأت سے کام نہ لے سکا۔ اس پر افسوس تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے کردار کی فطری (یا غلط پرورش سے پیدا شدہ) کمزوری کو تم کیسے نظر انداز کر دوگے! ـــــ اور یہ تو ایک مثال ہے۔ نمعلوم کتنے مُراد علی اِسی طرح نامُرادی کی زندگی گزارتے اور دُوسروں کے بچّے پالتے ہیں ـــــ ایک پردہ اُٹھ گیا اور تم بلبلانے لگے ہو ـــــ ذرا زندگی میں ڈوب کر دیکھو یہاں کیا ہو رہا ہے ـــــ اور کیا کیا برداشت کرنے اور کیا کیا معاف کرنے کی ضرورت ہے . . . . . "

"ایسی مثالیں بھی تو ملتی ہیں جب اس قسم کے حالات میں عورتوں نے انتہائی پاکیزگی اور عفّت کی زندگی گزار دی۔ کُھلی چُھٹی دے کر معاشرے اور اخلاق کی تباہی کے سامان پیدا کرنے کی اجازت بھی تو نہیں دی جا سکتی ـــــ جُرم کی سزا نہیں ملے گی تو جُرم کا احساس کیسے پیدا ہو گا۔"

"میں یہ کب کہتا ہُوں کہ جُرم کی سزا نہ دی جائے" اختر نے کہا۔" میں تو یہ کہتا ہُوں کہ حالات کا مطالعہ بھی ضرور

کیا جائے ——— پابندیاں لگائی جائیں، ضابطے بنائے جائیں لیکن جرم کو عام زندگی اور مجرم کے حالات سے کاٹ کر دیکھنا کہاں کا انصاف ہے ——— اور پھر جنس کا جذبہ کون نہیں جانتا کتنا ظالم ہے ——— جہاں اسے ضبط میں رکھنا ضروری ہے وہاں بعض رعایات دینا بھی ضروری ہے بالخصوص اس وقت جب حالات بھی خاص ہوں ——— پھر فرد کے سلسلہ میں تم معاشرتی کمزوریوں اور ظلم کو کیوں بھول جاتے ہو۔ یہ بھی خوب انصاف ہے کہ اخلاق کے نام کا لٹھ اُٹھایا اور آنکھیں بند کر کے دے مارا مجرموں پر ——— کسی کا سر ٹوٹا، کسی کا ہاتھ اور عذاب کو اطمینان ہو گیا کہ گنہ گاروں نے اپنے کیے کی سزا پائی ——— اور لطف کی بات یہ ہے کہ سزا تجویز کرنے پر سب آمادہ ملیں گے لیکن حالات کو ٹھیک کرنے کا عزم کسی کے پاس نہیں ——— ایک بات کا جواب دو۔ یہیں اس معاملے کا فیصلہ ہو جائے گا ——— ہم میں ایسے کتنے ہیں جن کو اپنے جنسی جذبات پر ہمیشہ اس قسم کا ضبط رہا ہو جس کا تم مطالبہ کرتے ہو؟ اور جن سے کبھی کسی قسم کی جنسی غلطی کا ارتکاب نہ ہوا ہو............ اب خاموش کیوں ہو؟ .... خاموش رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہو۔ تمھاری خاموشی تمھاری شکست ہے۔ پھر ایسی مثالیں تاریخ میں بہت ملتی ہیں۔ ہملٹ کی ماں میری آف سکاٹ لینڈ اور دیومالاؤں کے زمانے میں ہیلن اور کلائی ٹمنسٹرا ——— مولوی صاحب، ذرا اس دنیا میں رہ کر سوچو ——— اور نور احمد سے پوچھو کہ وہ کیا ارادہ رکھتا ہے۔"

"میرا کوئی ارادہ نہیں ہے ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" نور احمد نے آہستہ سے کہا۔ "ایک خوفناک خیال کو دباتا ہوں تو دوسرا زیادہ خوفناک خیال سر اٹھا لیتا ہے ——— مجھے ڈر ہے کہ بانو بھی اپنی ماں کے نقشِ قدم پر نہ چلنے لگے۔"

"بانو بہت نیک لڑکی ہے۔" اختر نے کہا۔ "اگر تم اس کو فوری طور پر اس ماحول سے نکال لاؤ گے تو وہ محفوظ رہے گی۔ تاخیر نقصان دہ ہو سکتی ہے کیونکہ خراب ماحول سے بچنا آسان نہیں ہے اور اب شادی کے بعد اس کی زندگی میں اور خیالات میں تبدیلی آنا بھی آسان ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" دوست محمد نے تائید کی۔

"لوگ بہت سی باتیں جانتے ہیں۔" نور احمد نے کہا۔ "یہ بھی کہ مراد میاں بانو کے باپ نہیں ہیں۔"

"اس میں بانو کا کوئی قصور نہیں۔ تمھیں تو یہ دیکھنا ہے کہ وہ نیک ہو بس ——— تم اپنی مثال ہی لے لو۔ تم بھی تو خود کو بے قصور سمجھتے ہو ——— تم نے تو کوئی غلطی کی بھی ہے۔ بانو کو کسی طرح بھی مطعون نہیں کیا جا سکتا۔" اختر نے کہا۔

"لیکن اس کا باپ ———" نور احمد نے کچھ اور کہنا چاہا۔

"تمھارا باپ کون ہے نور احمد؟" اختر راٹھور نے ٹوک دیا۔ "کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ تم واقعی امداد علی کے بیٹے ہو، اسی امداد علی کے جس کی ناک تمھاری ناک سے دوگنی بلند تھی اور جس کی پیشانی تمھاری پیشانی سے دوگنا کشادہ

تھی ؟ ـــــــ نمعلوم فطرت کس کس کا پردہ رکھے ہوئے ہے ۔ ایک پردہ اُٹھ گیا ہے اور تم پریشان ہو رہے ہو ؟"

"اختر !" نورُ احمد چیخا ۔

"چلاتے کیوں ہو !" اختر نے سمجھانے کے انداز میں کہا " زندگی میں حادثوں اور مصیبتوں کی گنجائش رکھنا ہی پڑتی ہے ۔ انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں کو ان کا حصّہ دینا ہی پڑتا ہے ۔ دُوسروں کو معاف کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ دُوسرے بھی تمھیں معاف کر دیں ۔ یہاں کوئی فرشتہ نہیں ہے ۔ اگر تم یہ نہیں سمجھتے تو مجھے اس بات کا ثبوت دو کہ تم واقعی امداد علی کے بیٹے ہو اسی امداد علی کے جس کا بڑا بیٹا شبیر علی شبیر کی طرح جری اور آزاد تھا ۔"

نورُ احمد نے سر گھٹنوں میں چھپا لیا جیسے رونے لگا ہو ۔ اختر نے محسوس کیا کہ تیر خطا نہیں گیا ۔ چنانچہ وہ پھر بولا ۔

"بانو اب عملی زندگی میں قدم رکھ چکی ہے ۔ اب اُس کے جذبات یقیناً پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں ۔ شادی کا تجربہ کوئی معمولی تجربہ نہیں ہوتا ۔ اس وقت ذراسی بھی لاپروائی اُس کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور پھر اس کا گناہ تمھارے سر ہوگا یا پھر اس مولوی حمید کے سر جو انصاف کا لٹھ آنکھیں بند کر کے گھمانے کا قائل ہے ـــــــ ایک بار پھر سُن لو اور غور سے سُن لو، بیگم مُراد کی شادی اس سے پوچھ کر نہیں کی گئی تھی ۔ مُراد کو اس کی ذات کا حصّہ قدرت نے یا حالات نے یوں بنا دیا جیسا گھن دانۂ گندم کا بن جاتا ہے اور دیمک لکڑی کا ـــــــ وہ جب گل رُخ تھی تو اس کے حُسن کا بڑا شہرہ تھا ۔ میرے بھائی شجاعت راٹھور نے بہت چاہا کہ اس سے شادی ہو جائے لیکن کوئی سُننے والا نہ تھا اور بزرگوں کے حکم سے سرتابی جُرم تھا اور پھر اُس ظلم کا کیا علاج جو فطرت خود روا رکھتی ہے ۔ شجاعت بھائی نے ایک بار گل رخ کو بھگا لے جانے کا پروگرام بنایا تھا مخالفت کرنے والوں میں میں بھی پیش پیش تھا اور آج مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیوں نہ بھائی کی مدد کی ـــــــ ہمارے چاروں طرف خطرات ہیں اور دُکھ ہیں ۔ ہمارا کام مسلسل یہ ہے کہ اپنی اور دُوسروں کی زندگی کو رہنے کے قابل بنائیں ۔ یہ صرف ایک معمولی حد تک ممکن ہے اور یہاں تک جانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے ۔ قصّہ مختصر، ان سب باتوں سے مقصود یہ سمجھانا ہے کہ بانو کی واپسی کا فوراً انتظام کرو ۔"

عاشق مزنگی اب تک نمعلوم کیسے خاموش پڑا تھا ۔ اس سنجیدہ بحث میں لوگ اسے کچھ دیر کے لیے بھول سے گئے تھے اور دوست محمد کو تو پریشانی میں خیال بھی نہ رہا تھا کہ عاشق بستر میں گھسا پڑا ہے ۔ اُس نے اپنی موجودگی کا پھر احساس دلایا اور کفن پھاڑ کر (یہاں لحاف مُنہ سے ہٹا کر) بولا " ارے بھائیو، ہم نے کُل چار جماعتیں پڑھیں ۔ یہ اُلٹی کوئی کتابوں سے آتی ہے ـــــــ میاں نورُ احمد جی کیوں اپنا جی ہلکان کرتے ہو ۔ اپن کے ساتھ روز ایسے ماملے ہوتے رہتے ہیں اور اپن خوش ہیں ۔ اپنی سمجھ میں تمھاری رونی شکل آتی نہیں ـــــــ تم بُرا مان جاتے ہو ۔ ورنہ جی چاہتا ہے کہ گرہ میں باندھنے لائیں ایک بات کہیں ـــــــ "

سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ انھیں یہ یقین کم ہی تھا کہ عاشق کوئی سنجیدہ اور مُفید مشورہ دے گا پھر بھی

وہ سننے کو بے تاب تھے کہ آخر اس کے دماغ میں کون سی بات ہے ———— اُدھر عاشق مزنگی نے سب کو اپنی جانب متوجہ پایا تو ہونٹ بھینچ کر بیٹھ رہا اور باقی لوگ جو انتظار کھینچ رہے تھے اس سے لطف اٹھانے لگا۔
دوست محمد کو اس وقت یہ حرکت اچھی نہ لگی، وہ مکّہ تان کر اٹھا ہی تھا کہ عاشق مزنگی نے لہک لہک کر گانا شروع کر دیا :

اپنا تو ہے یہی اصول
تازہ باسی کرو قبول
کرو قبول
کرو قبول

وہ جانتا تھا کہ اس مشورے کے بعد اس سے کیا سلوک ہو گا چنانچہ اس نے فوراً مضبوطی سے لحاف کو جسم کے گرد کس لیا اور دوست محمد کے گھونسے ہنس ہنس کر کھاتا رہا۔
"ذلیل ———— کمینہ ————" نور احمد چلایا۔ "مجھے گناہ کی ترغیب دیتا ہے۔ میں تمہیں ————"
اور وہ خاموش ہو گیا۔
"کہہ دو مار ڈالوں گا۔" عاشق چھیڑنے سے باز نہ آیا "مارنے والی صورتیں ہی اور ہوتی ہیں۔ سالا اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی فرشتہ بنا پھرتا ہے۔"
نور احمد کچھ نہ کہہ سکا اس کے ذہن میں ایک اور ہی ریکارڈ بج رہا تھا "تم مجھے نہیں مار سکتے ———— تم مجھے نہیں مار سکتے ———— مجھے کوئی نہیں مار سکتا . . . ."
اُس نے بے بسی سے حمید کی طرف دیکھا۔ حمید نے عاشق کو سختی سے ڈانٹا اور کہا "اختر کی رائے درست ہے۔ تمہیں واقعی بانو کے بارے میں کسی قسم کے شبہے کو دل میں جگہ نہیں دینا چاہیے اور اس کی واپسی کا فوری طور پر انتظام کرنا چاہیے اور تمہیں اپنے گھر بھی فوراً پہنچ جانا چاہیے۔"

(۱۲)

وہ ہوٹل میں واپس آیا تو دوستوں کے دیے ہوئے مشورے اس کے ساتھ تھے اور وہ ان پر عمل پیرا ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے مزید سوچا اور محسوس کیا کہ ابھی اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ خود مراد میاں کے گھر جاتا اور بانو کی واپسی کا مطالبہ کرتا۔ چنانچہ اس نے بانو کے نام ایک خط اس مضمون کا لکھا کہ میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے اُدھر نہیں آسکتا تم فوراً چلی آؤ۔
خط ڈالنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس نے کتنی بے کار بات کی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خط بانو کو نہیں ملے گا ———— پھر بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید کسی طرح وہ اس خط کے مضمون سے واقف ہو جائے ۔

بیگم مراد اسے پڑھ کر کہیں رکھ کر بھول جائے اور بانو کی نظر پڑ جائے یا کوئی اور ایسی صورت نکل آئے اور بانو ماں سے بغاوت کر دے۔

اگلے دن وہ اپنے گھر واپس چلا گیا۔ وُہی گھر تھا۔ کوئی تبدیلی اس کو نظر نہ آئی۔ دن بھر وہ بانو کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ اُس نے ایک اور خط لکھا۔ تین دن اور گزر گئے۔ پھر اُس نے تیسرا خط لکھا مگر بے سُود۔ تیسرا خط اُس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں لکھا تھا۔ اُس رات وہ بستر پر لیٹا تو معمول سے زیادہ افسردہ تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ وہ بانو کو بے حد چاہتا ہے لیکن اُسے حاصل کرنے کے لیے راستے کے اس بڑے پتھر بیگم مُراد کو یا تو ہٹانا پڑے گا ——— یا پھر اس کو زینہ بنانا پڑے گا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہمّت سے کام لے گا اور اگر ضرورت پڑی تو عدالت میں جانے سے بھی گریز نہ کرے گا ——— اس فیصلے پر بھی وہ کئی ہفتے عمل نہ کر سکا اور اس اُدھیڑ بُن میں رہا کہ اپنے فیصلے کو عملی صورت دے یا نہ دے اور اگر دے تو کیوں کر؟

آخر ایک روز اُس نے دل مضبوط کیا اور بیگم مُراد کو خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ اسے اس کے گھر آکر ملے کیونکہ وہ کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔

نور احمد کو پُورا یقین نہیں تھا کہ وہ آجائے گی لیکن اگلی شام جب وہ آگئی تو وہ زیادہ حیران نہ ہوا کیونکہ اُسے اس عورت کے حوصلے کا تجربہ ہو چکا تھا۔

ہلکے سبز رنگ کے لباس میں وہ بڑی دلکش نظر آرہی تھی۔ نورُ احمد نے سوچا اگر شجاعت اس عورت پر مرتا تھا تو کیا بُرا کرتا تھا۔ وہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بیگم مُراد کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی عیاں نہ تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے یہ عورت کبھی بوڑھی نہ ہوگی۔ وہ دونو کچھ دیر آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے اور ایک دُوسرے کو یوں بار بار دیکھتے رہے جیسے دو پہلوان ایک دُوسرے کی طاقت کا اندازہ کر رہے ہوں۔

"میں نے بانو کے نام تین خط لکھے۔"

"وہ مجھے مِل گئے تھے۔"

"وہ آپ کے لیے نہیں بانو کے لیے تھے۔"

"وہ میرا گھر ہے بانو کا نہیں ——— بانو مجھ سے ہے نہ کہ میں بانو سے ہوں۔"

پھر ایک وقفہ خاموشی کا آگیا۔ یہ وقفہ طویل ہونے لگا۔

نورُ احمد اپنی جگہ سے اُٹھ کر بیگم مُراد کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بیگم مُراد خاموش بیٹھی رہی۔ نورُ احمد نے ایک قدم اور اُٹھایا اور اس کے بالکل قریب ہو گیا۔ بیگم مُراد نے آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور غور سے نورُ احمد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُس کے چہرے پر عجب طرح کی وحشت برس رہی تھی جو اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی اور منتظر رہی کہ وہ اگلا قدم اُٹھائے۔

ایک خیال اُس کے ذہن میں اُبھرا "کیا یہ واقعی مجھے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے ؟ کیا مجھے یہاں بُلانے کا مقصد یہی تھا ؟" اور پہلی بار اُس کے چہرے پر پریشانی کا ایک سایہ پھیل گیا۔

نورُا احمد کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کی طرف بڑھے لیکن گردن سے ایک اِنچ ادھر رُک کر واپس آ گئے۔

"یہ واقعی مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے !" بیگم مرُاد نے سوچا اور اس کی نظریں اب نور احمد کے ہاتھوں پر رُک گئیں۔ کتنے بے چین نظر آ رہے تھے وہ ہاتھ۔ اُنگلیوں میں کِتنا خوفناک تناؤ تھا جیسے گردن دبوچتے ہی جان قبض کر لیں گے۔ بیگم مرُاد کی گردن سے کمر تک ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔

نور احمد ایک دم اُس کے سامنے فرش پر دو زانو بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پھر آگے بڑھے اور گردن کے بالکل قریب ہو گئے۔ بیگم مرُاد کا جسم پسینے سے بھیگ گیا لیکن اُس نے اپنے حواس قائم رکھے ——— پھر نور احمد نے چشم زدن میں اُس کے دونو ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں یوں ملا دیا جیسے دیو داسیاں دیوتاؤں کے سامنے ملاتی ہیں اور انگلیوں کی پوروں کی حِنا کو چومنے لگا۔ پھر اُس نے اس کی کلائیوں پر اپنے رُخسار مَلے اور گردن اور کندھوں پر بوسوں کی بارش کر دی اور پھر اُس نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا اور ان کے دماغ ریشمی لحافوں کی کئی تہوں کے نیچے دب کر سو گئے اور جسم جاگ اُٹھے اور فرش پر ان جسموں نے اپنی داستان لکھی ——— اور نیم بے ہوشی کی سی حالت میں ایک جسم نے دُوسرے سے کہا :

"مرُاد میاں سے طلاق لے لو"

اور دُوسرے جسم نے جواب دیا "نہیں ——— اس کی کوئی ضرورت نہیں !"

کوڑیوں کے مول

تیسری قسط

ترجمہ: احمد سعدی

بمل مترا

گھر واپس آتے ہی ماں نے دیکھ لیا۔

"ہاں رے، پھول دے کر آنے میں اتنی دیر لگی؟" اُس نے پوچھا۔

اس کے بعد قریب آکر بھیگے کپڑوں کو دیکھ کر بولی۔

"ان بھیگے کپڑوں میں اتنی دیر تک کہاں تھا، اسکول نہیں جانا ہے؟ اُتارو، اُتارو، بھیگے کپڑے جلدی اُتارو، کہیں بخار آگیا تو مجھے ہی پریشان کروگے، نہیں، اب تمہیں پھول لے کر جانے کی ضرورت نہیں، اب میں خود جایا کروں گی ــــــ"

ماں نے زبردستی اُس سے کپڑے اُتروائے اور گمچھا سے اُس کا سر پونچھ دیا اور پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی ــــــ جیسی میری قسمت ہے، میں دُوسروں کے گھر میں دن بھر کھانا پکاتی رہتی ہوں، آنکھ سے دیکھ کر بھی لڑکے کو ہوش نہیں آتا ــــــ اور کب ہوش ہوگا، اس لڑکے کو اب اور کب عقل آئے گی ــــــ

ماں کی باتیں سُن کر دیپنکر کو بہت دُکھ ہوتا، ماں کو کیا معلوم تھا کہ آہستہ آہستہ دیپنکر کے دل میں کتنے خیالوں نے گھر کر رکھا ہے، کتنی ساری سوچوں نے جمع ہو کر پہاڑ کی شکل اختیار کر رکھی ہے، جس طرح خود ماں کی سوچیں ہیں، اسی طرح دیپنکر کے دل میں بھی بہت ساری سوچیں جنم لیتی رہتی ہیں۔ گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر جب دیپنکر آسمان کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے دماغ میں بھی بہت سارے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی سورج کیوں طلوع ہوتا ہے، شام ہوتے ہی آسمان پر تارے کیوں چمکتے ہیں، جس آسمان سے بارش برستی ہے اسی آسمان سے دوپہر میں آگ کی بارش کیوں ہوتی ہے، اور کیا صرف اتنا ہی؟ آنگن کے کنارے جو امرُود کا پیڑ ایستادہ ہے، اُس کے پتے اتنے سبز کیوں ہیں اور جب یہ پتے سفید ہو جاتے ہیں تو زمین پر کیوں گر جاتے ہیں۔ اور وہ کوّا؟ وہ کوّا ہر روز آتا ہے، ہر روز آکر اسی شاخ پر بیٹھتا ہے، اس کا وہ سُرخ چہرے والا بچہ کہاں گیا، اس نے اس کو حاجی قاسم کے باغ میں مرا ہوا دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ سُست رہنے لگا تھا۔ جھوٹے بھات کھا کر وہ پھر اسی شاخ پر جا کر بیٹھ جاتا تھا اور شام ہونے سے پہلے ہی کہیں چلا جاتا تھا! شاید اس کا دُنیا میں کوئی نہیں ہے، شاید دُنیا میں کسی کا نہ ہونا بڑی تکلیف کی بات ہے، اس روز اس نے لکھی دیدی کا دیا ہوا چاکلیٹ اُسے دے دیا تھا، کوّے نے جلدی سے وہ چاکلیٹ نگل لیا تھا، یہی اچھا ہے، شرم بھی نہیں، خودداری بھی نہیں ۔ واقعی بڑے مزے میں ہے۔

دیپنکر جب اُسے آواز دیتا ——— "آ ——— آ ——— آ"

تو وہ کوا ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا، گردن کو خم دے کر دیکھتا کہ اس کے ہات میں کھانے کی کوئی چیز ہے یا نہیں، اُسے سچ مچ کھانے کو کچھ دے رہا ہے یا فریب دے رہا ہے ———

ماں ایک روز دیپنکر کو ساتھ لے کر پران متھ بابو کے یہاں گئی تھی، چھٹی کا دن تھا، ماں نے ایک دُھلی ہوئی ساڑی پہن لی تھی، نیلپال بھٹچارج اسٹریٹ کے آخری سرے پر پران متھ بابو کا مکان تھا، پران متھ بابو کے دادا کی کسی زمانے میں بڑی اچھی حالت تھی، گھرانہ خوش حال تھا، لیکن اب وہ غریب ہو چکے تھے۔

ماں نے کہا ——— "میں نے بھائی سے کہہ دیا ہے، تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

دیپنکر نے کہا ——— "لیکن میں نوکری نہیں کروں گا ماں ———"

"نوکری نہیں کروگے، سنوں تو سہی" ماں نے پوچھا ——— "بیٹھے بیٹھے مُفت کا نگلوگے؟"

"میں پڑھوں گا۔" دیپنکر نے جواب دیا۔

ماں سخت برہم ہو اُٹھی تھی۔

اُس نے کہا ——— "پڑھنے میں فیس نہیں لگے گی؟ تمھاری فیس میں کہاں سے دوں گی، سنوں؟ اگھو دادو ہم دونوں کو کب تک کھلائیں گے! میں تمھاری فیس نہیں دے سکوں گی بابو، کہے دیتی ہوں، اب میری صحت بھی اجازت نہیں دیتی ———"

پران متھ بابو گھر کے اندر ننگے بدن بیٹھے چرخہ کات رہے تھے۔ چاروں طرف الماریاں تھیں اور الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔

اُنھوں نے کہا ——— "نہیں دیپو کی ماں، جب مزید پڑھنے کی اس کی خواہش ہے تو تم اُسے ضرور پڑھاؤ ———"

"لیکن بھیا" ماں نے کہا ——— "آپ تو میری حالت سے واقف ہیں، میں اس کی فیس کہاں سے لاؤں گی ——— جب یہ دو ماہ کا تھا اس وقت سے لے کر اب تک کسی طرح مرکھپ کر پورا کرتی رہی لیکن اب تو میری صحت بھی مزید مشقت کی اجازت نہیں دیتی، اس کا کوئی انتظام ہو جاتا تو میں سکون کے ساتھ آنکھیں بند کر لیتی ———"

پران متھ بابو پان چبا رہے تھے، بولے ———

"تم اسے کالج میں داخلہ دلوا دو، فیس کے لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اور سچ مچ ماں کو فیس کے لیے پریشان نہ ہونا پڑا۔

کالج کی فیس پران متھ بابو اپنی جیب سے دیتے تھے، ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں دیپنکر ان کے سامنے حاضر

ہوتا، صبح کا وقت ہوتا اور پران متھ بابو دوسرے کاموں کے ہنگامے میں پھنسے ہونے کے باوجود اسے دیکھتے ہی کہتے ———

"آ گئے ؟"

اُسے مانگنا بھی نہیں پڑتا، وہ کوئی بات بھی نہیں کرتا، اُسے دیکھتے ہی دراز سے چھ روپیہ نکال کر وہ اُس کے ہات میں دے دیتے۔

پوچھتے ——— "تمھاری ماں کیسی ہے ؟"

"اچھی ہے سر" دینکر جواب دیتا۔

"تمھاری پڑھائی ٹھیک ہو رہی ہے نا ؟ پنچانن سنگھ جی کیسے ہیں ؟"

پنچانن سنگھ کالج کے پرنسپل تھے۔

"اچھے ہیں سر" دینکر جواب دیتا۔

"ان سے میرے بارے میں کہنا، سمجھے ؟ اگر کوئی دشواری ہو تو ان سے ضرور کہو"

پھر کہتے ——— "بڑے بنو، انسان بنو، تمھیں انسان بنتے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوگی"

ایک بار دینکر نے کہا ——— "سر آئندہ ماہ سے آپ کو روپیہ دینا نہیں پڑے گا"

"کیوں ؟"

"آپ نے تو میری بہت مدد کی ہے، کوئی کسی کے لیے اتنا نہیں کرتا ——— آئندہ ماہ سے میں ایک ٹیوشن کا انتظام کر رہا ہوں۔"

"ٹیوشن ؟"

پران متھ بابو نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا۔

بولے ——— "ٹیوشن مِل گئی ہے ؟"

"نہیں، ابھی نہیں ملی ہے لیکن تلاش کرنے سے مِل جائے گی، اندرون کالی گھاٹ میں بہت سے نئے لوگ آ رہے ہیں، مجھے دس روپے کی ایک ٹیوشن مل جائے گی۔"

پران متھ بابو نے کہا ———

"ٹھہرو"

پران متھ بابو کی آواز سن کر دینکر چونک اٹھا۔

پران متھ بابو نے گمبھیر آواز میں پکارا ———

"ہری پدو"

ہری پدو کے آتے ہی انھوں نے کہا ——

"حساب کا کھاتہ نکالو تو ——"

ہری پدو بہت ساری کاپیوں اور رجسٹروں کو اُلٹ پلٹ کرنے کے بعد کتھئی رنگ کی جلد والا ایک کھاتہ نکال کر لے آیا۔

پران متھ بابو وہ کھاتہ کھول کر اس کا ایک صفحہ دکھاتے ہوئے بولے ——

"پڑھو، پڑھ کر دیکھو ——"

دینکر نے پڑھ کر دیکھا۔

لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا، پورے صفحہ پر بہت سارے نام لکھے ہوئے تھے اور ہر ایک نام کے سامنے روپے کا ہندسہ درج تھا، کسی نام کے سامنے پانچ روپیہ، کسی نام کے سامنے دس روپیہ اور کسی نام کے سامنے دو روپیہ۔ اسی طرح بہت سے نام تھے، خود اس کا نام بھی درج تھا اور اس کے نام کے سامنے چھ روپیہ لکھا ہوا تھا۔

"کچھ سمجھے ؟"

"نہیں سر!"

پران متھ بابو نے کہا —— "تم اکیلے ہی روپیہ نہیں پاتے، بہت سے لڑکے پاتے ہیں، سبھی آکر لے جاتے ہیں، لیکن تمھاری طرح کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اُسے روپے کی ضرورت نہیں ہے، آج پہلی بار تمھاری زبان سے سُن رہا ہوں۔"

دینکر خاموش رہا، کیا جواب دے اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔

پران متھ بابو نے پھر کہا —— "دراصل یہ روپیہ میں بھی اپنی جیب سے تمھیں نہیں دیتا، کلکتہ میں چند ذی حیثیت لوگ غریبوں کی امداد کے لیے گاہے گاہے مجھے کچھ نہ کچھ دیتے رہتے ہیں، وہی روپیہ میں تم لوگوں کے ہاتھوں میں ڈال دیتا ہوں، میرے پاس سے روپیہ لینے میں تمھیں شرم نہیں آنی چاہیے۔ جب تک تمھیں ضرورت ہے، تم لے جایا کرو، جب تمھاری ضرورت باقی نہ رہے، ختم ہو جائے تو نہ لینا ——"

دینکر نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا، خاموش کھڑا رہا۔

پران متھ بابو نے گمبھیر لہجے میں کہا ——

"اب جا سکتے ہو ——"

اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر دینکر وہاں سے چلا آیا تھا۔ جیسے پران متھ بابو کے سامنے کھڑے رہنے میں اُسے سچ مچ شرم آرہی ہو! یہ بھی تو انسان ہیں! دُنیا کے کروڑوں انسانوں کی طرح پران متھ بابو بھی تو ایک انسان ہیں لیکن اس دُنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں؟ دینکر کو ایسا لگا جیسے آتے وقت انھیں پرنام کرنا بھی ان کی

توہین کرنا تھی! جیسے پران متھ بابو تمام شرافت، رذالت، قواعد، ضوابط، قانون اور دُوسری تمام دُنیاوی حدود سے بلند اور بالاتر ہوں، جو لوگ چاکلیٹ دیتے ہیں، جو لوگ سندیش دیتے ہیں، ان لکھی دیدی، سنی اور اگھور دادو سے پران متھ بابو پرے تھے، حالانکہ پران متھ بابو بھی دیوتا نہیں تھے، معمولی، بہت معمولی نیپال بھٹچارج اسٹریٹ میں رہنے والے ایک انسان تھے، پران متھ بابو نے تو روپیہ رشوت دے کر اُسے خریدنا نہیں چاہا، ورنہ اگر وہ چاہتے تو روپے دے کر دینکر سے اس کی خودداری، وفا، شرم، عاجزی، ہمدردی، احساسِ تشکر سبھی کچھ خرید سکتے تھے، لیکن اُنھوں نے ایسا تو نہیں کیا!

دینکر کو یاد ہے۔

جب پہلی بار ماں اُسے پران متھ بابو کے پاس لے گئی تھی تو اُنھوں نے اُس سے پُوچھا تھا۔

"تم نے مہابھارت پڑھا ہے؟"

"ماں کی زبانی مہابھارت کی کہانی سُنی ہے" دینکر نے جواب دیا ——— "پڑھا نہیں ہے"۔

پران متھ بابو نے پُوچھا ———

"اچھا بتاؤ تو، کائنات سے بھی بڑی کوئی شے ہے؟"

ان کا سوال سُن کر دینکر گھبرا سا گیا تھا، اس دُنیا، اس وسیع و عریض کائنات سے بڑی کون سی شے اس دُنیا میں ہو سکتی ہے! اور اگر کائنات سے بڑی کوئی شے ہو بھی تو وہ کائنات کے اندر کیسے سما سکتی ہے، جتنا بڑا پیالہ ہوگا اس میں اتنا ہی تیل تو رکھا جا سکتا ہے۔ ایک سیر کے برتن میں دو سیر تیل تو نہیں آ سکتا!

پران متھ بابو ہر روز معمول بنا کر چرخہ کاتتے اور چرخہ کات کر جو دھاگے تیار ہوتے اسی سے اپنے کپڑے بنواتے پران متھ بابو کی بیوی بھی چرخہ کاتتی تھیں، دونوں میاں بیوی نرالے تھے، ان کے کوئی بچہ نہیں تھا، بعد میں سبھوں نے چرخہ کاتنا چھوڑ دیا تھا، جب چرخہ کاتنے کی وبا پھیلی تھی تو سبھی چرخہ کاتنے لگے تھے، محلے محلے اور گھر گھر میں چرخہ کاتا جانے لگا تھا اور کھدر پہننا فیشن میں داخل ہو گیا تھا، لیکن دُوسری وبا کی طرح کھدر کی وبا بھی ایک دن ختم ہو گئی، تاہم پران متھ بابو نے زندگی بھر چرخہ کاتنا کبھی نہ چھوڑا، زندگی کے آخری لمحے تک چرخہ کاتتے ہی رہے۔

پران متھ بابو نے کہا ——— "بتاؤ، اس دُنیا میں، اس دھرتی پر، اس دھرتی سے بھی بڑی کون چیز ہے۔ بتاؤ؟"

ماں نے کہا ——— "بھیا میں ذرا اندر بھابی سے مُلاقات کر کے آتی ہوں۔"

"جاؤ۔"

اتنا کہہ کر پران متھ بابو پھر چرخہ کاتنے لگے۔

اس کے بعد پھر کہنے لگے ——— "مہابھارت میں لکھا ہے کہ ایک بار ایک سارس نے جودھشٹر سے

بہت سے سوالات کیے تھے ۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے،" دینکر نے کہا ——— "سارس کے سوالوں کا جواب نہ دینے کے باعث بھیم اور ارجن سبھی مر گئے تھے، آخر میں یُدھشٹھر نے ان سوالوں کا جواب دیا تھا سر۔"

پران متھ بابو نے پوچھا ———

"اچھا بتاؤ تو کس کے پاس دل نہیں ہے؟ کون جاگ کر بھی سوتا ہے؟ پیدا ہونے کے بعد بھی کون سانس نہیں لیتا؟ کون سی چیز ہوا سے بھی تیز رفتار ہے؟ کون سی چیز گھاس سے بھی زیادہ ہے؟"

پران متھ بابو نے یکے بعد دیگرے کئی سوالات کر ڈالے۔

دینکر ایک کا بھی جواب نہ دے سکا۔

پران متھ بابو نے کہا ——— "بھیم، ارجن اور ان کے ساتھیوں نے چونکہ مہا بھارت نہیں پڑھی تھی، اس لیے جواب نہ دے سکے تھے، لیکن ہم لوگوں نے تو مہا بھارت پڑھی ہے، ہم لوگوں کو تو ان کے جوابات معلوم ہونا چاہئیں۔"

دینکر پھر بھی خاموش رہا۔

پران متھ نے کہا ——— "بڑے ہو کر مہا بھارت پڑھو، سمجھے؟ اب سنو، کائنات سے بھی بڑی کون سی چیز ہے ———"

وہ پران متھ بابو کا مُنہ تکنے لگا!

پران متھ بابو نے چر خود روک کر کہا ———

"کائنات سے بڑی ہوتی ہے جننی ——— سمجھے ——— جننی، تمھاری ماں ———"

دینکر خاموش رہا۔

"ہاں، جننی۔ تم اپنی ماں ہی کو دیکھو، شاید تم نہیں جانتے، اس نے کتنی مصیبت اُٹھا کر تمھاری پرورش کی ہے، پھر بھی اس کے عوض کچھ نہیں چاہتی، تم جب چھوٹے تھے تو تمھاری اسی بیوہ ماں نے ان دنوں صرف تمھارے لیے رات کی نیند اور دن کا آرام تج دیا تھا۔ اور تم؟ تم نے یہ سب کچھ واجب الادا قرض سمجھ کر اس سے ادا کرایا ہے۔ اس سے اور بھی محبت، اور بھی خدمت اور بھی نگہداشت اور بھی پیار کرنے کا مطالبہ کیا ہے ———"

قدرے توقف کے بعد وہ پھر کہنے لگے ———

"اس کے علاوہ بھی تمھاری ایک ماں اور ہے، اس کے متعلق تم نے کبھی سوچا ہے؟"

دینکر نے حیرت سے دیکھا ———

"ایک ماں اور ہے؟"

پران متھ بابو نے کہا ———

"ہاں، ایک ماں اور ہے، اور وہ ہے تمہاری جننی ——— مادرِ وطن۔"

بولتے بولتے جیسے پران متھ بابو کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"شمال میں ہمالیہ سے راس کماری تک جو زمین تمہارے قدموں کے نیچے پھیلی ہوئی ہے، جو زمین تمہارے لیے غلّہ پیدا کرتی ہے، اناج دیتی ہے، بیماروں کے لیے دوا اُگاتی ہے، کپڑے دیتی ہے، پناہ دیتی ہے، سردی، گرمی اور برسات میں، دھوپ کی تپش سے، سردی کی حدّت سے ہر لمحہ ہماری حفاظت کرتی ہے، وہی مادرِ وطن، وہی زمین، وہی دھرتی، اس کائنات سے بھی بڑی ہے؛ اس دُنیا میں اس جیسا کون ہے . . . . ."

کہتے کہتے پران متھ بابو رک گئے اور پھر چرخہ کاتنے لگے۔

ماں نے اندر سے آکر آواز دی ———

"کھوکا۔"

دینکر نے ماں کی طرف دیکھا۔

ماں نے کہا ——— "اندر آؤ، مامی ماں کو پرنام کرو ———"

دینکر نے اندر جاکر دیکھا، پران متھ کی بیوی کھڑی تھیں۔

ان کے قدموں کی خاک سر پر پھیر کر دینکر نے پرنام کیا۔

پران متھ بابو کی بیوی دُعائیں دینے لگیں۔

"انسان بنو بابا، ماں کا چہرہ روشن کرو ———"

اس کے بعد دینکر ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ پران متھ بابو کے پاس جاتا رہا، پران متھ بابو کے پاس جاکر ہمیشہ اُسے عجیب سا احساس ہوتا۔

پران متھ بابو کہتے ——— "میرے پاس بہت ساری کتابیں ہیں، اگر کبھی تمھیں پڑھنے کی خواہش ہو تو میرے یہاں آکر پڑھ سکتے ہو، تم دیکھو گے، ان کے جیسا دوست دُنیا میں اور کوئی نہیں ہے، کتاب کبھی دھوکہ نہیں دیتی ———"

اُسے یاد ہے۔

پران متھ بابو کے یہاں سے نکل کر ماں گھر چلی گئی تھی اور دینکر کو کالج جانا تھا، وہاں سے داخلہ کا فارم لانا تھا اور فیس دے کر داخلہ لینا تھا، ماں کچھ دنوں سے ایک روپیہ دو دو پیسہ کر کے پس انداز کر رہی تھی، ماں کے نزدیک ایک پیسہ بھی قیمتی تھا، وہ لکڑی کے بکس میں ایک ایک پیسہ جمع کر رہی تھی اور روپیہ پورا کر رہی تھی۔

کبھی کبھی دینکر کہتا ——— "ماں ایک پیسہ دو گی؟"

"پیسے لے کر کیا کرو گے؟" ماں پوچھتی۔

دینکر جواب دیتا ——— "پینا بادام کھاؤں گا۔"

ماں کہتی ——— "جب بڑے ہو جاؤ گے تو بہت سارا بادام کھاؤ گے بابو' بہت سا گھگھنی دانہ کھاؤ گے' ابھی یہ پیسہ تمہارے ہی لیے جمع کر رہی ہوں' تمہاری ذات میں کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے' جانتے ہو' میں تو ایک پیسہ بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گی۔"

ماں انوکھے طریقوں سے پیسے کما رہی تھی' محلے کے کسی بڑے آدمی کی بہو کے لیے گدڑی سلائی کر دیتی' ماں کو وہ لوگ پھٹے پرانے کپڑے دے جاتے اور جب ماں گدڑی سی دیتی تو اُسے دو آنے اس کی مزدوری ملتی' اس کے علاوہ وہ دُوسروں کا خط لکھ دیتی' کپڑے سلائی کر دیتی' بھوڑھی بھون دیتی' مختلف آدمیوں کے مختلف کام کر دیتی اور اس کے بدلے ماں کو کہیں سے ایک پیسہ ملتا اور کہیں سے ایک آنہ اور اس پیسے کو ماں لکڑی کے بکس میں بند کر کے رکھ دیتی۔ ماں اپنی ذات پہ ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتی۔ ماں سوچتی ہے دیپو کے لیے رکھ دینا چاہیئے' دیپو کی پڑھائی میں کام آئے گا' دیپو کے کپڑے بنانے کے کام آئے گا' دیپو کی ذات پہ خرچ کم تو نہیں' ابھی تو دیپو کی ساری زندگی پڑی ہوئی ہے' دیپو انسان بنے گا' بڑے عہدے کی ملازمت کرے گا' دیپو بھی دُوسرے قابل آدمی کی طرح ہو گا دیپو کے لیے ماں کی فکر کی انتہا نہ تھی۔

ٹھیک ہاجرہ روڈ کے سامنے آتے ہی کرن سے ملاقات ہو گئی' دھوپ میں اس کا چہرہ جھلس گیا تھا' شاید آج اس کا نہانا اور کھانا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

دینکر کو دیکھتے ہی کرن آگے بڑھ آیا۔ مسکراتے ہوئے بولا ———

"میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا دیپو ———"

اور جب دینکر اس کے قریب آگیا تو بولا ———

"ایک خوشخبری ہے رے۔"

"کیا خبر ہے؟" دینکر نے پوچھا۔

"نرمل پالت کو اپنی لائبریری کا ممبر بنا لیا ہے' معلوم ہے۔" کرن نے جواب دیا۔

"ہر مہینے ایک روپیہ چندہ دے گا' مجھے بلایا ہے۔"

وُہی نرمل پالت' کالی گھاٹ اسکول میں ففتھ کلاس تک پڑھنے کے بعد ساؤتھ سوبربن چلا گیا تھا' ہمیشہ فرسٹ آتا تھا' ایک مرتبہ دینکر اور کرن پھر اس کے یہاں گئے تھے۔ ان ہی دنوں کرن کے گھر کے باہر ایک پھوس کے مکان میں نئی نئی لائبریری قائم کی گئی تھی۔ بہت ساری کتابیں اکٹھا کی گئیں۔ کرن کے گھر جتنی بھی پُرانی جنتریاں تھیں' رامائن' مہا بھارت الجبرا' جیومیٹری' جتنی کتابیں تھیں' سب کو جمع کر کے کرن نے ایک لائبریری قائم کی تھی' ایک کاپی میں ممبروں کا نام

لکھ رکھا تھا، ان سبھوں کو چندہ دینا ہوگا۔ اس کے بعد جب لائبریری خوب بڑی سی ہو جائے گی تو اس وقت ہزار روپیہ ماہوار کرایہ پر ایک بڑا سا مکان لے لیا جائے گا۔

کرن کہتا ـــــــ "دیکھ لوگے، میں کچھ ہی دنوں میں تین ہزار کتابیں جمع کر لوں گا۔"

اس کے بعد دینکر اور کرن لوگوں کے گھروں میں جاکر کتابیں مانگ مانگ کر لے آتے، کسی کے بھی گھر میں انھوں نے پڑھنے کی کتاب باقی نہیں چھوڑی۔ اس کے پاس بھی جتنی کتابیں تھیں وہ ایک دن سب کی سب کرن کو دے آیا۔

کرن کہتا ـــــــ "چندے کی کاپی لے کر ایک روز گھر گھر گھومنا ہوگا ـــــــ"

کتابیں جمع ہو گئی تھیں لیکن چندہ ادا نہیں ہو رہا تھا۔

راکھال چنڈی بابو کے خاندان کا لڑکا تھا، بڑا آدمی، دوپہر کے وقت ان کے گھر کا دربان دھنی رام ٹفن کے وقت کانسے کے گلاس میں ڈھک کر دودھ لاتا اور چار رس گلّے۔ اسکول کا دربان دوپہر کے وقت گیٹ بند کر دیتا تھا، جو لڑکے گھر سے پیسے لے کر آتے، وہ گیٹ کے شگاف سے ہاتھ باہر نکال کر آلو کابلی، گھگھنی دانہ اور امست خرید کر کھاتے، لاٹری کے بسکٹ بھی تھے۔ نمبر دیے ہوئے ایک گول دائرے پر کانٹے کو گھما کر چھوڑ دیا جاتا اور کانٹا گردش کرتے ہوئے جس نمبر پر آ کر رک جاتا وہ ایک پیسہ میں اتنے ہی بسکٹ دے دیتا اور ٹفن کا گھنٹہ بجنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی رام دھنی آ کر کھڑا رہتا اور ہاتھ میں دودھ کا گلاس لیے رہتا، وہ جگہ خوب سایہ دار تھی، عشق پیچاں کی ایک گھنی بیل نے گیٹ کو ڈھک رکھا تھا۔ عشق پیچاں کی شاخیں بھی کافی موٹی ہو گئی تھیں۔

رام دھنی آواز دیتا ـــــــ "دادا بابو، اے دادا بابو ـــــــ"

راکھال موٹا گول گپّا سا لڑکا تھا، ہاف پینٹ اور قمیض پہنے کلاس میں بیٹھا رہتا، اس وقت اسکول کے میدان میں بھی سبھی لڑکے لٹو گھمانے میں مشغول رہتے، کوئی آنکھ مچولی کھیلتا رہتا، آنکھ مچولی دراصل بہت مزیدار کھیل تھا۔ ایک لڑکا چور ہوتا سبھی پولیس بن کر اس کی تلاش کرتے، اس کے علاوہ ایک کھیل چکر کاٹنے کا بھی تھا، یہ کھیل بھی بہت مزیدار تھا۔

رام دھنی پھر آواز دیتا ـــــــ "اے دادا بابو، دودھ پی لو ـــــــ"

آخر جب کسی طرح راکھال دودھ نہ پیتا تو رام دھنی اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر سے جا کر کہتا، اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر رام رتن بابو تھے، بہت سخت آدمی تھے، چادر کو بغل سے نکال کر سینے کے گرد کس کر لپیٹے رہتے، رام دھنی کی آواز سن کر دوڑے ہوئے آتے اور آتے ہی چیخ اٹھتے ـــــــ

"اے اسٹوپڈ ـــــــ"

راکھال منہ سوکھا کر کھیل چھوڑ کر آتا اور خاموش کھڑا ہو جاتا۔

رام رتن بابو کہتے ـــــــ

"دودھ کیوں نہیں پیتے، پی لو ـــــــ"

راکھال آہستہ آہستہ رام دھنی کے ہات سے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں سارا دُودھ پی جاتا! اس کے بعد یکے بعد دیگرے چاروں رس گلے مُنہ میں بھر لیتا۔ رس گُلہ نگلتے ہوئے جیسے راکھال کا دم گھٹنے لگتا، دینکر، کرن، پھٹک، رمان اور لکھن سرکار سبھی اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ راکھال کا چہرہ رس گلہ چباتے وقت ایسا ہو جاتا جیسے وہ نیم کا پتہ چبا رہا ہو۔

سب کچھ کھا پینے کے بعد رام رتن بابو کہتے ——

"آئندہ تمھارے نام میں کوئی شکایت سُننا نہیں چاہتا، سمجھے؟"

راکھال چہرہ جھکا کر اثبات میں گردن ہلاتا۔

رام رتن بابو پھر کہتے ——

"دُودھ پینے میں تم ٹال مٹول کرتے ہو، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، تمھیں معلوم ہے دُودھ بہت طاقت ور غذا ہے، دُودھ پینے سے صحت اچھّی رہتی ہے، صحت اچھّی رہنے سے برین اچھا رہتا ہے اور برین اچھا رہنے سے ہی تو پڑھ لکھ سکو گے —— جاؤ ——"

اتنا کہہ کر رام رتن بابو چلے جاتے۔

اس وقت راکھال اپنا اصلی چہرہ باہر نکالتا، رام دھنی سے کہتا ——

"ٹھہرو، میں آج تمھارے ساتھ کیا کرتا ہوں، تم جب سوئے رہو گے میں تمھاری ناک کاٹ دوں گا۔"

اس کی بات سُن کر دینکر، کرن، پھٹک اور رمان سبھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے۔

اس کے بعد راکھال ایک کبت پڑھتا ——

رام دھنی پانڑے
دوئی نئی بھانڑے
پانڑے رہا تھائے لمبا ٹیکی
ٹیکی نیئے کھو روچ لیکھی
ٹیکی کاٹبو کچ کچئیے
پانڑے مور بے جھٹ پٹیے

یہ وہی راکھال تھا، کسی کسی روز راکھال کسی قیمت پر رس گلہ کھانے کے لیے تیار نہ ہوتا۔

وہ دینکر سے کہتا ——

"اے دیپو کھاؤ گے؟"

رام دھنی دینکر کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا۔

دینکر کہتا ——— "نہیں بھائی، میرا پیٹ بھرا ہوا ہے ———"

کرن نے اسی راکھال کو لائبریری کا ممبر بنالیا تھا، ایک آنہ چندہ ہر ماہ دینا ہوگا، زیادہ دینے سے بھی کوئی ہرج نہیں اسی پیسے سے کتابیں خرید کر لائبریری بڑی کی جائے گی، اس کے بعد جب لائبریری میں اور پیسے آجائیں گے تو ایک مکان تیار کیا جائے گا، اس وقت سبھی لائبریری دیکھنے آئیں گے، جب مہاتما گاندھی آئیں گے تو ان کو بھی بلاکر دکھایا جائے گا۔ جیسے ایم سیبن گپتا آئیں گے۔ لائبریری میں اچھی اچھی کتابیں رہیں گی۔

راکھال نے کہا ——— "میں تم لوگوں کو بہت سی کتابیں دوں گا، میرے گھر میں بہت سی کتابیں ہیں۔"

اور واقعی کرن جاکر تمام کتابیں لے آیا تھا، موٹی موٹی جلد بندھی ہوئی کتابیں تھیں، سب انگریزی کی کتابیں تھیں، ٹھیک ہے انگریزی کتابیں بھی رہیں۔ انگریزی کتابوں کا رہنا بھی ضروری ہے۔

راکھال نے کہا ——— "کسی سے مت کہو گے، کاغذ میں لپیٹ کر لے جاؤ، ورنہ بھیا دیکھیں گے تو بگڑیں گے۔"

اور کرن کاغذ میں لپیٹ کر تمام کتابیں لے آیا تھا۔ کرن تمام دن اسی لائبریری میں رہتا، کتابیں نکال کر انھیں دوبارہ سجاکر رکھتا، الماری نہیں تھی، میز نہیں تھی، کرسی نہیں تھی، کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف فرش پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی اور دیوار میں اینٹیں سجاکر ان پر کتابوں کی قطاریں کھڑی کردی گئی تھیں، دینکر نے کتنے ہی دنوں جاکر دیکھا تھا، کرن چپ چپ اکیلے اس کمرے میں بیٹھا رہتا۔

دینکر کہتا ——— "کیا رے، اکیلے کیا کر رہا ہے؟"

کرن جواب دیتا ——— "کوئی نہیں آتا، کوئی نہیں آئے گا تو میں اکیلے لائبریری کیسے چلاؤں گا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا بھائی ———"

کرن کے استقلال اور مستقل مزاجی کی داد دینی پڑتی ہے، کتابیں ہیں، ممبر نہیں ہیں، کوئی بھی لائبریری میں نہیں آتا، اس اندھیرے اور مرطوب کمرے میں آکر بیٹھنے کی کسی کو فکر نہیں تھی، سبھی اس وقت پارک میں فٹ بال کھیلنے گئے ہوتے یا ہریش پارک میں بیٹھے ہوئے یا راستے پر کھڑے پتنگ اڑا رہے ہوتے، اس وقت کرن اکیلا اس اندھیری کوٹھڑی میں بیٹھا رہتا، لائبریری میں جھاڑو دیتا، کتابوں کی گرد جھاڑتا، ان پر نمبر لگاتا، کھاتے میں نام لکھ کر ان کی فہرست تیار کرتا ——— ایک کام تو نہیں تھا!

کرن کہتا ——— "بیٹھ، تجھ سے ایک مشورہ لینا ہے۔"

دینکر پوچھتا ——— "وہ کیا؟"

"اس لائبریری کا ایک نام رکھنا ہوگا بھائی، میں نے ایک نام تجویز کیا ہے، کیسا نام ہے بتاؤ تو ——— دی کالی گھاٹ بوائز لائبریری ———"

دینکر نے کہا ——— "یہ تو بہت عمدہ نام ہے۔"

کرن نے کہا —— "ایک سائن بورڈ لگانا ہوگا، تم ایک ٹین دے سکو گے، چوکور ہونا چاہیے، میں رنگ کر خود ہی لکھ لوں گا۔"

آخر ایک ٹین کا بھی انتظام ہوگیا، اگھور دادو کے آنگن میں ایک کنستر بہت دن سے پڑا ہوا تھا، اسی کو پیٹ کر سیدھا کیا گیا تھا۔ بجس رنگنے کی دکان سے رنگ لا کر انگریزی میں سائن بورڈ تیار کر لیا گیا۔ صرف سائن بورڈ ہی نہیں۔ کرن نے ایک ربڑ اسٹامپ بھی بنوا لیا تھا، صدر دینکر بن گیا تھا اور سیکریٹری کرن تھا۔

کرن گھوم پھر کر چندہ اکٹھا کرتا۔ کلاس کے ہر لڑکے سے چندہ وصول ہوگیا، اس کے بعد کلاس سے باہر اس نے کام شروع کر دیا۔ مدھوسودن کے بڑے بھیا نے دو آنے دیے تھے، دونی کاکا نے بھی دو آنے دیے تھے۔

دونی کاکا نے کہا تھا —— "پھر لائبریری کیوں بنا رہے ہو بابا، لائبریری قائم کر کے کیا ہوگا؟ دل لگا کر پڑھتے لکھتے ہو؟"

کرن نے جواب دیا —— "آؤٹ بک پڑھیں گے، اسی لیے ——"

"کیا آؤٹ بک پڑھو گے، سنوں؟ پہلے یہ بتاؤ کہ آؤٹ بک کے معنی کیا ہیں؟ آؤٹ بک کا ہجے کرو تو پہلے تم لوگ ——"

دینکر ڈر گیا تھا۔

کرن نے کہا —— "باہر کی کتابیں نہ پڑھنے سے نالج نہیں بڑھتا۔"

"تم نے نالج کہاں سے سیکھ لیا! نالج کا ہجے کر سکتے ہو چھوکرے! نالج لے کر کیا کرو گے دھو کر پیو گے تم لوگ؟ ایشور چندر ودیا ساگر بننا ہے؟"

چھوٹے دا نے کہا —— "آہا، دو آنہ پیسہ مانگ رہے ہیں تو دے دو نا دونی کاکا۔"

دونی کاکا بگڑ گئے، بولے ——

"ارے تم نہیں سمجھتے، دیکھتے نہیں محلے میں سی۔ آئی۔ ڈی گھوم رہے ہیں۔ سودیشی کتاب رکھ لی تو کسی دن مصیبت آ جائے گی! کہیں ٹیگارٹ صاحب کو خبر مل گئی تو بھی کو پیٹ کر تختہ بنا کر چھوڑ دے گا —— ٹیگارٹ صاحب کو تم لوگ تو پہچانتے نہیں ——"

آخر کار دونی کاکا نے فتوحی کی جیب سے دونی نکال کر دے دی تھی۔

کرن اس کی رسید دینا چاہ رہا تھا۔ دونی کاکا نے کہا ——

"رسید دینے کی ضرورت نہیں، کہیں نام دیکھ کر کسی دن ایلیشیم رو میں پکڑ کر لے گیا تو نوکری ختم —— ٹیگارٹ صاحب کو تو تم لوگ پہچانتے نہیں ——"

وہی کرن، جب تمام لڑکے لکھنے پڑھنے، قصے کہانیوں اور جھگڑوں میں مشغول ہوتے، وہ لائبریری کے

کام میں محو ہوتا، کرن کی بڑی آرزو تھی کہ دیش میں سوراج ہوگا اور سی۔ آر۔ داس راجہ ہوں گے۔ اس کی بڑی آرزو تھی کہ اس کے بابا کی بیماری اچھی ہو جائے گی اور اس کی مالی حالت بہتر ہو جائے گی۔ لیکن سی۔ آر۔ داس کی موت کے بعد سے کرن جیسے بالکل ہی بدل گیا تھا اور اسی عرصے میں ایک دن اس کے دماغ میں لائبریری قائم کرنے کا بھوت سوار ہو گیا اور جب دُوسرے لڑکے مختلف کاموں میں اُلجھے ہوئے ہوتے، کرن دن رات لائبریری ہی کے بارے میں سوچتا رہتا، انسانوں کی دُنیا میں دو ایک آدمی شاید ایسے ناسمجھ بھی ہوتے ہیں اور اس دُنیا میں شاید دو ایک آدمی ایسے بے حساب بھی ہوتے ہیں جو دل و جان سے انتھک کوششوں سے کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور پھر ایک دن ایسا بھی آتا ہے، جب اس کے کام کا بھی پتہ نہیں چلتا اور خود اس کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا ہے، جب کوئی کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس وقت اصل آدمی کا کہیں پتہ نہیں ملتا، اس وقت وہ بے حساب، ناسمجھ اور کام سے پیار کرنے والا آدمی کہاں چلا جاتا ہے، کوئی اس کی خبر نہیں رکھتا، کوئی اس کی تلاش نہیں کرتا۔

کرن ہی کے ساتھ دینکر ایک بار نرمل پالت کے یہاں گیا تھا۔

چنڈی بابو ہی کی طرح بیرسٹر پالت بھی بڑے آدمی تھے، لیکن وہ دُوسری قسم کے آدمی تھے، چنڈی بابو امرا میں سے تھے۔ ان کے پاس کار تھی، سرکار، منشی اور محرّر تھے، گماشتہ اور دربان تھے، وہ جنم اشٹمی، رادھا اشٹمی اور درگا پوجا کا تہوار مناتے تھے، ان کا لڑکا راکھال دُودھ پیتا تھا اور رس گلہ کھاتا تھا، لیکن بیرسٹر پالت نئے زمانہ کے آدمی تھے، کسی زمانے میں کلکتہ میں ہائی کورٹ بنا تھا، پنچایت اُٹھا کر انصاف کی کُرسی پر انگریز سامراج قابض ہو گیا تھا، اس کے پیچھے کتنی ہی سچائی کیوں نہ ہو، کتنا ہی نیک مقصد کیوں نہ ہو، ان کے خیالات کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں، لیکن اس کے نتیجے میں انسانوں کی ایک نئی جماعت کی تخلیق ہوئی تھی اور یہ لوگ کالی گھاٹ نہیں جاتے تھے، تہواروں میں حصّہ نہیں لیتے تھے، اور بنگالی ہونے کے باوجود فرنگیوں کے علاقے میں رہتے تھے۔ ان کے گھروں میں کھانا پکانے والے باورچی اور خانساماں ہوتے، بچے آیا کی گود میں پرورش پاتے اور بابا کو ڈیڈی اور ماں کو ممی کہتے تھے۔

اور نرمل پالت اسی سماج کا تھا، اُسے دربان اسکول چھوڑنے جاتا اور چھٹی ہونے کے بعد اپنے ساتھ گھر لے آتا اور اسی لیے نرمل کے ساتھ اس کی کبھی دوستی نہ ہو سکی؛ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ پارک میں ملاقات ہو جاتی اور دو چار باتیں ہو جاتیں۔ جس روز دیش بندھو کا انتقال ہوا تھا، اس روز بھی اس نے اُسے دربان ہی کے ساتھ راستے میں کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔ دیش بندھو بھی تو بیرسٹر تھے، بیرسٹر پالت کے ہم عمر بھی تھے اور ہم پلہ بھی۔ شاید اسی لیے وُہ آیا تھا۔

دینکر کو یاد ہے، نرمل پالت کی کوٹھی میں جاتے ہوئے اُسے بے حد خوف محسوس ہوا تھا، کوئی مکان ایسا بھی ہوتا ہے جس کے اندر داخل ہوتے ہوئے خواہ مخواہ ڈر معلوم ہوتا ہے، نرمل پالت کی کوٹھی بھی ٹھیک ویسی ہی تھی، سامنے ایک گھیرا تھا جس میں پھولوں کا باغ تھا اور وہیں پر ایک دربان بیٹھا رہتا تھا، کبھی کبھی ایک کتا بھی

بیٹھا رہتا۔

کرن نے کہا ——— "چلو، ڈر کس بات کا، ہم لوگ چور تو نہیں، اندر چلو ———"

اس سے بھی پہلے کا ایک واقعہ اُسے یاد ہے۔

ان دنوں کرن کی لائبریری کو قائم ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے اور کرن ہر آدمی کے پاس چندہ کے لیے ہاتھ پھیلاتا پھر رہا تھا، کرن کو ضد تھی کہ وہ اکیلا ہی لائبریری قائم کر کے رہے گا، ان دنوں اس کا اس کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا اور یہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔

اِس روز بھی دینکر کوٹھی کے سامنے جا کر رُک گیا تھا۔

کرن نے ہمت دلاتے ہوئے کہا ———

"ڈر کس بات کا، چلو ———"

دینکر نے کہا ——— "مجھے ڈر لگ رہا ہے، اگر بھگا دے ———"

"کون بھگا دے گا، میں تو جا رہا ہوں، میرے ساتھ چلے آؤ ———"

اتنا کہہ کر وہ آگے آگے چل پڑا۔

اندر جاتے ہی دربان نے سامنے آکر کہا ———

"کون ہے، ادھر کیا مانگتا ہے؟"

دینکر ڈر کر بھاگا آرہا تھا اور کرن بھی کچھ گھبرا سا گیا، لیکن اس کے بعد ہی سنبھل گیا اور دربان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"نرمل بابو ہے؟ میں نرمل سے ملنے آیا ہوں ———"

"کھوکا بابو؟"

کرن نے جواب دیا ——— "ہاں، کھوکا بابو! ہم لوگ کھوکا بابو کے ساتھ ایک ہی اسکول میں پڑھتے ہیں، ہم لوگ کلاس فرینڈ ہیں ———"

دربان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

اُس نے کہا ——— "تو پھر صاحب کے پاس چلو ———"

کرن دربان کے ساتھ چلنے لگا، پھر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"آؤ نا دینو، چلے آؤ، میں تو ہوں، ڈر کس بات کا ہے!"

اور کرن کے ہمت دلانے پر وہ بھی پیچھے پیچھے چل پڑا۔ برآمدے میں ایک بڑی خوبصورت سی کار کھڑی تھی

اور ایک کُتّا زبان نکالے ہوئے کھڑا کھڑا گھور رہا تھا۔ گملے میں موسمی پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے، ایک ڈنڈے پر کاکاتوا بیٹھا تھا اور سرکارُواں کھڑا کیے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کے قریب ہی ایک برہنہ پری تھی، مرمر سے تراشی ہوئی وہ پری اپنے کپڑے سنبھالنے میں مصروف تھی۔

کرن اور دینکر دربان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔

دربان نے جوں ہی کمرے کا دروازہ کھولا، اندر سے سُوٹ پہنے ہوئے ایک آدمی زور سے چیخ اٹھا، شاید یہی نرمل کے بابا، بیرسٹر پالٹ تھے۔

دینکر پھر گھبرا گیا تھا۔

لیکن کرن سیدھا کمرے کے اندر داخل ہو گیا، اس کے بعد دینکر بھی اندر چلا گیا، اتنے میں ایک بنگالی بابو تیزی سے آکر دروازہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

کرن نے بلا جھجک پُوچھا ———— "نرمل ہے؟"

یکایک بیرسٹر پالت چیخ اُٹھے۔

"Who are these urchins Babu?"

بابو کی حالت ایسی تھی جیسے اس سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہو۔

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا ———— "کھوکا، تم لوگ بھی چلے جاؤ، تم بھی اس وقت یہاں سے چلے جاؤ، صاحب غصّہ ہو رہے ہیں ————"

دربان کو پھر ایک موقعہ ہات آگیا، اس نے کہا ————

"چلو، چلو، نکلو ————"

لیکن کرن بھی ہار ماننے والا نہیں تھا، اس نے کہا ————

"ہم لوگ نرمل کی تلاش میں آئے ہیں ————"

یکایک بجلی کڑکی، بیرسٹر پالت چیخ اُٹھے ————

"Ask them to clear out....."

بیرسٹر پالت نے انگریزی زبان استعمال کی تھی یا بنگالی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اور کسی نے سمجھنے کا موقعہ بھی نہیں دیا، اتنی ہی دیر میں دربان ان دونوں کو کھینچ کر باہر لے آیا اور اس کے بعد وہ دونوں ایک طرح سے دھکّا کھا کر کوٹھی سے باہر آ گئے۔

دینکر نے کہا ———— "اب میں نرمل کی کوٹھی میں کبھی نہیں آؤں گا بھائی ————"

"ضرور آؤں گا" کرن نے کہا ———— "نرمل سے لائبریری کا چندہ تو وصول کرنا ہی ہوگا ————"

اُسے یاد ہے، کوٹھی سے باہر آنے کے بعد دینکر نے ایکبار پلٹ کر کوٹھی کی طرف دیکھا تھا اور اُسے اُس وقت وہ کوٹھی بڑی بے رحم، بڑی سنگ دل نظر آئی تھی، جس میں کہیں پر بھی ممتا نہیں تھا، پیار نہیں تھا، وہ کوٹھی سجی ہوئی تھی، خوبصورت تھی، اس کوٹھی میں پھولوں کے گملے بھی تھے، کاکا تو ابھی تھا، برہنہ پڑی بھی تھی پھر بھی جیسے کسی چیز کی کمی رہ گئی تھی، سب کچھ ہونے کے باوجود جیسے کوئی چیز گم ہو گئی تھی اور سب کچھ پانے کے باوجود بہت کچھ نہ پانے کی چھاپ اس کوٹھی پر لگی ہوئی تھی اور جیسے کاکا نوا کے سر کے کھڑے رویئں اور مغموم چہرے میں اس کی کوٹھی کی اصلیت چھپی ہوئی ہو۔

کرن نے کہا —— " ٹھیک ہے، تم دیکھ لو گے، میں چندہ وصول کر کے رہوں گا، چندہ دیئے بغیر وہ کہاں جا سکتا ہے —— "

اور اتنے دنوں بعد آج کرن کی زبانی اسی نرمل پالیت کا نام سن کر دینکر کو سخت حیرت ہوئی۔

کرن نے کہا —— " نرمل کو ممبر بنا لیا ہے جانتے ہو، ماہانہ ایک روپیہ چندہ دے گا، بولا ہے —— مجھے بلایا ہے، چلو گے ؟ "

دینکر نے کہا —— " اگر اس کے بابو پھر بھگا دیں ؟ "

" دُور، اس قسم کا خوف کرنے سے لائبریری نہیں چل سکتی ! اس قسم کے کتنے ہی لوگ بھگا دیں گے، گالیاں دیں گے، تو کیا کام کرنا چھوڑ دیں۔"

دینکر نے پوچھا —— " تمہارے بابا کو معلوم ہے کہ تم فیل ہو گئے ہو ؟ "

" جان کر بھی کیا کریں گے " کرن نے جواب دیا —— بات تو کر نہیں سکتے، ان کا گلا اور بھی سُوج گیا ہے۔"

" لیکن تم کیا کرو گے ؟ پھر پڑھو گے ؟ "

" اب پڑھنے سے فیس دینی ہو گی " کرن نے جواب دیا —— " فری تو کریں گے نہیں، چھوڑو پڑھ کر بھی کیا ہو گا، وُہی سنسکرت گرامر کی گردان، وُہی انگریزی ٹرانسلیشن، یہ سب پڑھ کر کیا ہو گا، میں لائبریری میں بیٹھے بیٹھے بہت سی کتابیں پڑھ چکا ہُوں۔"

" کون سی کتابیں ؟ "

" یہی میک سوئنی، میٹ سینی، گیری بولڈی کی لائف وغیرہ سب پڑھ چکا ہُوں، سمجھے اور بھی پڑھوں گا، کتابیں پڑھ پڑھ کر میری معلومات بڑھ گئی ہیں، تم لوگ کالج میں پڑھو، تم لوگ نوکری وکری کرو، مجھ سے یہ سب نہیں ہو گا، مجھے تو کوئی ملازمت نہیں دے گا، پھر میں کس لیے پڑھوں ؟ کس کے لیے پڑھوں ؟ اور اب مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میرے پاس روپیہ کبھی نہ ہو گا۔"

" کیوں ؟ "

"دور بھائی، مجھے معلوم ہو چکا ہے" کرن نے جواب دیا ——— "زبردستی چھینے بغیر کسی کے پاس روپیہ نہیں ہوتا، یہ دنیا طاقتوروں کی غلام ہے! چھینے بغیر روپیہ نہیں ملتا، سوراج بھی نہیں ملتا، کوئی تمھارا منہ دیکھ کر تم کو روپیہ نہیں دے گا، یہ دُنیا اتنی سیدھی نہیں ہے ———"

اور اس روز کرن کی باتیں سُن کر دینکر کو بڑی حیرت ہوئی تھی، اس کرن نے بھی ایک روز کتنے حسین خواب دیکھے تھے، آرزوؤں کے کتنے محل تعمیر کیے تھے، دُنیا سے کتنی محبت کی تھی! یکایک اسی کی زبان سے ایسی باتیں بڑی عجیب سی لگ رہی تھیں، جیسے کرن اب بالکل بدل گیا تھا، اس کا وہ سادھو کہاں گیا؟ وہ ہمالیہ کا اصلی سادھو؟ جس نے سونار کا رنگ کے گھاٹ پر بیٹھ کر کرن کو بہت ساری اُمیدیں دلائی تھیں! کرن کے بابا کی بیماری اچھی ہو جائے گی، کرن کی غربت دُور ہو جائے گی، کرن کا ملک آزاد ہو جائے گا! وہ سادھو کہاں چلا گیا اور کرن بھی کہاں چلا گیا، سی۔ آر۔ داس بھی کہاں چلے گئے! کرن کی طرف دیکھ کر دینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کئی برسوں میں کرن کی تمام اُمیدیں، تمام آرزوئیں، تمام حسین خواب ٹوٹ کر بکھر گئے ہوں۔

دینکر نے پوچھا ——— "کیسے چھین لوگے؟"

"جھوٹ بولوں گا" کرن نے جواب دیا ——— "لوگوں کا قتل کروں گا، جو میری خوشی ہو گی وہ کروں گا، میٹھی میٹھی باتوں سے کچھ نہ ہو گا۔"

"اس کے معنی؟"

"اس کے معنی یہ ہوئے" کرن نے جواب دیا ——— "کہ اب سی۔ آر۔ داس اور گاندھی کی باتوں سے کچھ نہیں ہو گا، کانگریس کی باتوں سے کچھ بھی نہ ہو گا، کانگریس کی باتوں سے سوراج ہو گا نہ کیلا ہو گا! بھوجودا نے مجھے کچھ سمجھا دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"انگریز لوگ اتنی مصیبت اُٹھا کر اس مُلک میں آئے ہیں" کرن نے کہا ——— "یہاں اُنھوں نے اتنی بڑی تجارت، اتنا بڑا کاروبار پھیلایا ہے، یہ سب کیا ہم لوگوں کو دے دینے کے لیے کیا ہے؟ بھوجودا نے کہا ہے اس دُنیا میں ہر چیز چھین لینی پڑتی ہے۔ گھر سے ہو، سماج سے ہو یا کسی مُلک سے ہو! آئرلینڈ والوں نے اپنا مُلک چھین کر آزاد کرا لیا تھا، امریکہ نے جنگ کر کے اپنے مُلک کو آزاد کرایا تھا، سمجھے، طاقت سے دُنیا فتح کی جا سکتی ہے میں بھی سب کچھ چھین لوں گا، اب میں جینو نہیں بیچوں گا ———"

"پھر تمھارے گھر کا خرچ کیسے چلے؟"

"وہ سب کبھی دُوسرے دن بتاؤں گا" کرن نے جواب دیا ——— "پیسہ کمانے کے کئی آسان طریقے ہیں، بھوجودا نے مجھے سب کچھ سکھا دیا ہے ———"

"بھوجودا کون ہے سے ؟"

"میرے اُستاد" کرن نے جواب دیا ——" میں تمھیں بھی کسی دن اپنے اُستاد کے پاس لے جاؤں گا، دیکھو گے تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی، سمجھے، بھوجودا نے کہا ہے کہ ہم لوگ جو غریب ہیں اس میں بھگوان کا کوئی قصور نہیں ہے، ہم لوگ انسانوں کی وجہ سے غریب ہیں، سرمایہ داروں نے ہم لوگوں کو غریب بنا رکھا ہے، یہ انگریز بھی تو سرمایہ دار ہیں! ان انگریزوں کو جس طرح بھی ہو یہاں سے بھگانا ہو گا، میں تمھیں ایک روز بھوجودا کے پاس لے جاؤں گا، دیکھو گے ہم لوگوں کا پلان بن رہا ہے، ابھی میں کچھ نہیں بتاؤں گا——"

نرمل کی کوٹھی قریب آگئی تھی۔

پھر وُہی بیرسٹر پالت کی کوٹھی تھی، سامنے ہی دربان بیٹھا ہوا تھا، قطار در قطار گملے رکھے ہوئے تھے جن میں پھولوں کے پودے تھے، ایک ڈنڈے پر سر کو پھیلائے ہوئے کاکاتوا بیٹھا تھا اور پری کا مجسمہ کپڑے سنبھالنے میں مصروف تھا۔

آج کرن کو کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا، جیسے ان کئی دنوں میں ہی وہ بالکل بدل گیا تھا، میٹرک فیل ہونے کے باوجود کرن نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا ایک ہی دن میں جیسے وہ بالغ اور باشعور ہو گیا تھا حالانکہ اسی کرن کے ساتھ وہ کتنے ہی دنوں تک سڑکوں پر گھومتا رہا تھا۔ ان دنوں کرن کتنا معصوم تھا، اُس سے کتنا قریب تھا، ایسا معلوم ہوتا جیسے کرن اور دینکر ایک ہی آدمی کے دو نام ہیں، ان کے مسائل ایک تھے، ان کی قسمت ایک تھی! لیکن قدرت نے اُسے میٹرک کے امتحان میں فیل کر کے بہت بڑا بنا دیا تھا، بہت گیانی بنا دیا تھا، بہت گُنی بنا دیا تھا اور دینکر کو ایسا لگا جیسے وہ کرن سے بہت چھوٹا ہو گیا ہو!

کرن گیٹ کھول کر دندناتا ہُوا اندر چلا گیا۔

حیرت ہے! ایسا بے پروا تو کرن کبھی نہیں تھا! کرن کے اندر اتنی ہمت کہاں سے آگئی!

اسی دن کی طرح آج بھی دربان سامنے ہی بیٹھا تھا۔

کرن نے جاتے ہی اس سے پُوچھا۔

"کھوکا بابو ہے ؟"

دربان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ٹھہریے"——

اتنا کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

کرن نے کہا —— "دیکھ لیا نا! یہی بٹیا اس دن ہم لوگوں کے ساتھ کس بدسلوکی سے پیش آیا تھا، یاد ہے نا؟"

سچ مچ دربان کا سلوک دیکھ کر دینکر کو بڑی حیرت ہو رہی تھی، یہ کیا ہوا؟ اُسے تو اُمید نہیں تھی کہ ایسا ہوگا!
تھوڑی دیر بعد نرمل آگیا۔

دینکر نے بہت دنوں بعد دیکھا تھا، اب اس کی مسیں بھیگنے لگی تھیں آواز قدرے بھاری ہوگئی تھی، یہ وہی نرمل پالت تھا جواب پہچان میں ہی نہیں آرہا تھا۔ جیسے کافی بدلا بدلا نظر آرہا تھا، وہ قمیض اور پائجامہ پہنے ہوئے تھا اور بال بے ترتیب تھے۔

نرمل مسکرایا۔

"ارے دیپو تم؟ کتنے بڑے ہوگئے ہو اب؟ تم تو پہچان ہی میں نہیں آتے؟"

اور دینکر کو یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے صرف نرمل ہی نہیں، وہ بھی بدل گیا ہے! شاید اب وہ بھی جوان ہوگیا ہے!

نرمل نے کہا ——— "پہلے تو میں تمھیں پہچان ہی نہ سکا ———"

دینکر نے کہا ——— "تم فرسٹ ہوئے ہو؟"

"میرے تو چھ ماسٹر تھے۔" نرمل نے جواب دیا ——— "تمھارا کیا ہوا؟"

دینکر نے کہا ——— "میں نے کسی طرح فرسٹ ڈویژن لے ہی لیا ہے ———"

"یہ سب باتیں ابھی رہنے دو۔" کرن درمیان میں بول اُٹھا ———

"میرے چندے کا کیا ہوا بتاؤ؟ نہیں دو گے؟"

اور دینکر سوچ رہا تھا، یہ وہی نرمل پالت ہے! اس نے اُسے پہچان لیا ہے، اس کے ساتھ باتیں کر رہا ہے، اس کے جیسے غریب لڑکے سے باتیں کر رہا ہے، یہی بہت ہے، اس کے ساتھ یہی سلوک بہت ہے، اس کے پاس کیا کم دولت ہے! اس کے پاس کیا کم روپیہ ہے! کیا کم شہرت ہے، کیا کم مرتبہ ہے! سارے کلکتہ کے لوگ اس کے باپ کو پہچانتے ہیں، یہ اسی کا بیٹا ہے! میٹرک میں فرسٹ آنے والا لڑکا، چھ ماسٹر ہوئے تو کیا ہوا! چھ ماسٹر کون رکھ سکتا ہے؟ اور چھ ماسٹر رکھ لینے ہی سے کیا سبھی فرسٹ آجاتے ہیں! دینکر دوسروں سے کہہ تو سکے گا کہ نرمل پالت فرسٹ لوائے اس کا دوست ہے! اس دن کے بیرسٹر پالت کی گالیوں اور بدسلوکیوں کا اثر ایک ہی لمحہ میں زائل ہوگیا، اس کے دل پر چھایا ہوا اس کی بے عزتی کا غم دُھل گیا۔

کرن نے کہا ——— "ولایت جانے سے پہلے مجھے ایک سال کا چندہ دے دو گے، میرے پاس پانسو کتابیں ہوگئی ہیں اور سات سو ہو جائیں گی تو کسی سے لائبریری کی رسم افتتاح کرائیں گے۔"

نرمل نے پوچھا ——— "لیکن تم فیل کیوں کر ہوگئے؟"

"پاس بھی ہو جاتے تو کیا ہوتا۔" کرن نے جواب دیا ——— "اس سے زیادہ تو میں پڑھ نہیں سکتا۔

اتنا روپیہ میں کہاں سے لاتا ؟"

دینکر نے پوچھا ——— "تم ولایت جا رہے ہو ؟"

"بابا کی بڑی خواہش ہے۔" نرمل نے جواب دیا۔

نرمل کے فرسٹ آنے کی خبر سُن کر دینکر کو خوشی ہوئی تھی، لیکن نہ جانے کیوں، اس کے ولایت جانے کا سُن کر غیریت کا احساس ہونے لگا، اُسے محسوس ہوا جیسے نرمل اور اس کے درمیان تفاوت کی دیوار حائل ہے۔

دینکر نے پوچھا ——— "ولایت جانے میں تو بہت روپیہ خرچ ہوتا ہوگا ؟"

"وہ سب باباجانیں۔" نرمل نے جواب دیا ——— "میرا کیا ہے !"

کرن نے روپے لے کر ایک رسید لکھ کر دے دی، ایک روپیہ چندہ، ایک روپیہ ماہانہ ! اس کے لیے یہ رقم کچھ بھی نہ تھی۔ اس طرح نہ جانے اس کا کتنا روپیہ ادھر اُدھر خرچ ہوتا ہوگا، اُسے تو اس رقم کے خرچ ہو جانے کا احساس تک نہیں ہوتا، ایک روپیہ کی اس کے لیے کوئی حقیقت نہیں تھی، حیرت ہے ! اس نے کس بے پروائی سے ایک روپیہ دے دیا تھا۔

گیرج کے سائبان میں کھڑے کھڑے باتیں ہو رہی تھیں، اسی کوٹھی کے اندر داخل ہونے کے لیے ایک روز دینکر دُور دُور سے کتنی حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا تھا، اسی کوٹھی میں داخل ہو کر ایک روز اُسے نرمل کے بابا کی گالیاں سُننی پڑی تھیں، جھڑکیاں سہنی پڑی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ اتنے دنوں بعد گیرج کے سائبان میں کھڑے ہو کر نرمل سے باتیں کرنے میں دینکر کو بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر وہ چندہ نہ بھی دیتا تو بھی دینکر کو کوئی غم نہ ہوتا، نرمل پالت اس سے باتیں کر رہا تھا، نرمل پالت نے اُسے پہچان لیا تھا، یہ کیا کچھ کم تھا۔

یکایک نرمل نے پوچھا

"چائے پیوگے ؟"

"چائے ؟"

دینکر کو حیرت ہوئی۔

"میرے چائے پینے کا وقت ہو گیا ہے۔" نرمل نے کہا ——— "آج دیدی نے اپنی دو سہیلیوں کو بھی اپنے یہاں دعوت کی ہے۔"

"دور، ہم لوگ چائے وائے نہیں پئیں گے۔" کرن یکایک بول اُٹھا۔ "چائے میں مزدوروں کا خون شامل ہے۔"

نرمل اس کی بات سُن کر حیران رہ گیا۔

"مزدوروں کا خون ؟"

"ہاں" کرن نے جواب دیا ——— "چائے بگان کے صاحب لوگ مزدوروں کے پیٹ میں بوٹوں سے ٹھوکر مار کر ان کے خون سے چائے تیار کرتے ہیں، چائے پینا اور مزدوروں کا خون پینا دونوں برابر ہیں۔"

نرمل نے بہت ساری کتابیں پڑھی تھیں، لیکن یہ سب باتیں کسی کتاب میں لکھی ہوئی نہیں تھیں، اس کی بات سن کر نرمل حیرت سے کرن کی طرف دیکھنے لگا، جیسے وہ خود کو مجرم سمجھ رہا ہو۔

اس نے کہا ——— "لیکن ہم لوگ تو روز چائے پیتے ہیں۔"

"تو تم لوگ چائے پیو" کرن نے کہا ——— "ہم لوگ نہیں پیتے، میں بھی نہیں پیتا، دیپو بھی نہیں پیتا اور ہم لوگ کبھی پئیں گے بھی نہیں، تم نے دیکھا نہیں تھا، اخبار میں ایک خبر چھپی تھی کہ آسام میں ایک صاحب نے ایک مزدور کے پیٹ کو بوٹ سے ٹھوکر مار کر چاک کر دیا تھا ———"

نرمل نے کہا ——— "اچھا اب میں چلتا ہوں بھائی، ٹی ٹائم ہو گیا ہے، دیدی وغیرہ بیٹھی ہوئی ہیں، اب دیدی کی سہیلیاں بھی آنے ہی والی ہیں ———"

اتنا کہہ کر نرمل چلا گیا۔ کرن اور دینکر باہر ہی رہ گئے۔

دینکر نے کہا ——— "ارے تم نے چائے پینے سے انکار کیوں کیا؟ چائے پی کر دیکھتے کہ پینے میں کیسی لگتی ہے۔"

کرن نے کہا ——— "دُور، سُرخ رنگ ہوتا ہے، گرم پانی کی طرح، ایک بار میں نے پی ہے۔"

نرمل کے جانے کے بعد کرن اور دینکر گیٹ کھول کر باہر آ رہے تھے۔

یکایک انھوں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا گاڑی کوٹھی کے سامنے آ کر رک گئی۔ بگھی دیکھتے ہی دربان نے پھرتی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا اور ایک سلام داغ دیا۔

بگھی گیٹ کے اندر داخل ہو گئی ———

بگھی نرمل پالت کی تھی، یکایک دینکر سہم گیا، بگھی کے اندر کہیں نرمل کے بابا نہ ہوں اور اگر نرمل کے بابا نے ان دونوں کو یہاں پر دیکھ لیا تو دیکھ کر کہیں اسی روز کی طرح آج بھی خفا نہ ہوں۔

"بھاگ چلو کرن" دینکر نے کہا ——— "شاید نرمل کے بابا آ گئے، پھر بگڑیں گے۔"

لیکن نہیں، دینکر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بگھی کے اندر سے نرمل پالت کے بابا نہیں بلکہ لکھی اور ستی باہر نکلیں۔

ان کے اُترتے ہی دربان نے ایک بار پھر سیدھے ہو کر سلام کیا۔

لکھی دیدی نے پہلے انھیں نہیں دیکھا، ستی پیچھے پیچھے تھی، ویسے ہی بکھرے ہوئے گھونگر یالے بال ——— آج دونوں بہنوں نے ایک ہی رنگ کی ساڑھی پہنی تھی، لکھی دیدی نے بالوں کو چوٹی بنا کر پشت پر ڈال دیا تھا، وہ

دونوں اس کی طرف پُشت کیے کھڑی تھیں۔ اس لیے اسے نہ دیکھ سکیں۔

دینکر نے کہا ——— "چلو کرن، ورنہ ابھی دیکھ لے گی ———"

"یہ کون ہے رے؟" کرن نے پُوچھا۔

دینکر نے کہا ——— "باہر راستے پر نکل کر بتاؤں گا۔"

دونوں تیزی سے باہر نکل کر چل پڑے۔

لیکن اچانک پیچھے سے لکھی دیدی کی آواز آئی۔

"کون ہے، دینو ہے نا؟ اے دینو سُن ———"

دینکر نے پلٹ کر دیکھا۔

لکھی دیدی اور سنتی زینے کے اُوپر کھڑی تھیں۔

دینکر سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

لکھی دیدی دو زینے نیچے اُتر آئی۔

"دینو؟ تم یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

دینکر کو واقعی بڑی حیرت ہو رہی تھی۔

لکھی دیدی اس کے قریب آگئی اور اس کے دونوں کندھوں کو پکڑ کر بولی۔

"کیوں بھاگ رہے تھے؟ مجھے دیکھ کر کیوں بھاگ رہے تھے؟"

دینکر کی قوتِ گویائی ختم ہو گئی تھی۔ وہ کیا جواب دے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ لکھی دیدی کو دیکھ کر کیوں بھاگ رہا تھا، کیوں، لکھی دیدی سے اُسے کس بات کا خوف تھا! لکھی دیدی تو اب اُسے مارتی بھی نہیں تھی، تب؟ کیا شرم سے! سنتی کو دیکھ کر شرم آ رہی تھی، لیکن سنتی تو اُسے پہچانتی بھی نہیں، شاید اُسے تو یاد بھی نہ ہوگا ——— سنتی بھی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی، شاید وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی دیدی کس سے باتیں کر رہی ہے۔

دینکر سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

"تم لوگ یہاں؟"

لکھی دیدی نے کہا ——— "آج یہاں ہم لوگوں کی چائے کی دعوت ہے، مگر تم اب میرے یہاں آتے کیوں نہیں؟"

دینکر کھڑا کھڑا پسینے میں تر ہوتا رہا۔

لکھی دیدی نے سنتی کو مخاطب کر کے کہا ———

"میں اسی کے بارے میں کہہ رہی تھی تجھ سے، یہی ہے، ہر دم تیرے ہی متعلق پوچھتا رہتا تھا، سمجھی، تو دیکھنے میں کیسی لگتی ہے، گوری ہے یا کالی یہی سب، دن رات صرف تیرے ہی بارے میں پوچھتا رہتا ——— لو اب ملا کر دیکھ لو ——— مشابہت ہے یا نہیں ———"

اس کے بعد دینکر کی طرف دیکھ کر بولی ———

"یہی میری بہن ستی ہے، تم اتنی ساری باتیں پوچھتے رہتے تھے، ستی کے لیے اتنے پریشان تھے اور وہی ستی جب سے آئی ہے تم ایک بار دیکھنے بھی نہیں آئے ؟"

اُس وقت ستی کی حالت ایسی تھی جیسے ان کے سامنے کوئی بھوت ہو، وہ زینہ اُتر کر وہ بھی دیدی کی بغل میں آکر کھڑی ہو گئی۔

"او ماں، غضب ہو گیا، یہی ہے وہ دیپو ؟ جو تمہیں جھانک کر دیکھا کرتا تھا !"

"کیوں، تم نے کیا سمجھا تھا ؟" لکھی دیدی نے پوچھا۔

ستی نے اس کی بات ان سنی کر دی، اُس نے دینکر کے دونوں ہات پکڑ لیے ——— "تم کوئی خیال مت کرو ———"

لکھی دیدی جیسے حیرت زدہ سی ہو گئی۔

"او ماں، تم اسے پہچانتی ہو ؟ تم نے اسے کیسے پہچانا ؟"

ستی نے کہا ——— "میں سمجھ نہ سکی لکھی دیدی، میں بالکل نہ سمجھ سکی، میں نے سمجھا تھا. . . . ."

"لیکن تم نے مجھے اس روز جو نوکر سمجھا تھا، اس کا مجھے کوئی رنج نہیں۔" دینکر نے کہا۔

دینکر اتنا کہہ کر رُک گیا۔

ستی بولی ——— "سچ مچ اس دن مجھ سے بڑی بھول ہو گئی تھی، سمجھے لکھی دیدی، اس روز میں اس کے سر پہ مال لاد کر لے آئی تھی۔"

دینکر نے کہا ——— "اور چار پیسے مزدوری بھی دی تھی۔"

ستی اب کے مسکرا دی۔

"تم چار پیسے نہیں لے رہے تھے تو میں نے سمجھا کہ کم دے رہی ہوں اس لیے نہیں لے رہے ہو، واقعی میں کیسے سمجھتی، تم ہی بتاؤ، میں تو پہچانتی نہیں تھی، اسی دن پہلی بار کلکتہ آئی تھی۔"

لکھی دیدی بولی ——— "او ماں، تم دونوں کے درمیان اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے کچھ بھی معلوم نہیں اسی لیے تم میرے یہاں نہیں آتے ہو، میں بھی سوچ رہی تھی کہ آخر دیپو کیوں نہیں آتا۔"

دینکر نے کہا ——— "نہیں لکھی دیدی، اس کے لیے نہیں، تمہارا کام کر کے تو مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

لکھی دیدی نے کہا ——— " واقعی رے ستی، دیپو میرا تمام کام کر دیتا ہے، کچھ خیال نہیں کرتا ——— "

ستی بے حد شرمندہ تھی۔ بولی۔

" نہیں، نہیں، میں تم سے کوئی کام نہیں لوں گی، اب میں تم سے اپنا کوئی کام نہیں کراؤں گی ——— "

لکھی دیدی بولی ——— " نہیں رے، اس سے کام لیتی رہنا ورنہ یہ جھانک کر تجھے دیکھا کرے گا ——— "

لکھی دیدی اپنی بات ختم کر کے ہنسنے لگی۔ دینکر نے شرما کر اپنا سر جھکا لیا۔

ستی بولی ——— " لیکن چھی چھی، مجھے بڑی شرم آ رہی ہے ——— "

لکھی دیدی بولی ——— " اس سے تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے اسے کتنی بار پیٹا ہے، اس کے سامنے شرمندگی کیسی ——— تم میرے یہاں آیا کرو، آؤ گے تو؟ کب آ رہے ہو؟ کل؟ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ "

ستی اس وقت دوسری طرف دیکھ رہی تھی، اس کی طرف دیکھ کر پھر بولی ———

" چھی چھی مجھے بڑی شرم محسوس ہو رہی ہے، واقعی! چھی ——— "

لکھی دیدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

" رہنے دو، اس کے سامنے تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، بڑی آئی ہیں، شرمندہ ہونے والی ——— "

لکھی دیدی اتنا کہہ کر ستی کو کھینچ کر اوپر لے گئی۔

کرن راستے میں کھڑا ہوا اسی سمت دیکھ رہا تھا۔ دینکر کے قریب آتے ہی اس نے پوچھا ——— " یہ لوگ کون ہیں رے؟ چہرے تو بے حد حسین ہیں؟ کون ہیں یہ لوگ؟ "

" اگھور داد کے مکان میں کرایہ دار آئے ہیں نا، ان کے گھر کی لڑکیاں ہیں۔ "

دینکر کھوئے کھوئے انداز میں کرن کے ساتھ چلنے لگا۔ کرن کی باتیں اسے سنائی نہیں دیں ——— ستی نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا، وہ بہت شرمندہ تھی! پہچان نہ سکی تو کیا کرے گی! ستی کا تو قصور نہیں!

کرن بولا ——— " ان لوگوں کے ساتھ تمہارا خوب رگڑا جھگڑا رہتا ہے؟ "

" نہیں، یہ سب کچھ نہیں ہے۔ " دینکر نے جواب دیا۔

" تب؟ شاید یہ لوگ بہت امیر ہیں؟ "

دینکر نے کہا ——— " شاید۔ "

" ان کے بابا کیا کرتے ہیں؟ "

دینکر اس وقت بھی دل ہی دل میں سوچ رہا تھا، واقعی ستی کا اس میں کیا قصور ہے! اُسے پہچانتی نہیں تھی اسی لیے پیسے دے رہی تھی، پہچانتی ہوتی تو نہ دیتی، ستی بالکل ہی لکھی دیدی جیسی نہیں ہے، کتنی شرمندہ تھی، بار بار افسوس ظاہر کر رہی تھی جس سے خود دینکر کو شرمندگی محسوس ہونے لگی تھی! پتہ نہیں لکھی دیدی نے اس سے کیا کچھ کہہ دیا ہے؟ جھانک کر دیکھنے والی بات بھی اس سے کہہ دی ہے؟ ممکن ہے اور بھی بہت ساری باتیں کہی ہوں، کون جانے!

کرن نے جواب ——— "کیوں، تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"کیا جواب دوں؟"

"اس کے بابا کیا کرتے ہیں؟"

"سُنا ہے نرمل سے بھی زیادہ امیر ہیں۔" دینکر نے کہا ——— "ان لوگوں کا برما میں لکڑیوں کا کاروبار ہے۔"

کرن خوشی سے اُچھل پڑا۔ بولا ———

"تب تو بہت ہی اچھا ہوا، قلعہ فتح کر لیا، تم ایک کام کرو نا ———"

"کیا کام؟"

"پہلے بتاؤ کرو گے یا نہیں؟"

دینکر نے پُوچھا ——— "کون سا کام ہے بتاؤ نا ———"

"تمھارے ساتھ اتنا رگڑا جھگڑا ہے۔" کرن نے کہا ——— "ان دونوں کو لائبریری کا ممبر بنا دو نا، ہر ماہ دونوں مل کر ایک روپیہ چندہ دیں گی۔ اور کتابیں پڑھیں گی۔"

دینکر نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔

وہ سوچ رہا تھا، نرمل کے گھر والوں سے ان کی مُلاقات کیسے ہوئی! لکھی دیدی کی زبانی تو اس نے کبھی نہیں سُنا تھا اور اس نے کبھی یہ بھی تو نہیں سوچا تھا کہ یہاں اس طرح مُلاقات ہو جائے گی، جب سے ستی آئی تھی تب سے کتنی ہی بار ان کے یہاں جانے کی لالچ ہوتی تھی! اس کا دل بھی چاہتا کہ ایک بار لکھی دیدی اُسے بلا بھیجے، ایک بار رگھو کو اس کے پاس بھیج دے، اُسے خود جانے میں شرم آ رہی تھی، اسی لیے وہ امرُود کے پیڑ کے نیچے صبح و شام چکر کاٹتا رہتا تھا۔

ماں نے کہا تھا ——— "ہاں رے، وہاں پر بار بار چکر کیوں کاٹ رہا ہے؟ وہاں پر تیرا کیا ہے؟"

اور وہ کھڑکی کی اوٹ میں چھپا ہوا چہرہ دیکھنے کے لیے بار بار آنگن میں چکر لگاتا رہا تھا، لیکن کسی نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس مکان میں اس کی طرف دیکھنے کی غرض بھی کس کو تھی، زور سے کھانسنے پر بھی کوئی نگاہ اُٹھا کر اُدھر نہیں دیکھتا تھا۔

ماں نے کہا تھا ——— "ٹھنڈک لگا کر پھر سردی کھانسی مُول لے لو، بخار کو بلا لو، اس کے بعد تو میری ہی مصیبت

ہے ———"

ان دنوں میٹرک کا نتیجہ نکل گیا تھا، ماں کو کتنی فکر لگی ہوئی تھی، کس کالج میں پڑھے گا، کون خرچ دے گا، کہاں سے کتابیں آئیں گی، ماں ان دنوں اسی فکر میں گھل رہی تھی، کس کے آگے ہات پھیلائے، کس سے بھیک مانگ کر بیٹے کی تعلیم کا خرچ پُورا کرے، ماں کو بس یہی دھن تھی، اگر وہ پڑھنا چھوڑ دے تو کوئی اس کے لیے ایک ملازمت کا بندوبست کر دے، ماں کو اس کی بھی فکر تھی، کون ملازمت دلائے گا! ماں ان دنوں دوپہر میں گھر میں تالا بند کر کے نکل کھڑی ہوتی اور بیٹے کا مستقبل سنوارنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں جا کر ان کی بیویوں کی خوشامد کرتی، تاکہ وہ شوہر سے کہہ کر اُسے کسی دفتر میں ملازمت دلوا دیں! اور اس طرف دینکر کھڑکی کے نیچے جا کر کھڑا رہتا تھا، شاید اُسے لکھی دیدی بُلا بھیجے، شاید ایک بار اپنے ملازم سے خبر بھجوائے اور وہ ایک بار پھر ستی کو دیکھ لے!

اور اتنی کوشش اور اتنی ہیرا پھیری کے بعد بھی جو نہ ہو سکا تھا، وہ نرمل کے یہاں چندہ مانگنے کے بہانے آنے پر ہو گیا، خوش قسمتی سے کرن کے ساتھ وہ بھی یہاں آگیا تھا، نرمل کے یہاں آگیا تو اچھا ہی ہوا، ورنہ ملاقات ہونے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔

کرن نے ساتھ چلتے ہوئے کہا ———

"جانے دو، اگر ایک روپیہ ماہانہ چندہ نہ دینا چاہے تو آٹھ آنہ کر کے ہی دینے کو کہو گے، نہیں ہو گا تو آٹھ آنہ میں ہی دونوں کو ممبر بنا لیا جائے گا، کیا کہتے ہو ———"

ان دنوں واقعی کرن لائبریری کے سوا کچھ اور سوچتا ہی نہیں تھا، دینکر، پھٹک اور مدھوسودن سبھوں نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا، صبح کے وقت کھا پی کر تین چار لڑکوں کی ٹولی بنا کر یہ لوگ کالج جاتے اور کرن، کرن کے ساتھ جب بھی ملاقات ہوتی، وُہ لائبریری ہی کا ذکر لے بیٹھتا۔

کرن کہتا ——— "تم لوگ لائبریری میں نہیں آؤ گے تو میں اکیلا کس طرح سنبھالوں گا۔"

دینکر پُوچھتا ——— "اب تک کتنے ممبر ہوئے؟"

ممبر تو بہت سارے ہو گئے تھے، لیکن سبھی صرف چندہ دینے کے ممبر تھے، کرن بار بار ان کے گھر پہ جا کر تقاضہ کر کے چندہ وصول کرتا، کوئی دو آنے دیتا کوئی ایک آنہ اور کوئی صرف ایک پیسہ، چھوٹے چھوٹے بچوں نے ادھیلا بھی دیا تھا۔

کبھی کرن راستے میں بھیک مانگ رہا ہوتا۔ ٹرام لائن کے موڑ پر کھڑے ہو کر زور زور سے آوازیں لگا رہا ہوتا۔

"مہربانو، کرم کر کے جنیو خرید کر لیتے جائیے، مہربانی کر کے......"

اور راستے کی بھیڑ سے ایک دو آدمی باہر نکل کر جنیو خرید لیتے۔ سات آٹھ پیسے کا جنیو بک جانے کے بعد

کرن چلا آتا۔ وہ زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہتا، اب اُسے زیادہ دیر تک بھیک مانگنا اچھا نہیں لگتا تھا، اس کے علاوہ دینکر اس کا بچپن کا دوست تھا، بچپن کا ساتھی تھا، کلاس میں بھی وہ اس کے ساتھ رہتا اور بھیک مانگنے میں بھی۔ دونو ایک ساتھ پڑھتے آئے تھے، بھیک مانگتے آئے تھے اور ایک ساتھ میٹنگوں میں تقریریں سُنتے آئے تھے، لیکن یکایک دینکر کے پاس ہوجانے سے کرن اکیلا رہ گیا تھا، اب وہ چپ چاپ لائبریری میں پڑا رہتا اور جب زیادہ تھک جاتا تو چٹائی بچھا کر چت سویا رہتا!

گھر آکر وہ ماں کو گن کر پیسے دے دیتا۔

"آج نو پیسے کا بِکا ہے ——— یہ لو ——"

ماں کہتی ——— "ہاں رے، اور نہیں بِکے!"

کرن کہتا ——— "اور کسی نے جینو نہیں خریدا ———"

"کیوں؟ تم نے اچھی طرح سمجھایا ہوتا تو خریدتے ——— مُنہ سے کچھ کہو گے تو، زبان ہلا کر کہو گے تو، کہ تمھارے بابا کی طبیعت خراب ہے، گھر کی حالت خراب ہے ———"

"یہ سب سُن سُن کر ان کے کان پک گئے ہیں، اب کوئی یقین نہیں کرتا ———"

ماں کہتی ——— "اچھی طرح سمجھا کر کہو گے تو یقین کریں گے، تم انھیں سمجھا نہیں سکتے؟"

کرن کہتا ——— "وہ یقین کرکے بھی کوئی جینو نہیں خریدیں گے۔"

"کیوں، جینو ٹوٹ جانے پر تو وہ خریدیں گے ہی، برہمن گلے میں جینو ڈالے بغیر رہ سکتے ہیں؟"

کرن اس طرح کی باتوں سے بگڑ جاتا، کہتا ———

"جینو آج کل کوئی پہنتا ہے؟ برہمنوں نے بھی جینو پہننا چھوڑ دیا ہے ——— تم گھر کے اندر رہتی ہو، تمھیں کیا معلوم ہے، برہمن، شودر اور بنیا، سبھی ایک ذات ہو گئے ہیں، گلے میں دھاگہ ڈال لینے سے کیا ہوتا ہے؟"

کرن کی ماں کو چیخ کر باتیں کرتے ہوئے دینکر نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کرن کی ماں اس کی باتیں سُن کر حیرت زدہ سی ہو جاتی، گُنگ سی ہو جاتی، برہمن جینو نہیں پہنتے؟ جب برہمن ہی مذہب کو نہیں مانیں گے تو یہ دُنیا غرق نہیں ہو گی؟ مذہب ناپید نہیں ہو گا؟ آج اتنے برسوں سے کرن کی ماں یہی جینو بیچ کر گھر کا خرچ چلا رہی تھی، بیمار شوہر کا علاج کرا رہی تھی، بیٹے کی تعلیم کا خرچ پورا کر رہی تھی اور اب اگر یہی جینو فروخت نہ ہو؟

اس روز یکایک کرن کی بائیں جیب میں پیسے کی جھنکار سُن کر ماں جیسے چونک اُٹھی۔

"یہ جو پیسہ جھنک رہا ہے، یہ جو تمھارے پاس پیسہ ہے ———"

اور کرن کو غصہ آگیا ——— "وہ کیا تمھارا پیسہ ہے؟ وہ تو میرا..."

"تمھارے پاس پیسہ کہاں سے آیا؟ تم کیا کماتے ہو؟"

"میں کماتا نہیں ہوں اس لیے میرے پاس پیسہ نہیں رہے گا؟ اس پیسہ میں تم ہاتھ نہیں لگا سکتیں ———"

کرن کی ماں اس کی جیب ٹٹولنے کے لیے آگے بڑھی۔

کرن اُچھل پڑا۔

"خبردار۔ میں کہے دیتا ہوں، اس پیسہ کو ہاتھ مت لگاؤ۔"

"مگر اتنے پیسے آئے کہاں سے، بتاؤ گے تو، تم دیکھ رہے ہو کہ ایک پیسے کے لیے میں ترس رہی ہوں اور تمہارے پاس اتنے پیسے رہتے ہوئے مجھے نہیں دو گے؟ پیسے لے کر کیا میں خود نگل لوں گی، کیا میں اپنے لیے اس طرح پریشان حال رہتی ہوں؛ تمہارے ہی لیے تو پیسہ مانگتی ہوں، جانو بیچ کر کتنے پیسے ملتے ہیں، دیکھتے نہیں ———"

اس کے بعد کرن کی طرف دیکھ کر بولی ———

"پھر کہاں جا رہے ہو؟"

کرن ان باتوں کا جواب دیے بغیر باہر جانے لگا

کرن کی ماں نے کہا ——— "ارے، تمہارے پیسے لے کر کیا میں سورگ میں جاؤں گی، تمہارا پیسہ تمہارا ہی رہے گا، آج چاول ختم ہو گیا ہے، چاول ہی کی وجہ سے بھات بھی نہ پکا سکی ———"

کرن نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر کر جواب دیا۔

"بھات نہیں پکایا تو نہیں کھاؤں گا، اب میں رات کو گھر لوٹوں گا۔"

"لیکن تمہارے پاس تو پیسے ہیں، دے کر جاؤ نا، نہیں تو ایک سیر چاول ہی خرید کر لا دو۔"

کرن کے "غصہ" کا پارہ ایکدم چڑھ گیا۔

"یہ کیا میرا پیسہ ہے جو چاول خرید کر لا دوں، تمہارے ساتھ فضول باتیں کرنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

"اگر تمہارا پیسہ نہیں ہے تو تمہاری جیب میں کیوں ہے؟"

کرن نے کہا ——— "تم عورت ہو کر یہ سب کیا سمجھو گی، لائبریری کا چندہ میری جیب میں نہیں رہے گا تو کس کی جیب میں رہے گا، سنوں تو سہی؟ یہ سب گنا ہوا چندے کا پیسہ ہے، ممبروں کے چندے کا پیسہ، مجھے لینے کا اختیار ہے!"

اتنی دیر تک کرن کے بابا چبوترے پر سینے کے نیچے تکیہ رکھے لیٹے ہوئے تمام باتیں سن رہے تھے وہ یکایک بے چین ہو کر اُٹھے اور دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہنے لگے، ان کے گلے سے غوں غوں کی ایک عجیب سی آواز نکلی اور اس کے بعد سینے کے نیچے سے تکیہ لڑھک کر آنگن میں دھول پر گر پڑا اور ساتھ ہی ساتھ کرن کی ماں دوڑ پڑی۔

قریب جاکر بولی ——— "پانی پیو گے؟ گرم کر کے پانی لا دوں؟"

کرن کے بابا کوئی جواب نہ دے سکے، ان کے منہ سے پھر غوں غوں کی آواز نکلی اور کرن دھڑام سے صدر دروازہ بند کر کے تیزی سے باہر نکل گیا۔

دینکر اس وقت باہر کھڑا کھڑا سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا، گھر کے اندر جانے کی ممانعت تھی، کرن کے بابا کی تھوک آنگن میں پھیلی رہتی تھی، اس میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں، اس لیے ماں نے اُسے منع کر دیا تھا، لیکن وہ باہر کھڑے کھڑے سب کچھ دیکھ سن کر بہت غم زدہ ہو گیا تھا۔ سونار کار نک کے گھاٹ پر بیٹھا ہوا وہ سادھو کہاں گیا! اور سی۔ آر۔ داس بھی کہاں چلے گئے، کچھ دن پہلے کرن کو یقین تھا کہ اس کی تکلیف دُور ہو جائے گی، اب وُہی کرن بڑا ہو گیا تھا، دینکر بھی بڑا ہو گیا تھا، اب وہ یہ سب باتیں نہیں کرتا تھا، اب اس کے خیالات بدل گئے تھے، اب وہ لائبریری ہی کو سب کچھ سمجھنے لگا تھا، جیسے لائبریری قائم ہو جانے کے بعد سبھوں کا دُکھ دُور ہو جائے گا، جیسے سبھی لوگ، کلکتہ کے تمام باشندے اور بنگال میں رہنے والا ہر آدمی اگر "دی کالی گھاٹ بوائز لائبریری" کا ممبر بن جائے تو سونار کار نک گھاٹ کے سادھو نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہو جائے گا، جیسے اس لائبریری کے قائم ہو جانے سے تمام لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو جائے گا اور معلومات میں اضافہ ہونے کے بعد ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور آنکھیں کھل جانے کے بعد ہی سوراج مل جائے گا۔

باہر آکر کرن نے کہا۔

"دیکھتے ہو دیپو، کتنا جھمیلا ہے، دل لگا کر کام کر سکوں اور دل لگا کر لائبریری کی بنیاد مستحکم کر سکوں اس کا بھی موقعہ نہیں ملتا، گھر میں بھی اب دل نہیں لگتا۔"

"لیکن کھانا کھائے بغیر کس طرح کام کرو گے؟" دینکر نے پوچھا۔ "بھوک لگے گی تو کیا کرو گے؟"

بھات نہیں ملا تو کیا ہوا" کرن نے جواب دیا ——— "ڈاب کھائیں گے۔"

"ڈاب؟"

کرن نے کہا ——— "چلو نا، پیٹ بھر کر جتنی خواہش ہو ڈاب کھالوں گا، پھر دن بھر بھوک نہیں لگے گی ———"

دینکر وہ جگہ نہیں جانتا تھا، اس جگہ واقعی بے شمار ڈاب پڑے ہوئے تھے، جتنی خواہش ہو ڈاب کھالو، صرف ایک کٹاری کی ضرورت تھی، یا دا؟ سے بھی کام چل سکتا تھا، کالی گھاٹ کے مندر کے پچھم کی طرف سونار کار نک گھاٹ جانے کے راستے میں موڑ پر ایک ڈاب کی دوکان تھی، دوکان کے سامنے ڈاب کا پہاڑ کھڑا تھا، ایک دن پہلے سنکرانتی یا کوئی اور تہوار گزرا تھا، راستہ شال کے پتے سے بھرا ہوا تھا، کرن کہیں سے ایک کٹاری بھی لے آیا۔

بولا ——— "تم ٹھہرو، اچھا اچھا ڈاب میں کاٹ لوں پہلے ———"

اور راستے میں کوڑے پر پڑے ہوئے ڈابوں میں سے ایک بڑا سا ڈاب چن کر کرن نے کٹاری سے کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیا، اس کے اندر سفید سفید گودا تھا، کسی خریدار نے اس کا پانی پی کر کوڑے پر پھینک دیا تھا۔
تمام گودا کھا لینے کے بعد کرن نے کہا ——
"یہ لوگ کتنے بے وقوف ہیں، دیکھتے ہو، اصل چیز ہی نہیں کھاتے —— تھوڑا سا تم بھی کھاؤ گے؟"
اور صرف ایک ہی نہیں، یکے بعد دیگرے بہت سے ڈاب کاٹ کر کرن نے اس کا گودا کھا لیا۔ بولا ——
"جس روز گھر میں بھات نہیں بچتا، اس روز میں یہاں آ کر ڈاب کھا لیتا ہوں، اس کے کھانے سے بدن میں چستی آتی ہے جانتے ہو ——"
"کوئی کچھ نہیں کہتا؟" دیپنکر نے پوچھا۔
"کوئی کیا کہے گا" کرن نے جواب دیا —— "یہ سب تو کوڑے کی گاڑی میں لاد کر دھاپا لے جا کر پھینک دیتے ہیں —— صرف اس کٹاری کے لیے ذرا سی دشواری ہوتی ہے، بیٹے دینا ہی نہیں چاہتے، کہتے ہیں، دھار خراب ہو جائے گی، ایک کٹاری خرید لینے سے کوئی فکر نہیں رہے گی۔"
پہلے روز کرن کو اس طرح کھاتے دیکھ کر دیپنکر کو بے حد تعجب ہوا۔
اس نے پوچھا —— "تم روز کھاتے ہو؟"
"بھوک لگنے پر میں ڈاب کی دکان پر چلا آتا ہوں" کرن نے جواب دیا —— "اور مزے سے کھا لیتا ہوں، میرے گھر میں ہر روز بھات تو نہیں بچتا ——"
اس کے بعد قدرے رک کر بولا —— "برا بھلا جو بھی ہو، کھانے کا میں نے انتظام کر لیا ہے، اب کپڑے کا بھی کوئی انتظام ہو جائے تو پھر اطمینان ہے، خیر اب اس کے لیے بھی زیادہ دنوں تک سوچنا نہیں ہوگا۔"
اس کے بعد منہ پونچھ کر بولا ——
"اب چلو ——"
اس کے چہرے پر بڑی طمانیت تھی۔
ایک جیب میں چند جینو اور دوسری جیب میں لائبریری کی رسید کی کاپی اور ہاتھ میں ممبروں کے نام کا رجسٹر لیے کرن کہاں کہاں نہ بھاگتا دوڑتا رہتا، پہلے صرف جینو بیچنا ہی اس کا کام تھا، لیکن اب جینو فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ لائبریری کا ممبر بنانے کا کام بھی تھا۔
کرن کہتا —— "میرے ساتھ تمہیں بھی جانا چاہیئے —— تم رہتے ہو تو بڑی آسانی رہتی ہے، دراصل تم صدر ہو اور میں تو صرف سیکرٹری ہوں —— کبھی کبھی ممبر پوچھتے ہیں کہ صدر کیوں نہیں آتا؟"
کسی کسی دن کرن اسے بہت دور تک کھینچ کر لے جاتا، کبھی خضر پور، کبھی ٹالی گنج، اور کسی روز بوڑا بازار،

کلاس کے تمام لڑکوں کو کرن نے ممبر بنالیا تھا، راکھال، نرمل پالت، ہمان اور منترا سبھی ممبر بن گئے تھے، ان کے علاوہ دونی کا کا، پنجادا، مدھوسودن اور اخیر میں اس نے پران متھ بالو کو بھی ممبر بنالیا تھا۔

آخر ایک دن اس نے کہا

"اے، تمھارے اگھور دادو کو ممبر نہیں بنایا جاسکتا؟"

کرن نے کہا ——— "دُور ———"

"کیوں، ہرج ہی کیا ہے؟"

"نہیں بھائی۔ اخیر میں لاٹھی سے مارنے دوڑیں گے اور منہ جلاکر گالی دیں گے۔"

کرن نے کہا ——— "تم اتنے ڈرپوک کیوں ہو، اتنا ڈرنے سے صدر بننا چلے گا؟ ان کے پاس تو بہت روپیہ ہے، ہر ماہ دو آنہ دے دیں ———"

"نہیں بھائی، میں نہیں کہہ سکتا۔"

کرن سوچنے لگتا، ان کے علاوہ اور کون ہے؟

"اچھا چنونی کو ممبر نہیں بنایا جاسکتا؟"

اور صرف چنونی ہی کیوں۔ دُنیا کے تمام لوگوں کو اپنی لائبریری کا ممبر بنا لینے کے لیے کرن جیسے پاگل ہوگیا تھا، کرن سوچتا، اچھے کام کے لیے ممبر بننے میں لوگوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، کرن پیسہ تو چوری نہیں کرے گا، ایک دن اس لائبریری کا نام ملک بھر میں مشہور ہو جائے گا، اس وقت؟ اس وقت تو یہی سب لوگ ممبر بننے کے لیے خوشامد کریں گے لیکن اس سے پہلے؟ اس سے پہلے دن رات کام کیے بغیر نہیں چل سکتا! کرن کالج کے تمام لڑکوں کو ممبر بنانے کے لیے بھی بہت اصرار کر رہا تھا۔

کہتا ——— "تمھارے کالج میں اتنے لڑکے ہیں اور تم ایک کو بھی اب تک ممبر نہ بنا سکے ——— لعنت ہے تم پہ ———"

آخر میں ڈھونڈنے پر بھی جب کوئی کام نہ ملتا تو کرن راستے کے موڑ پر جاکر کھڑا ہو جاتا اور چیخ چیخ کر آوازیں لگاتا ——— "مہربانی کرکے ایک پیسہ کا جینو خرید کر لیتے جائیے، مہربانی کرکے ———"

کرن کی اُجلی رنگت، ننگے پاؤں اور پھٹے پرانے کپڑوں کو دیکھ کر کسی کسی کو شاید اس پر رحم آجاتا وہ قریب آکر کہتا ———

"دیکھوں بھائی، کیسا جینو ہے دیکھوں ———"

جینو کی پیٹ کھول کر دیکھنے کے بعد وہ ایک آدمی جینو خرید لیتا اور جب وہ پیسہ دے کر جانے لگتا تو کرن اس سے جھٹ پوچھ لیتا ———

"ہماری لائبریری کے ممبر بنیئے گا سر ——"

"لائبریری!"

بعض آدمیوں کو لائبریری کا نام سن کر بڑی حیرت ہوتی۔

کرن کے اندر ایک تحریک پیدا ہوتی، وہ جھٹ جیب سے رسید بک نکال کر دکھاتا —— "یہ دیکھیئے سر، بہت سے لوگ ممبر بن چکے ہیں، نئی لائبریری ہے، پانسو کتابیں ہو چکی ہیں، مہربانی کر کے آپ بھی ممبر ہو جاتے —— میں ہی سیکرٹری ہوں —— اور وہ صدر بیٹھا ہوا ہے، وہ دیکھیئے ——"

کرن دُور بیٹھے ہوئے دینکر کی طرف اُنگلی سے اشارا کرتا۔ اس وقت دینکر بہت دُور کسی پیڑ کے سائے میں اینٹ بچھا کر اس پر بیٹھا ہوتا۔

بعض دفعہ آدمی بگڑ جاتا، کہتا ——

"اتنی چھوٹی سی عمر میں جوا چوری کا کاروبار کرتے ہو چھوکرے، معلوم ہے میں ابھی تمہیں پولیس سے پکڑوا سکتا ہوں ——"

اتنا کہہ کر مزید کوئی بات کیے بغیر وہ چلا جاتا۔

دینکر قریب آ کر پُوچھتا —— "وہ آدمی کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہہ رہا تھا پولیس سے پکڑوا دوں گا! مجھے پولیس کا خوف دکھا رہا تھا! پولیس سے خوف کھاتا تو لائبریری کا سیکرٹری نہ بن سکتا، چلو اب دُوسرے موڑ پر چلیں، ادھر کے لوگ بہت بدمعاش ہیں بھائی ——"

وہ ایک ایک دن ایک ایک محلّے کا چکر لگاتا اور ایک روز خضر پور کے موڑ پر جا کھڑا ہوا، سہ پہر ہو چکی تھی اور کرن کالج کے گیٹ کے سامنے کھڑا ہوا تھا، دینکر کے باہر آتے ہی اس نے کہا —— "تمھیں بہت دیر ہو گئی؟"

"ہسٹری کی کلاس تھی" دینکر نے جواب دیا۔

"آج تم نے کسی کو ممبر بنایا ہے؟" کرن نے پُوچھا۔

"کوئی ممبر بننا نہیں چاہتا بھائی ——" دینکر نے جواب دیا۔

"تم انھیں اچھی طرح سمجھاتے ہی نہیں، تم پریذیڈنٹ ہو! جو ممبر بننا نہ چاہے اُسے ہماری لائبریری میں پکڑ کر لے آؤ، دیکھو گے میں ٹھیک سمجھا بجھا کر راضی کر لوں گا، امتحان پاس کر لینے سے کیا ہو گا، اس کے لیے عقل کی ضرورت پڑتی ہے، کیا سمجھے ——"

امتحان میں فیل ہونے کا کرن کو واقعی کوئی غم نہیں تھا، پاس تو گدھا بھی ہو جاتا ہے۔ کرن سوچتا، جو بھی ہو، لیکن کلکتہ میں ایسے اور بھی بہت سے لڑکے ہیں جو روپے نہ ہونے کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتے۔ کالج کی فیس،

امتحان کی فیس کچھ بھی نہیں دے سکتے، انھیں کے لیے اس نے لائبریری قائم کی تھی، اسی کی لائبریری سے کتابیں لے کر ایک روز سب لڑکے امتحان پاس کرلیں گے اور صرف لائبریری قائم کرنا ہی تو اس کا مقصد نہ تھا، اس چھوٹی سی لائبریری کو بڑا کرنا تھا اور لائبریری کے ساتھ فٹ بال کا میدان، ورزش کلب بنانا تھا، جہاں دماغی ورزش کے ساتھ جسمانی ورزش بھی ہوگی، جسمانی ورزش کے بغیر کام نہیں چل سکتا، صحت اچھی رہے گی جب ہی تو ضرورت پڑنے پر پولیس کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ کیے جاسکیں گے۔

اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا ——

"کسی سے مت کہو گے، تمھیں بتا دیتا ہوں، ضرورت ہوئی تو ہمارے کلب میں لاٹھی، چھرا، جوجوتسو سکھانے کا بھی انتظام ہوگا اور اس کے بعد ریوالور، پستول ——"

"ریوالور، پستول؟ یہ کون دے گا؟"

کرن زیرِ لب مسکرایا۔

"تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں، بھوجودا سب انتظام کردیں گے، ہمالیہ پر سب تیار ہو رہا ہے ——"

"بھوجودا؟ بھوجودا کون ہے؟"

"تمھیں بھی ایک روز بھوجودا کے پاس لے جاؤں گا، دیکھنا کتنے گریٹ آدمی ہیں، جرمنی، فرنچ، نیپالی، برمی، تمام زبانیں جانتے ہیں، بھوجودا، سب کچھ انھیں زبانی یاد ہے، تم تو میٹرک پاس ہو، لیکن بھوجودا تمھیں بھی انگریزی پڑھا سکتے ہیں۔"

بھوجودا کے بارے میں اسی دن پہلی بار دینکر کی زبانی سُنا تھا۔ اس وقت تک بھوجودا کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، یہ بھوجودا کہاں کے ہیں، کہاں سے اتنی زبانیں سیکھی ہیں، وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا، پھر بھی کرن کی زبانی ان کے اوصاف سُن سُن کر وہ خوف بھی کھانے لگتا اور اس کا جذبۂ تجسس بھی بھڑکتا، پران منتھ بابو صرف قید کاٹتے تھے، لیکن بھوجودا، بھوجودا جرمنی، فرنچ، نیپالی اور برمی زبانیں جانتے تھے، بھوجودا ریوالور، پستول بھی دے سکتے ہیں، پولیس کو کوئی پتہ نہ چل سکے گا، ہمالیہ پر سب تیار ہو رہا ہے۔

کرن نے کہا —"تمھیں پھر سب کچھ کھول کر ہی بتا دوں گا دیپو، لائبریری قائم کرنے کے لیے مجھے بھوجودا نے ہی کہا تھا ——"

"تم نے بھوجودا کو پہچانا کیسے؟"

"وہ سب باتیں میں ابھی تمھیں نہیں بتاؤں گا، بھوجودا نے تمھیں بھی ایک روز وہاں لے جانے کو کہا ہے۔"

"بھوجودا مجھے پہچانتے ہیں؟"

کرن کے ہونٹوں پر پُراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"پوتھیر دابی، پڑھا ہے؟"

"پوتھیر دابی؟"

"شرم کی بات ہے! تم کالی گھاٹ بوائز لائبریری کے پریذیڈنٹ ہو اور تم نے پوتھیر دابی کتاب کا نام نہیں سُنا، شرم کی بات ہے، لوگ کیا کہیں گے، بتاؤ تو؟"

اس کے بعد اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا ——

"شرت چندر چٹرجی کے ناول کا نام "پوتھیر دابی" ہے، حکومت نے ضبط کر لیا ہے، وہ "پوتھیر دابی" ناول تو بھوجو دا ہی پر لکھا گیا ہے ——"

دینکر نے حسرت بھری نگاہوں سے کرن کی طرف دیکھا، اُسے کچھ بھی معلوم نہ تھا، وہ کچھ بھی نہ جانتا تھا، میٹرک پاس کر لینے سے کیا ہوتا ہے، دینکر تو بھوجو دا کو بھی نہیں پہچانتا تھا دینکر کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اندر ہی اندر بھوجو دا کتنی بڑی تیاری کر رہے تھے —— تم پاس کر کے کالج میں پڑھو گے اور ملازمت کرو گے! یا شادی کر کے دُنیا داری میں اُلجھ جاؤ گے، مگر کرن؟ وہ عظیم مقصد لے کر دُنیا میں آیا ہے، بتیس روپے کی ملازمت مل جانے پر کچھ سہولت ضرور ہو جائے گی، شاید کھانے کو بھات بھی ملے، بابا کی دوا کے لیے بھی پیسے شاید بچ جائیں، ماں کے لیے شاید ساڑی بھی خریدی جا سکے، لیکن کیا اِسی سے دُکھوں کا خاتمہ ہو جائے گا؟ کیا اسی سے سب لوگ سکھی ہو جائیں گے، کیا اسی سے سبھوں کا پیٹ بھر جائے گا، جسم ڈھک جائے گا، کیا اسی سے سبھوں کو پناہ مل جائے گی؟ ملازمت کرنے سے کتنی تنخواہ ملے گی؟

"ابھی ایک شام کھاتا ہوں، اس وقت دونوں شام کھانے کو ملے گا، ابھی پھٹے کپڑے پہنتا ہوں اس وقت اچھے کپڑے پہنوں گا، لیکن میرے جو مسائل ہیں، جو کمیابی ہے جو احتیاج ہے، حل ہو جائیں گے اور کیا اس وقت بھی یہی حالت رہے گی ——"

"تو پھر یہ کمیابی کس طرح دور ہو گی؟"

"یہ سب تمھیں خود بھوجو دا سمجھا دیں گے" کرن نے کہا —— "اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تم پہلے لائبریری کے کچھ ممبر بنا دو، اس کے بعد دیکھو گے کہ بھوجو دا کیا کرتے ہیں ——"

چلتے چلتے وہ دونوں بہت دُور نکل گئے تھے۔

خضر پور کے موڑ پر آتے ہی کرن نے کہا ——

"تم یہاں پر ٹھہرو، میں بھیک مانگ لوں ——"

دینکر دُور جا کر کھڑا ہو گیا، اس وقت شام کا جھٹ پٹا ہو چلا تھا، کئی ٹرامیں خضر پور کی طرف چلی جا رہی تھیں اور کئی کالی گھاٹ کی طرف۔ وہاں پر کئی جوتے کی دوکانیں تھیں، کباب روٹی کے ہوٹل تھے۔ گائے کے گوشت کا

کباب سیخوں میں قطار در قطار ٹنگا ہوا تھا اور ایک بڑے سے تنور میں موٹی موٹی روٹیاں سینکی جا رہی تھیں، دینکر کو بھوک سی لگنے لگی، دینکر نے بہت دنوں سے گوشت نہیں کھایا تھا، اُسے گوشت بہت لذیذ معلوم ہوتا تھا، جس دن گوشت پکتا اس دن دینکر مانگ مانگ کر زیادہ بھات کھا جاتا، مگر اگھور دادا کے یہاں گوشت ہی کب پکتا تھا، جس دن اگھور دادا کے یجمان پرشاد بھجوا دیتے، اسی دن گوشت پکتا تھا، ورنہ اگھور دادا کے گھر میں گوشت پکتا ہی نہیں تھا۔

ادھر کرن اپنی آواز میں درد گھول کر چیخ رہا تھا۔

"مہربانی کر کے جینو خرید کے لیتے جایئے، مہربانی کر کے۔۔۔۔"

یکایک دینکر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ کیا، کاکا بابو؟"

اس نے راستے پر کاکا بابو ہی کی طرح کا ایک آدمی کو دیکھا، ساتھ میں اور بھی کئی لوگ تھے۔ لیکن کاکا بابو کا چہرہ ایسا کیوں ہے؟ کوٹ پتلون اور ہیٹ کہاں گیا؟ یہ تو بالکل ہی بدلے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں آج! سر کے بال اُلجھے ہوئے ہیں، میلی سی دھوتی ہے اور ایک پھٹی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہیں! ایک دم پہچانے ہی نہیں جاتے، کاکا بابو کا دفتر خضر پور ہی میں تو نہیں؟ اُس نے کاکا بابو کو تو کبھی ایسے لباس میں نہیں دیکھا تھا!

"کاکا بابو؟"

اِس فٹ پاتھ کو عبور کر کے اُس فٹ پاتھ پر جا کر دینکر نے آواز دی۔

"کاکا بابو؟"

کاکا بابو نے پلٹ کر دیکھا، ان کے ساتھ جو لوگ تھے اُنھوں نے بھی مڑ کر دیکھا۔

"کاکا بابو آپ یہاں؟ میں تو آپ کو پہچان ہی نہ سکا تھا، اس قسم کا لباس میں نے آپ کو کبھی پہنے ہوئے نہیں دیکھا تھا اسی لیے، آپ کا دفتر اسی طرف ہے شاید؟"

پتہ نہیں کیوں، دینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے کاکا بابو کا چہرہ دوسرے دنوں کی نسبت آج قدرے پریشان سا تھا، اس کی طرف دیکھ کر وہ حسب عادت آج مسکرائے بھی نہیں، وہ اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں، آج دینکر کو دیکھ کر ان کے چہرے پر وہ پہلے جیسی مسکراہٹ تھی اور نہ آنکھوں میں وہ استقبالیہ لکیریں تھیں، تو کیا یہ کاکا بابو نہیں ہیں؟ تو کیا دینکر کو دھوکہ ہوا ہے!

"کاکا بابو میں دینو ہوں، اگھور دادا کے مکان میں رہتا ہوں، ابھی کالج سے لوٹ رہا تھا ——"

اتنی دیر بعد جیسے کاکا بابو نے اُسے پہچان لیا۔

"تم؟ دینو بابو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ان کی باتوں کا جواب نہ دے کر، دینکر نے کہا ——

"میں تو آپ کو پہچان ہی نہ سکا تھا کاکا بابو، آپ کے یہ کپڑے؟"

"یہ ویسے ہی ہے ..... لیکن میں ابھی ذرا مصروف ہوں دیپو بابو، تم بہت دنوں سے میرے یہاں کیوں نہیں آئے؟ آؤ گے؟ سمجھے؟ آؤ گے —— تمھارے ساتھ بہت سی باتیں کرنی ہیں —— اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کیوں ——"

کاکا بابو کے ساتھ جو لوگ تھے، وہ اتنی دیر سے ایک ٹک اُسے گھور رہے تھے، کاکا بابو کے ساتھ وہ لوگ بھی چلے گئے اور دینکر وہیں پر کھڑا ہو کر اُنھیں دیکھتا رہا، کاکا بابو پاس کی ایک گلی میں، ایک تنگ و تاریک پتلی سی گلی میں داخل ہو گئے!

دینکر کاکا بابو کے اس خلافِ توقع سلوک سے اچنبھے میں پڑ گیا، یہاں پر کاکا بابو اس لباس میں کیا کر رہے ہیں! ان کے ساتھ یہ کون لوگ ہیں؟ وہ تنگ و تاریک گلی میں کیوں داخل ہو گئے؟ کاکا بابو کا دفتر یہیں تو نہیں ہے؟ یہ کس قسم کا دفتر ہے اور یہ کیسی ملازمت ہے۔ اس وقت تو لوگوں کو دفتر سے چھٹی مل جاتی ہے، اس وقت کاکا بابو پھر دفتر گئے ہیں کیا؟ مگر وہ دینکر کو یہاں پر دیکھ کر اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پہچانتے ہی نہیں!

اُس طرف فُٹ پاتھ پر کرن اپنی لے میں چیخے جا رہا تھا۔

"مہربانی کر کے ایک جینو خرید کر لیتے جائیے، مہربانی کر کے ...."

دینکر کو آتے دیکھ کر کرن آگے بڑھ آیا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں تمھیں دیر سے تلاش کر رہا ہوں۔"

"آج کتنا ہوا؟" دینکر نے پوچھا۔

"گیارہ پیسہ ہوا ہے۔" کرن نے جواب دیا —— "اِسی سے کام چل جائے گا، لیکن کوئی بھی لائبریری کا ممبر بننا نہیں چاہتا ——"

دینکر نے کہا —— "مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے بھائی، آنتیں جلنے لگی ہیں ——"

"ڈاب کھاؤ گے؟"

"ڈاب؟ پھر وہی ڈاب! لیکن ڈاب کھانے کے لیے تو بہت دُور جانا ہوگا۔" دینکر نے کہا —— "ڈاب تو کالی گھاٹ میں اُس مندر کے پاس ملے گا، وہ تو یہاں سے بہت دُور ہے، اس طرف ڈاب کی کوئی دوکان نہیں ہے؟"

"ہے ——"

"کہاں ؟"

"ایک دوکاندار سے دوستی کرلی ہے، ایک پیسہ دینے سے کٹاری دے دیتا ہے، تمھارے پاس پیسہ ہے ؟"

"نہیں۔"

"یہ کیا، تم کالج میں پڑھتے ہو اور جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے ؟"

"تمھارے پاس تو پیسہ ہے۔"

"جیتو کے پیسہ کا تو ماں کو حساب دینا ہوگا۔"

"لیکن لائبریری کا پیسہ تو ہے، چندے کے پیسے میں سے ایک پیسہ لے لینے سے کیا ہوگا ؟"

کرن نے کہا ——— "یہ نہیں ہو سکتا، وہ تو میرا نہیں ہے، میں نے یہ پیسہ ماں کو بھی چھونے نہیں دیا ہے، میں اس پیسے میں ہات نہیں لگا سکتا بھائی، لائبریری کا پیسہ پبلک کا پیسہ ہے، میں اُسے خرچ نہیں کر سکتا ———"

"تب پھر ؟"

زندگی میں جب کہیں سے بھی روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی، کبھی کبھی کوئی ان ہونی بھی ہو جاتی ہے اور اس دن دینکر کے ساتھ بھی وہی ہوا اور جو کچھ ہوا اس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا، کون کہہ سکتا تھا کہ اس طرح اچانک ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہو جائے گی جس سے ملنے کی کوئی اُمید ہی نہیں تھی۔ دینکر خود بھی دنگ رہ گیا تھا اور کرن کی حیرت کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔

غضنفر پور کے اسی نکڑ پر یکایک اسی بھلے آدمی سے ملاقات ہو گئی، جو ہمیشہ سوٹ میں ملبوس رہتا تھا، آج بھی وہ سوٹ میں ملبوس تھا، وہی سفید رنگ وہی لمبا چہرہ، وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا، دینکر نے اُسے نہیں دیکھا تھا، کرن کے دل میں کیا آیا کہ وہ دوڑ کر اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

بولا ——— "آپ میری لائبریری کے ممبر بنیں گے سر ؟"

"لائبریری، کون سی لائبریری ؟"

"دی کالی گھاٹ بوائز لائبریری، پانسو کتابیں جمع ہو گئی ہیں اور ابھی بہت سی کتابیں خریدنی ہوں گی، اگر آپ کچھ مدد کریں ———"

اتنا کہہ کر کرن نے چھپی ہوئی رسید اس کے سامنے کر دی۔

"یہ دیکھیے، بہت سے لوگوں نے چندہ دیا ہے، چندہ جمع کر کے ہم لوگ اس لائبریری کو اور بڑی بنائیں گے، یہ دیکھیے، ایک صاحب نے ایک روپیہ دیا ہے اور یہ دیکھیے ایک صاحب نے آٹھ آنہ دیا ہے ———"

"کالی گھاٹ ؟ کالی گھاٹ میں تمھاری لائبریری کہاں پر ہے ؟"

"ینپال بھٹیاچارج لین میں، ابھی چھوٹا سا کمرہ ہے بعد میں بڑا کمرہ کرایہ پہ لیں گے ——"
کالی گھاٹ میں ایشور گنگولی لین کہاں ہے، جانتے ہو؟"
اب کے کرن کی ہمت اور بڑھی۔ اس نے کہا ——

"ایشور گنگولی لین؟ ایشور گنگولی لین ہی میں ہمارا پریذیڈنٹ رہتا ہے —— وہ دیکھیے، وُہی ہے ہمارا پریذیڈنٹ دینبکہ سین، اُمینس ایک بی، ایشور گنگولی لین میں رہتا ہے ——"

اُمینس ایک بی نمبر سُن کر وہ شخص چونک سا گیا، اُس نے صدر کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا، اس وقت تک دینبکر دُور کھڑا کھڑا کرن کی حرکت دیکھ رہا تھا، شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا اور دُور سے اُسے اس آدمی کی شکل صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ شخص یکایک لپک کر دینبکر کے سامنے آگیا۔

"گڈ، گڈ تم، دیپو؟"

اس شخص کی زبان سے اپنا نام سُن کر دینبکر بھی چونک اُٹھا۔ اس نے غور سے اس آدمی کا چہرہ دیکھا۔ اُسے وہ شناسا سا معلوم ہوا، جیسے اس آدمی کو اس نے کہیں دیکھا ہے، کئی بار اس سے مل چکا ہے، اس سے باتیں کر چکا ہے اور وہ اُسے جانتا ہے . . . . .

یکایک دینبکر کو یاد آگیا۔

"آپ؟ آپ یہاں؟"

"تم مجھے پہچان رہے ہو؟ میرا نام مسٹر داتار ہے، بہت دن کے بعد تم سے ملاقات ہُوئی ہے ——"

مسٹر داتار، اتنے دنوں تک تو دینبکر کو اس کا نام بھی معلوم نہیں تھا، وہ کنڈو پوکھر کے کنارے کھڑا رہتا اور دینبکر لکھی دیدی کا خط لا کر اس کے ہاتھ میں دے دیتا، اس خط میں کیا لکھا ہوتا، اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا، وُہ جس کو ہر روز خط دے آتا تھا، اس کا نام بھی وہ نہیں جانتا تھا، ایک روز اس نے لکھی دیدی کو پڑھنے کی میز کے سامنے بیٹھ کر اسی آدمی کی تصویر چھپا کر دیکھتے ہوئے دیکھا تھا اور دینبکر کو دیکھتے ہی لکھی دیدی نے وہ تصویر چھپا لی تھی، یہ اس روز کی بات تھی جس دن سی۔ آر۔ داس کا انتقال ہوا تھا، اس کے بعد وہ ہر روز بلا ناغہ خط پہنچاتا رہا تھا، کتنی برساتیں، کتنی گرمیاں، کتنی بہاریں گزر گئیں، دن گزرتے رہے اور دینبکر میٹرک پاس کر گیا، اس کی عمر بڑھتی گئی اور اس کی مسیں بھیگنے لگیں، پھر دن گزرتے رہے، پھر ایک دن سنّی آگئی ——

یکایک مسٹر داتار نے پُوچھا ——

"تم لوگ چائے پیو گے؟"

اور دینبکر کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ کرن بول اُٹھا ——

"چائے ہم لوگ نہیں پیتے ——"
"تو پھر دُوسری کوئی چیز؟ چاپ، کٹ لیٹ، سنگھاڑا یا کچوری؟"
"وہ کھا سکتا ہوں" کرن نے جواب دیا —— "ہم لوگوں کو زوروں کی بھوک بھی لگی ہوئی ہے۔"
"تو پھر چلو، میں تم لوگوں کو کھلاتا ہوں ——"
مسٹر داتار ان دونوں کو ایک مٹھائی کی دوکان میں لے گئے، مرمر کی میز تھی، ہات دھونے کا بیسن تھا، شیشے کے گلاس تھے، دکان میں سب کچھ تھا، مسٹر داتار ایک میز کے پاس کنارے میں بیٹھ گئے، یہ دونوں بھی ان کے قریب جاکر بیٹھ گئے، اس کے بعد لوچی، سندیش اور رنپتوا ایک کیلے کے پتے پر سجا کر دکان کا ملازم ان دونوں کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔
دینکر نے پوچھا —— "آپ نہیں کھائیں گے؟"
داتار بابو نے کہا —— "میں یہ سب نہیں کھاتا، میں صرف چائے پیوں گا۔"
دینکر نے کرن کی طرف دیکھا، لیکن کرن اس وقت تک کھانا شروع کر چکا تھا، وہ لوچی پر رنپتوا رکھ کر جلدی جلدی نگل رہا تھا، وہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر کھائے جا رہا تھا اور اس کے سامنے رکھی ہوئی چیزیں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ دینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے کرن اس طرح کھا کر بڑی بے شرمی کا ثبوت دے رہا تھا، اس کی حرکت دیکھ کر دینکر کو بڑی شرمندگی محسوس ہونے لگی، ایک اجنبی آدمی کھلا رہا تھا اس لیے ذرا آہستہ آہستہ رُک رُک کر کھاتا تو اچھا معلوم ہوتا، پتہ نہیں، مسٹر داتار اپنے دل میں کیا خیال کریں گے۔
کرن کی طرف دیکھ کر داتار نے پُوچھا ——
"اور کھاؤ گے؟"
کرن نے اثبات میں سر ہلایا۔
"ہاں ——"
"تم؟"
دینکر نے کہا —— "نہیں ——"
"شرما رہے ہو کیا؟ شرمانے کی ضرورت نہیں، پیٹ بھر کر کھاؤ ——"
"مجھے کوئی شرم نہیں" کرن نے کہا —— "مجھے آپ جتنا کھلائیں گے، کھا لوں گا، میں آج چار دن سے ڈاب کھا کر گزارہ کر رہا ہوں ——"
"ڈاب؟"
"ہاں" کرن نے جواب دیا —— "آج صبح دس ڈاب کھائے ہیں، کل بیس ڈاب کھائے تھے ——"

دینکر نے اُسے روک دیا۔

"اس کے بابا سخت بیمار ہیں، گھر میں کھانے کو نہیں ملتا اسی لیے ڈاب کا گودا کھاتا ہے۔"

مسٹر داتار کو اس کی بات سُن کر حیرت ہوئی، وہ بہت ساری باتیں پُوچھنے لگے۔ کرن کیا کرتا ہے، دینکر کیا کرتا ہے، اس کے گھر کی حالت کیسی ہے، کس طرح بھیک مانگ کر اب تک تعلیم حاصل کرتا رہا ہے اور کس طرح پیسے کی مجبوری کی وجہ سے اُسے اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کر دینا پڑا، کس طرح پران متھ بابو دینکر کی ہر ماہ مدد کرتے ہیں، ہر ماہ کتنا روپیہ دیتے ہیں، اُنھوں نے ایک ایک کر کے بہت ساری باتیں دریافت کیں۔

کرن نے کہا ——— "مجھے اپنے لیے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں، آپ صرف میری لائبریری کے ممبر بن جائیں، ہر مہینہ ایک روپیہ چندہ دے دیں، اور مجھے کچھ نہیں چاہیے ———"

مسٹر داتار بولے ——— "ہر مہینہ ایک روپیہ نہیں دوں گا ———"

"تو پھر آٹھ آنے دے دیا کریں؟ لیکن آٹھ آنہ سے کم لینے سے کام نہیں چلے گا۔"

"نہیں آٹھ آنے بھی نہیں! دو روپے، میں ہر مہینے دو روپے دیا کروں گا۔"

کرن کی حیرت کی انتہا نہ رہی، تھوڑی دیر کے لیے وہ جیسے گنگ ہو گیا۔ دینکر کو بھی بڑی حیرت ہوئی، ان سے نہ تو ایسی کوئی راہ و رسم تھی اور نہ ایسی پُرانی مُلاقات تھی۔ صرف لکھی دیدی کا خط پہنچانے کی وجہ سے معمولی سی جان پہچان تھی، اُس نے تو کبھی ان کا نام بھی دریافت نہیں کیا تھا اور نہ کبھی ایسا کوئی اشتیاق ہی ظاہر کیا تھا، کبھی کبھی وہ صرف اتنا سوچتا کہ آخر یہ کون آدمی ہے؟ لکھی دیدی اُسے خط کیوں لکھتی ہے؟ یہ شخص لکھی دیدی کے گھر کیوں نہیں آتا، ان دونوں کے درمیان چوری چھپے خط و کتابت کیوں ہوتی ہے! لکھی دیدی نے اس خط کا ذکر دُوسروں کے سامنے کرنے سے کیوں منع کیا ہے، اگر کسی کو معلوم ہو جائے تو اس میں ہرج کیا ہے؟ تو کیا وہ کوئی غلط کام کر رہی ہے، چوری چھپے اس خط و کتابت کو تو اچھا نہیں کہا جائے گا ——— ! بنتی دیدی تو کسی کو خط نہیں لکھتی! بنتی دیدی کو تو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا، پھر لکھی دیدی کیوں بنتی دیدی جیسی نہیں ہے!

مسٹر داتار نے کہا ——— "تم میرے دفتر کا پتہ رکھ لو ———"

اتنا کہہ کر اُنھوں نے ایک کارڈ دیا، دینکر نے کارڈ لے کر دیکھا، اس پر لکھا ہوا تھا ——— مسٹر ایس ایس داتار، چوبیس بی، لوبازار اسٹریٹ ———"

"ہر روز دوپہر کے وقت میں دفتر میں رہتا ہوں، تم لوگ میرے دفتر میں آ کر چندہ لے لیا کرو گے۔"

پھر قدرے رُک کر بولے ———

"اور ایڈمیشن بھی میں ابھی دے دیتا ہوں، یہ لو پانچ روپے ———"

پانچ روپے! پانچ روپے کے نوٹ کی طرف دیکھ کر کرن ایسا بوکھلایا کہ ہات بڑھانا بھی بھول گیا۔ مسٹر داتار

نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا، وُہی مخصوص سگریٹ تھا! پھر وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگے۔ دینکر نے کتنی ہی بار اور کتنے دنوں تک انھیں سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا تھا، وہ لکھی دیدی کا خط پڑھتے وقت اسی طرح لمبے لمبے کش لیتے تھے اور اس کے بعد کہتے ——

"گڈ، ویری گڈ ——"

پہلے جب وہ لکھی دیدی کا خط لے کر جاتا تھا تو اُسے داتار بابو پر بے حد غصّہ آتا تھا، اُسے احساس ہوتا جیسے وہ کوئی غلط کام کر رہا ہے، جرم کر رہا ہے، لیکن آج پہلی بار دینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اب تک وہ غلطی پر تھا، داتار بابو کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی، مسٹر داتار بہت اچھے آدمی تھے، چوری چھپے وہ لکھی دیدی کو خط لکھیں، راہ و رسم بڑھائیں، اب وہ کسی سے نہیں کہے گا۔

داتار بابو بولے ——

"شاید پانچ روپے کا نوٹ دیتے دیکھ کر تم لوگوں کو حیرت ہو رہی ہے، لیکن ایک دن میں بھی تم لوگوں ہی کی طرح غریب تھا، میری گزر بسر بھی مصیبتوں اور تکلیفوں کے درمیان ہو رہی تھی، کئی کئی دن فاقے میں گزر جاتے، بہت دنوں تک جیب میں ایک پیسہ بھی نہ ہوتا، لیکن اس کے بعد میں بے شمار دولت اور جائداد کا مالک بن گیا —— میں ایک روز اپنی تکلیف دہ زندگی سے اُکتا کر گھر سے فرار ہو گیا تھا۔"

"فرار ہو کر کہاں گئے تھے؟" یکایک کرن نے سوال کیا۔

داتار بابو نے کہا —— "میں برما چلا گیا تھا ——"

برما! لکھی دیدی کا وطن بھی تو برما ہی ہے، دینکر نے سراغ لگانے کی کوشش کی، تو کیا داتار بابو اور لکھی دیدی کے درمیان برما ہی سے راہ و رسم ہے، کھانا پینے کے بعد روپیہ پاکر اس وقت کرن بے حد خوش تھا، اس نے جیب سے پنسل نکال کر ایک رسید کاٹ دی۔ رسید پر پانچ روپے کی رقم درج تھی۔

ایڈمیشن فی، اس کے بعد ہر ماہ دو روپیہ چندہ۔

کرن نے پوچھا —— "آپ کا پورا نام کیا لکھوں؟"

دینکر نے رسید دے دی۔

داتار بابو کہتے گئے ——

"تم لوگوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، تم لوگوں کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے —— dont be dis-heartend boys —— ایک دن میں بھی بغیر کچھ کھائے پیئے سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا، تم کوڑے پر پھینکے ہوئے ڈاب کھاتے ہو، مجھے وہ بھی نہیں ملا تھا، لیکن پھر بھی میں کبھی مایوس نہیں ہوا اور آج میرے پاس وہ سب کچھ ہے، لوگ جن چیزوں کی حسرت کرتے ہیں، میں نے جو کچھ چاہا وہ بھی پایا اور جو نہ چاہا وہ بھی پایا ——"

"آپ بھوجودا کو پہچانتے ہیں ؟"
یکایک کرن نے پھر ایک سوال کیا۔
"بھوجودا ؟ Who is he ، کون ہیں یہ ؟"
"بھوجودا بھی بہت سے ملکوں کی سیر کر چکے ہیں، وہ سات زبانیں جانتے ہیں، بھوجودا نیپالی زبان جانتے ہیں، برمی زبان جانتے ہیں اور فرنچ جانتے ہیں، بھوجودا نے بھی مجھ سے کہا تھا، دُکھ ہمیشہ نہیں رہتے، دُکھ کو ایک دن ختم ہونا ہی ہے، ایک روز سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، مُلک میں سوراج آئے گا، انگریز یہاں سے چلے جائیں گے، پھر ہمارے دیش کے لوگ ہی راجہ ہوں گے، بچپن میں سونار کارتک گھاٹ پہ ایک سادھو نے بھی مجھے یہی بتایا تھا ———"
مسٹر داتار نے کہا ——— "تم ٹھیک کہتے ہو، برما میں لکڑیوں کے ایک بہت بڑے تاجر مسٹر بی مترا ہیں، ان کی لائف ہسٹری بھی اسی طرح کی ہے ——— ان دنوں وہ بے شمار دولت کے مالک ہیں، پروم میں اتنا بڑا کاروبار کسی کا نہیں ہے ———"
یکایک دینکر نے پوچھا ———
"لکھی دیدی کسے بابا ؟"
"ہاں" مسٹر داتار نے جواب دیا۔
دینکر نے کہا ——— "لکھی دیدی کی بہن ستی بھی کلکتہ آگئی ہے ———"
"آگئی ہے ؟"
مسٹر داتار اتنا کہہ کر جیسے کچھ سوچنے لگے، اس کے بعد وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
"اچھا اب میں چلتا ہوں، تم لوگ اپنے گھر جاؤ ——— لیکن میرے دفتر ضرور آنا۔"
مسٹر داتار نے کاؤنٹر پر پیسے دے دیے، اتنی ہی دیر میں ان کے کافی روپے خرچ ہو گئے تھے۔
جاتے جاتے رُک کر انھوں نے دینکر کو بلایا۔
"سنو ———"
دینکر ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔
"آج لکھی دیدی سے تمھاری مُلاقات ہو گی ؟"
"ہاں، کہیئے، کیا کہنا ہے ؟"
"کہنا کل اُسی جگہ مجھ سے مُلاقات کرے ———"
دینکر کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا ———

"ایسی جگہ کہاں ؟"

"اُسی جگہ کہنے سے تمھاری لکھی دیدی سمجھ جائے گی اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، یاد نور ہے گا، کل ! کل سویرے ———"

اتنا کہہ کر وہ چلے گئے۔

کرن نے بہت دنوں کے بعد آج پیٹ بھر کر کھایا تھا، اس کے علاوہ پانچ روپے چندہ بھی مل گیا تھا، یکمشت اتنی رقم آج تک کسی نے چندے میں نہیں دی تھی، چنڈی بابو اتنے امیر آدمی تھے مگر ان کے لڑکے راکھال نے بھی نہیں دیا تھا، بیرسٹر پالیت کے لڑکے نرمل پالیت نے بھی نہیں دیا تھا، دونی کاکا، پنجادا اور مدھوسودن کے بڑے بھیا کسی نے بھی نہیں دیا تھا، بلکہ ان سبھوں نے طنز کیا تھا، مذاق اُڑایا تھا۔

کرن نے کہا——— "اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں دیپو، بہت اچھے آدمی ہیں، ہم لوگوں کو کتنا کھلا دیا ہے، اب تو مجھے چار روز تک کچھ بھی کھانے کو نہ ملے تو بھی کوئی پروا نہیں ———"

دیپنکر نے سوچا، واقعی بہت اچھے آدمی ہیں، ان سے جان پہچان ہی کتنی ہے ان سے تعلقات ہی کتنے ہیں! صرف چندہ روز وہ انھیں خط پہنچاتا رہا تھا، اسی کے لیے اتنی تواضع، اتنی خاطرداری!

کرن نے پانچ روپیہ کا نوٹ قمیض کی جیب سے باہر نکالا اور نکال کر بڑے غور سے دیکھنے لگا، جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو، پانچ روپیہ کا نوٹ! اُس نے پھر نوٹ کو تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

"پانچ روپیہ کا نوٹ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے، ہے نا ؟"

پھر بولا——— "یہ روپیہ تمھاری ہی وجہ سے ملا ہے دیپو، تم نہ رہتے تو وہ دیتے ہی نہیں، یہ کون ہیں رے ؟ تمھیں اُنھوں نے کیسے پہچان لیا ؟"

لیکن دیپنکر اس وقت کسی اور ہی خیال میں کھویا ہوا تھا، روپیہ کی طرف دیکھ کر اُسے ایک بات یاد آگئی، کیا روپیہ دینے ہی سے وہ بہت اچھے آدمی ہو گئے ؟ اتنے دنوں تک ان کے خلاف اس کے دل میں جو نفرت، جو غلط فہمی تھی، وہ کیا پانچ روپے ہی سے دُور ہو گئی ؟ روپیہ ہی کی وجہ سے تو کرن دِنار بابو کی تعریف کر رہا تھا ؟ روپیہ اور مٹھائی! اگر وہ روپیہ نہ دیتے، اگر نہ کھلاتے! اگر دُوسرے لوگوں کی طرح پولیس سے پکڑوا دینے کی دھمکی دیتے! تو کیا ہوتا ؟ تب تو اگھور دادو نے ٹھیک ہی کہا ہے، روپیہ ہی سے تو ہر چیز خریدی جاتی ہے، دُنیا کی ہر چیز تو روپے ہی سے خریدی جاتی ہے، پیار، محبت، شفقت، ذہن، احساسات، زیور، چاول، دال، نمک، تیل، سب کچھ!

"تم جواب کیوں نہیں دیتے ؟" کرن نے کہا۔

اس وقت پُل کے اُوپر سے ایک ٹرام تیزی سے نیچے اُتر رہی تھی، دیپنکر کھویا ہوا کھڑا تھا، ٹرام اس کے جسم کے بالکل قریب سے گزر گئی، دیپنکر چونک کر جلدی سے دُوسری طرف مُڑ گیا، اگر ذرا سی دیر وہ اور نہ مڑتا

تو وہ ٹرام کے نیچے آگیا ہوتا۔

دینکر کی ماں نے اسی وقت چولہے پر ہانڈی چڑھائی تھی، سہ پہر کے وقت تھوڑی دیر کے لیے اسے فرصت مل جاتی تھی، اس وقت تک دینکر کالج سے واپس نہیں آتا تھا، اب لڑکا باشعور ہو چکا تھا، پھر بھی کچھ کہہ کر نہیں جاتا، پتہ نہیں کہاں کہاں گھومتا رہتا ہے، جب شام ہونے لگتی ہے تو گھر لوٹتا ہے اور اس کے بعد ہی لالٹین جلا کر پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔

"اے لڑکی، لڑکی ——"

ایک روز اگھور دادو نے بالائی منزل سے اتر کر آواز دی۔ اگھور دادو کو آنکھوں سے سوجھائی نہیں دیتا تھا لیکن وہ دیوار کا سہارا لے کر چلے آتے تھے۔

"اے لڑکی، لڑکی، منہ جلی کو سنائی نہیں دیتا ——"

"کیا ہے بابا؟"

ماں سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

"آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں بابا؟ کھانا کھائیں گے؟"

"منہ جلا کہاں ہے؟ میں پوچھتا ہوں منہ جلا کہاں گیا؟"

ماں کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔

"کون بابا؟ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟"

"اور کس کے بارے میں پوچھوں گا! اس گھر میں کتنے منہ جلے ہیں، سنوں تو ذرا؟"

"چھیٹے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں یا پھونٹا کے؟"

اگھور دادو کو جلال آگیا۔

"ارے وہ دونوں کیا منہ جلے ہیں، وہ دونوں تو حرامزادے ہیں۔"

"تو پھر کس کی بات کر رہے ہیں؟ دینو؟"

"ہاں رے لڑکی، وُہی تو اصل منہ جلا ہے! منہ جلا امتحان پاس کر گیا مگر مجھے پرنام کرنے نہیں آیا، منہ جلے نے سمجھا کیا ہے! منہ جلے نے کیا سانپ کا پاؤں دیکھ لیا ہے؟ منہ جلا کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بولتے بولتے اگھور دادو کے پوپلے منہ میں آواز اٹک گئی۔

"اوماں، یہ کیسی بات ہے، اے دینو ——"

دینکر پڑھ رہا تھا، اٹھ کر سامنے آگیا۔

ماں نے کہا ——— "تم نے اپنے دادو کو پرنام نہیں کیا ؟ اس کو پاس ہوئے تو بہت دن ہو چکے ہیں بابا!
اب تو کالج میں پڑھ رہا ہے، اس کی کتاب خریدنے کے لیے آپ ہی نے تو روپیہ دیا تھا، اس کے کپڑے خرید
دیے تھے ———"

دینکر نے اگھور دادو کے قدموں پر جھک کر پرنام کیا۔

اور اگھور دادو لاٹھی لے کر چیخ اٹھے ———

"بھاگو مُنہ جلے، بھاگ جاؤ، میں کوئی نہیں ہوں مُنہ جلے، میں تمھارا کوئی نہیں ہوں ؟ میری ناقدری ؟"

اتنا کہہ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئے اور لاٹھی سنبھال لی۔

ماں نے کہا ——— "میری ہی غلطی ہے بابا! میں کہاں سے پڑھا سکوں گی، کہاں سے روپیہ لاؤں گی، اسی
فکر میں گھل رہی تھی، اس لیے آپ سے نہ کہہ سکی۔"

اگھور دادو کا غصّہ پھر بھی دھیما نہ ہوا، وہ پھر چیخ اٹھے ———

"میری ناقدری ؟ میرے ہی گھر میں رہ کر، میرا کھا کر مجھی کو مُنہ جلا نظر انداز کرے گا، میں نے گن گن کر بٹھا کر کو
کتنا تلسی چڑھایا تھا، ٹھہرو، میں تمھیں پاس ہونے کا مزہ چکھاتا ہوں، ٹھہرو ———"

کہتے کہتے اگھور دادو زینہ طے کرتے ہوئے اوپر چلے گئے۔

اور ماں دینکر پر برہم ہو اٹھی ———

"مجھے اگر خیال نہیں تھا تو مجھے دس طرح کی فکر گھیرے ہوئے ہے، میرا دماغ پریشان ہے، لیکن تمھیں تو
خیال ہونا چاہیئے، بتاؤ تو تمام دن تم کیا کرتے ہو، صرف کھانا اور کالج جانا، اس کے علاوہ تمھارا اور کیا کام ہے
سنوں ؟"

چنوفی روز سویرے بازار کرنے جاتی تھی اور ماں حساب کر کے اُسے سمجھا دیا کرتی تھی ———

"اسی چار آنے میں سب کچھ لانا ہوگا چنوفی سمجھ گئی لاڈلی ؟"

چنوفی اعتراض کرتی ——— "چار آنے میں تمام چیزیں کس طرح لاؤں گی، میں کوئی جادو تو نہیں۔"

"اس سے زیادہ میں نہیں دے سکتی میری لاڈلی! اس سے زیادہ چاہیئے تو بابا سے جا کر مانگ لو، میں
کچھ نہیں جانتی ———"

چنوفی جانتی تھی کہ اگھور دادو کے پاس جا کر پیسہ مانگنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی، وہ بڑبڑاتی ہوئی دل
ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی بازار کی ٹوکری لے کر چلی جاتی، اس کے بعد جب کافی دن چڑھ آتا اور چولھے کا کوئلہ
جل کر راکھ ہو جاتا، تو واپس آتی۔

"تم ابھی واپس آئی ہو چنوفی ؟ یہ بازار لانے کا وقت ہے، میں کب کھانا پکاؤں گی اور کب سبھوں کو کھانے

کے لیے دوں گی، بتاؤ تو ؟"

سوکھا ہوا پوئیں کا ساگ، جھینگڑی مچھلی، ایک ٹکڑا میٹھا کدو، آدھ سیر آلو اور ایک بیگن اور دُوسری کئی چیزیں چنوئی لاکر سامنے پھینک دیتی۔

کہتی —— "اب میں بازار نہیں کر سکتی ——"

"نہیں کر سکتی تو بابا سے جاکر کہو، مجھ سے کہہ کر کیا فائدہ ہوگا، میری لاڈو ؟ میں کون ہوں ؟"

"اچھا دیدی، تم ہر بات میں، بابا کا حوالہ کیوں دیتی ہو۔" چنوئی کہتی —— "میں پوچھتی ہوں تم کیا کچھ بھی نہیں ہو؟ میں پوچھتی ہوں تم بھی اسی گھر کی فرد ہو ——"

ماں کو غصہ آجاتا، وہ جلدی جلدی ترکاری کاٹتی ہوئی کہتی ——

"نہیں، میں اس گھر کی کوئی نہیں ہوں، کوئی بھی نہیں، کچھ بھی نہیں، میں اس گھر کی کچھ ہونے ہی کیوں جاؤں گی سنو، میری تقدیر جل گئی ہے اسی لیے تمھارے یہاں آکر بھات پکا رہی ہوں، میرا لڑکا جوان ہو جائے گا تو کیا تم سمجھتی ہو میں اس گھر میں کھانا پکاؤں گی ؟"

بنتی دیدی دروازے کے قریب آکر چپ چاپ تمام باتیں سنتی رہی اور جب تک ماں اور چنوئی کے درمیان باتیں ہوتی رہتیں اس وقت تک وہ کچھ نہ بولتی، وہ کچھ ایسی دکھائی دیتی جیسے اس گھر میں جنم لے کر اس نے کوئی جرم کیا ہو، جیسے ان گھر والوں کے سامنے جوان ہو کر اس نے بہت بُرا کیا ہو، بنتی دیدی جب چھوٹی سی تھی تو اس کے احساسات اتنے تلخ نہیں تھے۔ اسی کالی گھاٹ میں دُوسرے دسیوں لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ کھلے ہوئے آسمان اور ٹوٹی ہوئی چھت کے نیچے وہ پلی بڑھی تھی۔ اُس نے ایک حریص بوڑھے، ماں کی ممتا سے عاری دُنیا، اور دو بھائیوں کو دیکھا تھا، بھائیوں نے کب آہستہ آہستہ گھر سے باہر قدم نکالا اور کب باہر کی دُنیا میں کھو گئے، کب اس کا دل تنہائی کا خوگر ہو گیا، اُسے پتہ بھی نہ چل سکا۔ اس کے بعد ایک روز آہستہ آہستہ دبے پاؤں جوانی آگئی تو اس نے سہم کر چاروں طرف دیکھا اور خود اپنے وجود میں روپوش ہو گئی، اس کی اس تبدیلی کی خبر کسی کو معلوم نہ ہو سکی، کسی نے یہ سب کچھ معلوم کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، صرف چنوئی سب کچھ جانتی تھی، بچپن سے ہی چنوئی اس کی سب کچھ تھی، وُہی نہلاتی، وُہی کھلاتی، وُہی بازار کرتی اور وُہی آنگن میں جھاڑو بھی دیتی، یہی چنوئی اس کی ماں تھی، لیکن ایک دن چنوئی بھی بوڑھی ہو گئی، اس کی آنکھوں میں جالے پڑ گئے اور اب وہ بھی اس لڑکی کے دل کی بات سمجھنے سے قاصر ہو گئی، اس کے بعد یکایک دیبو کی ماں آگئی، دیبو کی ماں کے آتے ہی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک سہارا مل گیا ہو، جیسے یکایک کسی نے اس کے سینے پر ہمدردی کا ہات رکھ دیا ہو۔

وہ آواز دیتی ——

"دیدی ——"

ترکاری کاٹتے کاٹتے ماں جواب دیتی ——
"کیا ہے، کیا کہنا چاہتی ہو بیٹی ؟"
بنتی کی آواز سنائی نہ دیتی، اس کی زبان گنگ رہتی۔
ماں پھر پوچھتی —— "کیا کہنا چاہتی ہو کہو نا بیٹی ؟"
"تم چلی جاؤ گی دیدی ——"
"او ماں، کیا اسی لیے تم پریشان ہو گئیں، دُور، میں کہاں جاؤں گی بیٹی، اس بُڑھے کے سوا میرے لیے دُنیا میں بھگوان نے کوئی جگہ جانے کی رکھی ہے، میرا دیپو کب جوان ہوگا، میں اُسے دیکھ بھی سکوں گی، تم بھی کیسی نادان ہو!"
بنتی خاموش رہتی۔
ماں کہتی —— "تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں تمھارا کوئی انتظام کر کے ہی یہاں سے جاؤں گی، دیکھ لینا ——"
بنتی کو جیسے دِل ہی دِل میں ماں کی باتوں سے بڑی تسلی ہوتی، کیسی تسلّی، کیسا بھروسہ، یہ سب کچھ وہ نہیں جانتی تھی، وہ اس کا اظہار کرنے سے بھی قاصر تھی، لیکن پھر بھی اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ماں کا سہارا پاکر وہ مطمئن ہو گئی ہے، اس کے بعد وہ دروازے پر بیٹھ کر ماں کو کھانا پکاتے ہوئے دیکھتی رہتی۔
اور جب کافی رات ہو جاتی تو ماں بنتی کو اس کے کمرے تک چھوڑ آتی۔
"دروازہ بند کر کے سو جاؤ بیٹی، اندر سے چٹخنی لگا دو، اگر ضرورت ہو تو مجھے آواز دے دینا بیٹی، سمجھیں ——"
اور کسی دن چھیٹے کھانا کھا رہا ہوتا تو ماں کہتی ——
"اچھا بیٹے، تمھارے جیسے ہونہار بھائی کے رہتے ہوئے چھوٹی بہن کی شادی نہیں ہو گی، یہ کیسی بات ہے!"
چھیٹے یا پھونٹا، دونوں بھائی گھر کے بارے میں کبھی سوچتے ہی نہیں تھے، ان کا تعلق گھر سے صرف کھانا کھانے تک محدود تھا اور وہ بھی اگھور دادو سے پوشیدہ۔ ورنہ اگر کسی دن اگھور دادو کو یہ معلوم ہو جاتا کہ چھیٹے یا پھونٹا کھانا کھانے گھر آتے ہیں، تو وہ بہت پہلے ہی ہنگامہ کھڑا کر چکے ہوتے۔
وہ دونوں کھا پی کر ہاتھ مُنہ دھو لیتے، اس کے بعد چلے جاتے۔
ماں نے ایک دن پھونٹا سے بھی یہی بات کہی۔
"تم لوگ لائق بھائی ہو، تم لوگوں کو بہن کے بارے میں بھی تو سوچنا چاہیئے ——"
گھر سے ان کا صرف کھانے تک تعلق تھا، دونوں بھائی صرف کھانے ہی آتے تھے اور شاید کھانے کے لیے آنے سے پہلے گنگا میں نہا لیتے تھے۔
کھاتے کھاتے پھونٹا نے جواب دیا ——

"مگر ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں دیدی، بڈھے کی زندگی میں ہم لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

"اب وہ ضعیف ہو چکے ہیں، ان کی آنکھوں میں کیا روشنی ہے، اب کیا ان کے اندر بھاگ دوڑ کرنے کی طاقت ہے ———"

"طاقت تو نہیں ہے، لیکن زبان درازی تو سولہ آنے باقی ہے، انھیں زہر بھری باتوں سے تو گھر میں رہنا تک دوبھر ہو گیا ہے سالا ———"

ماں نے کہا ——— "بوڑھا ہو جانے کے بعد آدمی ایسا ہی ہو جاتا ہے بیٹے" اس کے لیے کیا غصہ کرنے سے کام چلے گا، یہ جو دونوں شام بھر پیٹ کھا رہے ہو، یہ بھی تو انھیں کا دیا ہوا ہے، وہ کما کر لاتے ہیں جب ہی تو تم لوگوں کو دونوں شام کھانے کو ملتا ہے ———"

"کیوں کھانے نہیں دے گا! بوڑھے کا باپ کھانے کو دے گا ——— بوڑھے کا چودہ پشت کھانے کو دے گا، کھانے نہیں دے گا تو میں بھی بوڑھے کو دیکھ لوں گا ایک بار، اس کا سر اینٹ سے پھوڑ دوں گا ———"

اس کے بعد، تو مزید کوئی بات نہیں کی جا سکتی تھی، چھیٹے اور چھوٹا زیادہ باتیں سننے کے عادی بھی نہیں تھے، کھانے کے بعد وہ دونوں گھر میں رکتے بھی نہیں تھے۔

کھانا کھا کر آنگن کے نلکے پر جا کر چو بچہ میں منہ ہات دھو لیتے اور باہر نکل جاتے، باہر نکل کر ایک بیڑی سلگاتے اور لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے چلے جاتے، اس کے بعد دن بھر ان دونوں کی شکل پھر دکھائی نہ دیتی۔

اور اس وقت پیتل کی ایک چھوٹی سی ہانڈی میں بھات جلنے لگا تھا۔

ماں نے نلکے کے پاس سے آواز دی ———

"اے بیٹی نبتی، اے بیٹی، بابا کا بھات جل رہا ہے، تم نے اتارا نہیں ———"

اگھور دادو کا بھات ماں چولھے پر سے نہیں اتارتی تھی، ہانڈی اتارنے کی ذمہ داری نبتی پر تھی۔

نبتی کہتی ——— "تم بھی تو اتار سکتی تھیں دیدی ———"

"نہیں بیٹی، برہمن کا بھات چھو کر میں گناہ گار بنوں گی کیا؟"

"لیکن ہم لوگوں کا بھات تو تم ہی اتارتی ہو۔"

ماں کہتی ——— "تم تو میری بیٹی کے برابر ہو، تم چینونی کے ہات کا پکایا ہوا کھا کر پلی بڑھی ہو پھر میرا چھوا ہوا کھانے میں کیا ہرج ہے!"

اور اسی طرح ایک روز دیبو کی ماں نے آکر اس گھر کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی، اسی طرح اس گھر میں بھات پکانے سے شروع کر کے، خرچ کا حساب رکھنا، نواسے اور نواسی کی پرورش تک تمام ذمہ داری دیبو کی ماں کے کندھے پر آگئی تھی، اگھور دادو نے کبھی روپیہ دیا تھا، کبھی نہیں دیا تھا، کبھی ماں کو جھگڑا کرنا پڑا تھا، کبھی منت کرنی پڑی

تھی، اور کبھی کبھی نیتی کے کپڑوں کے لیے جس طرح زبردستی روپیہ وصول کرنا پڑا تھا، اسی طرح اگھور دادو کے گھر کا خرچ چلانے کے لیے بھی روپیہ وصول کرنا پڑا تھا، بوڑھا روپیہ خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا، اگھور دادو کو لگتا جیسے سبھی ان کے روپے کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اگھور دادو کی نظر میں ساری دُنیا کے لوگ اُنھیں کی طرح تھے۔

لیکن ایک دن اگھور دادو پر یہ بھی منکشف ہوگیا کہ اس دُنیا میں آدمی کی ایک اور قسم بھی آباد ہے، ایک روز رات کو یکایک چنڈی بابو کے مکان میں چوری ہوگئی اور چنڈی بابو کے رادھا کرشن کی مورتی کے جسم پر جو گہنے تھے، اُسے سبھوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کوئی چوری کر کے لے گیا۔ رام دھنی دربان گیٹ کے سامنے ہی سویا ہوا تھا، اُسے بھی کچھ پتہ نہ چل سکا، ایک روز پہلے شام کے وقت خاندانی پروہت آکر پوجا کر گئے تھے، آرتی ہوئی تھی، بھوگ ہوا تھا، سیوا ہوا تھا، دھوپ دھونا جلا تھا، گھنٹہ بجا تھا، جو کچھ ہر روز ہوتا تھا، اس روز بھی ہوا تھا اور یکایک اس کے دُوسرے دن صبح سویرے دیکھا گیا کہ پوجا گھر کے دروازے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا اور مورتی کے جسم پر اور گلے میں پچاس تولہ سونے کا زیور، ہار اور سر کا سکٹ غائب تھا، چنڈی بابو بڑے آدمی تھے، اس لیے اس نقصان کا اُنھیں کچھ زیادہ احساس نہیں ہوا۔ لیکن اس کے بعد سے اگھور دادو کی آنکھوں کی نیند اور دن کا آرام چھن گیا۔ آس پاس ذرا سی بھی کوئی آواز ہوتی تو وہ چیخ اُٹھتے

"کون؟ کون ہے رے؟ کون ہے رے مُنہ جلا؟"

دیپنکر جب کالی گھاٹ آیا تھا، اس وقت کالی گھاٹ ایسا نہیں تھا، چھوٹی چھوٹی گھاس کی چالی تھی اور پتلی پتلی گلیاں تھیں، ان گلیوں کے اندر سے مندر تک ایک منٹ میں جایا جا سکتا تھا۔ اگھور دادو کی چھت پر کھڑے ہونے سے آس پاس بہت سے پیڑ نظر آتے، رات کو یکایک جب نیند ٹوٹ جاتی تو دیپنکر آنکھ کھول کر کھڑکی سے باہر دیکھتا، آسمان سے ٹیک لگائے ہوئے بہت سے دیو جیسے بڑے بڑے بال کھولے ہوئے ادھر اُدھر دوڑ رہے ہوں، اس وقت شاید اُسے یہ یاد نہیں رہتا تھا کہ دن کے وقت جو ناریل کے پیڑ دکھائی دیتے تھے وہی رات کے وقت دیو بن جایا کرتے تھے۔

"اے لڑکی، لڑکی، مُنھ جلی سُنتی بھی نہیں ——"

اس وقت کافی رات ہوتی اور اگھور دادو کھڑاؤں پہنے ہوئے دیپو کے کمرے کے سامنے آکر آواز دینے لگتے، دیپنکر اس وقت بہت چھوٹا تھا، بہت چھوٹا، ہوگلی کے کسی دُور اُفتادہ بیڑہ نامی گاؤں سے آکر ان دنوں اس نے اگھور دادو کے مکان میں پناہ لی ہی تھی، اس وقت اس کے پاس نہ کوئی سہارا تھا اور نہ ہی کوئی اسباب۔

اگھور دادو پوچھتے ——— "یہ کیسی آواز ہوئی لڑکی؟"

"کہاں؟ میں نے تو کوئی آواز نہیں سُنی، کیسی آواز؟"

انگھور دادو کہتے ——— "تم نے آواز نہیں سنی، لیکن میں نے جو آواز سنی ہے ———"

انگھور دادو چھٹ پٹ کرنے لگتے۔ کئی دنوں سے ان کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی، دن کو بھی انہیں نہ نیند آتی نہ چین ملتا، ججمانوں کے یہاں ٹھیک وقت پر پوجا کرنے بھی نہیں جا سکتے، کمرے کا تالا بار بار کھینچ کر دیکھتے، باہر جا کر رکشا پر بیٹھنے کے بعد پھر لوٹ آتے اور پھر تالے کو کھینچ کھینچ کر دیکھتے پھر باہر چلے جاتے، انہیں کہیں بھی چین نہیں مل رہا تھا، واپس آتے ہی وہ ہانپتے ہوئے تالے کو پھر کھینچ کر دیکھنے لگتے۔

اس کے بعد ایک روز گنگا کے اس پار پھر چوری ہوئی، چوروں نے اس پار سے چوری کر کے اِس پار کالی گھاٹ میں شاہ نگر کے قریب آکر صندوق کو توڑ کر خالی کیا تھا۔

اس کے بعد تو انگھور دادو کی حالت بالکل ہی غیر ہو گئی۔

ایک روز رات کو وہ پھر آکر آواز دینے لگے۔

"اے لڑکی، لڑکی ———"

"کیا ہے بابا؟"

"تم اسی گھر میں آکر سو رہو بیٹی، میں ان منہ جلوں سے تنگ آگیا ہوں۔"

"لیکن آپ؟ آپ کہاں سوئیں گے؟"

اور اسی دن سے یہ طے پایا کہ دیپنکر کے ساتھ ماں اسی کمرے میں سوئے گی۔ ماں انگھور دادو کے کمرے میں سونے لگی اور لوہے کے صندوق کا پہرہ دینے لگی اور اسی دن سے انگھور دادو بالائی منزل کے کمرے میں سونے لگے، لیکن پھر بھی انگھور دادو کی بے چینی کم نہ ہوئی، پہلے پہلے کئی دنوں تک وہ تقریباً دس بار آکر صندوق کو دیکھ جاتے۔

کہتے ——— "منہ جلی، تالا ٹھیک ہے تو؟"

اتنا کہہ کر بار بار تالے کو کھینچ کر دیکھتے۔

اس کے بعد پوچھتے ——— "چھیٹے، پھوٹنا تو تمھارے کمرے میں نہیں آتا ہے نا لڑکی؟"

ماں کہتی ——— "نہیں بابا ———"

"آنے سے ان منہ جلوں کو کمرے میں مت آنے دینا، میں کہے دیتا ہوں، گھر میں داخل ہونے مت دینا، جھاڑو مار کر بھگا دینا ———"

"پھر وہ لوگ کھائیں گے کیا بابا؟ آپ اگر کھانے نہیں دیں گی تو وہ لوگ کھائیں گے کیا؟ وہ تو آپ کے اپنے نواسے ہیں ———"

انگھور دادو کا پارہ چڑھ جاتا۔

"اپنے نواسے ہیں نا کچھ ہیں! ایسے نواسوں کی ضرورت نہیں، میں ایسے نواسوں کا مُنہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا مُنہ جلے نواسے اور نواسی کیا میرے لیے سورگ میں چراغ جلائیں گے' میں کہتا ہوں' یہ مُنہ جلے میری چتا جلائیں گے ——"

اور کبھی کبھی دن ماں کہتی ——— "لیکن میرا دیپو بھی تو ایک دن بڑا ہوگا' اس وقت ؟ اس وقت اگر دیپو اس صندوق کو توڑ دے بابا ——"

اگھور دادو کہتے ——— "روپیہ بڑا ہے یا لڑکا بڑا ہے رے لڑکی ——— تمہارے نزدیک روپیہ سے لڑکا بڑا ہے ؟ ہوشیار رہو گی لڑکی، بیٹے پر اعتبار نہ کرنا لڑکی، مُنہ جلے لڑکے سب کچھ کر سکتے ہیں، تمہارا لڑکا تمہارے گلے پر چھری پھیر سکتا ہے! یہ لڑکی، لڑکے، نواسے، نواسی، داماد، بھانجے، ان مُنہ جلوں پر کبھی اعتبار نہ کرنا ——"

"تو کیا روپئے کا اعتبار کروں گی ؟"

"روپیہ ہی تو سب کچھ ہے رے مُنہ جلی، روپیہ ہے اسی لیے تو میں ابھی تک زندہ ہوں رے مُنہ جلی! روپیہ ہے جبھی تو کھانے کو ملتا ہے رے مُنہ جلی، روپیہ ہی تو مذہب ہے، روپیہ ہی تو جپ تپ اور بھگوان ہے رے مُنہ جلی، روپیہ ہی تو دیوتا ہے ——"

اگھور دادو سے متعلق بہت سی باتیں دینکر بچپن ہی سے سُنتا آیا تھا، ماں شاید ان کی باتوں پر یقین رکھتی تھی یا شاید یقین نہیں رکھتی تھی، لیکن ایک روز اُسے بھی تو اسی روپیہ کے لیے اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا' اسی روپیہ ہی کے لیے تو ماں کو اپنے سُسر کا مکان چھوڑنا پڑا تھا' اسی روپیہ ہی کے لیے تو ماں کو ایک دن دوپہر رات میں بستر سے دیپو کو گود میں لے کر بھاگنا پڑا تھا اور بھاگ کر یہاں آنا پڑا تھا' اسی روپیہ ہی کے لیے تو اس کے بابا کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا، دینکر نے کتنے ہی دنوں آگ بھری دوپہری میں بلا وجہ ماں کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھے تھے ——— کہیں کچھ بھی نہیں ہے، لیکن ماں رو رہی ہے اور اپنے آنسوؤں کو آنچل میں جذب کرتی جا رہی ہے اور پہلے پہل دینکر کچھ بھی نہ سمجھ سکا تھا۔

چنوٹی بازار کر کے کیلا، مولی اور دوسری چیزیں لاتی اور ماں اس سے ایک ایک چیز کی قیمت دریافت کرتی اور قیمت سُن کر ٹھنڈی آہیں بھر کر کہتی ———

"یہ سوکھے ہوئے کچے آم بھی پیسے سے خرید کر آتے ہیں اور وہاں اسی دیپو کے باغ میں ٹوکریوں آم پڑے رہتے تھے، کوئی کھانے والا ہی نہیں تھا ——"

دیپو کہتا ——— "وہیں چلو نا ماں ——"

ماں خاموش ہو جاتی۔

"بھگوان جب وہ دن لائیں گے تو جاؤ گے، میں اب کہاں وہ سب کچھ دیکھ سکوں گی۔"

اور ایک دن اس نے ماں کی زبانی وہ دردناک داستان سُنی تھی۔

صبح کے وقت بابا کچہری گئے تھے، زمین کے سلسلے میں بڑے بھائی سے مقدمہ چل رہا تھا، یہ مقدمہ دو سال سے چل رہا تھا اور اس مقدمے کے سلسلے میں وکیل اور مُنشی کا ایسا چکر تھا کہ گھر سے عدالت اور عدالت سے گھر کا پھیرا لگانا پڑ رہا تھا۔

ماں کہتی ——— "زمین اور جائداد کے لیے تمھیں جان دینے کی کیا ضرورت ہے! تم ان لوگوں کو چھوڑ دو، دے دو، یہ بڑے نشے کی چیز ہے۔"

بابا کہتے ——— "میں اپنی زمین انھیں کیوں دے دوں؟ دیپو جوان ہونے کے بعد مجھے الزام نہیں دے گا!"

ہائے رے! دُہی دیپو پھر ایک دن جوان ہوگا، ماں نے کیا کبھی یہ سوچا تھا، اسی دیپو کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے مقدمہ بازی ہوئی، لیکن کہاں گیا دیپو اور کہاں گئی وہ زمین! اور کہاں گیا وہ آدمی! شام ہو چکی تھی، پھر بھی وہ واپس نہیں آئے تھے، پھر رات کی سیاہی پھیل گئی، وہ پھر بھی نہیں آئے، ماں کو شبہ سا ہونے لگا، دیپو اس وقت سو رہا تھا، ماں نے آہستہ آہستہ دروازہ کھول کر ایک بار باہر دیکھا، سامنے ایک چالتا کا درخت تھا اور اسی درخت کے نیچے سے کچہری جانے کا راستہ تھا، ماں نے ایک بار آواز دی، بہو ہونے کے باوجود پتہ نہیں اس وقت اس کے اندر کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی۔

"اے غلام، غلام مُلّا ———"

غلام مُلّا دیپو کے بابا کا مزارع تھا، دیپو کے بابا نے اُسے جوتنے کے لیے زمینیں دے رکھی تھیں، وہ لکڑی چیر دیتا، باغ سے آم اور کٹھل توڑ دیتا، بانس کاٹ دیتا اور دُوسرے احکام کی تعمیل کر دیتا، اسی لیے مصیبت کے وقت ماں نے اسی غلام مُلّا کو پُوری طاقت صرف کر کے آواز دی۔

کہانی سُنتے سُنتے دیپنکر نے پُوچھا۔

"اس کے بعد؟"

دیپو کی ماں کی زندگی میں وہ بھی ایک دن گزرا تھا، بابا صبح کے وقت ہی کھا پی کر کچہری گئے تھے، مگر اس وقت تک نہیں لوٹے تھے۔ ایسا تو نہیں ہوتا، اس کے بعد مشرق کی طرف بانس کے جھاڑ کے اُوپر چاند چمکنے لگا، بہت دیر انتظار کرنے کے بعد بھی غلام مُلّا کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

ماں نے پھر آواز دی ———

"اے غلام، غلام مُلّا، غلام مُلّا گھر میں ہو کیا؟"

ماں کو غلام پر بھروسہ تھا، غلام کے آ جانے کے بعد اُسے کوئی فکر نہ ہوگی، جس طرح بھی ہوگا، وہ خبر ضرور دے آئے گا، رات ہو یا دن ہو، وقت بے وقت ایک غلام ہی اتنی ہمّت کا کام کر سکتا ہے، وہ ڈر یا خوف کچھ نہیں جانتا، لیکن یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے غلام ملّا کے گھر کی طرف سے کوئی تیزی میں چلا آ رہا ہے اور اس کے ہات میں کوئی چیز چمک رہی ہے، چاند کی روشنی میں دیپو کی ماں نے دیکھا کہ غلام ملّا ایک تیز کٹاری لیے ہوئے اسی کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے ——

ماں چیخ اُٹھی ——

"غلام، تم ہو غلام؟ کون تم؟"

ایک ثانیہ کی بات تھی، ایک ثانیہ کے لیے ہی بھگوان نے اس دن جان بچا دی تھی، شاید دیپو کے مستقبل ہی کی وجہ سے ماں کی جان بچ گئی، ورنہ مزارع غلام ملا روپیہ لے کر اپنی مالکہ کو قتل کرنے آئے گا، اس وقت ایسا کون سوچ سکتا تھا؟ اور اس وقت، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ صرف دیپو کی ماں کو ہی قتل کرتا، شاید وہ دیپو کو بھی ختم کر دیتا، روپیہ کا ایسا ہی کھیل ہے، روپے سے ہر آدمی قابو کیا جا سکتا ہے، روپیہ جیسی نشہ آور اور سرور انگیز کوئی دُوسری چیز تو نہیں؟

کہانی سُنتے سُنتے دینکر نے پھر پُوچھا۔

"اس کے بعد کیا ہوا ماں؟"

"اس کے بعد کیا ہوا، کیا مجھے اس کا ہوش ہے! دروازہ اندر سے بند کر کے بھگوان کو پُکارنے لگی! رات گزر گئی، صبح ہوئی، اس کے بعد امین آیا، گوپی پیادہ آیا اور اُس کے بعد ——"

کہتے کہتے ماں کی آواز بھرّا گئی۔

"لاش پہچاننا مشکل تھا، سارے جسم کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، تمھارے بابا کے ہات میں سونے کی چار انگوٹھیاں تھیں، انگوٹھیاں دیکھ کر ہی لوگوں نے شناخت کیا ——"

"لیکن دو دن اور دو رات گزارنا بھی دو بھر ہو گیا، پولیس اور پیادہ کے چلے جانے کے بعد پھر سلسلہ شروع ہو گیا، میں گھر کے اندر سے دروازہ بند کر کے پڑی رہتی اور بھگوان کو یاد کرتی رہتی، لیکن اس کے بعد بھی میرا خوف کم نہ ہوا، اب پورے گاؤں میں کسی پر بھی میں بھروسہ نہیں کر سکتی تھی، مجھے محسوس ہوتا جیسے گاؤں بھر کے لوگ روپیہ کھا کر تمھارے بڑے چچا کے طرفدار ہو گئے ہیں، روپیہ ایسی چیز ہی ہے دیپو بیٹے، جائداد ایسی ہی چیز ہے، اگر یہ زمین اور جائداد نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا، وہ آدمی بھی اس بیدردی سے قتل نہ کیا جاتا اور مجھے بھی اپنا ہات جلا کر دُوسروں کے گھر میں آ کر کھانا نہ پکانا پڑتا۔"

یہ بہت دنوں پہلے کی بات ہے، بہت دنوں پہلے اس نے یہ کہانی سُنی تھی، کہرن، پران منتھ بالہ، اگھور دادو،

چنونی، بنتی دیدی اور چھٹے پھوٹا کی کہانی دینکر کی روح میں تحلیل ہوگئی، اپنی پیدائش کے ساتھ جو بدنصیبی اس کی ساتھی بن گئی تھی، دینکر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے خواب ہمیشہ دیکھتا رہا، لیکن کرن کی طرح اس کا جذبۂ یقین مضبوط نہیں تھا، ایسا یقین کرتے ہوئے اسے خوف محسوس ہوتا تھا، دینکر واقعی بہت بزدل تھا، وہ کسی کو دکھ دینے سے بھی ڈرتا تھا اور کسی سے محبت کرنے میں بھی اسے خوف آتا تھا۔ وہ سوچتا کہ کسی چیز کو کھرچنے سے کیا فائدہ ہے، کسی چیز کے کریدنے سے کیا حاصل ہے، جو جیسا ہے ویسا ہی رہے، جو لوگ جیسے ہیں ویسے ہی رہیں، کسی کا بھی کوئی نقصان نہ ہو، کہیں بھی کوئی تبدیلی نہ ہو، اگھور داد اگر تخیل میں تو کیا ہوا، ان کے یقین کو دینکر کبھی دھچکا نہیں لگائے گا، ان کی توہین نہیں کرے گا، وہ بے یقینی کو بھی اتنی ہی اہمیت دے گا۔ لکھن سرکار اگر اسے چپت مارتا ہے اور چپت مار کر اگر اسے تسکین ملتی ہے، خوشی حاصل ہوتی ہے تو خوش ہولے، اس میں ایسا نقصان بھی کیا ہے! وہ ذرا سا برداشت ہی کرے گا، ذرا سا خاموشی سے سہہ لے گا، اس سے کالی گھاٹ کی رواں دواں زندگی کے معمول میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے، فرق نہ آئے تو پھر ٹھیک ہے۔ اگھور داد جس طرح ججمانوں کو ٹھگتے ہیں، جس طرح فریب دیتے ہیں، وہ اسی طرح فریب دیتے رہیں گے، مدھوسودن کی دہلیز پر دوفی کا کا جس طرح دوسروں کی غیبت کرتے ہیں، ان کی برائی کرتے ہیں، وہ اسی طرح دوسروں کی برائی کرتے رہیں گے، پر ان منتھ بابو اگر جیل جا کر دیش کی سیوا کرنا چاہتے ہیں تو کریں، کرن اگر یہ سمجھتا ہے کہ لائبریری قائم کر لینے سے سوراج آ جائے گا تو سمجھتا رہے۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ تو ہر حال ہو کر رہے گا، دینکر نے بارہا سوچ کر دیکھا تھا، کسی کی خواہش اور ناخواہش، پسند اور ناپسند کی پروا کیے بغیر یہ زمین گردش کرتی رہے گی، یہ زمین کسی کی پروا کر کے اپنے محور سے ذرا سا کھسک نہیں سکتی، وہ گھومتی ہی رہے گی، وہ جس طرح اپنے محور پر ہمیشہ چکر کاٹتی رہتی ہے، اسی طرح چکر کاٹتی رہے گی! امڑا کے پیڑ پر جو کوا بہت دنوں سے کھانے کی امید میں چپ سادھے بیٹھا رہتا ہے، وہ اسی طرح بیٹھا رہے گا، وہ جب تک زندہ رہے گا تب تک ایسا ہی کرے گا اور اس کے ساتھ ساتھ دینکر بھی دن بہ دن اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی جان توڑ کوشش کرتا رہے گا!

اسی طرح سب کچھ چل رہا تھا، دن گزر رہے تھے، لیکن یکایک لکھی دیدی کے آتے ہی وہ پھر امیدوں کے جھولے میں جھولنے لگا، اسے امیدوں کا سہارا لینے میں بڑی راحت سی ملنے لگی۔

لکھی دیدی کا خط چوری چھپے ایک آدمی کو دے آنے کے درمیان جیسے کہیں ایک رومان پوشیدہ تھا، لکھی دیدی کا رقص، لکھی دیدی کا لکھنا پڑھنا، لکھی دیدی کا پیار، ان میں کہیں پر ایک رومان چھپا ہوا تھا، دینکر کو محسوس ہوا جیسے لکھی دیدی نے اسے ایک نئی زندگی کا سراغ دے دیا ہے۔ اس کے اسکول جانے میں، کالج جانے میں، لکھنے پڑھنے میں، لکھی دیدی نے ایک نیا شوق، ایک جنون سا پیدا کر دیا تھا! اتنے دنوں تک جیسے اس کی زندگی کا یہ حصہ ہمیشہ تک

اور بے مزہ تھا، جیسے اس نے اپنی زندگی کے اس حصّہ کا لطف ہی نہیں اٹھایا تھا، ایک اجنبی اور بُرے آدمی کو خط دے آنے میں دینکر کا کیا مفاد پوشیدہ تھا کون جانے! لیکن اس کام میں بھی اس کے لیے جیسے بڑی کشش تھی۔ پانی میں بھیگ کر خط دے آنے میں دینکر کا کوئی مفاد تو ضرور تھا۔ ورنہ وہ اتنی سرگرمی کیوں دکھاتا تھا جیسے خط نہ دے آنے میں اس کا عظیم نقصان ہوتا ہو۔

اور اس کے بعد ایک دن ستی آگئی۔

لیکن کتنی دردناک تھی اس کی آمد، ستی جب اس کی زندگی میں آہی گئی تھی تو پھر اس نے پہلی ہی ملاقات میں اس کے دل پہ ایسی ضرب کیوں لگائی! یہ ضرب اتنی کاری پڑی تھی کہ کرن بہت دنوں تک بھلا نہ سکا تھا، اس نے کتنی ہی بار سوچا تھا کہ اب وہ لکھی دیدی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دے گا۔

کرن نے کتنی ہی بار اس سے پوچھا تھا۔

"کیا جی، تم نے ان لوگوں کو ممبر بنایا؟"

"کن کو؟"

"وہی، تمھارے مکان میں رہنے والے کرایہ دار کی لڑکیوں کو؟ جن کے ساتھ تمھاری گاڑھی چھنتی ہے؟"

دینکر کو کرن کی یہ بات اس دن اچھی نہ لگی تھی۔ کرن نے جس انداز میں اشارا کیا تھا وہ بہت بے ڈھنگا تھا۔

اس نے کہا تھا ——"ان کے ساتھ اب میرے تعلقات نہیں رہے ——"

کرن نے پوچھا تھا ——"یہ کیا، آخر ہوا کیا تھا؟"

دینکر نے کہا تھا ——"نہیں، وہ لوگ بڑے آدمی ہیں ——"

اصل میں ان کا قصور یہ نہیں تھا کہ وہ بڑے لوگ تھے، دینکر سوچتا، وہ تو ان لوگوں کے پاس اپنے کالج کی فیس یا کتاب خریدنے کے لیے روپیہ مانگنے نہیں جاتا ہے، وہ کبھی جائے گا بھی نہیں، وہ اپنے روپے میں مگن رہیں، جب تک پر ان تھ بابو ہیں، تب تک تو وہی دیتے رہیں گے، لیکن جو لوگ اسے ذلیل خیال کرتے ہیں ان کے ساتھ وہ کس طرح میل جول بڑھا سکتا ہے۔ وہ تو ہر لحاظ سے ادنیٰ ہے، ہر لحاظ سے۔ صرف مالی اعتبار ہی سے نہیں، اہلیت کے اعتبار سے بھی ادنیٰ ہے اور صرف اہلیت کے اعتبار سے بھی نہیں، دلی اور ذہنی اعتبار سے بھی ادنیٰ ہے۔ جو لوگ روپے کی قیمت سے، روپے کے پیمانے سے ہر چیز کو پرکھتے ہوں ان کے نزدیک دینکر کی کیا قیمت ہو سکتی ہے! وہ لوگ بھی تو اگھور دادو ہی کی ذات کے ہیں، دینکر پر وہ لوگ ترس کھاتے ہیں، دینکر غریب ہے اس لیے ہمدردی جتاتے ہیں، شاید وہ لوگ اسے انسان بھی نہیں سمجھتے، اگر وہ لوگ اسے انسان سمجھتے تو لکھی دیدی اس کے ہاتھ سے خط کیوں بھجواتی، لکھی دیدی اس کے اوپر محض اس لیے اعتماد کرتی ہے کہ دینکر

کے اندر دھوکہ دینے کی قوّت نہیں ہے۔

کرن نے کہا ——— "بڑے آدمی ہیں اسی لیے تو کہتا ہوں ——— بھوجودا نے کہا ہے بڑے لوگوں سے بہلا پھسلا کر روپیہ وصول کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے، تم ایک بار جاؤنا، دیکھو کیا کہتی ہے ———"

اور بہت سوچ بچار کے بعد آخر کار اس روز دینکر پھر چلا گیا، بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ کرن نے زبردستی اُسے بھیج دیا۔

ستی اس وقت گھر میں نہیں تھی، دینکر کو معلوم تھا کہ اس وقت ستی گھر میں نہیں رہتی، جمعرات کو وہ دیر سے گھر آتی تھی، لکھی دیدی کے کالج کی بس گلی میں داخل ہوتے ہی ہارن بجاتی تھی، دینکر تیار ہی تھا۔ لکھی دیدی جوں ہی گھر میں داخل ہوئی وہ بھی پیچھے ہو لیا۔

"لکھی دیدی" اُس نے آواز دی۔

آواز سن کر لکھی دیدی نے پلٹ کر دیکھا۔

"دینو؟ کیا ہے جی؟"

"تم سے ایک بات کرنی ہے لکھی دیدی۔"

"بات کرنی ہے تو اندر آؤنا!"

دینکر نے کہا ——— "تم سے اکیلے میں باتیں کروں گا، کسی کے سامنے کہنا نہیں چاہتا"

لکھی دیدی مسکرائی۔

بولی ——— "کیوں جی! بہت راز کی بات ہے شاید؟"

"نہیں، میں تمھاری بہن کے سامنے کہنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟ ستی نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تمھاری چھوٹی بہن مجھے دیکھ نہیں سکتی؟"

"تم نے کیسے سمجھا کہ وہ تمھیں دیکھنا نہیں چاہتی؟"

"کیا معلوم! تمھارے ساتھ زیادہ باتیں کرتا ہوں شاید اسی لیے، حالانکہ میں نے کسی روز بھی اس سے کوئی بات نہیں کی پھر بھی مجھے دیکھ کر وہ منہ بنا لیتی ہے، اسی لیے تو اب میں تمھارے یہاں پہلے کی طرح آنا جانا بھی نہیں، حالانکہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمھاری بہن بہت اچھی ہے۔"

"تو کیا میں ستی سے بھی زیادہ اچھی ہوں؟"

دینکر صرف مسکرا کر رہ گیا، وہ زبان سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اس کے بعد لکھی دیدی نے کہا ——— "آؤ، اندر آؤ، ستی ابھی گھر میں نہیں ہے، تم کیا کہنا چاہتے ہو سن لوں۔"

اس کے بعد پڑھنے کے کمرے میں جاکر لکھی دیدی نے کتابیں رکھ دیں اور کھڑکیاں کھول دیں اور دینکر سوچنے لگا کہ وہ لائبریری کا چندہ کس طرح مانگے، کرن نے اُسے ایک رسید بک بھی دے دی تھی، دی کالی گھاٹ بوائز لائبریری کی رسید اس کی جیب میں تھی جس پر ربر اسٹامپ لگا ہوا تھا، اُسے کچھ کہتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی، دو روپیہ چندہ طلب کرنے میں شرم سی محسوس ہو رہی تھی، دو روپیہ کیا آسان بات تھی، دو روپے نہ ہوں تو ایک روپیہ ہی سہی، کرن نے کہہ دیا تھا اگر ایک روپیہ بھی نہ دینا چاہیں تو پھر آٹھ آنے ہی سہی، آٹھ آنے بھی دینا چاہیں تو مت چھوڑنا، ہر روز دو کتابیں پڑھنے کو ملیں گی، اچھی طرح سمجھا کر کہہ سکو گے تو، یا ہونق کی طرح سُندر چہرہ دیکھ کر ہی سب کچھ بھول جاؤ گے؟

لکھی دیدی ایک ساڑی اور ایک سیمیج لے کر باہر چلی گئی۔

"تم بیٹھو، میں آتی ہوں۔"

کرن نے کہا تھا۔ "جس طرح بھی ہو ان کو ممبر بنانا ہی ہوگا، سمجھے، اگر تم سے نہ ہو سکے تو مجھے لے جاؤ گے اپنے ساتھ، میں ٹھیک ممبر بنالوں گا ان دونوں کو، سبھی ممبر تو میں نے ہی بنائے ہیں! راکھال، نرمل پالیت سبھوں کو تو میں نے ہی ممبر بنایا ہے، پھر تمھیں صدر بنانے سے مجھے کیا فائدہ ہوا؟"

لکھی دیدی نے کمرے میں آکر پوچھا۔

"چائے پیو گے؟"

"چائے؟"

دینکر نے لکھی دیدی کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ واقعی لکھی دیدی بہت حسین دکھائی دے رہی تھی، بدل کر ساڑی پہن لی تھی۔ آئینہ کے سامنے جاکر چہرے پر پوڈر مل لیا تھا اور اب جوڑا باندھ رہی تھی! دینکر نے اپنے آپ کو سنبھال لیا، اُسے کرن کی بات یاد آگئی۔ سندر چہرے کی طرف دیکھ کر سب کچھ بھول مت جانا۔ بڑے لوگوں سے بہلا پھسلا کر روپیہ وصول کرنا ہوگا، بھوجدا نے کرن سے کہا تھا۔

دینکر نے کہا —— "ہاں پیوں گا۔"

رگھو ایک پیالی چائے رکھ گیا تھا۔

لکھی دیدی نے اس طرف چہرہ گھما کر کہا —— "اور ایک پیالی لے آ رگھو، آج دیپو بھی چائے پیئے گا۔"

رگھو نے حیرت سے دیکھا۔

"دیپو بابو۔ تم چائے پیتے ہو؟"

دینکر نے کہا —— "پیتا تو نہیں، صرف آج پیوں گا۔"

لکھی دیدی بولی ——— "وہ میری بات پر چائے پی رہا ہے۔"
رگھو ایک پیالی چائے اور دے گیا۔
کرن نے کہا تھا، چائے کے معنی ہیں مزدوروں کا خون، مزدوروں کا خون ہے تو ہوا کرے۔ کرن سنے گا تو خفا ہوگا کہ دی کالی گھاٹ بوائز لائبریری کا صدر ہو کر اس نے کیوں چائے پی؟ لیکن اس روز ایک میز پر لکھی دیدی کے پاس بیٹھ کر چائے پینے میں کتنی راحت ملی تھی اُسے! اس کے بعد زندگی میں کتنی ہی بار اُسے اس پہلی بار چائے پینے کی بات یاد آئی تھی، چائے پینے کی وجہ سے نہیں ——— اس وجہ سے کہ لکھی دیدی نے کتنے پیار سے اُس دن اُسے چائے پلائی تھی، اُسے بار بار اس کی یاد آتی رہی تھی، لیکن اس کے بعد اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس نے چائے نہیں پی تھی، زہر پیا تھا، سقراط کی طرح "ہیم لوک" پیا تھا۔ لیکن سقراط کی طرح دینکر نے یہ تو نہیں کہا تھا ———

Be hopeful then. gentlemen of the jury, as to death; and this one thing hold fast, that to a good man, whether alive or dead, no evil can happen. nor are the gods indifferent to his well-being

یکایک لکھی دیدی نے پوچھا ———
"دینو، تمھیں چائے کیسی لگی؟"
"بہت اچھی لکھی دیدی" دینکر نے جواب دیا۔
"پھر؟ پھر کبھی تم چائے پیتے نہیں۔"
دینکر نے کہا ——— "تمھارے ساتھ بیٹھ کر پی رہا ہوں اسی لیے تو اتنی اچھی لگ رہی ہے، کسی دوسرے کے ساتھ پیتا تو شاید اتنی اچھی نہ لگتی ———"
لکھی دیدی ہو ہو کر کے ہنسنے لگی۔
بولی ——— "تم نے باتیں کرنا تو خوب سیکھ لیا ہے دیکھتی ہوں ———

when my Daisy Sits by me. I need no sugar in my tea.

کیا کہتے ہو؟"
ایک روز لکھی دیدی نے اُسے چاکلیٹ دیا تھا، یہ بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ اس روز دینکر وہ چاکلیٹ کھا نہ سکا تھا، اُس روز اُسے شبہ سا ہوا تھا، اس کے بعد اُس نے بہت دفعہ لکھی دیدی کو دیکھا تھا، بہت طرح سے بتا رہا تھا ——— اب اُسے شبہ نہیں ہوتا تھا، دینکر نے چائے کا آخری قطرہ تک اپنے

حلق میں اُنڈیل لیا تھا۔

اس نے کہا ——" تمھاری چھوٹی بہن ابھی تو نہیں آئے گی نا؟"

"کیوں جی؟ ستی سے تم اتنا ڈرتے کیوں ہو، بولو تو؟"

دینکر نے کہا ——" میں ڈرتا نہیں، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھے پسند نہیں کرتی ——"

"کیوں؟ اس نے تم سے کچھ کہا ہے؟"

دینکر نے کہا ——"بولی نہیں، لیکن میری طرف وہ اس طرح کیوں دیکھتی ہے؟ اس روز بیرسٹر پالت کے یہاں بھی اُسے دیکھ کر ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔"

لکھی دیدی یکایک سنجیدہ ہو گئی۔

بولی ——"سمجھ گئی، وہ میری وجہ سے ——"

"تمھاری وجہ سے؟ کیوں؟ تمھاری وجہ سے وہ مجھے کیوں ناپسند کرے گی؟"

دینکر نے لکھی دیدی کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ جیسے یکایک افسردہ سا ہو گیا، جیسے لکھی دیدی یکایک بے حد سنجیدہ دکھائی دینے لگی، وہ نگاہیں نیچی کر کے کچھ سوچنے لگی، دینکر اس کی طرف دیکھتا رہا، اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا، یکایک یہ کیا ہو گیا، کون سی بات ہو گئی جس کی وجہ سے لکھی دیدی اتنی افسردہ ہو گئی۔

دینکر نے پوچھا ——" تمھیں کیا ہو گیا لکھی دیدی ——؟"

"وہ تم نہیں سمجھو گے بھائی، بڑے ہو گے تو سمجھو گے ——"

دینکر نے کہا ——"تم بتاؤ نا، میں سمجھوں گا، میں تو اب بڑا ہو گیا ہوں۔"

"نہیں جی، تم یہ سب نہیں سمجھ سکتے ——"

اتنا کہہ کر لکھی دیدی نے دینکر کی آنکھوں میں دیکھا۔

"سمجھے، کسی نے بھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، میرے بابا بھی مجھے سمجھ نہ سکے، ستی بھی مجھے سمجھ نہ سکی، ماں اگر زندہ ہوتی تو شاید وہ سمجھ سکتی۔"

اتنا کہہ کر لکھی دیدی نے میز پر اپنی پیشانی ٹیک دی اور چہرہ چھپا لیا، اس کے بعد رہ رہ کر لکھی دیدی کا جسم پھول پھول اُٹھتا، دینکر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ لکھی دیدی رو رہی ہے کیا! دینکر بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ لکھی دیدی کا یہ رُوپ تو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا! لکھی دیدی نے اُسے پیٹا تھا، لکھی دیدی نے اُسے پیار کیا تھا، لکھی دیدی نے اُسے چاکلیٹ دیا تھا، لیکن لکھی دیدی آج تک اس کے سامنے کبھی روئی تو نہیں تھی۔

دینکر نے آواز دی ——"لکھی دیدی۔"

لکھی دیدی نے پھر بھی اپنا چہرہ اُوپر نہیں اُٹھایا، اس کا جسم اب بھی پھُول رہا تھا تو کیا لکھی دیدی بھی روتی ہے، اب تک دینکر یہی سمجھ رہا تھا کہ رونے کے لیے دُنیا میں شاید دُوسرے لوگ رہ گئے ہیں، ماں ہے، چنونی ہے، دینکر خود بھی ہے، لیکن لکھی دیدی تو دُوسری ذات کی انسان ہیں، اتنا روپیہ، اتنا گن رہتے ہوئے اس طرح رقص کرنے کے باوجود یہ لوگ روتے ہیں!

دینکر نے پھر آواز دی ——— "لکھی دیدی، پھر اب میں جاتا ہوُں ———"

اب کے لکھی دیدی نے اپنا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور جلدی سے آنچل سے اپنی آنکھیں صاف کر لیں اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن پھر بھی اس کے افسردہ چہرے پر وہ مسکراہٹ بالکل پھیکی معلوم ہوئی۔

بولی ——— "خیر، تم کچھ خیال مت کرنا بھائی، میں نے جو کچھ کہا ہے اُسے بھُول جاؤ ———"

لکھی دیدی یہ کیا کہہ رہی ہے، دینکر بھُول جائے، وہ اپنی زندگی میں ہونے والے اتنے بڑے واقعہ کو بھُول جائے! پھر وہ دینکر بن کر کیوں پیدا ہوا ہے۔ بچپن سے اُس نے اتنی تکلیفیں کیوں جھیلی ہیں۔ پیدا ہونے کے بعد ہی اس کی ماں کیوں بیوہ ہو گئی ہے اور بیوہ ہو کر ایشور گنگولی لین میں اگھور دادو کے مکان میں اُسے کیوں پناہ لینا پڑی ہے، انسان اور قدرت کے نزدیک وہ اتنا احسان مند کیوں ہے، صبح کی دھوپ، دوپہر میں چیلوں کی پکار، امڑا کے پیڑ پر کوّے کا منڈرانا، حاجی قاسم کا ٹوٹا ہوا باغ، آگن کھاری کا تالاب اور تالاب کے اس طرف دھان کا کھیت اُسے کیوں اچھا لگتا ہے، اتنے دنوں تک یہ سب کچھ اُسے اتنا پُرکشش کیوں معلوم ہوتا رہا ہے، شاید دینکر کے ایشور کی مرضی نہیں تھی، اسی لیے وہ انسانوں سے اتنی چوٹیں کھاتا رہا ہے اور شاید اسی لیے انسانوں سے اُسے اتنی محبّت بھی ملی ہے، چوٹیں اور محبّت، نفرت اور پیار، بے عزتی اور عزت، انھیں سبھوں کے درمیان تو وہ دینکر بن سکا ہے۔ کون جانے اس کا یہ نام کس نے رکھا تھا! نام رکھنے والے نے اس کے نام کے ساتھ کیا اس کے ان خصائل کو بھی دیکھ لیا تھا ———

ایک بار بڑے ہونے کے بعد اُس نے ماں سے پُوچھا تھا۔

"میرا نام کس نے رکھا تھا ماں؟"

ماں نے جواب دیا تھا ——— "اور کون رکھے گا، میں نے رکھا ہے!"

"مگر اتنے نام رہتے ہوئے تم نے میرا نام دینکر کیوں رکھا؟"

ماں نے کہا تھا ——— "بنیٹرہ کے چھوٹے محل کے ملک بابوؤں کے یہاں نواسہ پیدا ہوا تھا، انھوں نے اس کا نام دینکر رکھا تھا۔ اس کے معنی تو مجھے نہیں معلوم، لیکن جب تم پیدا ہوئے تو میں نے تمھارا نام بھی دینکر رکھ دیا ———"

اس کے نام کی مختصر سی تاریخ تھی، لیکن اس دن، یہ نام رکھتے وقت ماں نے شاید سوچا بھی نہ ہو گا کہ اس کا دینکر زندگی بھر اپنے نام کی تفسیر بن کر رہے گا، وہ صرف روشنی جلاتا رہے گا، اپنے اندھیرے کو دور کرنے کے لئے اس کا کوئی روشنی جلانے والا نہ رہے گا۔

اس روز وہ لکھی دیدی کے یہاں سے چلا آ رہا تھا، لیکن یکایک لکھی دیدی نے اُسے پکارا۔

"سُنو ——"

"کیا ہے؟" دینکر نے پُوچھا ——

"کسی سے مت کہنا، سمجھے؟ میں تم سے پیار کرتی ہوں اس لیے سب کچھ کہہ گئی ہوں، سنتی کو معلوم نہ ہونے پائے۔"

"لیکن تم نے تو مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا ہے لکھی دیدی!"

لکھی دیدی نے کہا —— "تم سے سب کچھ کہہ دیتی تو اچھا ہوتا، شاید اس طرح مجھے سکون مل جاتا، سمجھے، تم نہ رہتے تو میں یہاں اس طرح زندہ نہ رہ سکتی ——"

"لیکن تمھیں تکلیف کیا ہے لکھی دیدی؟"

یکایک لکھی دیدی سیدھی ہو کر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

بولی —— "تم نے شمبھو کو دیکھا ہے۔"

"شمبھو؟ شمبھو کون ہے لکھی دیدی؟"

"وُہی تو ہے، جس سے تمھاری مُلاقات خضر پور میں ہوئی تھی، شمبھو ہی نے تو مجھے بتایا تھا۔"

"مسٹر داتار؟"

"ہاں، جس کو تم میرا خط دے کر آتے ہو، جانتے ہو، میرے لیے وہ سب کچھ کر سکتا ہے، میں اگر زہر کھانے کو کہوں تو وہ زہر تک کھا سکتا ہے، میرے لیے اُس نے کیا نہیں کیا ہے! اپنی دُنیا، اپنے عزیز و اقارب دوست احباب، اپنے کاروبار، سب کو چھوڑ دیا ہے! میں کلکتہ آ گئی ہوں تو وہ بھی برما سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کلکتہ چلا آیا ہے —— حالانکہ ——"

"حالانکہ؟"

لکھی دیدی نے کہا —— "حالانکہ میرے پاس کیا ہے، بولو! اس کا وہاں پر کتنا بڑا کاروبار ہے، کتنی شہرت ہے، نام ہے، میرے لیے اُس نے سب کچھ چھوڑ دیا اور میں؟ میں اس کے مقابلے میں کیا ہوں؟ اس کے مقابلے میں میری کیا حیثیت ہے؟ میں اس کے لیے کیا کر سکی ہوں؟ اُسے ایک دن میری خبر نہیں ملتی ہے تو وہ روتا ہے، جانتے ہو، رات کو اُسے نیند نہیں آتی ——"

"لیکن ۔۔۔۔"

کچھ کہتے کہتے دینکر کچھ نہ کہہ سکا، اُسے جھجک سی محسوس ہوئی، لکھی دیدی کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو تھے۔

لکھی دیدی پھر کہنے لگی ——

"کتنے لوگوں نے اُسے کتنا سمجھایا بجھایا، بولے تم ایک ذات کے ہو اور لکھی دُوسری ذات کی ہے، تم دونوں کا میل نہیں ہوتا، ہو ہی نہیں سکتا! میں بھی اُسے کتنا سمجھاتی ہوں، کتنا کہتی ہوں، لیکن کسی طرح بھی وُہ مجھے بھلانے پر تیار نہیں، اب وہ وہاں سے بھاگ کر یہاں چلا آیا ہے، جوں ہی بابا کو پتہ چلا تھا، اُنھوں نے مجھے پوشیدہ طور پر کلکتہ بھیج دیا تھا، اب وہ بھی بھاگ کر یہاں آ گیا ہے ——"

دینکر کیا جواب دے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ لکھی دیدی کی طرف دیکھتے ہوئے احمقوں کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

اس کے بعد اُس نے پوچھا ——

"تو پھر اب کیا ہو گا؟"

لکھی دیدی نے کہا —— "میں بھی تو اس سے یہی کہتی ہوں کہ اب کیا ہو گا؟ اور اب میری بھی یہ حالت ہے کہ اُسے دیکھے بغیر میں رہ ہی نہیں سکتی، ایک دن بھی اُس کی خبر معلوم نہیں ہوتی تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ——"

دینکر نے کہا —— "لیکن اگر یہ سب کاکا بابو کو معلوم ہو گیا؟"

لکھی دیدی نے کہا —— "کاکا بابو کو یہ سب معلوم ہو گیا ہے ——"

"معلوم ہو گیا ہے؟ اور کاکی ماں؟"

"سبھوں کو معلوم ہو گیا ہے، سنتی کو بھی معلوم ہے، میرے بابا کو بھی معلوم ہے اسی لیے تو کاکا بابو کے ساتھ اُنھوں نے مجھے کلکتہ بھیج دیا تھا، سوچا تھا کہ دُور چلے جانے کے بعد شاید میں اُسے بھول جاؤں گی، اسی لیے تو کلکتہ میں اتنی ساری جگہ ہوتے ہوئے بھی کالی گھاٹ کی اس گلی کے اندر کرایہ کا مکان لیا گیا ہے۔"

دینکر ساری باتیں سُن کر اچنبھے میں پڑ گیا، اس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا، جیسے لکھی دیدی کا ایک اور رُوپ یکایک اس کے سامنے آ گیا۔

لکھی دیدی نے کہا —— "یہی دیکھو نا، کل کالج کے سامنے ملاقات کرنے کی بات تھی، لیکن کالج میں سویرے چھٹی ہو گئی اور میں بس میں بیٹھ کر گھر چلی آئی، اس سے کوئی بات نہ ہو سکی، ساری رات میں ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکی اور میں جانتی ہوں اُسے بھی نیند نہیں آئی ہو گی ——"

دینکر نے کہا —— "تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ رات میں انھیں نیند نہیں آئی ہو گی؟"

لکھی دیدی نے کہا ——— "وہ تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گا، معلوم ہو جاتا ہے۔"

دینکر نے تھوڑی دیر کچھ سوچا، پھر بولا ———

"لیکن کیا تم سمجھتی ہو لکھی دیدی کہ جو کچھ تم کر رہی ہو وہ اچھا کام ہے!"

لکھی دیدی نے کہا ——— "یہ اچھا کام ہے، یہ تو میں نے نہیں کہا؟ میں جانتی ہوں یہ بُرا ہو رہا ہے، اسی لیے تو چوری چھپے اُسے خط بھیجتی ہوں، چھُپ چھُپ کر اس سے ملتی ہوں ———"

دینکر نے کہا ——— "تو پھر تم اُسے خط مت لکھو ——— خواہ مخواہ سبھوں کے دل کو صدمہ پہنچا کر کیا ہو گا' سُننے سے تمھارے بابا کو بھی صدمہ ہو گا، کاکا بابو اور کاکی ماں کو بھی صدمہ ہو گا! تمھارے دل کو بھی سُکھ نہیں ملے گا، دیکھ لو گی اور تمھارا دُکھ دیکھ کر مجھے بھی دُکھ ہو گا۔"

لکھی دیدی افسردہ ہو گئی۔

"نہیں جی، خط نہ لکھنے اور مُلاقات نہ کرنے سے تو میں ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

لکھی دیدی کی بات سُن کر دینکر کو بڑا تعجب ہوا اور ہزار کوشش کے باوجود وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ آخر یہ کیا چیز ہے۔

اس نے کہا ——— "اتنے دنوں سے تمھاری مُلاقات بابا سے بھی تو نہیں ہوئی کیا اس کے لیے تمھارا دل نہیں دُکھتا؟"

لکھی دیدی نے کہا ——— "دُور، تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔ بابا کے ساتھ مُلاقات نہیں ہوئی تو دُکھ کیوں ہو گا؟"

دینکر نے کہا ——— "لیکن مجھے تو اپنی ماں کے لیے بڑی پریشانی رہتی ہے، سچ مچ، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک دن ماں کو نہ دیکھ پاؤں تو شاید میرا دم نکل جائے ———"

لکھی دیدی نے کہا ——— "وہ اور قسم کی پریشانی ہے اور یہ اور قسم کی، اس پریشانی کے ساتھ مسرّت ہے، یہ مسرّت ملی ہوئی پریشانی ہے۔"

مسرّت ملی ہوئی پریشانی ہے! دینکر کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ یہ بات اُسے بڑی عجیب سی لگی۔

لکھی دیدی نے کہا ——— "خیر، اب تم جاؤ دیبو، شاید اب ستی آنے ہی والی ہے۔"

دینکر نے جانے کے لیے اپنا چہرہ گھمایا ہی تھا کہ لکھی دیدی نے کہا ———

"آج میں نے تمھیں بہت سی باتیں بتا دی ہیں، کسی سے اِن کا ذکر مت کرنا، ورنہ میں برباد ہو جاؤں گی، نہیں کہو گے نا؟"

دینکر نے جیسے لکھی دیدی کی بات سُنی ہی نہیں۔

اُس نے پُوچھا ——— " اچھا، لکھی دیدی! تم لوگ اپنے خط میں اتنی ساری کون سی باتیں لکھتی ہو؟"

لکھی دیدی نے پُوچھا ——— "کیوں، تم پڑھتے تو نہیں ؟"

" نہیں، میں کیوں پڑھوں گا ؟"

" نہیں، خبر دار، مت پڑھنا، تمھارے اُوپر مجھے اعتماد ہے اسی لیے تو میں تمھارے ہاتھ سے خط بھجواتی ہوں، تمھارے سوا اس مکان میں کسی پر بھی میں اعتماد نہیں کر سکتی، کسی سے کہو گے تو نہیں ؟"

دیپنکر کے کانوں میں ایک بات بھی نہیں گئی۔

یکایک اُس نے پُوچھا ——— " اچھا لکھی دیدی، جب تم دونوں کی مُلاقات ہوتی ہے تو تم دونوں میں کیا باتیں ہوتی ہیں ؟"

لکھی دیدی نے کہا ——— " او ماں، میں نے جو کچھ کہا وہ کیا تم نے سُنا نہیں، اور اور باتیں پوچھ رہے ہو ———"

دیپنکر نے کہا ——— " نہیں، نہیں کہوں گا، کسی سے نہیں کہوں گا۔"

" ہاں، مت کہنا، کہنے کی بات نہیں ہے۔"

دیپنکر اُٹھ کر چلا آ رہا تھا کہ یکایک لکھی دیدی نے پُوچھا۔

" ہاں، تم تو مجھ سے کچھ پُوچھنے آئے تھے ؟ کوئی راز کی بات مجھ سے تنہائی میں کرنا چاہتے تھے ؟"

واقعی تو! کوئی بات وہ کہنے کے لیے ہی تو آیا تھا! کوئی ضروری بات تھی، مگر اُسے تو کچھ بھی یاد نہیں رہا، کون سی بات کہنے آیا تھا، کون سی بات تھی، جو سبھوں کے سامنے کہنے کی نہیں تھی؟

لکھی دیدی نے کہا ——— "سُنا ہے کہ شمبھو سے مُلاقات ہوئی تھی تمھاری ——— مگر تم خضر پور کیا کرنے گئے تھے ؟"

دیپنکر نے کہا ——— " کرن وہاں ہر روز جینو بیچنے جاتا ہے، کرن کو تم نہیں پہچانو گی، میرا دوست ہے، لیکن اس روز مسٹر داتار نے ہم دونوں کو بہت سی چیزیں کھلائی تھیں لکھی دیدی، پیٹ بھر کر کھلا دیا تھا ہم دونوں کو سندیش، رس گلا، راج بھوگ ———"

لکھی دیدی نے کہا ——— " وہ ایسا ہی ہے، مجھے بھی کھلاتا رہتا ہے، مجھ سے تمھاری اچھی جان پہچان ہے نا، اسی لیے اس نے تمھیں بھی کھلایا ہے ———"

" وہ میں بھی سمجھتا ہوں، مجھے خط لے جاتے ہوئے تو اُنھوں نے دیکھا تھا، دھوپ ہو یا بارش، سو کر اُٹھتے ہی خط لے کر جاتا تھا، اسی لیے کھلایا اور کیا ——— مسٹر داتار بہت اچھے آدمی ہیں، جانتی ہو لکھی دیدی، اُنھوں نے بہت دیر تک باتیں کیں، بولے غریب ہونا کوئی جرم نہیں، خوف کھانے کی ایسی کوئی بات نہیں، مسٹر داتار بھی کبھی

بے حد غریب تھے ———"

نکھی دیدی نے کہا ——— "تم نے اُسے کیا دیکھا ہے، میں جانتی ہوں وہ کتنا نیک ہے ———"

"لیکن اُسے اس مکان میں آنے کے لیے کیوں نہیں کہتیں؟ چھپ چھپ کر ملتی ہو اسی لیے سبھی ناپسند کرتے ہیں ———"

"یہ نہیں ہو سکتا، اُس نے بہت کوشش کی ہے، میرے بابا کو تم نہیں جانتے ———"

بولتے بولتے یکایک نکھی دیدی رُک گئی اور باہر کی طرف نگاہ اُٹھا کر کچھ دیکھا۔

دینکر نے کہا ——— "تم رُک کیوں گئیں، بولو نا۔"

نکھی دیدی بولی ——— "معلوم ہوتا ہے ستی آگئی ہے۔"

نکھی دیدی اُٹھ کر باہر چلی گئی، وہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ ستی واقعی آگئی ہے یا نہیں، تھوڑی دیر بعد واپس آکر پھر کُرسی پر بیٹھ گئی۔

"نہیں، ابھی نہیں آئی ———"

دینکر نے پُوچھا ——— "تم بھی شاید ستی سے ڈرتی ہو نکھی دیدی ———"

"ڈروں گی کیوں، لیکن اُسے سب کچھ معلوم ہے نا، اسی لیے تو بابا نے اُسے یہاں بھیج دیا ہے ———"

"پھر اب میں تمھارے یہاں نہیں آؤں گا نکھی دیدی، ورنہ وہ مجھ پر شک کرے گی۔"

"نہیں تم پر شک نہیں کرے گی، تم اس کے ساتھ دوستی پیدا کر لو، پھر وہ تم پر شک نہیں کرے گی۔"

"لیکن اگر اُسے معلوم ہو گیا کہ میں تمھارا خط پہنچانے والا پیغام بر ہوں؟"

"کیسے معلوم ہوگا؟ تم نہیں کہو گے تو ستی کو کیسے معلوم ہوگا؟"

"اگر وہ مجھ سے دریافت کرے تب؟"

"تم کہنا، تم کچھ نہیں جانتے؟"

"تو کیا مجھے جھوٹ بولنا ہوگا!"

نکھی دیدی نے کہا ——— "بولو گے! جھوٹ بولو گے! میرے لیے تم جھوٹ بھی نہیں بول سکتے؟"

دینکر نے کہا ——— "لیکن جھوٹ بولنا کیا مناسب ہے، تم ہی بتاؤ۔"

نکھی دیدی نے کہا ——— "تو کیا یہی تمھاری محبت ہے؟ یہی تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟ دیکھو تو مسٹر داتار نے میرے لیے سب کچھ تج دیا ہے ———"

"لیکن میں نے تو عہد کیا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا!"

"جھوٹ بولنے میں ہرج ہی کیا ہے؟ کسی کو معلوم تو نہیں ہوگا!"

"لیکن چودہ سال تک جھوٹ نہ بولنے سے کتنا بڑا فائدہ ہے، جو کہوں گا وہ سچ ہو جائے گا ——"

لکھی دیدی نے کہا ——— "سب فضول باتیں ہیں! بچپن میں تمھارے اسکول ماسٹر نے تمھیں غلط بتایا ہے اب تم بڑے ہو گئے ہو، اب سب کچھ بھول جاؤ، ایک دن تمھیں بھی تو دنیاداری کرنی ہوگی، کتنے ہی لوگوں کے ساتھ ملنا ہوگا، کتنے قسم کے لوگ کتنی قسم کی باتیں کریں گے، جھوٹ بولے بغیر تم زندہ نہ رہ سکو گے۔"

اس کے بعد اس واقعہ کی یاد اُسے جب بھی آئی تھی، اُس نے محسوس کیا تھا کہ اس روز لکھی دیدی نے بڑے پیار سے زندگی میں پہلی بار چائے پلائی تھی، لیکن وہ چائے نہیں تھی، زہر تھا، سقراط کا "ہیملوک" نہیں، اصلی زہر تھا، اس نے شاید پہلی بار لکھی دیدی ہی سے محبت کی تھی، اور اس نے محبت کی تھی اسی لیے اس طرح زہر پی لیا تھا! وہ کتنی زبردست آزمائش تھی! ایک طرف اس کا عہد تھا اور دوسری طرف لکھی دیدی تھی!

لکھی دیدی نے کہا ——— "تم اگر سب کچھ کہہ دو گے تو میں تباہ و برباد ہو جاؤں گی دیپو ——"

"تم مجھے جھوٹ بولنے پر آمادہ نہ کرو لکھی دیدی۔ میں تمھارے پاؤں پڑتا ہوں!"

"تو گویا تمھارا عہد ہی بڑا ہے؟ میں کچھ بھی نہیں۔ میں تمھاری کوئی نہیں ہوں؟"

"تم اس طرح نہ کہو لکھی دیدی، مجھے دکھ ہوتا ہے!"

"تو کیا اگر میں مر جاؤں تو تمھیں خوشی ہوگی؟"

"چھی چھی، ایسی بات نہیں کرتے، تم کیا ہو لکھی دیدی! تمھارے منہ میں کوئی لگام ہی نہیں!"

لکھی دیدی کرسی سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ اس کے قریب آ گئی، لکھی دیدی کو اپنے قریب آتے دیکھ کر دیپنکر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لکھی دیدی نے دیپنکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ——— "تم اگر کہہ دو گے دیپو، تو میرے لیے مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

دیپنکر نے کہا ——— "پھر تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں!"

لکھی دیدی نے اس کا ہات اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں، بات کہنے کی نہیں؟"

دیپنکر نے سر ہلایا۔

"سمجھتا ہوں!"

"تو پھر؟"

دیپنکر کی نظریں جھک گئیں، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے لکھی دیدی اس کے اور بھی قریب سرک آئی ہو۔ اور اس کے جسم سے سٹ کر کھڑی ہو گئی ہے، اس کے بعد اُس نے پہلے کی طرح اس کے سر پر ہات رکھ دیا اور اپنے ہات سے اس کے بالوں کو سنوارنے لگی۔

"تم نہیں جانتے دیپو، میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں ـــــ"

اس کے بعد قدرے رُک کر بولی ـــــ

"یہ کیا تم رو رہے ہو؟"

شاید دیپنکر کی دونوں آنکھیں بھر آئی تھیں لیکن لکھی دیدی کی بات سُن کر ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور آنسوؤں سے اس کے دونوں گال تر ہو گئے۔

لکھی دیدی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"روتے نہیں، چھی، میری مرنے کی بات سُن کر تم رونے لگے؟ میں نے اگر کہہ دیا کہ مر جاؤں گی تو کیا سچ مچ مر جاؤں گی؟ مت روؤ، میں تو دیکھتی ہوں تم بھی میری ہی طرح جذباتی ہو، اتنا جذباتی ہونا کیا اچھا ہے؟"

اس کے بعد دونوں ہات دیپنکر کے سینے پر رکھ کر اُسے تسلی دینے لگی۔

"تمھیں اپنی زندگی میں ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی ہے، تمھاری تو ساری عمر پڑی ہوئی ہے۔ کتنا سیکھو گے، کتنا فریب کھاؤ گے، بہت کچھ سیکھو گے! ابھی تو تمھیں بہت کچھ دیکھنا اور سیکھنا باقی ہے، ابھی سے ہمت ہار دینے سے کیسے کام چلے گا، مت روؤ ـــــ"

لکھی دیدی نے اپنے آنچل سے اُس کے آنسو پونچھ دیے۔

"میری جان مت رو، میں تم پر اعتماد کرتی ہوں اسی لیے تمھارے ہات سے خط بھجواتی ہوں، دل کا حال کہہ سنایا تم سے کہنے میں مجھے کوئی شرم نہیں، چپ ہو جاؤ، مت روؤ میرے جان عزیز، میرے بھائی ـــــ"

اس کے بعد آنچل سے اس کا چہرہ صاف کرنے لگی۔

"تم نہیں جانتے، میں نے اپنی زندگی میں کتنا دُکھ اُٹھایا ہے، ماں بھی زندہ نہیں کہ اُس سے دل کی بات کہہ سکوں، بچپن ہی سے تنہائیوں کی گود میں میری پرورش ہوئی ہے۔ بابا رہ کر بھی نہیں کے برابر ہیں، بابا تمام دن اپنے کاروبار میں مست ہیں۔ صرف ایک اسی کو پایا تھا ـــــ لیکن اسے بھی سبھی مل کر مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں! جانتے ہو میں نے کتنی ہی بار خودکشی کرنی چاہی ہے، مرنے میں واقعی مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی، لیکن اس کے بارے میں سوچ کر تو میں مر بھی نہیں سکتی، اُسے بے حد صدمہ ہوگا، پھر وہ زندہ نہ رہ سکے گا ـــــ"

اتنی دیر میں دیپنکر قدرے پُرسکون ہو گیا تھا۔

لکھی دیدی نے کہا ـــــ "کیوں، میری بات مانو گے؟ کسی سے کہو گے تو نہیں؟"

"نہیں۔" دیپنکر نے جواب دیا۔

"یہ ہوئی اچھے لڑکوں جیسی بات۔"

اتنا کہہ کر لکھی دیدی اُس کے گالوں کو سہلانے لگی۔

بولی ——— "ستی بھی پوچھے تو جھوٹ بول گئے نا؟"

"ہاں" دینکر نے جواب دیا۔

دینکر دھیرے دھیرے چلا آ رہا تھا، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے نشہ سا آ گیا ہو، درگا پوجا میں بھنگ ملی ہوئی مٹھائی کھا کر جو سرور انگیز کیفیت ہوتی ہے ٹھیک ویسا ہی سرور آ گیا ہو، اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے قدم بہک رہے ہوں، ایسا کیوں ہوا، اُسے تو کچھ بھی نہیں ہوا! اس نے تو کچھ بھی نہیں کھایا، صرف ایک پیالی چائے پی ہے، چائے میں کچھ ملا ہوا تو نہیں تھا! کوئی نشہ آور شے تو نہیں تھی! چائے پینے سے شاید آدمی اسی طرح لڑکھڑانے لگتا ہے۔!

لکھی دیدی نے اُسے پیار سے زہر دے دیا تھا، ہیملوک نہیں، سچ مچ کا زہر، پران منتھ بابو نے اُسے کلاس میں جو کچھ سکھایا تھا، وہ بھول چکا تھا، اب ایک لمحہ کے لیے وہ بات اُسے یاد نہیں آئے گی۔

لکھی دیدی نے قریب آکر اُسے شانوں سے تھام لیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا؟"

لکھی دیدی کے جھنجھوڑنے پر اُسے ہوش آ گیا۔

"لکھی دیدی"

"بولو نا، کیا کہنا چاہتے ہو، بولو؟"

"اچھا، کاکا بابو کیا کام کرتے ہیں؟"

"کاکا بابو؟ کیوں؟ یکایک تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"سبھی مجھ سے دریافت کرتے ہیں!" دینکر نے کہا ——— "دونی کاکا، چھونے دا، پنچا دا، مدھو سودن کے بڑے بھیا، محلے کے سبھی لوگ تو مجھ سے پوچھتے ہیں۔"

"شاید یہی دریافت کرنے کے لیے تم یہاں آئے تھے؟"

دینکر کو اس وقت کچھ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ لکھی دیدی کے پاس کیوں آیا تھا، اُس نے جلدی سے کہا ———

"ہاں، میں یہی دریافت کرنے آیا تھا ———"

"تو یہ تو تم کاکا بابو سے بھی دریافت کر سکتے ہو!"

ہاں، ٹھیک تو ہے! وہ کاکا بابو سے بھی تو دریافت کر سکتا ہے، تعجب ہے، وہ اتنی معمولی سی بات دریافت کرنے آیا تھا، اتنی معمولی سی بات کے لیے اُسے لکھی دیدی کے گھر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اصل میں کس کام سے آیا تھا، اُسے یاد ہی نہیں تھا، شاید اُسے لکھی دیدی کے پاس آنے میں راحت ملتی ہے، دراصل وہ ستی کو نظر انداز کر کے لکھی دیدی ہی سے محبت کرتا تھا شاید۔

باہر نکلتے ہی اس نے دیکھا، ایشور گنگولی لیمن میں کافی دن چڑھ آیا تھا۔ دال پوری اور گھگھنی والا ہاٹ میں ایک بڑا سا جھولا لٹکائے ہوئے ہانک لگاتے ہوئے چلا گیا، باہر سیڑھی پہ کھڑے ہو کر دینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے خود کو اتنے دنوں کے بعد آج دریافت کر لیا تھا، اتنے دنوں کے بعد آج اس نے خود کو پہچان لیا تھا، لکھی دیدی نے جیسے اسے اپنی شناخت کرا دی تھی اور اسے اپنے کالج کے پروفیسر کی بات یاد آ گئی، Life of Socrates یاد آ گئی۔

Be hopeful then, gentlemen of the jury, as to death; and this one thing hold fast, that to a good man, whether alive or dead, no evil can happen, nor are the gods indifferent to his well-being

دینکر نے سچ مچ اس دن چائے نہیں پی تھی، زہر پیا تھا!

(باقی باقی)

بات چیت

فراق گورکھپوری / سُمت پرکاش شوقؔ

اُردو کے نقاد شاعر حضرت فراقؔ گورکھپوری حال ہی الٰہ آباد سے ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لیے دلّی تشریف لائے تھے۔ دلّی میں تین چار روز قیام کے دوران مجھے بھی ان سے مُلاقات کرنے کا موقع ملا۔ ذیل میں حاصل مُلاقات درج کر رہا ہوُں۔

شوقؔ

شوقؔ : فراقؔ صاحب! زندگی کی قدریں دائمی ہوتی ہیں یا بدلتی رہتی ہیں۔ آج کی مُلاقات میں اس بارے میں کچھ فرمائیے گا؟

فراقؔ صاحب : اس سوال میں قابلِ توجہ لفظ دائمی ہے۔ اگر دائمی سے زمانی دائمیت یا ہمیشگی مُراد لی جائے تو آفتاب، نظامِ شمسی، کائنات، کوئی چیز بھی دائمی نہیں مانی جاتی۔ صرف مادّے کو کہا جاتا ہے کہ اُسے دوام حاصل ہے لیکن مادہ سے بنی ہوئی کسی چیز کو دوام حاصل نہیں۔ یُوں تو ڈاکٹر اقبال نے بھی کہا ہے ؎

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

تو اس سوال کو ہم یوں کیوں نہ پیش کریں کہ زندگی کی قدریں بے بدلے جوُں کی توُں صدہا بلکہ ہزار ہا برس تک قائم رہتی ہیں یا عہد بہ عہد بدلتی رہتی ہیں؟ عہد بہ عہد سے مُراد سماج کے نشوونما کی منزلیں یا تاریخی عہد وادوار لیے جائیں۔ اس سلسلہ میں میرا ہی نہیں دُنیا بھر کی مہذّب قوموں کا یہ عقیدہ ہے کہ چند بُنیادی اور مرکزی قدریں اُس وقت تک نہیں مٹ سکتیں جب تک تہذیب و تمدّن دُنیا میں قائم ہے مثلاً دُوسروں کے ساتھ ہمدردی اور مساوات کے جذبات، کائنات سے محبّت اور ہم آہنگی کے جذبات، مرد اور عورت کے درمیان لطیف اور پاکیزہ محبت کے جذبات، بچّوں سے والہانہ محبّت اور پیار کے رُجحانات وجذبات پر جو اقدار قائم ہیں علم وحقیقت کی تلاش سے متعلق جو اقدار پیدا ہو چکی ہیں بہت سے امورِ حُسن وقبح سے متعلق احساسات فطرت اور رنگ و بو کی دُنیا سے دھرتی سے وحش وطیور سے انسان کی محبت وہم آہنگی اور بُنیادی طور پر یکسانیت کے جذبات، ان تمام امور سے متعلق جو اقدار ہیں وہ تو اُس وقت تک قائم رہیں گی اور انھیں قائم رہنا چاہیے جب تک دُنیا اور انسانی تہذیب و تمدّن قائم ہے۔

البتّہ نظامِ انسانی میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی۔ اس امر میں بھی غالباً اب سے چند صدیوں کے بعد

انسانی تمدن اور نظام اس منزل پہ پہنچ جائیں گے جس کے بعد کوئی نمایاں تبدیلی انسانی نظام میں سوچی نہیں جا سکتی۔

شوق : تو کیا انسان کی بدلتی ہوئی تاریخ ایک منزل پر آکر ٹھہر جائے گی اور اس کے بعد جب تک دُنیا مٹ نہ جائے انسانی سماج ایک ہی عالم میں پڑا رہے گا؟

فراق صاحب : خارجی طور پر میں نظامِ زندگی کے ہمیشہ بدلتے رہنے کا قائل نہیں البتہ داخلی طور پر ارتقاء اور تبدیلی کا عمل اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک دُنیا قائم ہے۔ ایک مثال سے اپنا مفہوم واضح کر دوں۔ میری یا آپ کی مادّی اور خارجی زندگی سنِ بلوغ سے ہماری موتوں تک بالکل یکساں رہ سکتی ہے لیکن ہمارے خیالات، محسوسات، تجربات، ہمارا وجدان، ہم پر گزرنے والی کیفیتیں، مطالعہ و مشاہدہ، غور و فکر کے نتیجہ کے طور پر ہماری داخلی دُنیا بدلتی رہتی ہے۔ انھیں ہم شاید اقدار کا بدلنا نہیں کہہ سکتے بلکہ مسلمہ اقدار کے زیر اثر ہم اپنے انفرادی نشو و نما سے اس تبدیلی کو تعبیر کر سکتے ہیں۔

شوق : ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ میں تبدیلیوں کے آپ قائل ہیں یا نہیں ؟

فراق صاحب : تخلیقی عمل کے ارتقا کا تو میں قائل ہوں مگر اس ارتقا کو میں تبدیلی اقدار ہرگز نہیں کہوں گا۔ اگر میں نے چالیس اور پچاس سال کی عمر کے درمیان کچھ شعری یا ادبی کارناموں کو پیش کیا اور پچاس سال کی عمر کے بعد سے چوتھائی صدی تک ان کارناموں میں اضافہ کرتا رہا تو اُسے اور جو کچھ بھی کہا جائے یہ قدروں کی تبدیلی نہیں بلکہ یہ ارتقاءِ تخلیقی عمل ہے۔ تبدیلی کا یہ مفہوم مجھے سخت ناپسند ہے کہ کل تک جو کچھ ہوا وہ آج سب منسوخ کر دیا جائے یا آج سب بیکار ہو گیا یا ردّی کی ٹوکری میں ڈالنے کے قابل ہو گیا جیسا شیکسپیئر نے کہا ہے RIPENESS IS ALL ۔ یعنی پختہ سے پختہ تر ہو جانے کا عمل ہی زندگی کا مقصد ہے۔

شوق : فراق صاحب! یہ باتیں بڑی گہری ہیں لیکن کیا پختگی کا عمل یا اُس کے مدارج کسی منزل پر آکر یک لخت رُک نہیں جائیں گے ؟

فراق صاحب : میرے وجدان کی آواز یہ کہتی ہے کہ پختگی ایک منزل یا ایک سطح پر پہنچ کر بھی اپنا تنوّع، اپنی اُپج، اپنی زرخیزی نہیں کھوتی۔ جمالیاتی قدریں اگر منطقی لحاظ سے نہ بھی بدلیں یا وُہی رہیں جو وہ بن چکی ہیں تو بھی بے شمار طریقوں پر یہ قدریں اپنے اظہار کی صُورتیں پیدا کرتی رہیں گی۔ مثلاً غالب سے جو قدریں غزلیں کہلواتی تھیں اُن قدروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن غالب کی ہر غزل ایک نئی جمالیاتی کائنات پیش کرتی ہے۔ صورت یا ہیئت کی تبدیلی قدروں کی تبدیلی نہیں ہے۔ جن اقدار کا میں قائل ہوں وہ غالباً وُہی اقدار ہیں جن کے بہت سے دُوسرے لوگ بھی قائل ہیں۔ میرے ہاں یہی قدریں میری شاعری کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ پریم چند کے افسانوں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ ٹیگور کے تخلیقی کارناموں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ شری جواہر لعل نہرو کے کارناموں کی شکل اختیار کرتی

ہیں اور اُردو اور دُوسری زبانوں کی رنگارنگ نظم و نثر کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ جسے ہم تنوّع، بوقلمونی یا رنگارنگی کہتے ہیں وہ ایک ہی قسم کی قدروں کی اُپج ہے۔ یکسانیت تنوّع کی دشمن نہیں ہے بلکہ تنوّع کی جان ہے ؏

ہم جان گئے اُس کو وہ جس رنگ میں آئے

سوال قدروں کے بدلنے یا نہ بدلنے کا نہیں ہے بلکہ قدروں کو تدریجی طور پر ہضم کرنے کا ہے اور انھیں ہضم کرتے ہوئے رنگارنگ تخلیقی عمل کو قائم رکھنے کا ہے۔

قدروں کے بدلتے رہنے پر ہمارے کمیونسٹ یا اشتراکی احباب میری رائے میں ضرورت سے زیادہ زور دیا کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تنسیخ اور تبدیلی کے الفاظ ان کے معشوق ہیں تبدیلی انقلاب، تنسیخ، ردّی کی ٹوکری میں ڈالنا، ٹھکرا دینا، مٹا دینا، ماضی پر تھوک دینا، اِن تصوّرات سے یاروں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور کیوں نہ ہو آغازِ تہذیب سے اب تک یا انقلاب رُوس تک جو کچھ ہوا ہے اُس کی عظمت کو محسوس کیے بغیر بادلِ ناخواستہ اُس کی مودبانہ سرپرستی کر کے یہ حضرات بہت خوش ہو جاتے ہیں۔ سرپرستی بجا لیکن کیا یہ حضرات ماضی کے کارناموں کو اُسی طرح سمجھ بھی سکے ہیں جس طرح مشہورِ عالم نقادانِ فن و ادب نے ماضی کو سمجھا ہے۔ مجھے تو دُنیا بھر میں کوئی ایسا کمیونسٹ نقاد کسی زبان میں نہیں ملا جس کا نام ہم مشہور نقادانِ فن و ادب کے ساتھ گستاخی کیے بغیر لے سکیں۔ اگر میں نام گنوانا شروع کر دوں تو یہ انٹرویو بہت طویل ہو جائے گا۔ دلوں کا چور چھپائے نہیں چھپتا۔ ہاں لگے ہاتھوں یہ بھی گزارش کر دوں کہ کسی فن کار کے شعوری یا تحت الشعوری، سماجی یا سیاسی عقائد کی شرح و تفسیر یا جائزہ و تنقید ادب ہی میں ہے اور نہ ہم اسے ادبی اقدار کا سمجھنا کہہ سکتے ہیں البتہ اسے جھک مارنا کہہ سکتے ہیں۔

شوق : ہندوستان کی ہر زبان اور اس زبان کے ادب سے آپ کو دلچسپی رہی ہے۔ ان زبانوں اور ان کے ادب سے اُردو کا موازنہ آپ کس طرح کریں گے؟

فراق صاحب : میں نے بنگالی بول چال اور بنگالی ادب کو اپنے کانوں سے سُنا ہے۔ اسی طرح کچھ نہ کچھ مرہٹی، گجراتی، سندھی، تامل، اور تیلگو اور دیگر زبانوں کے صوتیات سے اپنے کانوں کے پردوں کو آشنا کیا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کی ہر زبان اپنے محاسن کے باوجود مندرجہ ذیل امور میں اُردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی یعنی بحیثیت مجموعی نہیں کر سکتی:-

۱۔ صوتیاتی محاسن

۲۔ محاورہ بندی اور روزمرّہ۔

۳۔ ٹھیٹ سے ٹھیٹ اور معمولی سے معمولی عوامی لفظ میں تاثیر پیدا کر دینا یعنی انتہائی سادگی میں بلاغت پیدا کر دینا۔ فصاحت میں بھی اُردو کا مقابلہ ہندوستان کی شاید کوئی اور زبان نہیں کر سکتی۔ البتہ انگریزی زبان مندرجہ بالا تمام لحاظ سے اور بحیثیت مجموعی اُردو سے بڑھی ہوئی ہے۔

اُردو ہی کے ڈھانچہ پر کوئی کھڑی بولی ہندی یا جدید ہندی کو اُردو سے مختلف کر کے بنانے کی کوشش کی جا رہی

ہے لیکن جو باتیں میں نے اُوپر گنوائی ہیں انھیں سامنے رکھتے ہوئے میں جدید کھڑی بولی ہندی کو اُردو کا کامیاب مدِ مقابل نہیں سمجھتا اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ پریم چند کی اُردو نثر کا مقابلہ پریم چند کی ہندی نثر نہیں کر پاتی۔ ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ اسلوب بیان یا سٹائل کی رنگارنگی اور بوقلمونی اور مختلف سطحیں جتنی اُردو میں ملتی ہیں وُہ جدید ہندی میں ہمیں نہیں ملتیں۔ اور خوبی یہ ہے کہ اُردو میں کثیر التعداد اسالیب بیان یکساں مقبول ہیں۔ اگر میں اپنی ناچیز کوششوں کا ذکر کروں تو یہ کہوں گا کہ میری غزلوں رُباعیوں اور نظموں میں مُختلف اسالیب بیان کام میں لائے گئے ہیں۔ میں نے جدید ہندی کے اُن مصنّفوں کی کتابوں کے بھی اوراق اُلٹے ہیں جنھیں ساہتیہ اکادمی انعام یا دُوسرے انعامات دیے جا چکے ہیں اور انھیں پڑھ کر مجھے سخت ناآسودگی ہوئی ہے۔ جہاں تک جدید ہندی کا تعلق ہے مجھے اس امر کا رونا ہے کہ جدید ہندی اُن لوگوں کے ہاتھوں نہیں بن رہی جنھیں کھڑی بولی پر پُوری پُوری قدرت ہو یا جو کھڑی بولی کے ساتھ کھیل سکیں یا جو کھڑی بولی کے کرتب دکھا سکیں یا جو کھڑی بولی کا جادو جگا سکیں یا اسلوب بیان میں جو میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، ذوقؔ، نظیر اکبر آبادی، آتشؔ، نسیمؔ، انیسؔ، اقبالؔ، اکبرؔ، چکبستؔ، حالیؔ، سرشارؔ اور صدہا دُوسرے ماہرینِ اسلوب و زبان کا مقابلہ کر سکیں۔ میرے ہندی نواز یا ہندی پرست دوست مجھ سے اکثر کہتے ہیں کہ ابھی تو ہندی کا آغاز ہے۔ یہ حضرات اس بات کو نہیں جانتے کہ میرؔ کے کلام میں بھی اُردو کا آغاز تھا۔ چاسر (Chaucer) بھی انگریزی کے آغاز کی مثالیں پیش کرتا ہے۔ ملک محمد جائسی کے یہاں بھی اودھی زبان کا آغاز ہے۔ میں ہندی پرستوں سے کہوں گا کہ جدید ہندی کا آغاز ہی تو جدید ہندی کے مستقبل یا انجام کے لیے ایک خطرہ ہے۔ یہ ایسا آغاز ہے جس کی بدولت ہندی کی گاڑی رُک جائے گی بلکہ رُک گئی ہے۔ ایک غلط یا خراب حال صحیح یا اچھے مستقبل کو جنم نہیں دے سکتا۔ ایک بچّہ اپنے جنم دن ہی سے اپنے مستقبل کی نشاندہی کر دیتا ہے، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں نہ کہ ٹیڑھے میڑھے کھُردرے اور مُرجھائے ہوئے پات۔ دُوسرا رونا مجھے اس امر کا رہا ہے کہ انگریزی کی بلند ترین تعلیم کے بغیر ہندی ادیب بڑا ادیب نہیں بن سکتا اور نہ اتنا بڑا دماغ اسے میسّر آ سکتا ہے جتنا بڑا دماغ زندگی کے دُوسرے شعبوں میں گوکھلے یا تلک یا پنڈت نہرو کا تھا، جگدیش چندر بوس کا تھا، لاجپت رائے کا تھا، رام کرشن بھنڈارکر کا تھا۔ اور ہندوستان کے دیگر مشاہیر کا تھا۔ چھوٹا دماغ بڑا ادب نہیں پیدا کر سکتا۔ ہم ایک طرف تو اپنے طلبا کو تمام مغربی ادب، فلسفہ، سائنس اور دیگر علوم پڑھاتے ہیں، انگریزی ادب میں شیکسپیئر، برک، کارلائل، اور رسکن پڑھاتے ہیں اور انہی طالب علموں کو دُوسری طرف راشٹر بھاشا کے نام پر شری میتھلی شرن گپت، جے شنکر پرساد، نرالا اور پنت کی لکھی ہوئی چیزیں پڑھاتے ہیں۔ ہمارے طالب علموں کے دماغ جب دُنیا کے مشہور لکھنے والوں سے ان ہندی والوں کا اپنے دل و دماغ میں مُقابلہ کرتے ہوں گے تو اُن پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔

ہم افلاطون، شوپنہار، اور شیکسپیئر کو سمجھتے ہوئے اور ان کی قدر کرتے ہوئے غالبؔ، میرؔ، انیسؔ اور دیگر مشاہیر اُردو کی قدر کر سکتے ہیں لیکن جدید ہندی کے مشاہیر کی قدر نہیں کر سکتے۔ ہم بہترین کھانا کھا چکنے کے بعد ستّو کی

قدر نہیں کر سکتے۔ خود اُردو کا ہر نمک حلال پرستار دل سے اس بات کا قائل ہے کہ اگرچہ اُردو میں زبان و اسلوب کی
بدعتیں بالکل نہیں ہیں اور اُس میں بہت سی خوبیاں ہیں پھر بھی اُردو کو انگریزی ادب کے دوش بدوش کھڑے ہونا ہے
اُردو میں جو خوبیاں ہیں انھیں کی بنا پر مالویہ جی، لالہ جپت رائے، سوامی رام تیرتھ، سر تیج بہادر سپرو، سر عبد القادر،
جواہر لال نہرو اُردو کی قدر کرتے تھے۔ مگر ان بزرگوں کے برابر کا دماغ رکھنے والا ہندوستان کا کوئی مشہور آدمی جدید
ہندی کے نام نہاد مشاہیر کے کارناموں کا قائل نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ٹیگور، جے سی بوس، تلک، گوکھلے، گاندھی جی،
اچھی طرح کھڑی بولی جانتے تو جن نام نہاد ہندی مشاہیر کا نام میں نے گنوایا ہے اُن کے کلام کے وہ ہرگز قائل نہ
ہوتے۔ جدید ہندی جب تک بڑے دماغ والوں کو اپنا گرویدہ نہیں بنائے گی وہ ہماری زندگی میں کوئی جگہ حاصل
نہیں کر سکتی اور عوام ہی کو اُس نے کہاں اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ لوگوں کو اگر محبت ہے تو ہندی کے نام سے، ہندی
کی چیزوں سے نہیں۔ ایک بار کلکتہ میں اُردو مشاعرہ ہوا۔ ہزار ہا کی تعداد میں بنگالی جو ایک حرف اُردو نہیں سمجھتے
رات بھر مشاعرہ سُنتے رہے اور صبح کو اُنھوں نے اخبارات میں اپنا بیان شائع کرایا کہ ہم اُردو شاعری سمجھ نہیں
سکے لیکن ہم پر یہ مستقل اثر ہوا صرف شاعری کی صوتیات سے کہ یہ زبان ہماری مادری زبان سے زیادہ متمدن اور
ترقی یافتہ ہے۔

یہ سب کچھ کہنے کا مطلب صرف یہی ہے کہ ہندی کو اُردو کے بہت قریب آنا ہے۔ پہلے اُردو کو ہندی اپنائے
اُس کے بعد اس میں ایسے اضافے اور تبدیلیاں کرے اور ایسی نئی نئی چیزیں لائے جو اُس کے ڈھانچہ کو صدمہ نہ
پہنچائیں۔ کرنا تو کھڑی بولی کی خدمت اور کھڑی بولی ہی سے بالکل ناواقف ہونا یہ ایک عجیب گڑبڑ جھالا ہے۔ آج
ہندی کے قریب قریب سبھی نئے لکھنے والے اُردو کے قریب آنے کی کوشش کر رہے ہیں ہمیں اُن کی ہمت
افزائی کرنی چاہیے اور جہاں جہاں اُن کا قلم چوکے اُن کی اصلاح بھی کرنی چاہیے۔ ناگری حروف میں اُردو ادب
کو پیش کر کے ہندی کی بہت بڑی خدمت انجام دی جا رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُردو ادب میں کوئی کمی
نہیں یا کبھی کبھی اُس میں غلط رُجحانات کارفرما نہیں رہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ چند تبدیلیوں اور اصلاحوں
کی خاطر ہم اُردو ہی کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیں۔ یہ بڑی اچھی علامت ہے کہ آج کے ہندی پرست نوجوان مشاہیر
اُردو کو اپنا رہنما اور گورو مان رہے ہیں۔ اگر یہ عمل جاری رہا تو ہندی اور اُردو کا وہ سنگم جلد پیدا ہو جائے گا جس کا
خواب ہماری تاریخ دیکھ رہی ہے۔

تنقید کا تاریخی شعور اور انفرادیت

ڈاکٹر سیّد محمّد عقیل

جب ہم تنقید میں تاریخی شعور کی بات کرتے ہیں تو تنقید میں اس رُجحان سے مطلب نہیں ہوتا جس میں تنقید نگار ایک محقق کی حیثیت سے صرف تخلیقات کی تاریخیں جمع کرتا ہے۔ نہ اس کا مُدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات یا کسی مخصوص واقعہ کی حقیقت و نقائص تلاش کیے جائیں۔ یا پھر بادشاہوں کا تذکرہ جن کے دور میں ادیب کی نشو و نما ہوئی ہو، بُنیادوں کی تلاش، عبارت کے تیور، الحاقی یا غیر الحاقی کی بحث، مماثل تحریروں سے مصنّف کی تلاش، نُسخوں کی تقدیم و تاخیر سے صحت عبارت کا اندازہ لگانا۔ بلکہ تنقید نگار کو اس کوشش کی تلاش ہوتی ہے جس میں کسی ادیب یا مصنّف کی تخلیقات سمجھنے کے لیے ان حالات اور واقعات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو جنھوں نے سے اثرات کے تحت، شاعر یا ادیب کو ایک خاص وقت میں اس طرح کی تخلیق پر مجبور کیا ہو۔ جس نے تاریخ کی رفتار، سوسائٹی کے مذاق، اور سماج کے قدم کی دھمک محسوس کر کے مصنّف کے ذہن کے اوراق اُلٹے ہوں اور اُن میں اُن اثرات کی پرچھائیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہو، جس نے تنقید کرتے وقت کسی ادیب کو محض شارح بن کر نہ دیکھا ہو بلکہ ان تاریخی قوتوں کو پیشِ نظر رکھا ہو جن سے وہ ادب وجود میں آیا ہے۔ تہذیبیں اور تمدّن ارتقا پذیر ہوتے ہیں یا تنزّل کی منزلوں سے گزر کر موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں، جن سے قدریں بنتی اور بگڑتی ہیں، جن سے سماجی روایتیں، رسم و رواج، زندگی کی اجتماعیت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ محسوسات کے دروازے کھُلتے ہیں بند ہوتے ہیں اور انسانوں کی سیاسی و معاشی تاریخ کے ساتھ ان کے احساسِ جمال یا بد ذوقی کی وہ تاریخ بھی مرتب ہوتی ہے جس نے انسانوں کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے خوبصورت زندگی بسر کرنے اور طرزِ معاشرت کے دُوسرے بہتر راستے دکھائے ہوں یا ان کے تنزّل کے اسباب کا محاسبہ کیا ہو۔

تنقید کے اس تاریخی شعور کی روایت بہت پُرانی نہیں ہے۔ یورپ میں اسے جرمنوں نے شروع کیا، فرانس میں سینٹ بیو اور ٹین نے اسے اپنے طریقوں پر عام کرنے کی کوشش کی اور اُردو میں یہ رُجحان ترقی پسند تحریک کے ساتھ باضابطہ طور پر داخل ہوا۔ اس کی بکھری ہوئی شکلیں محمد حسین آزاد کی آبِ حیات میں بھی کہیں کہیں مل جاتی ہیں جہاں آزاد کا مخصوص لہجہ اور رنگ، دور کی ابتدا کا حال، شعرا کی کوششوں اور ادبی صلاحیتوں کو رنگین اور تمثیلی انداز میں پیش کر کے ادب کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ترقی پسند دور سے پہلے تنقید کا یہ طریقہ شعوری طور پر عام نہیں ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے شعر و ادب میں ایک نیا رُخ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان سماجی اور تاریخی رشتوں کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی

جنھوں نے ادیب کو ایک مخصوص حالت میں ایک خاص قسم کا ادب پیدا کرنے کے لیے تاریخی جبریت کے ہاتھوں مجبور کیا یا سماجی بندھنوں نے ادیب کو قید و بند کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے اکسایا۔

جو لوگ حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور زمانے کو حرکی سمجھنے کے ساتھ زندگی کی نامیاتی قوتوں پر بھروسہ اور اعتماد بھی، وہ جانتے ہیں کہ تاریخ ایک مخصوص سماج کو جنم دیتی ہے۔ سماج مذاق متعین کرتا ہے اور ادب، سماج اور تاریخ دونوں کا عکس لے کر اپنے اندر ایک مخصوص دور کے تمام اتار چڑھاؤ کو جذب کرتا چلا جاتا ہے۔ کوئی چاہے کہ اس اتار چڑھاؤ کو ادب کے اس مخصوص تاریخی اور سماجی دھارے سے الگ کر کے اس سے لطف اندوز ہو تو اسے ظاہری خوبیاں نظر آجائیں گی مگر وہ اس روح کی حرارت کا پتہ نہیں لگا سکتا جو اس ادب پارے میں دوڑتی پھر رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی میں یونان کی تاریخ بولتی نظر آتی ہے۔ ایلیڈ میں شمشیر و سناں کا یونان تو اوڈیسی میں طاؤس و رباب کا۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف تاریخ کی بازگشت نہیں بلکہ یہ ادب پارے اس زندگی کے نظریات کا عکس اور تاریخی جبریت اور جذبات کی تہوں کے مظہر بھی ہیں جن سے اہل یونان کے ساتھ ہومر کا سابقہ پڑا تھا۔ شیکسپیئر کے ساتھ الزابیتھی اور اسٹوارٹ عہد کے عقائد اور سوسائٹی بول رہی ہے۔ الزابیتھ کے زمانے میں موسیقی کا عام شوق، بلینک ورس کا استعمال جس کا تجربہ سرے (Surrey) نے ایلیڈ کا ترجمہ کر کے کیا، اس سے تقریباً سبھی ڈرامہ نگاروں نے فائدہ اٹھایا، انھیں شیکسپیئر کے طربیوں میں موسیقی کی لہروں اور ہیئتی تجربوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہنری چہارم کے کیڈ سین (Cade Scene) میں تمام پیوریٹن تحریکات، کسانوں کی بغاوت (Peasants' Revolt) کی پرچھائیوں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ رومیو جولیٹ ٹیوڈر حکومت کے خاندانی نظریات کی بازگشت[۱] ہے۔ انسان کے بھوت بہت سارے خفیہ واقعات سے پردہ اٹھا سکتے ہیں۔ یا عبادت کے وقت کسی کا قتل اس کی سزا نہیں۔ بلکہ ایسا قتل اس کی دوسری دنیا کو سنوار دیتا ہے اور اس طرح ہیملٹ کا کلیڈ یس (Caldius) جہنم میں جلنے کی بجائے جنت میں جا سکتا ہے۔ جولیس سیزر میں جن بغاوتوں کے بیانات ہیں انھیں متوسط طبقے کی ان بغاوتوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو سولھویں صدی کے اختتام کے قریب انگلینڈ میں عام ہونا شروع ہو گئی تھیں اور جو سنہ ۱۶۰۰ء میں ایسکس کی بغاوت (Essex Rising) کی شکل میں نمودار ہوئیں یا اس سے پہلے آئرش حادثہ (Irish Disaster) کی صورت اختیار کر چکی تھیں یہ ساری باتیں شیکسپیئر کا عہد بنتی ہیں۔ خواہ آپ شیکسپیئر کو شاہی کا طرفدار مانیئے یا انقلابی اور عوام کا ہمدرد اور انھیں ہم والٹ وہیٹ مین (Walt Whitman) کی طرح یہ کہہ کر مسترد نہیں کر سکتے کہ یہ سب مرتے ہوئے جاگیردارانہ خیالات ہیں، دور کے اصل خیالات اور تصویریں نہیں۔ ہو سکتا ہے شیکسپیئر نے جولیس سیزر کے عوام اور ہجوم (Mobs) کے ساتھ ہو کر متوسط طبقہ کی اس اسپرٹ کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہو جو آمریت یا شہنشاہیت کے خلاف دھیرے دھیرے

---

۱ civil blood makes civil hands unclean :— Romeo Juliet

سر اُٹھا رہی تھی اور جس نے جیمس اوّل کے دور تک پہنچتے پہنچتے بارُود کی سازش (Gun Powder Plot) ۔ اور سٹن کورٹ کانفرنس کی شکل میں شیکسپیئر کے لیے بڑے المیوں (Great Tragedies) کا مواد اکٹھا کیا ہو۔

اگر تنقید تخلیق در تخلیق ہے تو اس کا رشتہ اس تخلیق کے تمام سوتوں سے ہونا چاہیے جس کی وُہ تنقید ہے ادیب کی تخلیقات اور ان تخلیقات پر عملِ جرّاحی کر کے شاعر یا ادیب کے دل میں جھانکنے اور رگ و پے کی حرکت سے اس کے رُجحان کا محاسبہ کرنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس کے باہر کی دُنیا کو بھی سمجھے ۔ نہ صرف تاریخی سماجی بلکہ کسی حد تک ان جغرافیائی حالات کو بھی جو کسی تاریخ کی تکمیل میں اکثر محل بے محل خارج ہو کر واقعات کا رُخ بدل دیا کرتے ہیں۔ فتحیں شکست میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور قوموں کی زندگیاں بدل جاتی ہیں (جیسا کہ رُوسی برف باری نے نپولین کے ساتھ اور بنگال کی برسات نے ہمایوں کے ساتھ کیا)۔ اور اگر نقاد بیرونی دُنیا کا بظاہر مُنکر ہو بھی جائے تو اپنی دُنیا سے وہ الگ نہیں ہو سکتا اور اس طرح گھوم پھر کر تاریخی نقطۂ نظر پھر بھی تنقیدی تخلیق میں جھانکنے لگتا ہے کیونکہ نقاد جن اصولوں پر کسی تخلیق کو پرکھتا ہے وہ اس کے اپنے دَور کے اصول ہوتے ہیں اور اس طرح ایک وقت کا پورا مذاق، پسند اور طرزِ تنقید اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں جسے تاریخ کی رفتار سے جمالیاتی، نفسیاتی، تاثراتی یا مارکسی تنقید نگار الگ نہیں کر سکتا۔ جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر سید عبداللہ، مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، مجنوں، فراق، ڈاکٹر عبدالعلیم، آل احمد سرور ڈاکٹر اعجاز حسین، احتشام حسین اور ممتاز حسین، کلیم الدین احمد، اور ڈاکٹر احسن فاروقی یہ سب اپنی اپنی جگہ تنقید میں ایک خاص رُجحان کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اقبال، جوش، جگر، سردار جعفری، فراق اور جذبی کی شاعری، پریم چند علی عباس حسینی، کرشن چندر، بیدی اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں یا اُوپر لکھے ہوئے نقادوں کی تخلیقات کو ان حالات سے الگ کر کے پرکھا جائے جن کے زیرِ اثر اقبال نے مسجد قرطبہ، لینن خُدا کے حضور میں اور خضرِ راہ جیسی نظمیں لکھیں۔ جوش نے کسان، جشنِ تاجپوشی اور ہندوستان و پاکستان کا نعرہ لکھا۔ جگر صاحب نے شعلۂ طور کی والہانہ کیفیت سے نکل کر چھپرا اور بہار کے واقعات سے متاثر ہو کر غزلیں لکھیں ۔ کیا لہو کے چراغ، ایشیا جاگ اُٹھا اور جگن ناتھ آزاد کی وطن میں اجنبی جیسی نظمیں، تاریخ کی رفتار کو چھوڑ کر سمجھی جا سکتی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ شبلی جیسے قدیم نقادوں نے بھی تاریخ اور سماج کے اس نازک فرق کو اپنی استدلالی تنقید میں فراموش نہیں کیا گو ان کے وقت میں نہ تنقید کا موجودہ شعور پیدا ہوا تھا اور نہ اس کی اہمیت کا ایسا ادراک کیا گیا تھا۔ شعر العجم میں فرماتے ہیں:

> "جن شعرا کے کلام سے مبالغہ کی خوبی پر استدلال کیا جاتا ہے ان کی نسبت یہ دیکھو کہ وہ کس زمانے کے ہیں ۔ متاخرین میں ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ تمدّن کی خرابی ہے جس کا اثر مذاق پر پڑا ہے کہ لوگ مبالغہ کو پسند کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تمدّن کی خرابی نے شاعر اور سامعین دونوں کے مذاق کو خراب کر دیا ہے ۔"

حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں شاعری اور سوسائٹی کے تعلق پر بڑی موثر اور تفصیلی بحث کی ہے۔ اسی طرح پریم چند کی گئودان، چوگان ہستی اور میدانِ عمل کا محاسبہ بھی بغیر ہندوستان کے اس دور کی تاریخ کو سمجھے ہوئے، کانگریس کی جدوجہد، کسانوں کی تحریکات اور گاندھی جی کے نقطۂ نظر کو جانے بغیر محض نقاد کی ذاتی پسند یا ناپسند یا ناول کے چند میکانکی اصولوں کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی اور ادب کا یہی تعلق ہے جس سے حقیقی نقاد اپنے کو الگ نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد ذاتی پسند یا ناپسند کا سوال اٹھتا ہے۔

زندگی اور ادب کے ایسے تعلقات کو سمجھنے کے لیے ایک ادبی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے جو زندگی میں تیر جانے کے ساتھ ساتھ ان مسالوں کے بنیادی اجزا کو بھی سمجھ سکے جنھوں نے ادب کے پیکر کی تعمیر کی ہے۔ بعض اوقات یہ اجزا زندگی کی تیز رفتاری، امکانات، پسپائیت یا امنگوں سے بنتے ہیں۔ الزابیتھی ادب کی طرح، اردو میں دکنی ادبی سرگرمیوں کی صورت میں اور شمال میں مٹتی ہوئی مغلیہ حکومت کا اثر ہے کہ شہر آشوب اور قنوطی 'آہ' کی شاعری کی شکل میں۔ کبھی یہی تعلقات ادب کو انقلاب کے لیے تیار کرتے ہیں۔ روسو، ٹالسٹائی، پشکن، مایاکوفسکی کی طرح۔ اس کی ایک صورت نازی جرمنی کے ادیبوں کولبن ہیر (Kolben Heyer)، گرم (Grimm) اور یوسٹ (Jost) کے یہاں دیکھی جاسکتی ہے جو نازیوں کی 'تیسری حکومت' کے سب سے بڑے نقیب تھے۔ اس کی ایک متوازن شکل بریخت (Brecht) بھی ہے جس کا قومیت کا جذبہ، تیسری حکومت کے علم برداروں سے کس قدر مختلف ہے۔ ہندوستان میں وطن پرستی کے جذبے سے متاثر نظمیں اور ادب، چکبست، ظفر علی خاں، پریم چند، شاعر انقلاب کی تخلیقات اس زندگی کو بھی واضح کرتی ہیں جس سے ہندوستان اس وقت گزر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس انقلاب کے لیے بھی راستہ تیار کرتی جاتی ہیں جو ۱۹۴۷ء میں رونما ہوا۔ ادب اور زندگی کے اس تعلق کو اس 'مشغلہ' سے کبھی نہیں سمجھا جاسکتا جس میں کتب خانوں کی سڑی گلی کتابوں کو الٹ پلٹ کر اس کے اوّل اور آخری صفحات میں صرف یہ تلاش کرتے رہنا ہے کہ کب چھپی؟ کس مطبع سے چھپی؟ قطعۂ تاریخ کیا ہے؟ قلمی ہے تو بہت اچھا (چاہے کاتب نے اسے کسی چھپی ہوئی کتاب ہی سے نقل کیوں نہ کیا ہو اور اس نقل میں اپنی جانب سے بہت کچھ بڑھایا گھٹایا ہو) کیونکہ قلمی نسخہ کسی آسمانی صحیفہ سے کم مستند نہیں سمجھا جاتا۔ پھر ترقیمہ کی عبارت کیا ہے؟ مطبع کا مالک کون تھا؟ مہتمم کون تھا؟ کاتب کا نام کیا تھا؟ وہ پان بہت کھاتا تھا کیونکہ صفحات پر جابجا پیک کے نشانات سے شبہ ہوتا ہے۔ کسی خاص شاعر نے نور نامہ نام کی مثنوی لکھی تھی وہ ایک قلمی نسخے میں ملی جو آج سے پہلے کسی نے دیکھا تک نہ تھا۔[1] اور ایسا ادبی مشغلہ رکھنے والے اس بات کی فکر نہیں کرتے کہ اصل کتاب میں کیا ہے۔ لکھنے والے کے مسائل اور خیالات کیا ہیں اور وہ زندگی یا تاریخ کے کس دور سے گزر رہا ہے اس کے بجائے جب کبھی اپنے محبوب

۱؎ راقم الحروف کے مقالے "اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں" میں بھی اس طرح کی باتیں کبھی کبھی مل جاتی ہیں۔ یہ مقالہ ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا لیکن اب گورنمنٹ آف انڈیا نے شائع کیا ہے۔

مشغلے سے الگ ہوکر یہ لوگ دُوسرے ادبی مسائل کی طرف توجہ کرتے ہیں تو یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ادب اور زندگی میں کوئی واسطہ نہیں۔ دو بھائیوں کے مزاج اور سیرت میں جب بُعد المشرقین ہو سکتا ہے تو کسی ادبی تحریک میں بہت سارے ادیب کیسے شامل ہوکر ہم خیال ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی میں شاعروں اور ادیبوں کا کوئی حصّہ نہیں اسے صرف سیاسی لیڈروں نے آزاد کرایا ہے۔ مُلک کے سماجی اور معاشی اِرتقا کی سمتیں ناول نگار اور ادیب متعیّن نہیں کرتے بلکہ صرف سیاسی پارٹیاں، ماہرینِ معاشیات، وسماجیات اور ٹیکنیشنز طے کرتے ہیں۔ ادیب کو بھلا اس سے کیا واسطہ۔ مُلک کی قومی اور سیاسی یا سماجی زندگی میں ادیب کا کیا حصّہ ہو سکتا ہے وغیرہ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی مُلک کے باشندوں کو ادب، فنونِ لطیفہ اور زندگی کے تمام مسائل کو چھوڑ کر صرف سیاسی پارٹیاں بنانا چاہیے اور الیکشن لڑتے رہنا چاہیے کیونکہ یہی جماعتیں ملک کی ادبی، سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کے مسائل حل کر سکتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام حکومتوں کو چاہیے کہ تمام انسانوں کو صرف فوجی بنائیں اور مُلک کے تمام آلات اور مشینیں انسان کی آسائشیں و آرام کی اشیا فراہم کرنے کے بجائے بندوقیں اور گولیاں بناتی رہیں اور ادیبوں کو اپنا قلم پھینک کر صرف سپاہی بننا چاہیے یا ماہرِ سیاست کیونکہ ادیب جب زندگی کے کسی کام کا نہیں تو اس کے ادب کی تخلیق جیسے مجہول کام کرنے سے فائدہ؟

تنقید کا یہ رُخ نہ تو تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اور نہ ادب سے، بلکہ اسے دونوں کی نفی سمجھنا چاہیے کیونکہ اس میں اِن تاریخی قوتوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا جن سے ادب اور تہذیبیں وجود میں آتی ہیں، جن سے زندگی کی اجتماعیت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ خیالات ان بھٹکے ہوئے لوگوں کے مظہر ہیں جو نہ ادب کی اہمیت سے واقف ہیں اور نہ زندگی سے اس کے رشتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ وُہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اگر ادب، زندگی اور تاریخ میں ایک مربوط رشتہ نہ ہو یا ادب، سماج، عوام اور سیاست کا رُخ بدلنے پر قادر نہ ہو تو حکومتیں وقتاً فوقتاً ادبی تخلیقات کو ممنوع الاشاعت کیوں قرار دیں۔ جب ادیب اور شعرا کے خیالات کسی کو فائدہ نقصان پہنچا ہی نہیں سکتے، ادیب کے خیالات زندگی اور سماج پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتے تو شاعر اور ادیب جو چاہیں بکا کریں اس سے کیا فرق پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جو محض ادب پاروں کو سامنے رکھ کر ادیب کی منزل مقرر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ادیب یا فن کار کے خیالات کے سرچشموں تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ان کے محسوسات کی تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس طبقے کی تنقید میں ذاتی پسند یا ناپسندیدگی کی شمولیت کے ساتھ لفظی موشگافیوں، قواعد اور عروض کی غلطیوں اور دُوسرے محاسن و معائبِ سخن کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی ادیب یا شاعر کے لیے یہ باتیں بھی اتنی ہی ضروری ہیں جتنی کہ فن کی تکمیل کے لیے اور دُوسری باتیں۔ لیکن صرف یہی باتیں کسی فن کی عظمت کا راز نہیں ہوتیں۔ پھر الفاظ کی تراش خراش کا احساس، لُغات کا استعمال، الفاظ کے متروکات اور ان کا چلن، ان سب کے ساتھ تاریخ وابستہ رہتی ہے۔ ناسخ سے پہلے کبھو، کیدھر، آئے ہے، جائے ہے۔ کھوے ہے کا استعمال اور ان کے بعد ان تمام الفاظ اور جملوں کے متروک ہو جانے سے اُردو شاعری اور ادب سے ذرا بھی دلچسپی رکھنے والا اچھی طرح واقف ہے۔ تاریخ اور دنت

کے ساتھ زبان میں جو لسانی اور صوتی تغیر ہوتا رہتا ہے، فن کے پرکھنے کا جو معیار بدلتا رہتا ہے، بحروں اور اوزان کے استعمال میں جس ٹوٹ پھوٹ اور آزادی کا اظہار ہوتا رہتا ہے، تشبیہات اور استعارے جو نت نئے روپ اختیار کرتے جاتے ہیں، غیر ملکی، ملکی اور مقامی زبانیں، کاروباری دنیا کے جو نئے الفاظ، نئی مشینوں کے نام، اصطلاحات اور اشارے سکوں کا چلن جو کچھ بھی زبان کے ساتھ ادب میں شامل ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی عہد تاریخ کی یادگار بنتا جاتا ہے حافظ محمود شیرانی چہار درویش کی تقدیم و تاخیر کا اندازہ بھی اسی طرح الفاظ، زبان اور سکوں کے تذکرے سے لگاتے ہیں اور بہت سے تنقید نگار ایسی کلیدی باتیں تلاش کر کے سماج اور تاریخ کو چھوڑتے ہوئے سماج اور تاریخ کی حدوں میں داخل ہو جاتے ہیں اس طرح خالص فن کے دائرے بھی تاریخ حالات اور سماجی ارتقا جو ان تاریخی حالات کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے دونوں مل کر متعین کرتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی مکتب خیال کا نقاد خود کو تاریخ سے نہیں بچا سکتا۔ ٹین، ملارمے، ہرڈر، بنت بیو، بیلنخوف، بلنسکی، ڈاکٹر جانسن، میتھو آرنلڈ، ٹی ایس۔ ایلیٹ، حالی، شبلی، اختر رائے پوری، مجنوں، سرور، احتشام حسین، سب اپنا اپنا عہد ہیں، اپنے دور کا زندہ سماج اور بولتی ہوئی تاریخ۔

یہاں پر یہ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ تنقید نگار، ادیب کی زندگی یا اس کی تخلیق کے تمام گوشوں کو منور کرنے یہ کیا ضروری ہے کہ ادیب کی جو زندگی اس کے سماجی حالات نے بنائی ہے اس کو سمجھے بغیر اس کے فن کو نہ پرکھا جائے؟ کیا ادیب کی زندگی میں صرف تاریخ اور سماج ہی اہم پارٹ ادا کرتے ہیں؟ مذہب، اخلاقیات وغیرہ اس پہ اثر انداز نہیں ہو سکتے؟ نفسیات یا انفرادیت کا کچھ اثر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ غزل جیسی داخلی شاعری کے ساتھ کیا تنقید کا داخلی ہو جانا ممکن نہیں؟ کیا تاریخی شعور کی تلاش تنقید کو بالکل سائنٹفک طور پر مکمل کر کے ادب کا پورا احاطہ کر سکے گی؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب قطعیت کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ادب کو ناپنے کا کوئی ایسا مکمل پیمانہ نہیں جو سائنس کے تجربات اور نتائج کی طرح بالکل صحیح نتیجہ برآمد کر سکے۔ پھر تاریخی تلاش میں تو نتائج کے لیے اور دشواریاں ہیں۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر نقاد کسی فن پارے میں رُوحِ عصر، ادیب کے ایک خاص رُجحان کا سبب اور حقیقتوں کی چھان بین کرنا چاہے گا تو بغیر تنقید کی ایسی کوشش اور تلاش کے تاریخی اور سماجی طریقوں کے، یہ چھان بین ممکن نہ ہو سکے گی۔ فنی خوبیوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی، نیک نیتی، انسانی فلاح و بہبود، بغیر سوشلزم اور مادّہ کے علمی تصور کے، صرف عینیت پرستی اور ظاہری رکھ رکھاؤ سے ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رومانی شعر اخیالات کو مادّی تعبیریں نہیں دے سکتے اور اس طرح فن میں جمالیات کا احساس بھی اُن کے یہاں زندگی کے تاریخی اور سماجی رشتوں سے بہت دُور ہو جاتا ہے۔ تاریخ، سماج، معاشی ذرائع، مادّہ اور کلچر میں جو ایک اندرونی رشتہ ہے وہ رشتہ اپنے تانے بانے میں ادب اور فن کے تصور کو لپیٹتا رہتا ہے اور تاریخی و سماجی تنقید نگار انھیں اندرونی تہوں میں ڈوب کر ادب کا جائزہ لیتا ہے۔

سینت بیو نے ادیب اور ادب کے لیے درخت اور پھل کی مثال دی تھی اور ناقد ایک ماہر نباتیات ہے جو پھل کے ذائقے اور رنگ و بو کی تلاش میں درخت کی بیخ و بُن میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پھلوں کے خراب ہو جانے

کی وجہیں، پانی کی کمی، درخت کی عقبی زمین کے نقص، روشنی اور ہوا کی کمی میں ڈھونڈتا ہے۔ ناقد ایک عام سامع یا قاری نہیں ہوتا جب تک وہ ادیب کی تخلیق کے سرچشموں کا پتہ نہ لگائے، اس کے حالات کو نہ سمجھے۔

آج سے کوچہ و بازار میں مرنا ہے روا ظلم کی چھاؤں میں چپ بیٹھ کے جینا ہے حرام

(سردار جعفری)

———

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

(چکبست)

———

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(غالب)

———

پھرے ہے پارۂ دل چشم اشکبار میں یوں جلا کے چھوڑ دے جیسے کوئی بھنور میں چراغ

(ظفر)

———

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ بندی رکھے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

(انشا)

———

جیسے اشعار کی روح اور اس ماحول تک نہیں پہنچ سکتا جس ماحول میں یہ شعر کہے گئے ہیں۔ کرشن چندر کے 'حسن اور حیوان' 'کالو بھنگی'، بیدی کے 'پان شاپ'، 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، احمد ندیم قاسمی کے عبدالمتین ایم۔اے، 'رئیس خانہ'، اور 'سناٹا'، فشکر پلے کے 'دو سیر دھان'، کامو (Camus) کے 'پلیگ'، ہیمنگ وے کے 'گھنٹہ کس کے لیے بجتا ہے' For whom the Bell Tolls) یا 'ہتھیاروں کو الوداع' (Fare well to arms) یا بیٹنک شعرا (Beatnice Poets) کی تخلیقات کا جائزہ بغیر تاریخی سماجی تصریحات کے ممکن نہیں۔ ان تمام فن پاروں میں اس وقت کا سماج اور تاریخی حالات سب بول رہے ہیں۔ جنھیں صرف لطف لے کر اور ظاہری فن کی تلاش سے نہیں سمجھا جا سکتا ایسی تلاش ادب کی حرکی قوتوں کا بھی انکار بھی ہے اور ناقد کو اندھیرے میں بھٹکاتی پھرتی ہے۔

ٹین (Taine) نے جب فن کار کا جائزہ لینے کے لیے نسل، ماحول (Milieu) اور وقت (Mo-ment) کو صحیح طور پر معیار قرار دیا تو نسل سے اس کی مراد ملک اور قوم سے تھی جو ادیب کے مزاج میں جسمانی طور پر داخل ہو کر اس کلچر کو بھی سمو دیتے ہیں جسے تاریخ کا ایک مخصوص دور اس قوم کو عطا کرتا ہے۔ لیکن اگر ٹین کے خیال کو تھوڑی سی وسعت اور دے دی جائے تو اس نسل میں شعرا کی ایک نسل بھی شامل کی جا سکتی ہے جو ایک روایت کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے اور جس کے شاعر اور ادیب وقت کے تفاوت کے ساتھ بھی اپنے خیالات دوسروں تک پہنچاتے رہتے ہیں اور خیالات کی یہ ترسیل، وقت کے تقاضوں کے ساتھ شامل ہو کر اپنے اسکول سے مل جاتی ہے اور نہ صرف اسکول سے بلکہ دور کے ان لوگوں سے بھی جو کسی ایک وقت میں اپنا مذاق متعین کرتے ہیں ——— کیونکہ اسکول لوگوں کے مذاق ہی سے متعین ہوتے ہیں ———

——— اور فن کار اس مذاق میں سب کا نمائندہ یا ایک بلند آواز ہوتا ہے جو سارے خیالات کو متحد کر کے کسی مخصوص فکر یا فن میں ڈھال دیتا ہے اور ان بلند آوازوں میں جب کوئی ادیب اپنے لیے فکر اور تخاطب کے راستے الگ کرنے لگتا ہے تو سب سے اُوپر اُٹھ کر منفرد ہو جاتا ہے لیکن وہ اس دھارے سے بُنیادی طور پر الگ نہیں ہوتا۔ اس بات کی وضاحت کچھ اس طرح ہو سکتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی دلّی، زوال آمادہ مذاق، سطحی رنگینیوں، شاعری کے بندھے ٹکے اصولوں اور شاعری کے ایک عام مذاق کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کے مخصوص اصولوں کی دلّی تھی جس میں شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، معروفؔ، شیفتہؔ، آزردہؔ، آغا جان عیشؔ سبھی ایک رنگ میں تھوڑے سے بہت فرق کے ساتھ نظر آتے ہیں لیکن غالبؔ یا مومنؔ کی آواز ان تمام روایتوں کو لے کر بھی سب سے اُوپر اُٹھتی نظر آتی ہے اور تاریخ کا دھارا، ان کی شاعری میں تمام عصری عناصر کو کہیں نہ کہیں کھپا کر ان کی آوازوں کو منفرد بھی بنا دیتا ہے۔ بام و در، کوچے، شہنشاہ کی مصاحبت سے سوسائٹی میں وقار حاصل ہونے کا خیال، زندگی کی بے کیف گزران، عشق کی مخصوص روایتیں، مسائلِ تصوّف پر زور وغیرہ سے گزرنے کے بعد غالبؔ کی حکیمانہ نظر، منفرد طرزِ اظہار، رجائیت اور بلند نظری، اس عام سطح سے اُوپر اُٹھتی ہے جہاں بہت سی آوازیں گڈ مڈ ہیں۔ انیسؔ اپنی منفرد آواز کے باوجود تاریخ کے اس دھارے میں بہہ رہے ہیں جس میں لکھنؤ کا سماج بہہ رہا تھا اور مرثیوں میں 'چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے'، 'وہ بال تھی کہ حور نے بکھرا دیے تھے بال'، 'گہہ تھمی، گاہ بڑھی، گاہ رُکی گاہ چلی' میں رقص کا سماں اور معشوقانہ ادائیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ رعایاتِ لفظی کا استعمال، بے نقط مرثیے، میراث، شرافتِ نسلی کا امتیاز، مرثیہ کہنے کا ماحول، میدانِ جنگ کے بجائے محفلوں ہی میں تلوار اور نیزے کی چمک دیکھنے کی خواہش، جب ان تمام منزلوں سے گزر لیتے ہیں تب انیسؔ کی انفرادیت انھیں ایک بڑے فن کار کی شکل میں لے کر اُبھرتی ہے۔ یہیں سے شخصی سعی و تفحص یا جینیس کی شاخ پھوٹتی ہے۔

شخصی سعی و تفحص، جسے ادیب کی انفرادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا سلسلہ ادب کے اس تاریخی بہاؤ میں بڑا عجیب و غریب ہے اور دلچسپ بھی۔ درحقیقت ادب کے اس تاریخی بہاؤ میں مختلف مکتبِ خیال کے لوگ شامل رہتے ہیں جو ایک دوسرے سے طبعی اور ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر مختلف ہوتے ہیں اور کبھی ایک ہی مکتب میں مختلف تجربوں کے باعث اپنے اپنے راستے الگ مقرر کرتے ہیں۔ تاریخ باوجود اپنی تمام طاقتوں کے شخصی مزاج کے اس رُخ کو نہیں بدل سکتی جس میں چیزوں سے یا حالات سے ایک خاص انداز پر متاثر ہونے کی خاصیت، یا صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن اس انفرادی صلاحیت سے یہ مطلب نکالنا کہ انسان جماعتی طور پر کسی ایک فکری مرکز پر آ ہی نہیں سکتے، بڑی غلط سی بات ہے۔ انفرادیت کے معنی ادب میں بس یہی ہو سکتے ہیں جس کا اشارہ اُوپر کیا گیا۔ تاریخ کی خارجی باتیں، حادثات اور تبدیلیاں سب پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ادیب انھیں ساتھ لے کر ان کے مثبت اور منفی اثرات اور حالات کے مختلف رُخوں سے اپنی پیش کش میں نیا ڈھنگ اور نیا پن، تجربوں کی بنا پر پیدا کرتا رہتا ہے لیکن تاریخ اور سماج کے ہالے کو توڑ کر باہر نہیں جا سکتا۔ شیکسپیئر، مارلو، اسپنسر، ٹامس مور، فلپ، سڈنی اور بن جانسن سب تھوڑے سے بہت فرق کے بعد ایک ہی وقت اور تاریخ کی پیداوار ہیں لیکن شیکسپیئر اپنے خاص تجربوں اور طرز کے لحاظ سے اپنے عہد کی سب سے الگ آواز معلوم ہوتا ہے۔ صنعتی انقلاب اگر نہ ہوتا تو اس ڈکنس کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا تھا جس نے محنت کش طبقے سے دلچسپی لے کر

ان کی زندگیاں ناول کے صفحات پر منقش کر کے انگریزی ناول کو ایک نیا رُخ دے دیا لیکن اسی وقت تھیکرے کی وینٹی فیر (VAN-ITY FAIR) میں بھی ملتی ہے جو محنت کش طبقے کے بجائے لندن کی اُونچی سوسائٹی کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اسے کسی نئے پن یا کسی قوت ایجاد سے معرا تو کہا جا سکتا ہے لیکن تاریخ کے اس دھارے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تھیکرے، ایک ہی وقت میں تاریخ کے اثرات ایک دُوسرے طبقے کے انسانوں پر کیا پڑ رہے ہیں، اس کا مبلغ ہے اور اپنے گھسے پٹے تجربوں کے باعث پُرانی دیوار کو منقش کر رہا ہے لیکن اس نقش کے پیچھے دیوار اپنے تمام حوادث زمانہ کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ یہی صورت جارج ایلیٹ کے مڈل مارچ، برانٹی بہنوں کے ناول اور والٹر اسکاٹ کے ناولوں کی بھی ہے۔ لیکن ڈکنس وقت کے سب سے ترقی پسند راستے کو اپنا کر اپنے وقت کا جینیئس بن جاتا ہے۔ پریم چند کو جو چیز اپنے عہد کے ناول یا افسانہ نگاروں سے الگ کرتی ہے وہ ان کا ایسا شعور ہے جو دیہات کی زندگی کے نہاں خانوں میں پہنچ کر اس کی تہوں سے اصل خوبی اور خرابی کو باہر نکال لاتا ہے اور انقلاب کی دھیمی آنچ سے ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرتا جاتا ہے لیکن اسی وقت شرر اور فیاض علی بھی ہیں جو انھیں حالات سے دُوسری طرح کا اثر لیتے ہیں۔ شرر زمانے کی اس انقلابی کیفیت سے اسلامی احیاء کی کوشش کرتے ہیں۔ فیاض علی اور طلیب نئی زندگی اور پُرانی زندگیوں کے ملاپ (Fusion) سے اس رُومانی کیفیت کو منعکس کرتے ہیں جو ایک خاص طبقے میں سماجی آگہی سے نئی روشنی کے ساتھ بیدار ہو رہی تھی۔ سوسائٹی کی سیاسی انقلابی کیفیت کو چھوڑ کر اصلاحی تبدیلیوں کی خواہاں اس وقت کی خواتین ناول نگار احمدی بیگم اور نذر سجاد حیدر رہیں۔

کرشن چندر، بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت اور منٹو کے ساتھ ایک دُوسرا دور شروع ہوتا ہے جسے اشتمالی آگہی کا دور کہنا چاہیے۔ یہ سب بھی تاریخی بہاؤ میں ایک ساتھ بہہ رہے ہیں لیکن اپنی پوری ترقی پسندی، فن کی نئی قدروں کے احساس اور انقلابی تصورات کے ساتھ اپنی انفرادیت کا بھی تعین کرتے رہتے ہیں۔ ایک ہی گروہ اور عمر کی تقریباً ایک ہی منزل کے باوجود سب کے رنگوں کی الگ الگ نشان دہی ہوتی ہے۔ احمد ندیم کے کفارہ، کا ہیرو پیر محمد پریم چند کی دُنیا میں بھی ہے، گاندھیائی آہستہ روی اور نرم مزاجی سے بھی گزرتا ہے لیکن ندیم کی ذہنی انقلاب کی کوشش اسے زندگی کے پیچ و خم سے گزار کر گرفتاری کے بعد زندگی کے اس چیلنج کے لیے تیار کر دیتی ہے جس کے لیے ترقی پسند افسانہ نگار اپنے کرداروں کو تیار کرتے ہیں اور پھر احمد ندیم کی انفرادیت، ان کی چمکار، افہام و تفہیم اور کرداروں کے تیقن کے ساتھ ساتھ ان کے فطری طور پر بڑھنے اور پھیلنے سے عیاں ہو جاتی ہے جن میں وہ ہیجانی کیفیت کبھی نہیں ملتی جو کبھی کبھی کرشن چندر کے کرداروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ عصمت اور منٹو اپنی جنسیت نگاری (Pornography) کے ساتھ بھی اسی نظام زندگی کے خواہاں ہیں جس کی تمنا کرشن چندر اور ندیم یا بیدی کرتے ہیں۔ پھر جنسیت نگاری میں بھی عصمت اور منٹو کے نقطۂ نظر اور ٹیکنیک میں واضح فرق ہو جاتا ہے۔ ایک جنسی اصلاح کے لیے کوشاں ہے تو دُوسرا جنسی کجروی کے راستوں سے حقیقت نگاری کا مدعی ہے لیکن جب ان سب کو اکٹھا کر کے ایک حد میں منسلک کیا جاتا ہے تو نصب العین میں کوئی تضاد یا بُعد نظر نہیں آتا۔ سب اس بات کے متمنی ہیں کہ بنی نوع انسان کی بہتری کی صورتیں فراہم کی جائیں کہیں انھیں زندگی کے سیدھے راستوں پر چلا کر زندگی کی رنگا رنگی دکھا کر اور کہیں حیات کی عفونت اور مشکلوں

سے گزار کر، جو نہ تو زندگی کے بنیادی اصولوں اور ضرورتوں کو منسوخ کرتی ہیں اور نہ انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کو چھوڑتی ہیں اور نہ اپنی تاریخ کے راستے سے الگ ہوتی ہیں۔ نہ ہے پرے سرحد اور اک سے اپنا مسجود، وہائے عالم میں نہ مرنے کی تمنا اور 'اجگر نا' کے اعلان کو ہم عصری چشمک سمجھنا چاہیے۔ یا ادیب کی ایسی خواہش جو ادب کو روندے ہوئے راستوں سے الگ کر لینے کی کوشش ہے۔ جو باتوں کو اپنی حسی، فنی، عقلی اور جذبی کیفیت میں سمو کر ایک نئی شکل میں ظاہر کرتی ہے۔ جہاں ماضی کا محاکمہ، تاریخ کی کڑیاں اور حال کی ماضی دانی ان تمام باتوں کا اتصال ہے اور جن کے باعث فن کار ادب کے میدان میں ایک نئی اور منفرد راہ پر چلتا نظر آتا ہے اور اس انفرادیت میں بھی مقبولیت انھیں تخلیقات کو میسر آتی ہے جنھوں نے کائنات کا درد اپنے اندر سمیٹ لیا ہو اور فن کے تمام متناسب اور متوازن اصولوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ تاریخ کی ان رؤں کو ساتھ لے کر آگے بڑھی ہوں جو کسی سیاسی سماجی نظام کی اندرونی تہوں میں بہا کرتی ہیں۔

اُردو میں ناول نگاری کی ابتدا

ایک نیا زاویۂ نظر

اقتدار عالم خاں

اُردو ناول نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کے اواخر میں ہوئی۔ اس سلسلہ میں بھی دو رائیں نہیں ہیں کہ مغرب کی ادبی روایات کی چھاپ اُردو ناول پر شروع سے ہی بہت گہری رہی ہے۔ جدید اُردو ناول ہیئت اور تیکنیک کے لحاظ سے فارسی یا اُردو "داستان" کی نسبت مغرب کی "ناول" سے زیادہ قریب ہے۔ ابتدائی ناولوں اور داستان گوئی کے ہمعصر نمونوں کے درمیان بھی بہت کم چیزیں مشترک ہیں۔ میر امّن کی "باغ و بہار" بھی جو اُردو میں آسان اور عام فہم نثر کے رواج کا پیش خیمہ مانی جاتی ہے اس کُلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ابتدائی ناولوں میں چند ایسی جزوی علامتیں یقیناً ملتی ہیں جو ان کا کسی حد تک فنِ داستان گوئی سے متاثر ہونا ثابت کرتی ہیں۔ مثلاً کرداروں کے نام ان کی خُوبیوں یا خرابیوں کی رعایت سے رکھنا یا بیان کو چٹپٹا بنانے کے لیے اشعار کا بے جا استعمال۔ لیکن یہ علامتیں بہت کم ہیں اور وقت کے ساتھ اور زیادہ کم ہوتی گئی ہیں۔ اس کے برخلاف جذبات نگاری، منظر کشی، مکالمے، کہانی کا عروج و زوال اور سب سے بڑھ کر کرداروں کا ان کے نفسیاتی پس منظر میں پیش کیا جانا ایسے عناصر ہیں جو اُردو ناول کو ایک نئی اور داستان سے قطعی الگ صنفِ ادب بناتے ہیں۔ مجموعی طور پر کسی ایسی درمیانی کڑی کا بھی پتہ نہیں ملتا ہے جس کے ذریعہ داستان اور ناول کے مابین ایک طرح کا ارتقائی تسلسل ثابت ہو سکے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُردو نثر نگاروں کے سامنے اس مخصوص صنف کو اپناتے وقت صرف مغربی ناول کی مثال تھی، اُردو یا فارسی کی ادبی روایات میں بعض ایسے عناصر موجود نہ تھے جو پیشِ نظر رہے ہوں؛ دُوسرے الفاظ میں اس سوال کو یُوں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ "کیا ہندوستانی زبانوں خصوصاً اُردو اور فارسی کے انیسویں صدی سے پہلے کے ادبی سرمایہ میں جدید ناول سے مشابہ کوئی ادبی فارم موجود تھی؟" بظاہر اس سوال کا جواب نفی میں ہے یہ دراصل ایک ایسا مفروضہ ہے جس کو اُردو ناول سے بحث کرتے وقت ہر نقاد پہلے سے ہی مان کر چلتا ہے اور اگر کوئی واقعہ یا مفروضہ اس کی کسوٹی پر پُورا نہ اُترے تو اسے غیر معتبر تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں منشی سجاد حسین کے شائع کردہ ناول نشتر کی بابت وقتاً فوقتاً جو بحث ہوتی رہی ہے مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

سنہ ۱۸۹۴ء میں منشی سجّاد حسین نے اپنی کتاب نشتر اس تمہید کے ساتھ شائع کروائی کہ وہ ایک فارسی قصّہ کا ترجمہ ہے جس کو ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰-۹۱ء) میں ایک شخص سید حسن شاہ نے قلم بند کیا تھا۔ فارسی قصّہ کا ۱۲۱۷ھ کا نقل شدہ ایک قلمی نسخہ منشی سجاد حسین کے پاس تھا جو اب ناپید ہے۔ دورِ جدید کے اکثر ناقدین نشتر کا کسی پُرانے فارسی قصّہ سے ترجمہ مشکوک تصوّر کرتے ہیں۔ سب نے اس کتاب کو ایک جدید طرز "کا ناول" قرار دیا ہے اور انیسویں صدی کے اواخر کی ناول نگاری کا نمائندہ شاہکار تسلیم کرتے ہوئے اس کی مخصوص تکنیک کی روشنی میں ادبی رُجحانات کی بابت فیصلے قائم کیے ہیں۔ اس رویہ کی پُشت پر دراصل مندکرہ بالا مفروضہ ہی کار فرما ہے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر اختر انصاری کے بعض ارشادات، خصوصاً دلچسپ ہیں جن کو اگر یہاں پیش کیا جائے تو چنداں بے جا نہ ہوگا۔ پروفیسر صاحب موصوف اپنے

مضمون "اُردو ناول کا آغاز اور ابتدائی نشو نما" کی ابتدا میں پہلے تو یہ کلیہ پیش کرتے ہیں کہ

"اُردو میں ناول کی ٹیکنیک یکسر انگریزی ادب کے اثرات کی مرہونِ منت ہے اور انگریزی ادب کے اثرات ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ہمارے ادب پر پڑنے شروع ہوئے۔"

پھر نشتر کے ضمن میں بحث کرتے ہوئے سوال اٹھاتے ہیں

"آخر نشتر کے بارے میں اس قسم کی قیاس آرائی کا کیا سبب ہے اور ایسی کون سی ضرورت آن پڑی کہ منشی صاحب کے بیان پر شک کیا جائے اور جس چیز کو وہ ترجمہ بتا رہے ہیں اسے طبع زاد تخلیق ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جائے۔"

اور خود ہی یہ جواب دیتے ہیں

"ناول کے پلاٹ کی نوعیت، قصے کا ارتقا، واقعات کا اُتار چڑھاؤ اور بہت سے ایسے ضمنی پہلو اور جزئی امور ایسے ہیں کہ ان کی بنا پر ترجمے والی بات مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ناول میں ایسی اندرونی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہے کہ یہ سچا واقعہ نہیں بلکہ افسانہ ہے۔"

موصوف آگے فرماتے ہیں

"ہم نشتر پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کرداروں کے عمل اور واقعات کے بہاؤ میں افسانہ نگار کے ذہن کی کارفرمائی صاف طور پر جھلکتی نظر آتی ہے۔ خصوصاً ناول کے آخری حصہ میں واقعات جو روش اختیار کرتے ہیں اور افراد جس انداز میں المناک انجام کی طرف بڑھتے ہیں (بلکہ یوں کہنا چاہیے ڈھکیلے جاتے ہیں) وہ صریحی طور پر افسانوی آرٹ کا مظاہرہ ہے۔ کوئی پڑھنے والا یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قصہ کی حرکت افسانہ نگار کی کوشش اور من مانی کارروائی کی مرہونِ منت ہے۔"

اور ایک بار یہ ثابت کرنے کے بعد کہ نشتر کسی "افسانہ نگار" کے ذہن کی پیداوار ہے مضمون نگار کو اس فیصلے پر پہنچتے دیر نہیں لگتی ہے کہ وہ "افسانہ نگار" منشی سجاد حسین ہی تھے۔ ان کا دھیان اس طرف نہیں جاتا ہے کہ ایک "افسانہ نگار" کے ذہن کی پیداوار ہونے کے ساتھ ساتھ نشتر کی بابت یہ بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ اسے سید حسن شاہ ہی نے ۱۷۹۰ء میں تصنیف کیا ہو۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو پھر جس مفروضہ کلیہ کی مدد سے انھوں نے اپنا مضمون کھڑا کیا ہے وہ ہی باطل قرار پا جائے گا۔ انھیں تب یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ مغربی اثرات کے ظہور سے پہلے کے ادبی سرمایہ میں بھی اگر ایسی تخلیقات نظر آتی ہیں جو تکنیک کے اعتبار سے جدید ناول سے مشابہ ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ اصل کہانی فارسی میں تھی۔ اٹھارویں صدی میں اردو اور فارسی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس زمانہ کی "ہندوستانی فارسی" کے ادبی رجحانات اردو کی ادبی وراثت کا ایک اہم حصہ

ماننے جاتے ہیں۔

اس بحث سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ اٹھارویں صدی میں مغربی اثرات سے مبرّا اور ایک آزادانہ اتفاقی عمل کے نتیجہ میں جدید ناول سے ملتی جلتی صنف وجود میں آچکی تھی جس نے آگے چل کر اُردو ناول کو پروان چڑھانے میں مدد دی۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن ایسا دعویٰ اس وقت تک بے بُنیاد اور عبث مانا جائے گا جب تک کہ اس مخصوص نقطۂ نظر سے "ہندوستانی فارسی" کے نثری سرمایہ کو پُوری طرح کھنگال نہ لیا جائے۔ میری عرض محض اتنی ہے کہ اُردو ناول کے آغاز کی بابت اب تک جو کلیّے قائم کیے گئے ہیں ہمیں ان کے سلسلے میں اس قدر غلو نہیں کرنا چاہیے کہ اگر ان کے خلاف کوئی واقعہ سامنے آئے تو اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ ایسا رویہ ظاہر ہے گمراہ کُن ثابت ہو سکتا ہے۔ نشتر سے متعلق بحث میں کچھ ایسا ہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا جس کی وجہ سے اب تک اس اہم ادبی شہ پارے کا صحیح مقام متعیّن نہ کیا جا سکا۔

نشتر کا ایک فارسی نسخہ کتبہ ۱۲۶۹ھ (۴۹-۱۸۴۸ء) قاضی محمد سعید صاحب (پٹنہ) کی ملکیت ہے۔ قاضی صاحب موصوف نے مخطوطات کی ایک مطبوعہ فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے۔ فارسی متن اور اُردو ترجمہ کے تقابل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے اصل قصّہ کو جُوں کا توں پیش کرنے کی پُوری کوشش کی ہے یہاں تک کہ محاورہ کے استعمال اور اندازِ بیان میں بھی اصل تاثر برقرار رکھنے کا پُورا اہتمام کیا گیا ہے۔ چند اختلافات جو نظر آتے ہیں وہ غیر اہم اور جزوی امور سے متعلق ہیں۔ مثلاً فارسی قصّہ میں حسن شاہ کے جدّی حالات سرے سے غائب ہیں جبکہ مُنشی سجاد حسین کے ترجمہ میں تمہید کے بعد اس موضوع پر ایک علیحدہ سُرخی قائم کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی نُسخہ کے کاتب نے جدّی حالات کو غیر ضروری تصوّر کرتے ہوئے حذف کر دیا ہے۔ دُوسری طرف فارسی قصّہ کی تمہید میں خُدا اور رسول کی تعریف و توصیف میں دو ڈھائی صفحات لکھے گئے ہیں۔ لیکن مُنشی سجاد حسین نے "بعد حمد و نعت" کہہ کر اس قصّے کو چند الفاظ میں ہی نپٹا دیا ہے۔ ایک اور جگہ حسن شاہ اور خانم جان کے نکاح اور شبِ عروسی کے بیان کو منشی صاحب نے تھوڑا سا بدل دیا ہے۔ حاشیہ میں اس کی وجہ یوں بیان کی ہے۔

"........ اندازِ بیان کو میں نے بہت سنبھالا ہے ورنہ مصنّف نے تو اس زمانہ کا کچھ خیال ہی نہ کیا تھا۔"

فارسی متن ملاحظہ کیجیے تو اندازہ ہو گا مُنشی سجاد حسین کا تذبذب جائز تھا۔ بہر حال ان چند جزوی اختلافات کے علاوہ جہاں تک میں جائزہ لے سکا ہوں دونوں قصّوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اُردو ترجمہ لفظ بلفظ فارسی کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ رائے کہ نشتر مُنشی سجاد حسین کی طبع زاد تصنیف ہو سکتی ہے خارج البحث ہو جاتی ہے مگر ایک حل طلب مسئلہ پھر بھی باقی رہتا ہے۔ دستیاب فارسی نُسخہ کی تاریخ کتابت ۱۲۶۹ھ ہے لیکن کتاب کا سن تصنیف ۱۲۰۵ھ بتایا گیا ہے۔ ہمارے پاس نشتر کے سنہ تصنیف کے معتبر ہونے کی کیا سند ہے؟ نشتر کی اندرونی شہادتوں کو اٹھارھویں صدی کے تاریخی و ادبی ماخذ کی روشنی میں پرکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہُوں کہ اس قصّہ کی اندرونی فضا بڑی حد تک اٹھارھویں صدی کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے اور اس کے زیادہ تر کردار تاریخی شخصیتوں سے عبارت ہیں بلکہ اصل قصّہ کا مرکزی پلاٹ بھی ایک حد تک حقیقی واقعات پر مبنی ہے۔

اس سے نشتر کا اٹھارھویں صدی کے اواخر کی تصنیف ہونا قطعی ثابت ہے لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے متذکرہ بالا تحقیق کو مختصراً پیش کر دیا جائے۔

(۲)

نشتر کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ کھوج لگانا ضروری ہے کہ فارسی قصہ کا مصنف سید حسن شاہ جس نے اس کہانی کو آپ بیتی کے طور پر قلم بند کیا کون تھا۔ منشی سجاد حسین کے شائع کردہ ترجمہ میں خود حسن شاہ کی زبانی اس کے خاندان کی جو تاریخ بیان کر دائی گئی ہے وہ ان حالات سے بہت مشابہ ہے جو محسن لکھنوی نے "سراپا سخن" (مصنفہ ۱۸۶۱ء) میں اپنے خاندان کی بابت درج کیے ہیں ان دو بیانات کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ محسن لکھنوی کے باپ سید حسین شاہ حقیقت اور نشتر کے مصنف سید حسن شاہ دونوں کے بزرگوں نے "عرنبان" سے آکر خوست میں توطن اختیار کیا۔ دونوں سید امیر کلال کی اولاد میں تھے۔ دونوں کے بزرگ فرخ سیر کے عہد میں لاہور آکر رہنے لگے۔ دونوں کے دادا کا نام سید عرب شاہ اور نانا کا حکیم محمد نواز تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ نشتر میں سید حسن شاہ اپنے ایک چھوٹے بھائی سید حسین شاہ کا ذکر کرتا ہے جس سے یہ بات قطعی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔

محسن لکھنوی نے سراپا سخن میں اپنے "جناب عموی صاحب سید حسین شاہ ضبط خلف رشید عرب شاہ۔" کا ذکر کیا ہے صحیح نام ظاہر ہے حسن شاہ ضبط ہونا چاہیے کیونکہ دو حقیقی بھائیوں کا ایک ہی نام ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ کاتب نے غلطی سے حسن کے بجائے حسین لکھ دیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ حسن شاہ ضبط اور نشتر کا مصنف ایک ہی شخصیت ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن شاہ فارسی میں حسن تخلص کرتا تھا۔ خانم جان کی موت پر نشتر کے مصنف نے اپنے قطعات میں یہی تخلص دیا ہے۔ اغلب گمان ہے کہ اس زمانہ کی عام روش کے مطابق حسن شاہ کے اردو اور فارسی میں مختلف تخلص تھے کیونکہ نشتر ایک فارسی تصنیف ہے اس لیے اس میں مصنف کا اردو تخلص نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ یہ تخلص نشتر کی تصنیف کے بعد اختیار کیا گیا ہو۔

اردو شعراء کے ابتدائی تذکروں میں حسن شاہ ضبط کے مختصر حالات ملتے ہیں جن کی مدد سے اس کی زندگی کا ایک دھندلا سا خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۸۱ء میں خانم جان والے حادثہ کے بعد حسن شاہ اپنے نانا کے ساتھ لکھنؤ آکر رہنے لگا۔ وہاں اس نے جرأت کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر باقاعدہ شعر و شاعری کی مشق شروع کر دی۔ غالباً اس ہی زمانہ میں اس نے ضبط تخلص اختیار کیا۔ حسن شاہ کا چھوٹا بھائی حسین شاہ جس نے آگے چل کر جرأت کے شاگردوں میں ایک نمایاں مقام پیدا کیا شاید پہلی بار اپنے بڑے بھائی کے توسط سے ہی لکھنؤ کے اس مخصوص ادبی حلقہ میں داخل ہوا تھا۔ حسن شاہ کے بقیہ حالات کی بابت صرف اس قدر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عمر کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہنگاموں میں دلچسپی کھوتا گیا اور بالآخر بڑھاپے میں فقیری اختیار کر لی۔ وہ ۱۸۳۴ء میں بقید حیات تھا اور لوگ اسے ایک درویش کی حیثیت سے جانتے تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے ۱۲۲۱ھ میں حسن شاہ

کا ذکر کرتے ہوئے اُسے ایک "باحیا" اور "صاف طبیعت" انسان قرار دیا ہے۔

سید حسن شاہ کی پہلی تصنیف شاید نشتر ہی تھی جو اس نے تقریباً بتیس سال کی عمر میں قلم بند کی۔ اس کی بعض دوسری تصنیفات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ محسن لکھنوی کی روایت کے مطابق حسن شاہ نے ایک کتاب "مرأۃ حیدری" اور رمل و جفر پر کئی منظوم رسالے بھی تصنیف کیے تھے لیکن اس کی شاعری کے صرف چند ہی نمونے ملتے ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر اکثر تذکروں میں نقل کیا گیا ہے۔

نقدِ دل وحشت میں کھو کر اک جنوں پیدا کیا
ہم نے بازارِ محبت میں یہ کیا سودا کیا

ایک اور تاریخی شخصیت جس کا ذکر نشتر میں ملتا ہے فرانسیسی نژاد افسر میجر پولیر تھا جو ایک مدت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اودھ میں تعینات رہا۔ وہ اودھ کی تہذیب کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس کا شمار اٹھارویں صدی کے ان یورپینوں میں کیا جاتا ہے جو ہندوستان آکر خود بھی نوابوں کی سی زندگی گزارنے لگے تھے۔ پولیر کی مرزا امنشی کا گواہ ایک ہمعصر نقش اب تک موجود ہے جس میں اسے شاہ شجاع الدولہ کی معیت میں مرغوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ ایک مُرغ خود اس کی بغل میں بھی دبا ہوا ہے۔ نشتر میں اس نام کے ہجے "ہولیر" ہیں۔ یہ محض کتابت کی غلطی ہے۔ اس نام کے سلسلے میں بعض دوسری کتابوں میں بھی یہی غلطی ہوئی ہے۔ ولی اللہ فرخ آبادی کی کتاب تاریخ فرخ آباد کے بعض نُسخوں میں بھی "پولیر" کے بجائے "ہولیر" درج ہے۔ مزید برآں محمد بخش آشوب کی کتاب تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہ اور پولیر کے خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۸۰-۸۱ء میں پہلے کانپور میں اور پھر چنار میں مقیم تھا جس سے "ہولیر صاحب" کی نقل و حرکت کی بابت نشتر کی فراہم کردہ اطلاعات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور ہمارا یہ خیال مزید محکم ہوتا ہے کہ نشتر میں جس "ہولیر صاحب" کا ذکر ہے وہ دراصل میجر پولیر ہی تھا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ نشتر میں "ہولیر" کے نام کے ساتھ اس کے فوجی عہدہ کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے جب کہ باقی دوسرے انگریز افسران کے سلسلہ میں اس چیز کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ایک لحاظ سے منفی شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمیں تاریخی ماخذ کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر میجر پولیر کو مئی ۱۷۷۶ء میں اپنے فوجی عہدہ سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔ ۱۷۷۹ء میں جب وہ کانپور آیا تو اس وقت تک گورنر جنرل کی کونسل نے اس کو معاف تو ضرور کر دیا تھا لیکن ابھی تک وہ اپنے پُرانے عہدہ پر بحال نہیں ہو پایا تھا۔ ظاہر ہے اس زمانہ میں اس کے نام کے ساتھ کوئی فوجی منصب نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس طرح ہولیر صاحب کی میجر پولیر کی حیثیت سے شناخت اور اس امر کا ثبوت ملا کہ وہ کانپور اور چنار گڑھ میں اسی دوران میں مقیم تھا جو کہ نشتر میں بیان کیا گیا ہے نہ صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کہانی کے اکثر کردار تاریخی شخصیتوں سے عبارت ہیں بلکہ کہانی کے بُنیادی ڈھانچہ کا حقیقی واقعات پر مبنی ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

نشتر میں اور بھی کئی ایسے کردار ہیں جن کو ماخذ کی مدد سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً حکیم شفائی اور حکیم میر محمد نواز اپنے زمانے کے خاصے جانے مانے لوگ تھے جن کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض انگریز افسروں کی شناخت بھی ممکن ہے۔ میں نے ان تمام افراد کے بارے میں تاریخی حوالے اور دیگر حالات اپنے ایک انگریزی مضمون میں درج کیے ہیں جو جلد ہی شائع

ہونے والا ہے۔ یہاں اس تحقیق کو مختصراً پیش کرنا ہی مناسب معلوم ہوا۔

ایک اور قسم کی اندرونی شہادتیں جو نشتر کا اٹھارویں صدی کے اواخر میں تصنیف ہونا ثابت کرتی ہیں اس زمانہ کے سماجی اور سیاسی حالات کی وہ جھلکیاں ہیں جو جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ مثلاً کمپنی کی فوجی چھاؤنیوں کے حالات اور تنظیم کے بارے جو اشارے ملتے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ بیان نہ صرف کسی ہمعصر شخص کا ہے بلکہ ایک ایسے شخص کا بھی ہے جو نشتر کے مصنف حسن شاہ کی طرح خود بھی چھاؤنی کی تنظیم سے متعلق تھا۔ حسن شاہ کے بیان سے صاف عیاں ہے کہ لشکر کے روزمرہ کے اخراجات کے لیے کانپور کے مہاجنوں سے قرضہ لے کر کام چلایا جاتا تھا۔ مئی ۱۷۸۱ء میں خانم جان کی کانپور سے روانگی کے وقت یہ خبر پھیل چکی تھی کہ لشکر کے پورب جانے کا حکم کلکتہ سے آگیا ہے۔ حسن شاہ جو اس زمانہ میں حساب فہمی پر مامور تھے اس قدر مشغول نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی محبوبہ خانم جان کے ساتھ فرار ہو جانے کے منصوبے کو بروئے کار نہ لاسکے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کم سے کم کانپور کے تجارتی حلقوں میں کمپنی کی ساکھ بہت گر گئی تھی۔ حالت یہ تھی کہ جب حسن شاہ نے خانم جان سے ملنے کے لیے لکھنؤ کے سفر کا ارادہ کیا تو کانپور کے مہاجنوں کو شک ہوا کہ ان کی نیت میں فتور ہے۔ اس سلسلہ میں انھیں جو زحمت اٹھانی پڑی خود ان کی زبانی سن لیجیے۔ فرماتے ہیں:

> "جن لوگوں کا لینا دینا باقی تھا میرے لکھنؤ جانے کی خبر سن کے جمع ہو گئے۔ ہر چند میں نے اُن کو سمجھایا مگر کسی طرح نہ مانے آخر ش ان کا حساب چکانے پر آمادہ ہو گیا۔"

تاریخی مآخذ سے نشتر میں دیے ہوئے ان حالات کی تائید ہوتی ہے۔ خود گورنر جنرل نے ۸۲-۱۷۸۱ء میں کمپنی کی مالی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے اعلان کیا تھا:

> "کمپنی کی ساکھ اتنی گر گئی ہے کہ فوجوں کے روزانہ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے مناسب رقموں کا قرض ملنا مشکل ہو گیا ہے۔"

اسی طرح ڈیرے دار طوائفوں کے چھاؤنی میں قیام اور فوجی افسران کے ساتھ اُن کے تعلقات کے بارے میں نشتر کے بیان سے جو تصویر نکلتی ہے ہمعصر ماخذ اس کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ سیموئل ہیکس جس نے ۱۷۷۷ء اور ۱۷۸۵ء کے درمیان ہندوستان کی سیر کی اپنے "سفر نامہ" میں لکھتا ہے کہ جب وہ جنرل گوڈرڈ کے لشکر کے ہمراہ تھا تو اُس نے دیکھا کہ طوائفوں کے ڈیروں کے لیے باقاعدہ طور پر ایک علیحدہ دائرہ ہوا کرتا تھا جس کو کیمپ کی عام اصطلاح میں "لول بازار" کہا کرتے تھے بعض اوقات "لول بازار" کے مکینوں کے لیے حفظانِ صحت اور طبی امداد بھی لشکر کے ڈاکٹروں کی ذمہ داری مانی جاتی تھی۔ اس قسم کی اندرونی شہادتوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ یہاں مختصراً یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ نشتر میں اٹھارھویں صدی کے اواخر کے حالات کی بعض نہایت واضح اور دلچسپ جھلکیاں ملتی ہیں جن سے اس کا ۹۱-۱۷۹۰ء کی تصنیف ہونا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا تحقیق سے اتنا تو واضح ہے کہ اس قصہ کا مرکزی پلاٹ مصنف کے بعض حقیقی تجربات کے چاروں

طرف گھومتا ہے۔ لیکن پروفیسر اختر انصاری کی اس رائے میں بھی بڑی حد تک صداقت ہے کہ یہ قصہ کسی "افسانہ نگار" کے ذہن کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ خود حسن شاہ کے اپنے بیان کے مطابق یہ واقعہ ۱۷۸۱ء کا ہے جس کو اس نے تقریباً دس سال بعد ۹۱-۱۷۹۰ء میں قلم بند کیا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے اپنے اور خانم جان کے جو خطوط نقل کیے ہیں وہ حقیقی ہوں۔ خطوط کی زبان اور بیان کا فرق بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھیں دو مختلف شخصوں نے لکھا ہے۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ تمام مکالمے اور ضمنی واقعات جو مجموعی تاثر کے نقطۂ نظر سے بڑے اہم ہیں پندرہ برسوں کے بعد بھی مصنف کے ذہن میں اتنے تازہ رہے ہوں کہ وہ انھیں لفظ بلفظ قلم بند کر سکتا۔ تفصیلات کے بیان میں کیف و اثر پیدا کرنے کے لیے یقیناً فنکارانہ تخیل کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس کوشش میں بعض فرضی کردار بھی تخلیق کیے گئے ہیں۔ مثلاً خانم جان کے خانساماں کا لڑکا رحم اللہ جو اس کے خطوط حسن شاہ کے پاس پہنچاتا ہے ایک فرضی کردار معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اتنا چھوٹا ہے کہ ادھر ادھر کھیلنے پھرنے کے سوا اس کا کوئی کام نہیں ہے لیکن دوسری طرف جب وہ خانم جان کے ایما پر حسن شاہ کی تھاہ لینے کے لیے اس سے باتیں کرتا ہے تو بوڑھی کٹنیوں کے کان کترتا نظر آتا ہے۔ اگر کوئی اتنا چھوٹا بچہ جس کے ابھی کھیلنے کودنے کے دن ہیں رحم اللہ کی سی مدلل اور پختہ باتیں کرنے لگے تو لوگ اسے شاید جن سمجھ بیٹھیں۔ بہر حال شروع سے آخر تک رحم اللہ کا یہی انداز ہے مصنف نے رحم اللہ کے کردار کو بامعنی بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کے جذبات اور احساسات کو کہانی میں پنہاں المیہ سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ اس کے سپرد بس اتنا کام ہے کہ مرکزی کرداروں کے درمیان تعلق ختم نہ ہونے دے جسے وہ نہایت تندہی سے انجام دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ حسن شاہ کو خانم جان کے آخری لمحوں کا حال بھی رحم اللہ کے ذریعہ ملتا ہے۔ مصنف نے دراصل روایاتی نامہ بر اور راز دار کے کردار کو ایک مثالی روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ رحم اللہ کے لیے "سگ لیلیٰ" کا استعمال کہانی میں اس کے صحیح مقام کو بخوبی واضح کر دیتا ہے۔ کہانی کے اختتام پر رحم اللہ کو ان الفاظ کے ساتھ اسٹیج سے اتارا جاتا ہے:

> "راستے میں دس روپے رحم اللہ کو دیے' اور اس سے کہا کہ تیرے والدین فضامند ہوں تو میرے ساتھ چل ورنہ جس وقت تیرا جی چاہے میرے پاس آ جانا۔ میں ہمیشہ تیری خدمت سے باہر نہ ہوں گا۔ تو میرا اور مرحومہ کا راز دار ہے۔ مجھے خاطر داری لازم ہے۔"

خانم جان کے انتقال کے بعد یوں تو کہانی ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن ہر کردار اپنے مخصوص انداز میں آہستہ آہستہ نظروں سے اس طرح اوجھل ہوتا ہے کہ آخر تک اس کی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ بس ایک رحم اللہ کے سلسلہ میں یہ رعایت نہیں رکھی گئی ہے جیسے ہی اس کا کام ختم ہوتا ہے اسے اپنی کارگزاری پر انعام ملتا ہے۔ پیٹ ٹھونکی جاتی ہے اور پھر اسٹیج سے نیچے اتار دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کہ کہانی کے ہر موڑ پر وہ ایک اہم رول ادا کرتا نظر آتا ہے مرکزی واقعہ میں رحم اللہ کا کوئی مخصوص مقام نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی انفرادیت ہے۔ یہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ محض ایک خیالی کردار ہے جس کو ایک مثالی رول

ادا کرنے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ دوسرے کردار چونکہ زندہ شخصیتوں سے عبارت ہیں اس لیے جذبات و خیالات کے تصادم کے نتیجہ میں ان کی شخصیتوں کے ارتقا کو افسانہ نگار نظر انداز نہیں کر پاتا ہے۔ لیکن وہ بھی تخلیقی عمل کے اثرات سے قطعی مبرا نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مصنف کے تخیل اور جمالیاتی وجدان کے ہاتھوں بن سنور کر سامنے آتا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ نشتر اٹھارھویں صدی کے اواخر کی تصنیف ہونے کے ساتھ ساتھ افسانوی تخلیق کا ایک اعلیٰ نمونہ بھی ہے تو چنداں بیجا نہ ہوگا۔

(۳)

اب ہم دوبارہ اس بحث کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس کو مضمون کی ابتدا میں اٹھایا گیا تھا۔ نشتر کی بابت مندرجہ بالا تحقیق سے یہ واضح ہے کہ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں جب کہ مغربی ادب کے اثرات ابھی پوری طرح ظاہر ہونے شروع نہیں ہوئے تھے۔ کم سے کم ایک کہانی ایسی تخلیق کی گئی جو افسانوی ادب کے تمام لوازمات کو پورا کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افراد کی داخلی کیفیات کو موضوع بنا کر عام زندگی کے بنیادی المیہ کے چاروں طرف ایک مکمل اور بھرپور افسانہ کی تخلیق ایسے حالات میں بھی ممکن تھی جب کہ مغربی ادب کی مثال سامنے نہ رہی ہو۔ اس کے بعد ہم کس طرح جدید ناقدین کی اس رائے کو پوری طرح صحیح مان سکتے ہیں کہ

"اردو ناول کی تکنیک یکسر انگریزی ادب کے اثرات کی مرہونِ منت ہے۔"

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اردو کے ابتدائی ناول نگاروں کے سامنے نشتر یا اسی قسم کے دوسرے فارسی قصوں کی مثال بھی رہی ہو جو نشتر کی طرح ہر معنی میں "قدیم داستان" سے مختلف ہوں اور ناول نگاری کی شرائط کو بھی پورا کرتے ہوں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اٹھارھویں صدی میں نشتر سے ملتے جلتے اور کون سے قصے لکھے گئے اگر اس قسم کی چند اور مثالیں ہاتھ آجائیں تب ہی یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ مغربی اثرات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے ہی "ہندوستانی فارسی" میں جدید ناول سے مشابہ ایک تکنیک وجود میں آچکی تھی۔

ذاتی طور پر میرا گمان یہ ہے کہ ایسی کئی کہانیاں، حکایتیں اور آپ بیتیاں موجود ہیں جو ہندوستانی فارسی کے اس مخصوص ادبی رجحان کی نشان دہی کرتی ہیں۔ میں ذیل میں اس قسم کے تین قصوں کا ذکر کروں گا جو محض اتفاق سے میری نظر سے گزرے۔

اس زمرے میں سب سے دلچسپ اور نشتر سے مشابہ ایک عشقیہ داستان ہے جس کو ۱۸۰۶ء یا ۱۸۰۷ء میں تصنیف کیا گیا۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ ہر چند یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کون تھا لیکن بعض ایسے افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے جن کی تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ مصنف جو غالباً ڈیرہ غازی خان کا رہنے والا تھا اس واقعہ کو آپ بیتی کے طور پر بیان کرتا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ اس کہانی میں سب سے اہم کردار لالہ ہری سنگھ کا ہے جو مصنف کا راز دار اور ہم مشرب تھا۔ ایک شخص حاجی میر خان نے بالجبر ہیروئن کو اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن بعض امرا کی مہربانی اور بروقت مدد نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ بالآخر ملتان کے افغان صوبہ دار مظفر خان نے مصنف اور اس کی محبوبہ کی

مدد کی اور اُنھیں پناہ دی۔ یہ کہانی نشتر کی طرح سیدھی سادی عام فہم نثر میں لکھی گئی ہے اور ایک مکمل ناول کے تمام شرائط پورے کرتی ہے۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر کے مشہور مبیوری لُٹیرے ڈھوڈوجی کے فارسی حالات کا ایک قلمی نُسخہ انڈیا آفس کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ قیاس یہ ہے کہ اس کی بھی تصنیف اٹھارھویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ قِصّہ بھی ان فارسی قصّوں کے زمرے میں شامل کیا جائے گا جو ناول کی ٹیکنیک کی لوازمات کے ایک ایک حد تک حامل ہیں۔

ایک اور قِصّہ جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا "قِصّہ سلطان محمود" ہے۔ اس کے قلمی نُسخے بانکی پور لائبریری (پٹنہ) اور پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ سرسری طور پر دیکھیے تو یہ قِصّہ سُلطان محمود غزنوی سے متعلق فرضی داستانوں کے لامتناہی سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے لیکن بغور مُطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ سُلطان محمود کا نام محض علامتی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اصل میں یہ قِصّہ افلاطونی محبّت کے مسئلہ سے متعلق ایک بھرپور افسانہ ہے جس میں مصنّف نے نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں کرداروں کے جذباتی عمل کے ذریعہ اس مسئلہ کے مُختلف پہلوؤں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک سوداگر کا بیٹا ہے جو عہدِ طفلی میں وزیر کی بیٹی کا ہم مکتب تھا۔ اس زمانہ سے دونوں ایک دُوسرے سے محبّت کرتے ہیں۔ ان کے درمیان لگاؤ کی اصلُ بُنیاد ان دونوں کی گہری مذہبیت اور علم دوستی ہے۔ وہ جوان ہونے کے بعد سماج کی نظروں سے چھُپ کر ایک دُوسرے سے اس لیے ملتے ہیں کہ اکٹھے تلاوتِ قرآن کرسکیں یا کسی اور طرح خدا سے لو لگائیں۔ ایک بار سُلطان محمُود بھیس بدل کر رات کے وقت شہر کا گشت کر رہا تھا کہ اس نے سوداگر کے بیٹے کو وزیر کے مکان کی چھت پر چڑھتے ہوئے پکڑ لیا۔ سُلطان نے نوجوان کو بتایا کہ وہ کوتوال شہر ہے اور اب وہ اسے اگلے دن سُلطان کے حضور میں پیش کرے گا۔ نوجوان کو یقین ہوگیا کہ سلطان اسے چور قرار دے کر دار پر کھچوا دے گا۔ نوجوان نے اپنے ایک دوست کی ضمانت پر اس رات کے لیے رہائی حاصل کی اور کسی طرح اپنے مطلوب تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ جب لڑکی کو معلوم ہوا کہ یہ اُن دونوں کی آخری مُلاقات ہے اور کل اس کے محبوب کو سلطان چور قرار دے کر قتل کروا دے گا تو اُس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اُس نے اپنے عاشق کو گناہ کی ترغیب دی۔ اُس کا استدلال یہ تھا کہ جب ہماری پاک محبّت کا یہی صِلہ ملنا ہے تو پھر کیوں نہ ایک بار دل کے حوصلے نکال لیے جائیں۔ لیکن نوجوان نے اپنے اندر کمزوری نہیں پیدا ہونے دی اور اُس نے لڑکی کو سمجھایا کہ انسان کو اس قسم کی آزمائش میں پڑ کر اپنے اصولوں کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ جب نوجوان کی پاکبازی اور اصول پرستی سُلطان پر عیاں ہوئی تو اس کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ سُلطان نے اپنے خرچ سے اس کی شادی وزیر کی لڑکی کے ساتھ کروا دی۔ اس کہانی میں جس طرح مکالموں کی مدد سے کرداروں کے داخلی تضادات کو اُبھار کر اخلاقیات کے ایک اہم مسئلہ پر "خیر و شر" کے ٹکراؤ کو بھی پیش کیا گیا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ہم کسی طرح بھی اس کہانی کو ان روایاتی حکایتوں یا داستانوں کی صف میں نہیں رکھ سکتے ہیں جن میں افراد کی

داخلی کیفیات سے یکسر مبرّا ہو کر محض حالات اور اشیاء کے بیان کے ذریعہ پلاٹ تیار کیا جاتا ہے۔ قصّہ سلطان محمود ہر طرح سے ناول یا افسانہ کی تیکنیک کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

ان کہانیوں کی طرف اب تک دھیان نہ دیے جانے کی وجہ شاید یہ رہی ہے کہ وہ جس زبان میں لکھی گئیں اس کو فارسی داں حلقوں میں عموماً غیر ادبی اور لچر قرار دیا جاتا رہا ہے۔ لوگوں نے ایک عرصہ تک ان کہانیوں کو پڑھا ضرور لیکن کسی نے ان کو چھاپنے یا ادبی سطح پر پرکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی زبان ہیں بعض لوگ "کچوری" کی بو سونگھنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ حال اُنیسویں صدی کے وسط تک رہا۔ اس کے بعد اُردو نثر اتنی تیزی سے پھیلی کہ فارسی کی طرف سے لوگوں کا دھیان ہٹ گیا۔ جو لوگ پھر بھی فارسی نثر میں دلچسپی لیتے رہے وہ اکثر اوقات ذہنی لحاظ سے اسی تعصب کا شکار تھے جس کی بنا پر اب سے پہلے ہندی آمیز سلیس فارسی کو ادب کے دائرہ سے خارج کر دیا گیا تھا۔ عہدِ جدید میں یونیورسٹی کے اسکالروں کو شعرا کی سوانح تیار کرنے اور کلاسیکی عہد کی کتابوں کی تصحیح کرنے سے فرصت نہیں ملی کہ ہندوستانی فارسی میں نثر کے بدلتے ہوئے اسالیب اور اُن کے اثرات کا سائنٹفک ڈھنگ سے مطالعہ ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قصے جن کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا قعرِ گمنامی میں پڑے رہے اور کسی نے اُردو کے نثری ادب پر ان کے دُور رس اثرات کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ یہ قابلِ غور امر ہے کہ نشتر اسی وقت چھپ سکی جب اس کا اُردو میں ترجمہ ہو گیا۔ فارسی قصّہ تقریباً سو سال تک قلمی نسخوں کی صورت میں موجود تھا اور بعض لوگوں کی تفریح طبع کا سبب بھی بنتا تھا لیکن کسی نے بھی اسے چھاپنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ زمانہ دراصل فارسی میں انتہائی تنگ نظری کے عروج کا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ ہندی آمیز فارسی کو زبان ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ غالب کو قتیل کی سند ماننے سے اس لیے انکار تھا کہ وہ نو مسلم تھا۔ انھیں اپنی فارسی دانی کا سکّہ بٹھانے کے لیے پہلے تو ایک فرضی استاد کا ڈھونگ رچانا پڑا اور پھر اس کے "ولایتی" ہونے کا ڈھنڈورہ پیٹنا پڑا۔

مُغل عہد میں اور اس کے بعد کمپنی کے دورِ حکومت میں ایک عرصہ تک فارسی سرکاری دفاتر کی زبان رہی بلکہ مُلک کے ایک بڑے حصّہ میں کاروباری خطوط اور حسابات بھی اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ اس عمل نے قدرتی طور پر فارسی نثر میں ایک عام فہم اور ہندی آمیز طرزِ نگارش کا رُجحان پیدا کیا جو اٹھارھویں صدی کے اواخر تک پوری طرح نکھر چکا تھا۔ یہ وہ زبان تھی جس میں کلاسیکی فارسی کے مرصّع اور مسجّع انداز سے ہٹ کر اپنی بات کو سیدھے اور واضح طور پر کہنے کا طرز اختیار کیا گیا تھا۔ گو ادبی حلقوں میں اس زبان کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا لیکن "کم پڑھے لکھے" فارسی داں لوگوں نے جن کی مادری زبان ہندی یا اُردو تھی اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار کا اس کو ذریعہ بنایا اور اس طرح ایسے ادبی نمونے سامنے آنا شروع ہوئے جو فارسی الفاظ اور گرامر کے استعمال کے باوجود اُردو روزمرّہ سے زیادہ قریب تھے۔ یہ رُجحان ایک عرصہ تک اس لیے اور فروغ حاصل کرتا رہا کہ خود اُردو میں نثر نگاری کی ابتدا دیر میں ہوئی اور جب اُردو میں نثر لکھی بھی جانے لگی تو ایک عرصہ تک اُردو میں بھی کلاسیکل فارسی کی نقل میں مرصّع نثر کا فیشن رہا۔ ادبی حلقوں کے ہندی آمیز

فارسی کی طرف سے حقارت کے رویّہ کے باوجود یہ نثر کئی صدیوں تک لکھی جاتی رہی۔ مغل عہد کے بعض مآخذ خصوصاً یادداشتیں، سفرنامے، حکایتیں، لطائف اور انشائیہ نثر کے بعض مجموعے جو اب بھی قلمی کتب کے اکثر ذخیروں میں مل جاتے ہیں اسی زُمرے میں آئیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سلیس نثر میں انگریزی کتب اور دستاویزات کے اُردو تراجم کا کام شروع ہوا تو اس وقت فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کے سامنے انگریزی نثر کے نمونوں کے علاوہ ان سے زیادہ کارآمد اور قابلِ تقلید مثال ہندوستانی فارسی کی نثر کی تھی جس سے وہ بخوبی واقف تھے بلکہ اکثر اوقات اپنے ذاتی کاموں میں اسے استعمال بھی کرتے تھے۔ یہ فارسی نثر اصلیت میں اُردو روز مرّہ کا چربہ ہی تھی اور اس لیے وہ سلیس اُردو میں جملے بنانے اور اُنھیں ایک دُوسرے کے تسلسل میں لکھنے کا ڈھنگ سکھانے کا ایک بہت موثر ذریعہ بن سکتی تھی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جدید اُردو نثر پر بھی ہندوستانی فارسی کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ ان اثرات کی واقعی اہمیت کا اب تک پُوری طرح اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔ ہم نے محض قیاس آرائی اور کسی حد تک ذہنی تساہل پسندی کی بنا پر اس مفروضہ کو اپنا ایمان بنا لیا ہے کہ اُردو میں سلیس نثر کی ابتدا انگریزی کے اثر کے نتیجہ کے طور پر ہوئی۔

میرے خیال میں جدید طرز کی افسانہ نگاری یا ناول نویسی کے رائج ہونے کے لیے سب سے بڑی شرط سلیس نثر کا وجود میں آنا تھا چونکہ سلیس نثر ہندوستانی فارسی میں پہلے رائج ہوئی اس لیے اُردو سے بہت پہلے ہندوستانی فارسی میں افسانے اور ناول کے انداز کی چیزیں لکھی گئیں۔ اس سلسلہ میں کسی باہری اثر وغیرہ کا پہلے سے موجود ہونا کوئی قید نہیں ہے۔ اُردو میں سلیس نثر کا فروغ انگریزی ادب کے اثرات کے ساتھ ہوا اس لیے اُردو ناول اور افسانے کی ابتدا اور آغاز کا زمانہ بھی وُہی رہا جب ہندوستان میں انگریزی ادب سے واقفیت بڑھ رہی تھی۔ یہ محض ایک تفاق تھا۔ اس بنا پر ہم کوئی فیصلہ تب تک نہیں کر سکتے ہیں جب تک مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر بخوبی غور نہ کر لیا جائے اور اس سلسلہ میں ایک غور طلب مسئلہ یہ بھی ہے کہ کس حد تک ابتدائی عہد میں اُردو ناول نگاری کو فارسی کے ان قصّوں نے متاثر کیا جن کی نمائندگی نشتر کرتی ہے۔ کسی قطعی رائے پر پہنچنے سے پہلے ضروری ہوگا کہ مندرجہ ذیل مسائل پر مزید تحقیق کی جائے۔

۱۔ نشتر کی قسم کے دُوسرے فارسی قصّوں یا حکایتوں کا پتہ چلایا جائے اور ان کا فنّی نقطۂ نظر سے تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔

۲۔ ابتدائی اُردو ناولوں کا ان قصّوں سے تقابل کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ مغربی ناول کی نسبت وہ ان قصّوں سے کس حد تک قریب ہیں۔

۳۔ مختلف ابتدائی اُردو ناول نگاروں کی ذاتی تعلیم اور انگریزی ادب سے ان کی واقفیت کا اندازہ لگایا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ اُنھوں نے دراصل کس حد تک انگریزی ناول کی ٹیکنیک سے استفادہ کیا۔

اگر میرا یہ مضمون ان تینوں نکتوں پر مزید غور اور تحقیق کی ضرورت کو واضح کرتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

شامِ غریباں

ایک نادر مخطوطہ

محمد اکبر الدین صدیقی

لچھمی نرائن شفیق کے اجداد کا تعلق لاہور سے تھا۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ دکن آئے اور اورنگ آباد کو وطن بنالیا۔ اُن کے والد رائے منارام مآثر نظامی کے مصنّف تھے۔ شفیق نے بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اورنگ آباد میں کئی تذکرے لکھے گئے لیکن شفیق کے بارے میں کسی نے نہ لکھا اس لیے کہ تذکروں کی تالیف کے وقت وہ ابھی بیس سال کے بھی نہ ہوئے تھے۔ نتائج الافکار (۱۲۵۷ھ) کے مصنّف نے شفیق کے حالات اور فارسی کلام کا نمونہ دیا ہے اور ان کے تذکروں گلِ رعنا اور شامِ غریباں کا ذکر کیا ہے۔ ۱۳۲۹ھ میں "تذکرہ شعرائے دکن" شایع ہوا۔ اس میں عبدالجبار خاں ملکاپوری نے ان دونوں تذکروں کے علاوہ چمنستان شعرا کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ مآثر آصفی، مآثر حیدری، بساط الغنایم، مرأت الہند، نخلستان و تذکرۂ باباگرونانک کے نام وغیرہ لکھ دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ شفیق نے اور بھی کتابیں ضرور لکھی تھیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے جب ۱۹۲۸ء میں چمنستانِ شعرا شایع کیا تو شامِ غریباں کے بعد گلِ رعنا کا تذکرہ کیا اور دیگر تصانیف میں "حقیقت ہائے ہندوستان" "تمیق شنگرف" اور حالات حیدرآباد کا اضافہ کیا ہے۔ عمر یافعی مرحوم نے شفیق کی ایک مثنوی تصویر جاناں کا تعارف رسالہ تجلّی حیدرآباد کے ذریعہ کرایا جو بعد کو مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے شایع ہوئی ہے لیکن اس کے مقدّمے میں شفیق کی کسی نئی کتاب کا ذکر نہیں البتہ شفیق کا سنہ وفات (۱۲۲۳ھ) دیا ہے۔ یوسف علی خان صاحب آج کل مآثر آصفی کی تدوین میں مصروف ہیں۔ صاحب موصوف نے شفیق کی مزید پانچ کتابوں یعنی خلاصۃ الہند، امرت کنڈہ، سوسن دہ زبان، مثنوی اقسامِ نسواں اور تحفۂ احباب کا پتہ چلایا ہے۔ یا تو کتابیں ملی ہیں یا ان کے نام۔ عبدالرزاق صاحب عرشی مالک کتب خانہ درگاہ یوسفین کے کتب خانہ میں شفیق کا ایک کشکول یا بیاض تھی جس کو اس نے چمنستانِ اشعار کا تاریخی نام دیا تھا۔ یہ مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب تھا۔ کتب خانہ سالار جنگ میں "خرقہ صد پارہ" نام کی ایک کتاب فارسی میں پند و نصائح پر شفیق کی تصنیف ملتی ہے۔ پروفیسر سیّد محمد صاحب نے اپنے مضمون لچھمی نرائن شفیق میں ان ناموں کے علاوہ کسی اور کتاب کا نام نہیں دیا۔ شامِ غریباں کے مطالعہ سے اس فہرست میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہوتا ہے۔ شفیق کے الفاظ میں

"مخفی نماند کہ بندہ شفیق جواہر زواہر فام کتاب مستقل پنج ہزار بیت در مناقب آنجناب (میر غلام علی آزاد بلگرامی) بقید کتابت آوردہ ام۔" اس کتاب کا ابھی تک کوئی نسخہ دریافت نہ ہوسکا اس کے بعد اس کے اردو اور فارسی علیحدہ علیحدہ دیوان ہیں۔ اس طرح اس کی تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

چمنستانِ شعرا[۱]، گلِ رعنا[۲]، شامِ غریباں[۳]، مآثر آصفی[۴]، مآثر حیدری[۵]، انبساط الغنایم[۶]، مرأت الہند[۷]، حقیقت ہائے ہندوستان[۸]، تمیق شنگرف[۹]، حالات حیدرآباد[۱۰]، خلاصۃ الہند[۱۱]، امرت کنڈہ[۱۲]، تحفۂ احباب[۱۳]، تذکرہ باباگرونانک[۱۴]، نخلستان[۱۵]، سوسن دہ زبان[۱۶]، مثنوی

اقسامِ نسواں[17]، چمنستان اشعار[18]، خرقہ صد پارہ[19]، جواہر زواہر[20]، دیوانِ فارسی[21]، دیوانِ اردو[22]، شامِ غریباں ایسے شعرا کا تذکرہ ہے جو ایران سے ہندوستان آئے اور بابر بادشاہ سے لے کر محمد شاہ، شاہ عالم تک کے درباروں میں باریاب ہوئے اور دکن میں بہمنی دربار میں اور پھر اس کی جانشین سلطنتوں یعنی نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں سے متوسل رہے۔ بعض ایسے شعرا بھی ہیں جنھیں کسی دربار میں بار پانے کا موقع نہ ملا یہ شعرا یا تو یہاں رہ بس گئے یا واپس چلے گئے۔

اس مخطوطہ کے دو اور نسخوں کا پتہ چلا ہے۔ ایک علی گڑھ میں انجمن کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا اورینٹل کالج لاہور کے کتب خانے میں۔ انجمن کا نسخہ اوّل و آخر ناقص ہے اور لاہور کا نہ صرف اوّل و آخر ناقص بلکہ آب زدہ بھی ہے اور اکثر جگہ پڑھنا مشکل ہے۔ اس طرح میرے پیشِ نظر جو نسخہ رہا وہ مکمل اور نہایت عمدہ حالت میں ہے۔ اس کی کوئی نقل بانکی پور، رام پور اور بمبئی میں یا حیدر آباد کے کسی کتب خانہ میں موجود نہیں۔ اس لیے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

اس تذکرہ میں جملہ ۴۸۳ شعرا کا ذکر ہے۔ یہ تعداد مکمل نہیں کہلائی جا سکتی اس لیے کہ دکن ہی میں کئی ایسے شعرا کے نام ملتے ہیں جو دکن کے درباروں سے وابستہ رہ چکے ہیں لیکن اکثر تذکرے ان کے بارے میں خاموش ہیں۔ شفیق نے اس کمی کو دور کرنے کے لیے یہ تذکرہ تالیف کیا۔ اس کی تالیف کے وقت متعدد تذکرے اور کتب تواریخ زیرِ مطالعہ رہے ہیں جن کا اس نے نہایت دیانتداری سے حوالہ دیا ہے۔ چند تذکرے اور تاریخ کی کتابیں حسب ذیل ہیں:

تذکرہ طاہر نصیر آبادی، مجمع النفائس۔ آرزو۔ تذکرہ صبح صادق میرزا صادق۔ تذکرہ نظم گزیدہ ناظم تبریزی۔ میخانۂ قزوینی، مراۃ الخیال شیر خاں لودی، کلمات الشعرا محمد افضل سرخوش، عرفات العاشقین تقی الدین اوحدی اور اپنے استاد میر غلام علی آزاد کے تذکرے ید بیضا، خزانۂ عامرہ، سروِ آزاد اور غزلان الہند، یہ سب تذکرے آج ہندوستان کے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔ ان میں بعض طبع ہونے کے باوجود بھی بے حد کمیاب ہیں۔ تاریخی کتب میں امین رازی کی ہفت اقلیم اور ابو طالب کلیم، محمد صالح اور عبدالحمید لاہوری کے شاہجہاں ناموں یا شاہناموں کا ذکر ملتا ہے۔

متذکرہ بالا تذکروں کے علاوہ اس میں ایک اور تذکرہ "مرأت واردات" کا حوالہ موجود ہے۔ اس کا مصنف شاہ محمد شفیع نگینی ہے۔ یہ نگینہ ڈاکٹر نذیر احمد خاں کا وطن ہے۔ اس تذکرہ کا نہ کسی اور تذکرہ نگار نے حوالہ دیا ہے نہ کہیں اس کا نام مخطوطات کی فہرست میں نظر سے گزرا۔ غالباً یہ ناپید ہو چکا ہے۔ اس کے حوالے سے جو باتیں شفیق نے بیان کی ہیں وہ کسی اور تذکرہ میں نہیں ملتیں۔

شفیق نے ایک خاص اہتمام یہ بھی کیا ہے کہ شعرا نے جو کتابیں تصنیف و تالیف کیں ان کے نام دے دیے اگر انھوں نے کہیں سفر وغیرہ کیا ہو تو اکثر بقید سن اس کا ذکر کیا ہے۔

ہمارے محققین نے شفیق کے حالات بیان کرتے ہوئے چمنستان کے بعد شامِ غریباں ہی کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد گلِ رعنا کا۔ اس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ شامِ غریباں گلِ رعنا پر مقدم ہے لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ چمنستان کو شفیق کے لڑکپن کی کارگزاری سمجھیے کہ وہ ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوا اور اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۱۷۵ھ میں لکھا اور اس کے چھ سال بعد یعنی اپنی عمر کے چوبیسویں

سال ۱۱۸۱ھ میں گلِ رعنا لکھا اور شامِ غریباں اس کے سولہ سال بعد ۱۱۹۷ھ میں تصنیف کیا۔ اُس نے اپنی اکثر کتابوں کے نام تاریخی رکھے اور جن کا نام تاریخی نہیں خاتمہ پر ان کا قطعۂ تاریخ دے دیا ہے۔ چنانچہ شامِ غریباں کا نام متن کے اعتبار سے نہایت موزوں تھا لیکن اس میں تاریخ نہیں نکل سکی اس لیے قطعہ لکھ کر "اتمام نسخہ" ۱۱۹۷ھ سے اس کی تاریخ نکالی ہے۔ تذکرہ کی تکمیل کے بعد اس نے اپنے استاد آزاد بلگرامی کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور بہت طول طویل انتخابِ کلام دیا ہے۔ حالات کے بعد آزاد بلگرامی کے چند قطعاتِ تاریخ دیے ہیں جس سے مزید اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۱۹۷ھ میں مکمل ہوا ہے۔ آزاد نے میرزا مظہر جان جاناں کی شہادت پر تاریخی قطعہ لکھا ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے شفیق لکھتے ہیں کہ مظہر جان جاناں کو کسی نامعلوم شخص نے ۷ محرم ۱۱۹۵ھ کو جہان آباد میں زخمی کر دیا اور اسی زخم سے وہ یومِ عاشورہ کو انتقال کر گئے اور اپنے گھر کے صحن میں مدفون ہوئے۔ آزاد نے تاریخ کہی۔

میرزا مظہر سخن سنج شہید ۔۔۔ حشر او با نورِ چشمِ فاطمہ
روزِ عاشورہ از جہاں مظلوم رفت ۔۔۔ گفتہ شد تاریخ "حسن الخاتمہ" ۱۱۹۵ھ

اسی سال نور العین واقف بٹالوی نے بھی جہان آباد ہی میں رحلت کی[۱] اور آزاد نے اس طرح تاریخ کہی :

افسوس کہ واقف سخن سنج ۔۔۔ طومارِ حیاتِ خویش پیچید
تاریخِ وفاتِ او خرد گفت ۔۔۔ "واقف مہمانِ خلد گردید" ۱۱۹۵ھ

اس کے بعد شفیق لکھتے ہیں کہ "سرآمدِ شعرائے ریختہ" میرزا رفیع سودا نے بھی ۴ رجب کو رحلت کی تو آزاد نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ کہا۔

مرزا سودا رفیع عالی فطرت ۔۔۔ آرام گرفت در جوارِ رحمت
تاریخ وفات او رقم زد آزاد ۔۔۔ سودا آسود شادماں در جنت
۱۱۹۵

اور ان قطعات کے بعد آزاد نے ان تینوں کے لیے ذیل کا ایک قطعہ کہا ہے۔

سہ سخن سنج ہند دریک سال ۔۔۔ کوچ کردند باہم از دنیا
میرزا مظہرِ خدا آگاہ ۔۔۔ سخن او تمام درد و صفا
نادر العصر شیخ نور العین ۔۔۔ یک قلم کرد شعر را احیا
میرزائے بلند رتبہ رفیع ۔۔۔ در سخن صاحبِ یدِ بیضا
ہر سہ با بندہ آشنا بودند ۔۔۔ حیف رفتند در مقامِ فنا
بہرِ تاریخِ فوت این یاراں ۔۔۔ کرد آزاد مطلعی انشاء

---

[۱] ریو اور ایتھے نے نسخۂ عندلیب کے حوالے سے اور سرور صاحب قاموس المشاہیر نے تاریخ وفات ۱۱۹۰ درج کی ہے۔ اسپرنگر نے بھی انھیں کا اتباع کیا ہے۔

جانِ جاناں و واقف و سودا ۔ ۴۲۹
وارِدِ آشیانِ مُلکِ بقا ۔ ۷۶۶
۱۱۹۵

ان قطعات کی روشنی میں ۱۱۹۷ھ "اختتامِ نسخہ" کی صحت مُسلّم ہے۔

شفیق کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے اُستاد میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکروں سے استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ یہ آزاد ہی کی تصانیف ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں جب ہم شامِ غریباں کا مُطالعہ کرتے ہیں تو منجملہ ۴۸۲ کے صرف ۳۲ شعرا میں بعض شعراء کے کلام کا انتخاب شفیق کا اپنا ہے اور بعض شعرا کا آزاد سے لیا ہوا اور حالات کی عبارت میں قدرے یکسانیت نظر آتی ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ شفیق جو نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے اور پھر ان کے بیٹے عالی جاہ کے دربار سے متوسل رہے اپنے مربّی کے ساتھ ۱۱۷۷ھ میں اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد آئے اور پھر حالات کا مُطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ اُنھیں اورنگ آباد جانے کا موقع نہ ملا۔ اور ۱۲۲۳ھ میں یہیں حیدر آباد میں انتقال کیا۔ البتہ آزاد مُختصر سے قیام کے لیے ایک دفعہ ۱۱۸۶ھ اور دوسری دفعہ ۱۱۹۵ھ میں جب کہ ان کا سن اسّی سال کا ہو چکا تھا حیدر آباد آئے اور پھر اورنگ آباد واپس ہو کر ۱۲۰۰ھ میں انتقال کیا۔

شامِ غریباں اور گُلِ رعنا اور آزاد کے تذکروں کا مقابلہ بھی اس فرق کو واضح کر دے گا جو اُستاد اور شاگرد کے اندازِ بیان اور زبان میں موجود ہے۔ اس میں اُستاد اپنی پُوری صلاحیتوں کے ساتھ ادیبانہ شان میں نظر آتے ہیں اور شاگرد شاگرد ہی ہیں۔

شامِ غریباں کا آغاز آدم علیہ السلام کے تذکرے سے ہوا ہے اور توجیہہ یہ کی ہے کہ وہ جنّت سے ہندوستان آئے۔ اسی تعلق سے مختلف مذاہب میں جو روایات ملتی ہیں ان سب کے حوالے دیے ہیں۔ ان کے علاوہ علما اور شعرا نے بھی جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُنھیں بھی پیش کر دیا ہے۔ ان میں شیخ جلال الدین سیوطی، ناصر علی سرہندی، شیخ علی رُومی صاحب، محاضرۃ الاوائل اور شعرا میں امیر خسرو، میرزا صائب اور آزاد بلگرامی کے اشعار دیے ہیں۔ حرف الف میں (۵۱) شعرا کے حالات ہیں جن میں حکیم صدرالدین الٰہی، ابو الفتح گیلانی اور قزلباش خاں امید وغیرہ شامل ہیں۔ میر رضی شوستری اقدس کے حالات بیان کرتے ہوئے متعلقہ تاریخی واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اکثر شعرا کے انتقال کی تاریخیں یا معاصرین کے قطعات تاریخ بھی دیے ہیں۔

حرف ب کے تحت صرف میرزا عبد القادر بیدل کا ذکر ہے اور شفیق خُود ہی معترف ہیں کہ ان کا شمار واردانِ ہند میں نہیں۔ ان کا حال دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے اور گُلِ رعنا میں بھی خُود اُنھوں نے لکھا ہے لیکن یہاں ان حالات کو شامل کرنے کا مقصد یہ بیان کرتے ہیں:

"دریں ایام "مرأت واردات" تالیف شاہ محمد شفیع نگینی متخلص بہ وارد طہرانی بہ نظر رسیدہ۔ دریں کتاب بعضی احوال میرزا سوائی آں است کہ در تذکرہ ہا بہ نظر نہ رسیدہ۔ تالیف شاہ وارد غیر مشہور است لہذا بہ خاطر رسید کہ میرزا صاحب کمال عمدہ است۔ ترجمہ او را بہ احوال زاید کہ

شاہ وارد آوردہ، باید نوشت تا بر صفحۂ روزگار باقی ماند۔"

تمام تذکرے بجز ایتھے اور قاموس المشاہیر[1] کے اس امر پر متفق ہیں کہ بیدل عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور اعظم شاہ کے دربار سے متوسل رہے اور جب اُس نے اپنی مدح میں قصیدہ کہنے کے لیے کہا تو ملازمت ترک کر دی۔ لیکن وارد اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"طائر خوشنوای وجود میرزا از گلستان عدم در اکبر نگر عرف راج محل از ممالک بنگالہ پر پرواز کشود و مدتی دراں سرزمین معاش بجمعیت بسر برد و درکمال جوانی رُو بہ ہندوستان آورد و نخست در صحبت میرزا سلیمان، خالوی حقیقی سُلطان محمد معزالدین خلف شاہ عالم بن عالمگیر سالہا بسر برد بعد فوت میرزا سُلطان در سلک ملازمان اعظم شاہ بن عالمگیر ——— منسلک گشتہ بیت الغزل دیوان اعتبار گردید۔"

اس بیان کو اس لیے غلط نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد کا بیان اور تعجب خیز نظر آتا ہے جب اعظم شاہ نے بیدل سے اپنی مدح میں قصیدہ لکھنے کے لیے کہا تو بیدل نے ملازمت ترک کر دی اور شاہ وارد لکھتے ہیں کہ:

"پس از قطع منازل در بلدہ متھرا بر کنار دریائے جمن اقامت گزید۔ لعل محمد نامی حاکم آن مکان نائب حسن علی خاں بہادر الہ وردی خانی از قدوم میرزا اطلاع یافتہ در دل جوئی و خاطر داری کوشید۔ میرزا نیز دلدادۂ صُحبت اُو شد، اتفاقاً سلطان عالمگیر کہ در دکن بود لعل محمد را بحضور خود طلبید۔ لعل محمد موجب حکم بادشاہ جبراً و قہراً روبراہ سفر دکن آورد و در عرض راہ سمند عزیمت را اقلیم عدم جلوریز ساخت میرزا تا مدت یک و نیم سال در خانۂ راقم این اوراق بی تشویش معاش اصل اقامت افگند۔"

غرض اس طرح اس تذکرہ کے مطالعہ سے بعض نئی معلومات ملتی ہیں۔

کلیات علی عادل شاہی میں ایک غزل کا عنوان چار در چار ہے۔ یہ اصل میں سولہ رکنی بحر ہے اس کا نام بھی شاہ وارد کے تذکرہ میں موجود ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"در بحر کامل چار در چار اوّل شاعری کہ شعر موزوں کرد ادیب صابر است و اُو غزلی بیش از ہفت بیت مرقوم نہ ساختہ و بعد از ادیب صابر مولانا عبدالرحمٰن جامی غزل ہفدہ بیت ایجاد نمود و میرزا بیدل در بحر کامل چار در چار دیوانی مشحون بہ معانی خاص و مضامین عالی تصنیف کردہ۔"

صابر کا شعر حسب ذیل ہے:

چنیں شنیدم کہ لُطفِ یزداں بروی جوینده در نہ بندد   دری کہ بگشاید از حقیقت بر اہلِ عرفان دگر نہ بندد

---

[1] ایتھے نے اکبر آباد اور صاحب قاموس نے بخارا لکھا ہے۔

شفیق اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"شاہ وارد خبر ندارد کہ مطلعی کہ از ادیب صابر نقل کردہ در بحر کامل نیست بلکہ از فروغ بحر منتقارب است ۔ تقطیعش فعول فعلن" اس قسم کی تنقیدیں تذکرہ میں اکثر مقامات پر ہیں ۔ کہیں الفاظ کی تحقیق پر بحث کی ہے اور کہیں معانی و بیان کی نزاکتوں کو پیش کیا ہے ۔ اس سے شفیق کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

جس طرح شفیق نے آدم علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ہندوستان آئے اسی طرح شیخ سعدی کے بارے میں بھی لکھا ہے اور ثبوت کے لیے دو شعر پیش کیے ہیں :

تبی دیدم از عاج در سومنات ۔۔۔ مرصع چو در جاہلیت منات

بہ ہند آمدم من از آں رستخیز ۔۔۔ وز آنجا براہ یمن تا حجیز

تاریخی واقعات کے اظہار کے لیے ایسے شعرا کے حالات جن کا شاہی درباروں سے تعلق رہا ہے مطالعہ کیا جائے تو بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ ان میں میر جملہ روح الامین، سلیم، سرمد، ظہوری، انیسی شاملو، میر جملہ محمد سعید، شہرستانی، تقی اوحدی، میر رضی دانش وغیرہ شامل ہیں ۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی زندگی بالکل سپاہیانہ گزاری لیکن بیس بائیس شعرا ایسے ہیں جو عالمگیری امرا یا خود عالمگیر کے دربار سے وابستہ رہے ۔ نعمت خان عالی جیسا شاعر اور ادیب اسی دربار میں رہا ۔

شفیق نے بعض شعرا کی قبروں کی بھی نشانی دہی کی ہے چنانچہ سلیم کے متعلق لکھتا ہے کہ

"در سالی کہ اسلام خان (وزیر شاہ جہان) فوت شد (سلیم) ہم در کشمیر چشم از زندگانی پوشید و در دامن کوہی کہ مشہور بہ تخت سلیمان است مشرف بر تالاب ول بہ فتح دال مہملہ مدفون گردید ۔"

طغرا مشہدی کے متعلق لکھتا ہے کہ :

"او اخر حال گوشہ انزوا در کشمیر گرفت و ہماں جا درگذشت و نزدیک قبر ابو طالب کلیم مدفون گشت ۔"

لیکن پتہ نہیں کہ قدسی کے بارے میں شفیق نے کونسا تذکرہ پیش نظر رکھا غالباً ملا عبدالحمید لاہوری کا شاہجہان نامہ ہوگا کیونکہ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے :

"در لاہور سنہ ست و خمسین والف بعالم قدس خرامید ۔"

حالانکہ غنی کشمیری کا قطعہ تاریخ قدسی، سلیم اور کلیم کا مدفن ایک قرار دیتا ہے اور سرو آزاد میں یہ موجود ہے ۔ اس کے آخری تین شعر یہ ہیں :

عمرہا در یادِ او زیرِ زمیں ۔۔۔ خاک بر سر کردہ قدسی و سلیم

عاقبت از اشتیاق یکدگر ۔۔۔ گشتہ اند این ہر سہ در یکجا مقیم

گفت تاریخ وفات او غنی   طور معنی بود روشن از کلیم

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شفیق نے تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی اور جہاں سے جو اور جیسا مواد ملا جمع کر کے پیش کرتا چلا گیا۔ چمنستان شعرا کے مواد کے بارے میں بھی مولوی عبدالحق صاحب کو شکایت ہے کہ اس نے ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ کو جو بلحاظ صحت واقعات درخور اعتنا نہیں اہمیت دی اور اسی کو ماخذ بنایا لیکن چمنستان شعرا کا مصنف صرف اٹھارہ سال کا لڑکا ہے اور شام غریباں کا مصنف تقریباً چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکا ہے۔ اس لیے اس سے تحقیق و تلاش کی توقع کی جاسکتی تھی۔

کلیم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"وفات کلیم پانزدہم ذی الحجہ سال ہزار و شصت و یک ہجری واقع شدہ و در نزدیکی قبر محمد قلی سلیم مدفون گردید۔"

نعمت خاں عالی کی قبر کے بارے میں کہتا ہے کہ:

"اتفاقاً نعمت خاں بعد وصول حیدرآباد در رکاب شاہ عالم بہادر درسنہ احدی وعشرین و مائتہ والف رحلت کرد و در دائرہ میر محمد مومن مدفون گردید و برسر قبرش مسجدی ساختہ اند کہ بالفعل موجود است۔"

میر رضی اقدس شوستری کے بارے میں کہتا ہے کہ:

"آخر الامر در بلدۂ حیدرآباد گوشۂ انزوا گرفت ومناہل شد و بست و دوم جمادی الاولیٰ سنہ اربع وتسعین[۱۱۹۴] ومائتہ الف رحلت نمود و در دائرۂ میر محمد مومن استرآبادی مدفون گردید۔"

میر ابوتراب فطرت والد میر رضی دانش کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ:

"ابوتراب درسنہ ستین والف در نقاب تراب رفت۔ میر آزاد در سرو آزاد گوید کہ قبر او در دائرہ میر محمد مومن استرآبادی کہ گورستان مقرری ایرانیان است و مردم بسیاری از اہل ولایت دراں بقعہ خوابیدہ اند دیدہ شد۔ برلوح مزار او کندہ اند کہ ایں رباعی را دم آخر بنظم آورد.... و رباعی دیگر از میر رضی کہ در فراق والد خود گفتہ ہم برلوح مزار تحت رباعی مذکور نقش است۔"

پھر اس کے بعد شفیق نے لکھا ہے کہ:

"میر آزاد سلمہ اللہ تعالیٰ با بندہ فرمودند کہ درسنہ خمس وستین[۱۱۶۵] ومائتہ والف ورود حیدرآباد اتفاق افتاد و بدلالت میر رضی اقدس شوستری قبر میر ابوتراب در دائرہ میر دیدہ شد۔ دراں وقت دایرہ مذکور ویرانہ بود و اثری از آبادی نداشت پس ازاں بعد سی سال درسنہ خمس وتسعین[۱۱۹۵] ومائتہ والف باز ورود حیدرآباد رو نمود و دائرہ میر بملاحظہ درآمد اثری از قبر ولوح میر ابوتراب نیافتہ شد و ہم چنیں اکثر قبور کہ دراں قطعہ زمین بود با خاک برابر گشت۔ سببش ایں کہ در زمان

حال بنابر سکونت والیٔ ملک نواب نظام الدولہ آصف جاہ ثانی خلف الصدق نواب نظام الملک
آصف جاہ ہندیود کن آبادیٔ حیدرآباد بحد کثرت رسیدہ و ایں دائرہ کہ تمام خواب گاہ
حوتی بود آرام گاہ احیاگر دیدہ۔"

شفیق نے اپنی زبان کو نہایت سلیس اور عام فہم رکھا ہے۔ مقفیٰ اور مسجّع لکھنے کی کوشش نہیں کی البتہ شاعروں کے تخلّص کی مناسبت سے ان کا کلام دیتے ہوئے عبارت آرائی ضرور کی ہے۔ مثلاً

روغن استرآبادی کے لیے روغن قاز بر روی سخن می مالد۔ رونقی کے لیے اُو سخن را رونق می دہد۔ نشا لور کے لیے اُو تصویر سُخن می کشد۔ سیف الملوک شجاعی دماوندی کے لیے۔ ایں جواہر ازاں شمشیر است۔ مولانا صادق حلوائی کے لیے او حلوائی سُخن می فروشد اور غزالی مشہدی کے لیے این چند مُشکنافہ از غزالی است۔

اس اسلوب سے قاری کا ذہن بار محسوس نہیں کرتا اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

اس کی تنقید میں ابتدا سے آخر تک کہیں دل آزاری نہیں پائی جاتی۔ بلکہ جو واقعہ جس انداز میں بیان کرنا چاہیے اسی انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ ورنہ اکثر تذکرہ نگاروں نے تلخ گوئی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ یہ تلخی بعض جگہ آزاد کے تذکروں میں بھی نظر آجاتی ہے۔

یہ تذکرہ ان پیش کردہ خصوصیات کی بنا پر اہمیت کا حامل ہے اور فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت ہے کہ بیرونی شعرا کا حال یا ماخذ کا پتہ اس میں بہ آسانی مل جاتا ہے۔

رڈیارڈ کپلنگ

کسری منہاس

روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور کے دفتر میں ایک پیتل کی تختی نصب ہے۔ جس پر ذیل کی عبارت کندہ ہے:

"رڈیارڈ کپلنگ یہاں ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۷ء کام کرتا رہا۔"

یہ تختی جس کا ڈیزائن مسٹر سیلیون (SEILIVALN) نے بنایا تھا۔ میو سکول آف آرٹ میں تیار کی گئی تھی۔ اور اس کی نقاب کشائی سر مائیکل او ڈائر (ODY YER) نے بارہ مارچ ۱۹۱۷ء کو کی تھی۔

رڈیارڈ کپلنگ ۱۸۶۵ء میں بمبئی میں پیدا ہوا۔ اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھ سال کی عمر میں انگلستان بھیج دیا گیا۔ ہندوستان واپس آنے پر وہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے عملے میں شامل ہوگیا۔ اس کا باپ جان لاک وڈ کپلنگ ایک مشہور مصور ہوا ہے۔ جس کی زندگی کا آخری حصہ ہندوستان ہی گزرا۔ انسانوں اور حیوانوں کے اسکیچ بنانے میں جان لاک وڈ کا جواب نہ تھا۔ ایک طویل عرصے تک بمبئی یونیورسٹی میں فنونِ لطیفہ کے شعبے میں مجسمہ سازی کا درس دینے کے بعد جان لاک وڈ کا تقرر لاہور کے میو سکول آف آرٹ میں پرنسپل کے عہدے پر ہوا۔ رڈیارڈ کپلنگ اس وقت تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد واپس ہندوستان آچکا تھا۔ طبعاً اس کے باپ کی خواہش ہوئی کہ نوجوان کپلنگ کے لیے کوئی موزوں ملازمت تجویز کرے۔ اس وقت رڈیارڈ کپلنگ کی عمر سترہ سال کی تھی، لیکن وہ سرکاری ملازمت کرنے کے قابل نہ تھا کیوں کہ اس کی بینائی غیر معمولی طور پر کمزور تھی۔ دوسری جانب کپلنگ کو شروع ہی سے ادیب بننے کا شوق تھا۔ ان دونوں باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر جان لاک وڈ نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے مینیجنگ ڈائرکٹر سر ڈیوڈ میسن (DAVID MASSON) سے کپلنگ کی سفارش کی۔ نتیجے کے طور پر نوجوان کپلنگ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے عملے میں منسلک ہوگیا۔ یہ سلسلہ ۱۸۸۷ء تک رہا۔ چنانچہ اخبار کے دفتر میں جو پیتل کی تختی نصب ہے۔ وہ اسی سلسلے کی یاد دلاتی ہے۔ پانچ سال تک سول اینڈ ملٹری گزٹ میں کام کرنے کے بعد کپلنگ "پائنیر" کے ادارہ ادارت میں شامل ہوگیا۔ پھر ۱۸۸۹ء میں ہندوستان کو خیرباد کہہ کر انگلستان چلا گیا۔

رڈیارڈ کپلنگ کا پورا خاندان ادب اور صحافت سے دلچسپی رکھتا تھا۔ مصور جان لاک وڈ کو خود بھی ادب کے ساتھ لگاؤ تھا۔ کپلنگ اور اس کی بہن ابتدا ہی سے مضمون نگاری کے شوقین تھے۔ جان لاک وڈ سول اینڈ ملٹری گزٹ

کے کالموں میں نامہ نگار کی حیثیت سے کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے تھے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایک کرسمس نمبر میں کپلنگ خاندان کے جملہ افراد کی ادبی کاوشیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ یعنی اس نمبر میں ماں۔ باپ۔ بیٹا۔ بیٹی چاروں کی تحریریں موجود ہیں۔ ایسے ادب پرست خاندان کا چشم و چراغ رُڈیارڈ کپلنگ اگر سترہ سال کی عمر میں روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ سے متعلق ہو گیا۔ تو یہ امر کوئی حیرت ناک نہیں۔

رُڈیارڈ کپلنگ نے اپنے ناول سٹاکی اینڈ کمپنی (STALKY & CO) کے آخری باب میں اپنے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں تقرر کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ ناول ۱۸۹۹ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس وقت تک کپلنگ ایک مانا ہوا ناول نویس، افسانہ نگار اور شاعر تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اس لیے کہ وہ ۱۸۸۶ء سے انگریز مصنفین کی صف میں شامل ہو چکا تھا اور ۱۸۹۴ء میں جنگل بُک کے طباعت پذیر ہونے کے بعد وہ عالمگیر شہرت کا مالک بن چکا تھا۔ سٹاکی اینڈ کمپنی کے آخری باب میں افسانوی کردار، بیٹل (BEETLE) اور مینجنگ ڈائرکٹر کی ملاقات کا حال ہے۔

> وہ (مینجنگ ڈائرکٹر) بیٹل کو الگ لے گیا اور نصیحت کرتا رہا۔ (جس کا ایک حرف بھی بیٹل کو یاد نہ رہا تھا) جب بیٹل ہیجانی کیفیت کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس آیا تو اس نے ایک حیرت انگیز کہانی بیان کی۔ جس پر یقین لانا دشوار ہے۔
>
> "تم سو پونڈ سالانہ پر ملازمت شروع کرنے کے کو تیار ہو؟"
>
> اس ترک نے ہمدردانہ لہجے میں کہا:
>
> "اور میرا سفر خرچ بھی"۔
>
> اس طرح معاملہ طے ہو گیا۔ مینجنگ ڈائرکٹر نے بتایا کہ وہ اتنی مدت تک مجھے اس لیے تربیت دے رہا تھا اور مجھے اس کی مطلق خبر نہ تھی کہ ایک دم اخبار میں لکھنا شروع کر دینا مناسب نہیں ہوتا، پہلے ٹیلیگرام لکھنا اور قینچی سے اخبار کے تراشے کاٹنا سیکھنا ہوتا ہے۔

دراصل نوجوان صحافی رُڈیارڈ کپلنگ کی پیش گوئی پوری ہوئی اور تار لکھنے اور اخبارات کے تراشے لینے سے شروع کر کے امیر افغانستان کی ہندوستان میں تشریف آوری کے وقت یعنی ۱۸۸۵ء میں وہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کا خصوصی نامہ نگار بن گیا اور آخر کار اس اخبار کا نائب مدیر مقرر ہوا۔ جب امیر افغانستان کی جماعت پشاور آئی تو کپلنگ لاہور سے پشاور پہنچا۔ اور امیر موصوف کی جماعت میں شامل ہو گیا۔ پھر وہ اس جماعت کے ساتھ پشاور سے راولپنڈی آیا اور وہاں ٹھہرا رہا۔ اس نے اپنے ان دنوں کے تجربات نہایت پُر لطف طریقے سے قلم بند کیے ہیں۔

مستقبل کا شاعرِ مملکت رُڈیارڈ کپلنگ کچھ عرصے ایک پرائیویٹ کی حیثیت میں فرسٹ پنجاب والنٹیئر کی "بی کمپنی" سے متعلق رہا۔ لیکن کسی نے اسے پریڈ کرتے نہیں دیکھا۔ اولڈ لاہور کے مصنف کرنل گولڈنگ ان دنوں اس کمپنی کے کمانڈر تھے۔ کرنل گولڈنگ نے لاکھ کوشش کی کہ کپلنگ بھی دُوسرے فوجی نوجوانوں کے ساتھ پریڈ میں شریک ہوا کرے لیکن اس کی ساری ترکیبیں بے کار ثابت ہوئیں۔ آخر میں کرنل گولڈنگ نے حکم دیا کہ جو امدادی رقم کپلنگ وصول کر چکا ہے، وہ واپس کردے۔ کپلنگ نے بغیر حیل و حجت وُہ رقم واپس کر دی۔ اور صفائی کے ساتھ اعتراف کرلیا کہ وُہ اپنے فرائض منصبی انجام نہ دے سکا تھا۔ اس لیے جُرمانہ حق بجانب ہے۔ ہم یہاں یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کپلنگ فطری طور پر فوجی ملازمت کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ وہ ایک صحافی، ناول نویس، افسانہ نگار تو ہو سکتا تھا لیکن فوجی مشقت کے قابل نہ تھا۔

فوجی صلاحیتوں کا نہ ہونا ایک بات ہے اور برطانوی فوج کی بہادری پر فخر و نازش کے گیت گانا دُوسری بات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپلنگ میں بہادری کے کارناموں کو سراہنے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اس کی نظموں کے کئی مجموعے فوجی زندگی اور فوجی کارناموں سے متعلق ہیں۔ انگریز سپاہیوں اور انگریز ملاحوں کی زندگی کی جیسی مکمل تصویر کپلنگ کی نظموں میں ملتی ہے۔ ویسی کسی دُوسرے انگریز شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ کپلنگ کی نظموں کا پہلا مجموعہ جو ۱۸۸۶ء میں چھپا۔ فوجی زندگی ہی سے متعلق ہے۔ اس کا نام (DEPARTMENTAL DITTIES) یعنی شعبہ جاتی نغمے ہے۔ اس مجموعے کا پس منظر ہندوستان ہے۔ یعنی ہندوستانی پس منظر میں انگریز فوجیوں کی زندگی اور ان کے رہنے سہنے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شمال مغربی سرحد۔ کوئٹہ۔ کالکا۔ شملہ۔ کلکتہ۔ دار جلینگ پاکستان و ہندوستان کے پہاڑ اور میدان۔ ہندوستان کی طوفانی برسات، عمر خیّام اور حافظ کی شاعری سے تاثرات لے کر ان کو مغربی فلسفے کے انداز میں پیش کرنے کی کوشش۔ یہ اس مجموعے کے چند نقوش ہیں۔ تاہم ایک بات صاف ظاہر ہے وُہ یہ کہ نوجوان کپلنگ مشرقی تہذیب و معاشرت سے بے حد متاثر تھا۔ جیسے جیسے کپلنگ ہندوستان سے دُور ——— ہوتا گیا۔ اس کا شاعرانہ لہجہ آفاقی ہوتا چلا گیا اور اس کے سامنے صرف ہندوستان میں رہنے والے انگریز فوجی نہ رہے بلکہ پُوری سلطنت برطانیہ آگئی اور وہ "شاعرِ مملکتِ برطانیہ" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس کے باوجود وہ اپنے قیامِ ہندوستان کو فراموش نہ کرسکا۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۹۳۶ء تک (جب اس کا انتقال ہوا) اس کا رہنا سہنا ہندوستانی معاشرت سے متاثر تھا۔ اسے ہندوستانی غذائیں مرغوب تھیں۔ بعد کے شعری مجموعوں میں اس نے انگریز سپاہیوں اور انگریز ملاحوں کے کارناموں کے گیت گائے ہیں۔ اب اس کے سامنے صرف اینگلو انڈین طبقہ ہی نہ تھا بلکہ پُوری برطانوی کامن ویلتھ تھی۔ چنانچہ "SEVEN SEAS" یعنی ہفت قلزم مطبوعہ ۱۹۰۰ء میں اس نے اپنی وسعتِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں ایک نظم بمبئی پر بھی ہے۔ اس مجموعے میں۔ بارک روم بلیڈز (BARRAK ROOM BALLADS) کے زیرِ تحت انگریز سپاہیوں کی زندگی سے متعلق منظوم کہانیاں بھی شامل ہیں۔

ہندوستان سے کپلنگ نے بہت کچھ لیا۔ شاعر کے علاوہ کپلنگ ناول نویس، اور افسانہ نگار بھی تھا۔ اس کی سب سے مشہور نثری تصنیف "جنگل بُک" ہے۔ اس کا پہلا حصّہ ۱۸۹۴ء میں اور دُوسرا حصّہ ۱۸۹۵ء میں چھپا۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کپلنگ نے ہندوستان کے جنگلوں اور جنگلی جانوروں کا کتنا گہرا مُطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا۔ جنگل کی زندگی اور جنگل کے قانون کا نہایت دلکش پیرائے میں اظہار کیا گیا ہے۔ ایک انسانی بچّہ جس کو بھیڑیے پرورش کرتے ہیں اور بھالو (ریچھ) بھیگرا، تیندوا، شیر، چیتا غرضکہ سبھی جنگلی درندے اس بچّے کی تربیّت کرتے ہیں۔ اس بہانے سے جانوروں کے اطوار و عادات کو الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ یہ جنگل "بندھیاچل" کے دامن میں ہے۔ ۱۹۰۱ء میں کپلنگ نے اپنی بہترین فوجی تخلیق پیش کی جس کا نام کِم (KIM) ہے۔ یہ مشہور ناول ایک برطانوی سپاہی کی زندگی سے متعلق ہے۔ جو آئرلینڈ کے رہنے والا تھا۔ کِم کا باپ برطانوی فوج میں ایک سارجنٹ تھا۔ اور ہندوستان میں مقیم تھا۔ کِم بچپن ہی میں یتیم ہوگیا اور لاہور کی گلیوں میں آوارہ گھومنے لگا اس کی ملاقات تبّت کے رہنے والے ایک بُوڑھے لامہ سے ہوگئی۔ وہ لامہ کے ساتھ جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھاننے لگا۔ آخر اُسے ایک انگریز فوجی نے پہچان لیا جو اس کے باپ کا جاننے والا رہ چکا ہے۔ اس کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا گیا اور اُسے فوج کی خفیہ سروس میں ملازم رکھ لیا گیا اس نے رُوس کے ایجنٹوں کے پاس خفیہ دستاویزیں دریافت کرلیں اور اس طرح اُسے ایک فوجی جاسوس خیال کیا جانے لگا۔ اس ناول میں ہندوستان کے بہت سے مقامات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ہندوستانیوں کے مذاہب، توہمات اور رہنے سہنے کے عام طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ ناول عالمگیر شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ چنانچہ اس کی بنا پر کپلنگ کو ۱۹۰۷ء میں نوبل پرائز ملا۔ یہ اس کی ادبی خدمات کا اعتراف تھا۔

اگرچہ کپلنگ کی شہرت موجودہ زمانے میں اُس کی نثری تخلیقات کی بنا پر ہے۔ خصوصاً اُن تخلیقات کی بنا پر جن کا تعلق ہندوستان سے ہے یعنی وہ ناول اور افسانے جو انگریز فوجیوں، اینگلو انڈین لوگوں، ہندوستانی شہروں، جنگلوں پہاڑوں، باشندوں اور حیوانوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاہم اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں کپلنگ کا شمار برطانیہ کے صفِ اوّل کے شعرا میں کیا جاتا تھا۔ اس نے انگریزی شاعری کو ایک مخصوص لہجہ عطا کیا۔ اس کی اکثر نظمیں عوامی زبان میں ہیں بلکہ یہ کہنا اور بھی زیادہ صحیح ہوگا کہ اس کی بیشتر نظمیں گویا سپاہی زبان میں ہیں۔ تصنّع اور تکلّف اس قسم کی شاعری کے لہجے میں ہونا غیر ممکن ہے۔ اس کے خلاف خلوص اور مزاح کی چاشنی ان نظموں کی دلکشی بڑھاتی ہے۔ کپلنگ کے ہاں ایک مخصوص ترنّم ہے۔ وہ مشینوں، کارخانوں اور جہازوں کے آہنی اور چوبی آہنگ کا شاعر ہے، نہ کہ طبلے اور سارنگی اور دُوسرے آلاتِ موسیقی سے ترنّم حاصل کرنے والا۔ اس لحاظ سے کپلنگ جدید انگریزی شاعری کے بانیوں میں سے تھا۔ جس نے اپنا آہنگ صنعتی زندگی سے لیا۔ کپلنگ برطانوی ملکیت کا شاعر بھی ہے۔ ۱۸۹۵ء کے قریب انگریزی شعرا کا ایک مدرسۂ فکر اُبھرا جس کے رہنما کپلنگ اور ہنلی (HENLEY) تھے۔ یہ تحریک ملوکیت پرستی

کے رجحان کی بنا پر پیدا ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے کپلنگ برطانوی ملوکیت پرستی کا نمائندہ تھا۔ وہ خیال کرتا تھا کہ سفید فام اقوام کے سر ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ سفید فام اقوام میں بھی برطانوی قوم کے ذمہ خصوصیت کے ساتھ یہ کام ہے کہ وہ نیم متمدن اور غیر متمدن افریقی اور ایشیائی اقوام پر حکومت کریں اور انھیں تہذیب اور شائستگی کی تربیت دیں اپنی ایک نہایت مشہور نظم وائٹ مینز برڈن (WHITE MENS BURDEN) میں کپلنگ نے یہ رونا رویا ہے کہ سفید فام اقوام اپنا خون دے کر اور اپنی عمریں صرف کر کے وحشی اور نیم وحشی قوموں کی خدمت کرتی ہیں اور اس خدمت کو لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور اس قربانی کی قدر نہیں کرتے۔ کپلنگ کی شاعری کو غیر مقبول بنانے میں ملوکیت پرستی کے فلسفے کا ہاتھ ہے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے اور ہم سفید فام اقوام کے ممنونِ احسان ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایشیائی قوموں میں بیداری پیدا ہو چکی ہے اور افریقہ کا بڑا حصہ بھی آزادی کا طلب گار نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز حکومت سمٹ کر افریقہ کے تھوڑے سے حصے میں رہ گئی ہے۔ اور وہاں بھی چند روز کی مہمان نظر آتی ہے۔ کپلنگ کی شاعری نے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دیا اس لیے انگلستان کے باہر تو کیا معنی خود انگلستان کے اندر بھی وہ اپنی مقبولیت قائم نہ رکھ سکی۔ البتہ رُوس اور جرمنی کے خلاف جب کپلنگ کا جذبۂ حُبّ الوطنی جاگا تو اُس نے آمرانہ حکومتوں کے عزائم کو بے نقاب کر دیا۔ کپلنگ کی یہ نظمیں انگریزوں اور پڑھے لکھے انگریزی خوان طبقے کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہیں۔ کپلنگ ہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے ۱۹۰۰ء کے قریب دُنیا کو رُوس کے فتنے سے خبردار کیا اور ۱۹۱۴ء کے قریب کپلنگ نے جرمنی کی ملوکیت پسندی کے خلاف احتجاج کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کپلنگ سیاسی معاملات میں کتنی گہری سوجھ بوجھ رکھتا تھا اور وہ کتنا بڑا محبِ وطن تھا۔

کپلنگ کی عظمت کا دارومدار اس کی ان تحریروں پر ہے۔ جو ہندوستان سے متعلق ہیں۔ اوائل شباب میں کئی برس کپلنگ لاہور میں مقیم رہا اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کا نامہ نگار اور نائب مدیر رہا۔ اس لحاظ سے لاہور سے اس کا تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس کو ادیب و شاعر بنانے میں سرزمین لاہور کا ہاتھ ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی صحافتی اور ادبی زندگی کا آغاز یہیں سے کیا۔ مسٹر رابنسن جو لنڈن کے ایک شبینہ اخبار "گلوب" کے ادارے میں کام کر چکے تھے جب سول اینڈ ملٹری گزٹ کے مدیر اعلیٰ ہو کر آئے تو کپلنگ اور رابنسن میں گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اس کی صحبت نے کپلنگ کے ادبی ذوق کو اور زیادہ نکھارا اور اس کو ادبی تربیت دی۔ دونوں نے اس میں دلچسپ، مختصر اور حالاتِ حاضرہ کے متعلق مضامین لکھنے شروع کیے جو تقریباً دو ہزار الفاظ تک محدود ہوتے تھے۔ یہ مضامین بعد از ان PLAIN (TALES FROM THE HILLS) کے عنوان سے شائع ہوئے۔ رابنسن کپلنگ کی فرض شناسی، جفاکشی اور کارکردگی سے بے حد مطمئن تھا۔ رُڈیارڈ کپلنگ کے بارے میں اس کے تاثرات یہ تھے۔

"کپلنگ اپنے فرائض منصبی پُورے انہماک سے سرانجام دیتا ہے۔ اس کا کام تسلّی بخش ہے وُہ میرا بہترین معاون ثابت ہو رہا ہے اس کے علاوہ وہ ظرافت آمیز گفتگو کا

McClure's Magazine
July — 1896

بھی مالک ہے۔"

کپلنگ کو اس کے روزانہ معمول نے بھی ایک حد تک مدد دی۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد رات کو "اولڈ پنجاب کلب" میں جایا کرتا تھا۔ یہاں اپنے ہم وطنوں سے اپنے اخبار کے بارے میں گفتگو کا موقع ملتا۔ اس طرح اسے اخبار کی خامیوں کا علم ہوتا۔ اور وہ بتدریج پختہ کار ہوتا گیا۔ کپلنگ نے ہم سے بہت کچھ لیا اور اس نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ اس نے اپنے بیشتر فن پاروں میں لاہور کا مقامی رنگ پیش کیا ہے۔ اس کی اکثر حکایات اور نظموں میں یہاں کے ماحول کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔ ایک رات جبکہ چاند اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا اور اس کی نقرئی کرنیں تمام لاہور پر نور افشاں تھیں۔ یہ رات اگست کے مہینے کی ایک رات تھی۔ جب کپلنگ مسجد وزیر خان کے بڑے مینار پر چڑھ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے وہ ساری رات یہیں گزار دی۔ اس طرح اس نے لاہور کے ستر ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کو شب ماہتاب میں محوِ خواب دیکھا۔ اس نے لاہور کی اس رات کو (THE CITY OF DREADFUL NIGHT) کا عنوان دیا ہے۔ اس نے ایک نظم "ننھے شکاری" میں اُردو کے الفاظ "چیل" اور "مور" بڑی بے تکلفی سے استعمال کیے ہیں۔ برِصغیر پاک و ہند میں افسانہ نگار اور شاعر کے طور پر جو کچھ اس کے مشاہدے سے گزرا اسی کو اس نے شعر و ادب بنا کر پیش کر دیا۔ حیوانات کی نفسیات پر جو کچھ اس نے اپنی کہانیوں میں لکھا ہے وہ اس کے گہرے مشاہدے اور ہمدردی پر دلالت کرتا ہے اور یہی اس کی عظمت کا راز ہے لیکن ہم کپلنگ سے اس کی ملوکیت پرستی کے معاملے میں مفاہمت نہیں کر سکتے۔ کپلنگ کا قول تھا کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔ اور یہ دونوں کبھی نہیں مِل سکتے۔" وہ سمجھتا تھا کہ انگریز ہم پر حکومت کرنے کو پیدا ہوا ہے۔ ہم نہ تو مشرق و مغرب کے قائل ہیں اور نہ ہی کسی قوم کی غلامی کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے ہیں کیونکہ ہمارے خیال میں آزادی ہر قوم اور ہر فرد کا جائز حق ہے۔

یگانہ کا مرتبہ بحیثیت غزل گو

ملک اسمٰعیل حسن خاں

اُردو غزل کے سارے قدیم و جدید سرمایہ پر نظر رکھتے ہوئے اگر آپ صاحبِ طرز اور منفرد غزل گو شعرا کی ایک فہرست مرتب کرنا چاہیں تو بڑی مایوسی ہوگی۔ یہاں انفرادیت کو میں نے صرف اسلوب اور لہجے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اُس کے اندر معنویت اور غزل کی مخصوص رمزیت وغیرہ سب کچھ آ گئی ہیں۔ گویا اُردو غزل گو شعرا کی غزلیں فارسی کے غزل گو شعرا کی بھولی بھٹکی آوازِ بازگشت ہیں، جن میں نہ تو فکر و خیال کی ندرت نظر آتی ہے اور نہ اندازِ بیان یا "طرزِ گفتار" کی انفرادیت —— اگر اس کی وجہ دریافت کی جائے تو متعدد وجوہ سامنے آئیں گے اور لوگ عجیب عجیب دلائل اور اسباب پیش کریں گے۔ لیکن اس جگہ مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک تو غزل گوئی محض اظہارِ کمالات اور اُستادی کے مظاہرہ کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی، ذہنی ورزشیں زیادہ اور "خونِ جگر کی نمود" کہیں کہیں ہی جھلک پاتی تھی۔ اُستادانِ فن مختلف قافیوں کو سامنے رکھ کر اُن پر مصرعے لگاتے اور شعر کہتے چلے جاتے تھے اور بقول کسی کے وحدت میں کثرت کے تماشے دکھاتے تھے، اسی وجہ سے بعض لوگوں نے غزل پر "غیر فطری صنفِ شاعری" کا الزام لگایا، جو بڑی حد تک صحیح ہے، اس میں شاعر قافیوں کے سہارے آگے بڑھتا ہے اور دلی جذبات کا بھرپور اظہار اس میں بس کہیں کہیں یا گنتی کے شعرا کے یہاں ہی دکھائی دیتا ہے، غزل میں یہ نہیں ہوتا کہ پہلے کوئی خیال یا جذبہ ذہن و قلب کی گہرائیوں میں پیدا ہو اور پھر شاعر اُس کے لیے ایسے مناسب الفاظ قافیے اور بحر و ردیف کی تلاش کرے جس سے بات کی اہمیت اور تاثیر بڑھ جائے بلکہ اسّی فی صدی یہی ہوا ہے، اور ہوتا ہے کہ شاعر یہ پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ اسے فلاں زمین میں غزل کہنا ہے اور اُس کے لیے جتنے قافیے ذہن میں آتے ہیں اُن سب کو نوٹ کر لیتا ہے، پھر ہر قافیے کو بار بار ذہن میں گھماتا رہتا ہے اور شعر کہتا جاتا ہے، غزل میں قافیے جذبات و خیالات کے پابند نہیں رہتے، بلکہ قافیے خیالات پیدا کرتے ہیں، غزل گو شعرا کے دواوین کا اگر آپ تعمق نظری سے مطالعہ کریں تو یہ حقیقت فوراً آپ پر واضح ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح غزل میں فطری جذبات اور دل کی محفل سے اُٹھتی ہوئی سچی آواز نہیں ملے گی، آورد تصنع، مصنوعی اور بناوٹی مضامین اور پُر تکلف اندازِ بیان ہی کی کارفرمائی نظر آئے گی، پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غزل گو شاعر خارجیت (Objectivity) سے بالکل کام نہیں لیتا، وہ تو واردات قلبی کی تصویریں کھینچتا ہے، خارجی حالات اور خارجی کیفیات سے اُسے کوئی مطلب نہیں، وہ تو دل کی دُنیا" میں محو ہے، دل پر گزرنے والی کیفیات ہی اُس کی کُل کائنات ہیں، اُس کو صرف داخلیت (Subjectivity) ہی سے کام ہے اور داخلیت سے مراد وہی گل و بلبل، حسن و عشق، رقیب، معشوق، وصل و ہجر، خزاں و بہار، نزع و تربت، کفن و لاشہ، ناز و نیاز، شمع و پروانہ، جام و شراب، لب و کنار وغیرہ کے رسمی

روایتی قصّے ہیں، اُن کو لینڈر (Walter sevage Landor) کی طرح اسی بات میں لُطف ملتا ہے کہ:-

"There is joy in singing, when none here beside the singer."

میر نے جب آراستہ و پیراستہ باغ کا دریچہ کھولنا بھی پسند نہ کیا، اور دل کی دُنیا میں محو و مگن رہے تو دُوسرے غزل گو دِل سے باہر کی دُنیا کی طرف کِس طرح متوجہ رہ سکتے ہیں، اِس لیے کہ میر تو "خدائے سخن" تھے، جس نے میر کی شاعری کی شریعت سے انکار کیا وہ کافر ٹھہرا، ع

آپ بے بہرہ ہے جو مُعتقدِ میر نہیں

جوشؔ نے بالکل صحیح کہا ہے ؎

بہ فقط رسمی مقلّد وامق و فرہاد کے
مر رہے ہیں آج تک معشوق پہ اجداد کے
آج تک غالب ہے اُن پر وہ رقیب رُوسیاہ
کر چکا ہے زندگی جو میرؔ و مومنؔ کی تباہ
پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر نئے ہر صدا
اِن کے لب پر بھی وُہی ہے جو ولیؔ کے لب پہ تھا

یہ تو ایک جُملہ معترضہ تھا، میں کہہ یہ رہا تھا کہ دل کی دُنیا سے نکلے بغیر کام چلنا مُشکل بھی ہے اور غلط بھی۔ غزل میں جدّت ویسے ہی مُشکل سے پیدا ہوتی ہے نہ یہ کہ شاعر مشاہدات و تجربات اور دُوسرے (خارجی) رُجحانات و میلانات کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر ڈالے اور محض جذبات کے سہارے شاعری کرتا رہے، تو ایسی شاعری معنی اور اندازِ بیان دونوں ہی حیثیتوں سے کسی قدر کی مُستحق نہیں قرار پائے گی، نہ اُس میں تنوّع پیدا ہو سکے گا، نہ عظمت، اور اِس طرح معنی اور اندازِ بیان کی بوقلمونی اور رنگا رنگی اُس سے مُنہ پھیرے رہے گی۔ حالیؔ نے اسی لیے شاعر اور شاعری کے لیے ضروری شرائط میں ایک "کائنات کے مطالعہ" کی شرط بھی بیان کی ہے۔

پھر دُوسری وجہ یہ بھی ہے کہ غزل کے بعض بندھے ٹکے مضمون تھے، شاعر اُن ہی کو لوٹ پھیر کر اندازِ بیان بلکہ پینترے بدل بدل کر پیش کرتے رہے، اِس طرح فکر و خیال کی نُدرت اور مضامین کی جدّت اور اِس جدّت سے پیدا ہونے والا تنوّع دور کی آواز ہو کر رہ گیا۔ میرا مُدعا یہ بالکل نہیں ہے کہ وہ غزل کے رمز و ایمایا بالفاظِ دیگر غزل کے مخصوص آرٹ کے حدود کو توڑ کر نکل جاتے، صرف یہ مقصد ہے کہ وہ روایتی انداز کے چکر میں پڑ کر گل و بُلبل اور حُسن و محبّت کے موضوعات اور مضامین ہی کو 'حاصلِ کُل' سمجھ بیٹھے اس سے جہاں فکر و خیال کی نُدرت کو صدمہ پہنچا وہاں بات کہنے کے مُختلف اسالیب بھی پردۂ اخفا میں مرموز رہے۔

اس وقت جدید غزل گو شعرا میں سے ایک شاعر کا مختصر طور پر ذکر کرنا اور اُس کے کلام کی اُن دو چار خصوصیات پر تنقید کرنا چاہتا ہُوں جو اُس کی شاعری میں بُنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور اُردو غزل کے لیے تقریباً نئی ہیں، قبل اس کے کہ کچھ ذکر چھیڑا جائے مناسب یہ ہے کہ جدید غزل اور جدید غزل گو شعرا کے متعلق بھی مجملاً کچھ عرض کر دیا جائے تاکہ بات زیادہ واضح

ہوکر سامنے آسکے۔

جدید غزل گو شعرا سے میری مُراد وہ شاعر ہیں جن کی شاعری بیسویں صدی میں پروان چڑھی اور داغ، امیر، جلال اور امیراللہ تسلیم کے بعد جن کی زمزمہ پردازیاں سامع نواز ہوئیں اور جنھوں نے غزل پر حالی کے اعتراضات اور اصلاحی تحریک کے بعد سے لکھنو اسکول کی اس شاعری سے اجتناب کیا جہاں لفظی شعبدہ بازی اور مصنوعی باتیں ہی سرمایۂ کلام کی حیثیت رکھتی تھیں اور جہاں حقیقی جذبات و احساسات صدا بصحرا ہوکر رہ گئے تھے، یا پھر غزل میں تاثیر پیدا کرنے اور رنگِ قدیم سے گریزاں ہونے کے لیے تربت، کفن، میّت، لاش، نزع، گورِ غریباں وغیرہ مضامین کا نسخہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ ان غزل گو شعرا نے غزل میں مضامین اور اندازِ بیان دونوں لحاظ سے لکھنوی غزل سے احتراز کیا اور اپنی غزل گوئی کی بنیاد سچے جذبات و تاثرات اور دل نشین اور متاثر کُن اندازِ بیان پر رکھی اور غزل کو پھر سے مقبول بنانے کی کوشش کی، اُردو غزل کے احیا (Renaissance) سے یہی مُراد ہے ——— لیکن غزل میں اس نئے پن کے باوجود ان غزل گو شعرا میں سے بیشتر کے یہاں نئے شعور اور نئے امکانات کی تلاش بے سُود ہے۔ اُن کے یہاں سیاسی و سماجی احساس تقریباً مفقود ہے، اس کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ فانی اور جگر اقبال کو شاعر ہی ماننے کو تیار نہ تھے، بلکہ اُن کا قول تھا کہ وہ "ناظم یا واعظ تھا شاعر نہ تھا۔"

اس قافلے کے میرِ کارواں حسرت موہانی تھے، جدید غزل کا جب بھی تذکرہ کیا جائے گا اُن کی اہمیت اور خدمت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ——— اب اس گروپ کے غزل گو شعرا کے اسمائے گرامی ملاحظہ کیجیے تاکہ اور وضاحت ہو سکے، میں نے شاد، عزیز، ریاض اور ثاقب کو بھی اس گنتی میں شامل کر لیا ہے حالانکہ اصولاً ان کو شامل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس فہرست میں دو ایک ناموں کا اور اضافہ ہو سکتا ہے۔

شاد عظیم آبادی، ثاقب لکھنوی، آرزو لکھنوی، عزیز لکھنوی، ریاض خیر آبادی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، سائل دہلوی، بیخود دہلوی، یاس یگانہ چنگیزی، دل شاہجہانپوری، جلیل مانکپوری، ناطق لکھنوی، ناطق گلاوٹھی۔ تاجور نجیب آبادی، سیماب اکبرآبادی، وحشت کلکتوی، صفی لکھنوی، مانی جائسی، جگر مُرادآبادی، اثر لکھنوی۔ فراق گورکھپوری، اور اقبال۔

ان جدید غزل گو شعرا میں سے میں پانچ شاعروں کو اہم اور قدرِ اوّل کا شاعر مانتا ہوں جن کی شاعری میں آفاقیت کو چھوتی ہوئی قدریں اور عظمت و ہدایت کے وہ نقوش مِل جاتے ہیں جن کے باعث ان کی شاعری مدّتِ دراز تک زندہ اور قابلِ پسند رہے گی، بالترتیب اُن کے نام یہ ہیں:-

اقبال، فانی، اصغر، فراق اور یگانہ

جیسا کہ اُوپر عرض کر چکا ہوں کہ اُردو میں ایسے شاعر بہت کم ہیں جو صاحبِ طرز ہوں یا کسی خاص انفرادیت کے مالک ہوں، تقلید نے صنفِ غزل کو غیر فطری بنا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ غزل ایک مخصوص دائرے میں محدود ہوگئی اور اندازِ خیال کی نُدرتیں اور آواز کی انفرادیت جو بڑی اہم چیزیں ہیں معدوم ہوتی گئیں اور کورانہ تقلید کا رُجحان عام ہوگیا۔

صاحبِ طرز شاعروں کو اگر آپ شمار کرنا چاہیں تو دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں پر گن سکتے ہیں، یہ تقلید مضامین اور اندازِ بیان دونوں جگہ جلوہ نما ہے، مثلاً صاحبِ طرز شاعروں میں میرؔ، غالبؔ، انشاؔ، داغؔ اور جدید غزل گو شاعروں میں فانیؔ، اصغرؔ، اقبالؔ، فراقؔ اور یگانہ کو شامل کر سکتے ہیں، اردو غزل کے سارے سرمایے کے سامنے یہ چند نام قابلِ افسوس امر کا اظہار ہیں۔

یگانہ کے یہاں سب سے پہلی چیز جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اُن کا مردانہ عزم و اعتماد، کرارا پن، کڑک اور اندازِ بیان اور لہجہ کی وہ کھنک اور جھنکار ہے جو متوجہ کرنے کے ساتھ قاری کو مرعوب بھی کرتی ہے اور قاری اُس کو پڑھ کر ایک دم چونک جاتا ہے، یہ انداز اور یہ لہجہ یگانہ سے قبل اگر ملتا ہے تو کہیں کہیں غالبؔ کے یہاں، مثلاً اس قسم کے شعر ؎

وُہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا وہ جو اک رکھتے تھے ہم حسرتِ تعمیر سو ہے

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں

چونکہ غالبؔ کی شاعری کا مجموعی انداز ہی طنزیہ ہے اور اسی لیے اُن کے لہجے میں تیزی اور کڑک پیدا ہوئی ہے، یہ طنزیہ انداز اُن کے یہاں ہر جگہ ملتا ہے، خواہ حُسن و عشق کا ذکر ہو یا خدا سے گفتگو ہو، ساغر و شراب کا تذکرہ ہو یا حیات و کائنات کے مسائل پر تبصرہ ہو۔ غرض ہر جگہ طنزیہ لہجے کی چھاپ ہے، یگانہ کے یہاں ہر جگہ طنزیہ انداز تو مسلّط نہیں ہے البتہ جو کڑک اور تیزی ہے اُس میں اُن کی نُدرت پسند طبیعت کے ساتھ اُن کے طنزیہ لہجے (Bitterness) کو بھی بڑا دخل ہے، یاسؔ کے یہاں یہ انداز اور کرارا پن مل جُل گئے ہیں۔ پھر یہ انداز غزل میں نہ تو بُرا معلوم ہوتا ہے اور نہ غزلیت سے عاری ہے، رمزیت و ایمائیت جو غزل کی جان ہیں، یگانہ کے یہاں اُن کی بڑی افراط

ہے، چونکہ اُن کے سارے کلام پر ایک رجائی انداز چھایا ہوا ہے اور قنوطیت کا کہیں نام و نشان نہیں اس لیے اُس میں بانکپن اور مردانہ لہجہ و انداز پیدا ہو جانا لازمی تھا، زندگی کے متعلق اُن کا نقطۂ نظر رجائی (Optimistic) ہے، وہ ہار کر تیشے سے سر مار کر مر جانے کے لیے تیار نہیں، مصیبت کے پہاڑوں کو کاٹنے کا عزم و حوصلہ رکھتے ہیں، اس سے گھبراتے نہیں، "یقین محکم" اور "عملِ پیہم" پر اُن کا ایمان ہے، وہ ہم کو زندگی کا جبروتی رُخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعئ و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں، مجنوں صاحب کے بقول:

> "یاس کی شاعری ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ زندگی ایک جدلیاتی حقیقت ہے اور تصادم اور پیکار اُس کی نمو اور بالیدگی کے لیے ضروری ہے۔"

اسی لیے اُن کے یہاں ایک نوع کا زور اور شگفتگی ہے، جو غالب، اقبال اور اصغر کے علاوہ کسی اور غزل گو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی، شیلی (Shelley) نے اپنی ایک نظم (Ode to the west wind) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

'If winter comes can spring be far behind'

یگانہ اس پر پورا اور پختہ اعتماد رکھتے ہیں، اُن کا یہ اندازِ نظر اُردو غزل میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے، یگانہ نے اُردو غزل کو جو رجائی انداز، کڑک دار لہجہ، حوصلہ افزا خیالات رکھنے والا ذہن، ٹھک کر ہمت نہ ہارنے والا عزم اور جو توانائی اور کس بل دیا وہ اُردو غزل میں اُن کا خاص (Contribution) ہے، اُنھوں نے اپنی جدت پسند طبیعت سے اُردو غزل کی داستان میں ایک نیا افسانہ شامل کیا، اُس کے دامن کو وُسعت دی اور پھر شعریت اور غنائیت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا، مثلاً اس قسم کے بعض شعر دیکھیے ؎

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا   پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
(پوری غزل)

ہنوز زندگئ تلخ کا مزا نہ ملا   کمالِ صبر ملا صبر آزما نہ ملا

بہارِ زندگئ ناداں بہارِ بادِ وزاں کیوں ہو   یہ دُنیا ہے تو ہر کروٹ وُہی آرام جاں کیوں ہو

اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر   کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

کھینچی جو صدقِ دل سے اسیروں نے آہِ سرد   پھر کیا تھا پاؤں موجِ خزاں کا اُکھڑ گیا

لبِ دریا سے غرض ہے نہ تہِ دریا سے ۔۔۔ موج و گرداب سے ہے دست و گریباں ہونا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے ۔۔۔ اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
بلند ہو تو کھُلے تجھ پہ راز پستی کا ۔۔۔ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

پیرہن کیا گھر بھی خوش وقتی کے مارے تنگ ہے ۔۔۔ آشیاں ہے اپنے حق میں طرفہ زندانِ بہار

موجِ ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو ۔۔۔ دُنیائے گرد باد کی نشو و نما نہ ہو
ایسا نہ ہو کہ تھک کے کہیں بیٹھ جائے دِل ۔۔۔ دیر و حرم میں گم نگہ نارسا نہ ہو

مہندی بندھی نہیں مرے پائے خیال میں ۔۔۔ چاہوں تو کھینچ لاؤں گزشتہ بہار کو

گرفتارانِ ساحل کود پڑتے ڈر نکل جاتا ۔۔۔ کبھی تو زیستِ مُشکل آزماتی مرگِ آساں کو

ازل سے سخت جاں آمادۂ صد امتحاں آئے ۔۔۔ عذابِ چند روزہ یا عذابِ جاوداں آئے

غضب ہے مُنہ چھپانا سجدۂ ناحق کے پردے میں ۔۔۔ بلا سے تختۂ مشقِ ستم لوحِ جبیں ہوتی

دلیلِ راہِ دلِ شب چراغ تھا تنہا ۔۔۔ بلند و پست میں گزری ہے جستجو کرتے

اِن اشعار میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اندازِ بیان کی نوعیت دُوسرے شعرا سے مُختلف ہونے کے ساتھ مضامین کی ندُرت اور نوٗ اکت بھی موجود ہے، ہر بات عام سطح سے ہٹ کر کہی گئی ہے، اور ہر بات میں کوئی نہ کوئی جدّت پیدا کی گئی ہے، یہ چند مثالیں ہیں ورنہ ندُرتِ خیال اور ندُرتِ بیان کے نمونے یگانہ کے یہاں بہ کثرت ملتے ہیں۔

اس کہرا پے پن کے ساتھ یگانہ کے یہاں بہت سے ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کو پڑھ کر غالب کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، یہ اثر اُنھوں نے براہِ راست قبول نہیں کیا، بلکہ اُن کی اُفتادِ طبیعت کا نتیجہ ہے اس کے اندر نہ تو اتنے پیچ و خم ہیں جتنے غالب کے بہت سے اشعار میں ملتے ہیں اور نہ چیستانی انداز۔ غالب بیدل کے چکر سے نکلنے کے باوجود بیدل کی رمزیت

کو نہ چھوڑ سکے، اُنھوں نے ایسی لغو موشگافیوں اور ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا۔ لیکن مضمون کا رمزی اور طلسمی اشکال باقی رہا۔ یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن اور ایمائی اسلوبِ بیان کا لازمی نتیجہ تھا، یگانہ کے یہاں یہ رمزیت بالکل اُن کی ذاتی چیز ہے لیکن غیر شعوری طور پر (unconciously) اس میں غالب کا عکس ملتا ہے، یعنی بات کو غالب کے طریقے سے کہا گیا ہے، لیکن اندازِ بیاں یگانہ کا اپنا ہے جس پر کہیں سے تقلید کا گمان بھی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ پڑھنے والا غالب کے مزاج کی اِس خصوصیت سے واقف نہ ہو۔ غالب ہمیشہ بات کو درمیان سے یا سرے سے بیان کرتے ہیں، اور بہت سی کڑیاں چھوڑ دیتے ہیں جن کو خود تلاش کرنا اور بات کی بعض دُوسری تفصیلات ذہن میں فراہم کر کے مکمل کرنا ہوتا ہے، اسی لیے اُنھوں نے اپنے اشعار کو "گنجینۂ معنی کا طلسم" کہا ہے، اس طلسم میں پہونچ کر قاری کو طلسم کھولنے کے لیے دماغ لڑانا پڑتا ہے تب جا کر اُس کی رُوح یا تہ تک پہونچ سکتا ہے، بعض اوقات یہ محذوفات شعر میں بڑا لُطف پیدا کر دیتے ہیں، یگانہ کے یہاں بھی ایسے بہت سے اشعار ہیں جن کو سمجھنے یا اُن کی تہ تک پہونچنے اور اُن سے لُطف اندوز ہونے کے لیے وُہی غالب فہمی والی تھوڑی سی ریاضت درکار ہوتی ہے، ذیل کے اشعار اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں ؎

خوشا نصیب جسے فیضِ عشقِ شور انگیز ——— بقدرِ ظرف ملا، ظرف سے سِوا نہ ملا

ہوش اُڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھ کر ——— آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا

خُوشی سے ہو گئے بدخواہ میرے شادیٔ مرگ ——— کفن پہن کے جو میں گھر سے ناگہاں نکلا

مرنے کے ساتھ ہوں اندوہ و غم تو کیا کہنا ——— یقیں نہ ہو تو کرے کوئی امتحاں اپنا

نفس سے صلح کا انجام یہی ہونا تھا ——— اپنی ہر سانس پہ رہ رہ کے پشیماں ہونا

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس ——— گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دُعا ہو جائے گا

پرائے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک ——— حقیقت کُھل نہ جائے اضطراب راز داں ہو کر

نہ ترکِ اختیار آساں نہ ضبطِ اضطرار آساں ——— یہی دستِ دُعا جھلا کے اُٹھ جاتا تھا دشمن پہ

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

اُمیدِ صلح کیا ہو کسی حق پسند سے
پیچھے وہ کیا ہٹے گا جو حد سے بڑھا نہ ہو

فطرتِ مجبور کو اپنے گناہوں پہ ہے شک
وا رہے گا کب تلک توبہ کا در میرے لیے

موت کی یاد میں نیند اور بھی اُڑ جاتی ہے
نیند آ جائے تو کچھ موت کا ساماں ہو جائے

ترکِ لذّتِ دُنیا کیجیے تو کس دل سے
ذوقِ پارسائی کیا فیضِ تنگ دستی ہے

دُور سے ہنستے ہیں ظالم پاشکستہ جان کر
خیر مقدم کی صدا دیتے ہیں منزل سے مجھے

پناہ ملتی نہ اُمیدِ بے وفا کو کہیں
ہوس نصیب اگر ترکِ آرزو کرتے

صُلح جوئی نے گنہ گار مجھے ٹھہرایا
جرم ثابت جو کیا چاہو تو مشکل ہو جائے

حق میں اوروں کے تری ذات سراپا احساں
وائے قسمت کہ مری ضد سے تو عادل ہو جائے

یگانہ کے اسلوبِ بیان کی ایک اور خصوصیت ـ تمثیلی پیرایۂ بیان

یگانہ لکھنوی شعرا میں آتش کے بڑے مداح اور اُن سے متاثر نظر آتے ہیں، جس کا اظہار اُنھوں نے آتش کو خراجِ عقیدت کی شکل میں اپنے کئی اشعار میں کیا ہے ؎

کلامِ یاس سے دُنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرتِ آتش کا ہمزباں نکلا

ہمارا رنگِ سخن یاس کوئی کیا جانے
سوائے آتش ہے کون ہمزباں اپنا

اس میں شک نہیں کہ دبستانِ لکھنؤ کے شاعروں میں جذبات نگاری کی مثالیں اور وارداتِ قلب کی جھلکیاں اگر کسی شاعر کے کلام میں ملتی ہیں تو وہ صرف آتش ہیں، اگرچہ اُن کے یہاں بھی رعایتِ لفظی، ضلع جگت، صنائع بدایع اور توازماتِ حسن کے مصنوعی بیان کی کمی نہیں اور کہیں کہیں تو اس قسم کے شعر بھی ہیں ؎

کوئے جاناں چمن سے بہتر ہے　　اُس کا کُتّا ہرن سے بہتر ہے

لیکن اس کے باوجود اُن کا کلام نسبتاً خس و خاشاک سے پاک ہے اور سچّے اور حقیقی جذبات کی موجیں بیشتر مقامات پر رقصاں ہیں، پھر جہاں تک اندازِ بیان کا تعلق ہے وہاں بھی آتش ایک انفرادیت رکھتے ہیں اُن کا قلندرانہ بانکپن اور استغنائیت آمیز لہجہ اُردو غزل میں ایک مُنفرد حیثیت رکھتا ہے، اُن کا تمثیلی پیرایۂ بیان بھی بہت مشہور ہے، اُردو میں تمثیلی پیرایۂ بیان کا اگر کہیں ذکر ہوتا ہے تو پہلے آتش کی طرف خیال جاتا ہے، فارسی میں صائب اور غنی اس صنعت کے استعمال کے لیے مشہور ہیں، انھیں کی نازک خیالیوں سے متاثر ہو کر اُردو کے غزل گو شعرا کے یہاں بھی اس اندازِ بیان کا کافی رواج ہو گیا. اس کو صنعتِ احتجاج بہ دلیل بھی کہتے ہیں، اِس میں شاعر پہلے ایک دعویٰ کرتا ہے پھر اُس کے ثبوت میں ایک مثال پیش کرتا ہے یگانہ کے یہاں کہیں کہیں تمثیلی پیرایۂ بیان کارفرما ہے اور یہ آتش کے اثر کا فیضان ہے، لیکن یگانہ نے محض "فرضِ تقلید" ہی ادا نہیں کیا بلکہ اس میں ایک خاص دِل کشی اور اپنا انداز قائم رکھا ہے۔ جس کو پڑھ کر کہیں کہیں آتش سے زیادہ لُطف آجاتا ہے، اس قسم کی کچھ مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں ؎

چراغِ زیست بجھا دِل سے اِک دھواں نکلا　　لگا کے آگ مرے گھر سے میہماں نکلا
اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا　　خُدا کی شان کہ دُشمن نگہباں نکلا
اب اپنی رُوح ہے اور سیرِ عالمِ بالا　　کنویں سے یُوسفِ گُم کردہ کارواں نکلا

دِل کی ہوس وُہی ہے مگر دِل نہیں رہا　　محمل نشیں تو رہ گیا، محمل نہیں رہا

خلوتِ ناز کجا اور کجا اہلِ ہوس　　زور کیا چل سکے فانوس سے پروانے کا

اپنی ہستی خود ہم آغوشِ فنا ہو جائے گی　　موجِ دریا آپ ساحل آشنا ہو جائے گی

رفتارِ زندگی میں سکوں آئے کیا مجال　　طُوفاں ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے

نکہتِ گل کی ہے رفتار ہوا کی پابند　　رُوح قالب سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں

یگانہ کے حکیمانہ افکار

یگانہ کے یہاں حکیمانہ خیالات اور حیات و کائنات کے بعض مسائل پر خیال آرائی تو ملتی ہے لیکن منظم و منضبط فلسفہ یا خیال کی وحدت اور نظریات کا تسلسل نظر نہیں آتا، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے اور جذبات کی رو میں ہر بات سے اختلاف کرتے ہوئے اتنے آگے بڑھ گئے کہ

صبر و ضبط کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اُن کے اشعار میں مشاہدات و تجربات کے بوقلموں نقوش ملتے ہیں، جن کے مُطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے زندگی کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے اُس پر کافی غور و خوض بھی کیا، رسمی طرح خیالات ہی کو ادا کرنا کافی نہیں سمجھا، اُنھوں نے اپنی غزل میں زندگی کے بعض اہم نکات کی ترجمانی کی ہے اور اُن پر تبصرہ بھی کیا ہے، اُن کی نظر بڑی دُوررس اور اُن کا مشاہدہ بڑا عمیق ہے، اُن کے اِس قسم کے اشعار میں ایک مفکرانہ سنجیدگی ملتی ہے، جو قاری کو غور و فکر پر مجبور کرتی ہے، اس قسم کے اشعار میں اُنھوں نے اپنے تجربات و محسوسات اور مشاہدات کا نچوڑ پیش کیا ہے جن میں حیات و کائنات کے مسائل پر تبصرہ بھی ہے اور نفسیات انسانی کے بہت سے پہلوؤں کا بیان بھی۔ یہیں یگانہ کی شاعری اپنے انتہائی عروج پر پہنچ جاتی ہے، پھر اُن کا مخصوص طرزِ بیان اور طنزیہ لہجہ اُن کے وار کو بھرپور بنا دیتا ہے اور اُس کو ایک خاص سطح سے نیچے نہیں آنے دیتا۔ یہی وہ سطح ہے جو یگانہ نے اپنے لیے مخصوص کرلی ہے، جہاں وہ تنہا نظر آتے ہیں، جن اشعار میں کسی سنجیدہ اور عمیق مسئلہ کو بیان کیا جاتا ہے، وہاں خشکی و بے کیفی کا پیدا ہو جانا ایک لازمی امر ہے، یہ بات شاعر کی قدرتِ بیان پر منحصر ہے کہ اُس میں بے کیفی نہ ہونے پائے اور بات بھی بخوبی واضح ہو جائے۔ یگانہ نے جب کبھی کسی فلسفیانہ یا حکیمانہ مضمون کو لیا ہے تو اُس کو اپنے مخصوص اندازِ بیان سے انتہائی خوش گوار بنا کر پیش کیا ہے ——

ذیل میں ہم اس طرح کے بعض اشعار پیش کرتا ہوں جن میں یگانہ کی فکر کے بعض اہم زاویے قابلِ غور ہیں۔ گویا یگانہ کے یہاں فکر کا جو رُجحان ملتا ہے وہ اُن کے اسلوب کے لحاظ سے تو دُوسروں سے مختلف ہے ہی، لیکن اُن کے نظریات و افکار بھی دُوسروں سے مُختلف ہیں، اور اگر کہیں ایسا نہیں ہے تو طرزِ ادا کی ندرت نے اُن میں تازگی اور نیا پن پیدا کر دیا ہے، کچھ مثالیں درج ذیل ہیں ؎

مجھے دِل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

اس میں یگانہ نے جبر کے فلسفے کو اپنے مخصوص انداز میں جس طرح بیان کر دیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے، اہلِ جبر کا یہ خیال ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے، جو کچھ ہوتا ہے وہ خُدا کے حکم اور ایما سے ہوتا ہے، انسان اُس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے، سرشت و تقدیر اور ماحول ہی کے سبب سے ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ انسان گناہ کرنے پر مجبور ہو گیا، اُس کی ساری نشو و نما ماحول کی تابع ہے، اُس کی تعمیر و تخریب، نیکی و بدی میں ماحول و وراثت کا بھی ہاتھ ہے، جب انسان عمل پر کارفرما اور قادر نہیں، جب اُس کا 'ارادہ' بھی ایک نوع کا اضطرار ہے تو پھر اپنی "خطا" پر اُس کے منفعل ہونے کی کیا وجہ ہے، جوش نے بھی اس خیال کو کئی رُباعیوں اور بعض اشعار میں پیش کیا ہے، لیکن ایجاز و اختصار کے علاوہ جس جامعیت کے ساتھ یگانہ نے ادا کیا ہے وہ اُن ہی کا حصّہ ہے، پھر خطا پر نادم ہونے کے بجائے ایک طرح کا طنطنہ اور فخریہ لہجہ یگانہ کا مخصوص طرز ہے، جس نے شعر کو دُوسرے شعراء کی آواز سے بالکل الگ کر دیا —— فلسفۂ جبر کے اس موضوع پر یگانہ نے اپنے کلام میں طرح طرح سے اظہارِ خیال کیا ہے اور کہیں بھی دلیل و بُرہان کا ساتھ نہیں چھوڑا، اُنھوں نے اس مسئلے کو بہت سُلجھا کر پیش کرنے کی کوشش

کی ہے، جس سے بعض نئے گوشے بھی اُبھرے ہیں، ذیل کے اشعار میں اسی قسم کے خیالات کو نہایت شگفتہ طریقہ سے بیان کیا ہے اور ہر جگہ یگانہ کے "اندازِ بیان" نے شعر میں تازگی پیدا کر دی ہے ؎

سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور — گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے — وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

بندۂ فطرتِ مجبور ہوں مختار نہیں — ہاں ندامت میں ہے شک جرم سے انکار نہیں

سہو و خطا ودیعتِ فطرت سہی مگر — سمجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعار کو
اللہ رے اختیار کہ آمادہ کر لیا — فکرِ محال پر دلِ بے اختیار کو

بہانہ چاہئیے تھی موت بس نہ تھا اپنا — کہ میزبانیٔ مہمانِ حیلہ جو کرتے

خاک کا پُتلا ہے رفتارِ نمو سے مجبور — ہمہ تن سنگ بنے یا ہمہ تن دِل ہو جائے
صُلح جوئی نے گنہ گار مجھے ٹھیرایا — جرم ثابت جو کیا چاہو تو مشکل ہو جائے

یاس سر سے پانوں تک اُمید ہی اُمید تھے — فرد جب تک ہاتھ میں تھی کاتبِ تقدیر کے

فطرتِ مجبور کو اپنے گناہوں میں ہے شک — وار ہے گا کب تلک توبہ کا در میرے لئے

انوکھا گنہ گار یہ سادہ انساں — نوشتہ کو اپنا کیا جانتا ہے

یگانہ کے یہاں غالب کی طرح "تشکیک" کا ایک رُجحان بھی ملتا ہے، جس نے اُنھیں مذہب، خدا، اور دیر و حرم کے بارے میں بھی شُبہ میں ڈال دیا، اُنھوں نے کئی جگہ اپنے ان شبہات کا اظہار طنزیہ انداز میں کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی منزلِ مقصود یا مرکزِ حقیقی تک پہنچنا چاہتے ہیں، اگرچہ اس کا اُن کو کوئی سراغ نہ مل سکا، اور وہ عمر بھر اُمید و بیم اور "تشکیک و تذبذب" میں مُبتلا رہے، ذیل کے اشعار اُن کے تشکک پر روشنی ڈالتے ہیں ؎

بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ — کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتہ نہ ملا
اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر — کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

شش جہت میں ہے ترے جلوۂ بے فیض کی دھوم — کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہ گار نہیں

پار اُترے کیا دو آبۂ اُمید و بیم سے — جب ناخدا لئے دِل کو یقین خدا نہ ہو

کہئے کعبے کو سدھارے کہ صنم خانے کو — دیکھا دیکھی جو کوئی آپ کا دیوانہ بنے

بُتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا — خُدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

سجدۂ صبح و شام کیا کرتا — غائبانہ سلام کیا کرتا

زمانہ خدا کو خدا جانتا ہے — یہی جانتا ہے تو کیا جانتا ہے

ایک جھلک ہی دکھلا دے تو دُور سے جھک کر سلام کروں
اُس پار جگت کے ہوگا کوئی۔ اس پار نہیں تو کچھ بھی نہیں

کافرو دیندار اُن کے نزدیک دونوں گم کردہ راہ ہیں ؎

دِل مجھ سے پوچھتا ہے کہ تو کس طرف کو ہے — جوشِ جہاد کافر و دیندار دیکھ کر

نگاہِ بے نیازی نے دکھایا راستہ سیدھا — بھٹکتا کوئی کب تک جادۂ شیخ و برہمن پر

قیامت تک یہ کالے کوس روشن ہو نہیں سکتے — عبث ہے ہمرکابِ کافر و دیندار ہو جانا

غالب نے کہا ہے ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

بیگانہ بھی کچھ اس قسم کا خیال رکھتے ہیں اور اُمید و بیم کی کشاکش میں مُبتلا ہیں ؎

ٹھٹک رہے ہے حرم و دیر کے دوراہے پر — خلاف جا نہ سکے شاہراہِ فطرت کے

کھڑے ہیں دوراہے پہ دیر و حرم کے — تری جستجو میں سفر کرنے والے

منزل کی فکر کیوں ہو جب تو ہو اور میں ہوں — پیچھے نہ پھر کے دیکھوں کعبہ بھی ہو تو کیا ہو

اُن کی نظر میں یہ نماز، نماز نہیں بلکہ محض ٹکر لگانے کے مصداق ہے۔ "کعبۂ خانہ ساز" میں نماز کیا قبول ہو سکتی ہے، خصوصاً اُس وقت جبکہ اُس میں جذبِ دروں کی کوئی لہر شامل نہ ہو۔ ظاہری دینداری اور ریاضت و عبادت سے مقصد اُن کے نزدیک محض نمائش و نمود ہے ؎

زحمتِ سجدہ ہے فضول بتکدۂ مجاز میں — ہوگی نماز کیا قبول کعبۂ خانہ ساز میں
یادِ خدا کا وقت بھی آئے گا کوئی یا نہیں — یادِ گناہ کب تلک شام و سحر نماز میں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا پڑھے جاؤں تو کیا حاصل — نمازوں کا ہے کچھ مطلب تو پردیسی زباں کیوں ہو
کہیں رسمی عبادت رُوح کو بیدار کرتی ہے — نمازِ بے عمل سے حقِّ مذہب رائیگاں کیوں ہو

کلمہ پڑھوں تو کیوں پڑھوں سب کی نظر پہ کیوں چڑھوں — یادِ خدا تو دل سے ہے، دل سے زباں تک آئے کیوں

دل سے خدا کا نام لیے جا، کام کیے جا دُنیا کا — کافر ہو دیندار، دُنیا دار نہیں تو کچھ بھی نہیں

مُسلمان کا تصوّر اُن کے یہاں بہت وسیع اور بڑا آفاقی ہے، محض نُور و نار اور محض دیر و حرم ہی اُن کے یہاں مُنتہائے کمال نہیں ہیں، کلمہ پڑھ لینے اور داڑھی رکھ لینے سے کوئی مُسلمان نہیں ہو جاتا، داڑھی تو سکھوں کے بھی ہوتی ہے، یا محض مُسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے وہ "مسلمان" نہیں کہا جا سکتا، جب تک اس میں 'اسلام' کی وہ تمام اعلیٰ خصوصیات اور اقدار یعنی اسلام کی اصل رُوح موجود نہ ہو، محض زبان سے خدا و رسول کا نام لے کر مشرف بہ اسلام ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ؎

پڑھ کے دو کلمے اگر کوئی مسلماں ہو جائے — پھر تو حیوان بھی دو روز میں انساں ہو جائے
آگ میں ہو جسے جلنا تو وہ ہندو بن جائے — خاک میں ہو جسے ملنا وہ مسلماں ہو جائے

جیسا کہ اُوپر کہا گیا یگانہ کو خدا اور دیر و حرم کے متعلق شبہ ہے، دُنیا اُن کے خیال کے مطابق ناپائیدار ہے، ہر چیز بے ثبات ہے، مادہ فانی ہے، آخر میں سب کو فنا کے گھاٹ اُترنا ہے ؎

خدا میں شک ہے تو ہو، موت میں نہیں کوئی شک — مشاہدہ میں کہیں احتمال ہوتا ہے

لیکن وہ مرنے سے گھبراتے یا ڈرتے نہیں، بلکہ اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ اب سفر ختم ہوا ؎

موت آئی آنے دیجیے، پروا نہ کیجیے — منزل ہے ختم سجدۂ شکرانہ کیجیے

مگر "فردا" پر اُن کا بالکل یقین نہیں، فردا اُن کے نزدیک ناقابلِ اعتبار حقیقت ہے اس کی وجہ اُن کی نظر میں یہ ہے کہ انسان کی مُثبت عملی طاقتیں فردا کے تکیہ یا آسرے میں کمزور اور ڈھیلی ہو جاتی ہیں، اور ان میں وہ قوّتِ عمل اور جوش و ولولہ باقی نہیں رہتا جو آج اُن میں موجود ہے، دُوسرے چُونکہ اُن کے یہاں انسان مجبور ہے اس لیے معلوم نہیں کل کیا صُورت پیش آئے اور وہ اپنے عمل پر قادر نہ رہ سکے۔ یا کل وہ بات اُس کے قبضۂ قدرت سے باہر ہو جائے اِسی لیے اُنھوں نے کئی جگہ اپنے مخصوص انداز میں "فردا" کا مذاق اُڑایا ہے ؎

فردا کو دُور ہی سے ہمارا سلام ہے دِل اپنا شام ہی سے چراغِ سحر ہوا

اِسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دُور اِس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا

اِک معنیٔ بے لفظ ہے اندیشۂ فردا جیسے خطِ قسمت کہ پڑھا بھی نہیں جاتا

عجب کیا وعدۂ فردا پسِ فردا پہ ٹل جائے کوئی شام اور آجائے نہ شامِ بے سحر ہو کر

لذّتِ مژدۂ فردا میں جو ہیں ڈوبے ہوئے طعنۂ غفلتِ امروز سُنا کرتے ہیں

دکھائی آج ہی آنکھوں نے صوُرتِ فردا خزاں کی سیر بھی ہنگامۂ بہار میں ہے

خیالِ خام ہے یا معنیٔ موہوم کیا جانیں سمجھ میں رازِ فردا کیوں نصیبِ دشمناں آئے

دلِ نامحرمِ فردا خُدا کی مار ہو تجھ پر ابھی سے نشۂ حُسنِ عمل میں چوُر ہو جانا

کون جانے وعدۂ فردا وفا ہو جائے گا آج سے کل تک خُدا معلوم کیا ہو جائے گا

لذّتِ زندگی مُبارکباد کل کی کیا فکر، ہرچہ بادا باد

کبھی حقیقتِ فردا سُنو تو کان کھُلیں ندائے دل ہے کوئی دُور کی پُکار نہیں

سلامت آپ کا یہ حُسنِ لا زوال، مگر　　ہم آج ہی کے ہیں، کل کے اُمید دار نہیں

جو دم ہے غنیمت ہے، کیا جانیے کل کیا ہو　　اک دُور کی نسبت ہے امروز کو فردا سے

یگانہ کے یہاں ایک خوُد پرستی کا رُجحان بھی ملتا ہے جو خوُدی یا خوُدداری کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اُس کو بگاڑنے میں اُن سب حالات کا ہاتھ ہے جو "غالب شکن" لکھنے کا باعث ہوئے اور جس کے بعد یگانہ خودی یا خودداری سے "خوُد پرستی" پر اُتر آئے، خود کہتے ہیں ؎

خوُد پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے　　آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

"ناحق پرستی" کا اشارہ "غالب پرستی" کی طرف ہے، جو لکھنؤ کے اساتذہ پر ایک طنز ہے، ایک دُوسری جگہ قدرے وضاحت سے کہتے ہیں ؎

خوُدی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا　　خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

یہ شعر اُن کے نقطہ نظر اور خیال کا بڑا اچھا ترجمان ہے کہ کس طرح خوُدی کے نشہ نے اُن کو آپے سے باہر کر دیا اور وہ خدا بھی نہ بن سکے، لیکن اس سے انکار نہیں کہ "خوُد پرستی" کا یہ رُجحان بھی اُردو غزل بلکہ اُردو شاعری کے لیے نئی چیز ہے، اُن کی حق پرستی خوُد پرستی ہے، اِسی لیے وہ خوُد کو سجدہ کرنے کے لیے تیار ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں، انسان کو دُنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھتے ہیں، اُن کے خیال کے مطابق یہی "حق پرستی" ہے کہ خوُد کو پہچان لیا جائے، جس نے خود کو سمجھ لیا اُس نے حق کو سمجھ لیا، لیکن یہ تصوّف کے اُس نظریہ کہ "انسان اپنے تئیں اس خدا تک پہنچا سکتا ہے" سے بالکل مختلف ہے، یگانہ کو خدا اور دیر و حرم کے متعلق شبہ ہے لیکن انسان جیسی کھلی ہوئی حقیقت پر اُن کا ایمان ہے اور اُس کی عظمت کے وہ قائل ہیں، انسان اُن کے نزدیک ایک زبردست قوّت ہے جس کو سجدہ تک لازم ہے، اگر یگانہ اپنے آپ کو سنبھال لے جاتے اور خود پرستی یا "ہم چو من دیگرے نیست" کا شکار نہ ہو جاتے اور اپنی فکر کو منظم اور منضبط صورت میں پیش کرتے تو اُن کا کارنامہ کہیں زیادہ وقیع اور ایک خاص نقطۂ خیال کا حامل ہوتا۔ اُن کی خود پرستی یا حق پرستی کی نوعیت کی جھلک ذیل کے اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے ؎

آئینہ ہے وہ زیارت گاہ جس کے سامنے　　خوُد پرستوں کے لیے سجدہ روا ہو جائے گا

خوُد پرستانِ ازل دارند ایمانے دگر　　حق پرستی می کنند امّا بہ عنوانے دگر

زہے معراجِ انسانی کہ بندہ ہوُں تو اپنا ہوُں　　چڑھایا خود پرستی نے نگاہِ دوست و دشمن پر

بندۂ خود شناس ہے اپنے ہی پیرہن میں مست　　بوئے خودی کو دخل کیا پیش گہ ایاز میں

کیا بتاؤں کیا ہوں میں قدرتِ خدا ہوں میں　　میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے

دلیلِ راہ دلِ شب چراغ تھا تنہا　　بلند و پست میں گزری ہے جستجو کرتے

مزہ تو جب ہے یگانہ کہ بر دلِ خود بیں　　خودی کے نشہ میں بے گانہ خمار رہے

اب مختلف النوع مضامین کے مزید اشعار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں، جن میں یگانہ نے حیات و کائنات کے بعض مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے، ان اشعار کو دیکھنے کے بعد یگانہ کی ندرتِ فکر اور ندرتِ بیان کا کلمہ پڑھا جاسکتا ہے

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے　　وہ بد نصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور　　بے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر　　ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

لگا ہے دل کو اب انجامِ کار کا کھٹکا　　بہارِ گُل سے بھی اک پہلوئے خزاں نکلا

قصہ کتابِ عمر کا کیا مختصر ہوا　　رُخ داستانِ غم کا ادھر سے اُدھر ہوا

دل مرا دکھتا ہے خار و گُل کو باہم دیکھ کر　　دیدنی نادیدنی دونوں کو توام دیکھ کر

زمانے بھر کا منہ تکتے ہیں کیوں اپنی طرف دیکھیں　　بسر کرنا ہے جن کو رنگ و بوئے رائیگاں ہو کر

پیامِ غفلت جاوید ہے جلوہ حقیقت کا　　سما جائے نہ آنکھوں میں کہیں خواب گراں ہو کر

موجِ ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو　　دُنیائے گرد باد کی نشو و نما نہ ہو

حیرت نے شش جہت میں نظر بند کر دیا نامحرمِ طلسمِ خزاں و بہار کو

خُدا پرست بھی بندے ہیں حُسنِ فطرت کے سمجھ میں آئے نہ راز اِس طلسمِ حیرت کے
ہمیشہ منتظرِ انقلاب رہتے ہیں مزاج داں ہیں جو ہنگامہ زارِ فطرت کے

بلند و پست برابر ہیں اپنی نظروں میں خیالِ خام ہے یا ولولے ہیں ہمت کے
سعادتِ ابدی ہے مشیّتِ ازلی ہوس فضول بھروسے پہ حُسنِ خدمت کے

مشاہدے کو اک آئینۂ جمال دیا کمالِ عشق نے جوہر دکھادیے دل کے

عالمِ اسباب سے کیا فیضِ ناکامی ملا راہ پہ لاکر مجھے بھٹکا دیا تقدیر نے

ہاں وسعتِ زنجیر تک آزاد بھی ہوں میں ہستی مری مجموعۂ اضداد رہے گی
ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش دُنیا، یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

ہوش و خرد حقیقتِ روشن کہیں جسے ہے اک جھلک سی پردۂ صد احتمال میں

صبح و شامِ زندگی خوابِ پریشاں ہی سہی کچھ حقیقت کا بھی جلوہ، جلوۂ باطل میں ہے

غُنچے سے دل میں کچھ نہ تھا اک آہ کے سوا پھر کیا شگفتگی کی تمنّا کرے کوئی

یگانہ کا تغزّل

سطورِ بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جو مثالیں پیش کی گئی ہیں اُن سے اندازہ ہوا ہوگا کہ یگانہ کا اصل میدان یا موضوعِ سخن فطرتِ انسانی کی نفسیات کا بیان ہے، اِس کے علاوہ اُنھوں نے عالم اور نظامِ عالم پر بھی بہت کچھ لکھا ہے، حیات کے متنوّع اور پیچیدہ مسائل پر فکر و نظر کی گہرائی اُن کے ہاں ملتی ہے، لیکن حُسن و عشق کی کیفیات اور "حدیثِ لب و رُخسار" کا بیان اُن کا اصل موضوع نہیں ہے، نہ اُنھوں نے اس میدان میں زیادہ طبع آزمائی کی ہے، اُن کے عشقیہ اشعار میں اگر اُن کا لہجہ اور انداز شامل نہ ہوتا تو وہ اُردو کے ہزاروں فرسودہ و رسمی اشعار کی صف میں آجاتے — یگانہ نے اپنے جن اشعار میں حُسن و عشق اور کیفیاتِ محبّت کی باتیں کی ہیں، اُن کو روایتی سے زیادہ

مصنوعی کہہ سکتے ہیں، اس قسم کے اشعار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محض اُن کے دماغ کی پیداوار ہیں اور اُن میں وہ کیفیت نہیں ملتی، جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ 'از دل خیزد و بر دل ریزد'۔ اس کی ایک وجہ اُن کی غزلوں کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عشق و محبت کے کوچے سے ناآشنائے محض ہیں، اُس کے نشیب و فراز، اس سلسلہ میں پیش آنے والی کیفیات و واردات، اور عشق کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا اُن کو علم و احساس نہیں، اُن کے عشقیہ اشعار میں نہ دھڑکتا ہوا دل ملتا ہے اور نہ روتی ہوئی آنکھ۔ ان سب باتوں کے متعلق اُن کا علم سماعی اور تخیلی معلوم ہوتا ہے، اس لیے اُس میں وہ تپش اور سوز نہیں جو واقف کار عشقیہ شاعروں کے یہاں ملتے ہیں۔ دوسرے اُن کی اس ذہنی پیداوار میں بھی اُن کا کڑا اور تند و تیز لہجہ، طرزِ ادا، اور اکڑ اُس میں سوز و گداز، سپردگی، والہانہ ربودگی پیدا نہیں ہونے دیتی۔ جس سے اُن کی بات دِل کو لگ سکے اور نقل میں اصل کا لطف آئے۔ وہ خود اپنے آپ کو اتنا بلند سمجھتے ہیں کہ کبھی سپردگی کے لیے خود کو تیار نہیں کر سکتے، سرور صاحب کے بقول "یہ حریم حسن میں بھی اپنے آپ کو بھلا نہیں سکتے۔"
اُن کے یہاں عشقیہ اشعار میں غزل کی مخصوص اور مروّجہ غنائیت کے بجائے ایک کرارا انداز ہے، جس میں شعریت کا فقدان نہیں لیکن چونکہ ہمارے کان اُس سے آشنا نہیں ہیں اس لیے ہمیں اُس میں اکھڑا اکھڑا پن اور بے کیفی محسوس ہوتی ہے۔ اُردو میں بہت سے ایسے غزل گو شاعر ہیں جو عشق و محبت کے کوچے سے نابلد رہے ہیں، لیکن اُن کے تغزّل میں جو کیفیت، سپردگی اور سوز و ساز ملتا ہے، اُس کو پڑھ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ "دِل گداختہ" سے نکلے ہوئے "نغمات" ہیں لیکن جیسا کہ سطورِ بالا میں کہا گیا، یگانہ کے تغزّل میں نہ کوئی لطف ہے اور نہ جدّت اور نیاپن، نہ والہانہ انداز اور رنگین بیانی ہی، کہ جس سے بات اثر کن بن کر دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ لے، نئی چیز ہے تو یہی کہ کہیں کہیں اُن کا کرارا پن یہاں بھی چھپا یا ہوا ہے، ذیل کے اشعار سے اُن کے متغزّلانہ رنگ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

آنکھ جھپکی تھی تصوّر بندھ چکا تھا یار کا — چونکتے ہی حسرتِ دیدار کا دفتر کھلا

جانِ ایماں ہے ابھی وہ آنکھ شرمائی ہوئی — کیفیت میں ڈوب کر کیا جانے کیا ہو جائے گی

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا — چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

دُور سے اُن کو آج دیکھ لیا — دل کو تسکین ہوئی مگر نہ ہوئی

چُپ لگی مجھ کو گناہِ عشق ثابت ہو گیا — رنگ چہرے کا اُڑا رازِ دلِ مضطر کھلا

شب تاریک نے پہلو دبایا روزِ روشن کا — زہے قسمت مری بالیں پہ تیرا جلوہ گر ہونا

زنجیر پھر ہلا دی نسیمِ بہار نے — پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہو گیا

واہ کس ناز سے آتا ہے ترا دورِ شباب — جس طرح دور چلے بزم میں پیمانے کا
دیکھ کر آئینے میں چاکِ گریباں کی بہار — اور بگڑا ہے مزاج آپ کے دیوانے کا

خنجر انھیں ملتا ہے تو ہم کو نہیں پاتے — جب ہم کو وہ پاتے ہیں تو خنجر نہیں ملتا

سایۂ دیوار سے لپٹے پڑے ہو خاک پر — اُٹھ چلو ورنہ وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی — دِل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

واہ ری وارفتگی جاتی رہی سب بھوک پیاس — چشمِ بُلبل سے گلوں کو غرقِ شبنم دیکھ کر

دیندار و بُت پرست اُترتے ہیں ایک گھاٹ — کیا معجزہ ہے جنبشِ ابروئے یار میں

جلوہ گر رہنے لگا چشمِ تصوّر میں کوئی — حضرتِ دل بے سبب راتوں کی بیداری نہیں

یہ کس کے سر رہے گا خُونِ ناحق بے گُناہوں کا — وفاداروں کی ضد سے آپ قتلِ عام کرتے ہیں

کنکھیوں سے جو ہم کو بزم میں تم دیکھ لیتے ہو — کھٹک جاتے ہیں کانٹے کی طرح ہم چشمِ دشمن میں

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن گُل کھلائے گی — قفس سے چھوٹ کر سر پہ اُٹھا لیں گے گلستاں کو

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے — آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے

ہے جان کے ساتھ اور اک ایمان کا ڈر بھی   وہ شوخ کہیں دیکھ نہ لے مُڑ کے ادھر بھی
وہ ہم سے نہیں ملتے، ہم اُن سے نہیں ملتے   اک ناز دل آویز ادھر بھی ہے اُدھر بھی
اللہ ری بیتابیٔ دل وصل کی شب کو   کچھ کشمکشِ شوق بھی، کچھ صُبح کا ڈر بھی

دیوانے بن کے اُن کے گلے سے لپٹ بھی جاؤ   کام اپنا کر لو یاسؔ بہانے بہانے میں

لڑکھڑا کر ذرا کاندھے پہ سہارا جو لیا   ہاتھ کٹوائے ہیں ظالم نے مرے شانوں سے

نشۂ حُسن کی یہ لہر الٰہی توبہ   تشنہ کام آنکھوں ہی آنکھوں میں پیے جاتے ہیں

دید کی التجا کروں؟ تشنہ ہی کیوں نہ جان دُوں   پردۂ ناز خود اُٹھے دستِ دُعا اُٹھائے کیوں؟

زیادہ اشعار اس لیے پیش کیے گئے کہ اُن کے رنگ و انداز کا پُوری طرح اندازہ ہو سکے۔ میری رائے میں ان اشعار میں صرف تین ایسے ہیں جو کسی اوسط درجے کے انتخاب میں شامل کیے جا سکتے ہیں یعنی یہ اشعار ـــ

جانِ ایماں ہے ابھی وہ آنکھ شرمائی ہوئی   کیفیت میں ڈُوب کر کیا جانے کیا ہو جائے گی

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سُراغ باطن کا   چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے

دُور سے آج اُن کو دیکھ لیا   دِل کو تسکین ہوئی مگر نہ ہوئی

یگانہ اُردو غزل میں اپنے عاشقانہ اشعار کی وجہ سے زندہ نہیں رہیں گے، نہ اب اس حیثیت سے اُن کو کوئی جانتا ہے، اُن کا اصل Contribution جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اُن کا تیکھا اور کرارا اندازِ بیان ہے جو بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے اور اُس میں آواز اور موسیقی کے لحاظ سے ایک نیا زیر و بم اور ایک نیا آہنگ پیدا کر دیتا ہے، جو اُردو غزل کے سرمایے میں اسٹائل کا واحد نمونہ ہے، دُوسرے ایسے اشعار جن میں حیات و کائنات کے مختلف النّوع مسائل و مراحل پر تبصرہ ہے، جن میں اُنھوں نے انسان اور کائنات کے نفسیاتی حقائق و مشاہدات شاعرانہ لباس میں پیش کیے ہیں، اور بعضوں میں اسرارِ حیات جاننے کی خواہش مذہبی نقطۂ نظر سے کُفر کی حد تک پہنچ گئی ہے، بس اُن کی غزلوں کیا بلکہ اُن کی شاعری کی یہی وُہ خصوصیات ہیں جو اُن کو اپنے معاصرین کی صف میں نمایاں کرتی ہیں اور دبنے نہیں دیتیں، اور دراصل یہی ادب کو اُن کا عطیہ ہے، یا پھر اُن کی زبان دانی، محاورں، اور روزمرّہ کا استعمال، اُن کی بعض تراکیب، عروضی نکتے،

اور بلاغت، یعنی اُن کی فن کاری میں لُطف آتا ہے۔ یگانہ کے یہاں عروض کی وہ باریکیاں ملتی ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے قاری کو اُن پر بھی غور کرنا اور اُن سے لُطف اُٹھانا پڑتا ہے، مثلاً اس طرح کے اشعار ؎

ہمارا رنگِ سُخن یاسؔ کوئی کیا جانے ــــــ سوائے آتشؔ ہے کون ہمزبان اپنا

ہوا بھری افسردہ دلوں کی رُت بدلی ــــــ اُبل پڑا ہے پھر رنگ نقشِ باطل کا

سجدۂ اولیں میں پاس پا گئے دادِ بندگی ــــــ شادیٔ مرگ ہو گئے عید کے دن نماز میں

اگر کوئی شخص عروض سے واقف نہیں ہے تو ان کو صحیح پڑھنے میں اُسے دقّت ہوگی، مثلاً پہلے شعر کے دُوسرے مصرع میں لفظ آتشؔ کے بعد زبان رُکتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہاں کوئی اضافت ہونا چاہیے حالانکہ مصرع موزوں ہے، دُوسرے رُکن پر تسکینِ اوسط کا زحاف واقع ہوا ہے، اس وجہ سے اس مصرع کی تقطیع "مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن" کے بدلے "مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلن" پر ہوگی۔

اُوپر میں نے یگانہ کے حکیمانہ افکار، اُن کے تغزّل اور خاص طور سے اُن کے منفرد اندازِ بیان اور لب و لہجہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، لیکن یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ یگانہ کے یہاں مضامین میں خاصا تنوّع موجود ہے۔ اُنھوں نے زندگی کا مختلف رُخوں سے مطالعہ کیا ہے۔ حیات کے بہت سے نکات کو بیان کیا اور اُن پر تبصرہ کیا ہے، غزل کو فدویانہ متایام، دھیمے اور سُریلے لہجے کے بجائے ایک کڑک دار اور مردانہ لہجہ عطا کیا ہے، جس میں بڑی بلند آہنگی اور بڑا کس بل ہے، یگانہ کے اِس قسم کے اشعار قاری کے ذہن پر ایک یہ تاثر بھی چھوڑتے ہیں کہ زندگی کے نقائص و محاسن، خوبیوں اور خامیوں اور نور و ظلمت پر بھی اُس کی نظر پڑنے لگتی ہے۔ یگانہ کے اشعار پڑھ کر قاری کو زندگی کے بارے میں ایک بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اُن کے اشعار کو اگر تنقیدِ حیات (Criticism of Life) کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، اُنھوں نے اپنے کو کسی خاص موضوع کا پابند نہیں کیا، بلکہ بیشتر موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ وجودِ باریٔ تعالےٰ، دیر و حرم، نور و نار، کفر و ایماں، مرگ و زیست، رُوح و جسم، مادہ، جبر و قدر، بے ثباتیٔ دُنیا، فنا و بقا، رنج و خوشی، آغاز و انجام، نیکی و بدی، انسان کی عظمت، اُمید و بیم، صبح و شام، یہ سب موضوعات اُن کی غزلوں میں جاری و ساری ہیں؛ اور اُن سب پر اُنھوں نے حکیمانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے؛ غالب کی عظمت کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ اُنھوں نے زندگی کے ہر پہلو پر اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے، جس سے اُن کی شاعری میں بڑا تنوّع آگیا ہے، اُن کی شاعری نتائج کی شاعری ہے، اس کے برخلاف ذوقؔ اور مومنؔ کے یہاں یہ خصوصیت نہیں ملتی، ذوقؔ اور مومنؔ کیا اقبالؔ کے مقابلے میں بھی غالب کی عظمت و برتری کا بڑا سبب، اُن کا تنوّع ہی ہے؛ ورنہ آج اقبال مرزا غالب سے کہیں بڑے شاعر ہوتے۔ کچھ اسی طرح کی صُورت یگانہ کے یہاں بھی ملتی ہے، زندگی کی شاید ہی کوئی

اہم لہر ہو جو یگانہ کے ذہن سے ہو کر نہ گزری ہو، گویا یگانہ نے غزل کو زندگی اور زندگی کو غزل بنا دیا۔ وہ اپنے دور کا طرازِ اول انقلابی شاعر تھا، جس نے غزل کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا اور ایک نئے مدرسۂ فکر کی طرح ڈالی، گو "خود پرستی" اور بعض دیگر حرکات (مثلاً غالب شکنی وغیرہ) کے باعث اُن کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ قائم ہوا، لیکن نقاد کا فرض ان سب باتوں سے بلند ہے، نقاد تو فن کا پارکھ ہے، اس کو تو فن پارے کے حسن و قبح سے بحث ہے، اُس کو کسی کے کردار سے بحث نہیں، وہ مولوی یا مفتی نہیں ہے، نہ اُس کو اس کی ضرورت ہے، اُس کو ہر حال میں غیر جانبدار (Disinterested) رہنے کی ضرورت ہے، اگر ایسا نہ ہوا تو وہ فن کار اور فن پارے کے ساتھ انصاف نہ کر سکے گا۔ یگانہ کا مطالعہ بھی ہمیں اُن کی ان سب باتوں سے خالی الذہن ہو کر کرنا چاہیے، جبھی اُن کے شاعرانہ مرتبہ کا صحیح تعین ہو سکتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں نے یگانہ پر اعتراض کیا تھا کہ ان کے یہاں ایک نیا آہنگ اور مردانہ لب و لہجہ تو ملتا ہے لیکن موسیقیت آگیں اور ترنم آمیز انداز نہیں ملتا، جو غزل کی مخصوص کیفیت میں شمار ہوتا ہے، اُن کے اشعار نشتر کی سی کھٹک اور میٹھے درد کے بجائے تلوار کا گھاؤ عطا کرتے ہیں، اس کی وجہ اُن کے یہاں "شعریت و تاثیر" کی کمی میں تلاش کی جا سکتی ہے ——— حالانکہ یہ رائے صحیح نہیں، یگانہ کے یہاں ایسے اشعار بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں جن میں شعریت و غنائیت مفقود ہے اور نثر کا انداز و سپاٹ پن بھی پیدا ہو گیا ہے، اور اخیر زمانے میں تو یگانہ نے محض ضرب الامثال اور محاورہ بندی یا روزمرہ کے استعمال ہی کو "شیوۂ اہلِ نظر" سمجھ لیا تھا، جس کے باعث اُن کا کلام لطافت و کیفیت سے معرّیٰ ہو کر زباں دانی کے مظاہرہ کا میدان بن گیا اور شعریت و تاثیر رخصت ہو گئی، مثلاً اس قسم کے اشعار ؎

پالا امید و بیم سے ناگاہ پڑ گیا — دل کا بنا بنایا گھروندا بگڑ گیا

پہلے اپنی تو ذات پہچانے — رازِ قدرت بکھاننے والا

صورت ہی ایسی پیاری دیکھو تو رال ٹپکے — فطرت کا اقتضا ہے، بندے کی کیا خطا ہے

قربان تیری اٹکھیلیوں کے — خود سر چڑھائے خود مار اُتارے

اُف ری مشیت بھولے تو لاکھوں — پھلنے نہ دیکھے سارے کے سارے

پیٹ کے ہلکے لاکھ بڑ ماریں — کوئی کھلتا ہے ہا ننے والا

راہ چلتے لپٹ پڑے نہ کہیں — بے دھڑک دل میں ٹھاننے والا
میں سمجھ لوں گا دوست سے تو کون — مجھے رہ رہ کے تاننے والا
چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے — میں کہاں ہار ماننے والا
خاک میں مل کے پاک ہو جانا — چھاننا کیا ہے چھاننے والا

انگور کھٹے ہوں خواہ میٹھے — بے دسترسی کی طعنہ زنی کیا
مُنہ سے نہ بولو سر سے تو کھیلو — ہے ماجرائے ناگفتنی کیا

ایسے کے پاؤں چومیے یا پیار کیجیے — قدموں پہ میں جھکا تو وہ دونا اکڑ گیا
مشتہ زوریوں کا حوصلہ سرکارِ حسن سے — آعند پڑی وہ مار کہ چمڑا سا اُدھڑ گیا

کدھر چلا ہے ادھر ایک رات بستا جا — گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا
جفائے پنجۂ خونخوار سے جو بس نہ چلے — تو بن کے خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا

ہائے یہ بہکی بہکی باتیں کیوں — کیا کوئی بھنگ چڑھ گئی سرکار

لگی ہو چاٹ جنھیں تیری بد زبانی کی — ادب سے بیٹھیں گے نچلے وہ منچلے کیوں کر

کہیں پتھر بھی ہو سکتا ہے پانی — دُعاؤں کی رسائی ہو چکی بس
بجھائے کون تو جس کو جلائے — پتنگوں کی چڑھائی ہو چکی بس

تو کہاں اور کہاں وہ جلوۂ پاک — دلِ بے باک تیری آنکھ میں خاک
گھُل گئے جیسے موم کی مریم — کیوں بڑھایا تھا دل جلوں سے تپاک
فلسفی کو خبر نہیں اپنی — آنکھ کے آگے ناک سوجھے خاک

گوشہ گیری ہے اک انوکھا سانگ — مانگتا ہے کھُلے خزانے مانگ (پوری غزل)

حُسن پر فرعون کی پھبتی کہی　　ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی　　(پوری غزل)

خدا کی مار وہ ایامِ شورو شر گزرے　　وہ جن سوار تھا سر پر کہ سر سے در گزرے

آگ بجھ جائے، مگر پیاس بجھائے نہ بجھے　　پیاس ہے یا کوئی ہوکا کہ پیے جاتے ہیں

اپنی ڈفلی، اپنا راگ، اپنی دڑ ہے، اپنی بھاگ　　کہنے میں بات آتی ہے، سردار نہیں تو کچھ بھی نہیں

کام کیا فلسفی کا رندوں میں　　کیوں ہو بیٹھے بٹھائے، رنگ میں بھنگ

یہ اُن کے دوسرے اور آخر دور کے اشعار ہیں جب کہ ضرب الامثال اور محاورہ بندی کو اُنھوں نے اپنا مطمحِ نظر بنا لیا تھا، چنانچہ بعض پوری، پوری غزلوں میں یہی کرشمہ کاریاں نظر آتی ہیں، اب وہ اشعار دیکھیے جن میں یہ کرشمے تو نہیں لیکن پھر بھی "کیف اور تاثیر" سے معرّیٰ ہیں۔ ان کو منظوم کلام کہا جا سکتا ہے اور صرف تبرکاً پڑھا جا سکتا ہے ؎

دیر و حرم بھی ڈھے گئے جب دل نہیں رہا　　سب دیکھتے ہی دیکھتے ویرانہ ہو گیا

بہت میں نے ٹٹولا جادۂ شیخ و برہمن کو　　کوئی آساں ہے ناہموار کا ہموار ہو جانا
کوئی طوفان آیا یا مرے کان بجتے ہیں　　ذرا اے بندگانِ ناخدا ہشیار ہو جانا

لاش کم بخت کی کعبے میں کوئی پھکوا دے　　کوچۂ یار میں کیوں ڈھیر ہو بے گانے کا

کیا عجب ہے جو حسینوں کی نظر لگ جائے　　خون ہلکا ہے بہت آپ کے دیوانے کا

اِس طلسماتِ عناصر کی حقیقت کھل گئی　　جب گڑھے میں گور کے انسان داخل ہو گیا

آنکھ والے راہ میں حیرت کے پتلے بن گئے　　کچھ نہ سوجھا خاک کے پُتلوں کا عالم دیکھ کر

عمر گھٹنے کے لیے ہے، وقت کٹنے کے لیے　　مُفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بے گار میں

صدمے دیئے تو صبر کی دولت بھی دے گا وہ
کس چیز کی کمی ہے سخی کے خزانے میں

دیواریں پھاند پھاند کے دیوانے چل بسے
خاک اُڑ رہی ہے چار طرف قید خانے میں

بہت دستِ جنوں نے گدگدایا جب تو کیا کرتے
اُتاریں بیڑیاں اور پہنے دوہرے طوق گردن میں

آپ کے بیمار نے ہیں سختیاں جھیلیں بہت
شب بخیر اور ایک دھاوا آخری منزل کا ہے

گلے پر چھُری کیوں نہیں پھیر دیتے
اسیروں کو بے بال و پر کرنے والے

گریباں میں مُنہ ڈال کر خود تو دیکھیں
بُرائی پہ میری نظر کرنے والے

اپنی ہستی میں بھی کچھ تنگ آ پڑا
عِلم کا سودا بڑا مہنگا پڑا

زندہ رکھا ہے سسکنے کے لیے
واہ اچھے دوست سے پالا پڑا

بہالے گیا گھر بھی ابرِ کرم
جو بویا تو کیا اور نہ بویا تو کیا

وہ جوانی کی موج وہ منجدھار — خیر نیت بخیر۔ بیڑا پار
دُور سے دیکھ لو حسینوں کو — نہ بنانا کبھی گلے کا ہار
خبطِ مذہب ہو خواہ تحفۂ کفر — جس سے پایا اُسی کے سر مارا

لیکن مجموعی طور پر اُن کے کلام کا یہ رنگ نہیں ہے، اُن کے یہاں شعریت، موسیقیت، اور تاثیر کی بڑی افراط ہے۔ لیکن اصغر، حسرت، جگر، فانی یا بعض دُوسرے مُمتاز غزل گو شعرا کے کلام کی شعریت و موسیقیت کے معیار سے یگانہ کی شاعری کو جانچا جائے تو یقیناً فرق محسوس ہوگا۔ چونکہ اُنھوں نے اُردو غزل کی مروّجہ روایات اور مخصوص فضا سے انحراف کیا ہے اس لیے ہمیں اُن کے یہاں ایک اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے، ایسی اجنبیت جہاں ہر عام آدمی زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتا۔ نہ بخوشی یگانہ کے ساتھ زیادہ دُور تک جا سکتا ہے۔ لیکن اس اجنبیت کے پردے میں ایک نئی آواز کی لرزشیں موجود ہیں، جن سے اُردو غزل کی نئی نسل کو بہت کچھ مِل سکتا ہے، مجنوں صاحب نے صحیح کہا ہے کہ

"یاس اُن لوگوں میں سے ہیں جن کے کلام کی رہنمائی میں غزل کی ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو سکتی ہے، جو اس قابل ہو کہ زندگی کے نئے میلانات اور نئے مطالبات سے عُہدہ برآ ہو سکے۔"

یگانہ کا بات کہنے کا انداز یعنی "شیوۂ گفتار" چونکہ دُوسرے غزل گو شعرا سے مختلف ہے، اس لیے لوگوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ اُن کے یہاں شعریت و موسیقیت کی کمی ہے اور اُن کی بات تاثیر سے معرّیٰ ہے، حالانکہ اُن کی آواز کا جادو انسان کے ذہن و قلب کو مرعوب بھی کرتا ہے اور اپیل بھی۔ میں اس جگہ شعریت و موسیقیت کے بارے میں تفصیل سے بحث کرتا لیکن مضمون کی طوالت دامن گیر ہے، اس مضمون میں جتنے اشعار پیش کیے گئے ہیں اُن سے اس اعتراض کی صداقت کا پتہ چل سکتا ہے۔

غرض کہ یگانہ اُردو کے اہم اور مُمتاز غزل گو شاعر ہیں، اُنھوں نے اُردو غزل کو فکر و خیال کی جو ندرت، اظہار کی جو جراًت اور بیباکی، اسلوب کی جو انفرادیت اور لہجہ کی جو نئی جھنکار دی ہے، وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ پھر زبان، محاورہ، روزمرّہ اور عروض پر اُن کی قدرت اور وہ بھی حاکمانہ قدرت کا جواب نہیں ہے، اچھے اچھے کہنہ مشق اساتذہ کہیں نہ کہیں چوک جاتے ہیں لیکن یگانہ ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں فنّی لغزشیں شاید ہی کہیں نظر آئیں، عروض و قواعد کے لحاظ سے تو اُس پر کہیں کوئی اُنگلی رکھ ہی نہیں سکتا۔ وہ بڑا نابغہ و طبّاع (Genius) اور بڑا بیدار مغز شاعر تھا جو وقتی ہنگاموں اور بعد میں ضرب الامثال، محاورہ بندی اور زبان کے پیتڑوں کی نذر ہو گیا، اور اُردو ادب کو جتنا چاہیئے تھا نہ دے سکا۔ اُس کی تصنیف "چراغِ سخن" اہلِ بینش اور اربابِ بصیرت کے لیے مشعلِ ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں عروض کے باریک سے باریک نکات و غوامض عام فہم انداز میں سمجھائے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ یگانہ کا نام فہرست میں تیسرے یا چوتھے نمبر پر تو رکھا جاسکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ اُس سے چشم پوشی کی جائے یا اُسے نظر انداز کردیا جائے۔

ایک اہم ڈرامہ نگار

برق صدیقی فتحپوری

اُردو ڈرامہ نگاری کی تاریخ مرتب کرنے میں ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، پروفیسر وقار عظیم، محمد نورالٰہی، بادشاہ حُسین، عشرت رحمانی وغیرہ کی تصانیف کا مُطالعہ ناگزیر ہے جن میں قریب قریب تمام اُردو ڈرامہ نگاروں کے مفصّل اور مختصر حالات قلمبند ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخری دور کے ڈرامہ نگار افسوں مُرادآبادی، جوہر بنارسی، حباب رام پُوری، سجاد دہلوی، طالب بنارسی، ظریف اکبرآبادی، حافظ محمد عبداللہ فتحپوری، کریم بریلوی، حکیم نظامی، نظیر بیگ اکبرآبادی، رونق بنارسی، محمد عبدالوحید قیس فتحپوری، احسن اور بیتاب تھے۔ ان میں سے کسی کسی کے حالات مفصّل طور پر درج پائے جاتے ہیں اور کسی کسی کے مختصراً۔ جن کے حالات مختصر طور پر درج ہیں ان میں حافظ محمد عبداللہ فتحپوری اور محمد عبدالوحید قیس فتحپوری بھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنفوں کو ان سے ذاتی واقفیت نہ تھی اور نہ کہیں سے زیادہ مُواد فراہم کیا جاسکا۔ اسی وجہ سے جو کچھ لکھا بھی گیا اس میں بھی کچھ غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں اُن غلطیوں کا ذکر نہ کیا جائے گا۔

حال ہی میں فرمان فتحپوری نے اپنے مضمون "قدیم اُردو ڈرامہ کے ایک اہم فن کار" مطبوعہ نگار لکھنؤ میں (بابت ماہ مئی ۱۹۶۴ء) صفحات پر اس کمی کو پُورا کرنے کی کوشش کی ہے مگر افسوس ہے کہ اس میں بھی کچھ خامیاں نظر آتی ہیں جن کا ازالہ میرا فرض ہے تاکہ بالکل صحیح حالات سامنے آسکیں۔ اور چونکہ مجھے ان سے ذاتی طور پر اس لیے واقفیت ہے کہ میں انھیں کے خاندان کا ایک فرد ہوں اور عرصہ تک ان کی صحبت میں بھی رہا ہوں میرا یہ مضمون صحتِ حالات کی بنا پر حرفِ آخر ہے۔

حافظ محمد عبداللہ فتحپوری سنّی المذہب تھے اور تعصّب سے بری۔ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں:-

موحّد ہوں میں، صُلحِ کُل میرا مذہب
تعصّب نہیں مجھ کو ہرگز گوارا

یہ اپنے وطن موضع ہتھورا ضلع فتحپور (ہسوہ) یُو۔ پی کے ایک مُقتدر و متموّل شیخ گھرانے سے تعلّق رکھتے تھے اور موضع بلپور کے زمیندار تھے۔ ان کے مُورثِ اعلیٰ حضرت محمد سلیم شاہ چشتی ایک بزرگ تھے جو خواجہ معین الدّین چشتی اجمیری کے ہمراہ ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر کوئی چالیس سال کی تھی، یہ خاندان عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق رضؓ سے تھے اور ان کی زوجہ بی بی ظہیرہ کا سلسلۂ نسب خلیفۂ دوم حضرت عُمر فاروق رضؓ سے ملتا تھا۔ اُنھیں کے بطن سے حضرت شاہ پیدا ہوئے جن کی شادی ایک بزرگ محمد شاہ کی بیٹی سے ہوئی۔ محمد شاہ بھی خواجہ معین الدّین چشتی اجمیری کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور ان کا سلسلۂ نسب خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا تھا۔ انھیں حضرت شاہ صدیقی بن محمد سلیم شاہ چشتی کی اولاد میں شیخ حافظ محمد عبداللہ فتحپوری

بن منشی الٰہی بخش تھے۔

حافظ محمد عبداللہ فتحپوری کے والد منشی الٰہی بخش اپنے زمانہ کے علوم مروّجہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور اپنے علاقہ کے بڑے زمیندار ہونے کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں منصفی کے عہدے پر فائز تھے۔ کُل زمینداری ان کی ذاتی پیدہ کردہ تھی۔ یعنی نہ تو وراثت میں ملی تھی اور نہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بخشیدہ تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت وہ بین پوری میں منصف تھے۔ انھوں نے جنگِ آزادی میں حکومت کے خلاف اپنے ہم وطنوں کا ساتھ خفیہ طور پر دیا۔ وہ پہلے ہی انگریزوں کے خلاف بنتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک مقدمہ میں ایک فریق کی سفارش ایک بڑے عہدہ دار انگریز نے کی تو انھوں نے اس کی سفارش کو ٹھکراتے ہوئے دوسرے فریق کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ انگریز عہدہ دار ایک ہندوستانی کی اس جسارت سے دل میں بہت برہم ہوا اور انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ لیے ہوئے موقع کا منتظر رہا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر شروع ہوا تو اُس نے کچھ تار کٹوا کر ان کے مکان میں رات کے وقت پھنکوا دیے اور محکمہ پولیس کے ایک انگریز آفیسر کو اطلاع دے دی۔ تار برآمد کیا گیا اور بغاوت کے جرم میں ان کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ سازش کی گئی کہ جس طرح بھی ہو پھانسی کا حکم ہو لہٰذا پھانسی کا حکم سُنا دیا گیا اور کُل جائیداد اور ساز و سامان و مکانات ضبط کر لیے گئے۔ حافظ محمد عبداللہ نے اس حکم کے خلاف ولایت میں اپیل دائر کی جو کامیاب ہوئی لیکن وہاں کے فیصلہ کا انتظار کیے بغیر پھانسی دے دی گئی (بوقت عصر پنجشنبہ ۳۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء) رہائی کا حکم ولایت سے بعد میں پہنچا تو جائداد اور مکانات واپس کر دیے گئے مگر سامان جو نیلام کر دیا گیا تھا واپس نہ کیا گیا اور نہ اُس کی قیمت ہی دی گئی جس کی تعداد ہزاروں روپیہ کی تھی۔ نیلام شدہ سامان کی ایک ضخیم فہرست کی سرکاری نقل میرے پاس موجود ہے اور مقدمہ کی مسل محافظ خانہ میں محفوظ ہو گی۔

منشی الٰہی بخش کئی مواضع کے زمیندار تھے۔ ان کے بنوائے ہوئے کئی پختہ مکانات شہر فتحپور میں تھے، ایک تین منزلہ شاندار پختہ حویلی معہ غلام گردش، چھاپہ خانہ، رتھ خانہ، پائیں باغ اور چاہات کے جنوڑ میں تھی اور کئی پختہ مکانات ایک وسیع احاطہ کے اندر بین پوری میں تھے۔ ان کی بنوائی ہوئی ایک نہایت خوبصورت مسجد جس کے دیواروں پر اندر کی طرف کوڑی کا پلاسٹر ہے اب تک جنوڑ میں ان کی نوحہ خواں ہے۔ اسے ۱۲۶۳ھ ہجری میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اتنی خوبصورت مسجد ہندوستان کے کسی گاؤں میں نہ ہوگی اور شاید ہی کسی شہر میں ہو۔ اب یہ مرمت طلب ہے۔ اس پر اس کی جو تاریخ تعمیر کندہ ہے وہ یہ ہے:۔

شیخ الٰہی بخش منصف نیک رائے — در جنوڑ ساخت نو خانہ خدائے

ہاتف از تاریخ سالش مژدہ داد — شد چو بیت اللہ مسجد دل کشائے

۱۲۶۳ھ

منشی الٰہی بخش کے ایک لڑکی اور پانچ لڑکے تھے۔ لڑکی کا نام ظہور النساء تھا اور لڑکوں کے نام محمد عبدالرحمٰن، محمد نظیر، محمد عبداللہ، محمد عبدالغفور اور محمد عبدالشکور تھے۔ منجھلے لڑکے محمد عبداللہ نے ڈرامہ نگاری اور اداکاری میں خاص شہرت حاصل کی اور انھیں کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

حافظ محمد عبداللہ فتحپوری حافظِ قرآن تھے اور عربی فارسی سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ شعر و سخن سے بھی خاصہ لگاؤ تھا حافظ

تخلص کرتے تھے۔ فنِ شعر سے اُستادانہ واقفیت رکھتے تھے لیکن وہ اسے صرف ڈراموں تک ہی محدود رکھتے تھے۔ غزلیں نہیں کہتے تھے اور راقم الحروف کو بھی اس سے منع فرماتے تھے، وہ غزلوں کو بیکار شے سمجھتے تھے۔ قصیدے بھی نہیں لکھتے تھے کیونکہ ان سے خوشامد اور گدائی کی بُو آتی ہے جو ان کی خودداری کے منافی تھی۔ کبھی کبھی حمد اور پند سُود مند میں طبع آزمائی کر لیتے تھے۔ راقم الحروف نے کچھ کلام جمع کر لیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

حمد

(بحر رمل مسدّس معروف ۔ ارکانہ، فاعلاتن ، فاعلاتن فاعلن)

سب کا اوّل سب کا آخر ہے خدا — ہر جگہ ہر وقت حاضر ہے خدا
کر سکے کیا اُس سے مخفی کوئی کچھ — ظاہر و باطن کا ناظر ہے خدا
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْ — شعر جو ٹھہرے تو شاعر ہے خدا

بھجن (بہ وزن ہندی)

استائی } ارکانہ، مفعولن فعلن فعلن
مفعول فعولن مفتعلن

انترہ } ارکانہ: مفعول فعلن ۔ چار بار
مفعول فعولن مفتعلن

(دھن کھماچ ۔ تال قوالی)

یارب! تُو ہے بس یکتا
جگ میں نہیں کوئی مثل ترا — یارب ہے تُو بس یکتا
موجود ہے تُو، مقصود ہے تُو
محمود ہے تُو، مسجود ہے تُو
معبود نہیں اک تیرے سوا — یارب ہے تُو بس یکتا
سبحان ہے تُو، رحمان ہے تُو
یزدان ہے تُو، بھگوان ہے تُو
انسان ہیں سب تجھ پر ہی فدا — یارب ہے تُو بس یکتا

. . . .

ہولی

ارکانہ

استائی: فعلن فعولن فعول ۔ فعولن
فعلن فعولن فعولن فعولان ۔ فعلن

انترہ: فعلن فعولن فعلن فعولن
مفعول فعلن فعول ۔ فعولن

تُو ہے غفور الرحیم ۔ خُدایا

نادم ہُوں عصیاں سے میں پُر نہیں ہم — تو ہے غفور الرحیم۔ خُدایا
اپنے کرم سے تُو دے گا جنّت — ہے نام تیرا کریم۔ خُدایا
آتش کو گُلشن کرتا ہے تُو جب — کیا خوف نارِ جحیم ۔ خُدایا
سب کچھ دیا ہے تو نے اسے بس — دی جس کو عقلِ سلیم۔ خُدایا
. . . .
حافظ کو دُنیا ہے اب تو زندان — کر اس کو دار النعیم۔ خُدایا

دادرا

ارکانہ:

استائی — فاعلن فعلاتن فعولن / فعلن فعولن فعولن فعولن
انترہ — فاعُ فعلن فاعُ فعلن / فعلن فعولن فعولن فعولن

علم سی کوئی دولت نہیں ہے

بے اس کے انساں کو ثروت نہیں ہے — علم سی کوئی دولت نہیں ہے
دینے سے ہو ، دُونی یہ تو
کثرت ہے اس کو یہ قلّت نہیں ہے — علم سی کوئی دولت نہیں ہے
. . . .

ٹھُمری

ارکانہ: فعلن فعولن فعولن فعلن

اُستانی جی کچھ پڑھا دو مجھ کو — لکھنا بھی تھوڑا سکھا دو مجھ کو
. . . .

اُنھوں نے کچھ ایسی بحریں بھی اختراع کرلی تھیں جو غالباً غیر شاعرانہ ہونے کی وجہ سے پہلے قابلِ اعتنا نہ سمجھی گئی ہوں گی ۔ وہ ان سے بھی ڈراموں میں کام لے لیتے تھے۔ وُہ یہ ہیں :-

(۱)

نام بحر — اسباب مثمن سالم
ارکان — فاعِلُ فاعِلُ فاعِلُ فاعِلُ

نمونہ ۔ میرے خُدا کبھی تجھ کو فنا نہیں
تیرے سوا کسی شے کو بقا نہیں

(۲)

نام بحر۔ مُتعاقب مثمن سالم
ارکان ۔ مفعُولُ مفعولُ مفعولُ مفعولُ
نمونہ ۔ خالق ہے رازق ہے مالک ہے وہ سب کا
وہ سب کا اوّل ہے وہ سب کا آخر ہے

(۳)

نام بحر۔ مفروق مثمن سالم
ارکان ۔ فاعِلاتُ فاعِلاتُ فاعِلاتُ فاعِلاتُ
نمونہ ۔ جیسا آج ہے کل اس سے اچھا آئے گا زمانہ
یوں ہی روز مرّہ عمدہ آتا جائے گا زمانہ

(۴)

نام بحر۔ نظیر مثمن سالم
ارکان۔ مفعولاتُ مفعولاتُ مفعولاتُ مفعولاتُ
نمونہ ۔ مُفلس ہو جو محنت کش تو وہ زردار ہو جاتا ہے
دولت مند سُستی سے گدا اکبار ہو جاتا ہے

(۵)

نام بحر۔ ثقیل مثمن سالم
ارکان ۔ فَعَلَلَ فَعَلَلَ فَعَلَلَ فَعَلَلَ
نمونہ ۔ چلو چلو پرے ہٹو ملو نہ گلے سے ہرے
وہیں رہو تمھیں ہے کیا بُرے سے بھلے سے گرے

(۶)

نام بحر۔ نفیس مثمن سالم
ارکان ۔ مُفتَعِلن مفتعلن مفتعلن مفتعلن

نمونہ ۔ دے مجھے اے میرے خدا ایسا دہن ایسی زباں
جس سے کروں قیصرۂ عہد کی میں مدح بیاں

لیکن ان کا نام شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈرامہ نگاری اور اداکاری کی صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور اور زندہ ہے جس کی مختصر داستان یوں ہے :۔

یہ پہلے لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی سے منسلک ہوئے اور اس میں ڈرامہ نویسی کے ساتھ اداکاری کا کام بھی کرتے رہے پھر ۱۸۸۱-۸۲ء میں "دی انڈین امپیریل تھیٹریکل کمپنی آف انڈیا" کی بنیاد خود ڈالی۔ یہ اپنی اس کمپنی کے تنہا مالک تھے اور اس کے مینیجنگ ڈائرکٹر بھی۔ یہ کمپنی اس وقت کی بہترین کمپنی تھی۔ اس کا مرکزی دفتر شہر فتحپور میں تھا اور تماشے دکھانے کے لیے دور دراز کے اضلاع مثلاً الہ آباد، کانپور، آگرہ، میرٹھ، فرخ آباد، فیض آباد، دہلی، لکھنؤ، رام پور وغیرہ بھی جاتی تھی۔ رام پور میں یہ کمپنی بطور سرکاری مہمان کے مہینوں رہی۔ یہ کمپنی چاہے جہاں تماشے دکھا رہی ہو اگر وہاں کوئی شخص موضع چنور رایا اس کے گرد و نواح مثلاً سنگاؤں، سچولی، فتحپور، ہسوہ، ترسی، مکن پور وغیرہ کا پہنچ جاتا تھا تو ہمیشہ فری پاس سے تماشے دیکھا کرتا تھا۔

حافظ محمد عبداللہ کو ڈرامہ اور ڈرامہ نگاری سے فطری شغف تھا، وہ ان سے والہانہ عشق رکھتے تھے، ان کو ہمہ وقت اپنے فطری ذوق کی آسودگی کی فکر رہتی تھی، وہ ان کی دھن میں دُنیا و مافیہا سے بے نیاز و بے خبر رہتے تھے۔ وہ اس کے ذریعہ سے روپیہ کما کر دولت مند بننے کے آرزومند نہ تھے بلکہ اس خیال کو مضحک اور کمینہ سمجھتے تھے۔ وہ کمپنی کی آمدنی کو کمپنی ہی میں لگا دیتے تھے اور اپنے پاس سے بھی کچھ اور خرچ کرتے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی کمپنی بہت جلد چوٹی کی کمپنی سمجھی جانے لگی تھی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اپنی دولت کی ایک ایک کوڑی اس کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کا مقصد صرف تماشے ہی دکھانا نہ تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ عوام افعالِ قبیحہ کے بدنتائج اور اعمالِ صالحہ کے نیک ثمرہ سے آگاہ ہو کر انسان بننے کی کوشش کریں۔ وہ بہت خوددار انسان تھے اُنھوں نے کبھی کسی کے سامنے سر نہ جھکایا۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ ٹم ٹم پر چنور را سے فتحپور جا رہے تھے، ان کے پیچھے انگریز کلکٹر ضلع کی ٹم ٹم آ گئی اور گھنٹی دی لیکن اُنھوں نے کوئی پروا نہ کی، اپنی ٹم ٹم کو سڑک کے ایک کنارے نہ کیا، آواز دی گئی، کوئی پرواہ نہ کی، آخر کلکٹر ضلع نے اپنی سواری سڑک کے ایک کنارے کر کے آگے بڑھائی اور برابر پہنچ کر کہا "آواز دی گئی مگر تم نے راستہ نہ دیا۔ کیوں؟" جواب میں کہا :۔

"میری غرض نہ تھی آپ کو قاعدے سے پیچھے ہی چلنا چاہیے اور اگر آگے نکلنے کی خواہش ہے تو کنارے سے نکل سکتے ہیں، میں کیوں ہٹوں؟ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ سرکاری سڑک کو قاعدے سے استعمال کرے اور یوں بھی مجھے آپ پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ آپ کلکٹر ضلع ہی سہی، ہیں تو نوکر ہی، اور میں خود مختار ہوں کسی کا نوکر نہیں۔"

وہ معقول جواب پا کر خاموش ہو رہا اور چلا گیا۔

ایک مرتبہ کمپنی الہ آباد میں تماشے دکھا رہی تھی۔ وہاں کے انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کی میم نے اُن سے کہا کہ وہ نصف لاگت کمپنی کی دے گی اس کو نصف کا حصّہ دار بنا لیا جائے۔ ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میم نے پھر کہا کہ وہ نصف لاگت دے گی اور نفع نہ لے گی صرف اس کا نام اپنے نام کے ساتھ شریک کر لیا جائے۔ یہ بھی منظور نہیں کیا۔ میم نے اپنے شوہر سے شکایت کی تو وہ غصّہ سے آگ بگولہ ہو گیا اور اس طرح انتقام لیا کہ ایک رات تھیٹر میں چپکے سے آگ لگوادی۔ شعلے اُٹھنے لگے تو نوکروں نے آگ فرو کرنے کی کوشش کی۔ ان کو منع کر دیا۔ اور کہا جل جانے دو۔ کمپنی کا کُل سامان جل کر خاکستر ہو گیا۔ وہ معاملہ سے واقف تھے سمجھ گئے کہ ایسا کیوں ہوا۔ پُوچھنے والے احباب سے کہا کہ دشمنوں کے کلیجہ کی آگ ذرا دیر کے لیے ٹھنڈی ہو جانے دو تاکہ پھر اس سے زیادہ تیز آگ لگا سکوں۔ وہ بھی تو دیکھیں کہ محمد عبداللہ کیا بلا ہے۔ چنانچہ دُوسرے ہی دن سے از سرِ نو کمپنی کے قیام کا انتظام شروع کر دیا گیا اور تمام آلاتِ موسیقی، پردے، پوشاکیں اور دیگر ساز و سامان آناً فاناً مہیا کر لیے گئے اور چند دنوں کے بعد ہی کمپنی نے اسی شانِ رفتہ کے ساتھ پہلا تماشہ جو دکھایا وہ "پولیس ڈراما" تھا جو محکمہ پولیس کی دست درازیوں کا آئینہ دار تھا۔

وہ ڈرامہ لکھتے وقت اس میں ایسا ڈوب جاتے تھے کہ ان کو یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ وہ جو حُقّہ پی رہے ہیں وہ بالکل سرد ہو چکا ہے اور اگر کھانے کا وقت آجاتا اور کھانا اُن کے پاس رکھ دیا جاتا تو کھاتے بھی جاتے تھے اور لکھتے بھی رہتے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد پوچھتے کیا میں کھانا کھا چکا ہُوں۔" اسی استغراقِ کار نے ان کا نام اُردو ڈرامہ نگاروں کی دُنیا میں آفتاب کی طرح روشن کر دیا تھا۔ وہ ڈرامہ نگاری اور اداکاری دونوں میں قابلِ رشک حد تک کامیاب رہے۔ اُس وقت ان کا کوئی مدِّ مقابل نہ تھا۔ اداکاری میں وہ آغا حشر سے بھی بہت آگے تھے اور ڈرامہ نگاری میں ان کے درجہ کا اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کم سے کم سَو سوا سو ڈرامے تو ضرور لکھے ہوں گے جو مختلف مطابع میں برابر چھپتے رہتے تھے۔ مطبع لامع النّور فتحپور (جو ان کے بھائی حافظ محمد عبدالغفور کی ملکیت میں تھا) مطبع الٰہی آگرہ اور مچھو خاں پریس آگرہ خاص طور پر اس باب میں قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے ڈراموں کو کسی دُوسرے ڈراموں کا سرقہ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ خود اس کی تشریح کر دیتے تھے کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ فرسودہ قصّوں میں نئی رُوح پھُونک کر اُنھیں زیادہ نظر کش اور موثر بناتے ہیں۔ فرمان فتحپوری کے پاس صرف چوبیس ڈرامے موجود ہیں جن کی فہرست اُنھوں نے اپنے مضمون میں شامل کر دی ہے یہاں ان کی فہرست کو نقل کرنا بے سود ہے۔ پروفیسر وقار عظیم نے بجا فرمایا ہے کہ اُن کے ڈرامے بے شمار ہیں اور جن ڈراموں کا اشتہار عموماً ان کے ڈراموں کے ساتھ شائع ہوتا تھا اُن کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ بعض ڈرامہ کے مکالمے از ابتدا تا انتہا منظوم ہوتے تھے اور بعض میں صرف چند جملے نثر میں ہوتے تھے۔ اپنے آخری حصّۂ عمر میں وہ ایک نیا ڈرامہ لکھ رہے تھے جو بہت ضخیم تھا اور ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ یہ ان کی ساری عُمر کے تجربوں کا نچوڑ تھا۔ غالباً وہ ان کی زندگی میں ختم نہ ہُوا ہو گا۔ اب اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

ان پر اور ان کے کمالِ فن پر عوام کو کس قدر اعتماد تھا اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انڈین امپیریل تھیٹریکل کمپنی کے ختم ہو جانے کے بعد ایک تھیٹریکل کمپنی فتحپور میں تماشہ دکھانے آئی۔ کئی رات تماشے دکھائے۔ جو آمدنی روز ہوتی تھی وہ روزانہ مصارف کے لیے بھی کافی نہ ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ کمپنی اپنے مستقر کو واپس جانے کے قابل نہ رہی۔ مالک کو حافظ محمد عبداللہ کی بابت علم ہُوا تو ان کو تلاش کر کے اپنی ناگفتہ بہ حالت ان سے بیان کی اور مدد کے لیے استدعا کی۔ ایک کثیر رقم پر تین رات کے لیے کمپنی کو حافظ صاحب کے

سپرد کر دیا گیا۔ اُنھوں نے ایک اچھّا اور دلکش کھیل تجویز کیا اور دو دن تک اس کا پروپاگنڈہ اپنے نام سے کرتے رہے اور ایکٹروں کو مار مار کر مشق کراتے رہے۔ عوام ان کا نام سُن کر چونک پڑے۔ تیسری رات کو تماشہ دکھایا گیا۔ شائقین تماشہ کی تعداد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جو آمدنی ایک رات میں ہوئی اس سے تین رات کے تماشوں کی مقررہ رقم بہ آسانی ادا کی جا سکی اور بہت کچھ پس انداز بھی ہوا۔ مالک کمپنی نے شکریہ ادا کیا اور اپنے وطن واپس چلا گیا۔

آخر کار ۱۹۲۲ء کا ایک دن ایسا آیا جب اس اہم اور ناقابلِ فراموش ڈرامہ نگار و اداکار حافظ محمّد عبد اللہ فتحپوری کی زندگی کا یہی ڈرامہ (جس کے پہلے دو سین طربیہ تھے لیکن تیسرا اور آخری سین المیہ تھا) ختم ہو گیا۔ اور وہ اس تماشہ گاہِ عالم کے اسٹیج پر اپنا رول قابلِ رشک خوبصورتی و کامیابی کے ساتھ ختم کر کے ہمیشہ کے لیے چتورا کی زمینِ گورِ غریباں کے پردے میں غائب ہو گئے ۲۸ اپریل ۱۹۲۲ء جمعہ کو ——— اب صرف اُن کا نام ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں زندہ اور باقی ہے۔

اُن کی اولاد میں صرف دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی محمودہ بی بی جو محمّد عبد الوحید قیسؔ اُن کے بھتیجے کو بیاہی تھیں اور عرصہ ہوا فوت ہو چکی ہیں۔ چھوٹی لڑکی معصومہ بی بی قیسؔ کے چھوٹے بھائی محمد عبد المجید کو بیاہی تھیں اور اب تک بیوگی کی صُورت میں بہ قیدِ حیات ہیں۔

ان کے شاگردوں میں دو ڈرامہ نگار قابلِ ذکر ہیں ——— ایک نظیر بیگ اکبر آبادی جن سے مجھے واقفیت نہیں، دوسرے محمد عبد الوحید قیسؔ فتحپوری جو حافظ محمد عبد اللہ کے صرف شاگرد ہی نہ تھے بلکہ حقیقی بھتیجے اور بڑے داماد بھی تھے۔ ان کا بھی نام ڈرامہ نگاروں کی فہرست میں موجود ہے لیکن بہت مختصر حالات اور غلطیوں کے ساتھ۔ میں ان سے بھی بخوبی واقف ہُوں اس لیے ضرورت ہے کہ اُستاد کے ساتھ ساتھ اس کے قابل شاگرد کا بھی ذکر کر دیا جائے تاکہ دُنیا اُس کے صحیح حالات سے واقف ہو جائے۔

محمد عبد الوحید قیسؔ فتحپوری ڈرامہ نگار بھی تھے اور شاعر بھی اور جیسا کہ اُوپر ذکر کر چکا ہُوں محمد عبد اللہ فتحپوری کے خاص شاگرد، حقیقی بھتیجے اور بڑے داماد بھی تھے۔ ان کے والد حافظ محمد عبد الغفور عاشقؔ تلمیذ حضرت داغ دہلوی حافظِ قرآن تھے، خوش نویس تھے اور مصوری سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ کمپنی کے پردوں پر ان کا موئے قلم گل کاریاں دکھایا کرتا تھا۔ وہ مطبع لامع النّور کے مالک بھی تھے جس میں ڈراموں کی کتابیں بھی شایع ہوتی تھیں۔ ان کے دو دیوان شائع ہو کر نایاب ہو چکے ہیں۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۳ء کو صبح ۹ بجے چتورا میں انتقال فرمایا اور یہیں مدفون ہوئے۔ ان کے بڑے صاحبزادے محمد عبد الوحید قیسؔ تین مارچ ۱۸۷۶ء کو بروز جمعہ پیدا ہوئے تھے۔ تاریخی نام غلام حیدر تھا۔ اُنھیں کا تذکرہ یہاں مدّ نظر ہے۔ قیسؔ شاعری میں حضرت مضطر خیر آبادی سے مستفیض تھے اور ان کے پاس ریاست ٹونک میں بہ سلسلۂ ملازمت رہ کر فن سے واقفیت حاصل کی۔ پہلے اہلمد پیشی مقرّر ہوئے پھر سررشتہ دار عدالت دیوانی ہُوئے اور آخر میں منصف مجسٹریٹ درجہ دوم رہے۔ ۱۹۳۳ء میں ریٹائر ہو کر اپنے وطن چتورا میں آ کر عمر کے باقی دن سکون سے گزارے۔

ان کی پہلی شادی حافظ محمد عبد اللہ کی بڑی لڑکی محمودہ بی بی سے ۲۸ اپریل ۱۹۰۰ء میں ہُوئی تھی جس کی قبر مسجد کے سامنے چتورا میں ہے دُوسری شادی ٹونک میں شاہ جہاں کے ساتھ ۲ جنوری ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ کسی سے کوئی اولاد باقی نہیں۔ اُن کا کلام ٹونک کے مشاعروں کی زینت بنا اور اب ان کی ڈائری میں جو میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد سعید کے پاس ہے محفوظ ہے۔ ان کا نام صرف ان کے ڈراموں سے زندہ ہے جن کی صحیح تعداد نہیں معلوم ہو سکی۔ صرف چھ ڈرامے فرمان فتحپوری کے پاس ہیں۔ یہ سب مطبع لامع النّور میں چھپے تھے۔

قیسؔ کی زبانی راقم الحروف کو کچھ حالات استادِ حضرت مضطرؔ خیرآبادی کے بھی معلوم ہوئے جن کا مختصر ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مضطرؔ روزمرہ کے استاد تھے اور ٹونک میں مجسٹریٹی کے عہدہ پر فائز تھے۔ یہ نواب ٹونک کے شاعری میں استاد بھی تھے۔ ان کے دو دیوان حمدیہ اور نعتیہ "نذرِ خدا" اور "نیازِ مصطفےٰ" ہیں نے دیکھے ہیں۔ غزلوں کے دیوان کی بابت کوئی علم نہ ہو سکا۔ ان کی برجستہ گوئی اعجاز کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ کوئی طرح دے دیجیے وہ غزل سنانی شروع کر دیں گے۔ ان کی برجستہ گوئی کا امتحان ایک مرتبہ اہلِ لکھنؤ نے لیا جس میں وہ کامیاب رہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ ہر سال نواب ٹونک کی دی ہوئی تین مختلف بحر و قافیہ و ردیف کی طرحوں پر نعتیہ کلام میلاد شریف میں اسی وقت پڑھنے کے لیے ایک ساتھ تیار کر دیتے تھے۔ اس طرح کہ تین لکھنے والے ایک ایک طرح لے کر لکھنے کو بیٹھ جاتے۔ مضطرؔ پہلے کو ایک شعر لکھاتے پھر دوسرے کو ایک شعر بولتے پھر تیسرے کو، اور پھر پہلے سے آغاز کرتے۔ نواب ٹونک کو حاسدوں نے ان کے خلاف بھرا تو شاہی توجہ کم پا کر منظوم استعفا دے کر گوالیار چلے گئے۔ استعفار کے صرف چند اشعار یاد ہیں ملاحظہ ہوں:۔

ہر حال میں رہے گا تعلق حضور سے — جھٹکے سے ٹوٹ جائے وہ رشتہ نہیں ہوں میں
کوئی نہ کوئی مجھ کو اٹھالے گا ہاتھوں ہاتھ — پچ مچ کی چیز ہوں کوئی دھوکا نہیں ہوں میں
جب آپ بدگماں ہوں تو رہنا فضول ہے — سمجھیں برا جب آپ تو اچھا نہیں ہوں میں
آزاد کیجیے تو اڑوں مثلِ بوئے گل — کھٹکوں کسی نظر میں وہ کانٹا نہیں ہوں میں
جانے کا حکم ہو تو کروں انتظام کچھ — ہمراہ حسرتیں بھی ہیں تنہا نہیں ہوں میں

غزل کے دو تین شعر بطورِ نمونہ ملاحظہ کیجیے:۔

ہماری آہ کا کیا دیکھنا جو دیکھو گے — وہی تو بات ہے جھونکے ہوا کے دیکھ نہ لو

پڑا ہے اس طرح اُس در پہ مضطرؔ — کوئی دیکھے تو جانے مار ڈالا

خط پھاڑ کے پھینکا ہے تو لکھا بھی مٹا دو — کاغذ پہ اُترتا ہے فقط نام تمہارا

ان کے شاگرد نفیسؔ فتحپوری کے کلام کا نمونہ:۔

کفِ افسوس ملا کرتی ہے حسرت میری — رو دیے دیتی ہے مجھے دیکھ کے قسمت میری

وصل کی شب کٹ گئی ظاہر ہوئی تنویرِ صبح — آنسوؤں سے دھل گئی چکی نہیں تقدیرِ صبح

محمد عبدالوحید قیسؔ فتحپوری نے یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کو بوقت ۵ بجے شام انتقال فرمایا اور چتورا ہی میں مدفون ہوئے۔

راقم الحروف کے اس مضمون کو بہ لحاظِ صحتِ حالات حرفِ آخر گرداننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا رشتہ ان ڈرامہ نگاروں سے کیا ہے یہ معلوم ہو جائے۔ چنانچہ راقم الحروف محمد عبدالحمید برقؔ صدیقی بن محمد عبدالعزیز بن محمد عبدالشکور (برادر خورد حافظ محمد عبداللہ) بن منشی الٰہی بخش چتورا ہی میں اور ایک ہی مکان میں حافظ محمد عبداللہ اور محمد عبدالوحید قیسؔ کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور اُن سے برسوں ہم کلام رہا ہے۔



حفیظ جالندھری

غم موجود ہے، آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں، اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

یارو میں نے اپنا سینہ اپنے ہاتھوں چاک کیا ہے
سچ کہتے ہو، لیکن دیکھو، اپنے ہاتھوں سی تو رہا ہوں

خونِ جگر آنکھوں سے نہ ٹپکا، منہ سے شعلہ بن کر لپکا
شعبدہ گر ہوں، مجھ پر ہنسئے، میں بھی ہنستا ہی تو رہا ہوں

سیم و زر سے برتر و بالا، شاید کوئی شے پا جاؤ
راکھ ذرا میری بھی کریدو، کیمیا گر میں بھی تو رہا ہوں

ہاں میں حفیظ ہوں تیرا بندہ، بُت خانے کے اندر تک
میری نیّت پوچھتا کیا ہے تیری مشیّت بھی تو رہا ہوں

زود التفاتی

جوش ملیح آبادی

نظر آیا مجھے کل اک پری زاد
انوکھا ایک بت ہندوستاں کا

سمجھ ہی میں نہ آیا، لاکھ سوچا
کہ یہ تارا ہے کون سے آسماں کا

لچکتا، جھومتا، کھلتا، چٹکتا
مجسّم خواب گویا بوستاں کا

مہکتی سانس، جھونکے پھول بن کے
گھنی زلفیں، نشیمن بوستاں کا

چھبیلا، چلبلا، چنچل، چھلاوا
نکیلا، لٹ پٹا، مستانہ، بانکا

کمر یا شاخ، نسرین و سمن کی
نظر یا تیر ارجن کی کماں کا

وہ تابِ رُخ کہ پیاسے اور بھوکے
تقاضا بھول جائیں آب و ناں کا

لبِ انکار پر امواجِ اقرار
ترنّم یا دھندلکے ہیں اذاں کا

رُخِ رنگیں پہ، ہر موجِ نفس سے
چراغاں تھا، دیارِ کہکشاں کا

خرامِ ناز میں وہ آن، جیسے
زمیں پر آئے پیغام آسماں کا

وہ شوخی، جیسے جھونکوں میں پرافشاں
دوپٹہ، پھول سا آبِ رواں کا

نشیلی انکھڑیاں، برکھا کی راتیں
اثر ڈوروں میں رنگیں داستاں کا

صباحت میں، ذرا سا ایک جھٹکا
فسوں پرور ملاحت کی عناں کا

ملاحت تھی کہ گوکل کے دھندلکے
صباحت تھی کہ تڑکا اصفہاں کا

رواں تھی کم سنی، سوئے جوانی
جھلی چاندی پہ یا سونے کا ٹانکا

نئی صورت قوامِ آب و گل کی
نیا انداز ربطِ جسم و جاں کا

نظر میزان تھی روزِ جزا کی
بدن انصاف تھا نوشیرواں کا

نظر گوہر پہ جیسے مشتری کی
مجھے یوں دور سے کافر نے آنکا

اٹھیں اور جھک گئیں پل میں نگاہیں
کہ آنچل ہل گیا برقِ تپاں کا

چھپالے چاند کو جس طرح بدلی
بڑھا جب میں تو یوں چہرے کو ڈھانکا

مری نظریں پھریں یوں تھرتھرا کر
کہ جیسے، تنگ آکر زہر پھانکا

پھر اس نے غرفۂ ناز و ادا سے
مجھے کچھ دیر تک شرما کے جھانکا
ہٹایا پھر، رُخِ تاباں سے، رومال
کہ پٹ کھولا جواہر کی دکاں کا
رخِ نو آب پر دوڑی کسک سی
اثر جیسے کسی بارِ گراں کا
دیا جیسے کوئی آندھی میں گھر جائے
ہُوا یہ رنگ، روئے گل فشاں کا
یکایک آنکھ کے ڈوروں سے اُبھرا
تلاطم ایک شوقِ بے کراں کا
مجھے دیکھا کچھ ایسی کشمکش سے
کہ جیسے گونجنا جنگل کا ہانکا
مری زد پر وہ اس کی رسمساہٹ
کہ تابِ ماہ میں دامن کتاں کا
پکار اٹھی نظر "تیری ہی جانب"
جو یہ پوچھا "ارادہ ہے کہاں کا؟"
بالآخر اس نگارِ سیم تن نے
مجھے اعزاز بخشا میزباں کا
عطا کی، دوش کو، زلفوں کی جاگیر
دلِ صد چاک کو، بانہوں سے ٹانکا
مرے لمحوں کی جانب الغرض جوش
بڑھایا، تاج، عمرِ جاوداں کا

یادوں کے مجسّمے

جوش ملیح آبادی

منھ اندھیرے کے جام میں ہے کھنک
شب کے در پر ہے صبح کی دستک

آسماں پر ہے طرفہ اک ہلچل
چاندنی میں، رواں ہیں یوں، بادل

جیسے، چشمِ کرم، سرِ محشر
فردِ اعمال کی سیاہی پر

ظلمت و نور، غایب و موجود
جنگ ہے درمیانِ شعلہ و دود

چاندنی، بار بار، زیر و زبر
جھائیاں سی رخِ تجلّی پر

ماہ پر یوں، ہجوم ابرِ سیاہ
خُم پہ جس طرح محتسب کی نگاہ

جیسے کاغذ پہ جابجا دھبّے
نظر آتے ہیں روشنائی کے

پرفشاں ہیں فضا پہ رات کے خواب
اگرئی سی ہے چادرِ مہتاب

کون یہ چھیڑنے اٹھا ہے ساز
ایک عالم ہے گوش بر آواز

ٹہنیوں پر طیور ہیں خاموش
بے خودی کا زمیں پہ ہے سرپوش

خاک پر ہیں، مؤذنوں کے نشاں
سو رہی ہے گلوں میں بانگِ اذاں

چھاؤں کی گود میں ہے تابانی
مانجھے بیٹھی ہے صبح نورانی

ہو چلا ہے طلوع کا آغاز
لیلیٔ شب ہے مائلِ پرواز

حجلۂ گل میں بند ہے خوشبو
دُور، پائے صبا سے ہیں گھنگرو

نل میں ہے سائیں سائیں کی آواز
آمدِ آب کے نرسے انداز

راہ میں ہے گلاب سا پھیرا
باندھنے ہی پہ ہے افق سہرا

آج اے دل، یہ نور کا تڑکا
لے کر آیا ہے اک نیا کھڑکا

سینکڑوں جشن دورِ زرّیں کے
تک رہے ہیں فضا کے گوشوں سے

سینکڑوں، عہدِ رفتہ کے بستاں
ملگجی سی فضا پہ ہیں غلطاں

متحرّک ہیں چرخ پر جھرمے
سینکڑوں راگ، سینکڑوں مجرے

جن میں کل، گرمِ رقص تھے گل فام
اُڑ رہے ہیں اِدھر اُدھر وہ خیام

سر پہ غلطاں ہیں دن بہاروں کے
بول گیتوں کے، غول یاروں کے

ہائے، کس کو سناؤں یہ دُکھڑے
اُف وہ دمکے جگر جگر مکھڑے

لو در آیا شباب کا ساون
دل میں پروا چلی ارے سن سن

رُندھ گئی، زندگی کی تابانی
پھر برسنے لگا ارے پانی

ہائے پھر سان پر چڑھیں یادیں
ڈنک اٹھائے ارے بڑھیں یادیں

ہائے یارانِ رفتہ کا ریلا
لگ گیا آسمان پر میلا

ہاں، یہ شاعر[1] ہیں اور یہ ہیں جگر[2]
ہاں یہ امید[3] اور یہ ہیں شرر[4]

ہاں یہ نورالحسن[5] ہیں، یہ مانی[6]
یہ ہیں قاضی[7]، یہ حضرت فانی
یہ ہیں مخمور[8] اور یہ اعجاز[9]
یہ ہیں مختار[10] اور یہ ہیں مجاز[11]

یہ رفیع[12] و اثر[13] ہیں بستۂ غم
یہ عطا[14] ہیں، یہ صاحبِ عالم[15]
اُف، گھٹاؤں کی موج کے نیچے
دفعتہً کتنے دل دھڑک اُٹھے

کانپ اُٹھے رواں دواں لمحات
کس کی نکلی یہ آسماں پہ برات
اُف یہ کس بوستاں کی ہے کوکو
اُف یہ کیسی ہے بور کی خوشبو

باغ اپنے لیے، بصد فریاد
اڑ رہا ہے ارے ملیح آباد
آ گرے کا ہے آسماں پہ نور
پرفشاں ہے جمالِ سیتا پور

---

[1] حضرت آغا شاعر دہلوی [2] حضرت جگر مرادآبادی [3] امید امیٹھوی [4] میرزا شرر لکھنوی [5] نورالحسن خاں ملیح آبادی [6] مانی جائسی [7] قاضی خورشید احمد [8] حکیم مخمور لکھنوی [9] مرزا اعجاز حسین قزلباش [10] مختار احمد خاں ملیح آبادی [11] مجاز لکھنوی [12] رفیع احمد خاں فرخ آبادی [13] ابرار حسن خاں ملیح آبادی [14] میرزا عطا حسین قزلباش لکھنوی [15] حکیم صاحب عالم لکھنوی۔

مڑ رہا ہے خیال کا دامن
لو، سنکنے لگی نسیمِ دکن،

اڑ رہا ہے علم "اپالو" کا
رو رہا ہے فضا پہ کلکتہ[1]

بھر گئے، آنسوؤں سے اُف جل تھل
چرخ زن ہے، فضا پہ، تاج محل

ہائے لو دیے اُٹھے وہ دل کے چراغ
آگیا، کانپتا، وہ قیصر باغ[2]

کوٹے دل میں یہ دی صدا کس نے
"پھول چمپا کے، ہار بیلے کے"

کون یہ گل رخانِ پُر فن ہیں
بال کھولے جو گرم شیون ہیں

الاماں، سرخیوں کے ہلکورے
کس کی یہ انکھڑیوں کے ہیں ڈورے

ہائیں یہ کیوں مسک گئے بادل
کس نے، گھبرا کے پھینک دی ہیکل

کس کے بکھرے، ہوا پہ، یہ گیسو
کس نے بدلا یہ کرب سے زانو

کون تڑپا یہ دل کی دھڑکن سے
کس کی ٹوٹیں یہ چوڑیاں چھن سے

[1] بمبئی کا ایک ساحل [2] حضرت واجد علی شاہ کا یادگار باغ

بن گیا دل، تمام تر پھوڑا
کس نے یہ، ناچ میں، لیا توڑا
چل گیا سر پہ، دفعتہً آرا
کس نے طبلے پہ ہات یہ مارا

چھائی بے رنگیوں پہ، بارنگی
اُف یہ کس نے بجائی سارنگی
تار کانپے، لرز گئے تارے
رونگٹے، جھنجھنا گئے سارے

آئی کیسی یہ مثل شعلۂ ناز
کان میں، "جوش جوش" کی آواز
ہائے، مجھ کو پکار کر اے جوش
یہ ارے کون ہو گیا خاموش

کس کے شانے سے لڑ گیا شانا
کس کے ہونٹوں نے چھو لیا ماتھا
کس نے مارا یہ تیر سینے پر
کان میں "ہائے لکھنؤ" کہہ کر

اُف، مری جان پر بن آئی ہے
کردگارا، تری دہائی ہے
داورا، دکھ سہوں کہ مر جاؤں
ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں



فراق گورکھپوری

ہاں جان سے، اپنی جائیں گے ہم
پر تجھ سے نہ دل لگائیں گے ہم

اتنی بھی نہیں امیدِ انصاف
جیسا کہ کریں گے پائیں گے ہم

اپنے عالم میں اے غمِ دوست
معلوم نہیں کب آئیں گے ہم

اک روز اے پیکرِ تغافل
تیرے دل میں سمائیں گے ہم

جب اپنے نہ کام آئے تو کیا
اوروں کے کام آئیں گے ہم

ہر دل میں اٹھیں گے دل کی طرح
ناوک سا بیٹھ جائیں گے ہم

کہتے ہیں جس کو جان دینا
وہ کام بھی کر دکھائیں گے ہم

کہتے ہیں زمانے سے مرے طور
مدت تک یاد آئیں گے ہم

بڑھ جاتی ہے اور بے قراری
اس بزم میں اب نہ جائیں گے ہم

اے موجِ نسیم اس انجمن سے
مانند غبار اٹھ آئیں گے ہم

غربت میں نہ آئے یاد تیری
اس کی تو قسم نہ کھائیں گے ہم

اس عارضِ نازنیں کو اے دوست
آئینۂ دل بنائیں گے ہم

اے بھولنے والے یہ بتا دے
تجھ کو کبھی یاد آئیں گے ہم؟

اٹھتی جو نہیں کسی سے پیارے
وہ بات تری اُٹھائیں گے ہم

ہم اپنے حجاب آپ ہی ہیں
اب یہ پردہ اُٹھائیں گے ہم

اچھا تیری ہی ضد رہے گی
اچھا تجھے بھول جائیں گے ہم

دنیا مانے بقائے عاشق
اپنے کو یوں مٹائیں گے ہم

شاید جینا بھی ہم کو آ جائے
مرنا جب سیکھ جائیں گے ہم

یاد اس کی ہے نشترِ رگِ جاں
اب جی سے اسے بھلائیں گے ہم

پی جائیں گے سیلِ اشکِ غم کو
الٹی گنگا بہائیں گے ہم

آنسو اپنے رہیں سلامت
کچھ تارے توڑ لائیں گے ہم

سونے دو ان انکھڑیوں کو یارو!
اُن کا جادو جگائیں گے ہم

بولے وہ فراق سے خبردار
تجھ کو جو اُداس پائیں گے ہم

محبّت

صفی لکھنوی

محبت کیا ہے؟ میلانِ طبیعت — سوئے محبوب رجحانِ طبیعت

جو امرِ خیر سے ہوگی محبت — تو ہوگا نفس منسوبِ سعادت

اگر شر کی طرف ہے نفس مائل — شقاوت اس محبت کا ہے حاصل

نہ صائب عقل اگر معیار ہوتی — تمیزِ نیک و بد دشوار ہوتی

محبّت اس محبّت کو نہ سمجھو — جو خارج دائرے سے عقل کے ہو

خلافِ عقل جو کچھ ہے جنوں ہے — محبت وہ نہیں جوشِ جنوں ہے

محبّت دل میں پیدا کی خدا نے — جنون و عشق اس کے شاخسانے

حقیقی عشق ہو چاہے مجازی — مقدّم ہے خلوص و پاکبازی

نہیں تو جذبۂ حرص و ہوس ہے — جسے پروانہ سمجھے وہ مگس ہے

محبّت ہے جمالِ نفس کا نام — محبّت اعتدالِ نفس کا نام

محبّت جوہرِ آئینۂ دل — محبّت گوہرِ گنجینۂ دل

محبّت شاہدِ معنی کا زیور — محبّت روحِ خالص روحِ پیکر

محبّت حکمرانِ بحر و بر ہے — جدھر دیکھو محبّت جلوہ گر ہے

بہار آگیں ہے گلزارِ محبّت — بہر سو گرم بازارِ محبّت

دلوں پہ نقش ہے نامِ محبّت — بچھا ہے ہر طرف دامِ محبت

اسی صحرا کا ذرّہ مہرِ انور — اسی دریا کا ہر قطرہ سمندر

اسی سے حسن کو ہے جامہ زیبی — اسی سے عشق میں یہ ناشکیبی

اسی سے سرو قمری دوش بر دوش   اسی سے بلبل و گل ہیں ہم آغوش

اسی سے نعرہ زن ہے شب کو سرخاب   دلِ پروانہ بہرِ شمع بے تاب

قمر پر کبک بھی شیدا اسی سے   شبِ مہ قہقہہ پیدا اسی سے

اسی سے آشنا ہے آب ماہی   فراقِ آب میں بے تاب ماہی

اسی سے ناچتے ہیں جدبیں مور   بندھا کالی گھٹاؤں کا جہاں زور

اسی سے ہر جگہ ہوتا ہے پابست   صدائے نے پہ ہر مارِ سیہ مست

اسی سے مہر پر حربا ہے عاشق   کنول کے پھول پر بھونرا ہے عاشق

اسی سے ہے دلوں میں ہوک اٹھتی   اسی سے کوئلیں ہیں کوک اٹھتی

اسی دھن میں پپیہا بولتا ہے   ہوائے شوق میں پر تولتا ہے

اسی سے چہچہے کرتے ہیں ہر آن   چمن میں صبح مرغانِ خوش الحان

صداؤں سے کبھی ہوتی ہے ظاہر   اداؤں سے کبھی ہوتی ہے ظاہر

کبھی ہوتی ہے آہوں سے نمودار   کبھی دلکش نگاہوں سے نمودار

دلِ نازک محبت کی ہے منزل   پری رازِ محبت شیشہ ہے دل

نگہ سے دل کا ملنا ہے جو انداز   اسے کہتے ہیں نبضِ دل نظر باز

ہیں آنکھیں مظہرِ نورِ محبت   کشادہ غرفۂ حورِ محبت

محبت ہے شرابِ روح پرور   دل اس کا شیشہ چشمِ لطف ساغر

دلِ خوں گرم کی پگھلانے والی   ق   نگہ بن کر قیامت ڈھانے والی

وہی شے ہے محبت نام جس کا   خمِ گیسوئے پیچاں دام جس کا

یہی ہے نسخۂ تسخیرِ عالم   یہی ہے حلقۂ زنجیرِ عالم

اسی سے نظمِ موجودات مربوط   مرادِ معنیٔ پیوند مضبوط

محبت کی کشش ہے جلوہ افگن   کہ مقناطیس سے کھنچتا ہے آہن

نہ ہوتی یہ اگر حکمِ خدا سے   نہ جذبِ کاہ ہوتا کہربا سے

یہ بے جانوں میں جانداروں میں ثابت   ثوابت اور سیاروں میں ثابت

جو پانی ماہ پر شیدا نہ ہوتا   کبھی یوں جزر و مد پیدا نہ ہوتا

نہ جذبِ حسن سے ہوتا جو بیتاب   کنویں سے یوں نکل پڑتا نہ سیماب

کُرے میں ارض کے زورِ کشش ہے
اسی سے ہے وہ دامنگیر ہر شے

کشش ہر ایک سیّارے نے پائی
خداوندا تری قدرت نمائی

یہ جذب و انجذاب باہمی ہے
جواب تک سدِّ راہِ برہمی ہے

اگر اس قید سے آزاد ہوتا
کُرہ اِس خاک کا برباد ہوتا

ہر اک ذرّے میں ہے جوشِ محبّت
ہر اک قطرہ ہے مے نوشِ محبّت

کہیں بیشی کہیں اس کی کمی ہے
محبّت سے مگر دنیا تھمی ہے

اسی پر منحصر ہے ربطِ افراد
نظامِ اتحادِ چار اضداد

اسی سے روح و تن میں رابطہ ہے
یہی ہستی کا گویا ضابطہ ہے

ہر اک ذرّے کے دل میں ہے محبّت
ہماری آب و گل میں ہے محبّت

کیا کس نے دلِ آدم کو غمگیں
فراقِ خلد میں باوصف تمکیں

جب اُن کو ہجرِ حوّا پیش آیا
وہ کیا تھا جس نے آدم کو رلایا

ہُوا جب کشتۂ بیدادِ قابیل
کہو، کیوں روئے آدم بہرِ ہابیل

ہوئے پھر پسر کیوں نوح مضطر
اُٹھایا کس نے طوفاں دل کے اندر

ہوئے یوسف سے جب یعقوب مہجور
تو کون آنکھوں کا اُن کی لے گیا نور

مہِ کنعاں کو دی کس نے عزیزی
زلیخا کو ملی کس سے کنیزی

بھرے لیلیٰ کا دم کِس نے بنایا؟
دلِ مجنوں کو دیوانہ بنایا

مہیّا کر دیا کس نے یہ ساماں
غمِ شیریں میں دی فرہاد نے جاں

کیا ہے نل دمن کو کس نے مشہور
میانِ ہند از نزدیک تا دور

مآلِ قصّۂ سلمیٰ محبّت
حدیثِ وامق و عذرا محبّت

محبّت مایۂ ناز و نیاز ست
گواہش حالِ محمود و ایاز ست

یہی گلدستۂ طاقِ خیالی
یہی آئینۂ بزمِ مثالی

یہی ہیرو ہے دلکش ناولوں کی
یہی رونق ہے رنگیں محفلوں کی

زمانہ کل، محبّت ہے کمانی
اسی کے دم سے ہے پرزوں میں روانی

محبّت کا اگر خوگر نہ ہوتا
تو دل ہرگز خدا کا گھر نہ ہوتا

فنا سے ہر نفاق اس پر ہے مبنی
بقائے اتفاق اس پر ہے مبنی

محبت الغرض ہے ایک نسبت
کہ دو جانب کی جس کو ہے ضرورت

مکمل ہو نہیں سکتی یہ خالی
کہ دونوں ہاتھ سے بجتی ہے تالی

نہ جب تک دل کو دل سے راہ ہوگی
کبھی الفت نہ خاطر خواہ ہوگی

اگر ہو مطلبِ مطلوب و طالب
کمالِ اتحادِ ہر دو جانب

یہاں تک رفعِ اسبابِ دوئی ہوں
کہ آخر ایک سمجھے جائیں دونوں

تو یہ ہے بہترینِ جملہ اقسام
صداقت ہے اسی اخلاص کا نام

صداقت سے ہے خالی جو محبت
نہیں زنہار اس کو استقامت

جسے دردِ محبت کا مرض ہو
اگر بے لوث یعنی بے غرض ہو

ق

تو ہے روحانیت کی اک نشانی
ثمر اس کا حیاتِ جاودانی

چراغِ بزمِ عرفاں ہے محبت
ثبوت اس امر کا ہے جوشِ رحمت

خدا کو خود ہے بندوں سے محبت
دلیلِ راہِ ایماں ہے محبت

خدا کے ساتھ بندوں کو محبت
اسی کا نام ہے حسنِ عبادت

محبت کا اگر ہوتا نہ پیوند
نہ ہوتی باپ ماں کو مہرِ فرزند

محبت گر نہ بنتی شیرِ مادر
تو پاتے پرورش اطفال کیونکر

یہی ہے دایۂ اطفالِ ناداں
یہی راتوں کو ہے گہوارہ جنباں

محبت ہی کا ہے اک رشتۂ خاص
زن و شو جس سے ہیں پابندِ اخلاص

محبت گر نہ ہوتی رحم حاشا
نہ کرتے ، ناتوانوں پر توانا

یہی ہے مرہمِ دلہائے خستہ
یہی ہے دستگیرِ پاشکستہ

یہی ہے اصلِ منشائے قوانیں
یہی سرتاجِ آدابِ سلاطیں

قوی تر ہے محبت کا تعلق
ہر اک قوت پہ ہے اس کو تفوق

محبت سے نکل سکتا ہے وہ کام
نہ دے زورِ حکومت جس کو انجام

نہایت تجربے کا یہ سخن ہے
حکومت کی محبت بیخ و بن ہے

وہ گرمی ہے محبت ہی کی گرمی
جو دل کو موم کی دیتی ہے نرمی

بٹھا دیتی ہے پھر نقشِ حکومت
مطیعِ شاہ ہوتی ہے رعیّت

اطاعت کیا ہے یہ بھی تو یہی ہے
ملازم کا جو فرضِ منصبی ہے

اگر دل میں نہیں سچّی محبّت
تو مشکل ہے ادائے حقِ خدمت

یہ کیفیّت اگر طاری نہ ہوگی
کبھی دل میں وفاداری نہ ہوگی

محبّت اصل و فرعِ آں وفاق ست
محبّت بیخِ نخلِ اتّفاق ست

مواسات و فتوّت کیا، یہی ہے
مراعات و مروّت کیا، یہی ہے

محبّت کو گھٹا دیتی ہے دوری
بڑھا دیتی ہے تدریجاً حضوری

طبائع کا توافق ہے مگر شرط
جز ابیکار ہے ہو فوت اگر شرط

اِسی باعث سے اکثر بے ارادہ
یہ ہمجنسوں میں ہوتی ہے زیادہ

کبوتر با کبوتر باز با باز
کند ہمجنس با ہمجنس پرواز

جو انساں میں نہ ہو حیواں سے بدتر
جو زندہ میں نہ ہو بے جاں سے بدتر

نہ ہو جس ملک میں بے تخت ہے وہ
نہ ہو جس قوم میں کم بخت ہے وہ

جو ہو منظورِ ہمچشموں میں عزّت
کرو اعلا و ادنیٰ سے محبّت

محبّت ہی وہ جامہ ہے جو یکسر
مزیّب ہے قدِ شاہ و گدا پر

صفی میزانِ خُلق و آدمیّت
محبّت ہے، محبّت ہے، محبّت



حکیم احمد شجاع ساحر

کسے تاب تھی کہ سنتا اور پھر مری زبانی
ترے حسن کا فسانہ، مرے عشق کی کہانی

ترے حسن پر لٹا دی، ترے عشق میں مٹا دی
وہ متاعِ بیش قیمت جسے کہتے ہیں جوانی

ترے سامنے جو چپ ہوں تو نہ اس سے یہ سمجھنا
کہ جنوں نے سیکھ لی ہے رہ و رسمِ نکتہ دانی

تری بے وفائیوں کا نہ گلہ نہ کوئی شکوہ
کہ جہانِ بے وفا کی ہے ہر ایک چیز فانی

نہ مری سمجھ میں آیا کبھی عقدۂ تناسخ
یہ حیاتِ جاوداں ہے کہ ہے مرگِ جاودانی

یہ وقارِ نفس جس پہ ہے مدار زندگی کا
وہ مقام ہے کہ جس میں تہِ تیشہ زندگانی

سرِ شام ہی سے ساحر ہے حریفِ ظلمتِ شب
کیے میکدے کو روشن بہ شرابِ ارغوانی



حکیم احمد شجاع ساحر

میری کم آگہی سے ہے سب تیری شانِ دلبری
میرے وفورِ عجز سے تیرا غرورِ برتری

کارِ جہاں ریا سے ہے دلق و قبا سب ایک ہیں
رخت کہن قلندری، جامۂ نو سکندری

میرا نیاز بے عروج اُس کے عروج کو زوال
کون حریفِ انقلاب ہیں کہ سریرِ قیصری

دستِ سوال بہرِ جاں، عرضِ کمال بہرِ جاہ
وہ بھی ہے اک گداگری یہ بھی ہے اک گداگری

دانشِ حیلہ ساز کی ابلہ فریبیاں ہیں سب
فکر و نظر کے شعبدے رشکِ بتانِ آذری

پیکرِ آب و گل ہیں سب آدمی ہوں کہ سومنات
بُت وہی بتکدے وہی عام ہے رسمِ بُت گری

ساحرِ مست غرق ہے بحرِ محیطِ ذات ہیں
ہے یہ خدا پرست بھی محرمِ رمزِ کافری



حکیم احمد شجاع ساحر

جلوہ دکھاکے کون سے پردوں میں چھپ گیا ہے تو
ڈھونڈھ رہا ہوں تجھ کو میں شہر بہ شہر کو بہ کو

کاوشِ دستِ بُت تراش، بوسۂ سنگِ آستاں
وہ تھا کمالِ جستجو، یہ ہے مآلِ جستجو

رنجِ شکستِ بے محل، شکوۂ دوستاں غلط
وہ بھی فریبِ آرزو، یہ بھی فریبِ آرزو

بادہ کشوں کی بزم میں بدِ فضول ہے حساب
گردشِ سبحہ اور ہے، اور ہے گردشِ سبو

غازۂ روئے دلبراں، سرخیٔ خونِ عاشقاں
حُسن کی اُس سے آبرو، عشق کی اِس سے آبرو

حیلہ گری ہے عقل کی قصّۂ جبر و اختیار
کون مکلّفِ جواب، روزِ حساب، مَیں کہ تُو

ساحرِ بادہ خوار کو ڈھونڈتے کیا ہو شہر میں
ہوگا کہیں خراب و مست جام بکف کنارِ جو



حکیم احمد شجاع ساحر

راتوں کو مرے نالے جب دھوم مچاتے ہیں
اِس گنبدِ گردوں کی بنیاد ہلاتے ہیں

اب کون ترے گھر کے درباں کی کرے منّت
ہم دور کہیں جا کر بُت خانے بناتے ہیں

واعظ سے کہو چھپ کر خلوت میں کہیں بیٹھے
کچھ رندِ خراباتی مے خانے کو جاتے ہیں

اس بربطِ ہستی کے تاروں کو بدل ڈالو
طوفانوں کے ہنگامے کب ان میں سماتے ہیں

طوفاں کے تھپیڑے جب ساحل سے الجھتے ہیں
سطحوں کی بلندی کو پستی سے مِلاتے ہیں

جن رندوں کی اک ہُو، اِس میخانے کی رونق ہے
یہ عقل فروش اُن کو دیوانہ بتاتے ہیں

اُس بزم میں ساحر کو جاتے نہ کبھی دیکھا
جس بزم میں انساں کو رتبوں سے بٹھاتے ہیں



احمد ندیم قاسمی

خیال میں، کبھی ادراک میں بساؤں اسے
مگر میں چار طرف بے حجاب پاؤں اُسے

اگرچہ فرطِ حیا سے نظر نہ آؤں اُسے
وہ روٹھ جائے تو سو طرح سے مناؤں اُسے

طویل، ہجر کا یہ جبر ہے، کہ سوچتا ہوں
جو دل میں بستا ہے، اب ہاتھ بھی لگاؤں اُسے

اُسے بُلا کے بِلا عمر بھر کا سنّاٹا!
مگر یہ شوق، کہ اک بار پھر بلاؤں اُسے

اندھیری رات میں جب راستہ نہیں ملتا
میں سوچتا ہوں، کہیں جا کے ڈھونڈ لاؤں اُسے

نہ آسکے گا مرے ذہن کی گرفت میں بھی
وہ دوست ہے تو خدا کس لیے بناؤں اُسے

ندیمؔ ترکِ محبت کو ایک عمر ہوئی!
میں اب بھی سوچ رہا ہوں کہ بھول جاؤں اُسے

یہ عجب شب ہے

احمد ندیم قاسمی

یہ عجب شب ہے کہ روشن بھی ہے، تاریک بھی ہے
اتنی روشن ہے کہ دن اس کے مقابل شب ہے
اور تاریک بھی اتنی، کہ ترے دھوکے میں
میں نے چند اور حسیناؤں کے لب چوم لئے

اتنی روشن کہ ترے پیار کے اس پار مجھے
جتنے چہرے نظر آئے، مرے اغیار کے تھے
اتنی تاریک کہ ان چہروں میں ہر چہرے پر
مجھے خود اپنے ہی چہرے کے گماں گزرے ہیں

میں ترے پاس رہا، پھر بھی بہت دور رہا
آج میں نے ترا ایک اور بھی پہلو دیکھا

فیصلہ

اختر انصاری

آؤ اِک دوسرے میں کھو جائیں

دورِ ایّام بے مروّت ہے
گردشِ چرخ بے حمیّت ہے
سخت نامہرباں مشیّت ہے
بڑی بے درد آہ! فطرت ہے

آؤ اک دوسرے کے ہو جائیں
آؤ اک دوسرے میں کھو جائیں

آؤ ہاتھوں میں ہاتھ دے لیں ہم

آفتوں سے بھرا ہوا ہے جہاں
تہلکوں سے مفر نہیں ہے یہاں
حادثوں کے کھلے ہوئے ہیں دہاں
ہم کہاں، تم کہاں، قرار کہاں

جبرِ حالات مل کے جھیلیں ہم!
آؤ ہاتھوں میں ہاتھ دے لیں ہم!

آؤ باہوں میں ڈال لیں باہیں!

ہر خوشی ہے ملال در آغوش
زندگی ہے فنا کی حلقہ بگوش
کاروبارِ حیات مرگ فروش
ہر نفس خیر سے جنازہ بدوش
زیست کی کچھ نکال لیں راہیں
آؤ باہوں میں ڈال لیں باہیں

اپنے دامن میں تم چھپا لو ہمیں

ابرِ رحمت ہے برق کا مسکن
گُل کدے ہیں بہار کے مدفن
قطرہ قطرہ ہے سیل در دامن
ذرّہ ذرّہ ہے حشر کا مامن
ہم کلیجے میں ڈال رکھیں تمھیں!
اپنے دامن میں تم چھپا لو ہمیں!

اس سے بہتر جواب کیا ہوگا!

روشِ دہر کی شقاوت کا
وضعِ حالات کی دنائت کا
بخت کی دائمی عداوت کا
چرخ کے جورِ بے نہایت کا
اس سے بڑھ کر جواب کیا ہوگا!
اس سے بہتر جواب کیا ہوگا!

یہی میراثِ نسلِ آدم ہے!

چاکِ دامانِ دل سئے جائیں
زخمِ ہستی رفو کئے جائیں
بادہ ہو یا کہ سم، پئے جائیں
کچھ ہو انجام، ہم جئے جائیں

یہی تقدیرِ بزمِ عالم ہے
یہی میراثِ نسلِ آدم ہے

اب یہی فیصلہ ہے یاروں کا

جورِ غم ہم سے ہاتھ دھو بیٹھے
جبرِ حالات ہم کو رو بیٹھے
کشتی اپنی فلک ڈبو بیٹھے
اور مشیّت حواس کھو بیٹھے

ہے یہی عہد غم کے ماروں کا
اب یہی فیصلہ ہے یاروں کا

حفظِ مراتب

(مدیرِ نقوش کے نام)

پروفیسر منظور حسین شور

اگرچہ ظلمتِ کون و مکاں کی زد پر بھی ، ہے بر و بحر پہ صدیوں سے سیلِ ماہ رواں

اگرچہ تیرہ شبی کی بھی سینہ چاکی ہیں بھرا ہوا ہے اجالوں سے جیبِ کاہکشاں

اگرچہ تاج و کُلہ سے جدا بھی دریا ہیں ہزار ہا گہرِ شاہوار ہیں ... غلطاں

اگرچہ طاقِ خزف میں بھی قصرِ شاہ سے دُر سلگ کے گل نہیں ہوتا زمرّدِ تاباں

اگرچہ انجمنِ صد ہزار کوراں ہیں نظارہ تاب ازل سے ہے حسنِ دیدہ وراں

پیمبریٔ نفسِ ساحری نہیں ہے تو پھر ، جدا جدا ہیں مقاماتِ وحدتِ انساں

سحر کے نور کو شمعِ حرم کی جوت نہ جان اگرچہ صبح کا اس میں نہیں ہے کوئی زیاں

فسانہ ساز ابد تک ہے حرفِ تیشہ و سنگ اگرچہ بند ہے تا حشر کوہکن کی زباں

بجا کہ شعر کا بازار گرم ہے ہر سُو خیال و فکر بھی سستے ، ضمیر بھی ارزاں

بجا کہ کوچہ بکوچہ ہے نخشبوں کا ہجوم روش روش پہ ترشتا ہے اکِ مہِ تاباں

بجا کہ بتکدۂ وقت نے تراشے ہیں ، ہزار غالبِ دوراں ، ہزار میرِ زماں

ضمیر و ذہن پہ حلقوں کی مہر ثبت سہی قدم قدم پہ سہی شاعری کی ایک دکاں

ہزار رات کا میزان معتبر ہو مگر تُلے تو کیسے تُلے جنسِ نیّرِ تاباں

یقین کفر کے چشمے پہ کر رہا ہے وضو اندھیرا صبح کے منبر پہ دے رہا ہے اذاں

تری نگاہ کا ہو یا مرے نفس کا قصور

جلا کے دیکھ نہ تو مقبرے میں مشعلِ طور

پت جھڑ

مجید امجد

شیشموں کی ہری شاخوں پہ سہانے پتّے،
سب نئے اور پرانے پتّے،
بھرے بھادوں کی ڈھلی دھوپ میں رہ رہ کے جھمکتے تھے ابھی،
جب مری عمر کی پچاسویں پت جھڑ آئی

اتنا بھرپور سماں تھا — مگر اب کے تو ہر اک گرتے ہوئے پتّے کے ساتھ
اور اک مٹی کی تہ — میرے لہو میں تیری،
اور اک ریت کی سلوٹ — مرے دل میں اُبھری،
اور اک زنگ کی پپڑی — مری سانسوں پہ جمی،
اتنا بھرپور سماں تھا — مگر اب کے تو مجھے جس نے بھی دیکھا، یہ کہا:
"جانے کیا بات ہوئی، کچھ تو بتا،
تیرے ہونٹوں سے تو اب ایک وہ مرجھائی ہوئی موجِ تبسّم بھی گئی!"

میں اب کس کو بتاؤں کہ مرے جسم کے گارے میں گندھی

ایک ذی حس تپش ایسی کبھی تو ہے، جس کے سبب
روح کی راکھ پہ شعلوں کی شکن پڑتی ہے
سانس کے بل ہیں پنپنے کی سکت بٹتی ہے
ٹوٹتی کڑیوں ہیں جینے کے جتن جڑتے ہیں
میں یہ اب کس کو بتاؤں کہ مرے جسم کے ریشوں کے اس الجھاؤ میں ہے،
ایک وہ گرتی سنبھلتی ہوئی، نازک سی دھڑکتی ہوئی لہر،
جو ہر اک دکھ کی دوا ڈھونڈھتی ہے،
جو عجب حیلوں وسیلوں سے، گذرتے ہوئے لمحوں کے قدم روکتی ہے،
مجھ سے کہتی ہے کہ "دیکھ، ایک برس اور بجھا،
دیکھ، اب کے تری ہنستی ہوئی بتیسی پر،
ایک دھبّا سا پڑا، دانت جھڑا،
گھاؤ یہ اب نہ بھرے گا، کہیں اس سے تو یہ بہتر ہے کہ تو
اپنے ہونٹوں پہ لگالے کسی جھوٹی سی کڑی سوچ کی مُہر!"

لوگ کہتے پھرے، اس شخص کو دیکھو، اب تو
اس کے ہونٹوں سے تو اب ایک وہ مرجھائی ہوئی موجِ تبسّم بھی گئی
جب مری عمر کی پچّاسویں پت جھڑ آئی!

خم کدہ

عبدالحمید عدم

یہ کون نازنیں ہے جو اتنی دلبری سے

میخانۂ ازل میں ہم کو بلا رہا ہے

قائم ہیں روشنی کی دو سرمدی لکیریں

اک جام جا رہا ہے اک جام آ رہا ہے

ہماری خیر و خوبی کو گھٹانے کا تہیّہ ہے

اور اپنی شان و شوکت کو بڑھانے کا ارادہ ہے

ارے او صوفیو! او پارساؤ! او ریاکارو!

عبادت سے خدا کو ورغلانے کا ارادہ ہے؟

بت شکن ہوں رسوم باطل کا

یہ مرا نام و ننگ ہے ساقی

ہاتھ میں مے کا جام ہے تو کیا

دوش پر طبلِ جنگ ہے ساقی

سب مایا ہے

ابن انشا

سب مایا ہے، سب ڈھلتی پھرتی چھایا ہے
اس عشق میں ہم نے جو کھویا، جو پایا ہے
جو تم نے کہا ہے، فیضؔ نے جو فرمایا ہے
سب مایا ہے

ہاں گاہے گاہے دید کی دولت ہاتھ آئی
یا ایک وہ لذّت، نام ہے جس کا رسوائی
بس اس کے سوا تو جو بھی ثواب کمایا ہے
سب مایا ہے

ہاں نام تو باقی رہتا ہے، گر جان نہیں
جب دیکھ لیا اس سودے میں نقصان نہیں
تب شمع پہ دینے جان پتنگا آیا ہے
سب مایا ہے

معلوم ہمیں سب قیس میاں کا قصّا بھی
سب ایک سے ہیں، یہ رانجھا بھی، یہ انشاؔ بھی
فرہاد بھی جو اک نہر سی کھود کے لایا ہے
سب مایا ہے

، مایا۔ دھوکا، سراب، ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کیوں درد کے نامے لکھتے لکھتے رات کرو
جس سات سمندر پار کی نار کی بات کرو
اُس نار سے کوئی ایک نے دھوکا کھایا ہے؟

سب مایا ہے

جس گوری پر ہم ایک غزل ہر شام لکھیں
تم جانتے ہو، ہم کیونکر اس کا نام لکھیں
دل اس کی بھی چوکھٹ چوم کے واپس آیا ہے

سب مایا ہے

وہ لڑکی بھی جو چاند نگر کی رانی تھی
وہ جس کی الھڑ آنکھوں میں حیرانی تھی
آج اس نے بھی پیغام یہی بھجوایا ہے

سب مایا ہے

جو لوگ ابھی تک نام وفا کا لیتے ہیں
وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں
ہاں ٹھوک بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے

سب مایا ہے

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہرجائی ہے
اس شہر سے دور۔ اک کٹیا ہم نے بنائی ہے
اور اُس کٹیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے

سب مایا ہے
سب مایا ہے

اک بار کہو تم میری ہو

ابن انشا

ہم گھوم چکے بستی بن میں
اِک آس کی پھانس لیے من میں
کوئی ساجن ہو، کوئی پیارا ہو
کوئی دیپک، چندا، تارا ہو
جب جیون رات اندھیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

جب ساون بادل چھائے ہوں
جب پھاگن پھول کھلائے ہوں
جب چندا روپ لٹاتا ہو
جب سورج دھوپ نہاتا ہو
یا شام نے بستی گھیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

ہاں دل کا دامن پھیلا ہے
کیوں گوری کا دل میلا ہے
ہم کب تک پیت کے دھوکے ہیں
تم کب تک دُور جھروکے ہیں
کب دید سے دل کو سیری ہو
اک بار کہو، تم میری ہو

دل منزل منزل بھٹکے تو؟
دل اور کہیں جا اٹکے تو؟
ہم خوش دل، خوش دل کیونکر ہوں
جب دامن دامن پاتھر ہوں
جب آنگن آنگن بیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

کیا جھگڑا سُود خسارے کا،
یہ کاج نہیں بنجارے کا
سب سونا روپا لے جائے
سب دنیا، دنیا لے جائے
تم ایک مجھے بہتیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

رُباعیات

تلوک چند محروم

○

ہم نے بھی کھلائے ہیں چمن دیکھو تو
اشعار کے سرو اور سمن دیکھو تو
الفاظ و معانی ہیں گل و نکہتِ گل
اے حُسن شناسانِ سخن دیکھو تو

○

پیدا فکرِ و نظر سے ہوتا ہے سخن
دل کش اپنے اثر سے ہوتا ہے سخن
ہرگز یہ نہیں قافیہ پیمائی کا فن
رنگیں خونِ جگر سے ہوتا ہے سخن

○

مستوں کی رُباعیاں ہیں مستی سے بھری
صد گونہ نشاطِ مے پرستی سے بھری
محرُوم تری رباعیاں ہیں لیکن
بے منتِ مے سرورِ ہستی سے بھری

○

مشغلہ اپنا لڑکپن سے ہے تزئینِ ادب
ملحوظِ نظر رہا ہے آئینِ ادب
ڈرتے ہیں مشاعروں میں پڑھتے ہوئے شعر
کر دے کوئی کہیں نہ توہینِ ادب

○

تحسینِ سخن شناس ہے جانِ سخن
محتاجِ مشاعرہ نہیں شانِ سخن
ہوتی ہیں مشاعرے میں جتنی "واہیں"
اتنے تو نہیں ادا شناسانِ سخن

○

محرومؔ! مشاعرے میں جانا ہے اگر — کیا ہرج ہے، آتا تمھیں گانا ہے اگر
گانا نہیں آتا تو نہ جانا ہرگز! — اپنی تمھیں آبرو بچانا ہے اگر

○

موزوں اشعار اگرچہ کرتا ہوں میں — کچھ رنگ نیا بھی ان میں بھرتا ہوں میں
تقطیع کی تکلیف نہ دینا مجھ کو — اے اہلِ عروض! تم سے ڈرتا ہوں میں

○

آتی نہیں شاعری کسی حکمت سے — جوہر ملتا ہے یہ بڑی قسمت سے
رو زان کا علم کیوں کتابوں میں پڑھیں — طبعِ موزوں ملی ہو جب قدرت سے

○

غم خانۂ فکر کی بنا خود ڈالی — جس روز سے ہم نے شاعری اپنالی
پھر اُس پہ تخلص بھی کیا تو محروم — جس کے پانچوں حروف نکلے خالی

○

شاعر کے تخیل میں بھی اعجاز ہے کیا — سازِ ازل پہ نغمہ پرداز ہے کیا
مہر و مہ و پروین پہ گزر ہے اس کا — بے پر ہے مگر طاقتِ پرواز ہے کیا

○

میں نے جو رموز شعر میں کھولے ہیں — ہر چند بہ میزانِ خرد تولے ہیں
اب جائزہ اعمال کا اپنے لے کر — کہتا ہوں بڑے بول بہت بولے ہیں

حمد

مصطفیٰ زیدی

ہم نے اُس قوّتِ محسوس کو دیکھا نہ سُنا
ہم نے اُس گوہرِ ناسفتہ کو پرکھا نہ چُنا
اک سواری کہ شناسا نہ تھی، گھر پہ اُتری
اک تجلّی تھی کہ تہذیبِ نظر پر اُتری
جلوے دیکھے جو کبھی شاملِ ایماں بھی نہ تھے
اور ہم ایسے تن آساں تھے کہ حیراں بھی نہ تھے
دل کے آغوش میں اک نور دھمکتا گذرا
ایک لمحہ کئی صدیوں پہ چمکتا گذرا
وہم و تشکیک سے الہام کی باری نہ رُکی
شب سے شہزادۂ خاور کی سواری نہ رُکی
پتھروں کے صدفِ تیرہ سے ہیرے اُبھرے
بے کراں موج سے بے نام جزیرے اُبھرے
آیتیں گونج اُٹھیں حکمتِ گویا کے بغیر
مشعلیں جلنے لگیں شعلۂ سینا کے بغیر

اجنبی شہر سے اک خوشبوئے دم ساز آئی
دم بہ خود، مہر بہ لب وقت سے آواز آئی
"رات کا کرب بھی میں، صبح کا آرام بھی میں
حدّ و بے حد بھی میں، بے نام بھی میں، نام بھی میں
سنگ و سنجاب بھی ہوں، شعلہ بھی ہوں، خاک بھی ہوں
میں ترا وہم بھی ہوں، میں ترا ادراک بھی ہوں
میرا ہی سوزِ خموشی ہے ہر آہنگ کے ساتھ
میری ہی نرمیٔ مسلک ہے رگِ سنگ کے ساتھ
میری روداد وہی ہے جو جہاں پہ گذری
لامکاں پر بھی وہ گذری جو مکاں پر گذری
گردشیں تجھ سے ہلیں تو مرے پاس آئیں بھی
میں ترا جسم بھی ہوں، میں تری پرچھائیں بھی"



مصطفیٰ زیدی

بجھ گئی شمعِ حرم، بابِ کلیسا نہ کھلا
کھُل گئے زخم کے لب، تیرا دریچہ نہ کھُلا

درِ توبہ سے بگولوں کی طرح گذرے لوگ
ابر کی طرح اُمڈ آئے جو مےخانہ کھلا

شہر در شہر پھری میرے گناہوں کی بیاض
بعض نظروں پہ مرا سوزِ جکیمانہ کھلا

نازنینوں میں رسائی کا یہ عالم تھا کبھی
لاکھ پہروں میں بھی دروازے پہ دروازہ کھُلا

اب جو بیباک ہوئے بھی تو بہ صد اندیشہ
اب جو اک شخص کھُلا بھی تو حجابانہ کھلا

ہم پریزادوں میں کھیلے، شبِ افسوں میں پلے
ہم سے بھی تیرے طلسمات کا عقدا نہ کھُلا

ایک اک شکل کو دیکھا ہے بڑی حیرت سے
اجنبی کون ہے اور کون شناسا نہ کھلا

ریت پر پھینک گئی عقل کی گستاخ لبی
پھر کبھی کشف و کرامات کا دریا نہ کھُلا



شان الحق حقی

باقی نہ کوئی منزل، پہنچیں نہ کہیں راہیں
بھٹکا کے رہیں مجھ کو آوارہ گزرگاہیں

آلامِ زمانہ سے چھُوٹیں تو تجھے چاہیں
مصروفِ مشقّت ہیں حسرت سے بھری بانہیں

صحرا ہی سے گزری تھیں کھوئی گئیں جو راہیں
بتلائیں گے یہ چشمے، یہ بن، یہ چراگاہیں

شمشیر کی زد پر ہیں کچھ اور ہمیں جیسے
ہنگامِ تقاضا کیا، اے دل وہ جسے چاہیں

اب کون کہے تارا ٹوٹا تو کہاں پہنچا؟
آزاد کی ہر دُنیا، برباد کی سو راہیں

کیا رُوپ بدلتے ہیں تصویر میں ڈھلتے ہیں
آنکھوں میں رُکے آنسو سینے میں گھُٹی آہیں

اب نامِ غمِ دل کا تصویر و قلم تک ہے
طوفان نے سفینوں میں ڈھونڈی ہیں پناگاہیں

تشہیرِ سخن کہئیے یا قدرِ سخن حقّی
ارزاں ہیں مرے آنسو رسوا ہیں مری آہیں



شاعر لکھنوی

کہیں تو عشق کی آوارگی کو رنگ ملے ۔۔۔ دیارِ گل نہیں ملتا، دیارِ سنگ ملے

ہمارے خوں میں نہا کر بہار جب گزری ۔۔۔ دھواں دھواں تھے جو چہرے وہ رنگ رنگ ملے

تری گلی میں نہ جائیں تو پھر کہاں جائیں ۔۔۔ وہ لوگ، وسعتِ صحرا بھی جن کو تنگ ملے

سبھی ہیں غیر بھی، اپنے بھی، اب یہ کیا کہیے ۔۔۔ کدھر سے پھول ملے ہیں، کدھر سے سنگ ملے

سنا ہے راہ میں کانٹوں نے سر اٹھایا ہے ۔۔۔ ہماری آبلہ پائی کو اذنِ جنگ ملے

ورق ورق پہ نمایاں تھی اک نئی تحریر ۔۔۔ حجابِ گُل میں بھی کتنے حجابِ رنگ ملے

بتا سکیں گے وہی کچھ حقیقتِ پرواز ۔۔۔ جنھیں زمیں کی طرح آسماں بھی تنگ ملے

نصیب سب کو کہاں عزت شناسائی ۔۔۔ اُٹھا کے سر کو جو گزرے اُنھی کو سنگ ملے

یہ سب غزل کی لطافت کا فیض ہے شاعرؔ

نئے نئے جو ہمیں سوچنے کے ڈھنگ ملے



شاعر لکھنوی

دار تک آئے حریم لب و رخسار سے لوگ
باخبر کتنے ہیں حالات کی رفتار سے لوگ
دوست بن جاتے ہیں پیرایۂ اظہار سے لوگ
زخم دینے کو بھی آتے ہیں بڑے پیار سے لوگ
پرسشِ غم سے نئے زخم کھلا دیتے ہیں
یہ سبک چہرہ، یہ معصوم، یہ غمخوار سے لوگ
دل جو ارزاں ہے تو بے مول بھی بک جائے گا
پہلے مانوس تو ہوں چشمِ خریدار سے لوگ
اُس کی معصوم نگاہی کا اثر کیا کہئے
بے خطا بھی ہوں تو لگتے ہیں خطاوار سے لوگ
ڈھونڈنے کے لیے آوارہ مزاجی کا جواز
پھول تک آ گئے اُن کے لب و رخسار سے لوگ
ہونے والا ہے کسی صبحِ طرب کا آغاز
جاگ اُٹھے ہیں مری زنجیر کی جھنکار سے لوگ
سرِ سودا کی تواضع کے لیے اے شاعر
سنگِ آوارہ اُٹھا لائے ہیں بازار سے لوگ



نور بجنوری

بے کل سا ہو گیا ہوں ہواؤں کے شور سے
صحرا پکارتا ہے مجھے زور زور سے

وہ آنچ ہے کہ سایۂ دیوار جل گیا
شعلے نکل رہے ہے مری پور پور سے

کیا کیا نہ کج کلاہ تھے اقلیمِ عشق میں
آنکھیں ملا سکا نہ کوئی دل کے چور سے

کس کا خرام رازِ خرابات کہہ گیا
جنگل میں ناچتے ہوئے بدمست مور سے

کن بادلوں میں چھپ گئیں مہتاب زادیاں
پیمانِ شوق باندھ باندھ کے دل کے چکور سے

اہلِ خرد حساب میں مصروف تھے ابھی
ہم جا کے مڑ بھی آئے خلاؤں کے چھور سے

دیکھا ہے نور میری گنہگار آنکھ نے
فنکار کو بندھے ہوئے چاندی کی ڈور سے



شفقت کاظمی

ترا خیال مجھے راس آئے گا کہ نہیں
غمِ حیات کو آساں بنائے گا کہ نہیں

زمانہ جس کے سبب سے ہے مہرباں مجھ پر
کبھی وہ آپ مرا دُکھ بٹائے گا کہ نہیں

خزاں کے جَور اُٹھاتے رہیں گے ہم کب تک
کبھی بہار کا مژدہ سنائے گا کہ نہیں

بچھڑ گئے جو سرِ راہ زندگی مجھ سے
کبھی پھر اُن سے مُقدّر ملائے گا کہ نہیں

بجا ہے عہدِ محبت مگر خدا جانے
وہ مجھ سے عہدِ محبت نبھائے گا کہ نہیں

سکونِ قلب کی ضامن ہے یاد جس دن کی
وہ دن بھی پھر مری قسمت میں آئے گا کہ نہیں

گزر گیا ہے زمانہ تجھے ستم کرتے
کبھی کرم کی بھی تمہید اُٹھائے گا کہ نہیں

مٹا چکی ہیں جنھیں گردشیں زمانے کی
وہ بستیاں بھی کوئی پھر بسائے گا کہ نہیں

ہلاکِ کشمکشِ انتظار ہے شفقتؔ
وہ غم نصیب تجھے یاد آئے گا کہ نہیں



خانم، ممتاز مرزا

شامِ فراق بزم سجانے کو آگئی
پھر اُن کی یاد شمع جلانے کو آگئی

اُن کے بغیر پھول کھلاتی تو کیا نسیم
اکثر چمن میں آگ لگانے کو آگئی

دشتِ طلب میں دل پہ جو گزری نہ پوچھیے
ٹھنڈی ہوا اٹھی نیند دِوانے کو آگئی

اُٹھ کر تمھارے در سے بھٹکتے کہاں کہاں
اچھا ہوا کہ موت بُلانے کو آگئی

جب بھی کیا ہے جشنِ چراغاں بہار نے
بادِ خزاں چراغ بجھانے کو آگئی

اس درجہ آشیاں کو خرابی سے ربط تھا
بنتے ہی موجِ برق جلانے کو آگئی

ممتازؔ بزمِ شعر کہاں اور میں کہاں
اک غم کی داستاں سنانے کو آگئی



خانم، ممتاز مرزا

کسی کو کیا کہوں خود پر ہی اختیار نہیں
یہ حال ہے کہ تمھارا بھی اعتبار نہیں

اُٹھا لے نفرت و حرص و ہوس کی دُنیا سے
ترے جہاں کی ہوا مجھ کو سازگار نہیں

نبردِ عشق میں تنہا ہی زخم کھاتے ہیں
شریک درد نہیں کوئی غم گسار نہیں

کہو نسیم سے کلیاں کھِلانا بند کرے
میری حیات میں گنجائشِ بہار نہیں

یہ زندگی ہے عبارت تمھاری یادوں سے
تمھاری یاد ہے وہ پھُول جس میں خار نہیں

تمھاری یاد کی خوشبُو کے ساتھ بڑھتے گئے
جہاں ہو حاجتِ رہبر، یہ رہگزار نہیں

ہمیں تو یاد نہیں زندگی میں اے ممتاز
وہ لمحہ جب کہ ہمیں ان کا انتظار نہیں



خانم، ممتاز مرزا

رہبر کا نہیں ذکر کہ بے وجہ جلے ہے
ورنہ مری منزل تو مرے ساتھ چلے ہے

ہم خانہ خرابوں کا یہاں کون ہے یارب
ایک موجِ شرر ہے کہ سدا ساتھ چلے ہے

اب شیخ بھی راضی ہے برہمن بھی ہے شاداں
مسجد کہیں ویراں، کہیں بُت خانہ جلے ہے

خوں ٹپکے ہے برسوں رُخِ خورشید سے ہمدم
تب سنگ کہیں لعلِ بدخشاں میں ڈھلے ہے

شاید کہ بہار آئی ہے ممتاز چمن میں
پھر دُور کہیں کوئی نشیمن سا جلے ہے



خانم، ممتاز مرزا

مائلِ لُطف ہیں وہ دیکھئے کیا ہوتا ہے
درد گھٹتا ہے کہ اب اور سوا ہوتا ہے

اپنی محرومیِ قسمت کا گلہ کیا کیجے
ایک بے مہر پشیمانِ جفا ہوتا ہے

جذبۂ شوق نے مجبُور کیا ہے ورنہ
خود بخود کون گرفتارِ بلا ہوتا ہے

التجا لُطف کی کرنے کو تو سو بار کریں
دل لرز جاتا ہے جب خونِ وفا ہوتا ہے

ہائے وہ غم جسے بے پایاں مسرت کہیے
ہائے وہ درد جو خود جانِ دوا ہوتا ہے

میں ترا عکس ہوں اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنے سائے سے بھلا کوئی خفا ہوتا ہے

پھر بھی ہم کر نہ سکے ترکِ محبّت، ممتازؔ
یہ سمجھتے ہیں کہ انجام بُرا ہوتا ہے



ظہور نظر

جس طرح تُند ہوا کُنجِ شجر سے گزرے
یوں تری یاد مرے چاکِ جگر سے گزرے

دم کہیں لیں، کہیں ٹھہریں تو بتائیں تجھ کو
کس طرح ہم تیری فرقت کے سفر سے گزرے

اب بھی آتا ہے ترا دھیان مگر یوں، جیسے
اجنبی کوئی کسی راہگزر سے گزرے

اتنا آساں بھی نہیں ترکِ تمنّا کا خیال
یہ ہے وہ موجۂ پایاب جو سر سے گزرے

حسرتیں رنگتی پھرتی ہیں اب اُن راہوں میں
قافلے تیری تمنّا کے جدھر سے گزرے

جب بھی آیا ترے پیار کے دریا کا خیال
اَن گنت دشت مرے دیدۂ تر سے گزرے

تیز برسات سے بھی گرد نہ پیڑوں کی دُھلی
ہجر میں ایسے مناظر بھی نظر سے گزرے

ریزہ ریزہ

ظہور نظر

ہنس رہا ہے، بس رہا ہے سارا شہر!
خواہشوں کی زندگی آموز خوشبو میں بسے
خوبصورت جسم، رنگیں پیرہن
مسکراتے، گنگناتے، آتے جاتے مرد و زن،
جھومتے اشجار، ہنستے غنچہ و گل، لہلہاتے برگ و بار
دے رہے ہیں مژدۂ فصلِ بہار ——!

پھر بھی جانے کیوں مجھے
اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ میں
ہنستے بستے شہر کے اک خوبصورت چوک میں
ایک ایسے منہدم بت کی طرح استادہ ہوں
جسم جس کا زلزلے کے آخری جھٹکوں کے ساتھ
گر رہا ہو ریزہ ریزہ ہو کے فرشِ خاک پر!
بچھ رہا ہو بیتے لمحوں کے خس و خاشاک پر



شکیب جلالی

میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں
مرجھا کے آ گرا ہوں مگر سرد گھاس میں

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

صحرا کی بود و باش ہے اچھی نہ کیوں لگے
سوکھی ہوئی گلاب کی ٹہنی گلاس میں

دھوکے سے اس حسین کو اگر چوم بھی لیا
پاؤ گے دل کا زہر لبوں کی مٹھاس میں

چمکے نہیں نظر میں ابھی نقش دور کے
مصروف ہوں ابھی عملِ انعکاس میں

تارہ کوئی ردائے شبِ ابر میں نہ تھا
بیٹھا تھا میں اداس بیابانِ یاس میں

جوئے روانِ دشت ابھی سوکھنا نہیں
ساون ہے دور اور وہی شدت ہے پیاس میں

رہتا تھا سامنے ترا چہرہ کھلا ہوا
پڑھتا تھا میں کتاب یہی ہر کلاس میں

کانٹوں کی باڑ پھاند گیا تھا مگر شکیبؔ
رستہ نہ مل سکا مجھے پھولوں کی باس میں



بشیر بدر

خون - پتّوں پہ جما ہو جیسے
پھول کا رنگ ہرا ہو جیسے

بارہا یہ ہمیں محسوس ہُوا
درد سینے کا خدا ہو جیسے

یوں ترس کھا کے نہ پوچھو احوال
تیر سینے پہ لگا ہو جیسے

پھول کی آنکھ میں شبنم کیوں ہے
سب ہماری ہی خطا ہو جیسے

کرچیں چبھتی ہیں بہت سینے میں
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے

سب ہمیں دیکھنے آتے ہیں مگر
نیند آنکھوں سے خفا ہو جیسے

اب چراغوں کی ضرورت بھی نہیں
چاند اس دل میں چھپا ہو جیسے

جی میں آتا ہے کہ سجدہ کر لیں
دل کی آواز خدا ہو جیسے

روز آتی تھی ہَوا اُس کی طرح
وہ بھی یوں آیا ہُوا ہو جیسے

احسن علی خان

ہم کہہ نہ سکیں گے تو یہ حالات کہیں گے
پھر لوگ عجب حرف و حکایات کہیں گے

کیا شیخ سے کہتے کہ مصائب کو یہ حضرت
اللہ کی بھیجی ہوئی آفات کہیں گے

جو کر کے چکا چوند حقیقت کو چھپائیں
ہم ایسے اجالوں کو بھی ظلمات کہیں گے

کیا واسطۂ مہر و وفا دیں کہ وہ اِن کو
ناکارہ و فرسودہ روایات کہیں گے

ہاں! ترکِ تعلّق پہ بھی یہ ربط ہے باقی
مل جائیں نگاہیں تو ملاقات کہیں گے

خاموش سہی نطق سے محروم نہیں ہیں
کہنے پہ جب آئیں گے تو ہر بات کہیں گے

کیا کوئی اُٹھائے گا نہ صیّاد پہ اُنگلی؟
کیا اہلِ گلستاں فقط "ہیہات" کہیں گے

نادان سمجھتے نہیں ایما ہے جو تیرا
ہاں اہلِ خرد دن کو بھی اب رات کہیں گے

کل گفتۂ احسنؔ کو وہ ٹھہرائیں گے احسن
آج امرِ جنوں، شورشِ جذبات کہیں گے

میں کیوں جی رہا ہوں؟ میں زندہ ہوں کیسے؟

احسن علی خاں

مرے دوست، اب دوستی کیا نبھے گی جو تیرا ہے یزداں، مرا اہرمن ہے
تری زندگی زور زر، جاہ و نخوت مری زندگی عشق و غم، شعر و فن ہے
جو صحرا ہے تیرا وہ میرا چمن ہے

یہ مانا تمسخر سے پوچھا ہے تو نے میں کیوں جی رہا ہوں؟ میں زندہ ہوں کیسے؟
مگر سوچتا ہوں میں سنجیدگی سے کہ کیوں جی رہے ہیں یہ انساں، یہ کیڑے
کہ یہ زندگی کس طرف گامزن ہے؟

یہ مانا حقیر اور ادنیٰ ہوں لیکن میں جب تک ہوں "میں" زندگانی ہے میری
محبّت سے پائی ہے میں نے یہ وسعت کہ سب کی کہانی، کہانی ہے میری
کہ دنیا کا دکھ میرے دل کی چبھن ہے

خریدے حسیں جسم، لیکن کیا ہے کبھی روح کے پیار کا مول تو نے؟
خوشامد، فغاں، شور و غل سننے والے کبھی نہ سنے پیار کے بول تو نے
یہ بن پیار جیون بھیانک سپن ہے

جو گاڑی کے سائے میں چلتا ہے کتّا سمجھتا ہے کاندھوں پہ میرے جُوا ہے
گزرتے ہوئے وقت کی ٹھوکروں میں یہ انساں پڑا ہے، مگر جانتا ہے
کہ ہاتھوں میں میرے عنانِ زمن ہے

فضا میں پہنچ کر یہ دعویٰ ہے تجھ کو کہ دن رات کی چاک کر دیں قبائیں
نہ مغرور ہو اپنی پرواز پر تو ابھی تو ہیں باقی ہزاروں فضائیں
ابھی زندگی پا بہ زنجیرِ تن ہے

ابھی صرف "ذرّے" کی طاقت ملی ہے ابھی سے ترا حد سے باہر قدم ہے
کہیں تیرے ہاتھوں قیامت نہ آئے تو حیواں زیادہ اور انساں کم ہے
لہو کا طلبگار تیرا دہن ہے

تعجب ہے تجھ کو میں کیونکر ہوں زندہ تو سمجھا ہے میری نہ دنیا نہ دیں ہے
خرید اپنے سکّوں سے توُ دین و دنیا مجھے دین و دنیا کی پروا نہیں ہے
مرا حاصلِ زندگی میرا فن ہے
یہ فن اک حسیں تر جہاں کی لگن ہے

حمد

انوار انجم

رگوں میں پھیلتی جاتی ہے زہر بن کے حیات
نفس بکھر سے گئے روح کی مسافت میں
نگاہ جیسے اندھیروں میں جا کے ڈوب گئی

کوئی دعا کبھی پہنچی نہیں ترے در تک
مگر جبیں پہ شکایت کی اک شکن بھی نہیں۔
یہ جانتا ہوں اگرچہ ترے خزانے سے
مرے نصیب میں ٹوٹی ہوئی کرن بھی نہیں
مگر بہ فیضِ یقیں آج بھی دلِ ناکام!
ترے تصوّرِ موہوم کا پجاری ہے
سوائے سنگ و شرر کچھ نہ مل سکا لیکن
یہ سادہ لوح کہ پھر بھی ترا بھکاری ہے

تو واقعی وہ شہنشاہِ ذوالجلال ہے جو
قدم قدم پہ دکھاتا ہے اپنی شانِ عظیم،
تو کچھ سنے نہ سنے ہم رہیں گے سر بسجود
کوئی ہو دل کی صدا ہم پہ فرض ہے تکریم
اب اس سے آگے ہو کیا نیری قوتوں کا بیاں
اب اس سے بڑھ کے ترا اختیار کیا ہوگا

اِک بوند لہو کی

انوار انجم

یوں بھی ہوتا ہے کہ دریاؤں کے سوکھے ہوئے لب
خود ہی سیلاب کی لہروں میں نہا جاتے ہیں
یہ بھی دیکھا ہے کہ مرجھائی ہوئی ٹہنی پر
پھول لگتے ہیں تو لگتے ہی چلے جاتے ہیں

ہم جو تاریک جزیروں میں رہے ہم نفسو
جال بن جائے گی بڑھتے ہوئے سایوں کی لکیر
ذہن کھینچے گا وہ سنگین فصیلیں جن پر
روشنی آئے تو سر پھوڑ کے واپس ہو جائے
چاند اُبھرے بھی تو گہنایا ہوا سا اُبھرے

اپنی ہی ذات میں تعمیر نہ کیجے یہ حصار
آپ ہی گھر پہ بٹھائیں نہ خزاں کا پہرا
کھڑکیاں کھول کے رکھیں کہ کوئی موجِ صبا
کیا خبر بھولی بھٹکتی اسی در سے گزرے



فضا ابن فیضی

پریم نگر سے آنے والو! شہرِ غزالاں دیکھو تو
عارض عارض آنکھیں سینکو، گیسو گیسو گھومو تو

یہ دنیا ہے یا پھولوں کی سیج پہ بکھرے کانٹے ہیں
تن کا مول چکانے والو! من کے گھاؤ بھی دیکھو تو

ہم نے بھی دیکھے ہیں یارو! باتوں کے انداز بہت
تم ہو کسوٹی لیکن پہلے اپنا سونا پرکھو تو

کچھ تو کھلے یہ دنیا آخر کن اسرار میں لپٹی ہے
شوخ غزالو! بند ذرا تم اپنی قبا کے کھولو تو

دھوپ کڑی ہے ڈرتا ہوں کمھلا جاؤ گے دل والو!
آؤ ذرا دم لے لیں، کوئی سایۂ گیسو ڈھونڈھو تو

ہولے ہولے آج نسیمِ ناز کے جھونکے چلتے ہیں
اپنے دل کا دریچہ کھولے اس کی گلی سے گزرو تو

پھر میری خود سوزی پر تنقید و ملامت کر لینا
تم بھی اپنے دامن میں یہ جلتی آگ سمیٹو تو

موجِ نفس خنجر کی طرح سینے سے گزرنے لگتی ہے
تم بھی کسی کے ہو کر دیکھو، تم بھی کسی کو چاہو تو

غم کی دہکی آگ کو ٹھنڈی چاندنی بننا آتا ہے
میرے آنسو کی موجوں میں اپنا تبسم گھولو تو

آرزوؤں کے خاکے میں بھرنے ہیں ابھی کچھ رنگ نئے
عہدِ طرب کے بیتے لمحو! پیچھے مڑ کر دیکھو تو

شیوۂ محبوبی کا تقاضا اور بھی ہے کچھ اس کے سوا
عشق کا موسم بدلا، اب آئینہ کدوں سے نکلو تو

ماضی نے ڈھائے ہیں ستم کیا اس کا بھی احساس ہے کچھ
چہرۂ مستقبل کی حنا آراشو! آئینہ بھی دیکھو تو

مجھ کو خبر ہے فن کا دعویٰ رکھتے ہو تم بھی لیکن
اتنی سلیس اور اتنی سجیلی کوئی غزل کہہ لاؤ تو

میرے دشتِ سخن کے جواں آہو و!

فضا ابن فیضی

میرے دشتِ سخن کے جواں آہو و!
تم نے سیکھا کہاں سے یہ اندازِ رَم
گل کترتی ہے شوخیِ نقشِ قدم
تم شگفتہ خرام و سبک گام ہو
جیسے موجِ صبا
جیسے خوشبو کا رم
جیسے رقصِ بہارِ گل و یاسمن
سرخ بوتل سے جیسے ابلتا نشہ، جیسے مرمر سے جسموں کی انگڑائیاں
جیسے گیتوں کا ہنستا ہوا زیر و بم، جیسے مضراب کا ارتعاشِ حسیں، سینۂ ساز کی جنبشِ مرمریں
ذہنِ شاعر میں جیسے خیالوں کی رو، دستِ شاعر میں لہرائے جیسے قلم
جیسے بن کر پسینہ جبینِ سبو سے ٹپکنے کو ہو تند صہبا کا نم
میرے دشتِ سخن کے جواں آہو و!
تم شگفتہ خرام و سبک گام ہو

اپنے ہمراہ لے کر مجھے کن خیال آفریں مرحلوں سے گزرتے ہو تم
آنچ ہیں کن لپکتے ہوئے عارضوں کن سلگتے لبوں کی نکھرتے ہو تم
تم ہو شامِ اودھ کی خراماں شفق
تم ہو صبحِ بنارس کی لرزاں کرن، سحرِ بنگالہ کا بولتا بانکپن
گیسوؤں کا فسوں، کاجلوں کی پھبن
جلوہ گاہِ لب و چشم و رخسار سے
خال و ابرو و گیسو کے تاتار سے
سینۂ صندلیں کے سمن زار سے
تم نے آواز دی ہے مجھے بارہا
بیکراں پیار سے
جب تمہارے نفس کی جواں نکہتیں
ہو گئیں پر فشاں
رہ گزر رہ گزر، گلستاں گلستاں
پھول، پیمانۂ رنگ و بو بن گئے
نقشِ پا، نافۂ مشکبو بن گئے
ہیں تمہارے قدم کی حسیں جنبشیں
نازنیں جنبشیں
کہکشاں آفریں، کائنات آشنا
دل کش و جاں طراز و حیات آشنا
اس گریزاں نگاہی کے باوصف بھی

ہے تمھاری نظر التفات آشنا
تم جہاں رُک گئے منزلیں بن گئیں، فاصلے سو گئے، قربتیں جاگ اُٹھیں
خلوتیں جھُوم کر محفلیں بن گئیں
تم ہو غالب کی تخئیل کا بانکپن، اس کے اسلوب کی شوخی و طرفگی
میر کا سوز و درد و غم و آرزو
مصحفی کا مذاقِ جمال آشنا
تم ہو اقبال کے فلسفے کا عمق، اس کے لہجے کی آفاقیت کا نشاں
طبعِ حسرت کی رندانہ پاکیزگی، اس کے شعروں کی پُرکیف وارفتگی
جس نے دیکھی تمھاری لطافت وشی، اس نے سرتا قدم، تم کو مومن کی نازک خیالی کہا
فکرِ اصغر کے فانوسِ زرّیں میں تم ہو فروزاں شرارِ غزل کی طرح
تم جگر کے تغزل کا آئینہ ہو اک شگفتہ کنول کی طرح
تم ہو سیماب کے فن کی شائستگی، فکر کی ٹھوس قدروں کا معیار ہو
جوش کا تم خطیبانہ آہنگ ہو، اوس کی آنچ ہو، شعلہ سنگ ہو
تم یگانہ کے پندارِ فن کی جھلک، اس کے مجروح جذبوں کی جھنکار ہو
تم ہو نذرل کی آتش نوائی کی دُھن، اس کے باغی تخیل کی شوریدگی
تم ہو ٹیگور کے فن کی گمبھیرتا، اس کی موسیقیت اس کی جادوگری
تم ملے تو فراق ادا سنج کو روپ رس کی چھلکتی گلابی ملی
جام کو شعلۂ ماہتابی ملا، نرگسِ ناز کو نیم خوابی ملی
تم جسے فیض "دستِ صبا" نذر دے
جس کو ساحر کی "پرچھائیاں" بوسہ دے

لکھنؤ کا مجاز شگفتہ نفس

جس کو صہبا سے لبریز مینا کہے، اپنی معصوم و نوخیز نورا کہے
جس کو کہہ کر حجاب اپنے افکار پر داغ نے ڈال رکھا تھا وہ شے ہو تم
گنگناتا نشہ، بولتی مے ہو تم
تم ہو اختر کی ریحانہ، سلمیٰ ہو تم
میں ہوں وامق اگر، میری عذرا ہو تم
میرے دشتِ سخن کے جواں آہو و!
ساتھ لے کر مجھے تم کہاں آ گئے، کس طرف آ گئے؟
داد و تحسیں کے تیروں کی یہ بارشیں
ہر طرف "واہ" کے دام پھیلے ہوئے، حلقے زنجیر کے تنگ ہوتے ہوئے
اور اس "محفلِ آگہی صید" میں
میں ہوں تنہا کھڑا
دوش پر فکر و فن کا جنازہ لیے
ذہن ہے ناتواں، فکر ہے پا بہ گل
کتنے نشتر رگِ جاں کے ہیں متّصل
میرے دشتِ سخن کے جواں آہو و!
تم کو لے کر یہاں سے میں جاؤں کہاں! —



فضا ابن فیضی

مے برسے، ساغر چھلکے، جس جانب چشمِ یار پھرے
ہم تو پیاسے رہ کر بھی اُس محفل سے سرشار پھرے

بادِ صبا کے چنچل جھونکو! تم کو چمن میں رہنا تھا
جنگل جنگل کیوں آوارہ، پھولوں کی مہکار پھرے

ہم سے پوچھو! عشق میں جینا کتنا مہنگا سودا ہے
اک اک سانس میں لے کر اپنے صدیوں کا آزار پھرے

لوگو! اس نگری کا ہر دستور انوکھا ہے
نفرت تو بازار سجائے، تنہا تنہا پیار پھرے

تیرے بعد نہ اُترا پھر معیارِ نظر پر کوئی بھی
محفل محفل لیکر ہم سودائے لب و رخسار پھرے

سب کی پیاس بجھائی لیکن ہونٹ اپنے جلتے ہی رہے
مے سے بھرے ساغر کی طرح اک محفل میں سو بار پھرے

اچھے اچھے آنکھ بچا کر پاس سے گزرے، ناحق ہم
بن کر سر سے تابہ قدم، سچائی کا معیار پھرے

جس کو سب کہتے ہیں انساں وہ تو ہم کو مل نہ سکا
کوچہ کوچہ گھوم کے دیکھا، شہر پھرے، بازار پھرے

منصور و عیسیٰ کی کوئی تخصیص نہیں، اس دور میں اب
اپنے ہی کاندھوں پہ اُٹھائے لوگ صلیب و دار پھرے

اہلِ چمن فرطِ غیرت سے تم کو وہیں مر جانا تھا
پھول کی نازک گردن پر تلوار کی پیاسی دھار پھرے

پھول میں ڈھل جاتے بجھتے شعلے جن کیلئے، وہ لوگ کہاں
ہم وہ پیمبر جن کے پیچھے آگ لیے، گلزار پھرے

ہم یوں تیرے پیار کی خوشبو دل میں بسائے پھرتے ہیں
جیسے دشت میں تنہا کوئی آہوئے نافہ دار پھرے

علم و فن سے کورے ہیں جو اُن پر ہُن برسائیں لوگ
اور دامن میں مٹی بھر کر سونے کا فنکار پھرے

امر کہانی

جمیل ملک

میں کل تک تمہارے لئے اجنبی تھا
تمہارے خیالوں کی معصوم جنت میں کیا کچھ نہ ہوگا ؟
مگر میں کہاں تھا — !
مرے دل کے آذر نے بھی
کتنے ہی بُت تراشے تھے لیکن
سبھی بے زباں تھے، سبھی سنگدل تھے
وہ میرے تھے، پھر بھی وہ میرے کہاں تھے — !
کہ ان کے جواں سال چہروں پہ وہ اجنبیت نہیں تھی
جو میری نگاہوں میں حیرت کا جادو جگا کر
مجھے اُس مسرت، مجھے اُس محبت کا خوگر بناتی
ازل سے ابد تک ہے جس کی رسائی
جو آخر تمہارے لبوں سے اُتر کر
مرے دل کی دھڑکن میں یوں آسمائی
کہ جیسے یہی ایک زندہ حقیقت ہے
باقی ہر ایک چیز یا خواب تھی، یا فسانہ

میں کل تک تمہارے لئے اجنبی تھا
تمہارے خیالوں کی معصوم جنت میں کیا کچھ نہ ہوگا ؟
مگر میں کہاں تھا — !
اور اب ایک لمحہ
انوکھی زباں میں چہک کر
تمہارے خیالوں پہ چھانے لگا ہے
اور اب ایک ساعت
مجھے میری نظمیں سُنا کر
تمہیں مجھ سے چھننے لیے جا رہی ہے

ہماری محبت امر ہو گئی ہے



شاذ تمکنت

پاسِ آداب سے یا حسنِ مروّت سے ملے
وہ کہاں ملتے ہیں وہ تو مری قسمت سے ملے

شادمانی سے رہ و رسم ہی کیا تھی پھر بھی
ہم ملے بھی تو ترے غم کی رعایت سے ملے

خبرِ شورشِ جاں اوّل و آخر ہے زیاں
گھر کی وحشت سے ہو یا دشت کی وحشت سے ملے

ہم ملے حادثۂ فصلِ بہاراں سے مگر
پاسبانِ درِ زنداں کی اجازت سے ملے

جی میں ہے حسرتِ اظہارِ بیاں کیا کیا کچھ
اے حیاتِ گزراں تو کہیں فرصت سے ملے

شہر میں اب نہ کوئی دوست نہ دشمن اپنا
ہائے وہ لوگ کہ جن سے تری صورت سے ملے

چند لمحوں کی ملاقات کا کیا نام ہے شاذ
یعنی ہم روز ملے روز ہی حسرت سے ملے

بارِ وفا

شاذ تمکنت

پھر وہی آنکھیں وہی میری طرف دار آنکھیں
مسکراتی ہوئی، دلدار، ملنسار آنکھیں،
نارسیدہ یہ تمنّائیں یہ ارمان ترے
صاف آمادۂ شب خوں یہ پلک بان ترے،
یہ کھُلی زلفیں یہ شب زادیاں نکہت بردوش
اُف یہ دوشیزگیٔ بر یہ کنواری آغوش،
راہِ عصیاں سے اُبلتی ہوئی یہ جُوئے ثواب
معبدِ جسم یہ کندن کے کلس یہ محراب
سپر افگندہ نگاہوں میں مناجات لیے
ہمہ تن آرزوئے دید و ملاقات لیے
تو کہ ہے منتظرِ جرأتِ اظہارِ وفا

پھر وہی بارِ وفا پھر وہی تکرارِ وفا
دردِ سرشار ہوں لذّت کشِ آزار ہوں میں
صورتِ نقش ہوں میں صورتِ دیوار ہوں میں
کیا کہوں تجھ سے مری سانس رُکی جاتی ہے
تیرے پہلو میں کسی اور کی یاد آتی ہے



رفعت سلطان

بجا کہ مجھ پہ نہ وہ لطف کی نظر ہو گی
جو زندگی ہے تو ہر حال میں بسر ہو گی

یہ اضطرابِ سرِ شام کیا دلِ مضطر
یہ حال ہے تو بتا کس طرح سحر ہو گی

چمن سے میں چلا جاؤں گا لیکن اہلِ چمن
گلوں کی رُوح بھی میری ہی ہمسفر ہو گی

نہ کر خیال کوئی میری آہِ سوزاں کا
کہ میری آہ ترے حق میں بے ضرر ہو گی

اُنھیں نہیں نہ سہی لیکن اے نجومِ سحر
ہمارے حال کی تم کو تو کچھ خبر ہو گی

شعورِ عظمتِ انساں تجھے عطا ہو گا
تری نظر میں اگر عظمتِ بشر ہو گی

وفا کی آخری منزل نہیں ہے دُور، مگر
یہ سوچتا ہوں تجھے زحمتِ سفر ہو گی،

کبھی نقاب اُٹھا کر تو دیکھ حُسنِ ازل
ترے جمال پہ قرباں نظر نظر ہو گی

نہ ہٹ تعلقِ خاطر مگر مری جانب
تری نگاہ اُٹھی کچھ تو سوچ کر ہو گی

گذر ہی جائے گی آخر حیاتِ غم رفعتؔ
شبِ سیاہ بہر حال مختصر ہو گی



مظہر امام

کم ظرف ہیں، تنقید سے بیزار رہے ہیں
کہنے کو تو یہ لوگ قدح خوار رہے ہیں

زردار کے کوچے میں لیے پھرتے ہیں کشکول
جو انجمنِ نازمیں خود دار رہے ہیں

وہ بھی نہ ہوئے رسمِ محبت سے شناسا
جو لوگ کہ رسوائے سرِ بازار رہے ہیں

جتنی بھی ہو، قیمت تو لگا دیجے وفا کی
ہم جنسِ گراں ہی کے خریدار رہے ہیں

میری ہی طرح کرتے ہیں اک اک کی شکایت
جو اپنے ہی خوابوں کے پرستار رہے ہیں

اک آپ ہی سورج کی ضیا سے نہیں آگاہ
حالات سے ہم بھی تو خبردار رہے ہیں

نقّاد ہیں، مظہر کو سخن فہم نہ کہیے
یہ "حضرتِ غالب کے طرفدار" رہے ہیں



یوسف جمال انصاری

کان، وہ گونج کی جھنکار پہ دھرتا ہی نہیں
وادیِ خوف کا راہی کبھی ڈرتا ہی نہیں

وہی پتھر کا ہُوا جس نے پلٹ کر دیکھا
اپنی دھن میں جو چلا جائے، ٹھہرتا ہی نہیں

بوجھ بھاری ہو تو آزاد ہو شانہ بھی کبھی
جس کو جینا نہیں آتا ہے وہ مرتا ہی نہیں

نہ وہ محفل ہے نہ وہ ساتھ کے پینے والے
زہر کا گھونٹ کلیجے سے اُترتا ہی نہیں

جیسے تدبیر کے پیچھے کوئی تقدیر بھی ہو
کام بگڑا ہے کچھ ایسا کہ سنورتا ہی نہیں

دل سے اُٹھتا نہیں اب غم کے اندھیرے کا دباؤ
اور ترے دھیان کا سورج کہ اُبھرتا ہی نہیں

وقت گذرے تو گذرتا ہی چلا جاتا ہے
اور نہ گذرے تو کسی طرح گزرتا ہی نہیں

جی ہی بے کل ہو تو جینے کی ہوس ہو کس کو
پھر بھی دل ہے کہ تری یاد سے بھرتا ہی نہیں

عشق اک شعلۂ ہموار ہے دل سے دل تک
دب کے بجھتا ہی نہیں اُٹھ کے بکھرتا ہی نہیں



مضطر اکبر آبادی

وہ نظر بچا کے جو ناگہاں مرے سامنے سے گزر گئے
مرا درد اور نکھر گیا مرے زخم اور سنور گئے

جنھیں تیرے قرب کا چاؤ تھا جنھیں تیرے رُوپ کی پیاس تھی
وہ سبھی خیال بدل گئے وہ تمام خواب بکھر گئے

جو ہوئے نہ خلش وہ جگر ہی کیا جو بنے نہ نیش وہ شہر ہی کیا
انھیں زندگی کی خبر ہی کیا غمِ زندگی سے جو ڈر گئے

ہٹے تیری راہ سے جب بھی ہم بڑھے اور راہ کے پیچ و خم
ملے ہر قدم پہ ہزار غم ترے غم سے بچ کے جدھر گئے

یہی جوت لالہ و گل میں ہے یہی روشنی ہے سبو سبو
ہوا ایک دل جو لہو لہو تو ہزار جام نکھر گئے

یہی سیل کہہ کے بکھر گیا یہی لہر کہہ کے گزر گئی
جنھیں موج موج سے ضد رہی وہ سفینے پار اُتر گئے

کبھی مضطرؔ، اُن سے جو ہم ملے تو سمٹ کے رہ گئے فاصلے
بڑھے جدھر بھی دھیان کے قافلے وہیں چلتے چلتے ٹھہر گئے



کسریٰ منہاس

تڑپتے دل کا بیان نہ سمجھا، ان آنسوؤں کی زباں نہ سمجھا
مرے غمِ زندگی کی وسعت کو آج تک رازداں نہ سمجھا

یہی حقیقت میں زندگی ہے کہ مٹ کے بھی بے نشاں نہ سمجھا
فضا میں اُڑتے ہیں دل کے ذرّے مگر انھیں رائگاں نہ سمجھا

یہ جبہہ سائی کی لغزشیں ہیں کہ بے حسی پر گماں کروں میں
یہ راز میری جبیں نہ سمجھی کہ دل ترا آستاں نہ سمجھا

میں جان پر کھیل کر اے ناصح! ہوا ہوں راز آشنائے منزل
مری نظر کس مقام پر ہے مجھے تو سود و زیاں نہ سمجھا

خموش راتوں کی خلوتوں میں جو چپکے چپکے میں رو رہا ہوں
کوئی مرا ہمنوا نہ واقف کوئی مرا رازداں نہ سمجھا

جو پایا بلبل نے بھید یہ کچھ تو زندگی کو فغاں بنا کر
خموش پھولوں کا اور کوئی جہاں میں حسنِ بیاں نہ سمجھا

بھٹک گیا زندگی کی راہوں سے جو مسافر فریب کھا کر
سنی نہ بانگِ رحیل اُس نے وہ مقصدِ کارواں نہ سمجھا

جو ڈوب کر پھر کبھی نہ اُبھرا وہ جس نے کھو کر بھی کچھ نہ پایا
تباہ ہونے کی اس روش کو غضب ہے، کیوں اک جہاں نہ سمجھا

یہ بگڑی قسمت کی انتہا ہے کہ ہے جہاں میں وہ میرا ہمدم
سمجھ کے سوز و گدازِ دل کو جو حاصلِ دوستاں نہ سمجھا

جو کہہ چکا ہوں وہ التفاتِ نگۂ اوّل کی داستاں تھی
جہاں سے آغازِ ماجرا ہے وہاں سے کچھ رازداں نہ سمجھا

جو انقلابِ فریبِ ہستی کے راز سے آشنا ہے کسریٰ
نظر قفس پر ہے اس کی ہر دم وہ آشیاں، آشیاں نہ سمجھا



رضا زیدی

اک کیف سا طاری ہے اِک نشّہ سا چھایا ہے
چھٹتا ہی نہیں کوئی جب سے تجھے دیکھا ہے

کچھ روز کہیں راحت، کچھ روز کہیں کلفت
ہنگامۂ دنیا بھی کیا طُرفہ تماشا ہے

اک روشنی سی پھیلی گیسو جو ہٹے رُخ سے
یہ ماہِ درخشاں ہے یا آپ کا چہرا ہے

سوچا تھا بھُلا دیں گے ہم ان کو مگر اب بھی
جب یاد وہ آئے ہیں دل درد سے تڑپا ہے

یہ سیلِ غمِ جاں ہے کچھ ٹھیک نہیں اس کا
یہ نکلے تو دریا ہے تھم جائے تو صحرا ہے

بکھری ہے شفق سی یہ کیوں آپ کی آنکھوں میں
تحریرِ حیا ہے یا ھم سے کوئی پروا ہے

اس جسم کو کیا کہیئے، مرمر ہے کہ آئینہ
ہر عکس اُبھرتا ہے ہر رنگ جھلکتا ہے

جو بات کہی میں نے جو بات سُنی تم نے
اب سارے زمانے میں اس بات کا چرچا ہے



ضمیر اظہر

کامل ہے خود نمود سے تکمیل کیا کریں
کوئی بتائے عشق کی تشکیل کیا کریں

دل جانتا ہے، دل ہی سمجھتا ہے اس کے غم
لب سے بیان درد کی تفصیل کیا کریں

جس غم کدے میں دفن ہوں ارماں کے قافلے
روشن وہاں نجات کی قندیل کیا کریں

بس کہہ دیا کہ سوزِ مسلسل ہے زندگی
اس مختصر سی بات کی تاویل کیا کریں

مٹ کر نشانِ منزلِ اہلِ جنوں ہوئے
اب اس کے بعد شوق کی تکمیل کیا کریں

اظہر تمام عمر کٹی جس خیال میں
اب اُس خیالِ خام کی تذلیل کیا کریں

روشنی کے پانو

شاعر ندیم

جہاں جہاں ملے راہوں میں روشنی کے پانو
سمجھ لیا تری نظروں کی جگمگاہٹ ہے
جہاں جہاں ملی اوراقِ گل میں موجِ صبا
سمجھ لیا ترے قدموں کی نرم آہٹ ہے

تری نگاہ کی کرنیں جگا گئیں جادو
جہاں جہاں تھا اندھیرا وہیں سحر آئی
ملا جو دشتِ وفا میں مہیب سنّاٹا
تری خجستہ خرامی کی چاپ اُبھر آئی

تری نگاہ کا پرتو ترے قدم کے نقوش
کبھی بہا ہوا سونا کبھی جما سیماب
ترا قدم بھی ہے روشن تری نظر بھی چراغ
بس اور چاہتا کیا ہے مرا دلِ بیتاب
ملیں جو راہوں میں گلکار روشنی کے پانو



افضل پرویز

اس بزم میں جو بات بھی بیہودہ ہوئی ہے
خلقت اُسے حق جان کے آسودہ ہوئی ہے

اخلاص و محبّت ہو کہ ایثار و مروّت
ہر رسم ترے عہد میں فرسودہ ہوئی ہے

اُس لغزشِ مستی کو بھی ساقی نے نہ بخشا
رندوں سے جو باحالتِ موجودہ ہوئی ہے

پسماندوں سے تاوان طلب کرتا ہے قاتل
تیغ اُس کی مرے خوں سے جو آلودہ ہوئی ہے

پوجا کی گپھاؤں سے نکل پائے نہ انساں
رشیوں میں عجب سازشِ محمودہ ہوئی ہے

پرویز میں پیغامبرِ موسمِ گُل ہوں
غنچے کی چٹک آیۂ فرمودہ ہوئی ہے



اختر لکھنوی

ہشیار کر رہا ہے گجر جاگتے رہو
اے صاحبانِ فکر و نظر جاگتے رہو

دشتِ شبِ سیاہ میں سنتے ہیں شب پرست
روکیں گے کاروانِ سحر جاگتے رہو

ظلمت کہیں نہ کر دے اُجالے کو داغدار
لے کر چراغ دیدۂ تر جاگتے رہو

کیا جانئے کہ کرنے لگیں شعلے رقص کب
ہر ذرّہ بن چکا ہے شرر جاگتے رہو

سوئے نہیں کہ ڈوب گئی نبضِ کائنات
بوجھل ہو لاکھ آنکھ مگر جاگتے رہو

خوابیدہ اپنے چاہنے والوں کو دیکھ کر
ممکن ہے لوٹ جائے سحر جاگتے رہو

شب خوں کی فکر میں ہیں ثنا خوانِ تیرگی
اختر عزیز جاں ہے اگر جاگتے رہو



اختر ہوشیار پوری

جب تک کسی منزل کا تصور ہو نظر میں
دیکھا ہے یہی قافلے رہتے ہیں سفر میں

میں کیا ہوئے اشجارِ قد آور بھی نگوں سر
وہ آندھیاں آئی ہیں مری راہگزر میں

طاقوں میں اجنتا کے سجائے ہوئے بُت ہیں
تم آ کے تو دیکھو کبھی یادوں کے نگر میں

دیواروں کے ملبے میں ہیں پیمانوں کے ٹکڑے
کیا کیا نہ دفینے ہیں اس اُجڑے ہوئے گھر میں

یوں آئی سحر ماتھے پہ سورج کو سجائے
جیسے کہ کوئی شیشہ کفِ آئنہ گر میں

یہ باب بھی دلچسپ ہے تاریخِ چمن کا
انداز شراروں کے ہیں اب کے گلِ تر میں

جو پیڑ بھی رستہ میں تھا بے برگ و ثمر تھا
اِس زخمِ نظر سے بھی کھلے پھول نظر میں

اے مہرِ جہانتاب یہ عقدہ نہیں کھلتا
کیوں لوگ بچھڑ جاتے ہیں ہنگامِ سحر میں

اب نقلِ مکانی ہی میں عافیتِ جاں ہے
جلتی ہوئی بنیاد کا اعلان ہے گھر میں

اے گردشِ ایام ادھر سے بھی گزر ہو
اک شہرِ وفا ہم نے بسایا ہے کھنڈر میں

اوراق پریشاں ہوئے چاہت کے صحیفے
اب اپنا نشاں ڈھونڈتے ہیں تیری خبر میں

دکانوں پہ فن پارے بھی ہیں پھول بھی اخترؔ
اب فرق ہی کیا جنسِ وفا نقدِ ہنر میں



سُہمت یں کاش شوق

کسی کی پرسشِ پنہاں کا ذکر چھیڑ دیا
چراغِ محفلِ امکاں کا ذکر چھیڑ دیا

جنوں حیات کو ہنسنا سکھا رہا تھا ابھی
خِرَد نے کیوں غمِ دوراں کا ذکر چھیڑ دیا

تصوّرات کی دنیا میں برہمی سی ہے
یہ کس کی زلفِ پریشاں کا ذکر چھیڑ دیا

رہِ حیات کی تاریکیوں سے گھبرا کر
ترے جمالِ فروزاں کا ذکر چھیڑ دیا

شکستِ دل کا فسانہ بھی تھا جمالِ طلب
ستارۂ سرِ مژگاں کا ذکر چھیڑ دیا

جنابِ شیخ کو دیکھا تو بادہ خواروں نے
بڑے خلوص سے یزداں کا ذکر چھیڑ دیا

سُن کے گوری سکھی کی بتیاں آج بہت شرمائی رے!

محبوب اللہ مجیب

ساجن ہم سے چھیڑ کرت ہیں، دیکھ ری ہولی آئی رے
پاس بلا کر کیوں گھورت ہیں، جان گئے چتنورائی رے
دیکھ ری ہولی آئی رے!

چندا جیسا روپ جو دیکھا، بھولے سب ٹھکورائی رے
چنچل منوا پوچھت جائے، کاہے سُدھ بسورائی رے
دیکھ ری ہولی آئی رے!

رنگ اُڑا دے اور مسکا دے، کر لے سجنوا کھیل
ان نینوں کی بان ہیں شاید، باجے ہوشہنائی رے
دیکھ ری ہولی آئی رے!

پی کر گوری بہکت جائے، کیسی آس نراس
پاس پپیہا پی پی بولے، سکھ کی بیلا آئی رے
دیکھ ری ہولی آئی رے!

رُوپ ہے جیسے اگنی بینا، جو چھو دے جل جائے
سُن کے گوری سکھی کی بتیاں، آج بہت شرمائی رے
دیکھ ری ہولی آئی رے

غمِ جاناں

آتش لدھیانوی

میں جانتا ہوں اک ایسی جواں حسینہ کو
ادا سیوں میں ہے کھوئی ہوئی سی جو دن رات
ہر اک خوشی سے زمانے کی اس کو نفرت ہے
نظر میں اس کی ہے دن کا سماں بھی کالی رات
ہر ایک لمحہ اُسے موت کی تمنّا ہے
نہیں ذرا بھی سروکار زندگی کے سات
خزاں کا عہد کہ رنگِ بہار کی رُت ہو
ہر انقلاب سے ہے بے نیاز اُس کی ذات
گلہ ہے اُس کو زمانے کی کم نگاہی سے
کہ پا سکا نہ کبھی کوئی اُس کے غم کی بات
کہیں سے آیا نہ غمخوار کوئی ایسا کبھی
کہ پھیر کے جو محبت سے اُس کے بالوں میں ہات
یہ پوچھتا اُسے تُو اس قدر اداس ہے کیوں
سکونِ قلب و نظر اے مری بہارِ حیات

یہ شب کا پچھلا پہر، یہ مہیب خاموشی
یہ میرے کمرے کی چیزوں کے چیختے چہرے
یہ غور سے مجھے تکتے ہوئے سے چاروں طرف
یہ روشنی کا کہرا، یہ جھانکتے سائے

سڑک پہ کتّوں کے رونے کی گاہ گاہ صدا
ہوا کے سست جھکولوں سے کانپتے پرڈے
وہ دور جلتے چراغوں کی گھورتی آنکھیں
میں دیکھتا ہوں جنھیں کھڑکیوں کے شیشوں سے
یہ میرے کمرے سے باہر تمام عالم پر
سیاہ دیو اندھیروں کے مسکراتے ہوئے
میں اس ڈراؤنے ماحول کی فضاؤں میں
یہ جی میں سوچ رہا ہوں بڑے عجب دکھ سے

نہ جانے رہتے ہیں کس غم میں صرفِ آہِ نہاں
وہ لب کہ جن سے تبسّم کے پھول کھلتے تھے
نہ جانے چور ہے کس درد کی تھکاوٹ سے
وہ جسم جس سے فضاؤں کو رنگ ملتے تھے
نمی سی رہتی ہے کیوں اُن کنول سی آنکھوں میں
کہ جن سے تشنہ اُمیدوں کو جام ملتے تھے
بجھے سے رہتے ہیں کیوں وہ گلاب سے رخسار
دمک سے جن کی نگاہوں کے چاک سلتے تھے
پریشاں حال سی رہتی ہے کیوں وہ زلفِ دراز
مہک سے جس کی شگوفے دلوں کے کھلتے تھے

میں کاش اُس کی اُداسی کو یہ بتا سکتا
کہ عہدِ ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا



کیف احمد صدیقی

گلوں کو موت کی نیند آگئی ہے — مگر خوشبو ابھی تک جاگتی ہے

ترے غمگیں لبوں پر یوں ہنسی ہے — کہ جیسے دن میں بکھری چاندنی ہے

متاعِ غم بھی شاید کھو گئی ہے — اُداسی سر برہنہ پھر رہی ہے

مرا دل موجِ طوفانِ تمنّا — محبّت ایک سنجیدہ ندی ہے

ہر اک رُخ پر ہے یوں گردِ تفکّر — کہ جیسے ساری دنیا فلسفی ہے

مری آواز پر جب تم نہ آئے — تو خود آواز نے آواز دی ہے

کسی کی یاد بھی ہے بارِ خاطر — محبّت کتنی نازک ہو گئی ہے

میں وہ مجبورِ غم ہوں جس نے اکثر — ہنسی بھی آنسوؤں کے ساتھ پی ہے

نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا زمانہ — محبت موت ہے یا زندگی ہے

بظاہر شبنم آلودہ ہیں کلیاں — مگر رگ رگ میں اک آتش بھری ہے

شمیمِ گل کی رسوائی کا باعث — نسیمِ صبح کی آوارگی ہے

تری فرقت میں اے جانِ تغزّل — مری ہر اک غزل کتنی دُکھی ہے

مرا ہر شعر تابندہ ہے جس سے — وہ میرے تجربوں کی چاندنی ہے

جسے اے کیفؔ کچھ ہی لوگ سمجھے
وہی تو شعرِ روحِ شاعری ہے



شاد عارفی

لا اے ساقی تیری جے ہو ۔۔۔ کوئی بھی پینے کی شے ہو
اردی ہو بہمن ہو دَے ہو ۔۔۔ سب موسم اچھے ہیں، مے ہو
گلشن ہیں صیّاد کے ہاتھوں ۔۔۔ جو انجام بھی ہونا ہے، ہو

ق

ہم آخر ہمت کیوں ہاریں ۔۔۔ ہونا کامی پے در پے ہو
لاکھوں ہیں ہم سب بیچارے ۔۔۔ اے شہزادو! تم سب کے ہو
ذہنی طور پر اُترے شحنو ۔۔۔ تم اب تک بھی جَم ہو کے ہو
میں دنیا پر طنز کروں گا ۔۔۔ دنیا میرے کیوں درپے ہو
ہم اس کے پابند نہیں ہیں ۔۔۔ ساغر ہو، مینا ہو، مے ہو

شادؔ مجھے یہ دُھن رہتی ہے
اپنا نغمہ، اپنی لے ہو

میٹھا کڑوا جھوٹ

علی عبّاس حسینی

مجید جب ٹرین سے اُترا تو اُس وقت صُبح کے سات بج چکے تھے، لیکن سُورج روپوش تھا۔ اُس نے اپنے درخشاں چہرے پر کُہرے کی نقاب ڈال رکھی تھی۔ یخ پڑ رہی تھی۔ برف میں جھلی ہُوئی ہوا چل رہی تھی۔ چہار باغ جیسے بڑے اسٹیشن پر، جہاں ہر ٹرین کی آمد و روانگی کے وقت ایک میلہ سا لگ جاتا ہے، مجید نے ایک عجیب طرح کا سنّاٹا پایا۔ اسٹیشن کیا تھا، جیسے لڑکی کی رُخصتی کے بعد برات اُتارنے والا گھر۔ بس پانچ سات قُلّی دکھائی دیے۔ وُہ بھی مُنہ لپیٹے ہوئے، پالا مارے ہوئے پودوں کی طرح سکڑے سکڑائے۔ مجید کی اس سفر پر روانگی کے وقت بھی موسم کی یہ کیفیت لکھنؤ پر طاری تھی۔ پھر بھی اس وقت عام طور پر ٹھنڈک کا یہ اثر نہ تھا۔ غالباً اس لیے کہ شروع شروع کا معاملہ تھا، لوگوں میں قوّتِ برداشت زیادہ تھی۔ اب تو شاید ہر ایک کا خُون جمنے لگا تھا۔

رات کو ٹرین پر مجید نے اس سردی کو بُری طرح محسوس کیا تھا۔ اس نے برتھ پر اپنا خاصا موٹا روئی دار گدّا بچھایا تھا، دو دو کمبل اوڑھے تھے، پھر ان پر اپنا اوور کوٹ بھی ڈال لیا تھا۔ سوتے وقت نہ اُونی قمیص اُتاری تھی اور نہ اپنا سوئٹر۔ پھر بھی ٹھنڈک کی وجہ سے وُہ گٹھڑی ہی بنا رہا ـــــــ اس کا بار بار جی چاہ رہا تھا کہ وہ حمیدہ کی بہیتی چادر اٹیچی سے نکال کر جسم میں لپیٹ لے، مگر اُس نے سردی کھائی، آرام کی نیند نہ سویا، مگر اُس نے حمیدہ کی شال نہ نکالی، ڈر تھا کہ اوڑھنے لپٹنے میں کہیں مَل دل نہ جائے ـــــــ

بہت ہی عزیز تھی یہ چادر حمیدہ کو۔ اِسی اپریل کے مشاعرے میں مجید سری نگر بلایا گیا تھا۔ وہیں سے یہ شال، شہر کی ساری دُوکانیں چھان کر وہ حمیدہ کے لیے لایا تھا ـــــــ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کی سب سے بڑی تمنّا ہے کہ اُس کے پاس ایک ایسی شال ہو جو ہم چشموں میں کسی کے پاس نہ نکلے۔ جوئندہ یابندہ۔ مجید کو ایک ایسی ہی چادر دستیاب بھی ہو گئی تھی۔ چوڑے حاشیوں پر اتنا عُمدہ، نازک اور باریک کام کہ صنّاع کا ہاتھ چوم لینے کو جی چاہے۔ بیچ والے حِصّہ پر کشمیر کے سارے پھُول کِھلے ہوئے۔ گلاب، لالہ، بنفشہ و نرگس، سیوتی اور جوہی، کنوّل اور کوزہ ـــــــ اوڑھنے والی کی پُشت و شانہ پر گویا بہار آئی ہوئی چمن کا منظر دکھائیں گے۔

کشمیر سے واپسی میں پٹھان کوٹ سے لکھنؤ تک سلیپنگ برتھ پر لیٹے لیٹے مجید نے نہ جانے کِتنے حسین خواب جاگتے ہی میں دیکھے تھے۔ کِتنی خوش ہو گی حمیدہ! اس کے کُندنی گالوں میں کِس طرح خُون چھلک آئے گا۔ شانوں پر چادر پڑتے ہی وہ کیونکر شاخِ گُل کی طرح لچکے گی، اس کے گُلاب کی پنکھڑی جیسے لب کِس طرح پھڑکیں گے، اس کے آب دار دُرِ دنداں کیسے جھلکیں گے۔ وہ کِس طرح اٹھلا اٹھلا کر چلے گی۔ اس کی کمر اور کولھوں میں کیسے کیسے دِل ربا بل پڑیں گے اور وہ اس نادر تحفہ پر شوہر کا آنکھوں ہی آنکھوں میں کِس پیارے انداز سے شکریہ ادا کرے گی اور شکریہ ادا کرتے کرتے کچھ سوچ کر خُود بخود شرما بھی جائے گی۔

اور جب وہ لکھنؤ پہنچا تھا اور اُس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سُوٹ کیس سے نکال کر وہ چادر حمیدہ کے کندھوں پر ڈال دی تھی،

تو اس کے یہ سارے خواب سچ نکلے تھے ——— وہ بوکھلائی بھی تھی، وہ مُسکرائی بھی تھی، وہ کھِل کھلائی بھی تھی، وہ چہک بھی اُٹھی تھی اور اُس نے مجید کو پیار اور محبت کے انعامات سے مالا مال بھی کر دیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس چادر نے حمیدہ کی نظر میں ایک نوبہ نو صنم کی حیثیت بھی اختیار کر لی تھی۔ اُس نے اسے سینت کر شیشے کی الماری میں رکھا اور اس میں ایک مضبوط قفل ڈال دیا ——— یہ الماری کنجوس کے دل کی طرح ہمیشہ بند رہتی۔ صرف اس کے شیشے دن میں دو دو دفعہ باہر سے جھاڑ دیے جاتے تھے۔ یہ خاص اوقات تھے گویا اس کی زیارت کے لیے ——— وہ مُغل بادشاہوں کی طرح جھروکے میں بیٹھ کر " درشن " دیتی۔ اور حمیدہ غلام رعایا پرجا کی طرح پرنام کر لینا ہی اپنا سہاگ سمجھتی۔ ہمسائیاں، اعزا، عورتیں وہی جن کی ایسی نادر چیز کی محرومیِ ملکیت میں حمیدہ کی ساری عظمت اور شان تھی، انھیں بھی اس کی یونہی شیشے میں بند جھلک دکھائی جاتی ——— کیا مجال کہ کوئی اسے ہاتھ لگا سکے ——— کبھی کبھی مجید نے ٹوک بھی دیا تھا کہ " شال چادر اوڑھنے کی چیز ہے، پرستش کی نہیں! اوڑھتی نہیں ہو تو ہر مہینے میں ایک آدھ بار اسے دُھوپ ہی دکھا دو ——— اُونی کپڑا ہے کہیں کیڑے نہ لگ جائیں۔"

حمیدہ چڑ کر کہتی: " ارے کیسے بدشگونی کے الفاظ اپنے مُنہ سے نکال رہے ہو! — میں روز اسے دیکھتی بھالتی رہتی ہوں۔ نگوڑے کیڑوں کی کیا مجال جو میری شال کے آس پاس بھی پھٹک سکیں! — "

مجید کہتا: " اچھا تو یہی کرو کہ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اسے باہر نکال کر اپنے پہلو میں رکھ لیا کرو۔ معلوم ہو گا بہار سے لہلہاتے باغ میں بیٹھی ہو۔"

وہ کہتی: " آپ دیکھتے نہیں، کیسی موئی آندھیاں چل رہی ہیں۔ گرد چادر کے پھولوں میں گھُس کر اسے میلا کر دے گی! بس اب اسے تو میں اسی دن نکالوں گی جس دن جاڑوں میں اسے اوڑھ کر اپنے مُنّو کی برات لے کر چاند سی بہو گھر لانے جاؤں گی!" اور وہ تین برس کے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے مُنّو کو گود میں اُٹھا کر اتنا چُومتی اتنا چومتی کہ وہ بسورنے لگتا اور مجید کا جی چاہنے لگتا کہ وہ دونوں غنچہ دہنوں کو آغوش میں سمیٹ کر ایک ساتھ کلیجہ میں بھر لے ــ حمیدہ کی اس چادر پر فریفتگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مجید اس سے کچھ کچھ جلنے سا لگا تھا۔ اس کو یہ شبہ سا ہونے لگا تھا کہ حمیدہ کی محبت میں بیٹا ہی نہیں شریک بن گیا ہے بلکہ یہ شال بھی اس میں حصہ لگانے لگی ہے وہ شال کیا لایا، اس نے اپنے لیے ایک رقیب اپنے ہاتھوں بہم پہنچایا۔ غرض شال کی پوجا جاری رہی، گرمیاں بھی گزریں، برسات بھی گزری، جاڑے کا موسم بھی آیا، مگر شال نے اپنی جگہ نہ چھوڑی۔

لیکن مجید کے تعجب کی انتہا نہ رہی دو دن پہلے ——— اس روز جب وہ اس کڑاکے کی سردی میں اپنے مختصر سفر پر روانہ ہونے لگا اور ہولڈال میں بستر رکھا جانے لگا تو حمیدہ کو یاد آیا کہ اب تک مجید کا نیا لحاف تیار نہ ہو سکا تھا۔ منّو اپنے پالنے میں سلایا جاتا تھا اور مجید شریک زندگی ہی کے لحاف میں شرکت کر کے رُوئی اور دُوئی دونوں نعمتوں سے فیضیاب رہتا تھا۔ مگر اس سرد سفر کے لیے نہ رُوئی تھی نہ دوئی ——— حمیدہ تھوڑی دیر کھڑی گھبرائی گھبرائی اس مشکل کا حل سوچتی رہی، پھر جھپٹ کر الماری میں سے اپنی چہیتی شال چادر نکال لائی ——— مجید نے روکا — " دو دو کمبل کافی ہیں، میں تمھاری چادر نہ لے جاؤں گا، سفر میں مَل دَل جائے گی!"

مگر حمیدہ نہ مانی، چادر اٹیچی میں رکھ کر بولی: " مَل دَل جائے موئی! اب تمھاری جان سے زیادہ تھوڑے پیاری ہے!"

مجید نے چھیڑنے کے لیے کہا "اور اگر راستے میں کسی نے چرا لیا تو؟"

وہ بڑے گھمنڈ سے بولی "ارے تم سلامت رہو، ایسی بیسیوں آجائیں گی!"

مجید کو بیوی کی اس انتہا محبت کا اندازہ نہ تھا۔ حمیدہ اپنی محبوب ترین چیز میاں پر سے نچھاور کرنے کو تیار تھی۔ اس میں کسی طرح کے جذبۂ ایثار و قربانی کی جھلک نہ تھی۔ بلکہ بالکل پرخلوص محبت کا اظہار تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نظر میں شوہر کے آرام کے مقابلے میں کسی چیز کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

مجید کو اپنے دل میں ایک شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔ اسی خجالت کی وجہ سے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ چاہے مجھ پر جو کچھ گزر جائے حمیدہ کی یہ چادر نہ اوڑھوں گا اور اسے بعینہٖ ایسی ہی نئی واپس لا کر دوں گا۔ اس لیے رات میں جب وہ گٹھڑی بنا پڑا تھا اس نے چادر اٹیچی سے نہ نکالی ——

اس وقت جب گاڑی اسٹیشن کے قریب پہنچی تھی اور اس نے جلدی جلدی ہولڈال باندھا تھا اور گرم سوٹ پر موٹا اوور کوٹ پہنا اور گلے میں اونی مفلر لپیٹا تھا تو اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ گھر پر پہنچتے ہی بیوی کو اس کی شال چادر اوڑھا دوں گا اس لیے ہاتھوں کو دستانے سے چھپانے سے پہلے اس نے اٹیچی سے چادر نکال لی تھی اور گاڑی سے اسے اچھی طرح سنبھالتے اترا تھا جیسے وہ سچ مچ نذر دی جانے والی پھولوں کی چادر ہو۔ رکشے پر بھی بیٹھا تو اس کی تہیں کھول کر اسے ٹانگوں پر ڈالا نہیں بلکہ اسے گود میں اس طرح رکھا کہ کہیں سے شکن، دھبہ یا گرد نہ پڑے۔

رکشے والا جوان تھا۔ بھرے بھرے شانے، چوڑا سینہ، مضبوط کمر، موٹی موٹی پنڈلیاں، موٹی موٹی انگلیوں والے بڑے بڑے پاؤں۔ اس نے سر اور گردن میں ایک سوتی مفلر پگڑی کی طرح لپیٹ رکھا تھا —— وہ آدھی آستین کی خاکی قمیص پہ ایک پرانا سینڈ وکٹ سوتی سوئٹر پہنے تھا اور ٹانگوں میں ایک میلا خاکی نیکر۔ پنڈلیاں بھی کھلی تھیں اور پاؤں بھی ننگے تھے —— اپنے جسم کی ٹھنڈک دور کرنے کے لیے وہ رکشا تیز تیز چلا رہا تھا۔ رکشے کی تیز رفتاری نے ہوا پر صیقل رکھ دی تھی —— اس ہوا نے مجید کی گرم موزے میں لپٹی، گرم پتلونوں میں ڈھکی پنڈلیوں میں گھسنے اور آر پار نکل جانے کی کوشش شروع کر دی۔ مجید نے بڑی احتیاط سے حمیدہ کی شال کی ایک اور تہہ کھول کر اسے ٹخنوں تک لٹکایا —— اور جیب سے سگرٹ نکال کر اسے جلانا چاہا، ہوا کے جھونکے نے دیاسلائی کی کئی تیلیاں بجھا دیں۔ اس نے رکشے والے سے کہا۔ "ذرا رکو بھئی، میں سگرٹ جلا لوں!"

مجید نے سگریٹ پر کش لگاتے ہوئے رکشے والے پر نظر کی۔ اس کے دراوڑی چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے تھے۔ اس کی بغلیں بھیگ گئی تھیں اور وہ یخ زدہ ہوا کے جھونکوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ مجید نے سوچا، کتنی گرمی ہے خود انسان کے جسم میں۔ بس محنت مزدوری کی دیاسلائی دکھاؤ اور اندر کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ پھر نہ لحاف کی ضرورت نہ کسی شال کی!

اس نے پوچھا "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

وہ بولا "گونڈا جِلا (ضلع)"۔

مجید نے مسکرا کر پوچھا "مہریا ہے؟"

وُہ بولا: "اوہ نا ہوت اور بالک نہ ہوتن، شاب، تَ اِہ پالا ماں رکشا چلا ہُٹ" (وہ نہ ہوتی اور بچے نہ ہوتے صاحب تو اس سردی میں رکشا چلاتا)

مجید نے اور کُریدا: "یہیں شہر میں ہیں ؟"

وہ بولا: "ناہیں شاب، اپنا دیش ماں" (نہیں صاحب اپنے دیس میں)

مجید نے مُسکرا کر کہا: "جب ہی!"

رکشے والا اس "جب ہی" کے طنز کو کیا سمجھتا۔ مگر وہ گنگنانے لگا۔ "بَین لڑ جئی ہیں تو منوا ماں کھٹک ہوئی بے کری!"

مجید نے پُوچھا: "اچھا تو فلم دیکھنے کے لیے پیسے بچا لیتے ہو!"

وہ بولا: "ارے کب ہوں کب ہوں، سال چھ مہینا ماں نواب شاب۔" (ارے کبھی کبھی سال چھ مہینے میں نواب صاحب)
مجید جھنجلا اُٹھا۔ نہ جانے کیوں یہ سارے پردیسی لکھنؤ کے ہر سفید پوش کو نواب سمجھ بیٹھتے ہیں۔ وُہی محنت مزدوری سے عاری طبقہ۔ بیکاروں کی جماعت، "پدرم سُلطان بُود" کہہ کر اکڑنے والے اپاہج۔ مجید تو صُبح سے شام تک اپنے جوتا سازی کے کارخانے میں لگا رہتا، پچیس تیس کاریگروں کی نگرانی کرتا۔ دھوپ لُوں۔ سردی پانی میں دوکان دوکان پھر کر آرڈر حاصل کرتا، خون پسینہ ایک کرتا جب جا کر چار پیسے ہاتھ آتے ——— وہ کیا اس رکشے والے کی طرح مزدور نہیں؟ اور یہ کہتا ہے اُسے نواب صاحب!

وُہ یہی سوچ رہا تھا کہ دُور سے نم ہوا اپنے دوش پر ایک دلدوز کراہ کی آواز لائی۔ کراہنے والا کُچھ منمنا بھی رہا تھا۔ مگر صاف سُنائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر بھی آواز میں ایک انسانی دل کے لیے ناقابلِ برداشت درد تھا۔ مجید نے گھبرا کر رکشے والے سے پُوچھا: "ارے یہ کون کراہ رہا ہے بھائی؟"

اس نے رکشا آہستہ کر کے آستین سے مُنہ کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "ارے اِک گو پگلی ہو شاب! ہرم جادے اُہ کا بھی کھراب کیہن۔ اوہے ایک چھوٹا بالک کا چھاتی سے لگائے سڑک پر پڑل ہو۔ بس ہر وکھت چیکھت ہو۔ اِہ کا بچا لیو اری بلکوا کا کچھو اوڑھا دیو! ای سردی سے مرت ہو!" اور او کھُد ننگی ہو! (ارے صاحب ایک پگلی ہے۔ حرام زادوں نے اس کو بھی خراب کیا ہے ——— وُہی ایک چھوٹا سا بچہ سینے سے لگائے سڑک پر پڑی ہے۔ بس ہر وقت چیختی رہتی ہے "اس کو بچا لو! اس بچے کو کچھ اوڑھا دو! یہ سردی سے مر رہا ہے!" اور وہ خود ننگی ہے!)

مجید نے تعجب سے پُوچھا: "ارے تو اتنے بڑے شہر میں کسی اللہ کے بندے نے اُسے کوئی رضائی کمبل نہ اوڑھایا؟"

وہ بولا: "جہ کا پاس رجائی کملی ہوت ہے شاب، وہ کھُد اوڑھیہے کہ اُہ کا دی ہے!" (جس کے پاس رضائی کمل ہوگا صاحب وہ خود اوڑھے گا کہ اس کو دے گا)

رکشے والے نے بڑے زور سے کھنکار کر حلق صاف کیا اور دُور تھوکا۔ وہ رکشا اور بھی آہستہ کر کے بولا: "اجی نواب شاب! بڑا لوک موٹراں سیسہ چڑھائے پُوں پُوں کرت سَن سَن نکل جات ہن، اُہ کا ہے کا پگلی کی اور دیکھی ہن۔ اور آپن دو سو، اڑھائے سو کا کمل پگلی

پر ڈال دی ہن؟ آیو کا بات کہت ہن!" (اجی نواب صاحب، بڑے لوگ موٹر میں شیشہ چڑھائے پوں پوں کرتے سن سن نکل جاتے ہیں۔ وہ کاہے کو بگلی کی طرف دیکھیں گے۔ کیا وہ اپنے دو سو، ڈھائی سو کے کمبل بگلی پر ڈال دیں گے؟ آپ بھی کیا بات کہتے ہیں!)

رکشا اب بگلی کے قریب آگیا تھا۔ ناک کے بیٹھے ہوئے بانسے سے نکلتی ہوئی منمناتی آواز صاف سُنائی دینے لگی تھی۔ "ارے بچالو اس بالک کو! اس کو کوئی دستر اڑھا دو! یہ پاپی نہیں، میں ہوں! مر جائے گا اس سردی میں! اسے بچالو! آہ! آہ! بھگوان کیا اس دُنیا میں کہیں دیا نہیں؟ آہ! آہ!"

مجید نے دیکھا بگلی فٹ پاتھ پر آدھی ننگی پڑی ہے، بس ایک چھوٹی سی پھٹی دھوتی رانوں میں لپٹی ہے ایک کونا پیٹ پر پڑا ہے۔ جس کے نیچے سے ایک بچے کا سر دکھائی دے رہا ہے۔ بگلی کے بال مٹی میں اٹے ہیں اور اس کے چہرے اور چھاتی پر اس طرح کے نشانات ہیں جیسے کسی نے اُسے تیز ناخونوں سے نوچا ہے ــــ اس کی آنکھیں بند ہیں اور اس کی باچھوں سے خون بہہ کر جم گیا ہے۔ جیسے اس نے اپنے دانتوں سے اپنی زبان اور ہونٹ چبا ڈالے ہیں۔ اور وہ کراہے جا رہی ہے "آہ! آہ! آہ!" اور اس پر مکھیاں بھی بھن بھنا رہی ہیں اور چیونٹیاں بھی جگہ جگہ چمٹی ہوئی ہیں۔

مجید کے دل نے کہا "یہ تو کسی بھلے گھر کی بھٹکی ہوئی لڑکی ہے۔ کسی فریبی نے دھوکا دیا اور ماں باپ نے گھر سے نکال دیا" دفعتہً بگلی نے کراہتے ہوئے لال لال خون کبوتر دیدوں سے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا ــ وہ چیخی "یہ بالک اپرادھی نہیں! اُسے بچالو! اسے کچھ اوڑھا دو!"

یہ فریاد مجید کے جسم میں کرنٹ کی طرح دوڑ گئی۔ اس کے دل و دماغ جھنجھنا اُٹھے۔ وہ اس طرح کانپا کہ گھٹنے پر رکھی ہوئی شال پھسل کر جُوتوں پر آرہی۔ وہ اُسے جھک کر اُٹھانے اُٹھاتے بے سوچے سمجھے کہہ اُٹھا "رو کو جی رکشا!" رکشے والے نے پورا بریک لگایا، رکشا جھٹکے سے رُکا تو اس نے مجید کو سوالیہ انداز سے دیکھا۔

مجید نے شال اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "یہ چادر لو، اس ننگی کو اوڑھا دو!"

رکشے والے نے تعجب سے پوچھا "ای بگلی کا؟" (اس بگلی کو؟)

مجید نے جھنجلا کر کہا۔ "ہاں، اسی کو!"

اس نے رکشے سے اُترتے ہوئے کہا "ارے ای چدریا بہت بڑھیا ہو نواب شاب! اِہ کا بن ناہک پھینکت ہو!"

(ارے یہ چادر بہت ہی اچھی ہے نواب صاحب، اسے آپ ناحق ہی پھینک رہے ہیں)

مجید نے ڈانٹ کر کہا۔ "بکو مت! جا کے اُسے اڑھا آؤ۔"

مگر نہ مجید خود رکشے سے اُترا اور نہ اُس نے اپنے ہاتھ سے بگلی کو چادر اڑھانے کی ہمت کی۔ اس کی طرف نظر کرتے ہی متلی معلوم ہوتی تھی۔ خیال آتا کتنی گندی ہے وہ! نہ جانے کیسی کیسی بیماریوں کے جراثیم اس کے جسم سے لپٹے ہوں گے!۔ اور جب رکشے والا چادر لے کر کچھ ناخوش سا بگلی کی طرف بڑھا تو مجید نے اِدھر اُدھر سڑک پر گھبرائی ہوئی نظر ڈالی ــ کوئی دیکھتا تو نہیں اس کی اس بیوقوفی کو ــ کوئی دیکھ لے گا تو نہ جانے کیا سمجھے گا اپنے دل میں۔

رکشے والے نے پگلی کے پاس جاکر چادر کو زور سے جھٹکا دے کر پھیلایا۔ اور حمیدہ کی چہیتی چادر اس کے گندے جسم پر ڈالتے ہوئے بولا۔ "لے رے پگلی! تھار کسمت جاگ گئی۔ اب کھوب گرما کے لیٹ!" (لے رے پگلی، تیری قسمت جاگ گئی اب خوب گرما کے لیٹ!)

پگلی نے شال کی سرسراہٹ اور اپنے قریب ایک انسان کی موجودگی محسوس کی۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ دانت نکال کر اس طرح مُسکرائی کہ چہرہ اور بھی ڈراونا ہوگیا۔ رکشے والا جلدی سے پیچھے ہٹا۔ وہ تیز قدم رکھتا رکشے تک پہنچا اور اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اُسے پوری تیزی سے بھگا دیا۔ نہ جانے وہ پگلی سے ڈر کر بھاگا تھا یا خود اُس کے اپنے کچھ ایسے جذبات وخیالات تھے جن سے وہ بھاگ رہا تھا۔

اور مجید اس سوچ میں پڑ گیا تھا کہ وہ کیا کہے گا' حمیدہ سے۔ کیا وہ بیوی سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اس نے اس کی محبوب چادر ایک پگلی کو اڑھا دی؟ کیا وہ اس کو اپنی توہین نہ سمجھے گی؟ کہیں آنسو آگئے اس کی چشم میگوں میں تو؟ کہیں اُتر گیا اس کا ہنس مُکھ چہرہ تو؟ اس نے طے کیا وُہ جھوٹ بولے گا۔ ایسا جھوٹ کہ آنسو کی بجائے حمیدہ کے مُنہ سے کلمۂ شکر نکلے ——

حمیدہ نے میاں کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اُسے اوورکوٹ اتارنے میں مدد دی —— لہکتے ہوئے کوئلوں سے بھری انگیٹھی اس کے پاس لا کر رکھ دی —— گرم گرم پانی سے ہاتھ مُنہ دھونے کا انتظام کیا۔ جلدی جلدی کھولتی ہوئی چائے تیار کر کے پلائی۔ جب وہ سُوٹ اُتارنے اور گھریلو کپڑے پہننے دُوسرے کمرے میں چلا گیا تو حمیدہ نے اٹیچی کیس کھولا کہ کپڑے کبرڈ میں رکھ دے۔ ساری چیزیں موجود تھیں، مگر شال کہیں نظر نہ آئی —— اس نے ہولڈال بھی کھول ڈالا۔ بستر میں بھی وہ غیر حاضر نکلی۔ اس نے گھبرا کر مجید سے بلند آواز میں پوچھا۔

"میری شال کیا ہوئی؟"

مجید نے جھوٹی کہانی گھڑ لی تھی۔ وہ اس کے پاس آکر مُنہ لٹکا کر بولا "وہ تو ریل میں چوری ہوگئی۔"

حمیدہ کا چہرہ تمتما اُٹھا —— وہ بولی "کون مُوا لے گیا اُسے؟"

مجید نے نظریں نیچی کر کے کہا "رات کو ریل میں گھر سے بھی زیادہ سردی تھی۔ جب دو کمبلوں اور اوورکوٹ اوڑھنے سے بھی ٹھنڈک میں کمی نہ ہوئی تو میں نے ان کے اُوپر سے تمہاری چادر بھی ڈال لی۔ معلوم ہوتا ہے وہ کروٹ لینے میں برتھ سے نیچے گر گئی۔ میں سو ہی رہا تھا کہ دو مُسافر اُتر گئے —— اُنھیں میں سے کوئی اُسے بغل میں دبا لے گیا۔" اب وہ آنکھیں اُٹھا کر ذرا سا مسکرایا اور بولا "چیز ہی ایسی تھی کہ جو دیکھے مُنہ میں پانی بھر آئے!"

حمیدہ کوسنے لگی "اللہ کرے اس کا ہاتھ سڑ جائے! میری شال اوڑھنا اُسے کبھی نصیب نہ ہو! اس کی قبر میں کیڑے پڑیں!" اور اس کی آنکھوں میں آنسو آہی گئے ——

ماما عِدّن ناشتے کے سلسلے میں ہدایت لینے کے لیے آکر کھمبے سے لگی کھڑی تھی۔ وہ تڑ سے بولی "اے ہے بی بی۔ اتّی سی چادر کے چلے جانے پر آپ روتی ہیں۔ خدا کا شکر کیجیے کہ میاں کو کوئی چوٹ چپیٹ نہیں آئی —— سنتی ہوں آج کل چلتی گاڑی

میں ڈاکے پڑتے ہیں۔ موئے ڈاکو لوٹتے ہی نہیں، مُسافر کی جان تک لے لیتے ہیں ۔ اللہ آمین سے میاں صحیح سلامت ساتھ خیریت کے پلٹ آئے، صدقہ اُتروائیے، شکر کا سجدہ ادا کیجیے!"

حمیدہ کا مُوڈ بالکل بدل گیا ـــ اُس نے جھٹ پرس میں سے سوا روپیہ نکال کر عدّن کی طرف بڑھایا۔ "سچ کہتی ہو بُوا! صدقے ان پر سے ایسی ایسی سینکڑوں چادریں! تم ایک سینی میں سوا سیر کھڑا ماش اور ایک پیالے میں سوا پاؤ کڑوا تیل اور اس میں یہ سوا روپئے رکھ کر ان کے ہاتھ سے چھوا کر کسی فقیر یتیم کو دے دو اور میں جاتی ہوں ابھی دوگانہ پڑھنے ـــ" اور وہ وضو کرنے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

مجید نے سوچا۔ چلو کام بن گیا۔ ایک ذرا سے جھُوٹ نے بڑا نیک انجام دکھایا اور اُس نے زبان پر عجیب طرح کی شیرینی محسوس کی۔

دُوسرے دن جب ٹھنڈی ہوا ذرا گرمائی، تو پانچ بجے کارخانے سے پلٹتے وقت مجید اسی سڑک پر مُڑ گیا جدھر بگلی فٹ پاتھ پر پڑی تھی۔ اس نے دیکھا میونسپلٹی کے مہتر اس کی اکڑی ہوئی لاش ایک ٹھیلے پر لاد رہے ہیں۔ اس کے جسم پر وُہی میلی پھٹی دھوتی ہے اور اس کا مرا ہوا بچّہ اسی طرح اس کی چھاتی سے چپکا ہوا ہے ـــ مگر حمیدہ کی چہیتی چادر کا دُور دُور کہیں پتہ نہیں! اور مجید کا مُنہ کڑوے لُعاب سے بھر گیا!

سانپ

حکیم احمد شجاع

اُوپر اساڑھ کے مہینے کا جلتا ہُوا سُورج، نیچے بار کے چٹیل میدان کی تپتی ہوئی ریت، بُوڑھا سپیرا سر پر سانپوں سے بھری ہوئی پٹاری رکھے ایک ہاتھ میں بین اور دُوسرے ہاتھ میں اپنی جوان بیٹی کی اُنگلی پکڑے لمبے لمبے ڈگ بھرتا بستی کی طرف جا رہا تھا۔

آج اُس کو پیاس لگی تو وہ کسی چلتے ہوئے رہٹ پر بھی نہ ٹھہرا اور جب اس کی بیٹی نے پیلُو کی جھاڑیوں سے لال لال پیلو توڑنے چاہے تو اس نے اُسے روک دیا ـــــ وہ چاہتا تھا کہ جس قدر جلدی ہو سکے بستی میں پہنچ جائے جہاں اس گاؤں کے سب سے بڑے زمین دار کی بیوہ ملکانی اپنی اکلوتی بیٹی کا بیاہ رچا رہی تھی۔

سپیرے نے ایک مُدّت سے سُن رکھا تھا کہ ملکانی نے منّت مانی ہوئی ہے کہ جس دن اس کی بیٹی کی شادی ہوگی وہ سات غریب لڑکیوں کا جہیز اپنی گرہ سے دے کر ان کا بیاہ کر دے گی۔ کون جان سکتا ہے۔ سپیرے نے اس اُمید پر کہ شاید ان خوش قسمت لڑکیوں میں ایک اس کی بیٹی بھی ہو، کس بے چینی سے یہ دن پورے کیے تھے ـــــ آج وہ اپنی جوان لڑکی کو ساتھ لیے بستی کی طرف جا رہا تھا شاید سپیرے کی غریبی ملکانی کی نظر میں بچ جائے اور اس کی بیٹی کی بے بس جوانی کو دیکھ کر اس کا دل پسیج جائے اور سپیرے کو اتنا کچھ مل جائے کہ وہ اپنی بیٹی کے جہیز کا سامان کر سکے۔

پہلے زمانے میں سپیروں کی دُنیا میں لڑکیوں کا جہیز کوئی انوکھی قسم کا سانپ ہوتا تھا اور بس ـــــ جتنا اچھا سانپ کوئی سپیرا اپنی بیٹی کے جہیز میں دے سکے اتنا ہی اچھا دُولہا اسے مل جاتا تھا۔ سانپ ہی تو سپیروں کی روزی کا ٹھیکرا ہوتا ہے لیکن بستی کے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر اب سپیروں نے بھی اپنی کینچلی بدل ڈالی تھی اور وہ بھی سانپ کی جگہ سونے چاندی کے ٹکڑوں ہی کو اپنی بیٹیوں کی سب سے بڑی سفارش سمجھنے لگے تھے ـــــ سپیرا ابھی اس وقت یہی سوچ رہا تھا اور اس ناگ کے پھن کو دیکھتا جاتا تھا جو اس چھوٹی سی پٹاری کے سوراخ سے سر نکالے ہوا میں لہرا رہا تھا جو اس کی بیٹی کے سر پر رکھی تھی ـــــ دیکھنے والے مُشکل سے اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ کالا ناگ زیادہ زہریلا ہے یا اس لڑکی کی کافر جوانی، جو اس کے پھٹے ہوئے چیتھڑوں سے دست و گریباں ہو رہی تھی۔

آخر کار سپیرا بستی میں جا پہنچا اور اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ملکانی کی بیٹی کے بیاہ کی خبر سچّی ہے۔ اس کے ناتواں جسم میں نئی تازگی پیدا ہو گئی۔ اس کی مُرجھائی ہوئی آرزوؤں کا کنول از سرِ نو کھل گیا ـــــ وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز چلنے لگا۔ اتنا تیز کہ اس کی جوان بیٹی بھی اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے میں کُچھ تھکن سی محسوس کرنے لگی۔ کم سِن بچّے کالے ناگ کو پٹاری سے جھانکتے دیکھ کر اور جوان لڑکے سپیرے کی بیٹی کے شانوں پر اس کے سیاہ بالوں کو لہراتے دیکھ کر سانپوں کا تماشہ دیکھنے سپیرے کے ساتھ ہو لیے اور جب تک وُہ ملکانی کے دروازے تک پہنچے اس کے ساتھ لوگوں کی ایک بھیڑ چلنے لگی۔

سپیرے نے ملکانی کی حویلی کے دروازے پر پہنچ کر اپنے سر پر سے سانپوں کی پٹاری اُتاری۔ اُس کی بیٹی نے بھی کالے ناگ والی پٹاری زمین پر رکھ دی اور دونوں بانہوں سے اپنے سر پر ایک سانولے آبنوس کا محراب بنائے ہوئے انگڑائی لی۔ اب سپیرے نے بین بجانی شروع کی اور دونوں پٹاریوں کے ڈھکنے کھول دیے ———!

قسم قسم کے سانپ پٹاریوں سے باہر نکل آئے۔ بچے سانپوں کو دیکھ کر سہم گئے۔ گاؤں کے کڑیل جوان بھی جو لڑنے مرنے کو زندگی کا سب سے سہانا کھیل سمجھتے تھے۔ ان بے زبان کیڑوں سے ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ مگر خدا جانے سپیرے کی بین میں کیا جادو تھا کوئی سانپ بھی اس لکیر سے باہر نہ نکلتا تھا جو اس نے بین کی نوک سے اپنے ارد گرد کھینچ دی تھی۔ کوئی نہ سمجھ سکتا تھا کہ سپیرے اور اُس کی بیٹی کے بدن میں کیا طلسم ہے کہ کوئی سانپ بھی ان کی طرف کاٹنے کو نہیں بڑھتا تھا۔

بین کی آواز سُنی تو حویلی کی لڑکیاں دوڑ کر باہر نکل آئیں۔ ملکانی کی بیٹی بھی جھروکے میں کھڑی ہو کر سانپوں کا تماشہ دیکھنے لگی ——
یوں تو گاؤں والوں کے لیے سانپوں کا تماشہ ایک پُرانی چیز تھی مگر آج سپیرے کی بین سے کچھ ایسی رس بھری تانیں نکل رہی تھیں اور اس کے سانپ بین کی تان پر کچھ اس طرح ناچ رہے تھے کہ گاؤں والے بھی دنگ رہ گئے۔ دروازے پر لوگوں کا شور سُنا تو ملکانی بھی حویلی کی کھڑکی کے پاس آ کر جھانکنے لگی۔ سپیرے نے حویلی کی کھڑکیوں میں سے عورتوں کو جھانکتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ ان میں ملکانی بھی ضرور موجود ہو گی۔ بین کو اپنے پھیلائے ہوئے منہ سے الگ کر کے دُعا دینے لگا۔

"ملکانی کی خیر، ملکانی کی بچی کا سہاگ بنا رہے
آج غریب سپیرا مُنہ مانگا انعام لے کر جائے گا۔"

ملکانی بیٹی کی شادی رچا رہی تھی۔ مرے ہوئے شوہر کی جمع کی ہوئی دولت دل کھول کر لٹا رہی تھی۔ اُس نے پانچ روپے بیٹی کے سر پر سے نچھاور کر کے کھڑکی سے نیچے پھینک دیے۔ سپیرا زور سے چلّایا:

"آج سپیرا اپنے لیے دان لینے نہیں آیا ملکانی کو اس کی منّت یاد دلانے
آیا ہے۔ ملکانی کی بچّی جیتی رہے۔ سات غریب لڑکیاں اس دن کے
انتظار میں کنواری بیٹھی ہیں اور ان میں ایک میری بچّی بھی ہے۔"

یہ کہہ کر سپیرے نے بین کے اشارے سے بیٹی کو آگے بڑھنے کو کہا۔ سپیرے کی بیٹی دو تین قدم آگے بڑھ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسات کی چڑھی ہوئی ندی اپنے دونوں کناروں سے اُچھل کر بہنے لگی ہے یا ساون کی رُت کی بجلی نیلے آسمان پر اپنا پرتاب دکھا کر زمین پر اُتر آئی ہے۔

ملکانی کو اپنی منّت یاد آ گئی ——— وہ کچھ پشیمان سی ہوئی کہ بیٹی کے بیاہ کی خوشی میں وہ اس وعدے کو بھول گئی تھی جو اس نے اپنے خدا سے کیا تھا۔ دوڑی دوڑی اندر گئی اور ہزار روپے کی ایک تھیلی لے کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئی۔ دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے سپیرے کی بیٹی کو پکارا۔ سپیرا ملکانی کے ہاتھ میں تھیلی دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا اور پھر اس نے بیٹی کو للکارا۔ اور کہا ——

"سانپنوں کی رانی آگے بڑھ کر اپنی جھولی پھیلا دے —— اور
ملکانی کی جانی کو اسیس دے۔"

سپیرے کی بیٹی کا چہرہ بھی کبھی ایسے جذبے کی حرارت سے تمتما اٹھا جس کو اس نے آج سے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اس کے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی اور وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی ملکانی کی طرف بڑھی۔ ملکانی کے سامنے جا کر اس نے اپنے پھٹے ہوئے کرتے کا دامن پھیلا دیا۔ ملکانی نے روپوں سے بھری ہوئی تھیلی سپیرے کی بیٹی کی جھولی میں ڈال دی۔ سپیرے نے ایک موہوم تمنّا کو اس آسانی سے پورا ہوتے دیکھا تو کسی عجیب جذبے سے متاثر ہو کر چلّا اُٹھا:

"آہاہاہا —— ملکانی تُو نے اپنی منّت کی لاج رکھ لی۔ اور سپیرے
کی بیٹی کا کاج سنوار دیا —— سپیرے کی بیٹی بھی آج تیری بیٹی کو وہ
مانک دیتی ہے جو بادشاہ بھی نہیں دے سکتے۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک ہی جھٹکے میں اس تاگے کو توڑ ڈالا جو اس کی بیٹی کی گردن سے لٹک رہا تھا اور جس میں ایک سفید رنگ کا چھوٹا سا چمکیلا منکا پرویا ہوا تھا۔ پھر سپیرے نے تاگے سے منکا نکال کر ملکانی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا:

"ملکانی یہ منکا اپنی بیٹی کے ہار میں پرو دے اور اسے کہہ دے کہ اس
ہار کو رات دن پہنے رہے سانپ کسی رنگ روپ کا بھی ہو کیسا ہی
زہریلا اور خطرناک ہو اس کے پاس نہ آنے پائے گا۔"

ملکانی نے سپیرے کا منکا اپنی مٹھی میں لے لیا۔ سپیرے نے پھر اسیس دی۔

"ملکانی ترا کلیجہ ہمیشہ ٹھنڈا رہے اور تو من کی مرادیں پائے۔ تیری بیٹی
کا سہاگ بنا رہے۔"

یہ کہہ کر سپیرا اور اس کی بیٹی اپنی اپنی پٹاری سر پر رکھ کر اور ملکانی کے واں سے اپنی جھولی بھر کر جنگل کو لوٹ گئے۔ ادھر سانپ کا کھیل ختم ہوا تو حویلی میں پھر ڈھولک بجنے لگی۔ گاؤں کی لڑکیاں ملکانی کی بیٹی کا سہاگ گانے لگیں اور ملکانی بیٹی کی رخصتی کا سامان کرنے لگی۔

ادھر دولہا کے گھر میں بھی شادی کی دھوم دھام تھی۔ ساتھ کے گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار اپنے جوان بیٹے کی شادی کے چاؤ میں اپنے آپے میں نہ سماتا تھا۔ ایک تو بیٹے کی شادی کی خوشی اور دوسرے ہونے والی دلہن کا لالچ اور پھر اس بات کے احساس سے کہ کل سے اس کا بیٹا اپنے باپ کی زمین کا ہی وارث نہیں بلکہ اپنی دلہن کے باپ کی ساری املاک کا بھی مالک ہو جائے گا۔ بوڑھے زمیندار کی رگوں میں زندگی اور غرور کے سرکش شعلے بھڑک اٹھے۔ دور دور سے مہمان آئے ہوئے تھے اور میزبان ان کی خاطر تواضع میں روپیہ کو پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ اب اسے دولت کی کیا پروا تھی۔ ملکانی کی سونے چاندی سے بھری ہوئی تجوریوں کی کنجیاں اس کے حوالے ہونے والی تھیں۔

براتی برات کے ساتھ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ بوڑھے ڈاڑھیوں میں خضاب لگا رہے تھے۔ جوان سر کے پٹے سنوار رہے

تھے۔ بچوں کی مائیں اپنے بچوں کے لیے قیمتی سے قیمتی اور چمکیلے سے چمکیلے کپڑوں کی تلاش میں تھیں۔ میدان میں باجے کی گڑ گج اور حویلی میں ڈھولک کی تھاپ کا وہ شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ــــ جس گھوڑے پر دولہا کو سوار ہو کر برات کے ساتھ جانا تھا اسے سونے چاندی کے زیوروں سے آراستہ کیا جا رہا تھا۔ گاؤں کے بھاٹ دولہا کے باپ دادا کا شجرہ یاد کر رہے تھے۔ بھانڈ نئی نئی نقلیں تیار کر رہے تھے۔ میٹھے چاول اور قورمہ تو آج دولہا کے باپ نے اس بہتات سے تقسیم کیا تھا کہ انسانوں کا تو کیا ذکر چیل اور کوّے بھی دستر خوان کے بچے کھچے ٹکڑوں کو نظر اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ جب گاؤں والوں کا پیٹ بھر گیا تو وہ زمین دار کو لکھ لٹ راجہ کہنے لگے ــــ اور بھول گئے کہ کل تک وہ اسے خزانے کا سانپ کہا کرتے تھے۔

دولہا کی ماں دلہن کی سیج کو سہاگ کے عطر سے بسا رہی تھی۔ ڈومنیاں بنرے کا سہرا گا رہی تھیں۔ مگر بنرا کہیں نظر نہ آتا تھا ــــ دو دن ہوئے وہ اپنی دلہن کے لیے کچھ نادر تحفے خریدنے موٹر میں سوار ہو کر شہر چلا گیا تھا اور اب تک نہ لوٹا تھا۔ ان تحفوں کی خرید کے لیے جتنا روپیہ بھی وہ اپنی ماں سے لے سکا۔ پھر باپ سے بھی اس نے ادھر ادھر کے بہانے کر کے جو کچھ منہ سے مانگا حاصل کیا۔ ماں اور باپ کی محبت بیٹے کے بیاہ کے دن اندھی ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ جس قدر روپیہ وہ مانگ رہا ہے اس سے دس بیاہ رچائے جا سکتے ہیں مگر جوان بیٹے کی ضد اور پھر بہو کے لیے تحفے لانے کا بہانہ ــــ وہ سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھے اور سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھ سکے۔

زمیندار کے بیٹے نے شہر پہنچتے ہی حسن کے بازار کی سب سے بڑی دکان کا رخ کیا۔ گاہک جوان تھا۔ اس کی جیبیں نوٹوں اور اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دکان کے دروازے کھل گئے۔ وہ دن اور یہ وقت نہ اسے یہ خبر ہوئی کہ سورج کب نکلا اور کب ڈوبا ــــــ نہ اسے یہ یاد رہا کہ وہ ماں باپ سے کیا کہہ کر آیا ہے اور اس وقت اس کی برات اسے دولہا بنا کر دلہن کے گھر لے جانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ اس کو اس بات کا خیال نہ تھا کہ ایک معصوم لڑکی کیسی کیسی آرزوؤں سے اپنا دل بہلا رہی ہے اور آج کی رات کے انتظار میں کن کن بہانوں سے رینگتے ہوئے وقت کو جلدی جلدی بیت جانے پر مجبور کر رہی ہے۔ - - - - - - - - - - - - - - وہ تو اس وقت اپنی عقل کو دختر رز کے عشووں کی نذر کیے اپنے دل کو ایک حسین رقاصہ کی اداؤں پر لٹائے زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو فراموش کر چکا تھا۔ منوا نے زمیندار کو اپنی دکان کے مال کا گاہک دیکھ کر اور اس بات کا اندازہ کر کے کہ گاہک میں مال خریدنے کی ہمت بھی ہے حسن کے بازار کے تجربہ کار تاجر اپنے مال کے گاہک کی خود فراموشی کو اور بڑھانے کے لیے بڑے بڑے آزمائے ہوئے صدری نسخے استعمال کر رہے تھے۔

زمیندار کا بیٹا تو اپنی ہوش کو زہر کے گھونٹ پلا پلا کر اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ مگر اس کا ڈرائیور اس مکان کی ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بیٹا جس باپ کی تمناؤں کا اس طرح خون کر رہا ہے وہ آج اپنی برادری کو کیسے منہ دکھائے گا۔ جس ماں نے بیٹے کا بیاہ جیون بھر سے اس امید پر رچا رکھا ہے کہ آج اس کے سر پر سہرا بندھا دیکھے گی۔ اگر دولہا وقت پر گھر واپس نہ گیا تو برات کو دولہا کے بغیر دلہن کے گھر جاتے دیکھ کر وہ کیا کچھ نہ کر گزرے گی۔ وہ بے چین ہو کر اٹھا۔ ایک جست بھر کر سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور اس نے اوپر کی منزل کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا۔ گھر والوں نے اسے روکنے کی لاکھ کوشش کی مگر وفادار

نوکر اپنے مالک کو بے بس دیکھ کر مالک سے زیادہ طاقتور اور سرکش ہو گیا تھا ۔ اس نے آگے بڑھ کر زمیندار کے بیٹے کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا ۔ زمیندار کا بیٹا شراب کے نشے سے زیادہ ایک جوان عورت کے حسن کی مدھرا کے نشے سے بے ہوش پڑا تھا ۔ اس جھٹکے کو محسوس نہ کر سکا ۔ ڈرائیور نے اپنا سر پیٹ لیا اور چلّایا ۔

"ظالمو! تم نے یہ کیا کیا؟ تم نے اتنا بھی نہ سوچا آج اس کے بیاہ کا دن ہے ۔ گاؤں میں باپ بیٹے کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا ہوگا ۔ ماں حویلی کی کھڑکی سے جھانک جھانک کر بیٹے کی راہ دیکھ رہی ہوگی ۔ وہاں بیٹے کی شادی رچی ہوئی ہے ــــــ"

حسن کے بازار کے بوڑھے تاجر نے کھِل کھلا کر ہنستے ہوئے اُس کی بات کاٹ کر کہا :

"یہاں بھی تو شادی رچی ہوئی ہے ۔"

پھر اُس نے اپنی بیٹی کی طرف جس کے زانو پر سر رکھے زمیندار کا بیٹا سو رہا تھا اشارہ کرتے ہوئے کسی عجیب جذبے سے مشتعل ہو کر کہا :

"یہ لڑکی بھی تو کسی ماں باپ کی بیٹی ہے ۔ اس کے بیاہ کا دن بھی تو تمھارے مالک ہی نے مقرر کیا تھا ۔ اور وہ وقت پر آپہنچا اور جو قیمت ہم نے مانگی تھی وہ اس نے ادا کر دی ۔ یہ سچ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی برات نہیں آئی ۔ وہ سونے چاندی کے زیوروں سے سجے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں آیا ۔ اس کے آگے بلجے گاجے کا دھوم دھڑکا نہ تھا ۔ اس کے سر پر پھولوں کا سہرا نہ تھا ۔ اس کے بدن پر زری اور ریشم کا لباس نہ تھا ۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے یہ تو سب تمھارے بنائے ہوئے رسم و رواج ہیں ۔ اصل چیز تو یہ ہے جو تم دیکھ رہے ہو ۔ دو جوان دل آپس میں مل گئے ۔ دو ندیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بہنے لگیں ۔"

ڈرائیور کی عقل بوڑھے تاجر کی اس عجیب منطق کو نہ سمجھ سکی ۔ وہ اگر کچھ سمجھا تو بس یہی کہ اس کے مالک کو اس وقت اس کے گاؤں میں ہونا چاہیے جہاں اس کا بڈھا باپ اور بے چین ماں جن کا اس نے اتنے دن تک نمک کھایا ہے بیٹے کی انتظار میں ہیں ۔ اس نے بڑھ کر بوڑھے کے سینے پر ایک لات ماری ۔ بوڑھا لڑکھڑا کر گر پڑا ۔ پھر اُس نے پورے زور سے اس جوان لڑکی کو دھکا دے کر پلنگ پر سے گرا دیا جو اس کے مالک پر اپنی ملکیت جمائے بیٹھی تھی ۔ اور پھر اپنے مالک کو جو اس وقت بھی ہوش میں نہ تھا اپنے کندھے پر لاد کر چلا اور سیڑھیوں سے اُتر کر موٹر کی طرف بڑھا ۔ دکان والوں نے گاہک کو یوں ہاتھ سے جاتے دیکھا تو شور مچانے لگے ۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے ڈرائیور اپنے مالک کو موٹر میں لٹا کر ہوا ہو گیا ۔

موٹر گاؤں میں پہنچ کر زمیندار کی حویلی کے دروازے پر آ ٹھہری ۔ اُس کی آنکھیں قسم قسم کے اندیشوں سے چھٹکارا پا کر چمک

اُٹھیں۔ بوڑھا زمیندار بیٹے کو اس کی اس بے پروائی اور غفلت پر ڈانٹ بتانے کے لیے موٹر کی طرف بڑھا۔ مگر ڈرائیور نے لوگوں کی آنکھ بچا کر زمیندار کو اشارے اشارے ہی میں سب کچھ بتا دیا۔ زمیندار نے موٹر کی کھڑکی کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس پر ساری حقیقت روشن ہو گئی۔ بڑھاپے کو لوگ بُرا کہتے ہیں مگر بڑھاپے کی دانائی کبھی کبھی جوانی کی طاقت سے زیادہ کام کی چیز ثابت ہوتی ہے۔ زمیندار دروازہ کھول کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر ڈرائیور کے کان میں کہا "حکیم صاحب کے ہاں چلو۔"

جب موٹر حکیم صاحب کے گھر پہنچی تو حکیم صاحب پگڑی سنبھالتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔ ان کی زندگی کی ساری تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ واقعہ ہوا کہ گاؤں کا زمیندار خود چل کر ان کے گھر آیا۔ زمیندار نے موٹر سے اُتر کر حکیم صاحب کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ حکیم صاحب نے آج اپنی اہمیت کچھ اس طرح محسوس کی جیسے چیونٹی سے یہ کہا جائے کہ ہمالیہ پربت کا سارا دارومدار اس کی جانِ ناتواں پر ہے۔ اُنھوں نے زمیندار کو تسلّی دیتے ہوئے کہا:

"ابھی تو برات کے روانہ ہونے میں چھ گھنٹے باقی ہیں۔ چھ گھنٹوں میں تو
مَیں مُردے میں جان ڈال سکتا ہوں۔"

زمیندار کے بیٹے کو چارپائی پر لٹا کر حکیم صاحب اپنے مکان کے اندر چلے گئے۔ اور اس کی دوا دارو میں مصروف ہو گئے۔ پُرانے سِرکے کی پوری بوتل حکیم صاحب نے زمیندار کے بیٹے کو دو تین گھنٹوں میں پلا دی۔ جو نشہ فرض کی ذمہ داری کے احساس سے بھی نہ اُترا تھا سِرکے کی ترشی سے اُترنے لگا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ زمیندار کا بیٹا برات کے روانہ ہونے کے وقت تک ہوش میں آ گیا یا اپنے بدن میں پہلے کی سی توانائی محسوس کرنے لگا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ باپ کے کندھے کا سہارا لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ احتیاط کے طور پر اس کا باپ اور ماموں بظاہر اپنے دل کے چاؤ کے اظہار کے لیے مگر حقیقت میں دولہا کو سنبھل کر بیٹھنے کی طاقت دینے کی غرض سے اس کی کمر کو ہاتھوں کی ٹیک دے کر گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ پھولوں اور موتیوں کے زرتار سہرے نے دُولہا کا مُنہ چھپا رکھا تھا اس لیے اس کے تین دن رات کے عیش کی تباہ کاریاں براتیوں کی نظر سے پوشیدہ رہیں۔

آخر کار برات گاؤں کی گلیوں کے چکر کاٹتی ہوئی دھوم دھام سے دُلہن کے دروازے پر جا پہنچی۔ ایک گاؤں والوں نے دُوسرے گاؤں والوں کا استقبال کیا۔ زمینداروں کی ایک برادری نے اپنے بھائی بندوں کی دُوسری برادری کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں بھاٹوں نے دونوں خاندانوں کے شجرے پڑھے۔ باپ دادا کے کارناموں کا ذکر سُن کر دونوں برادریوں کے زمیندار ایک دُوسرے کو دیکھتے ہوئے اپنا اپنا سر اُونچا کر کے مونچھوں کو تاؤ دینے لگے۔

ملکانی کے روپے اور گاؤں والوں کی محبت اور عقیدت نے برات کی خاطر مدارات کا وہ سامان کر رکھا تھا کہ براتی حیران رہ گئے۔ جب وہ اس شامیانے میں جا کر بیٹھے جو ملکانی کی حویلی کے کشادہ صحن میں براتیوں کے بیٹھنے کے لیے لگایا گیا تھا تو سارے براتی بڑی حیرت سے اس کی آرائش کے سامان کو دیکھنے لگے۔ کوئی نہ جان سکتا تھا کہ ان کی آنکھوں کی ناگہانی کشادگی کی محرک دولہا کے بخت

کی یادری تھی یا ان کی اپنی عافیت کی غیبش زنی ۔ دُولہا کا باپ بھی دُلہن کے گھر کی شان دیکھ کر اپنی شان میں کچھ کمی محسوس کرنے لگے۔

جب سب مہمان اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو دُولہن کے خاندان کے پشتینی حجام نے "الٰہی بینت بخیر" کہہ کر دُودھ سے بھرے ہوئے کٹورے تقسیم کرنے شروع کیے۔ پھر گاؤں کی سب سے بڑی مسجد کے امام صاحب تشریف لائے اور اُنھوں نے نکاح پڑھایا۔ چاروں طرف سے "مُبارکباد" کا شور اُٹھا۔ دُولہا کے باپ کا سر خوشی اور غرور سے کچھ اُونچا اُونچا سا نظر آنے لگا۔ پھر کھانا تقسیم ہوا۔ براتیوں نے بڑھ چڑھ کر کھانا پکانے والوں کے ہنر کی داد دی۔ بھانڈ اپنا کھیل تماشہ دکھانے میں مصروف ہو گئے ۔ زمیندار ہنس ہنس کر ایک دُوسرے پر پھبتیاں کسنے لگے۔

غرض حویلی کے صحن میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مگر جو ہنگامہ حویلی کے اندر برپا تھا اس کا اندازہ مشکل سے ہو سکتا ہے۔ ملکانی نے دُولہا کی ماں کے سر پر سے ایک ہزار روپے کی تھیلی نچھاور کر کے ڈومنیوں میں بانٹ دی۔ دُولہا کی ماں کسی سے پیچھے کب رہنے والی تھی اس نے دو ہزار روپے کے نوٹ دُلہن کے سر پر سے نچھاور کر کے آنگن میں پھینک دیے۔ اب کیا تھا۔ سب نوکرانیاں اور ڈومنیاں آنگن میں بکھرے ہوئے نوٹوں پر ٹوٹ پڑیں۔ وہ دھکم دھکا اور غل غپاڑا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

ملکانی پھولوں سے لدی ہوئی اور گھونگھٹ سے چھپی ہوئی بیٹی کا بازو پکڑ کر اس کمرے میں چلی گئی جہاں آرسی مصحف کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ دُلہن تو دُلہن وہ کمرہ بھی دُلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ چھپر کھٹ پر پھولوں کے ہاروں کا سائبان اور اس سائبان کے چاروں طرف سنہری اور روپہلی تاگوں کی لڑیاں عجب بہار دکھا رہی تھیں۔ چھپر کھٹ کے سامنے گاؤ تکیے کے سہارے ایک بڑا سا آئینہ رکھا تھا۔ جس میں دُولہا دُلہن کے چہرے کا عکس دیکھ کر رُونمائی کی رسم ادا کرنے کو تھا۔ دُلہن کو چھپر کھٹ پر بٹھا دیا گیا۔ دُلہن کی سہیلیاں چھپر کھٹ کے چاروں طرف ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جمع ہو گئیں اور دُلہن کو چھیڑنے لگیں۔ روشنی کے قمقمے کھلے ہوئے پھول الھڑ لڑکیوں کی ہنسی۔ سہاگ کے گیتوں کی رس بھری تانیں غرض یہ حجلۂ عروسی ایک طلسم ہفت رنگ تھا۔ جس کا حسن آنکھوں کو مسحور اور جس کی شادمانی دل کو مسرور کر رہی تھی۔

اتنے میں ایک شور اُٹھا کہ دُولہا آرسی مصحف کی رسم ادا کرنے حویلی کے اندر آ رہا ہے۔ ڈومنیوں نے اپنے گیتوں کی تانوں کو اور بلند کر دیا۔ لڑکیوں کے قہقہوں سے فضا گونج اُٹھی۔ ملکانی نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دُولہا کمرے کے اندر داخل ہوا۔ ملکانی نے اس کی بلائیں لیں۔ اور ہزار اشرفیوں کی تھیلی دُولہا کے ہاتھ میں رکھ دی۔ دُولہا آگے بڑھا۔ اس کے پاؤں میں لغزش تھی۔ اس کا چہرہ سہرے سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ اس تلوار کا سہارا لیے کر جو راجپوتوں کی پُرانی رسم کے مطابق بیاہ کے دن دُولہا کے ہاتھ میں رہتی ہے، دُلہن کی چھپر کھٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی وہ دو چار قدم ہی چلا تھا کہ اس کا دامن کمرے میں رکھے ہوئے شمع دان سے اُلجھ گیا۔ اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ شمع دان کو ٹھکرا کر الگ کر دے۔ شمع دان گر پڑا۔ گھی کا چراغ بجھ گیا۔ دُولہا کا پاؤں زمین پر گرے ہوئے شمع دان سے ٹکرایا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور اوندھے مُنہ گر پڑا۔ ایک دھما کا ہوا۔ دُلہن گھبرا گئی اور اپنے چہرے سے سہرے کو ہٹا کر اس طرف دیکھنے لگی۔ دُولہا نے کوشش کر کے اپنا سر اُٹھایا اور ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اُٹھنے لگا۔ دُلہن کے مُنہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی اور وہ زور سے چلائی "سانپ"۔

اس کو صاف صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ایک کالا ناگ اپنا پھن اٹھا کر اپنے بل سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دُلہن کے مُنہ سے "سانپ" کی آواز سُن کر ملکانی دوڑی دوڑی بیٹی کے پاس گئی۔ اتنے میں دُولہا اپنی تلوار کے سہارے کھڑا ہو گیا اور پھر چھپر کھٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ دُلہن نے دیکھا کہ وہی کالا ناگ جو اپنے بل سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اب اپنا پھن ہوا میں لہراتا ہُوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے پھر ایک چیخ ماری اور ماں کی چھاتی سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے سسکیاں بھرتے بھرتے سہمی ہوئی آواز سے ماں کے کان میں کہا" وہ دیکھو ماں س س —— سانپ"۔

مگر دُولہا چھپر کھٹ کے قریب آیا ہی تھا کہ اس کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس طرح جیسے کسی نے اس کی چھاتی پر چمڑے کے کوڑے کی ایک شدید ضرب لگائی ہو وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ دُلہن چلّائی۔" دیکھو ماں سانپ بل کھاتا ہُوا دروازے سے نکلا جا رہا ہے" ملکانی اور دُوسری عورتیں کُچھ نہ سمجھ سکیں۔ وہ تو صرف یہی دیکھ رہی تھیں کہ دُولہا اُلٹے پاؤں بھاگ کر دروازے سے نکل گیا۔

دُلہن نے اپنے سینے کے اندر کچھ ایسی تپش سی محسوس کی جیسے کسی نے اس کی چھاتی پر دہکتا ہُوا انگارا رکھ دیا ہو۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اپنے سینے کو ٹٹولا۔ اس کے گلے کے ہار میں ہیرے کا دبا ہوا منکا آگ کی طرح جل رہا تھا۔

راستہ

خدیجہ مستور

گھٹیا چائے خانے کا ریڈیو فرمائشی پروگرام سُنا رہا تھا، وہ بھی ایسے زور شور سے کہ لتا کی آواز کا جادو دُور دُور تک چھا یا جا رہا تھا۔ جنوری کی اس انتہائی سرد رات میں اُس نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت اُداس ہے، تنہا ہے اور اسے کوئی گلے سے نہیں لگاتا۔ اُس نے دل ہی دل میں لتا کے گائے ہوئے بول دُہرائے "مجھے گلے سے لگا لو بہت اُداس ہوں میں"۔

اس نے بجھی بجھی نظروں سے چائے پینے والوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی چائے کی ایک پیالی کے دام ادا کر کے لوہے کی سیاہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

سامنے کے سینما ہاؤس سے آخری شو شروع ہونے کی گھنٹی کی آواز اسے بہت صاف سُنائی دے رہی تھی۔ سڑک کے اس پار کھڑے اس نے ایک لمحے کو ذرا دلچسپی سے اس طرف دیکھا۔ وہ لوگ جو تیسرے درجے کے ٹکٹ نہ خرید سکے تھے، ان میں قیامت کی نفسا نفسی تھی اور جنھیں ٹکٹ مل گیا تھا وہ سینما ہال کے دروازے پر جیسے ہلّا بول رہے تھے۔

اُس نے بڑی احتیاط سے پُرانے مفلر کو کانوں پر لپیٹ لیا اور لنڈے بازار سے خریدے ہوئے اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ چھپا کر آہستہ آہستہ فُٹ پاتھ پر چلنے لگا۔

یہ راتوں کو بارہ بارہ بجے تک کی آوارہ گردی جیسے اس کا نصیب بن چکی تھی۔ ان راتوں میں چاہے کُہر پڑ رہی ہو، چاہے چھاجوں بارش ہو رہی ہو، یا مارے گرمی کے سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا ہو، وہ یوں ہی بے مقصد ٹہلتا اور سوچتا رہتا۔

اُن اَن گنت راتوں میں جب وہ ٹہل ٹہل کر تھک جاتا تو جانے کتنی بار اپنی ناکامیوں اور حسرتوں پر چُپکے چُپکے رو دیا۔ محرومیوں کے احساس نے اسے تڑپایا۔ یہیں ان سڑکوں پر گھومتے ہوئے اس نے اپنے مستقبل کو سنوارنے کے منصوبے بنائے۔ انہی سُنسان راتوں میں اس نے بچّوں کی طرح بند دکانوں کے شوکیسوں کو دیکھا۔ ٹنگے ہوئے خوبصورت کپڑوں کو اپنے جسم پر سجایا۔ ساریوں میں لپٹی ہوئی معصوم حسین مورتیوں کو اپنے سینے سے لگایا۔ مورتیوں کو دیکھ دیکھ کر سوچا کہ کیا زبان اور دماغ بے وفائی کی علامتیں ہیں۔ اور یہیں اس نے بڑے فلسفیانہ انداز سے اپنے حساب بہت بڑی بڑی باتیں سوچیں۔ دُنیا کے بے پناہ حُسن کا اندازہ لگایا۔ یہیں اس نے جنگ اور امن کے مسائل پر غور کیا اور انہی سڑکوں پر چاندنی سے بھرپور ایک رات میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔ ایک دن تو وہ گھنٹوں یہ سوچ کر غصّے اور خطرے سے لرز رہا تھا کہ پڑوسی مُلک اس کے وطن کی سرحدوں پر فوجیں جمع کر رہا ہے۔ اسے اپنے پڑوسی مُلک کی بدمذاقی پر افسوس ہوا تھا۔ کیا وہ مُلک ویرانہ ہے؟ وہاں لوگ نہیں بستے؟ وہاں حُسن جنم نہیں لیتا؟ جس مُلک میں عورت مہندی لگاتی ہو، اس کے پاؤں میں بچھوا بجتا ہو، اور جہاں گنگا جمنا بہتی ہو، وہ جنگ کی باتیں کیسے کرتا

ہے؟ اس نے عہد کیا تھا کہ اگر اس کے مُلک پر ذرا سی بھی آنچ آئی تو وہ اپنے خُون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا مگر وہ اس مسحور کن فضا میں زہر نہ گھلنے دے گا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کے لاغر جسم میں جانے کہاں کی طاقت آگئی کہ وہ سینہ تان کر بڑی دیر تک لیفٹ رائٹ کے انداز میں چلتا رہا۔

وہ اپنے امکان بھر کبھی سرِ شام گھر نہیں گیا۔ تنہا، ویران دو کمروں کا گھر اسے کھانے کو دوڑتا۔ گھر کے راستے پر ہی اسے اپنی مرحومہ ماں یاد آنے لگتی۔ اس کی بیوہ ماں نے محنت مشقت کر کے اسے تعلیم دلائی تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرتے ہوئے سوچا کرتا تھا کہ اپنی اس تھکی ہاری ماں کو ایک دن سونے کے تخت پر بٹھا دے گا مگر جب وہ ایم اے کا امتحان دینے والا تھا تو اس کی اماں ایسی تھکیں کہ سونے کے تخت کا بھی انتظار نہ کیا اور ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر لیٹ کر ہمیشہ کے لیے سو گئیں۔

گھر کی تنہائیوں میں اسے نجمہ یاد آتی۔ اس نے اسے فیل ہوتے دیکھ کر محبت اور منگنی دونوں سے مُنہ موڑ لیا۔ اور ایک شاندار مستقبل والے سے شادی رچا کر رُخصت ہو گئی۔ پھر وہ ایم اے نہ کر سکا۔ نجمہ کی بے وفائی نے اس کے مستقبل پر ایسی لات ماری کہ نفرت کے باوجود اسے کلرکی قبول کرنی پڑی۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بے وفائی کا دُکھ دُنیا کے سارے دُکھوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ رات سوتے میں بھی نجمہ اس کے سینے پر دھم دھم کر کے اسے روندتی رہتی اور وہ مارے اذیت کے پھر نہ سو پاتا۔ ان لمحوں میں اس نے کئی بار سوچا تھا کہ قانون میں قتل کی سزا پھانسی ہے مگر بے وفائی کا جرم کسی قید و بند میں نہیں آتا! یہ بھی مزے کی بات ہے کہ سر توڑنا تو جُرم ہے مگر دل توڑنا جُرم نہیں! اگر وہ وزیرِ قانون ہوتا تو ضرور ایسا قانون بناتا کہ دل توڑنے والوں کو، بیچ چوراہے، پھانسی دے دی جاتی۔ پھر وہ اپنی اس اُوٹ پٹانگ سوچ بچار پر خود ہی بے بسی سے ہنسنے لگتا۔ اگر وہ وزیرِ قانون ہوتا تو پھر بے وفائی کا دُکھ ہی کیوں سہتا۔

نجمہ کو بھولنے اور خود کو بہلانے کے لیے اس نے بڑی ہما ہمی سے زندگی گزارنی چاہی۔ اس نے کتنی ہی بار عورت کو خریدا مگر اسے سچّی خوشی نصیب نہ ہوئی۔ اس نے ہر بار سوچا کہ عورت کو خریدنے کے لیے چاہے سب کچھ خرچ کر دو مگر گھاٹے کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ اس کا گھر تو اور بھی ویران ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جلد ہی اس چکّر سے نکل گیا مگر کسی کو اپنا بناتے اور محبت کرتے بھی ڈرتا۔ نجمہ نے اس کی زندگی سے اعتماد چھین لیا تھا۔

جنوری کی اس انتہائی سرد رات میں وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک چکا تھا۔ آج اس کے سارے جذبات اس کے گلے آ لگے تھے آج اس نے اپنی تنہائی اور اداسی پر دِل ہی دل میں خوب ماتم کیا تھا اور اس طرح اس کے دل کا غبار چھٹ گیا تھا۔

اب وہ تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا اور گھر پہنچ کر جلدی سے سو جانا چاہتا تھا۔ مال روڈ کی بڑی اور چھوٹی دکانیں، دیر ہوئی، بند ہو چکی تھیں مگر بڑی دُکانوں کے شو کیس اسی طرح بُقعہ نُور بنے ہوئے تھے اور چوکیدار موٹی موٹی لاٹھیاں پکڑے کھانس کھانس کر ادھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کہیں کہیں اکّا دُکّا راہ گیر جاتا ہوا نظر آ جاتا۔ ہاں کاروں کے لیے نہ رات تھی نہ سردی۔ جانے وہ کہاں سے آتیں اور زَن سے غائب ہو جاتیں۔ کُہر کی اِس چادر کے اُس پار کاروں کی پچھلی بتّیاں دُور تک جگنو کی طرح چمکتی رہتیں۔

اب کہر کچھ زیادہ ہی پڑنے لگی تھی۔ سڑکوں پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے بلبوں کی روشنی جیسے سردی میں ٹھٹھر کر اور بھی پیلی پڑ گئی تھی۔ وہ اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لیے بڑی تیزی سے میکلوڈ روڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

فلموں کے آخری شو ختم ہو چکے تھے۔ تانگے، ٹیکسیاں، اور رکشائیں حرکت میں آچکی تھیں۔ کھوکھوں میں بیٹھے ہوئے پان بیڑی سگرٹ بیچنے والے اونگھتے اونگھتے چونک پڑے تھے۔ اس نے ایک لمحے کو رُک کر تانگوں اور ٹیکسیوں کی طرف بے تحاشہ لپکتے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور پھر چل پڑا۔

کئی تانگے کھا کھم سواریاں بھرے قطار کے ساتھ اس تیزی سے اس کے پاس سے گزرے کہ اسے اپنی مرحومہ ماں یاد آگئیں۔ اگر وہ زندہ ہوتیں اور وہ جا کر اپنے بال بال بچنے کا حال سُناتا تو ضرور صدقہ دیتیں۔

اب وہ سینما گھروں کو اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ تانگوں اور ٹیکسیوں کا دھارا ابھی ختم ہو چلا تھا۔ اس نے اب اطمینان سے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ گھر اب تھوڑی دُور رہ گیا تھا۔

"ہائے تم کو ابھی تک کوئی تانگہ نہیں ملا۔ انتظار کر کر کے تھک گئی" پیچھے سے آکر کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مُڑ کر دیکھا، سیاہ نقاب سے ایک چاند کا ٹکڑا جھانک رہا تھا۔ وہ اس وقت بجلی کے کھمبے سے دُور تھا۔ وہاں اندھیرا تھا مگر وہ چہرہ کسی روشنی کا محتاج نہ تھا۔ عورت نے بڑی اپنائیت اور محبت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔

"تانگہ نہیں ملتا تو نہ سہی ٹیکسی کر لو، گھر میں سب پریشان ہوں گے کہ دیر کیوں ہو گئی، تم بھی اتنی دیر سے سوؤ گے تو صبح کام پر کس طرح جاؤ گے؟"

وہ مارے بوکھلاہٹ کے کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر عورت کا بڑھا ہوا ہاتھ جانے کیسے اس کے ہاتھ میں آگیا۔ یہ نرم ہاتھ مارے ٹھنڈ کے برف کا ٹکڑا ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ بھی سوچنے کی کوشش نہ کی۔ اسے تو اس وقت صرف ایک خیال تھا کہ کسی طرح اس ہاتھ کو اپنی حفاظت میں لے کر گرم کر دے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ عورت سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہے۔ وہ اس کے لیے ایک محبت کرنے والے شوہر کی طرح بے چین ہو گیا۔ اسے اس وقت یہ خیال ہی نہ رہا کہ عورت اس کی کچھ بھی نہیں لگتی۔ اس کہر پڑتی اندھیری رات نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ شوہر کے دھوکے میں اسے اپنا سمجھ بیٹھی ہے۔

"تم کو سردی لگ رہی ہے، بس ابھی تانگہ یا ٹیکسی مل جائے گی۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا اور جب مُڑ کر دیکھا تو ان کے پیچھے ایک سپاہی کھڑا ان دونوں کو تک رہا تھا۔ "آپ کیسے کھڑے ہیں سنتری جی؟" اس نے ذرا غصّے سے پُوچھا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ اس بیچاری عورت کو اکیلا دیکھ کر آ گئے ہوں گے۔

"میاں جی! اس زمانے میں عورت کو اکیلا چھوڑ کر چلتے بھی نہیں۔ فلم دیکھنے کو غنڈے بھی آجاتے ہیں اور ہر عورت کو آوارہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کچھ دُور تانگہ مل جائے گا۔" سپاہی اپنی لاٹھی گھماتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

"تم نے اس کا مُنہ ہی نہ توڑ دیا۔ یہ کون ہوتا ہے ہمیں نصیحتیں کرنے والا۔ میں نے تو لڑائی کے ڈر سے کہا نہیں۔ جیسے ہی تم تانگہ لینے گئے، یہ آ کر میرے پیچھے منڈلانے لگا۔ پھر میں تمہارے پیچھے بھاگی اور اب دیکھو کیا چپکے سے آ کر پیچھے کھڑا ہو گیا۔" مارے

غصّے کے عورت کی آواز بھرّا رہی تھی۔

"چلو معاف کر دو، غلطی تو میری ہے، تم کو چھوڑ کر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" اس کی آواز میں واقعی ندامت تھی۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ جب وہ اندھیرے سے گزر کر بجلی کے کھمبے کے پاس آیا تو اس نے شعوری طور پر اپنا مُنہ دُوسری طرف پھیر لیا۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ یہ مسرت سے بھرپور لمحے کہیں اتنی جلدی سے ختم نہ ہو جائیں۔

اس نے کئی مرتبہ چور نظروں سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ اس کی ترستی ہوئی سیاہ زندگی پر اچانک چاند کا ایک ٹکڑا آ گرا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو رُک کر مفلر سے اس طرح اپنا چہرہ چھپا لیا کہ صرف آنکھیں کھلی رہ جائیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان اُڑتے ہوئے لمحوں کو پکڑنے کے لیے خود کو کسی طرح عورت کے شوہر کے رُوپ میں ڈھال لے۔ ایک عمر بیت جائے مگر وہ اسے نہ پہچان سکے۔ اسے یہ سب کچھ کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔

اس نے اپنا چہرہ گھُما کر عورت کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی بڑی پیاری نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ گھبرا گیا مگر وہ مُسکرا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر جیسے پھُول کھل رہے تھے اور ہلکے ہلکے اندھیرے میں اس کی آنکھیں تیرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

"تم تھکیں تو نہیں؟" اس نے پُوچھا۔

"میں تمھارے ساتھ چلتے ہوئے پہلے کبھی تھکی ہُوں۔" عورت نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے اس ننھے مُنّے کنول کو اپنی مُٹھی میں دبا لیا مگر جلد ہی اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ ہاتھ نہیں بجلی کا پاور ہاؤس ہے۔ یہیں سے تو بجلی کی لہریں پھوٹتی ہیں۔ اسی ہاتھ کے دم سے تو یہ سارا شہر روشن ہے۔

اس نے ایک گھُٹی گھُٹی سی سانس بھری۔ اس کا کیسا جی چاہ رہا تھا کہ اس سنّاٹے میں عورت کو سینے سے لگا لے مگر اس نے اپنے اس جذبے پر فوراً ہی قابو پا لیا۔ وہ اتنی معصوم، محبّت کرنے والی اور خوبصورت عورت کی غلط فہمی سے کوئی فائدہ نہ اُٹھائے گا۔ وہ ایسی کچھ حرکت کبھی نہ کرے گا۔ اس نے پھر اس عورت کی طرف دیکھا تو وہ مُسکرا دی اور اس کے سخت مردانہ ہاتھ کو بڑی گرمجوشی سے دبانے لگی۔

ایک لمحے کو اس کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کوندگیا کہ کہیں یہ کوئی ایسی ویسی عورت تو نہیں۔ کہیں اسے بے وقوف تو نہیں بنا رہی۔ جانے اسے کہاں لے جائے، کیا عورت کبھی اپنے شوہر کو پہچاننے میں بھی غلطی کر سکتی ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کو چکرا کر رہ گیا۔ اب کے اس نے غور سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کس اعتماد اور معصومیت سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ پھر بھی اس کا دل صاف نہ ہوا۔ اس عورت ذات کا کیا اعتبار۔ اُس نے خالص مردانہ انداز سے سوچا۔ آئے دن اخبار ول میں کیسے کیسے واقعات آتے رہتے ہیں۔ کیا پتہ محض پولیس سے بچنے کے لیے اس نے سہارا ڈھونڈا ہو۔

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو آخر؟" عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے اچانک سوال کیا۔

"ایں!" وہ جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑی — "میں چاہتی ہوں کہ اب تم کسی طرح بھی کوئی سواری کا انتظام کرو۔ منّا ضرور جاگ گیا ہوگا سلیم، وہ میرے لیے رو رہا ہوگا۔ ہائے وہ روتا ہوا بھی بڑا پیارا لگتا ہے۔ لگتا ہے نا؟ بالکل تمھاری طرح ہے۔ ایسی ہی اس کی عادتیں بھی ہوں گی۔" عورت نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اچھا تو سلیم ہے اس کا نام! سچ مچ اس غریب کو دھوکا ہوا ہے۔ مگر وہ اسے کیا کہے، کون سا نام وے۔ نجمہ؟ اس نام سے اس کے کلیجے میں ہوک سے اُٹھی۔ مگر یہ نجمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ نجمہ تو پیدل چلنے اور مصیبتیں جھیلنے کے خیال سے ڈر کر اسے چھوڑ گئی۔ یہ تو اس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے نہیں تھکتی۔ یہ نجمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ اسے اپنا شوہر سمجھ کر کس پیار سے باتیں کر رہی ہے۔ اس کا شوہر سواری کی تلاش میں شاید آگے نکل گیا ہوگا اور اب واپسی پر کتنا پریشان ہوگا۔ کس طرح اسے تلاش کر رہا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل پر چوٹ سی لگی کہ اگر اس کا شوہر راستے میں مل گیا تو پھر وہ اسے چھین لے جائے گا۔ اس نے مضبوطی سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بس آگے جا کر کوئی سواری مل جائے گی۔ شاید دُوسرے سینما ہاؤس میں ابھی فلم نہ ختم ہوئی ہو۔"

"ہُوں!" عورت نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے قدم اُٹھانے لگی۔ راستہ بڑی خاموشی سے کٹ رہا تھا۔

"کتنی سردی ہو رہی ہے!" اُس نے خاموشی سے اُکتا کر کہا۔

"ہُوں!" عورت جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اُس نے صرف ایک بار اُس کا ہاتھ محبّت سے دبایا اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب اس شدّت سے کُہر پڑ رہی تھی کہ سامنے تھوڑے سے فاصلے پر بھی کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس کا کوٹ اور مفلر دونوں ہی نم ہو رہے تھے۔ مگر اسے ذرا بھی سردی نہ لگ رہی تھی۔ اسی کا تو جی چاہ رہا تھا کہ یہ کہر پڑتی رات کبھی نہ ختم ہو۔ قدرت نے یہ رات صرف اس کے لیے بنائی ہو۔

"تم کیا سوچ رہی ہو؟" اُس نے پُوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ منّا رو رہا ہوگا مگر سلیم، آج کتنی مدّت بعد تمھارے ساتھ باہر آنا نصیب ہوا ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے تو تمھارے ساتھ نکلنے کا خیال بس ستا کر ہی رہ جاتا ہے۔ سب کی مرضی کا لحاظ کر کے جیسے دم گھٹ گیا۔" عورت نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ٹھیک کہتی ہو، میرا دم خود گھٹتا رہتا ہے۔" اُس نے جلدی سے ہاں میں ہاں ملائی۔

"وہ دیکھو تانگہ" ——— عورت نے رُک کر سامنے اشارہ کیا۔

اس نے تانگے والے کو آواز دی۔ وہ بے حد آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ کوچوان کمبل میں لپٹا شاید اونگھ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آواز دی تو تانگہ ان کے قریب آ کر رُک گیا اور وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"کہاں چلنا ہے بابو جی؟" تانگے والے نے پُوچھا۔

اس نے بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہاں جانا ہے؟ کس گلی؟ کس محلّے؟ یہ چاند کا ٹکڑا کس گھر میں اُترے گا؟ اسے تو کچھ بھی

پتہ نہ تھا۔

"کیا سوچنے لگے"، تانگے والے کو جواب تو دو۔ رحمان پورے چلو بابا۔ یہ تمھاری ہر وقت کے سوچنے کی عادت نہیں جاتی" عورت ہولے سے ہنسی۔

"بھئی وہ میں سوچ رہا تھا کہ ننھا اگر اُٹھ گیا تو ضرور رو رہا ہوگا اور ——" وہ چپ ہو گیا۔

"ہاں! میرا بچّہ رو رہا ہوگا۔ لعنت ہے ایسے فلم دیکھنے پر" عورت نے دھیرے سے جواب دیا۔

رات، سنّاٹا اور پختہ سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ عورت اب آہستہ آہستہ اس سے دُور ہوتی جا رہی ہے۔ ٹاپیں بھاگتے ہوئے لمحوں کے رُوپ میں اسے بُری طرح بے چین کر رہی تھیں۔

اس نے گھبرا کر عورت کی طرف دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اب وہ مسلسل اسے دیکھتا رہے۔ وہ اس صُورت کا نقشہ اپنی آنکھوں میں کھینچ لینا چاہتا تھا۔

"کیا سوچ رہے تھے؟" عورت بڑے انداز سے گردن موڑے، کھوئی کھوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کچھ بھی نہیں!" اُس نے نظریں جُھکا لیں۔ کیسی مجبوری تھی کہ وہ اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح تو وقت سے پہلے ہی پہچانا جاتا۔

"سلیم" عورت نے جیسے خواب میں اسے پکارا۔

"ہاں!" اس نے مفلر اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"اماں، بہنیں اور ہمارا نکھٹو آوارہ بھیّا، سب جاگ کر انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں ان بیچاروں کو کیا پتہ کہ تانگہ نہیں مل رہا تھا اور ننھا بھی ضرور اُٹھ گیا ہوگا، تم کو نہ پا کر رو رہا ہوگا۔" اس نے اس طرح ننھے کا ذکر کیا کہ واقعی اس کا دل پدری محبت سے پھٹنے لگا۔ اسے تو اس وقت یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ وہ کسی کا باپ نہیں۔

"ہاں رو رہا ہوگا" عورت نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے گہری نیند سو گئی ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی آسیبی کیفیت طاری تھی۔ اس کی گردن اب بھی اسی انداز سے اس کی جانب مُڑی ہوئی تھی۔

اب وہ اسے جی بھر کے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے یہ خطرہ نہ تھا کہ یوں دیکھنے پر وہ پہچان لے گی۔ مریل گھوڑا جیسے رینگ رہا تھا۔ تانگے والے نے اسے دو چار چابکیں رسید کیں اور پھر کمبل میں ہاتھ چھپا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے عاجز آ گیا ہو۔ سڑک پر بالکل سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ اب کوئی راہگیر نظر نہ آتا تھا۔ سردی اس غضب کی ہو رہی تھی جیسے آج ہو کے پھر کبھی نہ ہوگی مگر وہ سردی اور سنّاٹے سب سے بے نیاز ہو کر عورت کو تکے جا رہا تھا۔

"سلیم" عورت نے آنکھیں کھول دیں —— "تم بتاؤ اگر میرا بھائی اپنی ماں بہنوں کا بار نہیں اٹھاتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ سب بھوکے مرتے ہیں تو مر جائیں۔ میں تمھاری کمائی کا ایک دھیلا بھی ان کو نہ دوں گی، اگر تمھارے پاس بہت دولت

ہوتی تو شاید میری وجہ سے ان کو سنبھال لیتے مگر اتنا لب ہے ہی نہیں۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ اتنے بہت سے لوگوں کا بار اٹھاتا پھرے۔ اتنے بہت سے بیمار اور بھوکے لوگ بھر گئے ہیں اس گھر میں۔ پتہ نہیں میں ان سب کے ساتھ کیسے رہتی ہوں۔ جی نہیں چاہتا کہ یہ سب مر جائیں۔ اپنوں کی محبت اندھی ہوتی ہے نا؟" اس نے اپنا چہرہ بازو میں چھپا لیا اور ایک ہلکی سی سسکی بھری۔

"سنو تو:" اس نے بے چین ہو کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ عورت کے دکھوں کی پل صراط سے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا اور جب وہ اس دھار دار راستے پر کٹ کر گرنے والا تھا تو عورت نے اپنا سر اوپر اٹھا لیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی گود میں ڈال کر مسکرانے لگی۔ وہ کٹ مرنے کی اذیت سے نکل کر خود بھی ہنس پڑا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر اسے کتنی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

"دنیا میں اتنی بہت سی مجبوریاں کیوں ہوتی ہیں سلیم؟" وہ پھر رنجیدہ ہونے لگی۔

"بس ہوتی ہیں۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر مارے ہمدردی کے دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ "تم یہ سب مت سوچا کرو نگی۔"

"سوچنا تو پڑتا ہے، اگر اللہ میاں نے انسان کو دماغ نہ دیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"مگر اس وقت تو نہ سوچو۔" اس نے عورت کا سر اپنے بازو پر ٹکا لیا تو اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔

تانگہ اب مزنگ چونگی کے چوراہے سے گزر رہا تھا۔ چوراہے کے ساتھ والی دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ ملازم لڑکے کوکا کولا کی خالی بوتلیں سمیٹ رہے تھے۔

"ارے، کیا مزنگ چونگی آگئی۔" عورت نے جیسے چونک کر دکانوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے بڑے دکھ سے جواب دیا اور پھر عورت کی طرف دیکھا جو سامنے کھڑ میں جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اب تک اس کی گود میں پڑا تھا۔

مزنگ بھی اب پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب ذرا دیر بعد رحمان پورہ آجائے گا۔ اس کی خوبصورت محبت کرنے والی بیوی اس سے چھوٹ جائے گی۔ اس کا پیارا ننھا جو بالکل اس کا سا ہے، اسے کبھی ابا نہ کہہ سکے گا۔ سب کچھ چھوٹ جائے گا۔ کاش وقت تھم جائے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ سائنس دان کوئی ایسی ایجاد بھی کرتے جس سے بھاگتے ہوئے لمحوں کو پکڑا جا سکتا۔

"یہ گھوڑا اتنی زور سے دوڑ رہا ہے، مجھے تو ڈر لگتا ہے۔" اس کی آواز میں خوف تھا۔

"ہاں آہستہ چلاؤ، کہیں تمہارا گھوڑا پھسل نہ جائے۔" اسے بھی اچانک احساس ہوا کہ گھوڑا تیز چل رہا ہے۔

"بابو جی، یہ تو اپنی زندگی میں کبھی تیز چلا ہی نہیں چاہے کھال نکال لو اس کی اور آپ کہتے ہیں کہ تیز چل رہا ہے۔" تانگے والا جیسے ان کی سمجھ پر زور سے ہنسا۔

تانگے والے کی ہنسی پر وہ شرمندہ ہو گیا۔ گھوڑا تو واقعی بے حد آہستہ چل رہا تھا۔ پھر بھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ گھوڑا

اور آہستہ چلے، بلکہ چل ہی نہ سکے۔ اس انتہائی سردی میں اس کے پاؤں شل ہو جائیں اور پھر ساری رات، ساری زندگی وہ عورت کا ہاتھ تھام کر سڑک کے کنارے بیٹھا رہے۔

"سلیم، میں سوچتی ہوں کہ ———" وہ چُپ ہو گئی۔

"یہی نا کہ اب ننھے کو چھوڑ کر تفریح کرنے کبھی نہ نکلوں گی، بس ابھی گھر آیا جاتا ہے۔" اُس نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسے کبھی نہ چھوڑوں۔" اس نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری اور پھر قریب سرک کر اپنا سر اُس کے سینے پر ٹیک دیا ——— "مجھے چھپا لو، گھر جانے کو جی نہیں چاہتا ———" وہ سرگوشی میں کہنے لگی۔ "وہاں تو درجن بھر جان کے دشمن سر پر دندناتے رہتے ہیں۔ تمہارے پاس بیٹھنے کو تو ایک منٹ بھی نہیں ملتا، مجھ سے تو تمہارے متعلق سوچا بھی نہیں جاتا ———" وہ اپنا سر اُس کے سینے پر رگڑنے لگی۔

"اور مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم کو پا کر بھی کھو دیا۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔ وہ اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کی زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔ وہ اس وقت جذبات کی شدت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ صرف ایک بار عورت کو اپنے سینے سے لگانے کی خواہش میں مرا جا رہا تھا مگر وہ صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اسے عورت میں ایسا تقدس اور معصومیت نظر آ رہی تھی کہ وہ اپنی اس چھوٹی سی خواہش کو بھی پُورا کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔

اب تانگہ رحمان پورے کی سڑک پر مُڑ گیا تھا۔ دُور دُور لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے بلب اسے پکے پھوڑوں کی طرح ٹپکتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے، اب سب کچھ چھن جانے کا احساس اُسے بُری طرح ستا رہا تھا۔ جانے کس گلی میں کس گھر میں اس کی بیوی اور اس کا بیٹا اس سے جدا ہو کر ہمیشہ کے لیے اُسے تڑپتا چھوڑ جائیں گے۔

اُس نے سوچا کہ وہ تانگے سے اُترتے ہی عورت کو خود بتا دے گا کہ رات کی تاریکی نے اُسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے وہ اس کا شوہر نہیں۔ کیا فائدہ کہ وہ خود ہی اُسے پہچان لے اور جانے کیا سمجھے۔ بے ایمان، ذلیل، مگر اُس نے ذلیل پن کی تو کوئی حرکت نہیں کی، وہ اسے بتا دے گا کہ وہ اس قدر پیاری ہے کہ اس نے صرف تصور میں اسے اپنا بنا لیا تھا اور سوچنا گناہ نہیں ہے۔ خواب دیکھنا کمینگی نہیں ہے۔

اسے اپنا ضمیر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس نے ہولے سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے اُٹھا لیا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اب اُس نے جینے سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور مارے کرب کے کسمسانے لگا۔

"کیا بات ہے سلیم؟" اُس نے بیتابی سے اس کے کوٹ کا کالر کھینچا۔

"کچھ بھی نہیں!" اُس نے کھوئے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی وہ اس عورت کو بھول سکے گا!

"سلیم میرے پاس اور سرک جاؤ۔" اس نے پھر اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔

"میں تمہارے پاس ہی تو ہوں۔" اُس نے اس طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ دو سال کی بچی ہو۔

تانگہ اب رحمان پورے کی ایک گلی میں مُڑ گیا تھا۔ پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُن کر کوئی آوارہ

کُتّے سامنے آکر بھونکنے لگے تھے ۔ گلی بالکل تاریک تھی اور یہاں کُہر کی چادر اور بھی موٹی ہوگئی تھی ۔

"ارے تُم نے تو بتایا ہی نہیں، تانگہ آگے نکل جاتا۔" اُس نے بُرقعے کے اُوپری حصّے کو ٹھیک سے اوڑھ لیا — "بس یہاں روک لو۔ آگے گلی میں تمھارا تانگہ نہ جا سکے گا۔"

تانگہ رُکتے ہی وہ اُتر گئی ۔ مگر وہ اپنی سیٹ پر جیسے جم کر رہ گیا تھا ۔ اس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ اسے گزرے ہوئے وقت کا یہ انجام بڑا ہی المناک معلوم ہو رہا تھا۔

"اُترو نا۔" عورت نے کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وہ کٹھ پتلی کی طرح نیچے آگیا اور تانگے والے کو کرایہ دینے کے لیے بٹوہ تلاش کرنے لگا۔

جب تانگے والا تانگہ موڑ کر چلا گیا تو اُسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا ۔ بھلا وہ اُترا ہی کیوں تھا، اسے تو اسی تانگے سے واپس چلا جانا چاہیے تھا۔

وہ بڑی مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے اس طرح چل رہی تھی جیسے رینگ رہی ہو۔ گلی کے موڑ پر وہ کھڑا ہو گیا تو وہ بھی رُک کر اس کا مُنہ تکنے لگی۔

"میں —— میں، میں کہنا چاہتا ہوں کہ ——" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"یہی نا کہ تم میرے شوہر نہیں ہو۔ ابھی کچھ دیر اور نہ کہتے تو اچھا ہوتا، کچھ وقت اور کٹ جاتا۔" وہ جیسے کنوئیں میں سے بولی۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی ۔

"شاید تم کو میرے اس طرح چھپانے پر افسوس ہوا مگر میں نے کوئی بے ایمانی تو نہیں کی، تم کو حفاظت سے یہاں تک پہنچا دیا ہے بہرحال میں تم سے مُعافی چاہتا ہوں ۔ بات یہ تھی کہ ——" وہ کہتے کہتے رُک گیا ۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔ اُس نے عورت پر بھرپور نظر ڈالی۔ "ننھے کو میری طرف سے پیار کرنا ——" اس کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔

"ننّھا، جو بالکل تمھارے جیسا تھا، جو راستے میں پیدا ہوا اور میرے اس گلی میں آنے کے بعد مر گیا۔" عورت سسک کر رو پڑی ۔ "اب کھڑے میرا مُنہ کیا تک رہے ہو؟ بھاگ جاؤ ——" اُس نے اپنا بُرقع کھسوٹ کر بغل میں دبا لیا۔" اب اتنے بہت سے بھوکے تمھاری جان کو رو رہے ہیں گے ۔ میں خالی ہاتھ گھر جا رہی ہوں۔" اُس نے جلتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے دُوسری گلی میں مُڑ گئی ۔ مگر وہ دُکھ اور حیرت کے ملے جُلے جذبات کے بوجھ تلے دبا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ سنّاٹے میں عورت کے جوتوں کی ایڑیوں کی کھٹ کھٹ اور سسکیوں کی آواز آہستہ آہستہ دُور ہوتے ہوتے جانے کہاں کھو گئی ۔ اب اسے اچانک اپنے لُٹ جانے کا احساس ہوا اور وہ پاگلوں کی طرح گلی میں دوڑا مگر اب وہاں خاموشی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ ان کی کھڑکیوں سے اندھیرا پھُوٹ رہا تھا۔ کہیں روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہ آئی ۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں کے ایک ایک دروازے کو پیٹ کر اس کا پتہ پُوچھے ۔ اس کی تلاش میں نگر نگر ڈھنڈورا پیٹے۔

اور جب وہ دُکھوں کے بوجھ سے نڈھال ہو کر واپس ہو رہا تھا تو گلی کے ویران اندھیرے میں ایک ننھی سی کنتائی ہوئی

لاش تیر رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا سڑک پر آگیا جہاں کنارے کھڑا ہوا تانگے والا بجھی ہوئی بتیوں میں تیل ڈال رہا تھا۔ وہ اُچک کر تانگے پر بیٹھ گیا۔

"اب کہاں چلنا ہے بابو!" تانگے والا ایک آنکھ میچ کر ہنسا۔

"میکلوڈ روڈ۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا اور جب اپنے ٹھنڈے برف چہرے کو اس نے دونوں ہاتھوں سے رگڑا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ رو رہا تھا۔

چٹان

حجاب امتیاز علی

عجیب واقعہ گزرا ۔۔۔۔!

یہ اُس سال کی بات ہے، جب میں اپنے بُوڑھے طبّی مشیر ڈاکٹر گار کے ساتھ کوہ الماس کے سبزہ زاروں پر اعصابی سکون کے لیے آئی ہوئی تھی اور اپنے ناول کا آخری حصّہ مکمل کر رہی تھی۔

موسمِ گرما کی بہاروں میں الماس کا چپّہ چپّہ سیّاحوں اور مُسافروں کی تفریح کا آماجگاہ بن جایا کرتا تھا۔ یہاں میں نے ایک نیلی چٹان کے سرے پر بنگلہ لے رکھا تھا جس کے سامنے چمن لہلہا رہا تھا۔

بوُڑھا ڈاکٹر گار بڑا مجلس پسند آدمی تھا۔ اپنی ساری زندگی اس نے اعلیٰ معیار کی محفلوں کے فانوسوں تلے ہنس بول کر گزاری تھی۔ چنانچہ آج کل کی چھٹیوں میں وہ تمام تمام دن مرغزاروں کے چکر کاٹتا اور دوستوں سے گپ لگاتا۔ بندوق ہاتھ میں رہتی، اور جہاں کوئی شکار نظر آتا، اسے نشانہ بناتا اور میں نیلی چٹان کے زیرِ سایہ بیٹھی اپنی کتاب لکھا کرتی۔ پھر جب شام پڑتی اور آسمان پر تاروں کی آگ لگ جاتی تو ہم دونوں اس ننّھے سے جگمگاتے شہر کی سیر کے لیے نکل جاتے۔ دوستوں سے ملاقاتیں کرتے، محفلوں میں شریک ہوتے، میں اپنی نامکمّل کتاب کی باتیں کرتی، ڈاکٹر گار اپنے شکار کی ۔۔۔۔۔ اور آدھی آدھی رات گئے واپس آتے، غرض رات بڑے ہنگامے میں کٹتی اور دن مصروفیت میں۔ کوہ الماس چونکہ مختصر سی جگہ تھی اس لیے وہاں کی نصف سے زیادہ آبادی ہمارے جاننے والوں کی تھی۔

ایک صُبح میں اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان لیے بید مجنوں کے نیچے بیٹھی کُچھ سوچ رہی تھی۔ سامنے درخت کی ایک گہرے کاسنی رنگ کی ٹہنی پر ایک زرد پروں اور نیلی چونچ والا پرند بیٹھا زور زور کی سیٹی بجا رہا تھا۔ ڈاکٹر گار اپنی نسوار کی ڈبیا اور بندوق لیے پہاڑوں پر گھوم رہا تھا کہ اتنے میں مری بوڑھی حبشن زوناش حسبِ عادت مُنہ پھلائے نمودار ہوئی۔

"کیا بات ہے بوڑھی بلّی ؟" میں نے اپنی گہری سوچ سے باہر نکل کر پُوچھا۔

نجانے کیا بات ہے۔ بوڑھی زوناش عام طور پر صُبح کے وقت چڑچڑی ہُوا کرتی تھی۔ شاید رات بھر کے خوفناک خوابوں کا اثر اس کے ذہن کو پریشان رکھتا تھا۔ خشک لہجے میں بولی "اپنا تار لیجیے۔"

"ارے کس کا ہے ؟ ۔۔۔۔۔" میں چونک پڑی۔

زوناش بغیر جواب دیے اپنی موٹی کمر ہلاتی واپس جا چکی تھی۔

میں نے جلدی میں لفافہ کے ساتھ تار بھی پھاڑ دیا۔ پھر اسے جوڑ کر پڑھنے لگی اور پڑھتے ہی متوحش ہو گئی۔ تار زُلفی کا تھا۔ لکھا تھا :۔

"مجھے فوراً آملو۔ میرا ارادہ عنقریب خودکشی کا ہے۔ کبھی یہ زندگی مجھے کتنی عزیز تھی! پر اب — ! زُلفی"

میں نے اسی وقت تار کا جواب تار سے دیا کہ

"مرے آنے تک رُکنا۔ روحی۔"

تار پڑھ کر میرے اعصاب تہ و بالا ہو گئے۔ زُلفی کی مُنّی سی لاش خون میں نہائی ہوئی مجھے صاف نظر آرہی تھی اور اس پر سخت حسرت برس رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہم مکتبی کے دن، وہ بےفکری کا زمانہ، اور عیش کی گھڑیاں یاد آنے لگیں جب میں اور زُلفی بچیاں تھیں۔ زُلفی مری پُرانی دوست تھی۔ مجھے اس کا بھی علم تھا کہ وہ سخت بزدل ہے اور خودکشی بڑی ہمت کا کام ہے لیکن اس کے باوجود اس کی لاش بار بار مری تصور کی آنکھوں کے آگے آجاتی تھی اور مری سسکیاں نکل جاتی تھیں۔

پریشان ہو کر میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو ہو رہے تھے۔ گیارہ بجے ایک جہاز جانے والا تھا۔ مجھے اسی میں اُڑ جانا چاہیے میں نے اپنے دل میں کہا۔

ٹھاں۔ ٹھاں ——— ! دُور پہاڑوں پر سے ڈاکٹر گار کی بندوق کی ناگوار آوازیں آرہی تھیں۔ میں بُرا سا مان گئی۔ مجھے شکار سے کبھی دلچسپی نہ تھی۔ اس ظالمانہ شغل سے مجھے نفرت تھی۔ جانے لوگوں کو کیا ثواب مل جاتا ہے جانوروں کو مار کر ——— پھر میں تو اس مخلوق کی شیدائیوں میں سے تھی۔

میں نے بڑبڑاتے ہوئے جلد جلد اپنے کاغذات پلیٹے۔ اندر کمرے میں جا کر ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس ٹھیک کیا اور ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئی۔

جب میں ہوائی اڈے کو جانے کے لیے تیار ہو کر باہر نکلی تو ڈاکٹر گار مجھے جنگل کے ایک موڑ پر بندوق ہاتھ میں لیے ہوئے ملا۔ اس کے دُوسرے ہاتھ میں کوئی چیز لٹک رہی تھی۔

چیخ چیخ کر مجھے آوازیں دینے لگا۔ "رُوحی! رُوحی! ادھر دیکھو۔ آج مُرغابی ملی ہے۔ زوناش سے کہنا دوپہر کے کھانے کے لیے اسے مصالحے میں خُوب سُرخ تل دے ——— ہاں دہی کا چھینٹا ضرور دے ———"

میں نے بے پروائی سے پلٹ کر دیکھا۔ مری ایک سسکی سی نکل گئی۔ "دہی کا چھینٹا ——— !؟ زُلفی خودکشی کر رہی ہے ڈاکٹر ——— اور آپ مُرغابی تل کر ———"

ڈاکٹر گار قریب آگیا۔ "کیا کہا؟ زُلفی؟ ——— خودکشی؟ جا کہاں رہی ہو تم؟"

میں نے تار اسے دے دیا۔ وہ آنکھیں چندھیاتے ہوئے تار پڑھ کر بولا: "اور تمہیں یقین آگیا؟"

"نہیں ———" میں نے دُوسری سسکی بھری۔ "تاہم کیا معلوم ———؟"

ڈاکٹر گار ہنس پڑا۔ "میں تم سب کو بچپن سے جانتا ہوں رُوحی۔ ارے خودکشی تو بڑے دل گردے کا کام ہے۔ زُلفی خودکشی کیا کرے گی۔"

"لیکن اس نے مجھے فوراً پہونچنے کی تاکید جو کی ہے۔ جان کا معاملہ ہے ڈاکٹر۔ میں اسے ساتھ لے کر کل صبح کے جہاز سے واپس

آجاؤں گی۔ تاکہ خودکشی کا خدشہ ہی باقی نہ رہے " یہ کہہ کر میں چل دی۔ جہاز میں تمام رستے میں بادلوں کو تکتی اور ادھر اُدھر متوحش نظریں ڈالتی ہوئی سفر کاٹتی رہی۔

ڈاکٹر گار مرغابی اٹھا کر ہلانے اور مجھے خدا حافظ کہنے لگا۔

دو گھنٹوں بعد جب میں زُلفی کے ہاں پہونچی تو وہ ایک دھانی رنگ کے خوبصورت لباس میں باغ کی دریچی پر بیٹھی گلہری کی طرح ایک سُرخ سیب کتر کتر کر کھا رہی تھی۔

اسے دیکھ کر مجھے دلی اطمینان ہوا۔ مسکرا کر بولی۔ " تم تو بنی سنوری بیٹھی سیب کھا رہی ہو۔ خودکشی کا پروگرام کیا ہوا؟"

اس نے مجھے گلے لگایا بولی " دو دن سے فاقہ تھا رُدحی۔ یہ پہلا سیب ہے۔ میں تمھاری منتظر تھی "۔

" اور خودکشی ؟ " میں ہنس پڑی اور اٹیچی کیس نیچے ڈال دیا۔

" تم نے تار میں ملتوی کرنے کو لکھ دیا ورنہ مر چکی ہوتی "۔

" نہیں تمھیں کوہ الماس اپنے ساتھ لے چلنے آئی ہوں زُلف۔ ایسی روشن گرم بہاروں میں خودکشی کرنا کفرانِ نعمت ہے۔"

" تم خودکشی کی وجہ نہیں جانتیں رُدحی۔ تم میری جگہ ہوتیں تو یہی کرتیں "۔

" میں مالیخولیا کی مریض نہیں ہوں جو یہ اقدام کرتی۔ "

اس نے سیب باغ کی دریچی سے باہر پھینک دیا۔ کمرے میں اُتر کر ایک سُرخ قالین پارے پر پنکھے کے نیچے بیٹھ کر بولی " رُدحی تم کو میری سوتیلی بہن شانو یاد ہے؟ طالب علمی کے زمانے ہی میں وہ کس قدر مکّار مشہور تھی۔ اکثر لڑکیاں اسے ناپسند کرتی تھیں۔ محض اس کی مکاری کی وجہ سے ، ! "

میں کچھ یاد کر کے بولی " ہاں ہاں مکار اور حسین ! "

" اسی نے مجھے خودکشی پر آمادہ کر دیا " زُلفی نے دردناک لہجے میں کہا۔

میں متاثر سی ہو گئی " ہائے زُلفی۔ تم اس کے ساتھ آخر رہتی کیوں ہو؟ ——— اب آج ہی تم میرے ساتھ کوہ الماس چلو۔ تم نے اب تک تفصیل تو مجھے کچھ بھی نہیں بتائی "

زُلفی کچھ سوچ کر بولی " میں نے تم کو اس لیے بلایا تھا ——— کہ اگر تم میری بجائے شانو کو اپنے ساتھ کوہ الماس لے جاؤ تو میرا کام بن جائے گا "

میں اس کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ صوفے پر کا ایک کشن کھینچ کر اس سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی " آخر بات کیا ہے زُلف ؟ "

زُلفی اب سنجیدہ اور اداس نظر آ رہی تھی " اگر تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کی وہاں کہیں شادی کرا دو تو میں زندگی بھر تمھارے اس احسان کو نہیں بھولوں گی "

"کسی کی شادی کرانا آسان ہے زُلفی؟ ——" میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی پھر بولی: "مزید براں اس عیّار لڑکی کی شادی کرانے کے فرائض آخر تم کیوں سرانجام دو؟"

"رُوحی۔ اس نے مری حق تلفی کی ہے۔ اب سارا قصّہ تم کو مختصراً سناتی ہوں۔ یقین جانئے ہوئے ایک دعوت میں مری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو بے حد دلکش اور خوش ذوق ہے۔ مارچ کا مہینا ہم نے سرسری ملاقاتوں میں کاٹا۔ اپریل میں ملاقاتیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ اوائل مئی میں اس کا تعارف اپنے رشتہ داروں سے کرایا اور سب نے اسے بے حد پسند کیا۔ اواخر مئی کا زمانہ محبّت کے دلفریب خواب دیکھتے گزر گیا لیکن جون کے پہلے ہفتے میں شانو آگئی۔ اس کا آنا تھا کہ مری دُنیا تہ و بالا ہو گئی۔ اس نے آتے ہی اس پر جادو سا کر دیا۔ وہ اس کے قریب ہوتی چلی گئی اور میں دُور ہٹتی گئی —— اب نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ اگر میں ایک قدم بھی اور پیچھے ہٹی تو ناکامی کے غار میں جا گروں گی ——"

"لیکن وہ شخص؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے متعلق میں کچھ کہہ نہیں سکتی رُوحیا کہ وہ شانو سے محبّت کر رہا ہے یا مجھ سے؛ مجھے دھوکا دے رہا ہے یا اُسے"

"پھر تو وہ خاصا گرگِ باراں دیدہ معلوم ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"وہ جیسا بھی ہے ...... میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم شانو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کوہ الماس کی دلچسپیوں میں اسے اتنا محو کر دو کہ وہ اسے بھول جائے۔ اور اگر ہو سکے تو اس کی وہیں کہیں شادی بھی کرا دو۔ کوہ الماس پر گرم بہاروں میں جگہ جگہ سے مسافر آتے ہیں۔ ایسی جگہ بڑی آسانی سے رشتے کرائے جاتے ہیں۔"

میں پریشان ہو کر بولی: "لیکن میں اس فن کی ماہر نہیں ہوں دُوسرے ——"

زُلفی بات کاٹ کر بولی: "میں کب کہتی ہوں رُوحی کہ تم کچھ کرو۔ تم سدا کی نکمّی ہو۔ ڈاکٹر گار اس سلسلے میں بے حد کارآمد ثابت ہوگا۔ وہ دُنیا جہان کے لوگوں کو جانتا ہے۔"

باغ کی روش کی طرف سے ہلکی ہلکی سیٹی کی آواز آنے لگی پھر تھوڑی ہی دیر بعد سُریلی آواز میں ایک عشقیہ مصرعہ سنائی دینے لگا۔ میں نے زُلفی سے پوچھا: "یہ کون گا رہا ہے؟"

مرا جملہ ختم ہوا تھا کہ شانو نیلی مخمل کی تنگ جینس پہنے بازوؤں پر سیاہ بال لٹکائے گنگناتی ہوئی اندر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹ گلناری رنگ کی لپ اسٹک سے انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس کے آتے ہی کمرہ گھاس کے عطر کی تیز خوشبوؤں سے مہک اُٹھا۔

مجھے دیکھتے ہی بولی: "ارے رُوحی! تم یہاں! میں نے سنا تھا تم کوہ الماس کے ہنگاموں میں مشغول ہو۔ مجھے رشک آ رہا تھا تم پر۔ ہائے مجھے کوہ الماس اتنا پسند ہے اتنا پسند ہے کہ وہاں ایک ہفتہ گزارنے کے لیے میں اپنی جان تک دینے پر تیار ہوں۔"

میں ہنس پڑی۔ ٹھنڈی کافی کا ایک گھونٹ لے کر بولی: "بغیر جان کا نقصان کیے تم وہاں کی فضاؤں کا لطف اُٹھا سکتی ہو تم مرے ساتھ چلو اور مری مہمان بن کر رہو۔"

زُلفی خوش ہو کر بولی "روحی تمہیں دعوت دے رہی ہیں شانو۔ مہینے بھر کے لیے ہو آؤ۔"

مَیں بولی "مجھے کل صبح کے جہاز سے واپس جانا ہے چلتی ہو تو ساتھ چلو۔"

شانو کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گئی پھر بولی "روحی، دو دن کے لیے تم اپنا سفر ملتوی نہیں کر سکتیں؟"

مَیں گھبرا کر بولی۔ "دو دن؟ بہت زیادہ ہیں شانو۔ تم کل ہی مرے ساتھ چلو۔"

زُلفی مجھے تیز تیز نظروں سے گھورنے لگی "رُوحی۔ دو دن میں قیامت تو نہیں آ جائے گی۔"

مَیں بولی "مجھے اپنے ناول کا آخری حصّہ مکمل کرنا ہے زُلفی۔ دو دن کے معنی یہ ہوں گے کہ سوچا ہوا سارا خاکہ دماغ سے نکل جائے گا۔"

"تو دماغ کے پٹ بند رکھنا ————" شانو ہنس کر بولی "اگر تم دو دن ٹھیر جاؤ گی تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی مجھے ایک ضروری انتظام کرنا ہے۔"

میں بادلِ نخواستہ دو دن کے لیے ٹھیر گئی۔

جب میں جانے لگی تو زُلفی نے مجھے بے حد پیار کیا اور بولی "روحی۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی کے آخری لمحوں میں بھی یاد رکھوں گی۔ تم نہیں جانتیں کہ اس عیار لڑکی کو یہاں سے دفع کر کے تم نے مجھ پر کتنا عظیم احسان کیا ہے۔ گویا مری راہ سے ایک چٹان ہٹ گئی۔"

"چٹان ————" میں ہنس پڑی "گویا تم اسے اپنی راہ سے ہٹا کر مری راہ میں حائل کرنا چاہتی ہو اور واقعی میں اس کے نیچے دب جاؤں گی۔ اس لیے کہ میں کوہ الماس محض اس غرض سے نہیں گئی کہ وہاں کے شور و شر میں لگی رہوں یا وہاں کی محفلوں کی شمع بنوں۔ میں تو اپنے ناول کا آخری باب مکمل کرنے گئی تھی۔ اب شانو دن رات میری جان کھایا کرے گی کہ مجھے دعوتوں میں گھماؤ۔ محفلوں کی سیر کراؤ۔"

زُلفی بولی "تم بہت بھولی ہو روحی۔ تم شانو کو نہیں جانتیں۔ اسے کسی سے متعارف کرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنے لیے راہیں آپ نکال لیتی ہے۔ وہ بڑی خارج المزاج لڑکی ہے اور اگر فرض کرو اس نے تمہیں کسی قدر پریشان کیا بھی ——— تو کیا ہوا۔ مرے لیے تم اتنی تکلیف گوارا نہیں کر سکتیں؟ آخر دوست آڑے وقتوں میں کام آنے کے لیے ہوتا ہے۔"

میں نے سوچا تو مجھے بھی اس کا کہنا کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوا کہ دوست آڑے وقتوں میں کام آنے کے لیے ہوتا ہے اور پھر مری اور زُلفی کی دوستی تو بچپن کی تھی۔

جب تیسرے دن میں شانو کو لیے ہوئے کوہ الماس پہونچی تو خوش گلو ایشیائی پرند بانس کی سرسبز ٹہنیوں پر نغمہ سرا تھے اور شام کی ہواؤں میں سونف کے گچھوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر گار باورچی خانے میں چھچہ لیے کے آگے ایپرن باندھے کھڑا اپنے شکار کیے ہوئے جنگلی مُرغ کی ایک ٹانگ بھُون رہا تھا۔

اس نے ہمیں دیکھ کر ایک قہقہہ بلند کیا۔ نسوار کی ڈبیا کھول کر زور سے سونگھی اور چمچہ آگے بڑھا کر کہا "تم دونوں اسے

چکھ کر دیکھو۔ کیا لذیذ قورمہ پکایا ہے میں نے۔ زوناش کو پکانے کیلئے کہتا تو وہ جلا کر رکھ کر دیتی۔"

اسی وقت اس کی نظر بجائے زُلفی کے شانو پر پڑی اور اُس نے متعجب ہو کر کہا۔ "ہائیں؟ زُلفی نہیں آئی؟"

اسی رات کا ذکر ہے۔ آسمان پر کہکشاں کی بساط بچھی ہوئی تھی بہار کے گرم و معطّر جھونکے ارغنوں کا سا شور مچا رہے تھے۔ شانو نے کھانا کھاتے ہی اپنے کسی دوست کو فون کیا۔ وہ دوست ذرا سی دیر میں آ کر اسے موسیقی کی کسی محفل میں لے گیا۔ میں آئس کریم کے دو پیالے ہاتھ میں لے کر باغ کی سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ ایک پیالہ ڈاکٹر گار کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دُوسرا خود کھاتے ہوئے شانو کے اس سفر کا مقصد ڈاکٹر گار کے ذہن نشین کرایا اور کہا۔ "یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوتا نظر آتا ہے۔ ہرجائی سی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ آتے ہی کوئی واقف نکال لیا۔ اب اس سے محبّت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ بہرحال بڑی بات یہ ہے کہ زُلفی کو اس سے نجات مِل گئی۔"

ڈاکٹر گار نے کہانی سُن کر کہا۔ "بچاری زُلفی۔ اچھا کیا کہ اس چٹان کو تم نے اس کی راہ سے ہٹا دیا۔"

میں بولی۔ "میں نے تو ہنگامی طور پر ہٹایا ہے۔ مستقلاً ہٹانا آپ کا کام ہے اس کی شادی کرا دیجیے۔"

ڈاکٹر گار نے آئس کریم سے مُنہ بھر کر کہا۔ "کوئی ایسا مُشکل کام بھی نہیں۔ کوہ الماس ——— تم جانتی ہو۔ یہاں گرمیوں میں بیسیوں رشتے ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا رُوحی بیٹی۔ بیگم نجم کا ایک مہمان ہے۔ کنوارا اور خوبصورت۔ اس کے اعزاز میں آج دوپہر بیگم نجم نے ظہرانہ کر رکھا تھا۔ تمہارا بھی بلاوا تھا۔ مگر تمہارا جہاز کھانے کے وقت کے بہت بعد میں پہنچا۔ ہاں تو وہ نوجوان دیکھنے میں تو ہنس مکھ اور ملنسار ہے۔ خواتین اور لڑکیاں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ مجھے یقین ہے وہ بہت جلد کوہ الماس کی محفلوں کا چراغ بن جائے گا۔"

"تو ڈاکٹر اس سے شانو کی ملاقات کرا دیجیے نا ———" میں نے اپنی سیامی بلّی کو آئس کریم کھلاتے ہوئے کہا۔ اور پھر بولی۔ "اگر ہو سکے تو شادی۔۔۔۔۔"

پھر میں ذرا ہنس کر بولی۔ "چٹانیں یونہی ہٹتی ہیں۔"

"میں پوری کوشش کرونگا۔ اگر وہ نوجوان شریف اور معقول نکلا اور دونوں نے ایک دُوسرے کو پسند بھی کیا تو میں بیگم نجم سے کہہ کر ان کا رشتہ کرا دوں گا۔"

"بیگم نجم کو ایک تو اس قسم کی باتوں سے انتہائی دلچسپی ہے دُوسرے وہ اس سلسلے میں ماہرِ فن کی حیثیت رکھتی ہیں۔" میں نے دستی سے بلّی کا مُنہ پونچھتے ہوئے کہا۔

اس شب جب میں اپنی خوابگاہ میں گئی تو بے حد مطمئن تھی۔ کیوں نہ ہوتی ——— میں نے دوستی کا فرض ادا کر دیا تھا۔ مسکرا مسکرا کر سوچنے لگی زُلفی کس قدر احسان مند ہو گی۔ میں نے جہنم سے نکال کر اسے فردوسِ بریں کی راہ پر ڈال دیا ہے۔۔۔۔۔۔! واقعی دوست ہو تو مجھ سا ہو۔ میں دیر تک اپنے نیلگوں بستر پر لیٹی مسکراتی رہی۔

دُوسری صُبح جب میری آنکھ کُھلی تو دریچے سے بہار کے خنک جھونکے اندر آرہے اور مرے رُخساروں کو چھُو رہے تھے اور مرے بستر کی نیلگوں ریشمی چادر اُڑی جارہی تھی۔ قریب ہی شاہ بلوط کی شاخ پر ایک ابابیل بیٹھی صبح کا نغمہ الاپ رہی تھی۔

میں نے صندل کے پانی سے جلد جلد غسل کیا اور تیار ہو کر نیچے ناشتے کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ میز پر ڈاکٹر گار اور شانو پہلے سے موجود تھے اور قیمے کے گرم گرم سموسے کھا رہے اور کافی پی رہے تھے۔

زوناش حسب عادت بڑبڑاتی ہوئی ہاتھ میں فرنی ڈونگا لیے دروازے میں کھڑی تھی۔ اس صُبح اس نے ایک گہرے گُلابی رنگ کی پوشاک پہن رکھی تھی جو اس کے سیاہ رنگ کو زیادہ نمایاں کر رہی اور اسے خوفناک بنا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی "سلام خاتون روحی۔ آج بڑی دیر میں اُٹھیں آپ۔ میں نے آپ کے لیے تازہ اناس کا رس نکال کر اس میں برف ڈال دی تھی۔ پگھل نہ گئی ہو ——— توبہ توبہ اتنی دیر؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اکثر بوڑھی حبشن کی جلی کٹی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ اس لیے چُپ چاپ جا کر اپنی کُرسی پر بیٹھ گئی اور ناشتہ کرنے لگی۔

ڈاکٹر گار اور شانو بے حد خُوش نظر آرہے تھے اور باتیں کیے جارہے تھے۔ میں نے اناس کے رس کا ایک گھونٹ لے کر کہا "بتاؤ شانو۔ رات کی محفل موسیقی کیسی رہی؟ تم بہت دیر میں لوٹیں۔"

شانو نے ابھی جواب نہ دیا تھا کہ ڈاکٹر گار بول پڑا "روحی۔ عجب اتفاق ہے۔ رات کی محفل میں بیگم نجم کا وہ مہمان بھی شریک تھا جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔"

"ارے عجب اتّفاق ہے۔" میں نے حیران اور خوش ہو کر کہا۔

اس پر شانو بولی "مری بھی اس سے مُلاقات ہو چکی ہے رُوحی۔ بلا کا خوش مزاج ہے اور خاندانی آدمی ہے۔ آج اس نے مجھے اس وقت کافی پر مدعو کر رکھا ہے اور شام کو بیگم نجم کے ہاں برج پارٹی پر بھی وہ موجود ہوگا۔ تمھیں بھی چلنا ہوگا۔"

"مجھے تاش کے کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں شانو تم اور گار چلے جاؤ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر بولی "ہو سکا تو فرصت پا کر بعد میں آجاؤں گی۔"

اس کے فوراً ہی بعد شانو اُٹھ کر تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تو ڈاکٹر گار نے سگار سُلگاتے ہوئے آہستہ سے کہا "بیٹی روحی۔ یہ بھی عجب لڑکی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیگم نجم کے مہمان سے بے تکلّفی کے ایسے تعلقات بنا لیے ہیں گویا ایک دُوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔"

میں ہنس پڑی "تعلقات کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دُور نہیں کہ دو ہفتوں کے اندر اندر شادی بھی ہو جائے ——— کیوں ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر گار نسوار کی ڈبیا کھولتے ہوئے بولا "اسی کو تو کہتے ہیں چٹ منگنی پٹ بیاہ۔"

اور یہی ہوا ——— ! بیگم نجم کے ہاں کبھی رقص و موسیقی کی محفلیں ہوتیں، کبھی نصف شب کے ہنگامے

منعقد ہوتے۔ میں چونکہ اپنی کتاب ختم کر کے دم لینا چاہتی تھی اس لیے ان محفلوں میں شاذ ہی شریک ہوتی۔ میں نے بیگم نجم کے مہمان کو اب تک نہ دیکھا تھا۔

ایک شام بیگم نجم نے ٹیلی فون کر کے مجھے تنبیہہ کی "رُوحی۔ تم کوہ الماس تفریح و سکون کے لیے آئی ہو یا مصروف گھٹی کی زندگی بسر کرنے کے لیے؟ تف ہے تم پر۔ لوگ سال بھر کی تکان دُور کرنے یہاں آتے ہیں اور تم نے سال بھر کی محنت یہیں کرنے کی قسم کھائی ہے۔ آج رات تمھیں ڈاکٹر گار اور شانو کے ساتھ مرے ہاں کھانے پر شریک ہونا پڑے گا۔ ہاں — تاکید ہے۔"

اور انھوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

چنانچہ ہم تینوں رات کے کھانے پر بیگم نجم کے ہاں پہنچے میں بھی بے حد خوش تھی کیونکہ دونوں کی محنت کے بعد تفریح کا لطف آرہا تھا۔ بیگم نجم کی محفلوں کے ہنگامے کوہ الماس میں شہرت رکھتے تھے۔

اسی رات پہلی دفعہ مری ملاقات ان کے مہمان سے ہوئی اور واقعی وہ بہت دلکش نوجوان نکلا۔ مگر مجھے ایک بات کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو عموماً ہمیں بے یقینی کا پیام دیتی ہے۔ یعنی یہ نہیں معلوم ہونے پاتا کہ اس قسم کے لوگوں کا کردار کیا ہے۔

شانو نے مرا تعارف اس سے کروایا "رُوحی۔ یہ ہیں بیگم نجم کے مہمان ونگ کمانڈر وفائی"

"وفائی؟ ———" مری ہنسی نکل گئی۔ پھر شگفتہ لہجے میں بولی "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ کے نام میں پائداری کی خوشبو آتی ہے۔ وفا کرنا آدمی کی بہت بڑی صفت ہے۔"

ونگ کمانڈر وفائی ہنس پڑے، بولے "زندگی میں جہاں جہاں بھی وفا کرنے کے موقعے سر پر آپڑیں گے اس سے دریغ نہ کروں گا۔"

اور واقعی وہ بہت باتونی، دلچسپ اور خوش شکل شخص تھا۔

مجھے اور ڈاکٹر گار کو کچھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ مرحلہ خود بخود طے ہو گیا جب ایک شام شانو نے مجھ پر اس راز کا انکشاف کیا اور کہا "روحی پیاری، میں نے ونگ کمانڈر وفائی کی طبیعت اور مزاج کو اچھی طرح جانچ لیا ہے۔ تمھیں یہ سُن کر متحیر نہیں ہونا چاہیے بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ ہم اسی ہفتے شادی کر لینا چاہتے ہیں۔ میں نے تار دے کر اپنی خالہ سے اجازت منگوائی ہے۔"

شادی اس کی ہو رہی تھی اور خوش میں تھی۔ بار بار خیال آتا تھا زُلفی کس قدر خوش ہو گی اپنی راہ سے اس چٹان کے ہٹ جانے سے۔

سوچ سوچ کر اسی دوپہر میں نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے زُلفی کو ایک تار دیا اور لکھا "چٹان سر کنے

لگی ہے۔ خوش ہو جاؤ۔

دُوسرے ہفتے کوہ الماس کے شاندار ہوٹل " اشڈ ورک " میں شانو کی شادی ونگ کمانڈر وفائی سے ہو گئی۔ شادی میں کوہ الماس کے سبھی معیاری لوگ شریک تھے اور بڑے ہنگامے کی شادی تھی اور کیوں نہ ہوتی، دُولہا دُولہن کوہ الماس کی ہنگامہ خیز اعلیٰ محفلوں کے دو روشن چراغ تھے۔

اُدھر میں شادی کی دعوت کھا کر باہر نکلی اُدھر تار گھر جا کر زُلفی کو دُوسرا تار دیا۔" چٹان ہمیشہ کے لیے ہٹ گئی ہے تم ذرا پہنچو۔ رُوحی۔"

تار دے کر میں ایک فخر کا احساس لیے ہوئے گھر واپس آئی اور مُسکراتے ہوئے زُلفی کے لیے اُوپر کی منزل میں ایک کمرہ ٹھیک کرنے لگی۔

دُوسرے دن میں نے دُولہا دُلہن کے لیے کھانا کر رکھا تھا اور سارے زندہ دلانِ الماس کو مدعو کیا تھا اور اسی دن زُلفی پہنچنے والی تھی۔

میں تمام دن دعوت کے انتظام میں مصروف رہی مگر مسلسل مسکراتی رہی۔ سوچتی رہی میں نے زُلفی کی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ کس قدر خوش ہو گی۔

میں نے ضیافت کا انتظام عرشۂ چمن پر کیا تھا۔ کیونکہ گرم بہاروں کا زمانہ تھا اور صحرائی پرند رات بھر باغ میں نغمہ سنج رہتے تھے۔ میں اور ڈاکٹر گار تیار ہو کر مہمانوں کی پیشوائی کے لیے باغ کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ آٹھ بجے مہمان آنے شروع ہوئے۔ عشقیہ موسیقی کی تانیں اور تازہ پھُولوں کی لپٹیں فضا میں رقصاں تھیں۔ کہیں قہقہے سُنائی دے رہے تھے، کہیں لطیفے، ڈاکٹر گار اپنی شب طعامی کے سیاہ کوٹ کی کاج میں گہرے سُرخ رنگ کے گلاب کی ایک ننّھی سی دہکتی ہوئی کلی لگائے بڑے ٹھاٹھ سے انتظام میں مصروف تھا۔ میں بھی اپنے گلابی ریشم کے بھاری جوڑے میں کبھی نوکروں کو ہدایات دیتی ہوئی، کبھی مہمانوں سے ہنسی مذاق کرتی ہوئی ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھی۔ دُولہا دُلہن عروسی لباس میں ملبوس ہاتھوں میں سُرخ انگوروں کے رس کا جام تھامے مہمانوں کے درمیان محوِ گفتگو تھے۔

سارے مہمان آ چکے تھے، اب صرف زُلفی کا انتظار تھا۔ آج شاید جہاز دیر میں پہونچ رہا ہے کئی مہمانوں نے قیاس آرائی کی۔

اتنے میں برساتی میں ایک کار آکر رُکی۔ میں اپنے گلابی ریشم کے لباس کے دامن سنبھالتی ہوئی زُلفی کی پیشوائی کو برساتی میں بھاگی۔

وہ بھی بنی ٹھنی بہار کی تیتری کی طرح کار سے اُتر پڑی اور اُترتے ہی مجھ سے چمٹ گئی اور سرگوشی کی۔" مری جان رُوحی، کیسے شکریہ ادا کروں تمھارا؟ تم نے مری راہِ حیات سے مصائب کی چٹان ہٹادی۔!"

میں اس کے گلے میں ہاتھ ڈالے مہمانوں میں سے آئی اور بولی" زُلفی پیاری۔ سب سے پہلے تم دُولھا دُلھن سے ملو اور انھیں مُبارک باد دو۔ دُولہا یہ ہیں ونگ کمانڈر وفائی" (پھر زور سے ہنس کر بولی) " جن کی گھٹی میں وفا پڑی ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ زُلفی دُولہا کے چہرے کو شُعلہ بار نظروں سے تک رہی تھی پھر اس نے چلاّ کر کہا" ہائے روحی۔ یہ وہی ہے۔!"

اب مجھے علم ہوا اور اب میں اس ستم انگیز حقیقت سے آگاہ ہوئی کہ چٹان ہٹی نہیں تھی بلکہ ہمیشہ کے لیے حائل ہو گئی تھی ——!"

"پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔"

بڑا تعجب

ڈاکٹر احسن فاروقی

مجھے خود بڑا تعجب ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سب کچھ خواب میں ہو گیا۔ مگر سب کچھ حقیقت ہے ہاں سب بالکل حقیقت ہے۔ دو بچے ہو چکے تیسرا پیٹ میں ہے۔ میں اب سترسٹھ ۶۷ برس کا ہو جاؤں گا اور وہ کوئی سولہ ۱۶ کی ہو گی۔ مگر یہ سب کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ بعض وقت سوچتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کہیں سو تو نہیں رہا ہوں۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ سب چیزیں حقیقت ہیں۔ میری پہلی بیوی کے بچے — اور اُن کے بچے — یہ گھر وہی ہے جس میں ہمیشہ رہا۔ یہیں سے سب بچوں کی شادیاں ہوئیں۔ یہیں سے پہلی بیوی کا مُردہ اُٹھا اور یہیں وہ خواب کا عالم طاری ہوا جو اب تک جاری ہے۔ وہ میری سب سے چھوٹی سالی کی سب سے چھوٹی لڑکی ہے! بڑے تعجب کی بات۔ وہ میرے بڑے لڑکے کی بڑی لڑکی سے چھوٹی ہے۔ مگر وہ میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ بڑی خوش ہے۔ دھڑا دھڑ بچے ہو رہے ہیں کوئی سال خالی نہیں گیا ہے۔ کیا میری سچ مچ اس سے شادی ہو گئی ہے۔ کیا میرے ہی بچے ہیں؟ کیا میں زندہ ہوں یا کسی اور دُنیا میں ہوں۔ کیا میں سو رہا ہوں اور جب جاگوں گا تو یہ سب خواب کی طرح بے حقیقت نظر آئے گا؟

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

ہاں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ساری زندگی خواب تھی جو اس تعجب خیز خواب کی طرف آ رہی تھی۔ اس کی ماں کوئی پانچ یا سات برس کی ہو گی جب میری شادی ہوئی۔ وہ مانجھے کر آئی تھی۔ گوری گوری گول مُنہ کی لڑکی کارچوبی کپڑوں میں دبی جا رہی تھی۔ اس نے چھوٹے سے ہاتھ سے میرے اُبٹن لگائی اور شرما گئی۔ میری بیوی سے کوئی بارہ تیرا برس چھوٹی بتائی جاتی تھی۔ مجھ سے کوئی پندرہ برس چھوٹی ضرور ہو گی۔ مانجھے کے دن لوگوں نے کہا کہ یہ نمونے کی لڑکی ہے اور بیوی مرحومہ سے وہ بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ شادی کے بعد وہ برابر اپنی بہن کے پاس آتی رہی۔ بہن کے بچوں کو کھلاتی رہی۔ جب بہن زچہ خانے میں ہوتیں یا بیمار ہوتیں تو سارا گھر سنبھال لیتی۔ میری ساس مرحومہ کہا کرتی تھیں "بڑا بہنوئی باپ کی جگہ پر ہوتا ہے" اور میں نے ہمیشہ اپنے کو اس کے باپ کی جگہ سمجھا۔ ایک دن اس کو گھر پہنچانے جا رہا تھا۔ وہ برقعہ اوڑھے پیچھے پیچھے تھی میں آگے آگے۔ میرا ایک دوست گرسرن تھا راستے میں ملا۔ بولا "بھابی ہے ساتھ؟" میں نے کہا "نہیں اس کی بہن ہے"۔ کہنے لگا "میاں یہ سالی بازی ٹھیک نہیں"۔ میں نے ڈانٹ دیا۔ "کیا بکتا ہے" اور وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ خیر میں نے اسے ہمیشہ لڑکی ہی سمجھا۔ اس کی شادی کی، اس کے بچے ہوتے رہے۔ میرے بچے اس کے بچے سب بڑھتے رہے۔ ساتھ کھیلتے رہے۔ قرنوں کی باتیں ہیں۔ پوری پوری زندگیوں کے حال ہیں، ایک بات ہو تو کوئی کہے۔ داستان کی داستان ہے مگر اس داستان کا یہ رُخ بدلنا۔ اُف، اُف کیسا عجیب

کیسا تعجّب انگیز، بڑا تعجّب ہے۔

خیر میرے چھوٹوں بچّوں کی شادیاں ہوئیں۔ بیوی بھی مرحوم ہوگئی۔ اس کے بھی چار بچّوں کی شادیاں ہوئیں۔ وہ بھی مرگئی۔ ایک یہ لڑکی کوئی چھ برس کی چھوڑ گئی۔ اس کا باپ بھی عزیز ہی ہوتا ہے اور وہ بھی ٹھیک ہی آدمی تھا۔ سال بھر تک وہ اسی لڑکی ہی کی دیکھ بھال کرتا رہا مگر ایک دن معلوم ہوا کہ اس نے ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ میں جو کبھی کبھی وہاں چلا جاتا تھا وہ بند ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ میری عزیز داری تو کسی سے تھی ہی نہیں۔ سالی کے بچّے تھے۔ مجھے خالو کہتے تھے۔ ہم زلف تھے بھائی کہتے تھے۔ وہ لائے نئی نویلی لڑکی تو مجھ سے پردہ کرانا لازمی تھا، رہی ان کی لڑکی تو مجھ سے مانوس ہوگئی تھی۔ میرے سب بچّے اپنے اپنے ٹھکانے تھے۔ ان کے بھی۔ بس یہ آٹھ برس کی لڑکی رہ گئی تھی۔ یہ اپنے بھائی بہنوں کے یہاں بھی کبھی کبھی چلی جاتی مگر اسے رہنا تھا اپنی سوتیلی ماں ہی کے پاس۔ میں نے دیکھا کہ سوتیلی ماں اس پر زبردستیاں کرنے لگی، وہ میرے پاس آجاتی اور رو رو کے بیان کرتی۔ میں نے اس کے باپ سے کہا کہ اسے پڑھواؤ۔ وہ ٹال گئے۔ میں نے کہا خرچہ میں دوں گا تو راضی ہوگئے۔ میں نے لے جا کے اسکول میں نام لکھوا اور سب خرچ پڑھائی کے دیتا رہا۔ وہ اسکول سے زیادہ تر ادھر ہی آجاتی۔ میرے گھر کو اپنا گھر سمجھتی۔ گھر کے کام کرنے لگتی۔ اکثر یہیں رہ جاتی۔ مگر پھر بھی غیر کی بچی تھی۔ باپ کے گھر ہی میں رہنا تھا اسے۔

چار برس یوں ہی کٹ گئے۔ پڑھنے میں وہ زیادہ اچھّی نہ نکلی بہرحال ساتویں درجہ میں آگئی۔ جوان ہو رہی تھی اور اب اس میں تعجب انگیز تبدیلیاں ہونے لگیں۔ پہلے پہلے کوئی تعجّب کی بات نہ تھی۔ جوان ہوتے ہی سب لڑکیاں اپنے تئیں سجانے بنانے لگتی ہیں کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ مگر وہ مجھ سے ایک خاص طریقہ پر شرمانے لگی۔ یہ شرماہٹ عجیب تھی۔ مجھ سے شرمانا۔ اس کی ماں کبھی نہیں شرمائی اس طرح مگر اس کے شرمانے میں ایک عجیب معشوقانہ ادا تھی جس پر مجھے تعجّب ہوتا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے اور پھر میرے دل میں عجیب گدگدی ہوتی تھی۔ مرد کو عورت کی طرف توجّہ ہوتی ہی ہے اور میں عورتوں کو دیکھ کر آنکھیں تو بند نہیں کر لیا کرتا تھا مگر کم سن لڑکیوں کو میں اپنی لڑکیوں کی طرح سمجھنے کا قائل تھا۔ جوان عورتوں میں کبھی کوئی بہت اچھّی ہوئی تو آنکھ بھر کے دیکھ لیا۔ اس سے زیادہ کبھی سروکار نہ ہوا۔ بیوی کو مرے ہوئے کوئی پندرہ برس تو ہوگئے ہوں گے۔ کبھی دوسری کرنے کا خیال بھی نہ ہوا۔ ساٹھ سے اوپر کا سن بھی آگیا تھا۔ بچّوں کے بچّے ہو رہے تھے۔ کبھی اگر بھولے بھٹکے خواہش بھی ہوتی تو یہی کہتا کہ اب بڑھاپے میں کیا ٹھڈھ بھس لگے گی مگر اس کا خاص طریقہ پر شرمانا اور میرے دل میں خاص قسم کی گدگدی ہونا بڑی تعجب انگیز باتیں تھیں۔ میں اکیلا تھا۔ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اکثر سوچا کرتا یہ کیا ہو رہا ہے اور بڑا تعجّب ہوتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اے میرے اللہ یہ کیا ہونے والا ہے۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کی ماں یہ چاہتی ہے کہ اس کا سارا بار مجھ پر پڑ جائے۔ پڑھائی لکھائی کے خرچوں کے علاوہ جوان ہوتی ہوئی لڑکی کو کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے اور سنگھار کی چیزوں کی بھی۔ وہ سب کچھ مجھ سے مانگنے لگی۔ مجھے ساتھ لے کر بازار جاتی اور یہ لے دیجیے اور وہ لے دیجیے، ہر قسم کا سامان لے آتی۔ سوتیلی ماں کے پاس یہ سب سامان لے جانے کو برا سمجھتی۔ میرے ہی گھر رکھ جاتی۔ صبح ہی آتی ناشتہ تیار کرتی، سنگھار کرتی رہتی اور یہیں سے اسکول جاتی۔ میں اپنے اس باہر کے حصّے میں بیٹھا رہتا۔

کبھی کوئی یار دوست آ گئے اُن سے باتیں کرنے لگا۔ کبھی اُٹھ کر کسی کے یہاں چلا گیا پھر آ گیا۔ کبھی کوئی کتاب وتاب پڑھنے لگا۔ جب نیند آتی سو جاتا۔ اندر کے گھر کا سارا کام ایک بڑھیا کے سپرد تھا۔ اپنے گھر کی پرانی لونڈی تھی وہ رینگ رینگ کر سب کام کرتی اور کام بھی کیا تھا۔ میرا کھانا پینا اور حقہ بھر کر یہاں رکھ جاتا۔ سارا گھر خالی ہی تھا۔ بڑھیا ایک کونے میں پڑی کھانستی رہتی وقت پر اُٹھ کر کام کرتی پھر پڑ رہتی۔ میں بھی اپنے ادھر باہر پڑا ہی رہتا۔ مجھے کوئی کام ہی نہیں تھا دُنیا کا۔

مگر کچھ دنوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اس لڑکی نے میرے گھر کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اپنی ساتھنوں کو اسکول سے یہیں لاتی اس کی ہمسن لڑکیاں میرے سامنے سے گزرتی ہوئی اندر جاتیں پھر کچھ دیر کے بعد نکل کر واپس جاتیں۔ میرے بچے سب اور شہروں میں ملازم ہیں۔ ان میں سے کوئی بال بچوں سمیت آجاتا تو وہ اپنے باپ کے گھر نہ جاتی، ان کی مہمان داری بالکل اسی طرح کرتی جیسے اس کی خالہ مرحومہ کیا کرتی تھی۔ آخر وہ سب اُس کے خالہ زاد بھائی بہن تھے ہی۔ جب وہ لوگ چلے جاتے تو وہ بھی اپنے باپ کے گھر چلی جاتی مگر روز صبح آنا، یہیں تیار ہونا، یہیں سے اسکول جانا اس کا ورد ہو گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ سوتیلی ماں اس کی کنگھی چوٹی سے بھنّاتی تھی۔ گھر کا کام کرانا چاہتی تھی، بچے کھلوانا چاہتی تھی مگر پھر بھی سیدھی نگاہ دیکھنے کو تیار نہ تھی۔ باپ نویلی بیوی میں ایسے محو ہوئے کہ اس بیسر لڑکی کو بھول ہی گئے تھے۔ یہ تو کہیے کہ میں نے پڑھنے میں لگوا دیا تھا نہیں تو نہ معلوم اس کا کیا حال ہوتا۔

خیر جب وہ سکول جانے لگتی تو یہاں ایک لمحہ کے لیے ضرور رُکتی۔ میرے سامنے نقاب اُلٹ کر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی کہتی آج چار آنے کی ضرورت ہے کبھی آٹھ آنے کی۔ میں نکال کر دے دیتا۔ میں دیکھتا کہ اس کے بال نہایت عمدہ طریقہ پر سجے ہوتے۔ مُنہ پر سفید اور سُرخ پوڈر مناسب طریقہ پر لگا ہوتا۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سُرخی لگی ہوتی مگر اس کا مجھے دیکھنے کا انداز عجیب ہوتا۔ نگاہ میں عجیب شرماہٹ کے ساتھ ساتھ ڈھیٹ پن بھی نظر آتا۔ عجیب مشاہدہ تھا۔ بیان کرنا مشکل ہے۔ دن دن بھر سوچا کرتا کہ یہ دکھائی کیسی ہے۔ اللہ میں نے تو کبھی کسی عورت کو اس طرح دیکھتے نہیں دیکھا۔ آخر اس لڑکی کے دل میں کیا ہے اور پھر بڑے تعجب کے ساتھ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ یہ پُراسرار دکھائی میرے دل میں بھی عجیب کیفیات جگا رہی تھی۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے مُڑ مُڑ کر دیکھتی ہوئی باہر کے دروازے تک جاتی پھر برقع کی نقاب چہرے پر ڈالتی اور غائب ہو جاتی۔

میرا عجیب عالم رہنے لگا۔ اس کی صُورت آنکھوں کے سامنے کھیلتی۔ مجھے کبھی پہلے کسی لڑکی کی طرف اس طرح توجّہ نہیں ہوئی تھی۔ نگاہ ضرور لڑی تھی مگر جوان ہوتے ہی شادی ہو گئی تھی۔ پھر بیوی ہی میں محو ہو گیا۔ بال بچوں میں پڑ گیا۔ لڑکیاں بڑی ہوئیں اگر کسی جوان لڑکی پر نگاہ پڑ بھی گئی تو یہ محسوس ہوا کہ میری بہو بیٹیوں کی طرح کی ہے۔ مگر یہ لڑکی تو میرے سر پر سوار ہوئی جا رہی تھی۔ لاکھ کوشش کرتا، دھیان ہٹاتا اور کاموں میں دل لگاتا مگر جب دیکھو اس کا چہرہ اور اس کی مخصوص دکھائی آنکھوں کے سامنے۔ اس کی خالہ اور ماں دونوں گوری تھیں مگر اس کا باپ سانولا تھا اس لیے اس کی رنگت چمپئی سی تھی۔ پوڈر سے اور بھی کھل جاتی تھی۔ یہ رنگت عجیب طرح دل میں کھُبنے لگی۔ میں نے کبھی پہلے کسی عورت کی رنگت پر غور نہیں کیا تھا۔ مگر یہ رنگت گھنٹوں توجّہ کا مرکز رہتی سوچنے لگتی کہ ایسا دلکش رنگت نہ کبھی دیکھی نہ سُنی۔ یہ حُسن کا کیا کرشمہ ہے۔ یہ کیا جادو ہے۔ پھر چونکتا اور کہتا کہ مجھے یہ کیا ہوا جا رہا ہے۔ میرے خیالات کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔ جی چاہتا کہ اپنا حال کسی سے کہوں۔ میرے ساتھ بیٹھنے والوں میں میرے ہم سن

ہی لوگ تھے مگر ان سے ذکر کرنے میں عجیب سبکی محسوس ہوتی ۔ میرے ایک ہم سن نے جوان لڑکی سے شادی کر لی تھی ۔ میں نے ان کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا " خوب بڑھ بھس لگی ہے ۔" اب لوگ یہی بات میری بابت بھی کہیں گے اور پھر سالی کی چھوٹی لڑکی ۔ ارے نواسی پوتی کے برابر ۔ مجھ کو باپ نہیں نانا سمجھتی ہوگی اور میں اس عالم میں ۔ بڑا تعجب ہوتا ۔ میں اپنے تئیں سنبھالتا ۔ نہیں میں جلد سے جلد اس کی کہیں شادی کرا دوں گا ۔ مگر نہیں ۔ محسوس ہوتا کہ جیسے میں اپنے دل کو نکال کر پھینک دینے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ دوسرے کے ساتھ اس کی شادی کے خیال سے عجیب رقابت محسوس ہوتی ۔ میں دن بھر اپنے جذبات سے لڑا کرتا ۔ سہ پہر کو وہ پھر آ جاتی اور پھر اپنی خاص ادا سے دیکھتی اور پھر سب کاٹے ہوئے جذبات اُبھر آتے ۔ وہ تھوڑی دیر اندر آرام کر کے اپنے باپ کے گھر چلی جاتی ۔ جاتے وقت پھر اپنی مخصوص اداؤں سے مجھے دیکھتی جاتی اور یہ ادائیں رات بھر کی کشمکش کا سامان پھر مہیّا کر جاتیں ۔

کبھی کبھی میں یہ بھی قیاس کرنے لگتا کہ اس کے دِل کا کیا عالم ہوگا ۔ اس کی میری طرف اس طرح توجہ پر مجھے بڑا تعجب تھا ۔ اس کی دکھائی عجیب و غریب تھی ۔ مجھے یاد آتا کہ میری مرحومہ بیوی جوانی میں سنگھار و نکھار کر کے ایسی ہی اداؤں سے مجھے دیکھا کرتی تھیں اور ان کی ان اداؤں پر جیسے میرا دل لوٹنے لگتا تھا کچھ ویسی ہی کیفیت اب بھی دِل میں محسوس ہوتی تھی ۔ مجھے تعجب ہوتا کہ یہ تیرا۱۳ چودہ۱۴ برس کی لڑکی مجھ ساٹھ۶۰ پینسٹھ برس کے بڈھے کو ایسی لُبھاؤنی نگاہوں سے کیوں دیکھے ۔ اس کے دل میں کیا ہے ؟ ہزاروں اس کے ہم سن اس سے کچھ بڑے جوان دُنیا میں پھر رہے ہیں ۔ اسکول آتے جاتے ہیں ۔ سہیلی ساتھنوں کے گھروں میں آتے جاتے دکھائی دیتے ہوں گے ۔ برقع کی نقاب تو ایک رسمی سی چیز ہو گئی ہے ۔ اعتراض کرنے والوں کو آتا دیکھ کر ڈال لی جاتی ہے ۔ آتے جاتے اس کا چہرہ کھلا ہی رہتا ہوگا اور ہزاروں نگاہیں اُس پر پڑتی ہوں گی ۔ آنکھ ناک کی بہت اچّھی نہ سہی مگر ایسی بُری بھی نہیں ہے ۔ لاکھوں دلوں کو لُبھا لینے کے لیے تو صُورت کافی اچّھی ہے اور پھر کھلتی ہوئی کلی ہے اس کی طرف کسی کی نگاہ نہ اُٹھ جاتی ہوگی ۔ باپ کو کوئی پرواہ نہیں ۔ سوتیلی ماں چاہتی ہے کل کی جاتی آج جائے ۔ اگر کسی کے ساتھ بھاگ جائے تو وہ لوگ اور بھی خوش ہوں کہ عذاب کٹا ۔ مگر یہ مجھ بڈھے سڑے ہوئے پھونس کو کیوں لبھا رہی ہے ۔ کیا سچ مچ لبھا رہی ہے یا میرا قیاس ہے ۔ محض وہم ہے ۔ میں اور غور سے اس کی دکھائی اور اس کی اداؤں کا مطالعہ کرتا گیا اور مجھے زیادہ سے زیادہ تعجب ہوتا گیا ۔ اس لڑکی کے اندر کوئی عجیب و غریب ارداح تھی اور یہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی ۔ مجھے گھسیٹ لینا چاہتی تھی ۔ میں باوجود اپنے بڑھاپے ، اپنی کمزوری ، اپنے تجربے کے اس کی طرف کھنچا جاتا تھا ۔ صاف یہ محسوس ہوتا کہ یہ مجھ سے وُہی کچھ چاہتی تھی جو اس کی مرحومہ خالہ جوانی میں سنگھار کرنے کے بعد چاہا کرتی تھی ۔ اس کی ماں نے ایسا کچھ کبھی نہیں چاہا ۔ یہ عجیب لڑکی ہے ۔ شاید یہ سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہوں مگر اس قسم کی توجہ اپنے ہم عُمروں سے کرتی ہوں گی ۔ نانا دادا کے برابر بڈھوں کی طرف سے یہ خیال عجیب چیز تھی ۔ مجھے بڑا ہی تعجب ہوتا ۔

ساتھ ساتھ مجھے یہ محسوس کر کے بڑا تعجب ہوتا کہ میں اب تک جوان ہوا ہی نہیں اور اب جوان ہو رہا ہُوں ۔ عرصے سے دُنیا کچھ بجھی بجھی سی معلوم ہونے لگی تھی مگر اب پھر نئے طریقے سے زندہ نظر آئی ۔ میں قریب قریب ترک کے درجہ پر

پہونچ چکا تھا۔ مگر اب بازار میں جانا اور خلقِ خدا پر نظر دوڑانا اچھا معلوم ہونے لگا تھا۔ دریا کے کنارے لہروں کا لطف لینا، باغوں میں پیڑوں کے نیچے لیٹ جانا اچھا لگتا۔ حافظ کا یہ شعر یاد آتا اور میں اس پر سر دھنتا۔

رونقِ عہدِ شباب است دگر بستان را می رسد مژدہ گل بلبل خوش الحان را

جوانی میں کچھ شاعری سے بھی شوق ہوا تھا۔ استاد آرزو کے سامنے زانوئے تلمذ بھی طے کیا تھا مگر پھر گھر کے دھندھوں میں پڑ کر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک پُرانے بکس میں جس پر پانچ انچ دھول جم گئی کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے ان میں پرانی بیاض بھی یاد آئی اس کو نکالا اور شعر کہنے لگا۔ اب مجھے اس لڑکی سے کچھ شرم سی آنے لگی جب وہ سامنے آتی اور اپنی خاص ادا سے مجھے دیکھتی تو محسوس ہوتا کہ جیسے وہ بالکل عُریاں ہو کر سامنے آگئی اور لاشعوری طور پر میری نگاہیں جھک جاتیں۔ میرا مُنہ پھر جاتا۔ اس پر بھی بڑا تعجب ہوتا۔ عجیب جذباتی کشمکش۔ معلوم ہوتا کہ قرنوں کا دفن کیا ہوا مُردہ زندہ ہو رہا ہے مگر اس کا گلا ہوا جسم اسے اٹھنے نہیں دیتا۔ کہہ نہیں سکتا کہ کوئی شیطان میرے اندر سما رہا تھا یا پھر یہ قدرت کا کوئی کرشمہ تھا۔ کوئی ناجائز بات تو نہ تھی۔ شاید جس چیز کو بڑھ بھس کہا جاتا ہے وہ یہی ہو۔ یہ بھی کوئی بیماری ہے۔ کسی سے دریافت کرنا چاہیے مگر کسی سے کہنے کے خیال سے بڑی شرم آتی۔ کیا کہے گا کوئی۔ کیا کیا ہنسی نہ اڑے گی۔ ارے یہ مجھے ہو کیا گیا ہے؟ اور اس سب کو سوچ کر میں بڑے تعجّب کے عالم میں آجاتا۔

اس سال اُس کے اسکول میں گرمیوں کی چھٹی ہوئی تو وہ دن دن بھر میرے گھر میں ہی رہنے لگی۔ میں اندر کے حصّہ میں برسوں سے نہ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس عالم میں ہے۔ ایک دن نہ معلوم کیا ہوا کہ اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ وہ اسی تخت پر بالکل اسی طرح بیٹھی ہے جیسے اس کی خالہ بیٹھی رہتی تھی۔ گھر ہر طرح صاف شفّاف سجا سجایا تھا۔ تمام چیزیں باقاعدہ رکھی تھیں۔ بڑھیا باورچی خانے کی کوٹھڑی میں پڑی کھانس رہی تھی۔

اُس نے اپنی کشیدہ کاری سے نگاہ اُٹھا کر مجھے اسی طرح دیکھا جیسے کہ میری مرحومہ بیوی دیکھا کرتی تھیں اور پُوچھا "آپ کھانا کھائیں گے۔ میں نے تیار کر لیا ہے۔ بڑھیا کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ آپ کہیں تو کھانا لاؤں۔"

میں نگاہیں جھکائے ہوئے ایک آدھ دُزدیدہ نگاہ اس کے چہرہ پر ڈالتا ہوا سُنتا رہا اور "ہاں بھوک تو لگی ہے" کہہ کر چوروں کی طرح واپس آگیا۔ یہ بھی میرے لیے ایک تعجب کا عالم تھا۔ وہ میرا گھر سنبھالے ہوئے تھی اور خوش تھی۔ اس نے میری بیوی کی جگہ شوق سے لے لی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کیا ہونے والا تھا۔ مجھے اس پر بڑا تعجب تھا۔

وہ میرے لیے سینی میں کھانا لگا کر لائی۔ میں کھانا کھاتا رہا وہ سامنے بیٹھی ایک رسالہ پڑھتی رہی۔ کھانا بڑھالے گئی حُقّہ لگا گئی۔ میں لیٹا حقّہ پیتا رہا۔ مگر میرا عجیب عالم تھا۔ میرے اندر عجیب جذبات کا غلبہ تھا۔ عجیب خوف طاری ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوں نیچے بڑی گہری وادی ہے اور میں گرنے ہی والا ہوں۔ اس دن وہ کئی کئی دفعہ اندر سے باہر آکر اُدھر سامنے بیٹھی اور رسالہ پڑھتی گئی۔ میرا ہول بڑھتا گیا۔ میں نے سوچا کہ میں کسی لڑکے کے یہاں چلا جاؤں بلکہ ایک نے پیچھے سے دُوسرے کے یہاں ہوتا پھروں۔ دس دس پانچ پانچ دن ہر ایک کے یہاں رہوں جب تک یہ اسکول بند رہیں۔ پھر دیکھا جائے گا اور میں نے اُس سے کہا بھی: "میں سوچتا ہوں تمھارے بھائی بہنوں کو دیکھ آؤں۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" وہ بولی۔
"تم یہاں اس گھر میں رہنا۔"
"یہاں اکیلے میں مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ بڑھیا بھی اپنے گھر جانے کو کہتی ہے۔ اب کہتی ہے وہ لڑکے کے پاس رہے گی۔ اب اُس سے کام نہیں ہوتا۔"
"نہیں وہ ٹھہری رہے گی۔ میں اس کے لڑکے کو بلا دوں گا۔ وہ بھی یہیں ٹھہر جائے گا۔"
"مگر مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ کسی رات مرگئی اور بھتنی بن کر میرے سر پر سوار ہو گئی تو؟"
مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ وہ مجھے بُری طرح جکڑے ہے اور میں اس سے الگ نہ ہو پاؤں گا۔ میں نے کہا "خیر سفر تکلیف دہ ہی ہوتا ہے اور آج کل گرمی میں۔ نہیں نہ جاؤں گا۔"
اب وہ روز میری اسی طرح خدمت کرتی رہی۔ میرا خوف کم ہوتا گیا۔ وہ بھی اور زیادہ نڈری سے میرے قریب آتی گئی۔ اس کے چہرہ کا عالم عجیب سے عجیب تر ہوتا گیا۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ کیا عالم تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ بھوکی ہے مگر غیرت کے مارے کہہ نہیں سکتی۔ اِدھر میرے خیالات میں بھی عجیب عجیب تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ میں نے یہ طے کرلیا کہ رات کو بھی وہ یہیں رہا کرے۔
"مگر اتنے بڑے گھر میں اکیلے مجھے ڈر لگتا ہے۔ ابا کے یہاں دوسرا ہٹ تو ہے۔ رات بھر خود ابا کی آہٹ رہتی ہے۔ بانو کی گھسر پھسر سُنائی دیتی ہے اور بچوں کے رونے کی آوازیں آجاتی ہیں۔ دن میں وہاں وہ چھوٹی اماں کھائے جاتی ہیں۔ اس لیے میں ان سے الگ ہو جاتی ہوں۔ رات میں جاکر پڑ رہتی ہوں۔"
یہ سب اُس نے عجیب حسرت سے کہا۔ صاف معلوم ہوا کہ جیسے وہ بالکل میرے پاس رہنا چاہتی ہے۔ میں کہتا کہ میں بھی اندر رہا کروں گا مگر مجھے اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونے سے بڑا ہی خطرہ محسوس ہوا جیسے کہ میں پہاڑی کی چوٹی سے کھڈ میں پھاند جاؤں گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں گا۔
ایسے ہی نہ معلوم کیا کیا ہوتا رہا۔ میں سب سوچ سوچ کر تعجب میں آجاتا ہوں اور تمام واقعات بھول جاتا ہوں ان کی ترتیب بھول جاتا ہوں۔ کبھی کچھ یاد آتا ہے کبھی کچھ۔ سب بڑا ہی گڑبڑ سڑبڑ ہے۔ بالکل خواب کی طرح بے ربط اور نہایت تعجب انگیز۔۔۔۔
ہاں سب سے زیادہ تعجب انگیز واقعہ۔ بس کیا کہوں۔ کیسے بیان کروں۔ حلق خشک ہوا جاتا ہے۔ دماغ چکراتا ہے۔ ہنسی بھی آجاتی ہے کہ یہ سب کتنا مضحک تھا۔ مگر یہ سب ہوا۔ خیر ایک رات میرے یہاں سے یہ گھر گئی اور پھر واپس آگئی اور کہنے لگی "گھر میں قفل لگا ہے۔ وہ لوگ سینما گئے"۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد بولی "آپ مجھے بھی سینما لے چلیے۔" میری اس کے میرے ساتھ اکیلے ہونے سے پریشانی بڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو سینما میں وقت کٹ جائے گا۔ میں جلدی سے تیار ہو کر اس کے ساتھ سینما گیا۔ بھئی۔ یہ سینما بڑی ہی اشتعال انگیز چیز ہے۔ بڑا ہی عجیب اثر رکھتی ہے۔ عاشقی معشوقی کے قصے۔ جوان حسین لڑکیاں ناچتی تھرکتی دماغ خراب کر دیتی ہیں۔ اب میں بڈھا ہو کر کیا کہوں کہ اس فلم نے مجھے مست

کردیا۔ اور اس کے اُوپر بھی جو اثر ہوا ہو گا وہ وُہی جانے۔ آخر وہ جوان تھی۔ بھُوکی تھی۔ بخیر جو بھی ہُوا ہو۔ اس رات کو یاد کر کے میں بڑے ہی تعجب میں آجاتا ہوں......... معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں بے بس تھے۔ کوئی عجیب طاقت سیلاب کی طرح ہم کو بہائے لیے جا رہی ہے۔ ہم دونوں بہہ گئے.........

صبح کو میری آنکھ کھُلی تو محسوس ہوا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ پاس ہی پلنگ پر سو رہی تھی۔ خواب کیسے تھا، سب حقیقت تھی۔ کئی دن تک اس خواب نما حقیقت کا عالم طاری رہا۔ ہم دونوں خواب ہی کی دُنیا سے گزرتے رہے۔ وہ اپنے باپ کے گھر گئی ہی نہیں اور نہ وہاں سے کوئی پُوچھنے آیا۔

چند تھے دن میں یہاں باہر بیٹھا تھا۔ بُرقع اوڑھے ایک عورت اندر آگئی اور ایسے زور زور سے باتیں کرنے لگی کہ مجھے صاف صاف سُنائی دے رہی تھیں۔

"ہاں وہ کہتی ہیں خالو ہے تو کیا ہوا۔ کوئی ناجائز تو نہیں ہے۔ اور بُڈھے کو کہو تو کیا سب کو جوان ہی تو مل جاتے ہیں جیسے یہ آوارہ گردی کب تک، نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی سوتیلی ماں کی رائے ہے جو یہ نوکرانی شاید یا کوئی محلّے والی کہنے کو بھیجی گئی ہے۔ بہر حال میرے اس کے ساتھ نکاح میں کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ باپ بالکل راضی تھے۔ نکاح ہو گیا۔ اس کے بھائی بہن اور میرے بچّے تعجب کر کے رہ گئے۔

اس نے پڑھنا بھی جاری رکھا۔ انٹرنس پاس کر لیا ہے اور انٹر کی تیاری بھی کرتی ہے۔ بچّے بھی دیکھتی ہے۔ گھر بھی دیکھتی ہے۔ میرا بھی ہر خیال رکھتی ہے مگر یہ سب مجھے بڑا ہی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ جو جو سوچتا ہوں وہ وہ تعجب میں آجاتا ہے، تعجّب بڑا تعجب!!!

سرور

جیلانی بانو

عینک کو ناک کی آخری پھنگ پر اٹکا کر واحد حسین نے خط کا آخری پیراگراف پڑھا۔

"آپ کی دعاؤں سے نومولود اور اس کی والدہ اچھے ہیں اور سب بزرگوں کی خدمت میں قدم بوسی عرض کرتے ہیں۔ والسلام۔"

آپ کا خادم۔ حقیر پُر تقصیر
واحد حسین عفی عنہا

"اوئی یہ نومولود کیا نام ہوا ——!" لنگڑی پھوپی نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

"اونہہ نام میں کیا رکھا ہے ——!" بی بی اپنے پوتے کا کرتا سیتے میں بولیں۔

"اللہ نے اس بڑھاپے میں واحد میاں کا گھر آباد کر دیا۔ ورنہ اب اولاد ہونے کے دن تھے؟"

"کس کے لڑکا ہوا ہے۔ اماں بتاؤ نا ——" سرور جانے کہاں سے کھیلتی ہوئی آئی اور اپنی ماں فاطمہ بیگم سے پوچھنے لگی۔ فاطمہ بیگم لنگڑی پھوپی کی دوائیں کھرل میں گھس رہی تھیں اس لیے بشیر نے جھنجلا کے کہا۔

"تیرے باپ کے لڑکا ہوا ہے ——" سب قہقہہ مار کے ہنس پڑے اور سرور بچاری کھسیا کے رہ گئی۔ تب بشیر نے اپنی موٹی بھدی کمر پر ساری لپیٹ کر اپنی بھابی رضیہ سے کہا۔

"ایں بھابی سچ مچ وہ تو سرور کا بھائی ہے۔ تم نے سنا نہیں تھا کہ لال میاں کا تعلق بی جانی سے تھا۔ ورنہ بھلا ہمارے چچا جان بیچارے کی کیا حیثیت ہے ——" اور پھر وہ بھی ہنسنے لگیں۔

—— بی بی اور لنگڑی پھوپی بھی ہنسنے لگیں۔

"اے فاطمہ بیگم بیٹا مبارک —— لو خوش ہو جاؤ لال میاں کا بیٹا بھی اب راج رچے گا۔ لاکھوں کی جائیداد کا مالک بنے گا۔" لنگڑی پھوپو نے بڑے طنز بھرے انداز میں کہا تو فاطمہ بیگم ساری کے پلو سے آنکھیں رگڑنے لگیں۔

"اب بھائی جاگیردار بنے گا تو بیچاری سرور کو بھی پیپرمنٹ چکھا دے گا کبھی۔" بشیر نے سرور کی طرف ترس کھا جانے والے انداز میں کہا۔

"مجھے نہیں چاہیے کسی کا پیپرمنٹ۔" وہ سچ مچ بڑی بے بسی سے سسکیاں بھرنے لگی۔

"گونگی بولی، گونگی بولی ——" چاند ورانڈے میں کھڑی اپنے دوستوں کے ساتھ تالیاں پیٹ رہی تھی اور سرور

کو چڑا رہی تھی۔ چاند نے اس کا نام گونگی رکھا تھا۔ کیونکہ وہ بہت کم بولتی تھی۔ ہر وقت کسی کونے میں چپ چاپ بیٹھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا کرتی تھی۔ چاند کو شبہ تھا کہ وہ نانی کے ہاں سے بہت سی چیزیں چرا کر لے جاتی ہے۔ جبھی تو ایک بار اس کی نئی ربن کھو گئی تھی اور ایک بار فاطمہ بیگم کے جاتے ہی رضیہ ممانی نے پاندان کھولا تو ساری الائچیاں غائب!

پھر وہ بڑے آئینے کے آگے کھڑی ہو کر ڈانس کرنے لگی۔

میں تو چندا سی گوری نار

دیکھو جی کوئی نجر لگیو نا

"اونہہ، ایسی لونڈیوں، چھوکریوں کے تو نہ جانے کتنے بچے اجالا بیگم کی ڈیوڑھی میں پل رہے ہوں گے"۔ لنگڑی پھوپی نے اپنے دل کو تسلی دی۔

"مگر اس بچے کو تو اجالا بیگم نے خود گود لے لیا ہے۔ واحد میاں کا وارث بنایا ہے۔" بی بی نے اطمینان سے کہا جیسے انھیں اس بات کا غم ہی نہ ہو کہ دیور کی ہزاروں کی جائیداد ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔

"دلہن بیگم تم آج ہی اجالا بہن کو خط لکھوا دو۔ کہنا کہ اب اس کلمو ہی بی جانی اور لال میاں کو نکال باہر کریں۔ بچے کو اپنی نگرانی میں پالیں ورنہ کمینی عورتوں کا دودھ پی پی کر بچہ بھی ویسا ہی بنے گا۔"

"پھوپو تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے اس بچے کی رگوں میں چچا جان کا ہی شاہانہ خون دوڑ رہا ہو۔" بشیر نے چپکے سے رضیہ کے کان میں کہا اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

پڑھنے والی عینک کیس کے اندر رکھ کر واجد حسین نے دوسری عینک لگائی تو ہر چیز کو بغور دیکھا۔ جیسے اب دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئے گی۔

ان کی بہو رضیہ، بتول اس کی لڑکی چاند، اور شاہین، سب ہلڑ بازی میں مصروف تھے اور غالباً سرور کو ستانے کی کسی اسکیم پر غور کر رہے تھے۔ لنگڑی پھوپو بھی اب لنگڑاتی ہوئی آنگن میں جا بیٹھی تھیں اور مرغیوں کو باسی روٹیاں توڑ توڑ کر کھلا رہی تھیں۔ مگر سرکش اور بے صبر مرغیوں کو ان کی کنجوسی پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ وہ لنگڑی پھوپو کی تکا بوٹی کیے دے رہی تھیں۔ کوئی ان کے ہاتھوں میں سے روٹیاں چھین رہی تھی اور کوئی ان کی انگلیاں نوچ رہی تھی۔

انھوں نے آنکھیں بند کر کے ٹھنڈی آہ بھری اور سوچنے لگے کہ سارا دار و مدار تو واحد میاں کی جائیداد پر تھا۔ اگر سچ مچ انھوں نے کسی چھوکری کے لونڈے کو جائیداد کا وارث بنا دیا تو خود ان کے بچوں کا کیا ہوگا! اب تو ذیابیطس نے زندہ رہنے کی امنگ بھی ان سے چھین لی تھی۔ ادھر بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا اور بی بی نے ڈاکٹروں کے کہنے میں آ کر ان پر نمک، مرچ، چاول، گوشت ہر چیز حرام کر دی تھی۔ اب انسان جیے تو کس کے لیے ——— ! آخر انھوں نے تحصیلداری میں جو صدر المہام جیسے ٹھاٹ کر ڈالے وہ کس کے لیے!

پنشن لے کر ایسا بور تو کوئی نہ ہوا ہوگا جیسے وہ ہوئے۔ جب تک ملازمت کرتے رہے تھے تو پنشن کے کیا کیا چاؤ نہ آتے مگر یہ تھوڑی معلوم تھا کہ جو دن آج پلک جھپکتے میں گزر رہے ہیں وہ پنشن کے بعد شیطان کی آنت بن جائیں گے۔

اب تو وہ دُنیا کے ہر غیر ضروری اور فضول کام میں وقت صرف کرتے تھے پھر بھی ڈھیروں وقت بچ جاتا۔ اخبار کو چار چار بار پڑھتے۔ گھر کی ساری اچھی بُری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر وہ نارنگی تلے کرسی ڈال کر پائپ سلگا لیتے اور ہر آئے گئے کو روک کر بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے۔

"کیا لایا ——— کہاں گیا تھا ———؟" وہ سارو کو روک کر پوچھتے۔

"جی گوشت، ترکاری لایا ہوں۔" وہ بھی بڑے سرکار کے سوالوں سے عاجز تھا۔

"دیکھوں ———" پھر گھنٹوں ٹوکری سامنے رکھے بھنڈیاں اُلٹتے پلٹتے، گوشت کی بوٹیوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا۔ دہی چکھتے، پھر ایک آدھ ٹماٹر مُنہ میں ڈال لیتے تھے۔

سارو سے نبٹتے تو پھر وہی بیاض اور شعروں کی دُنیا۔

"ممی، ممی ہم ممانی کے ساتھ بُندھن، دیکھنے جائیں۔" اندر چاند اپنی ماں سے پُوچھ رہی تھی۔

"اری سرور کہاں مر گئی۔" اندر سے بشیر نے پکارا ——— "چاند سینما جا رہی ہے ذرا اس کے سینڈل پر پالش تو کر دے۔"

یہ سُن کر سرور اپنی ماں کے پاس سے اُٹھ کر اندر بھاگی۔

"پہلے اپنی اس منحوس چوٹی کو سمیٹ، جو ہَیں ٹپکاتی پھرتی ہے ہر جگہ۔" بشیر بیگم کو سرور کی چوٹی سے للّہی بیر تھا۔ مگر سرور سمجھتی تھی کہ بشیر بیگم تو اس کی اور اس کی ماں کی پکّی دشمن ہیں۔ جانے کیوں بشیر بیگم کے سامنے جاتے ہی وہ ڈر کے مارے کانپنے لگتی تھی اور بدحواسی میں اچھے بھلے کام بگڑ جاتے۔ اس پر بشیر بیگم کو اور غصّہ آتا اور وہ اُٹھتے بیٹھتے سرور کی لمبی چوٹی پکڑ کے خُوب دھمُوکے رسید کرتیں۔ سرور امّاں سے لاکھ کہتی کہ "شبستان" والی ڈیوڑھی میں نہ جایا کرو۔ مگر امّاں بھی کیا کرتیں ——— لوگوں کے پھٹے پُرانے کپڑے سینے سے ایسا کیا مل جاتا ہے کہ وہ گھر بیٹھ کر کھاتیں۔ سرور ان کی اکلوتی لڑکی تھی۔ نو دس برس کی دُبلی پتلی، سیاہ اٹنگا پاجامہ پہنے اور پھٹا ہوا ململ کا جھیر جھیر کرتا پہنے۔ اس کی آنکھیں اتنی چمکدار تھیں جیسے دُور جنگل میں چراغ جل رہے ہوں۔ لیکن سرور مُنہ پھیر کے جانے لگتی تو اس کے بالوں کو نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ ڈھائی فُٹ کے قد پر اس کی موٹی خوبصورت سی چوٹی ایڑیوں کو چھوتی تھی۔ بی بی کی دونوں بیٹیاں بشیر اور بتول سرور کے ان خوبصورت بالوں کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرا کرتی تھیں۔ ان کے بال لاکھ دوائیں استعمال کرنے پر بھی کاندھوں سے نیچے نہ اُترے تھے۔ بشیر کی لڑکی چاند کے بال بھی ویسے ہی تھے۔ مگر چاند کی پھوپیوں نے اس کے بال میموں کے ڈھنگ پر ترشوا دیے تھے اور ایک یہ سرور تھی کہ بالشت بھر کے قد پر یہ موٹی چوٹی لیے پھرتی تھی۔ بتول تو اٹھتے بیٹھتے فاطمہ بیگم سے کہتی تھی۔

"اجی پھوپو! اللہ خیر کرے کہتے ہیں لمبے بال منحوس ہوتے ہیں۔" پھر فاطمہ بیگم کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی اپنے دل کو تسلّی دے لیتی تھی۔

"خیر، لمبے بال ہوئے تو شوہر کو چوٹی پکڑ کے نکال باہر کرنے میں آسانی ہوگی۔"

اس بات پر وہ دونوں بہنیں ہنسی کے مارے لوٹن کبوتر بن جاتی تھیں۔

دو چار دن بعد ایک دن بشیر پھر فاطمہ بیگم سے کہتی۔

"اجی پھوپو، تم تو خود ہی دمڑی دمڑی کو محتاج ہو۔ سرور کے اتنے بالوں کو کتنا تیل چاہیے۔ تھوڑی سی چوٹی کاٹ دو نا مُردار کی۔ نہیں تو لاؤ میں کاٹے دیتی ہوں۔"

یہ سُن کر فاطمہ بیگم کے ہاتھ کام کرتے کرتے کانپنے لگتے تھے۔ ان کے لبوں پر کوئی بات آ آ کر رُک جاتی۔ پھر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے برقع اوڑھتیں اور سرور کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔

فاطمہ بیگم وہ خاردار جھاڑی تھیں جو پھولوں کی کیاری میں نکل آتی ہے۔ واجد حسین کے ابّا آئے دن بچّوں کی پیدائش سے بور ہو گئے تو فاطمہ بیگم کی ماں کو بیاہ لائے مگر ایک برس بھی نہ گزرا تھا کہ وہ بھی میاں کی صُورت دیکھ کر اُبکائیاں لینے لگیں۔ جب نواب صاحب نے یہ خبر سُنی تو فاطمہ بیگم کی ماں پر سخت عتاب نازل ہوا اور غصّے کے مارے اُنھیں ایک کوٹھڑی میں بند کروا دیا۔ پھر بالکل بھُول گئے کہ اس عورت کی صُورت بھی اُنھوں نے کبھی دیکھی تھی۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد جب ان کے بیٹوں (واجد حسین اور واحد حسین) نے وصیت نامہ دیکھا تو اس میں کہیں فاطمہ بیگم اور ان کی ماں کا ذکر نہ تھا۔ لہٰذا حسبِ قاعدہ اُنھیں ڈیوڑھی کی ماماؤں چھوکریوں کی صف میں گنا گیا۔

مگر اس خاندان کی شہرۂ آفاق دریا دلی کو واحد حسین نے نبھایا۔ یعنی فاطمہ بیگم کو نہ صرف مُنہ بولی بہن کہا بلکہ اپنے گاؤں کے ایک کھیت مزدور لال میاں سے ان کا عقد بھی کر دیا۔ شہر کے جاگیرداروں کی بیٹی بیاہنے کے لیے جب لال میاں کو ایک ہزار روپے کی ضرورت پڑی تو واحد حسین نے ایک ہزار کے عوض اسے گیارہ سال کے لیے رہن رکھ لیا۔

اس وقت حیدر آباد کے جاگیرداروں میں کھیت مزدوروں کو رہن رکھنے کا طریقہ عام تھا۔ مقرّرہ میعاد تک وہ مزدور دن رات مالک کے کھیتوں میں مُفت کام کرنے کے پابند ہو جاتے تھے۔ میعاد ختم ہونے کے بعد اُن چھٹی کے دنوں کو بھی بھُگتنا پڑتا تھا جب کسی وجہ سے کام نہیں کر سکے تھے۔

فاطمہ بیگم سسرال آئیں تو دولہا گیارہ برس کے لیے گروی پڑا تھا۔ اور اس بن باس کو کاٹنے کے خیال ہی سے وہ بوڑھی ہوتی جا رہی تھیں۔ اس لیے وہ پھر شہر میں آکر محنت مزدوری کرنے لگیں۔ سات برس کی سرور باپ کا انتظار دیکھتے دیکھتے تھک گئی۔ کبھی کبھی وہ ماں کی گود میں لیٹ کر پوچھتی۔

"امّاں، ابّا گاؤں سے بھاگ کر کیوں نہیں آجاتے۔"

"چپ چپ ———" فاطمہ بیگم سہم کر کہتیں۔ "ایسی باتیں کر کے کیا گاؤں میں ہمارا مُنہ کالا کروائے گی! لوگ

سُنیں گے تو کیا کہیں گے !"

سات برس کی سرور کی سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا کہ اماں اور ابا اتنا لوگوں سے کیوں ڈرتے ہیں ! یہ گاؤں والوں کا کونسا انصاف تھا کہ اس کا باپ اپنے ہاتھ گیارہ برس کے لیے بیچ دے ۔ اماں کہتی تھیں کہ ایک ایسا ہی رہن شدہ آدمی بھاگ گیا تھا تو گاؤں والوں نے اُس کے بیوی بچوں کو اپنے کنوئیں سے پانی بھی نہیں پینے دیا !

" اماں میں چپکے سے رات کو پانی لے آیا کروں گی " سرور نے اماں کو اطمینان دلایا ۔

" مگر تو ایسی باتیں کیوں سوچتی ہے ۔ صبر کر بیٹا ۔ اب صرف دو برس رہ گئے ہیں وہ بھی گزر ہی جائیں گے ۔"

" مگر کب تک " سرور جھنجلا جاتی تھی ۔" مجھے کہیں سے سو روپے مل جائیں تو میں ابھی ابا کو چھڑا لاؤں "

" پاگل کہیں ایسا ہوتا ہے ! فاطمہ بیگم اسے سمجھاتیں ۔" بھائی جان نے تو کاغذ پر لکھوا لیا ہے کہ بیچ میں پیسے واپس نہیں ہوں گے ۔"

" اماں ، میں جب بڑی ہو جاؤں گی تو ماموں جان کے صندوق میں سے وہ کاغذ نکال کر پھاڑ دوں گی "

" ہشت پگلی ، لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کرتی ہیں " فاطمہ بیگم اسے تھپک تھپک کر سلا دیتی تھیں ۔

لنگڑی پھوپو سمجھیں اب یہ دونوں بلائیں بھی زندگی بھر کے لیے ان کے گلے پڑیں گی ۔ مگر فاطمہ بیگم نے کہیں ایک کوٹھڑیا کرایے پر لے کر سلائی پسائی شروع کر دی ۔ ہر مہینے دو چار دن کے لیے وہ بی بی کے ہاں آجاتیں ۔ اچار ڈالنے ' اناج صاف کرنے ' مسالہ کوٹنے اور پھٹے لحاف بستر سینے کے لیے ۔ اس کے بدلے میں فراخ دل بی بی انھیں عام مزدورنیوں سے زیادہ مزدوری دیتیں ۔ دونوں ماں بیٹی کو پیٹ بھر کھانا کھلاتیں ۔ سرور اُوپر کے کام پر لگا دی جاتی ۔

رضیہ ، راشد اور چاند مل کر سرور کو خوب بے وقوف بناتے تھے ۔ چاند سرور کو پیپرمنٹ کی گولیوں کے دھوکے میں کونین کی گولیاں کھلا دیتی ۔ راشد ایک پیسہ دینے کا وعدہ کر کے گھنٹوں اسے دھوپ میں کھڑا کرنے کا تماشہ دیکھتا تھا رضیہ اس کی چوٹی میں آگ لگانے کی سوچتی مگر ایسے خطرناک مذاق پر کوئی راضی نہ ہوتا تھا ۔ پھر جب پسینے میں نہائی ہوئی سرور پیسے کا مطالبہ کرتی تھی تو سب اس کے پاگل پنے پر خوب قہقہے لگاتے تھے ۔ پھر جب رضیہ اپنے جہیز کا ریڈیو بجاتی تھی تو سرور اور دیوانی ہو جاتی ۔ آگے پیچھے ہر طرف جھانکتی ۔ اسے پکا یقین ہوتا کہ یہ سب چاند کی شرارت ہے ' وُہی اندر چھپ کر گاتی ہے ۔

سارا گھر سرور سے نوکروں کی طرح کام لیتا تھا ۔ لنگڑی پھوپو اپنی دوائیں پسواتیں ۔ بتول ایاز اور غزل کو تھما دیتی ۔ رضیہ اپنی لڑکی فوزیہ کے لیے جھنجھنا بجانے کو بٹھا دیتی ۔ خاطر بی برتن دُھلواتیں ۔ پھر عین کھانے کے وقت بی بی ادبدا کے ایسے کام نکالتی تھیں کہ یہ دونوں ماں بیٹیاں سب کے ساتھ دسترخوان پر نہ بیٹھ پائیں ۔ واجد حسین کو فاطمہ بی کے ہاتھ کے اچار اور پاپڑ بہت پسند تھے ۔ وہ آم چھیلتیں تو سرور مسالہ کوٹتی ۔ کبھی چاول صاف کیے جا رہے ہیں ۔

زندگی گرم دودھ بن گئی تھی۔ اگلتے بنتی نہ نگلتے۔
مگر اتنا کام لے کر بھی کوئی مفت میں تو ان کے ہاتھ نہ تڑواتا تھا۔ بشیر بیگم چاند کی پرانی فراکیں، اور شلواریں سرور کے لیے دیتی تھیں۔
"یہ فراکیں چھوٹی ہو گئی ہیں۔"
حالانکہ چاند سرور کی ہم عمر ہونے کے باوجود بالکل سوکھی کانٹا تھی اور محنت کش، صحت مند سرور اس کے سامنے کئی برس بڑی لگتی تھی۔

اماں میں بھی چاند کے ساتھ "بندھن" دیکھنے جاؤں گی۔" سرور ضد کرنے لگی۔
"دیکھیئے، امی، یہ سرور بھی میرے ساتھ جانے کی ضد کر رہی ہے۔" چاند نے اپنے بالوں میں ربن باندھتے ہیں کہا۔
"تو کہاں جائے گی۔ ایسے گندے کپڑے پہن کر۔" بی بی نے اسے ڈانٹا۔
"وہاں دو روپے کا ٹکٹ آتا ہے۔" فاطمہ بیگم نے بھی اسے ڈرانا چاہا۔
"نہیں ہم بھی جاتے ———" وہ چاند کے خوبصورت کپڑے دیکھ دیکھ کر ٹھنکنے لگی۔
"ٹھہر و اب اس مردار کی میں خبر لیتی ہوں یہ ایسے نہیں مانے گی۔" بشیر بیگم چاند کے بالوں میں کنگھی کرتے میں بولیں۔
"چپ چپ۔" فاطمہ بیگم نے جلدی سے اٹھ کر اس کے دو تھپڑ مارے۔
"دیکھ زیادہ ضد کی تو تیری چوٹی کاٹ کر پھینک دوں گی۔ میرا غصہ بڑا برا ہوتا ہے۔" بشیر بیگم نے دیدے نکال کر دھمکی دی۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ فاطمہ بیگم کو اپنی بیٹی کے بالوں پر بڑا ناز تھا۔ بیٹی بھی ہر وقت اپنی چوٹی ہاتھ میں اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ جیسے دنیا سے انوکھی چیز ہو۔ اس کی اتنی لمبی چوٹی دیکھ کر چاند کو اپنے کٹے ہوئے بال بڑے حقیر لگتے اور وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر کہتی۔
"امی میرے کو بھی سرور کے جیسی لمبی چوٹی ہونا۔"
"چھی، نام نگوڑ! میرے سامنے وہ اجاڑ چوٹی کا۔" بشیر بیگم جل کر کہتیں۔
"نہیں ہم بھی جاتے "سی نما" دیکھنے ———" وہ زور زور سے رونے لگی۔
"اری مردار کیوں مغرب کے وقت نحوست پھیلا رہی ہے!" بشیر بیگم نے ایک ڈانٹ پلائی۔
"چپ اجاڑ صورت ماٹھی ملی۔ تیری صورت کو انگار لگو۔" فاطمہ بیگم اس کے اوپر دھڑا دھڑ تھپڑ برسانے لگیں تو سرور کی چیخیں اور بڑھ گئیں۔

پھر سب نے تیزی سے بشیر بیگم کو باہر آتے دیکھا۔ دُوسرے لمحے اُنھوں نے سڑاپ سے کوئی چیز بیچ آنگن میں پھینکی۔

دُوسرے لمحے فاطمہ بیگم نے دیکھا وہ سرور کی چوٹی تھی۔ سرور نے دیکھا تو وہ دھڑ سے نیچے گر پڑی۔ فاطمہ بیگم اپنی جگہ ساکت تھیں۔ صرف چاند کا لمبا قہقہہ گونج رہا تھا۔

"میں پہلے ہی بولی تھی کہ میرے سامنے ضد نکو کرو۔ میرا غُصّہ بُرا ہوتا ہے۔" وہ قینچی ٹیک کے اپنے ماتھے سے پسینہ پُونچھنے لگیں۔

بی بی نے بڑی مُشکل سے آنکھیں اُٹھا کر اپنی بیٹی بشیر کو دیکھا پھر آنگن میں پڑی ہوئی سیاہ چوٹی کو ——— اور یہ سوچ کر اُن کے آنسو گرنے لگے کہ اُنھوں نے خود ہی ان سنپولوں کو دُودھ پلایا ہے ———؟

——— (زیرِ تکمیل ناول کا ایک باب) ———

چیر کے درخت

اختر جمال

جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو چیر کے اُونچے اُونچے گھنے درخت یاد آتے ہیں۔ ایک عجیب طرح کے سکون اور سناٹے کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے چاروں طرف بڑا صاف ستھرا اور پُرسکون ماحول نظر آتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ راحت بڑے وقار سے زندگی کے سٹیج پر سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے کہ اس کی شخصیت کے جادو سے ساری چیزیں نظروں سے گم ہو جاتی ہیں۔ جس طرح ایک بہترین ہیروئن اپنی اداکاری کے وقت کسی دُوسری چیز کو دیکھنے اور دُوسرے کرداروں پر نظر ڈالنے کی مُہلت نہیں دیتی ہے۔

دُبلا پتلا جسم تیکھے خدوخال اور بڑی بڑی ہنستی ہوئی آنکھیں —— ! اتنی شوخ اور چنچل آنکھیں میں نے پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے احساس ہُوا کہ آنکھیں ہونٹوں سے زیادہ سلیقے سے ہنسنا جانتی ہیں اور جب اُس کے ہونٹوں کے گوشے مسکراتے تو مجھے معلوم ہوتا کہ کلیاں کس طرح کھلتی ہیں۔ میں سوچ میں پڑ جاتی کہ خالق نے اس کی تخلیق مٹی سے کی ہے یا پارس سے یا کسی ایسی چیز سے جس کا ہمیں علم نہیں ہے !

اس کے بال کتنے گھنے اور گھونگر یالے تھے ریشم کی طرح چمکیلے اور ملائم۔ ہم سب اس سے کہا کرتے تھے کہ اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا کرے ایسے بالوں کو باندھنا نہ صرف بالوں پر بلکہ ذوقِ سلیم پر بھی ظلم معلوم ہوتا تھا۔ مگر وہ بڑی لاپروا تھی۔ جو ملا پہن لیا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ پہن لیتی تھی وہی اس پر سجتا تھا اور جو لڑکیاں بڑے سلیقے اور اہتمام سے تیار ہو کر آیا کرتی تھیں جانے کیوں اسے دیکھ کر بھنّا جاتی تھیں۔ وہ کیسے ہی کپڑے پہنے، کیسے ہی بال بنائے اس سیدھی سادھی لڑکی کی شخصیت میں کچھ ایسی موہنی تھی کہ وہ سب پر چھا جاتی تھی۔ اتنی خلیق، ہنس مکھ اور خوش مزاج لڑکی اس کی ہم جماعتوں میں کوئی بھی نہ تھی۔ پھر اس کی ذہانت اور لیاقت بھی اسے دُوسری لڑکیوں سے ممتاز بناتی تھی۔ وہ ان گنت صلاحیتوں کی مالک تھی۔

اس کی ایک بات مجھے بڑی عجیب سی لگتی تھی اسے بے تحاشہ ہنسنے کا مرض تھا اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں اتنے آنسو آجاتے تھے کہ لگتا تھا وہ رو رہی ہے اور جب وہ روتی تھی تو اچانک روتے روتے ہنس پڑتی تھی۔ اور بعض دفعہ تو یہ اندازہ لگانا محال ہوتا تھا کہ وہ رو رہی ہے یا ہنس رہی ہے۔ یہی اس کی اداکاری کا کمال تھا اس نے کبھی پتہ نہ چلنے دیا کہ وہ رو رہی ہے یا ہنس رہی ہے۔ !

میں نے اسے پہلی بار کالج کی لائبریری میں دیکھا تھا۔ ان دنوں میں نے بی اے میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔ وہ اسی کالج

کی پُرانی طالبہ تھی۔ جب میں نے اپنے لیے کتابیں پسند کیں تو وہ میرے پاس آئی۔ اتنی دلکش مُسکراہٹ اور اتنے باوقار انداز سے اُس نے میری کتابیں دیکھیں اور کہا " آپ کا اور میرا مذاق بالکل ایک جیسا ہے۔ مجھے بھی یہی مُصنّف پسند ہیں جو آپ نے چُنے ہیں اور پھر اس نے کارل مارکس کی "سرمایہ" دیکھ کر کہا " جناب یہ بڑی مشکل کتاب ہے یہ آپ کے پلّے نہیں پڑے گی اس میں میں نے بھی سر کھپانے کی بیسیوں کوشش کی ہے۔"

"دراصل میرے بھائی مجھ پر اپنے علم و فضل کا بڑا رعب جانتے ہیں اس لیے میں نے سوچا میں بھی کُچھ قابلیت پیدا کر لوں۔"

"خُوب اچھا خیال ہے" پھر وہ مُسکرا کر بولی " آپ کے مضامین کیا ہیں ؟"

"انگریزی ادب، سیاست اور تاریخ۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ تاریخ کے بجائے اقتصادیات لے لوں۔"

"نہیں جی بہت اچھے مضامین ہیں آپ قطعی نہ بدلیے۔ میرے پاس بھی یہی مضامین ہیں۔ اچھا تو پھر ہاتھ ملائیے میرا خیال ہے ہم اچھے دوست ثابت ہوں گے!"

ہم واقعی اچھے دوست ثابت ہوئے ہم نے مل کر بڑی اچھی اچھی کتابیں پڑھیں۔ برنارڈ شا ——— گالزوردی ——— ابسن کے ڈرامے اور ڈکنز، ہارڈی، فلابیر، ٹالسٹائی اور زولا وغیرہ کے ناول روسو کی سوانح وغیرہ اُردو میں اسے کرشن چندر ——— عصمت، منٹو اور بیدی پسند تھے اور یہی مصنّف میرے محبوب مصنّف تھے۔ اُردو کے تمام شعرا کے مجموعے ہم باری باری لائبریری سے لے جاتے اور پھر اپنے پسندیدہ اشعار نوٹ کر کے اپنی اپنی نوٹ بک ایک دُوسرے کو دکھاتے۔ ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہتی۔ اکثر و بیشتر ہمارا انتخاب بالکل ایک ہوتا تھا۔ شاعروں میں اسے فیض، ساحر اور کیفی پسند تھے۔ مجھے جوش کی بعض نظمیں بہت پسند تھیں مگر وہ اکثر ہنس کر کہتی " جانے کیوں جوش کو پڑھ کر اپنی جہالت کا احساس ہونے لگتا ہے حالانکہ میری اُردو بڑی اچھی سمجھی جاتی ہے مگر جوش صاحب مجھ سے بار بار لغت کھلواتے ہیں۔"

میری دوست نہ صرف کتابیں پڑھنے کی شوقین تھی بلکہ عملی کاموں میں بھی آگے آگے تھی۔ وہ ڈرامیٹک سوسائٹی اور ڈبیٹنگ سوسائٹی کی رُوح تھی۔ کالج میگزین بھی وُہی مرتّب کیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ سٹوڈنٹس یونین کے جلسوں اور ہنگاموں میں بھی سب سے آگے آگے ہوتی تھی۔ اس کے مجبور کرنے سے ہی میں نے بھی کالج کی سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کیا تھا جب میں مباحثوں میں حصّہ لینے لگی تو اُسے بہت خوشی ہوئی۔ جب کالج کی ٹیم مباحثوں میں شرکت کے لیے کہیں باہر جاتی تو اس میں ہم دونوں کا ساتھ ہونا لازمی سا ہو گیا تھا۔ جب ہم دونوں اکٹھے جاتے تو سب کو یقین ہوتا کہ ہم ٹرافی ضرور لائیں گے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ لڑکیاں اس سے جلتی تھیں اور لڑکے اس کی تعریف میں ایک دُوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ ان سب سے بے پروا اور بے نیاز اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے اس بات کا شدید احساس تھا کہ میری دوست ذہانت اور قابلیت میں مُجھ سے بہت آگے ہے۔ میں کوشش کرتی تھی کہ اس کی برابری کرنے لگوں۔ جب وہ کسی کتاب کا

ذکر کر دیتی تو اس کتاب کا مطالعہ کرنا میرا فرض ہو جاتا تھا نہ صرف میرے لیے بلکہ کالج کی تمام لڑکیوں کے لیے وہ ایک نمونہ اور مثال تھی!

جوانی اپنی اہمیت جتائے بغیر نہیں رہتی ہے اور وہ تو تھی ہی ایک اہم شخصیت ——— گھر میں ——— کالج میں ہر جگہ وہی سب کی اکلوتی اور لاڈلی تھی۔ اسے یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ اپنے ماحول میں سب سے اچھوتی، سب سے اچھی اور سب سے زیادہ چاہے جانے کے لائق ہے۔ وہ ایک اُونچے مینار پر کھڑی تھی جہاں سے دُوسرے لوگ بہت ادنیٰ، پست اور حقیر نظر آتے تھے بالکل بونوں کی طرح ——— ! اس لیے اسے سب ناقابلِ التفات معلوم ہوتے تھے۔ بہت سے لڑکے اس کی محبت کا دم بھرتے تھے، مگر سب اسے اس طرح دیکھا کرتے تھے جیسے زمین کے باسی چاند کو دیکھتے ہیں۔ وہ جب لڑکیوں کے محبت بھرے قصے سنتی یا رُومانی کہانیاں پڑھتی تو حیران ہو کر سوچتی کہ آخر اسے کیوں نہیں کسی سے محبت ہو جاتی ہے کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ وہ صرف پڑھنے لکھنے اور بڑے بڑے کام کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ جذبات اور احساسات کا وہ سوتا جس کے ماتحت لڑکیاں عشقیہ قصے پسند کرتی ہیں اس کی شخصیت میں سے نہیں پھوٹ سکتا یا موٹی موٹی کتابوں تلے دب کر خشک ہو گیا ہے۔ اچھا ہے اس کے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے، اسے دُنیا میں بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ جب وہ مجھ سے ایسی باتیں کرتی تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا۔ میں اسے محبت اور فخر سے دیکھتی!

وہ جو دُور دُور سے ہمیشہ جیت کر آنے کی عادی تھی، ایک دفعہ ہار گئی! پہلا انعام کھو کر دُوسرا لائی۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی شکست تھی۔ کالج میں ہر طرف سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ "زیادتی ہوئی ہے ——— بے ایمانی ہوئی ہے۔ جانبداری ہوئی ہے ——— !" وہ چیخ کر بولی۔ "نہیں نہیں ——— بالکل ایمانداری سے فیصلہ ہوا ہے، وہ واقعی بہت اچھا بولا تھا۔ اتنا گھمبیر لہجہ تھا اور دلائل تو اتنے ٹھوس تھے۔ سچ پوچھو تو میری تقریر اس کے سامنے کچھ بھی نہ تھی۔ ایسی ایسی باتیں کم بخت نے سوچی تھیں جہاں میرا ذہن بھی نہ جا سکتا تھا۔"

سب چُپ ہو گئے اُس نے بڑی کُشادہ دلی سے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا تھا۔

وہ اپنی پہلی شکست سے ذرا بھی اُداس نہ تھی بلکہ جانے کیوں ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ اتنے بہت سارے لوگوں میں سب ہی بونے نہیں ہیں۔ کوئی اس سے بھی زیادہ قد آور ہے۔ اس نئے شخص کی دریافت پر وہ اتنی خوش تھی کہ اپنی ہار کا اسے ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہار کر بہت کچھ پا گئی ہے۔ وہ اسے جان گئی ہے اسے پا گئی ہے جو اتنا ذہین ——— اتنا سمجھدار اور اتنا بھلا مانس دکھائی دیتا ہے۔

اور وہ غرور، خودداری اور بے نیازی جو اس کی عادت سمجھی جاتی تھی جانے کہاں غائب ہو گئی ——— اب اسے ہر دم اس آدمی کا خیال آتا جس نے اُسے شکست دی تھی۔ عورت اس آدمی سے ہی محبت کرتی ہے جو اسے شکست دے سکے۔ وہ اس مباحثے میں پہلا انعام ہی نہیں اپنا دل بھی ہار آئی تھی۔ وہ اسے ساری دُنیا سے زیادہ لائق اور اچھا معلوم ہوتا تھا اور وہ ہر وقت اس آدمی کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔

ایک دن اس کے نام ایک دُور دراز شہر سے جہاں وہ مباحثے میں حصّہ لینے گئی تھی۔ ایک خط آیا۔ خط میں لکھا تھا "پہلا انعام ججوں نے بالکل غلط دیا ہے۔ فیصلہ سرے سے غلط تھا۔ یہ انعام آپ ہی کا حق تھا۔ آپ کی آواز ——— ذہانت ——— اور شخصیت کا سحر میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں اور میرا جی چاہتا ہے کہ پہلا انعام لاکر آپ کے قدموں میں ڈال دوں۔"

یہ جملہ پڑھ کر اسے محسوس ہوا کہ کون و مکان کی دولت مل گئی ہے۔ اس کا دل خوشی سے ناچ اُٹھا۔ اُس نے اسی روز جواب لکھا اور بتایا کہ وہ ججوں کے فیصلے سے پُوری طرح متفق اور مطمئن ہے۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس نے اتنی فاضلانہ تقریر سُنی۔ انعام اگر اسے ملتا تو وہ حق تلفی سمجھتی ———! دونوں طرف خطوط کا تبادلہ شروع ہوگیا اور خط طویل ہوتے گئے۔

وہ جبکہ کالج کے بے شمار لڑکے دم بھرتے تھے اور وہ کسی کو بھی مُنہ نہ لگاتی تھی، ایک دُور دراز شہر کے ایک عجیب سے لڑکے کی محبّت میں گرفتار ہوگئی جسے اس نے صرف ایک دفعہ دیکھا تھا اور وہ بھی اسٹیج پر ——— جیسے سینما کا کوئی منظر ——— ! خطوں کی وساطت سے اُس نے اس کی شخصیت کے مختلف رُوپ اس طرح دیکھے تھے جیسے البم میں کسی فنکار کے مختلف پوز دیکھے جا سکتے ہیں۔ اپنی تحریر میں وہ اسے اسٹیج سے بھی زیادہ ذہین ——— اور پُرکشش معلوم ہوا۔ اس نے اپنے دل کے آسن پر اسے ایک دیوتا کی طرح بٹھالیا اور چپ چاپ اس کی پُوجا شروع کردی!

ایک دن میں نے سُنا کہ راحت کی شادی ہو رہی ہے تب مجھے بڑا تعجب ہوا۔ ایسے انوکھے ڈھنگ سے کسی نے شادی کی ہے۔ صرف خط و کتابت کر کے یا اسٹیج پر دیکھ کر ——— اس کے خاندان بھر میں مخالفت ہوئی۔ دوستوں نے اُسے سمجھایا زندگی میں انسان کچھ اور ہوتا ہے اور اسٹیج پر کچھ اور نظر آتا ہے۔

خط و کتابت میں انسان تہذیب کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اور زندگی میں ہر وقت تہذیب اور احترام تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ان مشوروں کو سُن سُن کر تنگ آگئی تھی۔ اور اس نے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ شادی کرے گی تو صرف اس آدمی سے ——— !

اس مشکل کا حل اس کے ابّا جان نے یہ تلاش کیا کہ اسے چند روز کو بلایا جائے اور وہ ایک ہفتہ اُن کے گھر مہمان رہا۔ بڑوں اور بچوّں سب نے ہی غور دبین لگا لگا کر اسے دیکھا کسی کو بھی اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی ——— سب نے یہی کہا لڑکا بڑا نیک ہے، بڑا قابل ہے، پھر اچھے خاندان کا ہے اور انہی دنوں اُس نے آئی سی ایس کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا ——— اب کسی کے پاس کوئی اعتراض باقی نہ رہا تھا اور فرحت نے سوچا کہ وہ جنم جنم سے جو سوچتی آرہی تھی اب وہ ساری سوچیں ختم ہوگئیں۔ بس اب سوچنے کے لیے کوئی بات باقی نہیں رہی ہے۔ جب وہ چلا گیا تو اسے محسوس ہوا کہ زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے ——— اور یوں ان کی شادی طے ہوگئی ——— !

راحت میری سب سے عزیز دوست تھی۔ اس کی محبّت اعتماد اور رفاقت میرے لیے باعثِ فخر تھی۔ میرے دوست، عزیز اور سارا گھرانہ اسے پسند کرتا تھا۔ جب وہ آتی تھی تو اس کی شخصیت کی مہک سب کو موہ لیتی تھی۔ اس کی شادی پر میں

سب سے زیادہ خوش تھی اس لیے کہ میں سمجھتی تھی کہ اُس نے دولت اور ظاہری شان و شوکت کے مقابلے میں ذہانت اور قابلیت کو چنا ہے۔ جب اس کا منگیتر ہمارے گھر آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ راحت کو اس سے زیادہ اچھا شوہر نہیں مل سکتا تھا!

اور جب میں اس کی شادی پر تحفہ چننے لگی تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا دوں۔ جگمگ کرتے ہوئے زیورات اور جھلملاتے ملبوسات کی وہ دلدادہ نہ تھی۔ بہت غور و فکر کے بعد میں نے سوچا میں اسے اچھی اچھی کتابیں دوں گی۔ اس لیے کہ ہماری دوستی کی ابتدا بھی کتابوں سے ہی ہوئی تھی۔

جب راحت کی شادی ہوئی تو ہم سب کو توقع تھی کہ یہ ذہین جوڑا مل کر بہت بڑے بڑے کام کرے گا۔ دونوں بہترین مقرر ہیں۔ دونوں میں لکھنے کی خداداد صلاحیت ہے۔ دونوں کا ایک ہی شوق ہے اچھی کتابیں پڑھنا اور اب جب یہ دونوں اکٹھے زندگی کے سفر پہ چلیں گے تو علم و ادب کی شاہراہ پر موتیوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔

شادی کے بعد ایک عرصہ تک راحت کے خط آتے رہے۔ اس کے ہر خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی سے پوری طرح مطمئن اور سکھی ہے! کچھ عرصہ بعد جب اس کے خط آنے بند ہو گئے تو میں نے اور اس کی دوسری دوستوں نے سمجھ لیا کہ اب وہ بہت ذمہ دار قسم کی خاتون ہو گی جو بہت مصروف رہتی ہو گی اور اس لیے اب اسے خط و کتابت کا وقت نہیں ملتا ہے۔ پھر میں نے یہ سنا کہ وہ اپنے میاں کی ملازمت کے سلسلہ میں امریکہ چلی گئی ہے۔

ایک طویل عرصہ گزر گیا ——— وہ گم سی ہو گئی! میں بھی اسے بھول چلی۔ کبھی کبھی اس کی تصویریں ——— اس کی چیزیں ——— اور اکٹھے گزارے ہوئے دن یاد آتے مگر پھر میرے لیے اس کی یاد بھی ایک ایسی ہی قیمتی اور لاثانی سی آرائشی چیز ہو گئی جیسے میری دیوار پر ایک خوبصورت مغل آرٹ کی تصویر ہے۔ بس اسی طرح میرے ذہن کے پردوں پر اس کی تصویر خاموش ٹنگی رہی ———!

نتھیا گلی کے ایک بڑے ہوٹل کے لان میں ہم سب آرام سے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بچے ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ میں کبھی بچوں کی طرف دیکھتی اور کبھی پہاڑوں کی ڈھلانوں پر لگے ہوئے چیڑ کے درختوں میں نظریں اُلجھ کر رہ جاتیں۔ دفعتاً میری نظر اُن لوگوں پر پڑی جو لان میں داخل ہو رہے تھے۔ چند مرد اور عورتیں آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر چل رہے تھے اور ان کے بیچوں بیچ ایک موٹی تازی گوری چٹی عورت نظر آئی۔ جس کے گال سیب کی طرح سُرخ اور آنکھیں ——— میں نے غور سے دیکھا۔ آنکھیں مجھے جانی پہچانی نظر آئیں۔ اُف میرے اللہ ان آنکھوں کو کہاں دیکھا ہے ——— ؟ بہت دیکھا ہے! اس عورت نے بھی مجھے دیکھ لیا ——— وہ فیروزی ساڑھی سنبھالتی تیز تیز قدموں سے میری سمت دوڑی میں اُچھل کر کھڑی ہو گئی! یہ راحت تھی ——— ! "سعیدہ!" وہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی!

ہم دیر تک نہ بول سکے۔ جیسے ایک لمحے میں ہم نے پندرہ سال طے کر لیے ———! "میں نے تو تمھیں دور سے ہی پہچان لیا تھا۔ تم ذرا بھی نہیں بدلی ہو ———!" وہ خوشی خوشی میرا ہاتھ تھام کر بولی۔

"میں تمھیں اتنی جلدی نہ پہچان سکی دراصل تم بہت موٹی ہو گئی ہو۔" میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔

"ہاں سب کہتے ہیں میں بہت موٹی ہو گئی ہوں۔" اس کی نظر میرے شوہر پہ پڑی جو اس بھرت ملاپ سے انتہائی متاثر معلوم ہو رہے تھے۔

"ظفر تم تو بالکل ویسے ہی ہو۔" میرے میاں میں اور راحت ہم جماعت رہ چکے تھے اس لیے راحت اور بھی زیادہ خوش ہو گئی!

"اچھا بتاؤ یہاں کیسے آنا ہوا؟"

"بس یونہی سیر و تفریح کا پروگرام بنا لیا۔ ہم راولپنڈی میں رہتے ہیں۔ ظفر وہاں پریکٹس کرتے ہیں اور میں ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ چھٹیوں میں ذرا آرام کرنے اور گھومنے کو جی چاہا ——— تم نے ہمارے بچوں کو نہیں دیکھا۔ فوزیہ ——— جاوید ——— اور احمد! ——— بچے بھاگ کر آ گئے۔ راحت نے بچوں کو لپٹا کر پیار کیا اور کہا۔" ایسے پیارے بچے بس تمھارے ہی ہو سکتے تھے ———"

"اچھا تم سناؤ تمھارے میاں اور بچے کہاں ہیں ———"

"میرے میاں کراچی ہیں تین ماہ کے لیے بچوں کو لے کر یہاں آ جاتی ہوں۔ یہاں ہم نے گرمیوں کے لیے ایک گھر بھی بنایا ہے۔ اچھا جو لوگ میرے ساتھ آئے تھے میں ان سب کو چھوڑ کر بھاگ آئی۔ ان سے تمھارا تعارف کراؤں۔ وہ لوگ بھی ہماری سمت آ رہے تھے۔ یہ سب کراچی سے تعلق رکھتے تھے اور سیر و سیاحت کے لیے نتھیا گلی آئے ہوئے تھے۔"

راحت نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اس کے گھر پر قیام کریں اور ہمارا سامان ایک جیپ میں لدوا کر اس کے گھر پہنچا دیا گیا ہم سب نے ٹہلتے ہوئے جانا پسند کیا۔

راحت کے گھر کا راستہ پہاڑی ڈھلانوں پر سے ہو کر گزرتا تھا اور سارے راستے ایک بڑی سی خوبصورت سی پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ چاروں طرف تا حدِ نظر چیڑ کے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں کے درمیان ایک سُرخ سُرخ چھت نظر آ رہی تھی۔ راحت نے دُور سے اشارہ کیا۔" وہ ہمارا گھر ہے ——— تعجب ہے ہم سب پاکستان میں ہیں اور ایک دُوسرے کی خبر نہیں ہے۔ میں نے تو فرض کر لیا تھا کہ تم ہندوستان میں ہو ——— کبھی کبھی سوچا کرتی تھی کہ تم سے ملنے ہندوستان جاؤں گی ———!"

"تم نے مجھے یاد تو رکھا ——— میں سمجھ رہی تھی کہ تم مجھے بالکل بھلا چکی ہو۔ دراصل شادی کے بعد میں پاکستان آ گئی۔ ظفر کے گھرانے کے لوگ پہلے سے یہیں تھے۔ تمھارے بارے میں سُنا تھا کہ امریکہ چلی گئی ہو ———"

"شوکت کی ملازمت کے سلسلہ میں جانا ہوا تھا۔ اب شوکت نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ ان کے بھائیوں نے مجبور کیا کہ یہ بھی ان کے ساتھ تجارت کریں ——— بڑے بڑے ٹھیکے بھی لیتے ہیں۔"

"میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ شوکت تجارت کرتے ہیں اور ٹھیکے لیتے ہیں۔" مجھ سے زیادہ ظفر کو تعجب ہوا شوکت

جو بہترین مقرر تھے بڑے اچھے ادیب تھے ——— ایک تاجر اور ٹھیکیدار کی حیثیت سے مسخرے لگتے ہوں گے ۔ میں نے سوچا ۔

راحت کا گھر مجھے بہت پسند آیا ۔ زندگی کی جتنی آسائش اور آرام بیسویں صدی اس پہاڑی علاقے میں مہیا کر سکتی تھی وہ سب راحت کو حاصل تھا !

راحت نے میرے اور بچوں کے لیے دو بہت خوبصورت اور آراستہ کمرے بنائے ۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی تو نتھیا گلی کا سارا حسن سمٹ کر میری کھڑکی کے پاس آگیا ——— ! گہرے گہرے کھڈ ——— ہموار اور ناہموار راستے ——— گھنے گھنے چیر کے درخت ——— اودے اودے بادل ——— نتھیا گلی کا چھوٹا سا بازار، ڈاک بنگلہ اور کوٹھیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں ۔ رات کے وقت نشیب و فراز پر روشنیاں اتنی نظر فریب معلوم ہوتی تھیں کہ میں پہروں اس کھڑکی میں کھڑی دیکھا کرتی تھی ۔

راحت نے محبت اور خاطر میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ۔ ہم سب وہاں بہت خوش تھے لیکن راحت کی اس محبت اور خاطر کے باوجود بھی راحت کبھی کبھی مجھے اجنبی سی معلوم ہوتی تھی ۔ پہلے راحت کی طرف جو چیز فوراً متوجہ کرتی تھی وہ اس کی ذہانت تھی اور اب اس بے تحاشہ گوشت سے لدے ہوئے ڈھانچے میں صرف اس کی آنکھیں جھپک کر کبھی کبھی کہتی تھیں کہ وہ ذہین ہیں ۔ لیکن اس کے ملبوسات کی چمک دمک نظروں کو خیرہ کر دیتی تھی اور وہ آنکھیں اپنا سارا جادو اور کشش کھو دیتی تھیں ۔ اور دیکھنے والے کی نظریں صرف لباس پر ہی مرکوز رہتی تھیں ۔ یا کبھی کبھی اس کے گالوں کی طرف اٹھتی تھیں جو کشمیری سیبوں کی یاد دلاتے تھے ۔ اس کے بال یورپ کے جدید سٹائل کے مطابق ترشے ہوئے تھے ۔ جانے کیوں مجھے اس کی دو لہراتی ہوئی چوٹیاں یاد آتی تھیں جو اس کی دبلی پتلی گردن میں کبھی آگے اور کبھی پیچھے جھولا کرتی تھیں ۔ وہ چوٹیاں جو اس کی گردن کی خوشنمائی میں اضافہ کر دیتی تھیں ۔ آج شاید اس کے بھدے پن کو بھی چھپا لیتیں ——— اس کی گردن میں اتنا گوشت تھا کہ جب وہ جھکتی تھی تو اس کی ایک ٹھوڑی کے بجائے دو ٹھوڑیاں نظر آتی تھیں ۔ راحت جو کبھی بھی کپڑوں اور زیوروں کی دلدادہ نہ تھی سارے دن یہ سوچا کرتی تھی کہ وہ شام کو کیا پہنے اور رات کو کیا پہنے ——— میں اپنے اٹیچی میں چند ساریاں ڈال کر لائی تھی وہی الٹ پلٹ کر جو بھی ہاتھ میں آتی باندھ کر نکل جایا کرتی تھی ——— راحت ایک دن کہنے لگی :

”سعیدہ، طالب علمی کے زمانہ میں تم لباس کے سلیقے کا بڑا خیال رکھتی تھیں اور ان دنوں میں لباس سے بالکل لاپرواہ تھی اور اب معاملہ برعکس ہے تم اتنی لاپرواہ کیوں ہو گئی ہو ——— !“

”دراصل میں سارا دن اسکول میں سر کھپا کھپا کر اتنی خشک ہو گئی ہوں کہ اب مجھے زندگی میں ہر رنگینی بد مذاقی معلوم ہونے لگی ہے ——— اب تو میں یہ سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں نکال سکتی کہ کیا پہنوں، بس پہن لیتی ہوں ۔ ہاں اپنی بیٹی کو اچھے کپڑے پہنا کر شوق پورا کر لیتی ہوں ۔“

”بمبئی میں تو بہت سی ایسی اسکول اور کالج میں پڑھانے والیوں کو جانتی ہوں جو بہترین لباس پہنتی ہیں اور ہر

وقت بی متوری رہتی ہیں۔"

"پھر تم یہ سمجھ لو کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں" ——— !

"تم نے یہ اسکول کا درد سر کیوں مول لے رکھا ہے ظفر کی آمدنی اچھی خاصی ہے۔"

"ظفر کی آمدنی واقعی معقول ہے لیکن میرے پاس جو وقت ہوتا ہے اچھا ہے وہ بھی کام آ جائے۔ کچھ کام کرنے سے طبیعت کتنی خوش رہتی ہے۔ اور میں ہمیشہ سے خود کو مصروف رکھنے کی عادی ہوں ——— دراصل سچ بات تو یہ ہے کہ تم متوسط طبقے کا حال نہیں جانتی ہو ——— ظفر خواہ کتنا ہی کمائیں خرچ اور آمدنی برابر ہو جاتی ہے ——— اب تھوڑا سا جو فضول خرچی کو جی چاہتا ہے تو اس کے لیے میں کماتی ہوں ——— تم تاجروں کے طبقے میں رہتی ہو۔ تم میری بات نہیں سمجھ سکو گی" !

"نہیں، میں خوب سمجھتی ہوں آخر میں تاجروں کے طبقے میں پیدا تو نہیں ہوئی تھی ——— ! میں نے بھی ایک وسیع دنیا دیکھی تھی ——— ہاں اب میں کچھ نہیں جانتی یا جاننا چاہتی ——— ! اس لیے نہیں کہ میں خود غرض ہوں اس لیے کہ شاید یہ سب جاننا بیکار ہے ——— ! ہاں جتنی قومی خدمت مجھ سے بن پڑتی ہے کرتی ہوں ——— ہم نے ایک اسکول کھولا ہے ———" میرا جی چاہا کہ کہوں کہ کہیں وہ بھی اسی تجارت کے ذیل میں نہ آتا ہو مگر اتنی پیاری دوست کا دل دکھانا مجھے اچھا نہ لگا۔

وہ مسکرا کر بولی "اچھا یہ بتاؤ تم نے گھر کہاں بنایا ہے ———؟"

میں ہنس پڑی "کہیں بھی نہیں، یہ زمین کا فرش آسمان کی چھت اور افق تک جہاں نظریں جاتی ہیں ہر طرف مجھے اپنے گھر کا احاطہ اور اپنے گھر کی دیواریں کھڑی نظر آتی ہیں اور اس دنیا میں جو بھی خوبصورتی اور دلکشی ہے سب اپنی ملکیت معلوم ہوتی ہے اس وقت تمہارا گھر اور یہ سارے گھر مجھے اپنے لگ رہے ہیں اس لیے کہ یہ سب اسی زمین پر ہیں جو میری ہے ——— !"

"ہائے تم ذرا بھی نہیں بدلی ہو۔ ہم کالج کے زمانے میں ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے اور میں تو تم سے بھی ایک قدم آگے تھی وہ اسٹوڈنٹس یونین، وہ جلسے جلوس اور تقریریں۔ کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا ہے کہ وہ چیزیں میری زندگی کا ایک حصہ تھیں۔ اب تو میرا یہ حال ہے سعیدہ کہ مجھے کراچی کے ایک اسکول کا افتتاح کرنا تھا۔ میں تقریب میں کچھ ایسی پریشان سی ہو گئی بڑی مشکل سے میں نے چند الفاظ کہے۔" میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا ——— ! کیا وہ اتنی بدل سکتی ہے ———؟ اچھا تھا کہ وہ انسانوں کی بھیڑ میں کھو گئی تھی۔ کاش وہ کبھی نہ ملتی۔ اب وہ ملی ہے تو راحت نہیں راحت کا مذاق معلوم ہوتی ہے۔

"سعیدہ تم نے جو کتابیں میری شادی پر دی تھیں وہ میں نے کراچی میں اتنی احتیاط سے اپنے ڈرائنگ روم میں سجا رکھی ہیں۔ جب انھیں چھوتی تھی تو تم یاد آ جاتی تھیں ——— وہ گزرے ہوئے شب و روز، اب تو گھر میں کسی سے

اس زمانے کی باتیں کروں تو لوگ یقین نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ میں شیخی بگھار رہی ہوں ۔ ! ایک دفعہ ایک مباحثہ سننے کو گئی ۔ مباحثے کے بعد جب میں نے اپنی چند ملنے والیوں سے کہا کہ میں اپنے کالج میں بہترین مقررہ سمجھی جاتی تھی تو ان سب نے مسکرا کر اس طرح دیکھا کہ میرا دل دکھ سے بھر گیا ۔ میں نے ان سے کہا تو وہ کہنے لگے تم چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہو ـــــ لو بھلا یہ چھوٹی سی بات ہے ؟

"آج کل تمھیں کون سے مصنف پسند ہیں ؟ تم کیا پڑھتی ہو ـــــ ؟

وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی ۔ "سعیدہ مجھے پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا ہے ـــــ اتنی پارٹیاں ' اتنے فنکشن ـــــ پھران کی تیاری گھر پر ہر وقت لوگوں کا آنا جانا ـــــ دعوتیں ـــــ ! تم سوسائٹی میں MOVE نہیں کرتی ہو ۔ ایک بار انسان سوسائٹی میں قدم رکھے تو بس سوسائٹی کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے ـــــ ! یقین جانو روزانہ بارہ بجے رات سے پہلے گھر واپس نہیں آ سکتی ہوں ۔"

"میں تو سمجھتی تھی کہ میرے پاس ہی وقت نہیں ہوتا مگر میں تو رات کو پڑھنے کو اچھا خاصا وقت نکال لیتی ہوں ۔ !"

"اچھا آج تو باتوں میں اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ نوکر کو پکانے کی ہدایت دینی ہے ـــــ اچھا یہ بتاؤ آج کیا کھاؤ گی ـــ ؟ ہے تو چھوٹی سی جگہ مگر کھانے کی ہر چیز مل جاتی ہے ۔ مرغیاں تو اتنی سستی ہیں اور میرے میاں کا قول ہے جب مرغ سستا مل سکتا ہے تو کوئی اور چیز کھانا حماقت ہے ـــــ اچھا آج تمھارے لیے خود روسٹ کروں گی ـــــ ؟

"رہنے دو اتنی تکلیف کیوں کرتی ہو نوکر اچھا خاصا پکا لیتے ہیں ۔"

"سعیدہ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں کھانا پکانا بھول گئی بلکہ میں بہترین کھانے پکاتی ہوں ـــــ ! تمھیں شاید معلوم نہیں شوکت کو اچھے کھانے کا کتنا شوق ہے ۔ ویسے ان کی خوراک بہت کم ہے ۔ اس لیے پکاتی تو ان کے لیے ہوں مگر کھانا مجھے پڑتا ہے اسی لیے تو اتنی موٹی ہو رہی ہوں ۔ ایک دفعہ ڈائٹنگ کی یقین کرو دو مہینے میں دس پونڈ وزن کم ہو گیا مگر جب اُبلے اُبلے کھانوں سے طبیعت بدمزہ ہو گئی تو پھر میں نے ڈائٹنگ سے کان پکڑے اور انتقاماً کھانا شروع کیا پھر ایک ماہ میں دس پونڈ کے حساب سے وزن بڑھنا شروع ہو گیا ۔ تم بتاؤ تم نے ایسا اچھا جسم کیسے بنا رکھا ہے ـــــ ؟ کیا راز ہے ؟"

میں ہنس پڑی ۔ "راز تو کوئی نہیں ہے ۔ میں نے تو ساری زندگی ڈائٹنگ نہیں کی ۔ بس ہم کھانے کے شوقین نہیں ہیں ۔ سیدھا سادا کھانا کھاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جب تھکی ہاری گھر پہنچتی ہوں تو نوکر جیسا بھی بدمزہ کھانا سامنے رکھ دیتا ہے ڈٹ کر کھاتی ہوں ـــــ ! بھوک میں ہر چیز مزیدار معلوم ہوتی ہے ـــــ خدا کا شکر ہے ظفر کو بھی کھانے کا شوق نہیں ہے ۔"

"ہائے شوکت کا تو یہ حال ہے کہ اگر ذرا بھی ذائقہ خراب ہو تو ڈونگا نوکر کے منہ پر دے مارتے ہیں ۔ ان کی طبیعت میں اس قدر غصہ ہے اور اسی لیے میں باوجود اتنی سوشل ہونے کے باورچی خانے سے لاپروا نہیں رہ سکتی ۔ شوکت کے ذوق کی وجہ سے کراچی بھر میں ہمارے گھر کے کھانے مشہور ہیں ۔ پسندے اور مرغِ مسلم میری سسرال کے خاص نسخے سے پکایا جاتا

ہے۔ بعض بعض تراکیب میری ساس نے مجھے خاص طور پر سکھائی تھیں اور اب میں نے ان میں اتنا کمال حاصل کر لیا ہے کہ میری سسرال والوں کا خیال ہے میں ان سے زیادہ اچھا پکاتی ہوں۔"

وہ واقعی اتنی ہنرمند اور ذہین تھی جس طرف بھی متوجہ ہوتی اس میں کمال حاصل کر لیا کرتی تھی اور اب کوئی تعجب نہیں اگر اُسے کھانا پکانے میں کمال حاصل ہے! میں جتنے دن اس کے گھر رہی اُس نے اپنے ہاتھ سے اچھے اچھے کھانے پکائے۔ وہ دن میں کئی مرتبہ پوچھتی "اچھا بتاؤ کیا کھاؤ گی ——— ؟" میں کہتی "چھوڑو جو پک جائے گا کھا لیں گے۔ چلو بیٹھ کر باتیں کریں یا گھومیں" ——— وہ سمجھتی تھی کہ بہترین خاطر صرف بہترین کھانا ہے۔ وہ کئی کئی گھنٹے باورچی خانے میں گزارتی تھی۔ اس کے دونوں لڑکے بڑے ذہین اور شریر تھے وہ سارا دن احمد اور جاوید کے ساتھ گھوما کرتے تھے۔ فوزیہ زیادہ تر راحت کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ ان دونوں نے ایک دُوسرے کو بہت پسند کیا تھا۔ میری بیٹی سارے دن اس سے اپنے ناخونوں پر پالش کرواتی ——— بال سنوارواتی ——— اور بار بار فراک بدلوانی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ راحت کو میری بیٹی میں شاید مجھ سے زیادہ اچھی دوست مل گئی ہے! کم از کم لباس اور آرائش و زیبائش میں دونوں ہم مذاق معلوم ہوتی تھیں۔ کھانے کا شوق میری بیٹی کو بالکل نہیں تھا۔ اس لیے راحت اُداس ہو جاتی۔ "تمھاری بچی کچھ نہیں کھاتی۔" وہ بڑے ملال سے کہتی اور سو سو جتن کر کے اسے کھلانے کی کوشش کرتی۔ مگر فوزیہ راحت کے شاندار میٹھوں سے عاجز آ گئی تھی اور اُس نے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ جب وہ دیکھتی کہ سارا گھر کھانے کے لیے خوشامد کر رہا ہے تو اترا جاتی اور بڑی مشکل سے توس اور دُودھ کی پیالی حلق سے اُتارتی۔

ایک دن میں نے راحت سے کہا "تمھارے گھر اخبار نہیں آتا ——— یا تمھیا گلی میں اخبار نہیں ملتے ——— ؟"

وہ ہنس پڑی "دراصل اخبار تو ملتے ہیں لیکن مجھے اخبار پڑھنے کی عادت ہی نہیں رہی۔ خبریں ریڈیو پر سُن لیتی ہوں۔ اس لیے منگوانے کا خیال نہیں آیا تُم نے اور ظفر بھائی نے بھی نہیں کہا ورنہ منگوا لیتی ———"

"ظفر نے بازار میں دیکھا وہاں بھی نہیں ملا اس لیے ہم نے سوچا شاید یہاں اخبار نہیں آتے۔" راحت اخبار نہیں پڑھتی یہ خبر بھی میرے لیے صدمے سے کم نہ تھی۔ میں اداس ہو گئی۔ طالب علمی کے زمانے میں ہم دونوں کو اخبار پڑھے بغیر روٹی ہضم نہ ہوتی تھی۔ کئی کئی اخبار راحت کے گھر آتے تھے اُس زمانے میں ریڈیو تو حکومت کا تھا مگر اخبار عوام کے تھے۔ کیسے اچھے اچھے اخبار نکلا کرتے تھے۔ ہم اچھے مضامین کاٹ کاٹ کر فائل میں رکھ لیا کرتے تھے۔ وہ مجھے چپ دیکھ کر بولی "تم بھی چند روز اخبار نہ پڑھو ——— دُنیا کے سارے جنجالوں میں سر کھپانے کا آخر کیا فائدہ ——— مجھے تو اخبار پڑھ کر کوفت سی ہوتی ہے ایک بھی ڈھنگ کی خبر نظر نہیں آتی جسے پڑھ کر جی خوش ہو کہیں قحط، کہیں طوفان، کہیں زلزلہ ——— یہاں لڑائی وہاں فساد ———"

یہ سب کہنے کے باوجود اس نے اسی دن سے انگریزی اور اُردو کے کئی اخبارات منگوانے شروع کر دیے۔ کبھی کبھی رسمی طور پر وہ بھی اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیتی جس طرح فوزیہ تصاویر کی خاطر اخبار دیکھا کرتی ہے۔

ایک دن راحت اپنی دراز سے چند عورتوں کے رسائل نکال کر لائی اور کہنے لگی۔"تو ان میں بہت اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ تمہیں کسی کسی رسالے میں میرا نام بھی نظر آجائے گا۔"

"تمہارا نام ——— تم لکھتی ہو؟" میں خوش ہو کر چلاّئی۔

"میں اکثر کھانا پکانے کی ترکیبیں بھیجا کرتی ہوں!" اب تو میرے ہوش و حواس پر سچ مچ بجلی گری "اچھا ———" میرے اندر کوئی مُردہ بولا۔

وہ میرے احساسات سے بے خبر مُسکرا رہی تھی۔ بڑی شفیق اور معصوم مُسکراہٹ۔ وہ جو کالج کے زمانے میں میگزین کی ایڈیٹر ہوا کرتی تھی اور وہ جو بہترین مضامین لکھا کرتی تھی میں آج پندرہ سال بعد اسے بہت آگے دیکھنا چاہتی تھی ——— !

وہ بڑے فخریہ انداز سے بولی۔"کھانا پکانے کی کتابیں جمع کرنا بھی میرا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ ڈھیروں ہندوستانی، انگریزی، فرانسیسی اور چینی کھانوں کی کتابیں میرے پاس ہیں۔ کچھ تو یہاں بھی میرے ساتھ ہیں میں تمہیں دکھاؤں گی۔ شوکت کھانا پکانے میں تو اناڑی ہیں مگر انھیں ایسا کمال حاصل ہے کسی بھی مُلک کے کھانے کی کوئی بھی ڈش چکھ کر اس کا صحیح نام بتا دیتے ہیں۔ مجھے چینی اور فرانسیسی کھانے پسند ہیں۔ عرب، شام اور مصر کے کھانے تو بہت کچھ ہم سے ملتے جلتے ہیں۔ بعض چیزیں اٹلی کی بھی اچھی ہوتی ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو سارے جہاں میں ہمارے ہندوستانی اور پاکستانی کھانے کا جواب نہیں ——— !"

جانے کیوں میں اس موضوع پر کچھ نہ بول سکی۔ دیسی کھانا میں بھی اچھا پکا لیتی ہوں اور انگریزی کھانوں میں مجھے صرف میٹھے پسند ہیں اور میں مختلف طریقوں کے کیک اور پڈنگ تیار کر لیتی ہوں مگر راحت کے سامنے گویا میں طفلِ مکتب تھی اس لیے میرا کھانوں پر تبصرہ نہ کرنا ہی مناسب تھا ——— !

"تم شوکت سے ملو گی تو بہت خوش ہو گی۔ دیکھ لینا کسی دن وہ اچانک ٹپ سے آٹپکیں گے!"

ایک دن سچ مچ شوکت ٹپ سے آٹپکے ——— ! شوکت بالکل وہی شوکت تھے جنھیں میں نے پندرہ برس پہلے دیکھا تھا۔ تھوڑے سے موٹے زیادہ ہو گئے تھے مگر مردوں پر ایک عمر میں اتنا موٹاپا اچھا لگتا ہے۔ وہی ذہانت اور تیزی وہی مذاق ——— ! شوکت کے آنے سے نتھیا گلی کی سونی سونی سی زندگی ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی ——— ! شوکت جن ممالک میں گئے تھے ان کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا جبکہ راحت نے صرف وہاں کے کھانے سیکھے تھے۔ ان کی گفتگو سے وسیع مُطالعہ اور مشاہدہ جھلکتا تھا۔ پندرہ برس پہلے کا شوکت ذہانت اور قابلیت میں اس شوکت کے آگے بچہ لگتا تھا۔ اور یہ دیو ——— ! شوکت کی شخصیت نے مجھے اور ظفر دونوں کو مرعوب سا کر دیا۔ ہم ان کے مقابلے میں خود کو بالکل جاہل معلوم ہوتے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں صرف بچوں کو پڑھا سکتی ہوں لیکن جو کچھ میں بچوں کو پڑھا رہی ہوں وہ سب غلط ہے جیسے تاریخ، جغرافیہ اور حساب سب کچھ بدل گیا ہے۔ مگر مجھے

نہیں معلوم ——— ! ظفر کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ انسانوں کی بیماریوں کو سمجھ سکتے ہیں اور ان کا تجزیہ کر سکتے ہیں لیکن انسانوں سے ان کا کبھی واسطہ نہیں رہا ہے۔ انسان کیسے سوچتے تھے، کیسے محسوس کرتے ہیں اور زندگی میں کس طرح عمل کرتے ہیں جیسے یہ سب ان کی سمجھ سے باہر ہے۔

شوکت کا رُعب داب اور شخصیت یوں سارے ماحول پر چھا گئی کہ ہم دونوں خود کو احساس کمتری میں مبتلا محسوس کرنے لگے۔ میں نے سوچا یہ وہ شخص ہے جس نے راحت کو شکست دی تھی اور اسی لیے راحت نے اس آدمی سے محبت کی ہے!

میں نے گھبرا کر سوچا کوہ ہمالیہ کے بلند اور عظیم سلسلہ کی طرح ہر طرف یہی شخص کیوں چھایا ہوا ہے —— آخر اور بھی تو لوگ ہیں! اس آدمی کی شخصیت نے راحت کو ختم کر دیا۔ راحت صرف اس کے پیروں کی جوتی بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے لیے اچھے اچھے کھانے پکاتی ہے۔ اس کے لیے بنتی اور سنورتی ہے۔ گھر سجاتی ہے —— اس کی پوزیشن کی نمائش کے لیے زرق برق لباس اور زیور پہنتی ہے اور اس کی اپنی شخصیت ان دبیز تہوں میں چھپتی جاتی ہے —— اب ہر طرف یہی ہے —— راحت کہیں بھی نہیں ہے، اُف یہ ظالم آدمی —— ! اس کی یہ بھاری بھرکم شخصیت اس کے پاس جو چیز آتی ہے چھپ جاتی ہے یا کچل جاتی ہے۔ میں نے ظفر کو دیکھا —— ظفر نے مجھے کبھی شکست دینے کی کوشش نہیں کی۔ ظفر نے ہمیشہ میرے ساتھ چلنا پسند کیا ہے۔ ہم اکٹھے محنت کرتے ہیں۔ سیر تفریح کرتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں۔ مجھے اس لمحہ ظفر سے انتہائی محبت محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا، اتنی رفعت، اتنی عظمت اور ذہانت کس کام کی جو دوسروں کو ہر وقت کچھ نہ ہونے کا احساس دلائے اور اس طرح احساسِ کمتری دوسرے فرد کو بالکل ختم کر ڈالے —— ! مجھے شوکت سے انتہائی نفرت محسوس ہوئی اس نے میری دوست کو مار ڈالا —— ! یہ موٹی عورت جو زرق برق کپڑے پہنتی ہے۔ نفیس کھانے پکاتی ہے۔ زندہ دلی سے سوسائٹی میں گھومتی ہے مسز شوکت ضرور ہے مگر یہ راحت ہرگز نہیں ہے۔ کسی زمانے میں یہ راحت ہو گی مگر اب نہیں ہے!

میں بھی اپنا گھر سجاتی ہوں۔ اپنے ہاتھ سے اپنے میاں اور بچوں کے لیے کوئی اچھی چیز بھی پکا لیتی ہوں —— مگر اس میں میرے ارادے اور میری مرضی کو دخل ہوتا ہے۔ مجھے یہ خوف نہیں ہوتا کہ ظفر کو اگر یہ چیز یوں نہ ملی تو وہ کھانا نہیں کھائے گا اور نوکر کے مُنہ پر ڈونگا دے مارے گا —— ! اور اس لیے میں اپنی انفرادیت کے ساتھ زندہ ہوں —— میں وہی ہوں جو آج سے پندرہ برس پہلے تھی —— میں آگے بڑھ رہی ہوں —— میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے —— میں نے سوچا ظفر بہت اچھا آدمی ہے —— ورنہ میں بھی مر جاتی ——!!

شوکت کے آنے کے بعد راحت اور زیادہ باورچی خانے کی ہو گئی۔ شام کو جب ہم سب اس کے خوبصورت لان میں بیٹھتے اور شوکت باتیں کرتا تو راحت آرام کرسی پر لیٹی پیار سے اس کی صورت تکا کرتی۔ اس کی نظریں اتنی محبت اور آسودگی کا اظہار کرتیں جیسے وہ دُنیا کی سب سے خوش قسمت عورت ہے جو دُنیا کے سب سے بڑے آدمی کی بیوی ہے! اس لیے

میں سوچتی عورت خدا نے اسی لیے تو بنائی تھی کہ آدم تنہا تھے ——— خدا نے آدم کی بوریت کا گویا علاج تجویز کیا تھا کہ عورت بنادی تھی اور تب سے آج تک عورت کا مقصد صرف بوریت دُور کرنا ہے ———! عورت بھی یہی حیثیت زیادہ پسند کرتی ہے۔ میری نظر راحت کی ایرانی بلّی پر پڑی۔ سفید سفید بالوں والی موٹی تازی بلّی جو ہر وقت اپنے مالک کی گود میں بیٹھی غرّایا کرتی ہے ———! اور اس طرح غرّا غرّا کر وہ بھی آسودگی کا اظہار کرتی ہے اور راحت غرّانے کے بجائے مُسکراتی ہے۔ راحت سچ مچ مردوں کا آئیڈیل ہے۔ شاید ظفر کو بھی شوکت پر رشک آتا ہو۔ میں نے گھبرا کر ظفر کی طرف دیکھا ——— مجھے صُبح سے اپنے جانے کی فکر ہوتی ہے ——— بچّوں کی تیاری کی، اپنی تیاری کی بھاگ دوڑ ——— اور پھر دوپہر کو جب میں واپس آتی ہوں تو تھکن سے بالکل بوجھل ہوتی ہوں۔ میں ظفر کے آرام اور راحت کا اس طرح خیال نہیں رکھ سکتی جس طرح راحت اپنے میاں کا خیال رکھتی ہے۔ اس کیلیے ہر وقت اہتمام کرنا کھانا تیار کروانا ——— کونسا سُوٹ پہنے گا، کونسی ٹائی اچھّی لگے گی، موزے اور جوتے کیسے ہوں۔ ظفر کا کام بھی مُختلف نوعیت کا ہے۔ آسے اپنے مریضوں کے پاس ٹھاٹ باٹ سے جانے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی جیسی اُلٹی سیدھی ساڑھیاں میں پہنا کرتی ہُوں ظفر بھی ایسے ہی اُوٹ پٹانگ سُوٹ پہن کر نکل جاتا ہے۔ چند ہی تو سُوٹ ہیں جو وہ باری باری پہن لیتا ہے اگر شوکت کے پاس بھی اتنے ہی کپڑے ہوتے تو راحت کا دردِ سر کم ہو جاتا تو پھر یہ شوکت کا قصور نہیں ہے جو راحت اب صرف مسز شوکت نظر آتی ہے یہ ان ڈھیر ساری کوٹھیوں، بنگلوں اور جگمگاتے ہوئے سکوں کا قصور ہے جو شوکت کے بینک بیلنس کی صُورت میں اس طرح بڑھتے اور پھیلتے جا رہے ہیں جیسے زمین پر حشرات الارض!

ایک دن راحت نے پیار سے فوزیہ کو لپٹا کر کہا "بھئی سعیدہ اب فوزیہ میری بیٹی ہے اور تمھارے پاس میری امانت ہے جب یہ بڑی ساری ہو جائے گی تو میں اسے لے آؤں گی۔" اس نے اپنے ذہین اور فطین بیٹے کی طرف دیکھا جو لان میں گھوڑے کی سواری کر رہا تھا۔

میں ہنس پڑی "واہ محنت میں کروں اور پال پوس کے تمھارے حوالے کر دوں۔ ایسی ہی محبّت ہے تو ابھی سے لے لو۔"

"ہاں، ہاں میں تو بالکل تیار ہوں تم ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے کہو۔"

فوزیہ گھبرا کر اس کی گود سے اُتری۔ "نہیں نہیں خالہ جان میں تو اپنے ابّو کے پاس رہوں گی۔" سب ہنس پڑے۔ بات ختم ہو گئی! مگر میں لرز گئی گئی۔ فوزیہ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ میں چاہتی ہُوں وہ اپنے باپ کی طرح ڈاکٹر بنے اس کی زندگی کا ایک مقصد ہو۔ وہ دُنیا میں کچھ کام کرے۔ اگر اسے راحت لے آئی تو وہ راحت کے بیٹے کے لیے جیے گی۔ ریشمی گدے اور لحافوں میں آرام سے لیٹی رہے گی۔ سارا دن کپڑوں اور زیوروں کے انتخاب میں گزر جائے گا رات کے بارہ بجے پارٹیوں سے لوٹا کرے گی۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہوگا راحت کے بیٹے کے لیے مزیدار کھانے پکانا ——— ساری دُنیا کے کھانوں کی کتابیں جمع کرے گی اور شاید رسالوں میں کھانا پکانے کی ترکیبیں بھی بھیجا کرے گی۔ مجھے

پھریری سی آئی۔ اچانک راحت کی سفید سفید ریشمی روئیں والی بلّی کُشن سے کود کر نیچے آگئی۔ میں نے سوچا زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور جینے کے لیے ملتی ہے۔ انسانوں کی طرح جینے کو ــــــ بلیوں کی طرح جینا بھی کوئی جینا ہے ــــــ! یہ عورتیں بلیوں کی طرح جینا کیوں پسند کرتی ہیں۔ اس طرح جینے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ مجھے وہ بہت سی موٹی موٹی پھولی پھالی بیگمات یاد آگئیں جو کبھی کبھی اپنے بچوں کی خبر لینے اسکول میں داخل ہوتی ہیں ــــــ! جھلملاتے ہوئے لباس اور ساریاں ــــــ آگے کو نکلے ہوئے بڑے بڑے پیٹ ــــــ کیسے ٹھسے سے وہ کلاس کے باہر کھڑی ہو کر استانی کو دیکھتی ہیں جیسے وہ ایک ادنیٰ اور حقیر چیز ہے جو تھوڑے سے معاوضہ کی خاطر ان کے بچے کو پڑھاتی ہے ــــــ ایسے ہی جیسے ان کے گھروں میں اردلی، خانساماں اور آیائیں ہوتی ہیں ــــــ! اُستانی سے اپنے بچے کے بارے میں دو چار باتیں کر کے اُنھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اُنھوں نے وقت خراب کیا ہے بلکہ اس مربیانہ اور سرپرستانہ انداز سے پلٹ جاتی ہیں جیسے دو چار باتیں کر کے احسان کر گئیں ہیں۔ یہ ساری عورتیں، یہ بلیوں کی طرح جینے پر کتنی نازاں ہیں۔ راحت تو کم از کم کھانے پکانے کے فن میں مہارت حاصل کر چکی ہے مجھے وہ عورتیں یاد آئیں جو فخر سے کہتی ہیں کہ "سارا دن لیٹے لیٹے تھک گئی ــــــ بارش کی وجہ سے کہیں ملنے بھی نہ جا سکی"!

ایک صاحبہ کہا کرتی تھیں کہ "سارا دن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وقت کیسے گزاروں اس لیے سیر کے بہانے اسکول چلی آتی ہوں کہ چلو سیر بھی ہو جائے گی اور بچے کو بھی دیکھتی آؤں گی کہ کیا پڑھ رہا ہے؟"

راحت کم از کم باورچی خانے میں تو جاتی ہے ــــــ میاں کے آرام اور آسائش کا تو خیال رکھتی ہے ــــــ! سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اللہ میاں کی خدمت کو صرف فرشتے کافی تھے تو آخر آدم کو عورت کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی! ظاہر ہے عورت کام کے لیے نہیں ہے اس کی زندگی کا مقصد صرف بوریت دُور کرنا ہے ــــــ! تھکن کا علاج کرنا ــــــ اور جو خود چکری کی طرح کام کر کر کے تھک جائے وہ دُوسرے کی تھکن کیوں کر دُور کر سکتی ہے ــــــ!

میں نے سوچا اگر فوزینہ ڈاکٹر بن گئی تو ہر وقت طرح طرح کی بیماریوں میں مُبتلا لوگوں میں گھری رہا کرے گی۔ میں تو کم از کم اچھے گھرانے کے صاف ستھرے ہنستے کودتے بچوں کے درمیان وقت گزارتی ہوں اور بیچاری فوزینہ دُوسروں کے دُکھ اور بیماریاں دیکھ دیکھ کر کہیں خود بھی دُکھی اور بیمار نہ بن جائے۔

کیسی تھکی ہاری فوزینہ شام کو آیا کرے گی اور ڈاکٹر کو کہاں چین ملتا ہے ــــــ اپنے باپ کی طرح رات کو دوڑ رہی ہے اور کبھی صبح سویرے ــــــ! اور ایک آدمی اپنے لیے جیتا ہے خواہ وہ شوکت ہو، ظفر ہو یا کوئی اور ــــــ وہ گھر میں سلیقہ اور ترتیب چاہتا ہے ــــــ بچے چاہتا ہے ــــــ تفریح چاہتا ہے ــــــ! ایک عورت وہ کہاں کہاں جان مارے ــــــ کس کس طرف دیکھے ــــــ! میرے دِل نے کہا فوزینہ کو راحت کے حوالے کر دو ــــــ راحت کے ڈرائنگ رُوم میں، دو بلیاں ہو جائیں گی۔ آرام سے رہے گی ــــــ! راحت نے ذراسی بات کہہ کر میرا دماغی سکون چھین لیا۔ فوزینہ پندرہ سولہ برس بعد خود زیادہ اچھی طرح یہ فیصلہ کر سکے گی کہ اسے کونسی زندگی پسند ہے! لیکن اگر

بلی کی زندگی آئیڈیل ہے تو پھر لکھنے پڑھنے کا کیا فائدہ ———؟

راحت کے ایرانی قالین ——— سرسراتے ہوئے ریشمی پردے ——— آراستہ و پیراستہ کمرے۔ جانے کیوں مجھے ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ میں گھبرا گئی ——— مجھے اپنا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر یاد آنے لگا۔ جہاں ڈرائنگ روم میں ایک سادی سی دری پر ایک سن کا قالین پڑا ہے۔ ہلکا سا صاف ستھرا فرنیچر ہے ——— میری کتابیں ہیں ——— میرے ہاتھوں سے لگائے ہوئے پودے ہیں اور وہ چیزیں ہیں جو میں نے اور ظفر نے پندرہ برس میں انتہائی محنت اور عرق ریزی سے حاصل کی ہیں ——— گھر کی بالکل چھوٹی چھوٹی چیزیں ———!

میری چھوٹی سی لکھنے پڑھنے کی میز ——— چھوٹا سا لیمپ ———! میرا گھر مجھے ہزاروں کوسوں سے آوازیں دینے لگا ———! میں بے چین ہو گئی ———! میں گھر جاؤں گی ———! اب اسکول کھلنے والا ہے ——— مجھے اپنے ڈھیر سے شاگرد یاد آئے۔ ہزاروں ننھے منے ہشاش بشاش چہرے، میرے ساتھ کام کرنے والی استانیاں! میں نے سوچا راحت پندرہ برس پہلے میری دوست ضرور تھی مگر سچ پوچھو تو آج ہم اجنبی ہیں۔ ہماری زندگی بالکل مختلف ہے۔ ہم میں کوئی بات بھی تو مشترک نہیں ہے۔ ہاں وہ پندرہ سال ہمارے مابین مشترک ہیں۔ اور میری ساتھی استانیاں میرے طبقے کی عورتیں ہیں۔ میرے ان کے دکھ سکھ اور مسائل سب ایک جیسے ہیں۔ ہم ایک جیسے کپڑے پہنتے ہیں اور ایک جیسی باتیں کرتے ہیں اور اپنی اپنی زندگیوں کو بہتر اور خوشگوار بنانے کی جد و جہد کرتے ہیں اور اس طرح اس ان تھک تگ و دو کے بعد جب ہم کچھ حاصل کرتے ہیں کوئی چھوٹی سی چیز ہی خرید لیتے ہیں تو کتنے خوش ہوتے ہیں! مجھے اپنی ساتھی استانیاں شدت سے یاد آئیں۔ ظفر بھی شاید کچھ اسی طرح سوچ رہے تھے۔ کہنے لگے "اب کسی طرح راحت کو راضی کرو ——— بہت سیر و تفریح کر لی اب اپنے گھر چلیں"!

یہ سن کر مجھے ایک طرح کی خوشی سی ہوئی مجھے اطمینان ہوا کہ ظفر کو بھی اپنی زندگی پسند ہے۔ اسے شوکت پر رشک نہیں آتا ——— یہ کتنی اچھی بات ہے!

جب راحت سے کہا کہ اب گھر جانے دو تو وہ کسی طرح تیار نہ ہوتی تھی ——— "پندرہ برس بعد ملے ہیں ابھی تو پوری باتیں بھی نہیں ہوئیں۔ ابھی تمھاری چھٹی باقی ہے ظفر تھوڑی سی چھٹی لے سکتے ہیں۔"

"ظفر نے یہ پہلی مرتبہ چھٹی لی ہے یہ تو چھٹی کے قائل ہی نہیں ہیں۔"

ظفر نے کہا۔ "مجھے اپنے مریض شدت سے یاد آ رہے ہیں۔"

شوکت ہنس کر بولے "مریض یا کوئی مریضہ ———!" سب ہنس پڑے۔

میں نے راحت سے کہا کہ وہ واپسی میں ہمارے گھر ضرور ٹھہرے گی۔ اسے ہمارے گھر میں وہ آرام تو نہیں مل سکتا جو یہاں حاصل ہے لیکن اس کے آنے سے ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔ راحت نے وعدہ کیا کہ وہ آئے گی اور اطمینان سے ہمارے ساتھ رہے گی کیونکہ اسے چھٹی ہی چھٹی ہے ———! وہ ہنس پڑی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک

آئے۔ اتنے بہت سے آنسو کہ میں سمجھ نہ سکی کہ وہ رو رہی ہے یا ہنس رہی ہے ——— ! وہ ضرور ہنس رہی ہوگی !

جب ہم راحت کے گھر سے رخصت ہوئے تو میں اداس ہوگئی۔ پندرہ برس پہلے وہ میری سب سے عزیز دوست تھی ! یہ پندرہ سال زندگی کی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہیں ——— وہ ماضی بن کر بھی موجود ہیں ——— ! راحت آج بھی اتنی ہی مخلص اور پیاری ہے ——— ! کتنے پیار اور محبت سے رخصت کر رہی ہے ——— ! مگر ہم پندرہ برس پہلے جس طرح ایک دوسرے کے قریب تھے آج اس طرح ایک دوسرے کے قریب نہیں ہو سکتے۔ میں تو اس راحت سے ملنا چاہتی تھی جو پندرہ برس پہلے میری طرح سوچتی تھی ——— اور اسی ایک طرح سوچنے کی وجہ سے میرے قریب تھی ! اور اب پندرہ سال بعد میں راحت کے بجائے مسز شوکت سے رخصت ہو رہی تھی ——— کتنی اچھی ہیں مسز شوکت۔ محبت اور خلوص کی پتلی ——— ! جب میں جیپ میں بیٹھ گئی تو اس نے اداس ہو کر میرا ہاتھ پکڑ لیا ——— "سعیدہ تمہارے ساتھ گزرا ہوا زمانہ لوٹ آیا تھا۔ کیسی پیاری زندگی گزاری تھی ہم نے ——— تمہارے علاوہ اب اس زندگی کی کوئی بھی تو یادگار میرے پاس نہیں رہی ——— !" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ میرے دل پر چوٹ لگی ——— تو راحت اس زندگی سے خوش نہیں ہے ! راحت اس زندگی کو زندگی کی معراج نہیں سمجھتی ——— ! ہر شخص دنیا میں اپنی پوری قدر و قیمت کے ساتھ جینا چاہتا ہے ——— کچھ کرنا چاہتا ہے ——— خواہ وہ بالکل معمولی ہی کام کیوں نہ ہو۔ اور چھوٹے چھوٹے سے لوگ چھوٹے چھوٹے کام کر کے کتنے خوش رہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ زندگی ہے ! میں نے راحت کو ہمدردی سے دیکھا !

راحت جلدی سے کمرے میں گئی اور اپنے ہاتھوں سے ایک بہت بڑا ناشتے دان اٹھا کر لائی ——— "لو یہ تمہارے اور بچوں کے ناشتے کے لیے کچھ چیزیں ہیں۔"

"ہائے راحت اتنا تو کھا کر بیٹھے ہیں اور اب تم نے ——— ! اتنی تکلیف کی۔"

"میں نے خود سب چیزیں بنائی ہیں تم کھا کر تو دیکھنا۔ یہ مٹھائی میری خاص ایجاد ہے ——— اور کیک میں نے سوئس (swiss) ترکیب کے مطابق بنایا ہے۔ تم ضرور کھانا ——— مجھے بڑی خوشی ہوگی ——— شوکت کو swiss کیک بہت پسند ہیں۔ تم بھی پسند کرو گی ——— !"

آنسوؤں سے میرا حلق نمکین ہو گیا ! شوکت کو سوئٹزرلینڈ کے کیک پسند ہیں۔ یہ بات وہ اکثر بتایا کرتی تھی۔ کاش مجھے پندرہ برس پہلے یہ بات معلوم ہوتی کہ شوکت ایک اچھے مقرر اور ذہین طالب علم کے علاوہ اچھے کھانوں کے شوقین بھی ہیں تو میں راحت کو ہرگز شادی نہ کرنے دیتی۔ اس نے شوکت کو اسٹیج پر دیکھا تھا کاش وہ کسی دعوت میں کھانے کی میز پر شوکت سے ملتی تو وہ ہرگز شوکت کا انتخاب نہ کرتی۔ اس لیے کہ اس زمانے میں اسے کھانے سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا ——— ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اس کی آنکھوں میں خلوص اور درد تھا ——— ! ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور پھر چھوڑ دیا ——— ! جیپ چل پڑی۔ فوزیہ زور زور سے ہاتھ ہلا کر سب کو خدا حافظ کہہ

رہی تھی ——— اور راحت اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی ——— ! جیپ آہستہ آہستہ پہاڑی ڈھلانوں پر سے اُترنے لگی۔ میں نے ایک بار گردن موڑ کر راحت کے گھر کو دیکھا ——— بڑے بڑے چیڑ اور چنار کے درخت، سنّاٹا اور سکون ——— ! اور پھر مجھے راحت کی محبّت اور دُکھ سے بھری آنکھیں یاد آئیں ——— اور راحت کی ایرانی بلّی یاد آئی ——— میرا جی چاہا کہ میں پھُوٹ پھُوٹ کر روؤں ——— ! مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنی دوست کی لاش چیڑ کے گھنے درختوں تلے دبا کر لوٹ رہی ہُوں ——— !

میری دوست جو پندرہ برس پہلے مر گئی تھی اور جو میرے تخیّل میں آج تک زندہ تھی۔ کاش مجھے مسز شوکت نہ ملتیں اور راحت میرے تخیّل میں ہمیشہ زندہ رہتی ——— ! جیپ ڈھلانوں پر سے اُتر کر سڑک پر آگئی۔ میں نے پھر اس سمت دیکھا جہاں چیڑ کے گھنے درختوں کے سائے میں میری دوست کا مزار ہے جس کی چھت سُرخ رنگ کی ہے۔ میں نے اپنے آنسوؤں کو اس کی یاد میں بہنے دیا ——— !

اے سٹڈی اِن بورڈم

کرتار سنگھ دُگل

سونے کا کمرہ، کھانے کا کمرہ، برآمدہ، گیلری۔ گیلری، برآمدہ، کھانے کا کمرہ، سونے کا کمرہ —— اینی ٹہل رہی ہے۔

اینٹ کی دُوگّی، پان کی پنجی، حکم کی بیگم —— سامنے گول کمرے میں اینی کا خاوند تاش کھیل رہا ہے۔

ٹپ ٹپ۔ ٹپ ٹپ۔ ٹپ ٹپ۔ باورچی خانے میں نل ٹپک رہا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی۔ نیچے گلی میں پھیری والا آواز لگا رہا ہے۔

سونے کے کمرے میں پلنگوں کی چادریں جھاڑ جھٹک کر اُن پر پلنگ پوش بچھے ہیں۔ ابھی ابھی دُھل کر آئے پلنگ پوش، جن میں سے دھوبی کی استری کی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔ صاف ستھرے۔ اینی اب پلنگ پر بھی نہیں بیٹھ سکتی۔ ایک بار نوکر صفائی کر کے ہٹا ہے۔ بار بار وہ تھوڑے ہی آئے گا اور پھر اُسے اور بھی تو کئی کام ہیں۔ اُس کے خاوند کی فرمائشیں ہی دم لینے نہیں دیتیں۔ اُس کا خاوند، اور اُس کے جواری دوست! چڑیا کا غلام، پان کی بیگم، اینٹ کا بادشاہ، گول کمرے میں تاش کے پتّے اکٹھے کیے جارہے ہیں۔

ٹپ، ٹپ، ٹپ ٹپ۔ باورچی خانے کا نل ٹپک رہا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی۔ نیچے گلی میں پھیری والا آواز لگا رہا ہے۔

کھانے کے کمرے کی میز صاف ہے۔ میز کے بیچ رکھا جگ پانی سے بھرا ہے۔ پانی کے لیے بار بار نوکر کو آواز دینا اُسے زہر سا لگتا ہے۔ کرسیاں میز کے اندر بچھی ہوئی ہیں، محض اُن کی پشت باہر ہے۔ جیسے مرغی نے اپنے بچے پنکھوں میں سمیٹ لیے ہوں۔ سائڈ بورڈ پر رکھی گھڑی کی ٹک ٹاک اُونچی ہو رہی ہے۔ جب سے اینی اس کمرے میں آکر کھڑی ہوئی ہے، گھڑی کی ٹک ٹک لگاتار اُونچی ہوتی جارہی ہے۔

پان کی دُوگّی، پان کی پنجی، پان کا نہلا۔ تاش کھیل رہی جوکڑی میں کوئی خوش ہو رہا ہے۔

ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ۔ باورچی خانے میں نل ٹپک رہا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی۔ نیچے گلی میں پھیری والا آواز لگا رہا ہے۔

برآمدے میں آرام کرسیاں ساکت و جامد پڑی ہیں۔ کرسیوں کے بیچ تپائی پہ اخبار رکھا ہے:

"عالمی جنگ ہو کر رہے گی!" چین کا کہنا ہے "اِس ایٹمی جنگ میں چاہے ساری دُنیا بھسم ہو جائے، چینی ختم نہیں ہو سکتے۔ اُن کی آبادی دُنیا میں سب سے زیادہ ہے!" اور اینی کو آیا کے ساتھ باہر سیر کے لیے گئے اپنے بچوں کا خیال آتا ہے۔ اُس کی آنکھوں

کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا ہے چکر! چکر!

اینٹ کی پنجی، پان کی چھکی، حکم کی ستی، گول کمرے میں تاش کھیلنے والوں میں کوئی چیخ اٹھا ہے۔

ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ! باورچی خانے میں نل ٹپک رہا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی! نیچے گلی میں پھیری والا آواز لگا رہا ہے۔

تیل سے سنورے ہوئے پٹے، لال لال بتیاں، کجرائی پلکیں، بنی ہوئی، کانٹوں کی طرح نوکیلی مونچھیں، اسپات جیسا سینہ، کراری آواز۔ اپنی گیلری میں کھڑے ہوکر نیچے گلی کی طرف دیکھتی ہے۔

چڑیا کا اکہ، پان کی دوگی، حکم کا تکہ! گول کمرے میں تاش کا دو روپے کا ویسا چل رہا ہے۔

ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ! باورچی خانے میں نل ٹپک رہا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی! نیچے گلی میں پھیری والا آواز لگا رہا ہے۔

برآمدے میں کہیں بھی تو کوئی جالا نہیں۔ اس نگوڑے شہر میں کتنی صفائی ہے نہ مکھی نہ مچھر، مکڑی جالا نہیں بناتی۔ ملکے گھر، وہ جالے اتارا کرتی تھی۔ اور کچھ نہ ہوتا تو وہ بانس اٹھا کر جالے اتارنا شروع کر دیتی تھی۔ مکڑیاں ہٹ ہٹ اس کی طرف دیکھتی رہتیں اور اپنی ان کے قلعے ڈھاتی رہتی۔ دودھ سی سفید دیواریں، دودھ سی سفید چھت، دودھ سے سفید کونے —— کہیں کوئی جالا نہیں، کہیں کوئی مٹی نہیں۔

حکم کا نہلا، حکم کا دہلا، حکم کا غلام! گول کمرے میں کسی کی پھر جیت ہوئی ہے۔

ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ! باورچی خانے میں نل ٹپک رہا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی! نیچے گلی میں پھیری والا آواز لگا رہا ہے۔

کھانے کے کمرے میں ہر چیز اپنے ٹھکانے پر ہے۔ اس نوکر سے ایک بار کہہ دو پھر یہ کم بخت کبھی غلطی نہیں کرتا —— جگ پانی سے بھرا ہے، کرسیاں میز کے اندر ہیں۔ کرسیاں باہر خواہ مخواہ جگہ گھیرتی ہیں۔ اتنا بڑا شہر، اتنے چھوٹے فلیٹ، اتنی تنگ جگہ ——

چڑیا کا اکہ، چڑیا کی دوگی، چڑیا کی تگی! گول کمرے میں سے کسی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آرہی ہے۔

ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ! باورچی خانے میں نل ٹپک رہا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی! نیچے گلی میں پھیری والا آواز لگا رہا ہے۔

سونے کے کمرے میں، سنگار میز کے سامنے ایک چڑیا اپنی پرچھائیں کے ساتھ لڑ رہی ہے۔ بار بار شیشے کو چونچ مارتی ہے۔ جب تھک جاتی ہے تو سنگار میز کے فریم پر بیٹھ کر سستا لیتی ہے۔ پھر شیشہ پر چونچ مارنا شروع کر دیتی ہے۔ دیوانی چڑیا!

حکم کی دوگی، پان کی دوگی، اینٹ کی دوگی! گول کمرے میں جیسے کوئی چیخ رہا ہے۔

ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ! باورچی خانے میں نل ٹپک رہا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی! نیچے گلی میں پھیری والا آواز لگا رہا ہے۔

کھانے کے کمرے میں سائڈ بورڈ پر رکھی گھڑی رُک گئی ہے تین بج کر پچیس منٹ اور سات سیکنڈ ——— یہ گھڑی کیوں رُک گئی ہے؟ شاید اپنی آج پھر اُسے چابی دینا بھول گئی تھی۔

باہر برآمدے میں تپائی پر پڑا اخبار:

عالمی جنگ ہو کر رہے گی!

اپنی کو یوں لگتا ہے جیسے کوڑیوں والا سانپ کُنڈلی مارے بیٹھا ہو۔!

سرسوں کے تیل میں سنورے پٹے، نیچے گلی میں یہ مہک بالوں کی ہے۔ کوئی پکوڑے نہیں تل رہا۔

حکم کا اِکّہ، پان کا اِکّہ، اینٹ کا اِکّہ! گول کمرے میں جیسے کوئی اُچھل رہا ہو۔

ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ! باورچی خانے میں نل ٹپک رہا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی! نیچے گلی میں پھیری والا آواز لگا رہا ہے۔

اور اپنی اشارے سے پھیری والے کو اُوپر بلا لیتی ہے۔ تیل سے سنورے پٹے، لال لال پُتلیاں، کجرائی پلکیں، بٹی ہوئی کانٹوں جیسی نوکیلی، اسپات جیسا سینہ، کراری آواز۔

"ایک روپیہ کِلو دی ہیں، سیم کی پھلیاں!"

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی۔ پھیری والا اپنی کی طرف دیکھتا ہے۔ اُونچی لمبی، ہرے رنگ کی ساڑھی پہنے وہ لچک رہی!

"دو کِلو دے دو!" اپنی پانچ کا نوٹ پھیری والے کی ہتھیلی پر رکھتی ہے۔

پھیری والا ٹوکری میں سے دو کِلو سیم تول کر اپنی کی پٹاری میں ڈالتا ہے اور پھر ایک نظر اپنی کی طرف دیکھتا ہے۔

تازہ سیم کی پھلی، لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی۔

"میم صاحب!" پھیری والا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ہے "میم صاحب، باقی کے تین روپے میرے پاس ہی رہنے دیں۔ میں کل آپ کو لوٹا دوں گا۔ آج مجھے بڑی ضرورت ہے۔"

اور اپنی مان جاتی ہے۔

ابھی سیم کی پٹاری اُس نے باورچی خانے میں لا کر رکھی ہی ہے کہ باہر دروازے پر دستک ہوتی ہے۔

اپنی دروازہ کھولتی ہے۔ "میم صاحب!" سامنے سیم والا کھڑا ہے۔ "میم صاحب! میں بہت مصیبت میں ہوں۔ مجھے دس روپے اور دے دو! میرا بھائی پولیس والوں نے پکڑ رکھا ہے اور میں اُن کے مُنہ میں ہڈی دے کر اپنے بھیا کو چھڑا لاؤں گا۔"

اپنی اندر سے اپنا بٹوا لے آتی ہے اور اُس میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر پھیری والے کو دیتی ہے۔ باقی نوٹوں کی گڈی بٹوے میں رکھتی ہے۔ اپنی پھیری والے کی طرف دیکھتی ہے۔ لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی۔ پھیری والا سیڑھیاں

اُتر جاتا ہے۔ اینی نوٹ کرا اپنے کمرے میں ابھی پہونچی بھی نہیں کہ باہر پھر دستک ہوتی ہے۔

پھیری والا ہے "میم صاحب! وُہ تو پچاس روپے اور مانگتے ہیں! میرا بھائی اُنھوں نے بند کر دیا ہے۔ میں آپ کو پیسہ پیسہ لوٹا دوں گا!"

بٹوا ابھی اینی کے ہاتھ میں ہی ہے۔ بٹوے کو کھول کر اینی دس دس کے پانچ نوٹ گن کر پھیری والے کو دیتی ہے۔ باقی بس دو نوٹ بچے ہیں۔ اینی انھیں بٹوے میں رکھ رہی ہے۔

"میم صاحب ایک دس کا نوٹ اور دے دو۔ اِن پولیس والوں کا کچھ پتہ نہیں کون جانے اور مانگ لیں۔۔۔۔!"

اینی ایک نوٹ اور نکال کر پھیری والے کو پکڑاتی ہے۔

"میم صاحب! یہ دُوسرا نوٹ بھی دے دو! میری ضرورت بڑی سخت ہے!"

اور اینی آخری نوٹ بھی پھیری والے کے حوالے کر دیتی ہے۔

ٹپ ٹپ! ٹپ ٹپ! پھیری والا جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر جاتا ہے! اینی اُس کی پیٹھ دیکھتی رہتی ہے۔ لمبی سیم کی پھلی، ہری سیم کی پھلی!

خالی خالی بٹوا، ویسی کی ویسی اینی دہلیز پر کھڑی ہے، اور سامنے لفٹ میں سے آیا بچوں کو لے کر نکلتی ہے۔ لال لال، گورے گورے اُس کے دونوں بچے!

اور اینی کو جیسے جھنجھوڑ کر کسی نے جگا دیا ہے! یہ اُس نے کیا کیا ہے؟ ڈھیر سارے روپے اُس نے کسی پرائے مرد کو پکڑا دیے اور اینی دوڑ کر سیڑھیاں اُتر جاتی ہے۔ پھیری والا کہیں بھی نہیں نہ اُس گلی میں نہ اگلی گلی میں۔

پھُولی ہوئی سانس، تھکی ہاری اینی اپنے فلیٹ میں لوٹتی ہے۔ گول کمرے میں تاش ویسی کی ویسی چل رہی ہے۔ "پان کا اِکّہ۔۔۔۔!"

"آپ یہاں بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ مجھے تو کوئی لُوٹ کر بھی لے گیا ہے!" اینی اپنے خاوند کو کہتی ہے اور پھر سُبک اُٹھتی ہے۔

محلہ سدھار کمیٹی

فکر تونسوی

بھائیو، بہنو! تھوڑی سی والداؤ اور بہت سے بچو!

آپ نے یہ اچھا نہیں کیا کہ مجھے محلہ سدھار کمیٹی کی اس سالانہ میٹنگ کا صدر بنا دیا۔ میں صدارت سے ہمیشہ بدکتا ہوں کیونکہ یہ ایک ایسی عزت ہے جو انسان کو غیر فطری بنا دیتی ہے اور اُس سے راست گفتاری چھین لیتی ہے۔ مثلاً اب میں اتنا بھی نہیں کہہ سکتا کہ جس کرسی پر میں بیٹھا ہوں اُس کی ایک ٹانگ ٹوٹنے کے قریب ہے اور میں پورے وقت ایک پہلو بیٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالے رہا ہوں۔

حضرات! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پورا محلہ ایک کرسی ہے جس کی ایک ٹانگ ہمیشہ ٹوٹنے کے قریب رہتی ہے اور ہم ہم سب ایک پہلو بیٹھے اپنے آپ کو سنبھالتے رہتے ہیں۔ اس سنبھالے پر ہمارا کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے وقت کا یہ انتہائی بھونڈا استعمال ہے لیکن ہمیں اپنے محلے سے چونکہ بے حد محبت ہے۔ اس لیے محبت کی خاطر ہمیں یہ بھونڈا پن کرنا ہی پڑتا ہے —— جناب والا! محبت، انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ یہ تو ہماری ذہانت ہے کہ ہم نے اس بدنصیبی کو قربانی کا دلفریب نام دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا ہے۔ ورنہ خدا نے تو ہمیں جذبۂ محبت عطا کر کے ہمارے ساتھ کافی بڑا دھوکا کیا تھا۔

میں نے ابھی ابھی آپ سب صاحبان بلکہ "صاحبات" تک کی تقریریں سُنیں۔ جو محلہ سدھار کے عظیم مقصد سے کی گئی ہیں۔ ان تقریروں سے ہی مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارا محلہ بگڑے ہوئے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس لیے ہمارا سدھار ہونا چاہیے۔ آہ! یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ ہم خود ہی اپنے آپ کو ذلیل انسان کہہ کر ذلیل کریں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل تسلیم کر لینا بہادری ہے۔ اور گویا ہم بہادر لوگ ہیں۔ صاحبان! اگر ایسا ہے تو میں حیران ہوں کہ آپ بہادر انسانوں کا سدھار کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ وقت کا بھونڈا استعمال نہیں ہے کہ آپ پیغمبروں کو نصیحت کریں کہ آپ کے کپڑے میلے ہیں، انھیں دھو لیجیے، حالانکہ پیغمبر اگر کپڑے نہیں دھوتا تو اس کی کوئی گہری اور فلسفیانہ وجہ ہو گی۔ جو اُسے خود اچھی طرح معلوم ہو گی۔

اس لیے جناب! میری مانیے تو اس محلہ کا سدھار مت کیجیے۔ اگر آپ کے کپڑے میلے ہیں تو صابن سے دھو لیجیے۔ صرف صابن کے پراپیگنڈہ کی خاطر اتنے زیادہ لوگوں کو ایک میٹنگ میں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے! —— چند دن ہوئے اس محلے کے ایک بزرگ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے۔ "فکر صاحب! اس محلے میں چوہوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ مگر کوئی ان کا

بند و بست کرنے والا نہیں ہے۔" میرا خیال ہے کہ چوہوں کی سینہ زوری پر آبدیدہ نہیں ہوئے تھے بلکہ اُن کی آنکھوں میں مگرے تھے۔ ورنہ چوہے تو چوہے دان کے ذریعے بڑی آسانی سے پکڑے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم چوہے دان اور صابن کا استعمال نہیں جانتے تو جناب! ہمیں خدا سے دُعا کرنی چاہیے کہ ہمیں اگلے جنم میں انسان نہ بنائے بلکہ چوہے بنا دے۔ جو کپڑے نہیں پہنتے اور جنھیں صابن کے استعمال کے علم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ چوہوں نے کبھی چوہا سدھار کمیٹی بنائی ہو۔ اور مگروں کی آڑ میں آنسو بہاتے ہوں۔ بھائیو اور بہنو! بُرا نہ مانیے تو میں کہوں گا کہ چوہے ہم سے زیادہ فطری زندگی گزار رہے ہیں۔

آپ شاید مجھ پر شک کر رہے ہوں گے کہ میں محلہ کا سدھار نہیں چاہتا۔ ایسا ہی شبہ مجھ پر اُس محلہ میں بھی کیا گیا تھا جہاں میں دو سال پہلے رہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے بھائیو! کہ دُنیا کے ہر محلہ میں محلہ سدھار کمیٹی بنائی جاتی ہے اور ہر محلہ میں سدھار کا چسکہ پایا جاتا ہے اور اُس کی ایک معقول وجہ بھی ہے کہ دُنیا کے ہر محلہ میں رات کو بے تحاشا کُتّے بھونکتے ہیں جس سے اہلِ محلہ پریشان رہتے ہیں۔ ہر محلہ میں ایک نہ ایک جھگڑالو عورت رہتی ہے جو خللِ امن کا باعث بنی رہتی ہے۔ ہر محلہ میں دو چار آوارہ گرد نوجوان لڑکے پیدا ہو جاتے ہیں جن سے محلہ کا اخلاق ہمیشہ تلوار کی دھار پر رہتا ہے اور ہر محلہ میں پانچ دس ریٹائرڈ بوڑھے بھی ضرور رہتے ہیں جو نصیحتوں کے چراغ اپنے سرہانے جلا کر بیٹھے رہتے ہیں۔

اور دوستو! یہ سب خداداد نعمتیں ہیں ان سے ہم بچ نہیں سکتے۔ ان سے کوئی بھی محلہ نہیں بچ سکتا۔ اگر کسی محلہ کو ان نعمتوں سے محروم کر دیا جائے تو وہ محلہ نہیں رہتا بلکہ جنّت بن جاتا ہے اور معاف کیجیے، جنّت ایک انتہائی اُکتا دینے والی چیز ہے، جنّت، شوکیس میں ایستادہ "پلاسٹک" کی ایک چیز ہے۔ جس کے لب اگرچہ لعلیں ہیں مگر اُن پر کسی کا بوسہ ثبت نہیں ہوا۔ کیونکہ اُس بوسے میں نہ حلاوت ہوتی ہے نہ حرارت ـــــ سچ بتائیے کیا آپ پلاسٹک کی اُس حسینہ کو کوئی محبت نامہ بھیج سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ اُس جہنّم کے خلاف کیوں شور مچاتے ہیں۔ یہ پلاسٹک کی جنّت میں حرارت اور حلاوت پیدا کرتی ہے۔ میں تو جب محلہ کی کسی جھگڑالو عورت یا آوارہ گرد لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے جنّت کے ساتھ جہنّم بھی پیدا کر دیا اور ہمارے محلہ کو پلاسٹک کی حسینہ بننے سے بچا لیا۔ جناب والا! خدا پر اعتبار کیجیے وہ ہم سے زیادہ ذہین اور دُور اندیش ہے جس نے ہمیں زندگی کی حلاوت اور لذّت بخشنے کے لیے انگریز ہی عطا نہیں کیے بلکہ ریٹائرڈ بوڑھے بھی عطا کر دیے جو لومڑی کا رول ادا کرتے رہتے ہیں۔

آج کی میٹنگ میں ایک معزز مقرر نے اشارتاً ذکر کیا ہے کہ ہمارے محلہ میں ایک شاعر رہتا ہے جو رات کو شراب میں دُھت ہو کر آتا ہے اور اُدھم مچاتا ہے۔ اُنھوں نے تجویز کیا کہ اُسے محلہ سے باہر نکال دیا جائے ـــــ صاحبان! میری رائے ہے کہ اُسے محلہ سے مت نکالیے ورنہ وہ کسی دوسرے محلہ میں چلا جائے گا۔ جہاں وہ پھر اُدھم مچائے گا اور پھر نکال دیا جائے گا کیونکہ ہر محلہ میں محلہ سدھار کمیٹی موجود ہے ـــــ لہٰذا میں اُس شاعر کو سمجھا دوں گا کہ وہ شاعری ترک کر دے اور کہیں لوئر ڈویژن کلرک بن جائے۔ شاعری ترک کرنے ہی سے وہ میگساری ترک کرے گا کیونکہ لوئر ڈویژن کلرک کے اندر، ہلدی، نمک اور ایندھن خریدنے کی تمنا بیدار ہو جاتی ہے اور شراب خریدنے کی جرأت اور استطاعت مر جاتی ہے۔ شراب

ہی کا لطیف اور نفیس احساسات کو جگاتی ہے۔ مگر ہلدی اور نمک لطیف احساسات کو سُلا دیتے ہیں۔ بلکہ مار دیتے ہیں۔ اس لیے اگر ہمیں اُس شاعر کا سُدھار کرنا ہے تو اُس کے اندر بسے ہوئے شاعر کو مار دینا چاہیے۔ ہمارے محلّہ کو شاعری کی ضرورت نہیں، ہلدی اور نمک کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہلدی اور نمک کبھی اُودھم نہیں مچاتے۔ حضرات! اگر آپ سب لوگ شاعر نہیں بن سکتے تو اُس کی واحد وجہ یہی ہے کہ آپ کے لطیف احساسات ایندھن کے ڈھیر کے نیچے دب گئے ہیں، سو گئے ہیں، مر گئے ہیں۔

ہاں، میں اُس شاعر کو سمجھا دوں گا کہ وہ مر جائے اُس کی لاش کو کندھا دینے کے لیے پوری محلہ سُدھار کمیٹی موجود ہے ————

چند دن ہوئے، محلّہ میں کیرتن کرانے کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کیرتن سے محلّہ میں کتنے فی صدی رُوحانی جذبات پیدا ہوئے۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ کیرتن کے بعد پولیس آئی اور ہمارے محلّہ کے لالہ کانشی رام جی کو لوہے کی بلیک کے جُرم میں گرفتار کر کے لے گئی۔ حالانکہ لالہ جی نے کیرتن کے لیے سب سے زیادہ چندہ دیا تھا اور کیرتن کے بعد اپنے ہاتھ سے مقدس پرشاد بانٹا تھا (کیا یہ افواہ سچ ہے کہ اُس نے اپنے بچّوں کو نسبتاً زیادہ پرشاد دیا تھا؟) بہر کیف مجھے پولیس کا یہ فعل پسند نہیں آیا کیونکہ اُس نے کیرتن کے رُوحانی اثرات پیدا ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ دراصل لالہ کانشی رام سے زیادہ ہمیں پولیس میں رُوحانی جذبات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ کیرتن کے تقدّس کو اس طرح ہتھکڑیاں پہنائی جاتی رہیں گی۔

میں نے جب جیل میں لالہ کانشی رام سے مُلاقات کی اور پوچھا کہ کیرتن کا یہ غلط نتیجہ کیوں نکل آیا تو اُنھوں نے فلاسفروں کی طرح جواب دیا۔ "لوہے کی بلیک ایک انفرادی مسئلہ ہے۔ آپ اُسے کیرتن کے اجتماعی اثر سے کیوں ملاتے ہیں۔ دیکھ لینا، مجھے کیرتن کا پھل الگ ملے گا۔ یعنی میں چھوٹ جاؤں گا۔"

"کیسے؟" میں نے تشریحاً پوچھا۔

وہ مُسکرائے اور بولے۔ "بھگوان نے میری عبادت سے متاثر ہو کر پولیس کی بُدھی بھرشٹ کر دی ہے اور وہ میرے ساتھ رشوت کی بات چیت چلا رہی ہے۔ کیرتن کا پھل رائیگاں نہیں جاتا فکر صاحب! آپ کی عبادت میں سچّی عقیدت اور خلوص ہونا چاہیے۔ میں پُوچھتا ہوں، ذرا بتائیے، پولیس کی بُدھی بھرشٹ کرنے میں کس کا ہاتھ ہے؟"

بھائیو اور بہنو! لالہ کانشی رام کی یہ تشریح اگرچہ انوکھی اور ناقابلِ فہم تھی لیکن اگر وہ واقعی رہا ہو گئے تو کیا ہم میں سے کسی کی جرأت ہے کہ کیرتن کے رُوحانی اثرات سے انکار کریں۔ البتہ صرف ایک شُبہ میرے دل میں ابھی تک رینگ رہا ہے کہ اس کیرتن کے بعد محلّے کے بھگوان داس چپراسی کا سامان جب اس کے مالک شری نارائن داس نے باہر پھینک دیا تھا تو کیرتن کا پھل بھگوان داس چپراسی کو کیوں نہیں ملا ہے حالانکہ کیرتن میں اُس نے سب سے زیادہ سرمستی اور عقیدت اور خلوص کے ساتھ ڈھولک بجایا تھا اور رات بھر جاگتا اور گاتا رہا تھا ———— کیا کوئی ایسا انتظام نہیں ہو سکتا کہ خدا بھی اپنی بُدھی بھرشٹ کر لے۔ یہ محلّہ سُدھار کمیٹی کا فرض ہے کہ

وُہ رشوت کا بندوبست کرے اور بھگوان داس چپڑاسی کو دوبارہ مکان دلا دے ورنہ خطرہ ہے کہ محلّہ میں کیرتن کی روایت ہنگو
شکل اختیار کر جائے گی۔ اور کیرتن کے رُوحانی اثرات میں تضاد پیدا ہو جائے گا۔ کم از کم عبادت کی سطح پر تو چپڑاسی اور آڑتن
مرچنٹ میں فرق مٹ جانا چاہیے۔ ورنہ ہمارے محلّہ کے لوگ کیرتن کے لیے چندہ دینے سے ہچکچانا شروع کر دیں گے۔ ذرا
سوچیے اگر چندہ جمع کرنے میں رُکاوٹ پیدا ہو گئی تو کیا کیرتن منڈلی والے کم اُجرت پر کیرتن کرنے سے انکار نہیں کر دیں
گے؟

محلّے کی ایک تعلیم یافتہ خاتون مسز وِملا نے اپنی تقریر میں دھمکی دی ہے کہ اگر محلّہ کے بچّوں میں گندی گالیاں دینے کی
قبیح عادت ختم نہیں کی گئی تو میں محلّہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ حضرات! مجھے شک ہے کہ وہ محلّہ نہیں چھوڑیں گی کیونکہ اُن
میں لیڈرانہ صفات پائی جاتی ہیں اور وہ اس محلّہ کی عورتوں کی لیڈر بننا چاہتی ہیں۔ اگر محلّہ کے تمام بچّے آج فیصلہ کر لیں کہ وُہ
گندی گالیاں نہیں دیں گے تو مسز وِملا کے لیے یہ انتہائی رنجدہ فیصلہ ہوگا۔ کیونکہ کوئی لیڈر یہ نہیں چاہتا کہ گندی اور بُری چیزیں
ختم ہو جائیں۔ ہماری کمزوریاں، گندگیاں اور بُرائیاں ہی مسز وِملا کی لیڈرانہ بھُوک کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ ان کا خاتمہ گویا مسز وِملا
کا خاتمہ ہوگا۔ ایک تیر انداز سے اگر یہ کہا جائے کہ تم بغیر نشانہ کے تیر چلاؤ تو وہ اسے اپنے آرٹ کی توہین سمجھے گا۔ اُسے آپ پر
غصّہ آئے گا اور ممکن ہے، غصّہ میں وہ محلّہ چھوڑ کر چلا جائے۔ اگر مسز وِملا ابھی تک محلّہ چھوڑ کر نہیں گئیں تو صرف اس لیے کیونکہ یہاں
کے بچّے برابر گندی گالیاں دیے جا رہے ہیں اور مسز وِملا اُن کی ماؤں کو برابر پھوہڑ، بدتمیز اور بدنصیب کہے جا رہی ہیں۔ جنابِ عالی!
اگر ایک تعلیم یافتہ عورت ایک غیر تعلیم یافتہ عورت کو پھوہڑ کہے تو غیر تعلیم یافتہ عورت میں ایک صحیح قسم کا احساسِ کمتری جاگ
پڑتا ہے اور جب لوگوں میں احساسِ کمتری پیدا ہو جائے تو وہاں ایک نہ ایک لیڈر ضرور پیدا ہو جاتا ہے جو اس احساسِ
کمتری کی ستار پر اپنا نغمہ الاپتا ہے۔

اس لیے حضرات! مسز وِملا کی دھمکی کو بھی ایک قسم کا نغمہ سمجھیے۔ خدا نہ کرے کہ ہمارے محلّہ کی عورتیں پھوہڑ اور
بدتمیز نہ رہیں اور یہ نغمہ بند ہو جائے جسے سُن سُن کر ہمارے محلّہ کی عورتیں مست ہو رہی ہیں ——— یہ صحیح ہے کہ
گندی گالی تہذیب کے زوال کی علامت ہے اور مسز وِملا نہیں چاہتیں کہ اُس کے اپنے بچّے بھی گندی گالیاں سیکھ جائیں۔
لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہُوں کہ مسز وِملا یہ بھی نہیں چاہتیں کہ ایسے قیمتی محلّہ کو جہاں تہذیب زوروں پر ہے، چھوڑ کر چلی
جائیں۔ دراصل مسز وِملا اس محلّہ کی عورتوں اور بچّوں میں تہذیب کی داغ بیل ڈالنا چاہتی ہیں۔ چاہے اُس کے لیے اُنھیں
کتنی ہی قربانی دینی پڑے۔ چاہے اس کے لیے بچّے گندی گالیاں سیکھ جائیں۔ جناب! لیڈروں میں قربانی کا زبردست جذبہ
پایا جاتا ہے۔ اس لیے مسز وِملا کو قربانی کا موقع دیجیے۔ ورنہ اُن کی افسردگی اور بڑھ جائے گی اور آنکھوں کے سیاہ حلقے اور
گہرے ہو جائیں گے جو محلّہ کی بدتمیزی پر کُڑھتے رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔

بھائیو اور بہنو! ——— اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے میں آخری گزارش کروں گا کہ اس محلّہ کے سُدھار
کے غم کو اتنا گہرا مت بنائیے۔ بلاشبہ آپ اس میں چند سطحی تبدیلیاں لے آئیے۔ مگر کوئی بُنیادی تبدیلی ہونے کی مصنوعی کوشش

نہ کیجیے۔ بے شک آپ چوہوں کو محلہ بدر کرنے کے لیے بلّیاں پالنے کا پلان بنائیے (ان کے ساتھ کچھ بلّے بھی لے آئیے گا کہ بلّیوں کی زندگی "ڈل نہ ہو جائے) محلہ کی صفائی ستھرائی کے لیے کوئی منشتر کہ فنڈ کریئیے (فنڈ اتنا کم نہ ہو کہ اُس میں غبن کی گنجائش نہ رہے) چوروں کو ڈرانے کے لیے ایک با تنخواہ پہرے دار بھی رکھیے (پہرے دار سو فی صدی جفا کش اور احمق ہو تاکہ چوروں سے نہ مل جائے) محلہ میں اگر کسی کا انتقال ہو جائے، کسی کا جنم ہو جائے، کسی کی شادی ہو جائے یا کسی کا لڑکا لڑکی بھاگ جائے تو بے شک سب مل کر آنسو بہائیے یا قہقہے لگائیے (اور یہ سب کچھ اس لیے کیجیے کہ آپ کے ساتھ بھی یہ سانحہ ہو سکتا ہے) ———— غرض یہ سب کچھ کیجیے۔ ہر سطحی حرکت کیجیے جس کا آپ کے دل سے کوئی گہرا تعلق نہ ہو۔ جناب! میں یہ تھوڑی سی کڑوی بات اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ ہم اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے اور نہ ہم سے کوئی فرد محلہ سُدھار کمیٹی کو یہ اجازت دے گا کہ اُس کے دل اور رُوح کی سلطنت پر حملہ کرے۔ کیا آپ محلہ سُدھار کمیٹی کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ آپ کو انڈا کھانے کا حکم دے۔ جبکہ آپ ٹماٹر کاٹ کر کھا رہے ہوں۔ ایک بار میں نے محلہ کے ایک شخص سے کہا۔" جناب! آپ کے چہرے پر جو داڑھی ہے وہ انتہائی بدنما لگتی ہے آپ روزانہ شیو کیا کیجیے۔" تو وہ مجھ سے اتنا ناراض ہوا کہ میں اب اُس سے ڈر کے مارے وہ دس روپے بھی نہیں مانگتا جو اُس نے مجھ سے قرض لیے تھے ———— اسی طرح ایک بار محلہ کے ایک معزز آدمی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ آپ پان مت کھایا کیجیے۔ اس سے آپ کے دانت جھڑ جائیں گے ———— میں حیران ہوں کہ میرے دانت جھڑنے سے اُس آدمی کو کیا دلچسپی ہے؟ ———— کیا صرف اس لیے میں اُس کی بات مان لوں کہ میں کبھی کبھار اُس سے اخبار پڑھنے کے لیے مانگ لاتا ہوں؟

اس لیے جناب! ہم ایک محلہ میں رہنے کے باوجود الگ الگ انسان ہیں۔ محلہ سُدھار کمیٹی اگر ہم الگ الگ انسانوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنا چاہتی ہے تو یہ اُس کی سنگدلی ہے بلکہ ایک غیر فطری حرکت ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے آپ نے مجھے صدارت کی عزت دے کر مجھے غیر فطری باتیں کہنے پر پابند کر دیا۔ آپ کے ماتھے پر اس وقت جو شکن پڑ رہے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں نے اس پابندی کو توڑ ہی دیا۔ اور اُس کرسی کے ٹوٹنے والے پائے کا ذکر کیوں کر دیا جو شاید لالہ کانشی رام کے گھر سے لائی گئی ہے، جو آج کل بلیک کے جرم میں جیل میں بند ہیں ————

آنگن

رام لعل

اُس دن صُبح صُبح ہی نیٹا کے ساتھ کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ جھگڑا ہو جانے کے بعد ایک دُوسرے سے کوئی بات کیے بنا ہی ہم نے چائے پی اور اُسی طرح چُپ رہ کر کھانا بھی کھا لیا تھا۔ ایسا کرتے وقت ہم ایک دُوسرے کی طرف دیکھنے کی بجائے اُس آنگن کی طرف خالی خالی آنکھوں سے دیکھتے رہے جس کے سامنے ہی ہم ایک کونے میں بنے ہوئے ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے تھے۔ ایک دیوار، ایک چق اور ایک جنوبی ہند کی سُندر چِتروں والی چٹائیوں سے بنے اسکرین سے گھری ہوئی جگہ کو اگر ڈرائنگ رُوم کہا جا سکتا ہے تو وہ —— واقعی ایک ڈرائنگ رُوم تھا۔

اِدھر کئی دنوں سے نیٹا کے ساتھ جھگڑا رہنے لگا تھا۔ یہ بات بہت عجیب تھی کہ نیٹا ایسی سندر پتنی کے ساتھ رہ کر بھی اس گھر میں ناخوشگواری پیدا ہو جاتی تھی۔

اُس روز اتوار تھا۔ اتفاق سے کوئی ملنے والا نہ آیا۔ ورنہ ہم اس طرح چُپ اور ایک دُوسرے سے یوں کٹے کٹے کیسے رہ سکتے تھے۔

ہاں اُس روز صُبح صُبح ہی تو نیٹا کی ایک جان پہچان کی مسز اگروال آ گئی تھیں۔ یہ آگ انہی کی لگائی ہوئی تو نہیں تھی لیکن اُس دن کے جھگڑے کا کارن دراصل وُہی تھیں۔

نیٹا نے مسز اگروال سے ہمارے اُس مکان کا ایک حصّہ کرائے پر دے دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ مجھے اُس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن مسز اگروال چاہتی تھیں اس آنگن کا پارٹیشن کر کے رہنے کے دونوں حصّے الگ کر دیئے جائیں۔ پارٹیشن کرتے وقت دیوار کی دونوں طرف الگ الگ باتھ رُوم بھی بنا دیئے جائیں۔

مکان کی اس طرح کی تبدیلی کے لیے نیٹا مجھے کئی مہینوں سے کہہ رہی تھی۔ اُس کا خیال تھا ایسا کیے بغیر ہمیں کوئی بھی ڈھنگ کا کرائے دار نہیں مل سکے گا۔ صُبح اُس نے اپنی بات کو پھر دُہرایا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ اُسے میرا انکار کرنا بُرا لگا۔ بُرا لگنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے مسز اگروال کی موجودگی میں انکار کیا تھا۔ اس سے نیٹا کی سُبکی سی ہوئی۔

مجھے اپنی اس حرکت کا افسوس تھا۔ مجھے اپنی بیوی کے جذبات کا کچھ خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اس کے لیے میں نے اُس سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ لیکن جو بھی ہو، زخمی جذبات کچھ دیر تک تو ٹیستے ہی ہیں۔ میں تو ابھی

تک نیتا سے خفا تھا۔ وہ آنگن کی دلکشی کو ختم کر دینے کے لیے بار بار ضد کیوں کرتی تھی۔

میں دراصل روز روز کی چخ چخ سے پریشان ہو اٹھا تھا۔ باپ دادا سے وراثت میں ملی ہوئی چھ کمروں والی اس ایک منزلہ عمارت کے بیچوں بیچ بنے اتنے بڑے آنگن کی خوبصورتی کیوں مٹنے دوں؟ اتنا بڑا آنگن تو ہمارے محلے میں کسی کے پاس نہیں تھا۔ اڑوس پڑوس والوں نے ضرورت پڑنے پر ہمیشہ اس کا استعمال کیا تھا۔ ہر سال اسی جگہ جمع ہو کر سب لوگ ہولی کھیلتے تھے۔ جب دسہرے کا تہوار نزدیک آ جاتا تو رام لیلا کمیٹی والے گھر گھر جا کر چندہ مانگنے سے پہلے یہیں آجاتے اور ہنومان، سگریو، انگد، نل نیل وغیرہ بندروں کا بھیس بدل کر اچھلتے کودتے اور کلکارتے ہوئے یہاں سے نکلتے تھے۔ یہ سلسلہ میرے پرکھوں کے سمے سے چلا آرہا تھا۔ اسی وجہ سے محلے والے ان کے نام کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اسی سلسلے کو جاری رکھ کر میں نے بھی ویسی ہی عزّت پائی تھی۔ ابھی دو تین دن پہلے نیشنل بینک کے پوری جی نے آنگن مجھ سے مانگا تھا۔ ایک ہفتے بعد ان کی بیٹی پونٹی کا بیاہ تھا۔ اوروں نے بھی آگے پیچھے کی تاریخوں میں یہ جگہ اپنے لیے چاہی تھی۔

نیتا نے میری سماجی اہمیت کے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا؟ وہ مجھے بار بار یہ طعنہ کیوں دینے لگتی ہے آپ کو تو بس لوگوں کا ہی بھلا چاہیے۔ اپنی مالی حالت سدھارنے کی تو کوئی چنتا ہی نہیں ہے۔ اس کا بس چلتا تو مجھے اور خود کو کسی کونے میں سمیٹ کر باقی سارا مکان ہی کرائے پر اٹھا دیتی!

مجھے اس کی ضد بہت عجیب سی لگی۔ خوبصورت عورتیں عام طور پر ضدی ہی ہوا کرتی ہیں۔ وہ مرد کی محبّت سے فائدہ اٹھا کر اپنی ہر بات منوانے پر تُلی جاتی ہیں۔ نیتا نے اس گھر میں قدم دھرنے سے پہلے اس آنگن کا جائزہ لے ڈالا۔ پھر ایک عجیب سی خوشی سے مغلوب ہو کر کہہ اٹھی۔ "ہائے، یہ تو بہت بڑا آنگن ہے۔ اتنے بڑے آنگن پر تو دو مکان اور کھڑے ہو سکتے ہیں!"

پھر ایک روز اس نے میرے پہلو میں بیٹھ کر روایتی بیویوں والے انداز میں بڑے لاڈ سے یہ پلان بنایا تھا۔ "سارے مکان کو ہی ہم گروا دیں گے۔ اتنے بڑے آنگن کی بھی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں ہم تین منزلہ مکان بنوائیں گے۔ ہر منزل پر تین تین فلیٹ۔ ایک ایک فلیٹ کا کرایہ تین تین سو تو مل ہی جائے گا۔ آپ چاہیں تو اس کام کے لیے میرے سارے گہنے حاضر ہیں۔ مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں۔ میری تین سو کی تنخواہ بھی آپ لے لیا کیجیے۔ صرف آپ کی تنخواہ میں ہی گھر کا سارا خرچ چلا لیا کروں گی۔ آپ کا بنک بیلنس، اور پرویڈنٹ فنڈ اور ——— زیادہ ضرورت پڑی تو ہم اِدھر اُدھر سے قرض بھی لے لیں گے۔ مکان بنتے ہی ہم سارا قرض دو تین سال کے اندر اندر نپٹا دیں گے۔

سارے مکان کو گرا کر ایک نیا مکان بنانے کا منصوبہ تو خیر دو سال بعد ہی شروع کیا جا سکتا تھا جب میری اور اس کی تنخواہ میں سو اور پچاس کی ترقی ہونے والی تھی لیکن ابھی تو وہ دو سو روپے ہر مہینے

حاصل کرنے کے لیے اس آنگن کی تقسیم چاہتی تھی۔

اس دن شام تک ہمارا میل نہ ہو سکا۔ الگ الگ کمروں میں پڑے رہے۔ میں صوفے پر لیٹا ایک ناول پڑھتا رہا۔ پتہ نہیں وہ کیا کرتی رہی؟ میں نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ صبح تو اُس کے ہاتھ میں امتحانوں کی کاپیوں کا بنڈل تھا۔

جہاں میں لیٹا تھا وہاں سے آنگن صاف دکھائی دیتا تھا۔ نومبر کے شروع کی دُھوپ وہاں اُتری ہوئی تھی۔ سُنہری اور گُن گُنی دھوپ جسے آنکھیں بند کر کے شریر میں جذب کر لینے کی خواہش ہوا کرتی ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی جو دیوار پر چڑھی بیلوں اور پیڑوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر ان کے پیلے سُوکھے پتّے گرا کر اُنھیں سارے آنگن میں اِدھر سے اُدھر اُڑاتی پھرتی تھی۔ میں نے کچھ دیر کے لیے ناول اپنی چھاتی پر اُلٹا رکھ دیا۔ گردن گھما کر آنگن کی دلکشی میں کھو گیا۔

کئی سال پہلے، جب میں کچھ ہی سال کا رہا ہوں گا، میں نے یہاں پہلی بار ایک برات کا سواگت ہوتے دیکھا تھا۔ باراتی ڈھول اور باجوں کے ساتھ ناچتے گاتے ہوئے آئے تھے۔ میں اپنے ہم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ چھت کی منڈیر پر بیٹھا خوش ہو رہا تھا۔ ہم لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ منڈیر کے کنارے کنارے پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے کنکر بھی نیچے گراتے تھے۔ جب کوئی کنکر کسی باراتی کے سر پر جا پڑتا اور وہ سر اُٹھا کر ہمیں گھورنے لگتا تو ہم ڈر کر مگر ہنستے ہوئے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ اُسی دن میں نے پہلی بار بندوق چلتے دیکھی تھی جب ایک براتی نے جوش میں آکر سب کے منع کرنے کے باوجود اپنی دونالی کی بندوق سے دو ہوائی فائر داغ دیے تھے۔ ڈز ڈز کی اُونچی آواز سُن کر ہم سب نے کانوں میں اُنگلیاں دے لی تھیں۔ ساری باتیں تو مجھے یاد نہیں ہیں لیکن کچھ دُھندلی دُھندلی سی تصویریں اب بھی کبھی کبھی سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔

مجھے اپنی بوا کا بیاہ بھی یاد ہے۔ تب بھی میں چھوٹا سا ہی تھا۔ جب وہ اپنے دُولہا کے ساتھ جانے لگی تھی تو وہ اِس گھر کے ایک ایک آدمی کے ساتھ گلے مل مل کر رو رہی تھی۔ مجھے اس کا چیخیں مارنا ابھی تک یاد ہے۔ مجھے بھی وہ اپنی بانہوں میں سمیٹ کر روتے روتے پتہ نہیں کیا کیا کہتی رہی تھی۔ اس سے مجھے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔ مجھے روز پیسے دیا کرتی تھی۔ میں اُس کے لیے دو بار ایک فوجی کے خط بھی لے آیا تھا، جنھیں اُس نے سب سے چُھپ کر مگر آنکھوں میں آنسو لا لا کر پڑھا تھا۔ ایک بار اُس نے میرے سامنے اس آنگن میں دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو کر اس فوجی کے ساتھ کچھ باتیں کی تھیں۔ فوجی اُس دن کہیں بہت دُور چلا گیا تھا اور شاید پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ میری بوا اب اُدھیڑ ہو چکی ہے۔ اب بال بچّوں والی ہے۔ پتہ نہیں اُسے یہ سب یاد ہے یا نہیں! اُس نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ میں بھی اُس سے کچھ نہیں پوچھ سکتا۔

پھر ایسا ہوا کہ میں عمر میں کچھ بڑا ہو گیا۔ کچھ جسمانی ساخت بھی بڑھی۔ تب شاید میں ہائی اسکول میں تھا۔ اڑوس پڑوس کی دو ایک لڑکیاں جو عمر میں مجھ سے ایک ایک دو دو سال بڑی تھیں لیکن میرے ساتھ ہی کھیلا کرتی تھیں اُن کے بیاہ بھی اسی آنگن میں ہوئے۔ وہ بھی یہاں سے روتی ہوئی وداع ہوئیں۔ اُنھیں روتا دیکھ کر ہم لوگ بھی کسی قدر افسردہ ہوئے تھے مگر اس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اُسی زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ بھی مجھے یاد ہے۔ یہاں دسہرے کے دنوں میں رام اور ہنومان کی لڑائی ہو گئی۔ ہنومان نے کسی بات پر طیش میں آکر رام کو اُٹھا کر دے مارا۔ رام کو بہت چوٹیں آئیں۔ پھر بڑی کوشش کے بعد اسی جگہ بھگت اور بھگوان کی صلح کرائی گئی تھی۔

یہ واقعہ یاد آتے ہی میں مسکرا اُٹھا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں سے نکل کر آنگن میں جا کھڑا ہوا۔ آنگن کے بیچ کھڑے ہو کر ایک اور دلچسپ واقعہ بھی یاد آیا۔ ہماری گلی میں ایک لڑکی دُلاری بھی رہتی تھی۔ بانس کی طرح لمبی اور پتلی۔ کوئی لڑکی ذرا سی لمبی نکل جائے تو وہ بہت عجیب سی لگتی ہے۔ ہم اُسے بانس دیدی کہہ کر چڑاتے تھے۔ ہمیں وہ پکڑ لیتی تو ہماری ٹھکائی کر دیتی۔ ہم اُس کے مُنہ پر یہی کہا کرتے۔ "بانس دیدی تیرا بیاہ کبھی نہیں ہوگا۔!"

لیکن ایک دن اسی آنگن میں اُسے بھی بیاہ لے جانے کے لیے ایک دُولہا بارات لے کر آگیا۔ جس روز وہ ڈولی میں لے جائی جا رہی تھی ہم سب لڑکے دیوار کے سہارے کھڑی کی ہوئی سائیکلوں کی گدیوں اور کیریر پر بیٹھے اس کی طرف بڑی اُداس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اُس سمے بھی بانس کی مانند لمبی لگ رہی تھی۔ اپنے نئے نویلے سے دو پور اونچی! لیکن ہم لوگ ہنسنے یا مذاق اُڑانے کے موڈ میں نہ تھے۔ اُسے روتا سسکتا دیکھ کر ہماری آنکھیں بھی بھیگ چلی تھیں۔

دُلاری کے بیاہ کے بعد اس محلّے کی کچھ اور لڑکیوں کے بیاہ بھی آگے پیچھے کی تاریخوں میں کر دیے گئے تھے۔ پتہ نہیں کیا سبب تھا؟ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ کھیل کر یہاں جوان ہوتے تھے لیکن اُن کے بیاہ دُور دُور کر دیے جاتے تھے۔ اس محلّے کی کوئی لڑکی اسی محلّے میں دُلہن بن کر نہ رہ سکی۔ یہاں کے لڑکوں کے قد کاٹھ نکالتے ہی ماں باپ کو اپنی اپنی لڑکیوں کی فکر لگ جاتی تھی۔ بارات والوں کی خاطر مدارات کی وجہ سے ہمیں کبھی کبھی تو کئی ہفتوں تک اپنے آنگن کو استعمال کرنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ میرے بزرگ لڑکی والوں کا ہاتھ بٹانے میں بھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔ دریاں، برتن، چارپائیاں، تخت وغیرہ ہر چیز جو وہ دے سکتے اُن کے حوالے کر دیا کرتے۔ میونسپلٹی نے پانی پر ٹیکس لگا دیا تو بھی یہاں پانی کے استعمال پر کوئی روک ٹوک نہیں لگائی گئی۔ یہاں بجلی آگئی تو مہمانوں کو روشنی اور پنکھوں کی سہولیات بھی دی جانے لگیں۔ ان کے لیے اُنھوں نے لڑکی والوں سے کبھی خرچ لینا گوارا نہ کیا۔

میرے بزرگوں کے نام سے یہاں کا ایک اور اہم واقعہ بھی وابستہ تھا۔ اسی محلّے کے ہندو مسلمانوں کے

درمیان ایک بار بڑا فساد ہوا تھا۔ کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔ کئی روز تک پکڑ دھکڑ ہوتی رہی تھی۔ لیکن میرے دادا اور پتا نے اپنی کوششوں سے ہندو اور مسلمانوں کو اسی آنگن میں جمع کر کے ایک دوسرے کے گلے ملوا دیا تھا۔ اُن سب کی ٹھنڈے شربت اور مٹھائیوں سے تواضع کی تھی۔

لیکن یہ آخری سال تھا جب یہاں محرم کا جلوس آیا تھا۔ ورنہ ہر سال جلوس تازیے لے کر کچھ منٹوں کے لیے یہاں رُک جاتا تھا۔ اُس کی تعظیم کے لیے اس آنگن میں سینکڑوں مشہور اور قابلِ احترام وکیل، ڈاکٹر، حکیم، عہدیدار اور بیوپاری لوگ گھنٹوں پہلے سے آکر بیٹھ جاتے تھے۔ جن میں مسلمان ہندو اور سکھ شامل ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی انگریز افسر بھی شامل ہو جاتا تھا۔ ماتم کرنے والے جو مرثیے پڑھا کرتے تھے ان کے کئی بند ہمیں زبانی یاد ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی تو میں خود اکیلے میں گانے لگتا تھا۔

دولاکھ کے حلقے نے علم دار کو گھیرا
وُہ چاند تو تھا بیچ میں اور گرد اندھیرا
اِک تیر لگا چشم پہ اور سینے پہ بھالا
بند آنکھیں ہوئیں مُنہ سے لہو شبیر نے ڈالا
رُخصت ہوئے اب شہ سے علی اکبرِ ذیشان
..................!

جب میں انجنیئرنگ کالج میں پڑھتا تھا اور ایک بار چھٹیوں میں گھر آیا تو اُن دنوں ڈاک خانے والے بھاردواج کی لڑکی دمنتی کا بیاہ ہو رہا تھا۔ دمنتی نے میرے ساتھ ہائی اسکول کا امتحان دے کر آگے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس کے بیاہ میں پہلی بار میں نے بھی اپنے پُرکھوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مہمانوں کی انتھک سیوا کر ڈالی۔ سویرے سے شام تک بھاگا بھاگا پھرا۔ دمنتی کو میں نے ایک تحفہ بھی پیش کیا تھا۔ اُسے وداع کرنے اُس کے ساتھ اسٹیشن تک بھی گیا تھا۔ دمنتی کا بھائی بیکنٹھ میرا گہرا دوست تھا۔ اُس روز ہم دونو ہی رو پڑے تھے۔ پتہ نہیں کیوں رو پڑے تھے؟

بیٹھنے کے لیے میں موڑھا اُٹھا لایا۔ موڑھے میں بالکل ڈوب کر اپنے آنگن کے چاروں طرف اُوپر آس پاس کے اُونچے اُٹھے ہوئے مکانوں کو دیکھا۔ یہ سب مکان تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد اُونچے ہوتے گئے تھے۔ ان مکانوں کی کھڑکیوں میں میں کتنے چمکتے، مُسکراتے ہوئے چہرے دیکھ چکا تھا۔ میری بہن پرمیلا اور شکنتلا کی کتنی ہی سہیلیاں ——— مدھو، پریا، اُرملا، وغیرہ گلی پار کر کے، اپنے اپنے مکان میں سے نکل کر کھیلنے کے لیے اسی آنگن میں آجاتی تھیں۔ اس آنگن میں اُن کے کتنے سارے گیت، سُریلے قہقہے اور کانوں کو بھلی لگنے والی کلکاریاں، چٹکلے اور طنز بکھرے پڑے تھے۔ ان کی بیاہ سمے کی دبی دبی چیخیں اور سسکیاں ابھی

تک کانوں کے ساتھ ٹکراتی ہوئی جان پڑتی ہیں۔

اسی آنگن کے نرم مٹی والے فرش پر سمیتا بھی چل کر آیا کرتی تھی۔ کبھی صبح اور کبھی شام کو، کبھی کبھی جلتی دوپہر میں بھی وہ دبے پاؤں آنکلتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم، احتیاط سے اٹھاتی ہوئی! کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو اس سے صبح کا اخبار یا ویکلی مانگ کر لوٹ جاتی تھی۔ میں سامنے آجاتا تو وہ مسرور ہو اٹھتی۔ پھر ہم برآمدے پر پڑی ہوئی نیلے بھاری پردوں والی چقوں کے باہر اس آگ کی سی دھوپ سے بھرے ہوئے آنگن میں پہروں کھڑے گھس پھساتے، اور مسکراتے رہتے تھے۔ ہمارے گھر والے تو بند کمروں میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے اور فل اسپیڈ پر پنکھے چھوڑ کر گہری نیند سوئے ہوئے ہوتے تھے۔ سخت گرمی اور پسینے سے شرابور ہو ہو کر چمکتا ہوا سمیتا کا وہ چہرہ اب بھی یاد آجاتا ہے تو نہ جانے کیسا لگنے لگتا ہے!

اسی جگہ میں نے بھابی اور ماں کی موجودگی میں آدھی آدھی رات تک سمیتا کو کئی کہانیاں سنائی تھیں۔ اپنی کالج کی زندگی کی دلچسپ شرارتوں کا حال سنا سنا کر اسے ہنسایا بھی تھا اور کبھی کبھی اپنی پی ڈبلیو ڈی کی ملازمت کے قصّے سنا کر اسے فکر مند بھی بنایا تھا۔ اسی جگہ ایک رات بھابھی نے اچانک ہی سمیتا کے سامنے مجھ سے پوچھ لیا تھا۔ "تم اب شادی کیوں نہیں کر لیتے، نربندر؟ اس آنگن میں کتنا سونا پن ہے! ساتھ بات کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ تمھاری دلھن کے آجانے سے ہر طرف جھنکار سی بکھر جائے گی —— سچ کہتی ہوں۔"

اس کی بات سن کر میں اور سمیتا دونوں ہی دیر تک گم سم سے بیٹھے رہ گئے تھے۔ ہماری خاموشی پر بھابھی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا تھا —— "تم دونوں تو ایسے چپ ہو گئے ہو جیسے ایک دوسرے کو چاہتے ہو!"

ہم دونوں اس وقت بھی چپ بیٹھے تھے۔ ماں اس سمے گہری نیند میں ڈوبی خرّاٹے لے رہی تھیں۔ اسی وقت اوپر چھت پر سے بھیّا نے بھابھی کو پانی لے آنے کے بہانے سے پکار لیا تھا۔ بھابھی ہماری طرف شرارت بھری نظروں سے مسکرا کر دیکھتی ہوئی اوپر چلی گئی تھی اور سمیتا مجھ سے کچھ کہے بنا ہی جلدی سے اٹھ کر اپنے گھر چل دی تھی۔ میں گلی کا دروازہ بند کرتے وقت وہاں بلا مقصد ہی کھڑا سا رہ گیا تھا۔

اور پھر، وہ دن بھی آگیا جب اسی آنگن میں میں نے سمیتا کے دولہا اور اس کی برات کا بھی سواگت کیا تھا۔ یہ اس آنگن کا سب سے بڑا دلدوز واقعہ تھا۔ جسے میں پیار کرتا تھا اسے دوسرے مرد کے ساتھ وداع بھی کرنا پڑا۔ اب میں بچّہ نہیں رہا تھا۔ پچیس برس کا تعلیم یافتہ اور ایک معقول سی ملازمت پر تعینات تھا۔ اس بات کو بخوبی سمجھ چکا تھا کہ زندگی کے فیصلہ کن لمحوں میں چپ رہ جانے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے!

میرے بڑے بوڑھے ایک ایک کر کے پرلوک سدھار چکے تھے۔ اسی آنگن میں سے ہی ان کی ارتھیاں

بھی اُٹھائی جا چکی تھیں۔ بھائی اور بھابی ایک دُوسرے شہر میں اپنا الگ مکان بنوا کر مجھے یہ سارا مکان سونپ گئے تھے۔

یہاں اکیلا رہ جانے سے مجھے بڑی گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ رات کو جب بستر پر لیٹتا تو مجھ پر یادوں کے پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے۔ یادوں کی کچھ پرچھائیاں بھی آ نکلتیں جو بہلاتی کم تھیں اور رُلاتی زیادہ تھیں۔

دن کے وقت دفتر جانے سے پہلے خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں نل پر سے پانی بھر بھر کر سارے آنگن میں چھڑکتا پھرتا۔ اتنا پانی بہاتا کہ چاروں طرف جل تھل ہو جاتا لیکن پیاسی دھرتی دیکھتے ہی دیکھتے سارا پانی پی لیتی اور اپنے اندر سے ایسی سوندھی سی خوشبو اُگلتی کہ میری نس نس میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔

بیاہ ہو جانے کے بعد سمیتا صرف ایک بار اُس آنگن میں آئی تھی۔ مجھ سے ملنے کے لیے ہی آئی تھی۔ اُس دن بھی میں پانی بھر بھر کر آنگن میں چھڑکاؤ کرتا پھر رہا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ اُگے بوٹوں اور کیاریوں کو بھی سینچتا پھر رہا تھا کہ اُسے اچانک اپنے سامنے پاکر ٹھٹھک گیا۔ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ ہاتھوں میں بالٹیاں اُٹھائے، منہ میں داتن دبائے حیران اور چپ چاپ۔

میں نے مُسکرا کر بالٹیاں نیچے رکھ دیں۔ کمر میں اڑسا ہوا پاجامہ ٹھیک کیا اور اُس کے پاس جاکر پوچھا "تم کب آئیں، سمیتا؟"

اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ پتہ نہیں وہ میری آنکھوں میں کیا دیکھتی رہی! پھر اُس نے مجھ پر سے نظریں ہٹا لیں۔ میرے اور اپنے آس پاس پھیلے ہوئے اس وسیع اور کشادہ آنگن کو دیکھنے لگی جیسے پرہم دونوں کے وجود محض دُو نکتوں ہی کے برابر تھے۔

"چلو، چل کر اُس تخت پر بیٹھو!"

وہ اُسی جگہ پہ گٹھڑی سی بنی کھڑی رہی۔ وہ ایسے لباس میں تھی جنہیں دُلھنیں شادی کے بعد پہننے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ اُس کی مانگ میں سیندور کی ریکھا تھی۔ اُس کی رنگت کتنی بدل گئی تھی۔ اشکل بھی جیسے بالکل دُوسری ہو گئی تھی جس کا پہلے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی اُداسی وُہی تھی۔ محرومی کا گہرا نقش وہی تھا۔ وہ کتنی دیر تک کھڑی دیکھتی اور سوچتی رہی۔ اس کے ہونٹ کانپتے رہے اور اُس کی آنکھیں نمناک ہوتی گئیں۔ شاید آنسو روک نہ سکی تو جلدی سے پلٹ کر باہر چلی گئی۔

بس! یہی کچھ دکھانے کے لیے ہی یہاں تک آئی تھی! یہ تو میں جانتا ہی تھا! یہ سب تو مجھے معلوم تھا۔ اس کا احساس تو مجھے ہوتا رہتا تھا۔ لیکن وہ میرے پاس آکر اس طرح اچانک لوٹ کیوں گئی؟ کچھ کہا تو ہوتا! کچھ دیر بیٹھ گئی ہوتی! نہ ہاں، نہ ہوں!!

اس کے بعد میں نے سمیتا کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے ڈیڈی کا کسی دُوسرے شہر میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ اب

اس کا اس شہر میں کیا کام؟ وہ یہاں کہاں آئے گی؟ کس کے لیے آئے گی؟

آنگن کے سونے پن سے گھبرا کر میں نے شادی کر لی۔ نیٹا کو گھر لے آیا۔ نیٹا کے یہاں قدم رکھتے ہی سچ مچ ہر طرف جھنکار سی بکھر گئی۔ جیسا کہ بھابی نے ایک بار کہا تھا۔

میں مونڈھے پر سمٹا ہوا اپنے آنگن کو آبدیدہ سا ہو کر دیکھ رہا تھا۔ بیلوں، بوٹوں اور برگدوں کی سوکھی زرد پتیاں میرے چاروں طرف فرش پر اڑتی پھرتی تھیں۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی لمحے نیٹا بھی دستک سن کر برآمدے کی ڈاٹ کے نیچے آ کر رک سی گئی اس کے صبح کے دھوئے ہوئے لمبے کالے بال اس کی پیٹھ پر ہی بکھرے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف بنا پلکیں جھپکائے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ میں جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازے پر پنجاب نیشنل بنک والے وہی پوری جی ہی تھے۔ بڑی معذرت سے بولے —— "بھئی معاف کرنا نریندر، تمہیں ناحق تکلیف دی۔ دراصل میں یہ کہنے آیا ہوں کہ اب مجھے اس آنگن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کیونکہ پونٹی اور شیکھر نے صرف چار چھ جنوں کے ہی سامنے بغیر کسی غل غپاڑے کے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے کہتے ہیں، ہم ہنگامے اور دعوت کا روپیہ بچا کر کسی پہاڑ پر چلے جائیں گے۔ میں نے بھی منظوری دے دی ہے آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ بہرحال آپ کی کوآپریشن کا بہت بہت شکریہ!"

اتنا کہہ کر وہ تو پلٹ گئے مگر میں بالکل گم سم سا اپنے آنگن کی طرف دیکھنے لگا۔ چاروں طرف سے اونچے اونچے مکانوں سے گھرے ہوئے آنگن کی طرف۔

جب میں نے آنگن کو پار کیا تو مجھے یوں لگا جیسے مجھے وہاں چلتے چلتے کئی گھنٹے بیت گئے ہوں کئی سال۔ جب دوسرے کنارے پر پہنچا تو میں بالکل تھک چکا تھا۔ میرے سامنے نیٹا کھڑی تھی۔ آدر کو سمیٹی ہوئی چق کے نیچے۔ دلکش مگر چپ اور مضبوط۔ اپنی ضد پر جمی ہوئی۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا —— "تم بلا وجہ ہی ناراض ہو گئیں، نیٹو؟ چلو چائے پلواؤ۔ پھر بیٹھ کر اس آنگن کا نقشہ بدلنے کا اسٹیمیٹ بنائیں گے۔"

غروب

جوگندر پال

"تمھیں شاید یقین نہیں آرہا ؟"

"میرا سر پھرا ہوا ہے کہ چالیس برس کے کنفرمڈ بیچلر کی بے تکی باتوں کو خدا کا کلام سمجھ لوں۔"

"شٹ اپ!" پروفیسر ڈاکٹر پانڈے نے خشک سی مسکراہٹ سے اپنے دوست پروفیسر قادر کو جواب دیا، اور وہ دونوں لیبارٹری سے برآمد ہوکر ڈاکٹر پانڈے کے دفتر میں داخل ہوئے۔

"بیٹھو۔" ڈاکٹر پانڈے نے خود بیٹھ کر پروفیسر قادر کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"آل ورلڈ سائنٹسٹس کانفرنس نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے اور تشویش ظاہر کی ہے کہ سورج کی آگ ٹھنڈی پڑ رہی ہے اور عنقریب آگ کا یہ گولہ بالکل سرد ہوکر رہ جائے گا ——"

"عنقریب —— ؟"

"ہاں کوئی ڈھائی کروڑ سال تک ——"

"اوہ —— ہ!" پروفیسر قادر نے اپنے اطمینان کے اظہار کے لیے سانس بھرا۔

"اوہ وہ نہیں۔" ڈاکٹر پانڈے جھلّا سا گیا۔ "ذرا غور کرو ہماری دُنیا کی حالت کیا ہوگی۔"

"کیا ہوگی؟" ڈھائی کروڑ سال بعد کے خطرے کا احساس پروفیسر قادر کو بڑا مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔" اور ہو بھی گئی تو تمھیں کیا؟ تمھیں کسی سے عشق نہیں، تمھارے بیوی بچے نہیں، ڈھائی کروڑ سال بعد کیا، سالی دُنیا کو آج ہی تباہ ہونے دو، تمھیں کیا؟ ——" وہ ہنسنے لگا۔

"تمھاری ہنسی بڑی المناک ہے۔"

پروفیسر قادر مزید ہنسنے لگا۔ "ہم سب جانتے ہیں کہ ستر اسّی برس کی عمر میں ہمیں موت آلے گی پھر بھی جب تک وہ ہمارے سر پر نہیں آ کھڑی ہوتی ہم بڑے مزے سے آنکھیں بند کیے کسی جاوداں زندگی کے تصور میں مست رہتے ہیں۔ اب تم ——"

"تم ادب کے لوگ بڑے جاہل ہوتے ہو یار!" اپنی سائنسی برتری سے لبریز ہوکر ڈاکٹر پانڈے کو معلوم ہونے لگا کہ پروفیسر قادر بیچارہ نرا خالی خولی ہے۔ "چھوٹے یا بڑے ہندسوں کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ وقت کی پہچان میں ایک سہولت مہیا کریں اور بس، مگر تم لوگ ہو کہ ہندسوں کی جسامت کو وقت کی طوالت کا مترادف

سمجھ لیتے ہو ـــــــ"

"وہ تو ہے ہی ۔" پروفیسر قادر نے اُسے ٹوکا ۔ "ڈھائی کروڑ سال کا عرصہ ایک سال سے ڈھائی کروڑ گنا طویل ہے ۔"

"نہیں، میرے بھائی، نہیں !" ڈاکٹر پانڈے کو اپنے ساتھی پر ترس آنے لگا کہ خواہ مخواہ اُس نے اپنی ساری زندگی ادب وڈب میں ڈبو دی ہے ۔ "وقت کو سال و ماہ کا نام ہم نے دے رکھا ہے، بذاتِ خود وقت صرف وقت ہے، وہ ایک کروڑ سال ہو یا ایک روز یا ایک لمحہ ۔" ڈاکٹر پانڈے پھر پریشان نظر آنے لگا ۔ "ذرا تصوّر کرو، جب سُورج ٹھنڈا پڑ جائے گا، تو کیا ہوگا ؟"

"ہوگا کیا ؟" پروفیسر قادر نے اپنی کلاس میں کسی نظم کی تفسیر پیش کرنے کے انداز میں کہا ۔ "ہم دن کے وقت سو لیا کریں گے اور چاند تاروں کی روشنی میں راتیں آباد کر لیں گے ـــــــ لو سگار پیو ۔" وہ اپنا سگار سلگانے لگا ۔

"نو، تھینک یُو ! میں نے تمباکو نوشی، شراب نوشی ـــــــ سب اُلٹی عادات ترک کر دی ہیں ۔"

"یعنی سیدھی عادات نے تمہیں اُلٹا لٹکا دیا ہے ۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر، تمھارے نزدیک تو ساری عمر اُلٹا لٹکے رہنا ایسا ہی ہے جیسے یہی گھڑی دو گھڑی کے لیے سِیس آسن کرنا ۔ تمھیں ڈھائی کروڑ سال تک زندہ رہنا ہے تاکہ سُورج ـــــــ"

"مذاق مت کرو میرے دوست، میں واقعی بڑا پریشان ہوں ـــــــ لاؤ تمھارا سگار پی ہی لوں ۔" ڈاکٹر پانڈے سگار لے کر پروفیسر قادر سے ماچس طلب کرنے لگا ۔ "تم غور نہیں کر رہے ۔ جب سُورج ٹھنڈا ہو جائے گا تو ـــــــ تو وہ یخ بستہ اندھیرا ـــــــ"

"لیکن موت کے بعد بھی تو یہی ہوتا ہے ۔ ایک یخ بستہ اندھیرا اور بس ـــــــ"

"لیکن اِس موت میں اور اُس موت میں بڑا فرق ہے ۔ اِس موت میں ایک گونہ زندگی آباد ہوتی ہے ـــــــ تمھارا سگار واقعی بڑا مزیدار ہے ۔" ڈاکٹر پانڈے نے بڑے مزے سے ایک کش لیا ۔ "ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ اِس موت سے زندگی کا تسلسل نہیں ٹوٹتا، ہم جو زندہ رہ جاتے ہیں موت سے متعلق سوچ سوچ کر اُس میں اپنے سانس بھر دیتے ہیں، لیکن وہ موت ٹوٹل زندگی کی ٹوٹل موت ہے، گھور سیاہ بے بصری، یا نہ جانے کیا، کیونکہ بے بصری کا تصوّر بھی زندگی کا محتاج ہے ـــــــ تم ہنس رہے ہو ؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں برنارڈ شا کا کوئی ڈرامہ سٹیج کر رہا ہوں ؟ ارے بابا، یہ تمھارا ڈرامہ نہیں، میری سائنس کی باتیں ہیں، حقیقت ہے ۔"

"اطمینان رکھو ڈاکٹر، اگر تم جھوٹ بھی بول رہے ہو تو مجھے قطعاً اعتراض نہیں، کیونکہ ہم اہلِ ادب کے نزدیک جھوٹ بھی سچائی ہی کا ایک اہم حصّہ ہے ۔" پروفیسر قادر سگار کا کش لیتے ہوئے کچھ سوچنے کے لیے ذرا ٹھہر گیا ۔ "تمھاری مشکل یہی ہے ڈاک، کہ تم جھوٹ کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے ۔ واللہ اگر تم اپنے معلوماتی علم کے گورکھ دھندے سے

باہر نکل آؤ، شاعرانہ یا بقول تمہارے احمقانہ اضطراب سے عشق کرو اور ہر خوبصورت جھوٹ پر ایمان لے آؤ تو تمہیں اُن سب دباؤں سے نجات مل جائے جو ڈھائی کروڑ سال بعد وقوع پذیر ہوں گی ——— اچھا بتاؤ، اب چائے پلاؤ گے؟ نہیں پلا سکتے تو میرے ڈیپارٹمنٹ میں چلے آؤ۔ ہمارا رسول ایسی فسٹ کلاس چائے تیار کرے گا کہ تمہیں سرے سے سورج کی حرارت کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ آؤ!"

"نہیں بھائی، تم جاؤ اب، مجھے کام کرنا ہے۔"

لیکن ڈاکٹر پانڈے کا جی اپنے کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ جب پروفیسر فادر چلا گیا تو وہ بدستور سوچتا رہا کہ سورج کی گرمی کیونکر انحطاط پذیر ہو رہی ہے۔ یہی سوچتے سوچتے اُس نے اپنے سامنے بالائی دیوار کی جانب دیکھا وہاں دھوپ کا ٹکڑا کچھ ایسا دکھائی دے رہا تھا گویا برف کی سفیدی جمی ہوئی ہو اور اس برفانی سفیدی کی طرف گھور گھور کر دیکھتے ہوئے سائنس داں کے ننھے مُنّے ذہن پر کل کائنات کا کینوس بننے لگا، جیسے ایک نقطے سے کروڑوں، اربوں میل کی وسعتیں پھوٹ رہی ہوں اور ان وسعتوں میں سیاروں کا سفر، زندگی کی ریل پیل سورج سے قائم ہو جو سدا جل جل کر اس لیے راکھ نہیں ہوتا کہ وہ آگ سے جلتی ہوئی کوئی اور شئے نہیں بلکہ خود آگ ہے لگاتار جل جل کر آگ میں صرف آگ ہی باقی رہ جاتی ہے، روحِ آتش، جو کبھی نہیں بجھتی، کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔

"لیکن یہ آگ اب کیوں کم ہونا شروع ہو گئی ہے؟" سائنس داں نے بے چین ہو کر اپنے سائنسی اعتقاد کو جھنجھوڑا

"چالیس ہزار پچاس کروڑ سال پہلے ہمارا کرۂ ارض جل جل کر آگ کی اسی جسیم روح سے باہر آ گرا تھا۔ اس تپیدہ ٹکڑے کی سطح آج سرد ہو چکی ہے لیکن چونکہ ابھی اس کے باطن میں کچھ حرارت اور بے چینی کہیں چھپی پڑی ہے اس لیے اب بھی یہ ٹکڑا سورج کا طواف کرتا رہتا ہے مگر جب اس کا محور ہی بجھ گیا، بے جان ہو گیا تو یہ بھی خلا کی تہوں میں غرق ہو جائے گا۔"

"لیکن نیچر کا پروگرام ہے کیا؟ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں؟ ———"

ڈاکٹر پانڈے آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ فٹ کر کے اپنے آفس کی کھڑکی کے قریب آ کھڑا ہوا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"آخر نیچر اپنے اس اقدام سے چاہتی کیا ہے؟ کیا خودکشی پر تل گئی ہے؟" سورج کی جانب گھور گھور کر دیکھنے کے باوجود اُس کے دل و دماغ حرارت کے احساس سے عاری رہے۔

"ارے بھئی ڈاکٹر۔" باہر فلسفہ کا پروفیسر اُسے دیکھ کر چلتا چلتا ٹھہر گیا تھا۔ "ادھر دیکھو، سورج یہاں نیچے دھرتی پر اُترا ہوا ہے۔" اُس نے دھوپ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "مگر تم اسے دیکھنے کے لیے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائے ہوئے ہو۔"

ڈاکٹر پانڈے نے حسبِ عادت خشک سے انداز میں مسکرا کر اُسے سلام کیا اور کھڑکی سے ہٹ کر پھر

اپنی کرسی پر آبیٹھا اور بدستور نظامِ شمسی سے متعلق سوچ سوچ کر اس نے اپنے سامنے رکھا ہوا تازہ اخبار اٹھایا اور سرخیوں پر نگاہ دوڑانے لگا، چھوٹے بڑے حروف جو بے حس انسانوں کی مانند اپنے بھیانک معنی کو بڑی سرد مہری سے ادا کر رہے تھے۔ ڈاکٹر پانڈے نے لاپروائی سے اخبار کو ایک طرف ڈال دیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ اگر ہم سب واقعی ڈھائی کروڑ سال بعد ایک بیکراں منجمد تاریکی میں غرق ہو رہے ہیں تو ہم باقاعدہ اپنے اپنے کام میں کیوں جٹے رہیں؟ کیوں نہ ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیکار بیٹھ جائیں اور ڈھائی کروڑ سال تک چپ چاپ قیامت کا انتظار کریں؟

اسی اثنا میں ڈاکٹر پانڈے کا بوڑھا چپراسی اس کے چند کاغذات لیے آفس میں داخل ہوا۔

"ننھو!" چپراسی کاغذات میز پر رکھ کر مڑنے لگا تو ڈاکٹر نے کہا۔ "اِدھر آؤ۔" علمیت کی فطرت ہے کہ اپنی بے چارگی محسوس کر کے جہالت سے ایک چھپا ڈھکا سمجھوتا سا کر لیتی ہے۔ "تم جانتے ہو سورج سرد ہوتا جا رہا ہے؟"

بوڑھا چپراسی کتابی علم سے بے بہرہ تھا لیکن جب سے غریب کی بوڑھی جلد حیات کے گرم و سرد سے جلد متاثر ہونے لگی تھی وہ غور و فکر کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ "سورج بھگوان تو ابھی ہٹا کٹا ہے سرکار، پر آدمی ہی بڈھا ہوتا جا رہا ہے۔"

"یعنی؟"

"یا فی یہ سرکار،" سائنس والوں کے چپراسی نے اپنے آقا کی زمین پر ذرا ٹانگیں پسار کر بیٹھنے کا حق جتایا۔ "کہ آدمی کا اپنا ٹمپریچر گر جائے تو باہر کی تپن بھی برف لگتی ہے۔ آج کل کے چھوکروں کو دیکھتا ہوں سرکار تو بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ جنم سے بوڑھے ہیں اور تو اور، کھل کر کھکھلانے سے بھی ڈرتے ہیں کہ پسلی ٹوٹ جائے گی۔" وہ ہنسنے لگا۔ "بات یہ ہے سرکار کہ نئے لوگ سوچ سوچ کر، پڑھ پڑھ کر ناکارہ ہوتے جا رہے ہیں۔ برا نہ مانیے میں اپنے دل کی ایک بات کہہ رہا ہوں۔" ننھو ڈاکٹر پانڈے کا منہ لگا آدمی تھا۔ "آدمی اِلم سے بڑا نہیں ہوتا۔ دل بڑا ہو تو آدمی بھی بڑا ہوتا ہے میں اپنی لگائی کو سو حریفوں کی سبھا سے اٹھا کر بھگا لایا تھا سرکار، بس اندر کی ایک تپن سی، ایک چاہ سی تھی، سو ———"

ڈاکٹر پانڈے کو معلوم تھا کہ ڈور ذرا اور ڈھیلی چھوڑ دی تو یہ بافونی بڈھا بولتا چلا جائے گا۔ "اچھا جاؤ اب ننھو، کام کرنے دو۔"

"ہاں سرکار، آپ کام کریں۔" وہ جاتے جاتے کوئی خیال آنے پر ٹھہر کر ہنسنے لگا۔ "پر ایک بات کہوں، ان بچہ لوگوں کو سائنس پڑھانے سے پہلے آپ موہبت کرنا سکھائیے۔ انھیں موہبت کرتے دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے اٹک اٹک کر کوئی امتحانی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ آپ سورج کی بات کرتے ہیں سرکار، میں تو ———"

"اچھا، اچھا۔" ڈاکٹر پانڈے نے اپنی ہنسنے کی خواہش دبا کر متین نظر آنے کی کوشش کی۔ "جاؤ۔"

ننھو چلا گیا تو ڈاکٹر پانڈے کھلکھلا کر ہنس پڑا گویا ننھو نے اس کی متانت کو گدگدا دیا ہو۔ "ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ ہم نئے لوگ اس لیے جی بھر کے محبت نہیں کرتے کہ محبت کو بھی علوم میں شمار کرنے لگے ہیں۔"

ڈاکٹر پانڈے کا منہ ہنس رہا تھا اور ذہن میں طلوع ہو رہا تھا اور اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ پروفیسر قادر کی تمباکو آمیز خنداں آواز اُس سے مخاطب ہے۔ "محبّت علم نہیں ڈاکٹر، محبّت احساس ہے، کیونکہ علم سب کی ساجھی ملکیت ہے اور محبّت سب کی اپنی اپنی" گویا ڈاکٹر پانڈے کی سماعت میں اچانک اُس کا دل چلا آیا ہو۔ "ڈاکٹر، محبّت ہر انسان سے براہِ راست رابطہ پیدا کرتی ہے۔ تم نے اپنے یونگ اور یونگ کو بھی سائنٹیفک سب ٹائٹیلز دے رکھے ہیں، مگر محبت علم ہے نہ سائنس، محبت ایک تجربہ ہے، ایک ذاتی خوشی ہے، ذاتی غم ہے ———"

"ذاتی غم! ذاتی خوشی ———" ڈاکٹر پانڈے نے اپنے دل میں کسی ذاتی غم، کسی ذاتی خوشی کو ڈھونڈنا چاہا لیکن یہاں اُسے لاشخصی، سائنسی حقائق کے سوا کچھ نہ ملا۔ جیسے وہ اِن حقائق کو اُلٹ پلٹ کر سچائی ڈھونڈ رہا ہو۔

"تمھاری مشکل یہ ہے کہ تم جھوٹ کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے۔" پروفیسر قادر کی آواز میں سگار کی خوشبو کتنی پُرلطف تھی۔

ڈاکٹر پانڈے نے جلدی سے گھنٹی دبائی جسے سُن کر نتھّو فوراً حاضر ہو گیا۔

"نتھّو، کینٹین سے ایک پیکٹ سگار لے آؤ، اور ایک ماچس۔ جلدی۔"

نتھّو نے منہ موڑا تو ڈاکٹر پانڈے اچانک کوئی خیال آنے پر اپنی گھڑی دیکھنے لگا۔ "مِس ہرمزجی ابھی تک کیوں نہیں آئی؟"

مِس ستینہ ہرمزجی اُس کی نگرانی میں اپنی پی ایچ ڈی، کے لیے 'سپیس' پر ایک مقالہ لکھ رہی تھی، اپوائنٹمنٹ کے مطابق وہ ہر بدھ کو ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اُس کے دفتر میں پہنچ جاتی تھی لیکن آج ساڑھے گیارہ سے دو چار منٹ اُوپر ہو لیے تھے۔

"دیکھو ڈاکٹر۔" ایک دن قادر نے ڈاکٹر سے کہا تھا۔ "عورت کو خلا سے کیا دلچسپی؟ وہ تو ہمیشہ ہر خلا کو بھرا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔"

"یعنی؟"

"یعنی اُسے تم سے دلچسپی ہے۔"

"شٹ اپ!"

"نہ مانو۔ تمھیں تو اپنی آنکھیں کھولنے یا بند رکھنے کا حق حاصل ہے، کیونکہ آنکھیں تمھاری ہیں۔ مگر یاد رکھو، چالیس برس کی عمر میں ایسا موقع مشکل ہی سے ہاتھ آتا ہے۔ اب بھی نکھٹو بن کے بیٹھے رہے تو ساری عمر کنوارے رہو گے۔"

دفعتاً اپنے آفس کے باہر نسوانی چاپ سُن کر ڈاکٹر پانڈے کو معلوم ہوا کہ اُس کے دل کی لیبارٹری میں کیمیکلز کی بوتلیں اچانک اپنے خانے سے گر کر چُور ہو گئی ہیں، اور وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آیئے مِس سینہ ہرمزجی!" ڈاکٹر نے 'ستینہ' کہنے کے لیے پارسی لڑکی کو اُس کے پُورے نام سے پکارا کیونکہ

وہ سوچ رہا تھا کہ یہی وہ خوبصورت سچائی ہے جسے وہ ابھی ابھی سائنسی حقائق کے انبار میں ڈھونڈ رہا تھا۔

"معاف کیجیے مجھے دیر ہو گئی ہے۔"

ڈاکٹر پانڈے نے اپنے دل ہی دل میں کہا کہ جھوٹ دوڑا دوڑا چلا آتا ہے لیکن سنیہ ہمیشہ اپنا وقت لے کر ہی پہنچتی ہے، اس نے مس ہرمزجی کی طرف بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ جوگیا رنگ کی سلکن ساڑھی پہنے ہوئے تھی، اس کے جھمکوں کے سرخ رنگ بے چین ہو ہو کر ہل رہے تھے، اس کا منہ ذرا ذرا کھلا ہوا تھا جیسے وہ بولے بغیر بات کرنا چاہ رہی ہو اور اس کے بالوں کی شوخ سیاہی اور چہرے کی ذہین سفیدی بڑا خوشگوار تضاد پیدا کر رہی تھی۔

مس ہرمزجی اپنے پروفیسر کو اپنی جانب اس قدر غور سے دیکھتے ہوئے پاکر شرما گئی اور اس کی ساڑھی کا رنگ اچھل کر اس کے چہرے میں چلا آیا۔

"بیٹھیے۔"

وہ بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر پانڈے کے سامنے دیوار کی دھوپ گویا اپنی حدت سے پگھل پگھل کر ڈاکٹر کے پاؤں کی جانب پھیلنے لگی۔

"مس ہرمزجی۔" ڈاکٹر بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آپ کی آمد سے پہلے میں آپ ہی سے متعلق سوچ رہا تھا۔"

مس ہرمزجی کے کھلے ہوئے لب، ذرا اور کھل گئے مانو اس کی دلآویز خاموشی کی صدا ڈاکٹر کے الفاظ سن کر ذرا بلند ہو گئی ہو۔

"اور میں سوچ رہا تھا کہ ہر وقت خلا کی طرف تکتے تکتے، کہ ہماری اپنی زمین ہماری نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے۔"

مس ہرمزجی کی دزدیدہ سی مسکراہٹ اوٹ سے باہر آگئی۔

(یو آر گریٹ پروفیسر قادر! محبت واقعی ایک تجربہ ہے، ایک ذاتی خوشی ہے، ذاتی غم ہے۔)

"میرا ایک دوست کہا کرتا ہے مس ہرمزجی کہ عورت کو خلا سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ عورت فطرتاً ہر خلا کو بھرا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" سینتہ ہرمزجی کے ساکن، سفید چہرے میں پیدہ، شرمیلی سرخی کو محسوس کر کر کے ڈاکٹر گویا صبح کے سورج پر آنکھیں جمائے ہوئے ہو اور کرۂ ارض کے مانند اس تابناک حیات آفریں سیارے کا طواف کر کر کے وقت کی ویران بے کرانی کو زندگی کے ماہ و سال سے آباد کر رہا ہو۔

"مس ہرمزجی، تم ——— میں ———"

ڈاکٹر پانڈے کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہونے لگے۔ "افوہ، کتنی گرمی ہے!"
(سورج ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے؟)
"مس ہرمزجی، آپ پارسی لوگ سورج کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟"
"کیونکہ سورج کی حرارت لازوال ہے۔"
"تمھاری قوم بڑی ذہین ہے مس ہرمزجی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی پارسی ہو جاؤں۔"
سبیتہ ہرمزجی اپنے پروفیسر کی جانب تشکر سے دیکھنے لگی۔
"مس ہرمزجی ——"

"جی؟"
"جی، کی بڑی شیریں ملائمت محسوس کر کے ڈاکٹر پانڈے بے چین ہو گیا۔ "آج میرا ذہن 'خلا' کی بجائے محبت کے موضوع سے بھرا ہوا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے مس ہرمزجی، کہ ہم خلا کی بات کسی اور دن پر اٹھا رکھیں؟"
"پروفیسر، آپ —— آپ شاید نہیں جانتے۔ میں بیوہ ہوں۔"
"تو کیا مضائقہ ہے؟" ڈاکٹر پانڈے اپنی کرسی سے اٹھ کر بڑے گرمجوش اشتیاق سے سبیتہ ہرمزجی کے قریب آکھڑا ہوا جیسے وہ اپنے پیراسی نتھو کی طرح سوحریفوں کے روبرو اپنی محبوبہ کو اڑا لے جائے گا۔ "تم جو بھی ہو سبیتہ، میں —— تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں ——"
"آپ میری ہتک کر رہے ہیں ڈاکٹر پانڈے! ——"
زمین نے چشم زدن میں سورج کے ڈھائی کروڑ چکر کاٹ لیے اور ——!

بے آباد جزیرے

احمد شریف

کوچی پہنچ کر سب سے پہلے راماشی سے ملاقات ہوئی۔

ہمیں اس جزیرے پر اترے تیسرا روز تھا۔ بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ میں اپنی ہٹ میں پلنگ کی پٹی پہ پاؤں رکھے ٹانگیں پسارے کرسی میں نیم دراز اونگھ رہا تھا کہ راماشی اس طرح میری کرسی کے قریب آکر گری جیسے کسی نے اسے دروازے میں کھڑی کر کے دھکّا دیا ہو۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ہڈسن چوکھٹ سے کندھا ٹکرائے کھڑا تھا۔ آتشدان میں بھڑکتے شعلوں کا عکس اس کی سرخی مائل بلّوری آنکھوں میں جھلملا رہا تھا۔ وہ مجھے حیران دیکھ کر مسکرا دیا اور کہنے لگا۔

"اِٹ اِز فور یو کیپٹن۔"

پھر راماشی سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں جاپانی میں کوئی بات کہی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور جلدی جلدی میرے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔ ہڈسن اسے اشاروں پر ناچتی پا کر ہنسا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنی ہٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میرے بوٹ اتار کر وہ فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی فراک کے دامن سے صاف کرنے لگی۔

میں نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔ وہ سڈول جسم اور زردی مائل رنگت والی قبول صورت لڑکی تھی۔ صورت اجڑی اجڑی تھی۔ خدوخال کا تناسب بکھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب کھینچ لیا۔ وہ بلا حیل و حجت گردن جھکا کر کرسی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہیروشیما اور ناگاساکی جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ ان کے کھنڈروں تلے جاپان کی عظمت دفن ہو کر رہ گئی تھی اور فاتح فوجیں اس ملک پر اپنا قبضہ مکمل کرنے آئی تھیں۔

ہڈسن کی بدولت پچھلے تین روز میں کئی جاپانی لڑکیاں فوجی افسروں کے تصرّف میں لائی جا چکی تھیں۔ وہ ایسی لڑکیوں کو تلاش کرنے اور ان کے کس بل نکالنے کا ماہر تھا۔

آتشدان میں لکڑیاں چٹخیں تو لمحہ بھر کو سنّاٹا ٹوٹ گیا۔ میں نے ٹھوڑی پکڑ کر راماشی کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی پلکوں پر لرزتے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے اور وہ کرسی کے بازو پر سر رکھ کر رونے لگی۔ وہ روتی رہی اور میں اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو انگلیوں کی کنگھی بنا کر سنوارتا رہا۔

اس کے طرزِ عمل میں کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ ہڈسن کے ہتھے چڑھ کر جو بھی لڑکی آتی پہلے پہل وہ طوفان کی زد پر آئی ہوئی نازک شاخ کی طرح لرزتی۔ نو گرفتار پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتی اور پھر اس ماحول میں اس طرح رچ بس جاتی جیسے اسی ماحول کا ایک حصّہ ہو۔ نیا ماحول ان لڑکیوں کو ایسا راس آتا کہ وہ رات گئے تک وہیں اٹھلاتی پھرتیں۔ مترنم قہقہے گونجتے رہتے اور سپیدۂ سحر کے قریب وہ مچھلی، گوشت اور پھلوں کے

بند ڈبے سنبھالے چپکے سے کھسک جاتیں ——— راماشی بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر سُرخ سُرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر لا کر صاف ستھری انگریزی میں بولی۔

"آئی ایم سوری کیپٹن۔"

اور اُٹھ کر اس طرح کام میں لگ گئی جیسے اپنے ہی گھر چلی آئی ہو۔

جن حالات میں وہ یہاں لائی گئی تھی وہ بڑے افسوس ناک اور تکلیف دہ تھے۔ پھر بھی اس کا آنا غنیمت تھا۔ وطن سے دُور آکر میں تنہا اور اُداس تھا۔ ماحول پر افسردگی ٹوٹ کر چھائی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اور اُس کے درمیان اجنبیت کے فاصلے جلدی سے سمٹ جائیں۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنسے اور موتیوں کی لڑی ٹوٹ کر بکھر جائے۔ ہٹ کے نیم تاریک ماحول میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں اُبھریں اور رسیلے لبوں کا رس شہد بن کر ٹپکے ——— راماشی کے گداز اور لچکیلے جسم کا خیال آتے ہی پلنگ سرسوں کے پھولوں سے لبالب بھر گیا۔

میں رات کے حسین تصور باندھے بیٹھا تھا کہ وہ چپکے سے آئی اور کرسی سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے کولہوں کا بیضوی اُبھار کرسی کے بازو پر پھیل گیا۔ میرا جی چاہا اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گود میں بٹھالوں کہ میری نظر اس کے رُخسار وں پر پھیلی گیلی گیلی لکیروں پر پڑی تصورات کا آئینہ گر کر چور چور ہوگیا۔

وہ چلی گئی اور رات اور بھی ویران ہوگئی۔

اگلے روز وہ آئی ——— اور پھر روزانہ آتی رہی۔ میں جب بھی اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے لاتعداد بگولے اپنے دامنوں میں زرد پتوں کے ہجوم لیے ویران قبرستانوں میں چکراتے پھر رہے ہوں۔ وہ اس آسیب زدہ مکان کی طرح پُراسرار دکھائی دیتی جس کی کھڑکیاں اور دروازے مدت سے بند پڑے ہوں۔ اس کی موجودگی میں ماحول دم سادھ لیتا۔ کربناک سناٹا چھا جاتا۔ ہٹ میں اس کے قدموں کی چاپ اس طرح اُبھرتی جیسے وقت دھیرے دھیرے کراہ رہا ہو اور پھر سناٹے پر سناٹے کی ایک تہ اور چڑھ جاتی۔

اس پر موسم بڑا گندا اور واہیات تھا۔ دن بھر دُھند چھائی رہتی۔ راتوں کو سرد ہوائیں چھت کی ٹائیلوں میں مُنہ چھپا کر روتی رہتیں۔ ایسے میں راماشی کی وجہ سے اعصاب پر خواہ مخواہ عورت سوار ہو جاتی۔ سچی بات ہے میں اس سے جان چھڑانے کی تجویزیں سوچنے لگا۔

اس روز صبح سے برف گر رہی تھی۔ میں جس وقت میس (MESS) میں داخل ہوا ہڈسن بار کے کاؤنٹر پر جھکا پی رہا تھا۔ میں نے دروازے میں رُک کر کپڑوں پر سے برف جھاڑی۔ وہ میرے لمبے بوٹوں کا اُوپر سے نیچے تک جائزہ لے کر بولا۔

"گھوڑ سواری سیکھ رہے ہو؟"

"سواری کے لیے گھوڑا کہاں ہے؟"

میں نے اُلٹا اُسی سے سوال کیا اور کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنس کر بولا۔

"گھوڑی تو ہے نہ۔" پھر مُڑ کر بار مین سے کہنے لگا۔ "ایک پیگ وہسکی چھوٹا والا۔"

میں نے اس کا شانہ ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

"راماشی کو کسی اور کے ساتھ نتھی کر دو۔"

"کیوں ؟"

"کیا ضرورت ہے آخر ان لڑکیوں کی ؟"

میں نے بیزاری سے کہا۔ وہ منہ کھول کر میری صورت تکنے لگا۔ بارمین نے گلاس میری طرف سرکا دیا۔ میں گلاس ہاتھ میں لے کر اس سے کھیلنے لگا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا۔

"مائی ڈیر کیپٹن۔ ناک۔"

اس نے اپنی ناک کی پھننگ چٹکی میں لے کر مروڑی۔ اس کی سرخ ناک اور بھی سرخ ہو گئی۔ پھر وہ میری طرف جھک کر آپ ہی آپ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔

"لڑکیاں قوم کی ناک ہوتی ہیں۔ جب وہ راتیں غیر مردوں کے ساتھ بسر کریں تو ناک کٹ جاتی ہے۔"

اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے گلاس لیا اور ایک ہی گھونٹ میں وسکی کا چھوٹا پیگ حلق سے اتار لیا۔ اور پھر زور سے میرا کندھا تھپتھپا کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

میں ہٹ میں واپس آیا تو راماشی جا چکی تھی۔ میں کمبل اوڑھ کر بوٹوں سمیت پلنگ پر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں کیوں ہڈسن کی سرخ ناک میری آنکھوں میں گھسنے لگی۔ اچانک میرے سرہانے کوئی درخت کے گیلے تنے پر زور زور سے کلہاڑے چلانے لگا۔ میں کمبل پرے پھینک کر جلدی سے اٹھا۔ ہٹ سنسان پڑی تھی۔ باہر نکل کر دیکھا تو حدِ نظر تک برف کی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ ہٹس کا بے ترتیب سلسلہ سیاہ دھبوں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میرے پڑوس میں پچیس تیس گز کے فاصلے پر ہڈسن کی ہٹ تھی۔ میں اس طرف لپکا۔

ہٹ میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر ہڈسن پر پڑی۔ وہ کمان کی صورت پرلی طرف منہ کیے فرش پر پڑا تھا۔ اس کے پیروں میں راماشی کھڑی تھی۔ اس کا فراک تار تار ہو کر شانوں پر جھول رہا تھا۔ اس کی گول گول چھاتیوں پر لمبی خراشیں تھیں۔ ان خراشوں سے خون رس رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ہڈسن پر مرکوز تھیں۔

میں نے ہڈسن کا کندھا پکڑ کر اسے اپنی جانب کروٹ دی۔ اس کی آنکھوں اور منہ کے درمیان ایک بھیانک سوراخ منہ پھاڑے مجھے گھور رہا تھا۔ گولی ناک کو توڑتی ہوئی حلق میں اتر گئی تھی۔ اس نے ہچکی لی اور راماشی کے فراک کی دھجیاں اس کی مٹھیوں میں دب کر رہ گئیں۔ راماشی ابھی تک بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھینا اور رومال سے صاف کر کے ہڈسن کے پہلو میں ڈال دیا۔ اس کی مٹھیوں سے راماشی کے فراک کی دھجیاں نکلیں۔ اپنے اور راماشی کے قدموں کے نشانات مٹائے اور اسے اپنی ہٹ میں لے آیا۔

راماشی کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اور میں اس کے سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا —— ناک سسری کا کیا ہے۔ کتنے پر آئے تو پل بھر میں کٹ جائے —— میں اسے جیپ میں بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آیا۔

فاتح فوجوں کے جنگل میں آگ لگ گئی اور جب جاپانی لڑکیوں کا ریوڑ کمانڈر کے روبرو پیش کیا گیا تو خلافِ توقع راماشی کے چہرے پر گلاب سے کھلے ہوئے تھے۔ کمانڈر نے اُس سے پوچھا۔

"کیپٹن ہڈسن کو مارا؟"

راماشی نے اتنے زور سے نفی میں سر ہلایا کہ اُس کے بالوں کی جھالر پیشانی پر بکھر گئی۔ میں کمانڈر کی طرف جھکا اور نظریں نیچی کر کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کل شام یہ لڑکی میرے ساتھ تھی۔"

کمانڈر نے مسکرا کر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دُوسری لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں ہٹ کی طرف آتے ہوئے اپنے اندر والے مجنوں کی بوالعجبیوں پر دل ہی دل میں ہنسا۔ میں اس اجنبی لڑکی کو بھلا کیوں موت کے مُنہ سے بچاتا پھر رہا تھا۔ میرا اس کے ساتھ کیا رشتہ تھا! ——— میں تو اس مُلک میں جاپانی قوم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے آیا تھا۔

ہٹ میں داخل ہُوا تو راماشی میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بھاگی ہوئی آئی اور میرے گلے میں بازو حمائل کر کے جھول گئی۔ میں اسے کلاوے میں لے کر پلنگ پر چپت لیٹ گیا۔ میرے سینے پر ریت کے گُدگُدے ٹیلے ذرا دیر کو دبے اور ہوا کا دُوسرا ریلا اُنھیں پھر سنوار گیا۔ وہ ٹانگیں سکیڑ کر مجھ پر سوار ہو کر بیٹھ گئی اور اُس نے دونوں ہاتھوں کا بوجھ میرے سینے پر ڈالتے ہوئے جھک کر میری آنکھوں میں جھانک کر پُوچھا۔

"تم دیوتا ہو؟"

"نہیں۔" میں نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنے پہلو میں لٹا لیا اور اس کی جانب کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ "میں اُلّو کا پٹّھا ہوں۔"

"اوں۔" وہ نچلا ہونٹ لٹکا کر کسمائی اور پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "کل امّی آپ کو سڑک تک دیکھنے آئی تھیں۔ پر آپ ٹھہرے ہی نہیں۔"

"تم نے ٹھہرنے کے لیے تھوڑا ہی کہا تھا؟"

"مجھے خیال ہی نہ رہا۔" اُس نے بھولپن سے کہا۔ "پھر امّی نے جونہی مجھے دیکھا لپٹا کر زار و قطار رونے لگیں۔ ان کے دل میں تو اسی روز سے چور تھا جب ہڈسن مجھے چھاپہ مار کر گرفتار کر کے لایا تھا۔ امّی کا خیال تھا مجھے رات سے پہلے پہلے گولی مار دی جائے گی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"

جاپانی لڑکیوں کو رام کرنے اور ان سے بلا تامّل اپنی بات منوانے کے لیے ہڈسن اسی طرح ان لڑکیوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کر کے لایا کرتا تھا۔ میں نے شرارتاً پُوچھا۔

"گرفتاری کے بعد تمہارا کیا خیال تھا؟"

"میرا خیال ——" اس نے بات کرتے کرتے رُک کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی "میرا خیال تھا میں رات کی رات میں کہیں کی نہ رہوں گی ۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس لڑکی کو صدیوں سے جانتا ہوں —— میں نے اس کے سر کے نیچے رکھے ہوئے بازو کا حلقہ تنگ کر کے اسے سینے سے لگا لیا۔ بے ہنگم دھڑکنوں کے شور سے دل کے کواڑ بجنے لگے۔ اس نے اپنے اور میرے درمیان دونوں مٹھیوں کی دیوار حائل کر کے ایک دم سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"تم ان لوگوں کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہیں بھگا لے جانے آیا ہوں۔"

وہ تڑپ کر اُٹھی اور کہنے لگی۔

"تو پھر بھگا لے چلو۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے —— ابھی بھگا لے چلو۔"

میں اسے بھگا کر اس کے گھر لے گیا۔ اور وہیں اس کے پاپا سے عجیب سی ملاقات ہوئی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس کی کال کوٹھڑی میں جا گھسا۔

راماشی مجھے ایک کمرے میں بٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا خیال تھا اس کا گھر جاپانیوں کے روایتی گھر کی طرح ہوگا۔ مگر وہاں نہ فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں۔ نہ کمرے کے وسط میں نیچی تپائی پر بلّوری کٹوروں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ میں نے سوچا جس طرح ہماری تہذیب کا گاؤ تکیہ اور چاندنی دیوان خانے سے اُٹھ کر کوٹھڑی میں پہنچ گئے ہیں اسی طرح جاپانی تہذیب بھی بوریا بستر لپیٹ کر کسی اندھیرے کمرے میں دبکی پڑی ہوگی۔ میں متجسس سا اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔

اس کمرے سے ملا ہوا ایک اور کمرہ تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہاں گھُپ اندھیرا تھا۔ کہیں سے روشنی کا گزر نہ تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ جب آنکھیں اندھیرے سے قدرے مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا کونے میں ایک اُدھیڑ عمر آدمی سر نیہوڑائے کرسی پر بیٹھا دیوار کے ساتھ رکھا ہوا پنکھا جھلا رہا ہے۔ وہ میری آمد سے بے نیاز پنکھا جھلاتا رہا۔ اس برف خانے میں میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے یونہی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا دیا۔ روشنی کا ایک قتلہ اس طرح اندھیرے میں آن گرا جیسے پردے سے لگ کر کھڑا ٹھٹک گیا ہو۔ روشنی دیکھ کر وہ اُدھیڑ عمر آدمی کرسی پر اچھلا اور چلّانے لگا۔ راماشی نہ جانے کہاں سے میری طرف لپکی اور کہنے لگی۔

"پردہ گرا دو۔ ساشا کو لُو لگ جائے گی۔"

وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی۔ مجھے کریدنی سی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"ساشا کون ہے؟"

اس نے آنکھیں نیم وا کر کے بغور میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"میرا بیٹا۔"

ساتھ ہی نڈھال ہو کر دھپ سے صوفے پر گر گئی۔ اس کا زرد چہرہ گہرا زرد ہو گیا۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ پرائی عورت سے دل لگا بیٹھنے پر شرمسار ہو کر میں نے سر جھکا لیا۔ کمرہ کسی اندھے کنوئیں کی طرح بھائیں بھائیں کرنے لگا اور پھر اس اندھے کنوئیں سے راماشی کی آواز آئی۔

"ہماری ایک چھوٹی سی دُنیا تھی جہاں میں، ہارا کو اور ہمارا ساشا رہتے تھے۔ ہارا کو ہیروشیما کے مقامی ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ پھر ہماری بدلی یوکوہاما ہو گئی۔ یوکوہاما جانے سے پہلے میں ایک دن کے لیے امی اور پاپا سے ملنے یہاں چلی آئی۔ جس روز میں یہاں پہنچی اسی روز ہیروشیما پر بجلی گری اور میں بھسم ہو کر رہ گئی۔

"پتہ نہیں میں کب تک گرداب میں پھنسی غوطے کھاتی رہی ——— پاپا، ساشا اور ہارا کو کو ڈھونڈنے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کی آنکھوں میں سربریدہ ہیولے دست و گریباں تھے۔ وہ بے حال سے دروازے کے چوکھٹے میں جڑے کے جڑے رہ گئے۔ ان کا منحنی سا وجود اور بھی سکڑ گیا۔ میں ان کی طرف بھاگی اور ماں ہوتے ہوئے پتہ نہیں کیسے مُنہ پھاڑ کر پُوچھا۔

"پاپا، ساشا مر گیا؟"

"انھوں نے مجھے گود میں لے لیا اور سینے سے لگا کر بولے۔"

"پگلی ساشا نہیں مر سکتا۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا۔"

"پھر انھوں نے چھتی پر سے وہ پالنا اُتارا جس میں امی مجھے بچپن میں لٹا کر جھلایا کرتی تھیں۔ اور اب ——— اب پاپا اس اندھیرے کمرے میں بیٹھے اس پالنے کو جھلاتے رہتے ہیں۔"

راماشی کی آنکھیں ابھی تک ماضی کی راکھ میں دفن یادوں کے ذخیرے کو کرید رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر پکارا۔

"راماشی۔"

وہ اس بچے کی طرح چونکی جس نے ابھی ابھی ڈراونا خواب دیکھا ہو۔ میں نے اس کے شانوں کے گرد بازو ڈال کر کہا۔

"راماشی، ساشا کبھی نہیں مر سکتا۔"

اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ ہمارے درمیان اجنبیت کے فاصلے لمحہ بھر میں سمٹ گئے۔

راماشی میرے خیالوں میں بس گئی۔

ایک رات ہم بتی بجھائے، پلنگ پر خاموش لیٹے تھے۔ راماشی کھڑکی سے جھانکتے چودھویں کے چاند کو دیکھ رہی تھی اور میں وہ انفعاہ جھیلوں میں جھلملاتے چاند کو تک رہا تھا۔ سرد ہوائیں ہٹ کی چھت پر ٹائیلوں میں چھپی گنگنا رہی تھیں۔ اس نے میری طرف کروٹ لی اور پُوچھنے لگی۔

"تمھارے دیس کا چاند بھی ایسا ہی ہے؟"

میں نے کہا۔

"میرے دیس میں تو چاند کی کھیپ ہوتی ہے۔"

"کھیپ !!!"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

"اور کیا۔ میرے دیس میں جب گاؤں کی گوریاں شفاف پیشانیوں پر جھومر سجائے ترنجن میں بیٹھ کر چرخے کاتتی ہیں تو آسمان کا چاند بدلی میں چھپ جاتا ہے۔"

وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے مستفسرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تمھارے دیس کی لڑکیاں بہت خوبصورت ہیں؟"

میں اس کے ذہن میں کھد بداتے وسوسوں کو بھانپ کر دل ہی دل میں مسکرایا اور جذباتی بن کر کہا۔

"مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھانے والی لڑکیاں خوبصورت نہیں ہوں گی تو کیا بدصورت ہوں گی! —— ان کے چہروں پر تو چناروں کی آگ کا پرتو رقص کرتا ہے۔ ان کی لمبی پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں تھکے ہارے مسافر بیٹھ کر سستاتے ہیں اور جب وہ چلتی ہیں تو دھرتی ان کے قدموں میں بچھ جاتی ہے۔"

وہ مرجھا گئی اور کہنے لگی۔

"میرے چہرے پر تو سرسوں پھولی ہوئی ہے۔ ایک بھولے بھٹکے مسافر نے میری پلکوں کے سایے میں دو گھڑی کو ڈیرا ڈالا تھا۔ بیچارہ اس سایے میں جل کر راکھ ہو گیا۔"

وہ اس وقت چاندنی کا دوپٹہ اوڑھے، پاؤں لٹکائے پٹی پر بیٹھی تھی۔ پلکوں کی جھالر پر دو موتی جھلملا رہے تھے۔ میں چپکے سے اُٹھا اُس کے پیروں میں فرش پر آلتی پالتی ماری اور دونوں ہاتھ باندھ کر کسی پجاری کی طرح سر جھکا لیا۔ میرے جی میں آئی اس سے کہوں —— تو تو ایشیا کی بیٹی ہے —— لیکن وہ جلدی سے اُٹھی اور میرے ہاتھ تھام کر میری گود میں لیٹ گئی اور کہنے لگی۔

"مجھے اپنے دیس لے چلو۔ میں وہاں ترنجن میں بیٹھ کر چرخہ کاتوں گی۔"

اس کی آواز میں پہاڑی جھرنوں کا سنگیت تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔

فتح کا سہرا در اصل ابراہم کے بیٹوں کے سر تھا۔ جب اس سہرے کی نمائش گلی گلی ہونے لگی اور ہم اتنے دنوں سے اس علاقے میں گولہ بارود کے ذخیروں کو فلیتہ دکھانے اور جاپانی فوج کے مُردے پر سو دُرّے مارنے کی جو کاغذی کارروائیاں کر رہے تھے ان کو عملی جامہ پہنانے کا کام اُنھوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو ہماری حیثیت براتیوں کی سی ہو گئی اور پھر براتیوں کی ٹولیاں ایک ایک کر کے واپس ہونے لگیں۔

ہڈسن کی لائی ہوئی جاپانی لڑکیاں پرانے ڈیرے چھوڑ کر نئے ڈھیروں کی طرف چل دیں۔ پرانے ڈیرے ویران ہو گئے۔ کوچی میں وہ میری آخری رات تھی۔ راماشی اور میں دو بے آباد جزیروں کی طرح پڑے تھے اور ہمارے درمیان ابھی سے کھاری پانیوں کی دیوار حائل ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس سے بہت سی اَن کہی باتیں کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس پنچھی کی طرح حیران تھا جس کے آشیانے

کے چار تنکے آندھی اُڑائے لیے جارہی ہو۔ جب خاموشی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو میں نے جھنجھلا کر اسے جھنجھوڑ ڈالا اور اسے سامنے بٹھا کر پوچھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی!"

وہ شرما گئی۔ اس کے رُخسار گلابی ہو گئے۔ میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں تمھاری مانگ میں سیندور دیکھ کر میرے گھر والے بنا کہے سمجھ جائیں کہ میں دُلہن لے کر آیا ہوں ——— چلو، ابھی کسی پگوڈے میں چل کر شادی رچالیں۔"

اُس نے مسکرا کر میری آنکھوں میں دیکھا اور مان گئی۔ لیکن جب چلنے کے لیے تیار ہوئے تو وہ دروازے میں رُک کر کھڑی ہو گئی اور اداس لہجے میں بولی۔

"یہاں کی شادی کا اب کیا اعتبار! ——— جہاں شام کی شادی صبح کو ٹوٹ جائے ——— تم مجھے ساتھ نے چلو۔ میں جانتی ہوں سورج نکلتے ہی تمھارا جہاز روانہ ہو گا ——— میں آپ ہی پہنچ جاؤں گی۔"

خیالات کی آندھی نہ جانے اُسے کیسی کیسی بھول بھلیوں میں اُڑائے لیے پھر رہی تھی۔ میں کہنے ہی والا تھا کہ میں تمھیں دل میں چھپا کر لے جاؤں گا کہ وہ جلدی سے مڑی اور چلی گئی۔

اس رات کے پچھلے پہر میرے ساتھیوں نے چوری چوری وہ کیبن دُلہن کی طرح سجایا جس میں راماشی سفر کرنے والی تھی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق علی الصبح آگئی۔ اس کے چہرے پر دُلہنوں کا سا نکھار تھا۔ سُرخ فراک کا عکس چہرے پر جھلک رہا تھا۔ چمکیلی آنکھوں میں بجلیاں کوندر رہی تھیں اور گلابی ہونٹوں سے رس چھلک رہا تھا۔ وہ مجھے بے محابہ اپنی طرف دیکھتے پاکر شرما گئی اور ریلنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے پاس باریک ڈوری کی ایک ریل تھی۔ وہ ڈوری کا ایک سِرا پانی میں ڈبو کر کھیلنے لگی۔

دُھندلکے میں جاپان کے جزیرے سوئے ہوئے تھے۔ مجھے یونہی خیال آیا کہ میں نے چار ماہ کا طویل عرصہ کوچی کی ایک ہٹ میں بند پڑے پڑے گُزار دیا۔ اتنا بھی نہ ہُوا کہ وہ اجڑا دیار گھوم پھر کر دیکھ لیتا۔ میں نے راماشی سے کہا۔

"اگر ایک دن کے لیے روانگی ملتوی ہو جائے تو ہم ہیروشیما ہو آئیں۔"

اس کی آنکھوں میں دھوئیں کا ایک بادل سا اُٹھا اور دیکھتے دیکھتے پھیل گیا۔ اس سے پہلے کہ بادل برستا وہ آنکھیں جھپکا کر بولی۔

"تم نے پاپا کو تو دیکھا ہی ہے۔ انھی کو ہیروشیما سمجھ لو۔"

اور ہوا کے رُخ پر کھڑی ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کی متغیر حالت دیکھ کر مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔ اتنے میں لنگر اُٹھایا جانے لگا۔ وہ ڈیک پر گہما گہمی دیکھ کر چونکی۔ اس نے جلدی سے ڈوری کا ایک سرا مجھے پکڑایا اور گینگ وے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"میرے زخم ابھی بہت گہرے ہیں۔ ذرا مندمل ہو جائیں میں خود ہی تمھارے پاس آجاؤں گی۔"

پھر گینگ وے پر رُک کر کہنے لگی۔

"ڈوری چھوڑ نہ دینا۔ میں ساحل پر کھڑی ڈور چھوڑتی جاؤں گی۔ آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی تھوڑی دیر تعلق قائم رہے گا۔"

میں ڈوری کا سرا پکڑے رہا۔ وہ ڈوری چھوڑتی رہی۔ رفتہ رفتہ ساحل دُور ہوتا گیا۔ اور پھر ——— پھر ساحل نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ڈوری میرے ہاتھ سے چھُوٹ گئی۔

پھر زخم مہکے

شفیق حسن زیدی

کہر آلود ہوا میں سمندر کے پانیوں کی سرسراہٹ ہے۔ کلب کی بالکنی میں کافی کا پیالہ سامنے رکھے میں خاموش بیٹھا ہوں۔ نیچے ہال میں زرینہ، امتیاز کے ساتھ بیٹھی کراچی آرٹس گروپ کا کلچرل پروگرام دیکھ رہی ہے۔

ہال میں گھٹتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں اور خوشبوؤں اور سرگوشیوں سے بچ کر میں تازہ اور ٹھنڈی ہوا لینے کے لئے بالکنی میں آ گیا ہوں۔ یہاں سمندری گھاس کی مہک میں رچے بسے ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے ہیں۔ بالکنی میں کوئی روشنی نہیں اور سامنے اندھیرے میں دور تک کیماڑی کی ان گنت روشنیاں جگنوؤں کی طرح چم چم کر رہی ہیں۔ ان روشنیوں سے مجھے ایکا ایک دیوالی کا خیال آیا ہے۔ میں چونک پڑا ہوں۔ دیوالی کا خیال جیسے میرا منہ چڑا رہا ہے "تم سمجھتے ہو کہ تم ہمیں بھول گئے ہو؟ تم ہمیں کبھی نہ بھول سکو گے مجھ جیسے نہ جانے کتنے خیال تمہارے ذہن کے کونوں کھدروں میں چھپے ہیں۔ وقت آنے پر سب تمہارے سامنے آکر تمہارا منہ چڑائیں گے۔"

تاریکی میں بہت سے دریچے روشن ہو گئے ہیں۔ کیماڑی کی روشنیاں پل بھر میں مجھے کہاں لے آئیں۔

یہ میرا شہر ہے۔ رام گنگا کے کنارے چھوٹا سا خوبصورت شہر، اور مکانوں کی منڈیروں اور چھجوں اور دیواروں پر سرسوں کے تیل کے جلتے ہوئے دیئوں کی بے شمار قطاریں ہیں۔ شاہی بازار میں روشنیوں سے جگمگ کرتی برتنوں کی دکانیں اور دیوالی کا روپ دیکھنے کے لئے خلقت ڈھل آئی ہے۔ سڑک پر کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ ہجوم کے درمیان سے تانگے اور رکشائیں اور سائیکلیں گھنٹیاں بجاتی ہوئی چیونٹی کی ایسی رفتار سے گزر رہی ہیں۔ میرے شہر کے باسیوں کو سڑک پر چلنے کا قرینہ نہیں آتا۔ وہ بے فکر ہو کر بیچ سڑک میں چلتے ہیں۔ گاڑی والے خود ہی گاڑیاں بچا لیتے ہیں۔

شاہی مسجد کے دروازے میں لگی سبیل پر لوگ پانی پینے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ میرے ساتھ میرے کچھ دوست ہیں اور میں شکر کے کھلونے بیچنے والی دکان کی تلاش میں ہوں۔ رضیہ نے چلتے سمے کہا تھا کہ شکر کے کھلونے لانا نہ بھولنا۔ عجب پاگل سی لڑکی ہے۔ مٹھائی کھانے کی دھنی۔ اب یہ شکر کے کھلونے، ہاتھی، گھوڑے، بیل، اونٹ اور نہ جانے کیا کیا۔ ان سب کو کھانے سے کیا فائدہ؟ اس سے تو بہتر ہے کہ شکر پھانک لی جائے، پھر اس پگلی کو کون سمجھائے؟ ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتی ہے۔

لالہ گردھاری مل کی دکان پر لکشمی کی قدِ آدم تصویر روشنیوں میں ڈھل رہی ہے۔ ایک زبردست ہجوم اس کے چاروں طرف لگے ہوئے بجلی کے قمقموں کو جلتے بجھتے دیکھ رہا ہے۔ دکان سے ذرا پرے سڑک کے ساتھ دو بڑے بڑے تخت پڑے ہیں جن پر سفید چادریں بچھی ہیں۔ ایک تخت پر رنگوں میں لپے پُتے مٹی کے کرشن اور شِو اور گنیش اور دوسرے اَن گنت بھگوان چُنے ہوئے ہیں۔ دوسرے پر شنکر کے کھلونے سلیقے سے لگے ہیں۔

رات دبے قدموں چراغوں کی اوٹ میں گزر رہی ہے۔

بہت سے چراغ بُجھ گئے ہیں، باقی ٹمٹمانے لگے ہیں۔

میں تھک گیا ہوں۔ ابھی ابھی تھانے کے گھنٹہ نے بارہ بجے رات کا گجر بجایا ہے۔ آوازیں ڈوب گئی ہیں۔

یہ میرا محلہ ہے۔ اِملی کے بزرگ درخت کی شاخوں میں ہوا سنسنا رہی ہے۔

مجھے اپنے ہی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔ اگر بابا کو پتہ چل گیا تو ڈانٹ پڑ جائے گی "شرفا کے بچے اتنی رات گئے گھروں سے باہر نہیں رہا کرتے۔ اپنے طور طریق سنبھالو صاحبزادے۔"

گومگو کے عالم میں دستک دیتا ہوں۔ ہولے ہولے۔ خود میرے کانوں کو یہ آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اندر قدموں کی چاپ سُنائی دے رہی ہے۔ دروازے کی زنجیر کھڑکھڑانے لگی۔

"ارے رضیہ!"

"ہشت" وہ ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر کہہ رہی ہے۔" آہستہ۔ بابا کو پتہ چل گیا تو چھٹی کا کھایا یاد آ جائے گا۔ شام سے ناراض ہو رہے تھے۔ کہہ رہے تھے، منو صبح سے نظر نہیں آیا۔ جانے کہاں واہی تواہی مارا مارا پھر رہا ہے۔ بس ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔"

"تم بڑی اچھی ہو رضیہ۔"

"سچ؟ اچھا میرے کھلونے لاؤ۔"

میں شنکر کے کھلونوں کی تھیلی اس کو دیتا ہوں۔ خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا ہے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ باری باری گھوڑے اور اونٹ اور ہاتھی اور بیل کو نکال کر دیکھتی ہے۔ پھر ہاتھی کو اپنی انگلیوں میں نچاتی ہے۔

"میں اس کی سونڈ کھاؤں اور تم دھڑ اور ٹانگیں۔ ہی ہی!" وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی دوپٹے میں دباتی ہے۔

میں سو رہا ہوں۔

میں نے جو گلاب بویا تھا اس پر پھول اتر آئے ہیں۔ گلاب کی ساری شاخوں پر رضیہ کے بے شمار ہنستے ہوئے، کھلکھلاتے ہوئے چہرے لگے ہیں۔ رضیہ کی شوخ آنکھوں میں گلاب کے ڈورے ہیں۔ "تم بڑے ہو گئے ہو منو" نہ جانے کہاں سے اماں کی آواز آ رہی ہے۔ "رضیہ کے گدگدی نہ کیا کرو، بُری بات ہے بیٹے۔" "منو یہ گلاب توڑ لو۔" رضیہ چیخ رہی ہے۔ "منو ہمیں توڑ لو۔" رضیہ کے اَن گنت چہرے چلا رہے ہیں۔ "دیکھو ہمارے چاروں طرف کانٹے اُگ آئے ہیں۔" "اُف!" میرے منہ سے سسکاری اور انگلی سے لہو کی بوند نکلی۔ کانٹا میری

انگلی میں چبھ کر ٹوٹ گیا۔ کانٹا میرے گوشت میں پھانس بن کر کھٹک رہا ہے۔ خیر اسے رضیہ سوئی سے نکال دے گی۔

"اٹھو بیٹے! صبح ہوگئی۔" اماں دودھ کا پیالہ لیے سرہانے کھڑی ہیں۔ "دیکھو دھوپ دیوار پر چڑھ آئی۔"

ہائے یہ خوبصورت دیوار جو صدیوں سے موسموں کے تھپیڑے سہہ سہہ کر کالی پڑگئی ہے اس کی منڈیروں پر کائی جمی ہے پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے اور جگہ جگہ گھاس پھوٹ آئی ہے۔

"لو کلی کرکے دودھ پیو، منہ ہاتھ دھوؤ، ناشتہ کرو اور کالج جاؤ۔ رضیہ کب کی اسکول گئی۔"

"ٹھیلہ آگیا بیا۔" مجھے ہنسی آگئی۔ رضیہ کے اسکول کا ٹھیلہ، جیسے بیل گاڑی پر ٹین کی چھت والا لکڑی کا کمرہ بنا دیا جائے اور جس میں بیلوں کی بجائے دو آدمی جُتے ہوں۔ دروازے پر آکر ان میں سے ایک آواز لگاتا تھا۔

"ٹھیلہ آگیا بیا۔"

اسکول سے آکر میں رضیہ کو چھیڑتا تھا "ٹھیلہ آگیا بیا" اور وہ منہ بسور بسور کر ٹھنکتی تھی اور اماں اور خالہ بی سے شکایتیں کرتی تھی لیکن یہ تو پرانی بات ہے۔ اب تو وہ رکشے میں اسکول جاتی ہے۔ رکشے پر پردہ پڑا ہوتا ہے اور پھر رضیہ برقع اوڑھ کر بیٹھتی ہے۔

دھوپ میرے گھر کی دیوار پر چڑھ کر سارے شہر میں پھیل گئی اور پھر کمہلا کر اترنے لگی۔

شام ہو رہی ہے، جھٹپٹے کے گدلے آسمان میں پرندے اڑ رہے ہیں۔

محلے کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔

بوڑھے عبداللہ نے باہر سے آکر کہا "میاں! چاند ہوگیا" تو مانو بابا کے اندر کوئی مشین حرکت میں آگئی۔

"چھٹو — اے چھٹو! ارے بھئی کہاں ہو؟ چلو جلدی سے امام باڑے کی صفائی کرو۔ عبداللہ تم دری لے کر چلو اور وہ لوبان اور اگربتیاں کہاں ہیں۔ مجال ہے کوئی چیز وقت پر مل جائے۔ علم سجانے ہیں۔ سارا کام باقی پڑا ہے اور میر علی حیدر ٹھیک آٹھ بجے منبر پر بیٹھ جائیں گے۔"

محرّم کا چاند نظر آتے ہی محلّہ میں گہما گہمی شروع ہوجاتی ہے۔ سارے شیعہ اور سُنّی مل جُل کر بڑی شان سے حسینؓ کی تعزیہ داری کرتے ہیں۔

رضیہ سِل کے پاس بیٹھی بٹّے سے چوڑیاں شہید کر رہی ہے۔ گھر میں ساری بیبیوں نے کالی پوشاکیں پہن لی ہیں۔

"رضیہ!"

"چُپ رہیے۔ اماں بی کہہ رہی تھیں ہر وقت منّو کے کولھے سے چپکی رہتی ہے۔ منّو جب گھر میں ہوتا ہے تو پروانے کی طرح اس کے گرد چکّر کاٹتی ہے۔ آپ نے جو رومال مجھے دیے تھے وہ بھی انہوں نے دیکھ لیے۔"

"رضیہ!"

"آپ مجھے اس طرح کیوں پکارا کرتے ہیں؟ اور اگر پکارتے ہیں تو جو کہنا ہو فوراً کہہ ڈالا کیجیے۔ ہائے اللہ میرے پاس سے ہٹئے۔ اماں بی دالان سے دیکھ رہی ہیں۔"

فضا میں لوبان کی مہک گھٹی ہے ' ماں یہ کہتی ہے کہ رن میں اجل آئی ہوگی '۔ ڈپٹن دادی کے یہاں زنانی مجلس میں رضیہ اور نجمہ اور زہرا نوحہ پڑھ رہی ہیں ۔ ڈیوڑھی میں ننھی پلٹن تبرک تقسیم ہونے کے انتظار میں خاموش بیٹھی ہے ۔ میں اور عالم اور شکیل اور پھٹن دادا علم کے جلوس کے لیے اپنی ماتمی ٹولی پر تبصرہ کر رہے ہیں ۔ صابر بھائی بید ہلاتے چوک کا گشت لگا رہے ہیں ۔

فضا میں لوبان کی مہک ہے اور رضیہ نوحہ پڑھ رہی ہے '...... رن میں اجل آئی ہوگی '۔ سوگ کے سیاہ لباس میں رضیہ بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے ۔ اگر وہ میرا سوگ کرے تو میں بھی سچ مچ مرجاؤں ۔ تنہائی میں یہی بات رضیہ سے کہتا ہوں تو وہ جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیتی ہے ۔

" بری بات ۔ ایسی بات آئندہ کبھی مت کہنا "

تعزیے دفن کر کے ہم ابھی ابھی کربلا سے لوٹے ہیں ۔ ہم سب سر سے پیر تک دھول میں اٹے ہوئے ہیں ۔ ہمارے ہونٹوں پر خشکی سے پپڑیاں جمی ہیں اور باہر نکلے ' پر منہ ہاتھ دھو دھو کر ہم ببن بھائی کے یہاں فاقہ شکنی کے لیے جا رہے ہیں ۔ پھٹن دادا مٹی کے ایک بھولوے میں دہی لا رہے ہیں ۔ چوک میں شامِ غریباں کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔

عاشق علی چچا کے آتے ہی لڑکوں نے " بٹ کلیجی ، بٹ کلیجی " چیخنا شروع کر دیا ہے اور وہ ڈنڈا لیے ان کے پیچھے بھاگ رہے ہیں ۔

اور جیسے ساری کائنات ان کے ساتھ بھاگ رہی ہے ۔ وقت کا پہیہ اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہا ہے اور ہم سب اس کے ساتھ دوڑ رہے ہیں ۔ کچھ تھک کر گر پڑے ہیں اور ہر دوڑنے والے کو چلا چلا کر روک رہے ہیں ۔ کچھ دوڑ رہے ہیں اور تھکے ہوؤں کی ہمت بندھا کر بھاگنے کی تلقین کر رہے ہیں اور میں ہوں کہ کبھی تھکے ہوؤں کی دلجوئی کرتا ہوں اور کبھی دوڑنے والوں سے قدم ملاتا ہوں ۔ نہ جانے یہ پہیہ کہاں رکے گا ؟ نہ جانے زمانہ کہاں رکے گا ؟ نہ جانے میں کہاں رکوں گا ؟

میں تھک گیا ہوں ۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے ۔

مجھ سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی ہیں ۔ یوں لگتا ہے جیسے جسم سے جان نکل چکی ہو ۔ ڈاکٹر میرے سرہانے کھڑا میری گھبرائی ہوئی اماں اور بابا کو تسلی دے رہا ہے " فکر کی کوئی بات نہیں ، معمولی سا ٹائیفائڈ ہے ۔ دوا وقت پر پلایئے اور پرہیز کا خیال رکھیئے "

" رضیہ ! تم کہاں ہو ؟ " میں بڑبڑاتا ہوں ۔

" میں یہ رہی "

میرے ماتھے کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہتھیلی اور نرم نرم انگلیاں چھو رہی ہیں ۔ مجھے آرام مل رہا ہے ۔ میں آنکھیں کھول دیتا ہوں ۔ رضیہ کو میرے پاس چھوڑ کر سب ڈاکٹر کے ساتھ باہر چلے جاتے ہیں ۔ میں رضیہ کو دیکھ کر مسکراتا ہوں ۔ رضیہ بھی مسکراتی ہے لیکن اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں ۔ دفعتاً وہ میرے سینے میں منہ چھپا کر رونے لگتی ہے ۔ باہر قدموں کی آہٹ ہوتی ہے ۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دوپٹے کے

پلو سے اپنی آنکھیں خشک کرتی ہے اور میری ہتھیلیوں کو ہاتھ میں لے کر جھانوا کرنے لگتی ہے۔
رضیہ میرے سینے میں مہک رہی ہے۔

"لو بیٹے میں شوربے میں چپاتی کا چھلکا بھگو لاتی ہوں۔" امّی نے پیالہ میری طرف بڑھا دیا ہے۔ مدت کے بعد آج ڈاکٹر نے پہلی بار شوربا چپاتی کھانے کی اجازت دی ہے۔ میں مربھکّوں کی طرح پیالہ تھام لیتا ہوں۔ رضیہ ہنستی ہوئی سامنے سے گزرتی ہے۔
"کہاں جا رہی ہو رضیہ اتنی خوش خوش؟ ذرا یہاں آؤ۔"
وہ بھاگ کر میرے پاس آتی ہے اور چپکے سے کہتی ہے۔
"پہلے دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھ آؤں۔ آپ اچھے ہو گئے نا۔ میں نے منّت مانی تھی۔"

آسمانوں پر رنگوں کی دھنک کھلی ہے۔
میں نے ابھی ابھی اماں اور خالہ بی کو سرگوشی کرتے سنا ہے۔ وہ میری اور رضیہ کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔ خالو کے مرنے کے بعد خالہ بی اور رضیہ ہمارے ساتھ رہنے لگی ہیں۔ گو خالہ بی کو اپنی زمینوں سے اچھی بھلی آمدنی ہے پھر بھی ان کے بقول "گھر میں مرد کا ہونا ضروری ہے۔" اور میرے بابا تو شروع ہی سے رضیہ کو بیٹی کی طرح چاہتے ہیں۔
کالج جانے سے پہلے میں ناشتہ کے لیے باورچی خانے میں گھس آیا ہوں۔ بابا باورچی خانے میں ناشتہ کرنے پر چلاتے ہیں۔ پر میں کیا کروں؟ جاڑوں میں تو مجھے چولھے کے پاس بیٹھنے میں بڑا مزا آتا ہے۔
ماما توے پر پراٹھا ڈالتے ڈالتے کہتی ہے۔
"مبارک ہو میاں۔ چراغ لے کے ڈھونڈو گے تو رضیہ بی کی ایسی دلہن نہیں ملے گی۔"
رضیہ برآمدے میں آرام کرسی میں بیٹھی ہوئی کروشیا سے بیل بُن رہی ہے۔ گھر کے سارے لوگ کہیں مہمان گئے ہیں۔ میں ابھی ابھی کالج سے آیا ہوں اور کتابیں چپکے سے تخت پر رکھ کر دبے دبے قدموں سے جا کر رضیہ کے کان میں چیخ پڑتا ہوں۔
"اوئی ـــ" کہہ کر وہ اچھل پڑتی ہے اور پھر سینے پر ہاتھ رکھ کے مجھے غصہ کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ میں ہنستا ہوا اس کے قدموں سے لگ کر فرش پر بیٹھ جاتا ہوں۔
"ہائے اللہ! ہٹ کر بیٹھئے، کوئی دیکھ لے گا۔"
"تو ـــ؟" میں منہ بنا کر جواب دیتا ہوں۔" اپنے آپ منہ پھیر کر چلا جائے گا۔ ہم اپنی بیوی کے پاس بیٹھے ہیں۔"
"ہائے! شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے۔ صورت بھی دیکھی ہے اپنی آئینے میں؟"
"ہاں دیکھی ہے! بڑی پیاری صورت ہے۔"
"جی ہاں! بالکل بندر لگتے ہو۔" اس نے ہنس کر دوہرے ہوتے ہوئے کہا۔

"بھئی رضیہ! اب بندر بناؤ یا انسان۔ اماں اور خالہ بی کا پروگرام تو مجھے تمہارا شوہر بنانے کا ہے۔"
"جھوٹ ——" اس نے سُرخ ہو کر کہا۔
"رضیہ! میں سچ کہہ رہا ہوں۔"
میں نے اس کا کپکپاتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ حیا سے اس کی پلکیں بوجھل ہو گئی ہیں اور اس کے رخساروں پر بیر بہوٹیاں دوڑ رہی ہیں۔

رِم جھم، رِم جھم۔ مینہ کی جھڑی لگی ہے۔

برساتی اوڑھے، پانی میں شرابور میں باہر سے آتا ہوں تو ناک میں پکوان تلنے کی مہک آتی ہے۔ رضیہ دالان میں انگیٹھی پر کڑھائی چڑھائے پوریاں تل رہی ہے۔ چاروں طرف اس کی سہیلیاں ہیں۔ دالان کے در میں پڑے ہوئے جھولے پر نجمہ ہولے ہولے پینگیں لے رہی ہے۔ سب ایک ساتھ بول رہی ہیں۔ باتوں کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ مجھے دیکھتے ہی اچانک سناٹا چھا جاتا ہے۔ میں ہنس کر کہتا ہوں۔

"رضیہ! یہ تمہاری سخت باتونی سہیلیاں چُپ کیوں ہو گئیں۔ میں ملک الموت تو نہیں کہ جس محفل سے گزروں سناٹا چھا جائے اور یوں بھی جب لڑکیاں خاموش ہوتی ہیں تو اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔"

ایکا ایکی ہنگامہ سا ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف سے باتوں کی کنکریاں مجھ پر برسنے لگتی ہیں۔ لڑکوں کی ساری نسل کی مذمت شروع ہو جاتی ہے۔ میں خاموش کھڑا مسکراتا رہتا ہوں۔ یہ سب پیاری پیاری لڑکیاں جنہوں نے رضیہ کے ناطے بزرگوں کو بتائے بنا چپکے سے مجھ سے پردہ توڑ دیا ہے۔ یہ جو میرے پیچھے رضیہ کو میرا نام لے لے کر چھیڑتی ہیں اچانک مجھ سے بگڑ گئی ہیں اور غصہ میں چنگاریوں کی طرح چٹخ رہی ہیں۔ رضیہ نے میری جانب سے منہ پھیر لیا ہے۔ میں معافی مانگ کر سنجیدہ چہرہ بنائے اپنے کمرے میں آ جاتا ہوں۔

اچانک لڑکیوں پر اوس سی پڑ جاتی ہے۔ وہ سوچنے لگتی ہیں جیسے انہوں نے میرے ساتھ زیادتی کی ہو۔ رضیہ رکابی میں پوریاں رکھ کر لاتی ہے۔ میں نرمی سے کہتا ہوں "میں نہیں کھاؤں گا۔" تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور ساری لڑکیاں پرا باندھے اندر آ جاتی ہیں۔ سب کے منہ لٹکے ہوئے ہیں اور آنکھوں میں شوخی کی چمک بجھی ہوئی ہے۔ میں ان کی طرف گھور کر دیکھتا ہوں۔ سب دفعتاً رُک جاتی ہیں اور ایک دوسری کو کہنیوں کے ٹھوکوں سے کچھ کہنے کا اشارہ کرتی ہیں۔ پھر نجمہ کہتی ہے۔

"منّو بھیّا! ہمیں معاف کر دو......."

میں اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی زور کا قہقہہ لگاتا ہوں۔ پھر جیسے اچانک گھٹا چھٹ جائے لڑکیاں کھلکھلاتی ہوئی کمرہ سے بھاگ جاتی ہے۔

رِم جھم، رِم جھم۔ مینہ کی جھڑی لگی ہے۔

"رضیہ تم کیوں رو رہی ہو؟"

"نہیں تو" وہ دوپٹے کے پلّو سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگتی ہے۔

"اماں! رضیہ کیوں رو رہی ہے؟" میں جھنجھلا کر پوچھتا ہوں۔

"بیوقوف ہے۔ بہت پڑھ لیا۔ انٹرنس پاس کر لیا۔ اب آگے داخلہ لینے کے لیے ضد کر رہی ہے۔ باجی نے منع کر دیا ہمارے خاندان میں آج تک کسی لڑکی نے بھی انٹرنس تک نہیں پڑھا۔ اب کیا میم بننا ہے یا نوکری کرنا ہے؟ میں کس کس کی زبان پکڑتی پھروں گی۔"

خالہ بی منہ سُجائے تخت پر بیٹھی ہیں۔

آنگن میں رات کی رانی مہک رہی ہے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کیاریوں میں موتیے اور بیلے اور ریدھمان کے کرن پھول کھل رہے ہیں۔

"پگلی ہو رضیہ تم تو۔ دو سال کی بات اور ہے، پھر میں تمہیں ایم۔اے کرا دوں گا۔"

"نہیں۔ میں آگے نہیں پڑھوں گی۔ میں اماں بی کو ناراض نہیں کروں گی۔"

میں ایک دم اُداس ہو جاتا ہوں۔ "پُرانی قدروں پر چل کر رضیہ تم میری رفیق کیسے بنو گی؟ نئے آفتاب سے منہ موڑ کر تم کب تک ڈوبتے ہوئے ستاروں کو تلاش کرتی رہو گی؟" میں نے رضیہ سے کہنا چاہا تو لیکن خاموش رہا۔

میں بادلوں میں سے گزر رہا ہوں۔ جھاگوں کے ایسے ملائم بادل، سفید اور سیاہ اور سُرخ اور ارغوانی، رنگ برنگے بادلوں کے ٹکڑے فضا میں تیر رہے ہیں اور ان کی چھوٹ سے ساری زمین رنگوں میں نہا رہی ہے۔ اجنبی سے رنگ، اجنبی چہرے مجھے اپنی طرف بلا رہے ہیں۔

رام گنگا کے کنارے صبح ہو رہی ہے۔

مشرق میں آسمان پر گلابی دھاریاں پڑی ہیں اور ان کا عکس ندی کے کناروں نے چُرا لیا ہے۔

"بھئی متو! ہمیں تمہارا شہر بہت پسند آیا۔ بمبئی میں اتنی خوبصورت صبح نہیں ہوتی۔"

"لیکن بمبئی میں تم اتنی صبح اٹھتی ہی کب ہو گی؟ یہ تو ہم تمہیں زبردستی اٹھا لایا۔"

"تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

مندروں کی قطار سے ناقوس اور گھنٹوں کی مدُھر آوازیں آ رہی ہیں۔

گھاٹ پر اشنان کرنے والوں کے ہونٹوں سے رامائن کے اشلوک بھنبھناہٹ بن کر نکل رہے ہیں۔

میرے برابر نر رینہ کھڑی ہے۔ صبح ہو رہی ہے اور سورج کی پہلی نارنجی روشنی اس کے چہرے پر گری ہے تو جیسے اس کا چہرہ لَو دے اٹھا ہے۔

بے شمار جنگلی کبوتر جامع مسجد کے میناروں کے چکّر کاٹ رہے ہیں۔ نمازی اس کی طویل سیڑھیوں سے اُتر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیحیں ہیں اور زبانوں پر خدا کا نام۔

میں خدا کا قُرب محسوس کر رہا ہوں۔

چاروں طرف اُجالا پھیل رہا ہے۔

"ارے آپ دونوں صبح ہی صبح کہاں چلے گئے تھے؟" رضیہ کہہ رہی ہے۔" ہم نے کتنی دیر چائے پر آپ کا انتظار کیا۔"

ابھی زرینہ کو آئے چند ہی روز ہوئے ہیں لیکن مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ہم ہمیشہ سے دوست ہوں، جیسے ہم ہمیشہ سے ساتھ ہوں۔ اگرچہ ہم اب دس سال کے بعد ملے ہیں۔ اس وقت چچا جان اور زرینہ بمبئی سے کچھ روز کے لیے آئے تھے۔ تب ہم سب چھوٹے چھوٹے تھے۔

وقت اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہا ہے۔ میں اور زرینہ ساتھ ساتھ ہیں۔ ہم بیڈمنٹن کھیل رہے ہیں۔ ہم سارتر اور فلسفۂ وجودیت پر بحث کر رہے ہیں۔ ہم جوہری بم کی تباہ کاریوں پر تبصرہ کر کے اس کی مذمت کر رہے ہیں۔ ہم چاندنی رات میں بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ ہم تاش کھیل رہے ہیں، پکنک پر جا رہے ہیں، تصویروں میں رنگ بھر رہے ہیں اور زندگی خوبصورت ہے اور پیار اس سے زیادہ خوبصورت، اور جیسے میں زرینہ سے نہیں خود اپنے سے مل گیا ہوں۔

وقت اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہا ہے اور رضیہ کی دلکشی میں اور اضافہ ہو گیا ہے اور وہ مجھ پر پہلے سے زیادہ مہربان ہے وہ رات گئے تک میری راہ تکتی ہے اور جاڑوں کی راتوں میں اُٹھ کر میرا ٹھنڈا کھانا گرم کرتی ہے۔ میری قمیصوں کے ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکتی ہے۔ میرے بچپن کی ساتھی ہے، میری ہمدرد ہے اور میری اُلجھن۔

میری اُلجھن بڑھتی جا رہی ہے۔ میرے سامنے دو تصویریں ہیں۔ دونوں میں کچھ اچھائیاں ہیں۔ دونوں میں کچھ خامیاں بھی ہیں اور مجھے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ میں کون سی اچھائیاں منتخب کروں یا پھر کون سی خامیاں منتخب کروں۔

گھر میں ہنگامہ بپا ہے۔ بابا اور میرے سارے خاندان کو زرینہ کی بے پردگی پسند نہیں لیکن چچا جان نے زرینہ کو برقع اُٹھانے سے انکار کر دیا۔

"بھائی جان! آپ کے احترام کے باوجود میں زرینہ کو قید کر کے نہیں رکھ سکتا۔"

"منّو!" زرینہ کہہ رہی ہے۔" مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اَن گنت کالے ناگ کنڈلی مارے میرے چاروں طرف جمع ہیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ کب موقع ملے اور کب ڈسیں۔"

بابا نے چچا جان سے سارے رشتے ناطے توڑ ڈالے۔

ہم اپنا سامان لے کر دوسرے گھر میں جا رہے ہیں۔ جس گھر میں ہم اب تک رہتے رہے یہ چچا جان کا ہے اور اب پنشن کے بعد چچا جان یہیں رہیں گے اور چچا جان نے اپنی لڑکی کو پردہ کرانے سے انکار کر دیا ہے اور بابا نے چچا جان سے قطع تعلق کر لیا ہے۔

شام ہو رہی ہے۔

"منّو! تم تو یہاں آیا کروگے نا؟" زرینہ کہہ رہی ہے۔

"ہاں!"

"اور بابا نے منع کیا تو ــــ؟"

"اوّل تو بابا مجھے منع نہیں کریں گے اور اگر منع کیا تو میں ان سے کہہ دوں گا کہ ...... کہ .... بلکہ وہ مجھے منع کیوں کریں گے۔"

شام گہری ہو گئی۔

نئے گھر کی قدیم محرابوں والے برآمدوں میں لالٹینیں روشن ہیں۔ ماما اور عبداللہ سامان کو گھسیٹ گھسیٹ کر قرینے سے لگا رہے ہیں۔ سب چُپ چُپ ہیں۔ غم کا سکوت سب کے دلوں میں ڈیرا ڈالے ہے۔ لیکن رضیہ خوش ہے۔ وہ گنگنا رہی ہے اور پھرتی سے گھر کی آرائش میں مصروف ہے۔

رات کالی ہے۔ آسمان پر تارے پلکیں جھپکا رہے ہیں۔

"آپ چُپ چُپ کیوں ہیں؟"

"نہیں رضیہ ــــ کوئی خاص بات نہیں۔"

"پھر اتنے اُداس کیوں ہیں؟"

"تو پھر کیا کروں ــــ؟"

"کچھ باتیں کیجئے۔"

"باتیں ــــ؟ کیا باتیں کروں تم سے ــــ؟ تمہیں ادب سے کچھ دلچسپی نہیں۔ تمہیں سیاست سے کوئی سروکار نہیں، تمہیں کرکٹ اور ٹینس اور بیڈمنٹن سے کوئی واسطہ نہیں۔ تم کو موسیقی اور مصوّری کا شوق نہیں۔ تم کچھ بھی تو نہیں جانتیں اور رات کی رانی اور بیلے اور موتیا کو بھی ہم اس گھر میں چھوڑ آئے۔ اب تم ہی بتاؤ میں تم سے کیا باتیں کروں؟ بولو؟؟"

لالٹین کی پیلی روشنی میں رضیہ کا چہرہ سفید پڑ گیا ہے۔

رات کالی ہے۔ آسمان پر تارے جھلملا رہے ہیں۔

میں سو رہا ہوں۔

میرے گلاب کے سارے پھولوں کی پنکھڑیاں سوکھ سوکھ کر جھڑ گئیں اور سخت اور کھردرے کانٹے اپنی زہریلی نوکیں میری طرف بڑھا رہے ہیں۔ میری انگلی میں سخت تکلیف ہو رہی ہے۔ رضیہ کانٹا نکالتے نکالتے سوئی میری انگلی میں چھوڑ گئی ہے۔ آسمان سے تارے برس رہے ہیں۔ میرے بالوں میں، میرے جسم پر، میرے چاروں طرف ٹھنڈے ٹھنڈے روشن روشن تارے بکھرے ہوئے ہیں۔ میں

کہکشاں پر چل رہا ہوں ۔ میرے قدموں تلے ستارے چُرمُر چُرمُر کر رہے ہیں ۔ زرینہ بادلوں میں اُڑتی ہوئی آئی ۔ اس نے میری انگلی سے سُوئی کھینچ کر وہاں اپنے ہونٹ رکھ دیے ہیں ۔ زرینہ کے چہرے پر صبح طلوع ہو رہی ہے ۔ وہ میرا ہاتھ تھامے ستاروں پر چل رہی ہے ۔ مجھے خدا کا قرب محسوس ہو رہا ہے ۔ کسی نے میرا دامن اچانک پکڑ لیا ہے " رضیہ مجھے چھوڑ دو ! رضیہ مجھے چھوڑ دو " رضیہ کے قدم کہکشاں پر سے پھسل گئے ہیں ۔ وہ چیختی ہوئی نیچے اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی ہے ۔ میں اور زرینہ ستاروں پر کھڑے اندھیرے میں جھانک رہے ہیں ۔ رضیہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی ۔

" اب اُٹھ بھی جائیے ۔ یا تو تڑکے ہی سے اٹھ کر سارے میں بھاگے پھریں گے یا سوئیں گے تو ایسے گھوڑے بیچ کر ——"

" ارے تم آ گئیں رضیہ —— ! "

" کیوں میں کہاں گئی تھی —— ؟ "

دوپہر —— گرمی کی جھلسی ہوئی دوپہر ۔ اِملی کی شاخوں میں فاختہ کُوک رہی ہے ۔

" زرّیں ! "

" ہوں ! "

" اماں کہہ رہی تھیں بابا میرا یہاں آنا پسند نہیں کرتے ۔ مجھے جلد ہی کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہے ۔ "

" مُنّو ! " زرینہ نے میری گردن میں باہیں ڈال کر اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا ہے ۔

پچھّم سے ایکا ایکی آندھی اٹھی ہے ۔ سُرخ خون کے رنگ کی ایسی آندھی ۔ ساری فضا اور زمین سُرخ ہے ۔ اِملی کی شاخوں میں تیز ہوا سیٹیاں بجا رہی ہے ۔ میں برآمدے کے در سے ٹکا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں ۔

" مُنّو ! "

میں تعجب سے رضیہ کی طرف دیکھتا ہوں ۔ اس نے پہلے کبھی مجھے میرا نام لیکر نہیں پکارا تھا ۔

" کیا میں بُری ہوں ؟ "

" نہیں ۔ کیوں ؟ "

" کیا مجھ میں کوئی خامی ہے ؟ "

" نہیں ۔ لیکن یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو ؟ "

" پھر تم نے مجھ سے شادی کرنے کے لئے کیوں منع کیا ؟ بولو ۔ بولو ؟ " وہ میرا بازو جھنجھوڑ کر چیخ رہی ہے ۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی ہے اور آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے ہیں ۔

" رضیہ ! پگلی ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں ۔ ابھی سے شادی کیسے کر لوں ؟ "

میں نے رضیہ سے بہانہ بنایا ہے لیکن میرا دل رو رہا ہے۔

شاید رات آدھی گزر چکی ہے۔ بلّیوں کے لڑنے سے میری آنکھ کھل گئی ہے۔ رضیہ چھت کی منڈیر پر بیٹھی ہے۔ نیچے چاندنی سے دُھلے ہوئے آسمان میں مجھے اس کا ہیولیٰ صاف نظر آرہا ہے۔ میں چپکے سے چھت پر چلا آیا ہوں۔

"رضیہ ــــ"

"جی ــــ"

"رضیہ ــــ"

"میں نے کتنی بار کہا کہ مجھے اس طرح نہ پکارا کیجئے۔ جو کہنا ہو کہہ دیا کیجئے۔"

"تم مجھ سے ناراض ہو ــــ؟"

"نہیں ــــ"

"رضیہ! دیکھو تو سارا گھر مجھ سے خفا ہے۔ بابا، اماں، خالہ بی، حد یہ ہے کہ ماما اور عبداللہ تک مجھ سے اکھڑے اکھڑے بات کرتے ہیں۔ صرف اس لیے رضیہ کہ میں نے تم سے شادی کرنے کو منع کر دیا۔ یقین کرو، میرے ذہن اور خیالات میں اتنی تبدیلی آچکی ہے کہ تم مجھ سے کبھی خوش نہیں رہ سکتیں ــــ ارے! تم تو رونے لگیں۔ لو میں چپ ہی ہو جاتا ہوں۔"

"میں آپ سے خوش نہیں رہ سکتی یا آپ مجھ سے خوش نہیں رہ سکتے؟ اپنے متعلق آپ جو چاہے سوچئے لیکن خدارا دوسروں کے لیے غلط مت سوچئے۔" اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"اچھا رضیہ! اگر تم ناراض ہو تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا اور کہیں ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں سے تمہیں تکلیف نہ پہنچا سکوں ــــ"

وہ دفعتہً اُچھل کر میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔

"نہیں منّو! تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ لو لو وعدہ کرو تم نہیں جاؤ گے۔"

میں وعدہ کر لیتا ہوں اور سوچتا ہوں، رضیہ کتنی اچھی ہے۔ رضیہ سچ مچ بڑی اچھی ہے لیکن زرینہ شاید اس سے بھی اچھی ہے۔ یا اللہ! میں کیا کروں؟

بہار کا موسم آگیا۔

محرابوں میں پھیلی ہوئی عشق پیچاں کی جھالروں میں بھونرے منڈلا رہے ہیں۔

میں زخمی کھڑا اس دیوار کو دیکھ رہا ہوں جسے چچا جان مزدوروں سے تڑوا رہے ہیں۔ یہ کائی لگی سیاہ دیوار جس کا پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑ گیا ہے اور جگہ جگہ گھاس پھوٹ آئی ہے جس نے صدیوں تک موسموں کے تھپیڑے سہے ہیں، جس کے سائے میں میرا بچپن اور میری زندگی گزری ہے، جس کے اوپر ہاتھ رکھ رکھ کر ہم آنکھ مچولی کھیلے ہیں۔ یہ دیوار جس کی نرم سیلی ہوئی کائی اور سیاہی میری پیشانی، میرے رخساروں

اور میرے ہاتھوں پر چھوٹی ہے، جس نے میری نگاہوں کو ٹھہرنا سکھایا ہے۔ یہ مضبوط دیوار جو کتنے زمانوں سے اپنی جگہ اسی آن بان سے کھڑی ہے۔ جو میری معلّم ہے۔ جس نے مجھے عظمتوں اور رفعتوں کے درس دیے ہیں۔ یہ دیوار آج چند مزدوروں کی کدالوں سے ریزہ ریزہ ہو کر گر رہی ہے اور میں سامنے کھڑا خاموشی سے اسے گرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں جو ایک مجبور انسان ہوں۔ لیکن اس کا ہر زخم میرا اپنا گھاؤ ہے۔ چچا جان بڑی شان سے کھڑے اسے گرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں لیکن وہ کیا جانیں کہ اس دیوار کو تلاش کرنے کے لیے میری نگاہیں کہاں کہاں بھٹکیں گی۔ اگر اس کی جگہ نئی خوبصورت دیوار اٹھی بھی تو وہ میری معلّم تو نہیں بن سکتی۔

"آؤ زرّین تم اس دیوار کی عظمت سے واقف تو نہیں لیکن اس کی تباہی کے ماتم میں میری شریک ہو جاؤ۔"

عشق پیچاں کی بیل میں چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔

ایک طویل رات ختم ہو کر صبح ہوئی ہے۔

کہیں سے ایک آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ "منّو! یہ خوبصورت نئی دیوار ہماری معلّم تو نہیں بن سکتی لیکن آؤ آنے والی نسلوں کیلئے ہم اس کی حفاظت کریں کہ وہ اسی کے سائے میں پروان چڑھیں گی۔"

ارے یہ تو میری ہی آواز میرے سینے میں گونج رہی ہے۔

سول لائنز میں سفیدے کے اونچے اونچے درختوں کی نوکیلی پتیاں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں سنہری ہو گئی ہیں۔ درختوں کے سائے میں زرینہ کے ساتھ چلتے چلتے میں اچانک ٹھہر جاتا ہوں۔

"زرّین ——"

"ہوں ——"

"زرّین —— مجھ سے شادی کرو گی؟"

وہ آنکھیں پھیلا کر میرے چہرے کو دیکھتی ہے۔

"منّو! تمہیں پتہ ہے کہ تم رضیہ سے منسوب ہو۔"

"وہ بات تو کب کی ختم ہو گئی زرّین —— اور جبھی سے گھر میں میری قدر بھی ختم ہو گئی۔ اب تو عجب سی زندگی گزر رہی ہے۔ عجب عجب باتیں سوچتا ہوں۔ کبھی خوش ہو جاتا ہوں کبھی اُداس۔"

"منّو! لوگ کیا کہیں گے؟"

"لوگ ——؟"

"اچھا مجھے سوچنے دو۔"

"کب تک ——؟"

"بس کل تک ـــ اور اگر کل میں تم کو نہ ملوں تو پھر تم خود ہی سمجھ لینا۔"

ناؤ کے پل پر بیٹھا میں رام گنگا کے پانی کو بہتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ یہ پانی کہاں سے آرہا ہے اور کہاں جائے گا۔ آج جو پانی یہاں سے گزر رہا ہے وہ کل کون کون سی زمینوں کو سیراب کرے گا۔ آج اور کل۔ کل اور آج اور کل۔ کل جو گزر چکا، آج جو ہے، کل جو آئیگا کل اور آج اور کل۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں جو میں خلاؤں میں پہنچ جاؤں، جہاں وقت کا کوئی پیمانہ نہیں۔ وقت جو سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہے۔ دوڑتے دوڑتے میں کیسی ان جانی سرحدوں کو پار کر آیا ہوں جن کے بیچ میں کوئی "نومینز لینڈ (NO MAN'S LAND)" نہیں۔ ایک قدم اٹھایا اور پھر سب کچھ بدل گیا۔ زندگی کی ساری قدریں بدل گئیں۔ لیکن وقت اسی طرح باقی ہے۔ کل اور آج اور کل۔

زر بینہ لان میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ مسکراتی ہے۔ بڑی پیاری، بڑی خوبصورت مسکراہٹ۔ میں اس کے قریب بیٹھ جاتا ہوں۔ ہم دونوں خاموش ہیں۔ یہ وہ لمحے ہیں جب خاموشی تکلّم سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ جب قرب اور رفاقت کا احساس شدید ہوتا ہے اور جب دو دوست سوچتے ہیں کہ 'ہم ایک ہیں'۔

"سارے مرد ہرجائی ہوتے ہیں۔"

"میری بات بھی تو سنو نجمہ ـــ!"

"نہیں۔ میں تو آپ کو یہ خوشخبری سنانے آئی تھی کہ ڈاکٹر نے رضیہ کو ٹپ دق بتائی ہے۔"

"نہیں ـــ" میں زور سے چیختا ہوں۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

لیکن نجمہ نے میرے دل کا کرب نہیں سنا ہے۔ وہ بڑی تمکنت سے آنچل کو اپنی انگلیوں پر لپیٹتی ہوئی باہر چلی گئی ہے۔

میں بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا ہوں۔ میں بے چین ہوں۔ میرے روم روم میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں۔ میں ہرجائی ہوں۔ رضیہ کو دق ہو گئی اور اس کی سہیلیاں الفاظ کا گرم گرم سیسہ میرے کانوں میں انڈیل رہی ہیں۔ یا اللہ! میں کن انگاروں پر چل رہا ہوں؟ میں کس آگ میں جل رہا ہوں؟

آسمان پر تارے پھیکے پڑ گئے۔ شاید مجھے نیند آرہی ہے۔

"منّو! آج ابّا میاں نے اشاروں کنایوں میں سمجھایا ہے کہ تم سے نہ ملا کروں۔"

"کیوں؟"

"ہمارے عزیزوں میں، سارے محلے میں، سارے شہر میں سب یہی کہہ رہے ہیں کہ میں نے تم کو رضیہ سے چھین لیا ہے۔ ابّا میاں

وسیع النظر ضرور ہیں لیکن بے حس نہیں ہیں ۔"

"پھر تم کیا کہتی ہو ۔۔۔؟"

"میں تو اب اتنی آگے نکل آئی ہوں کہ تمہارے بنا واپس بھی نہیں جا سکتی اور تمہیں بھی تو میری ضرورت ہے ۔ ہے نا ۔۔۔؟"

"ہاں زرین ! میں بھی تمہارے بنا نہیں رہ سکتا ۔ میں آج ہی اماں کے ذریعہ بابا سے کہلوائے دیتا ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے ۔ وہ زیادہ سے زیادہ مجھے بے شرم سمجھ لیں گے ۔ میں نے سب کچھ کھو کے تمہیں پایا ، اب تمہیں بھی کھو دوں تو زندہ کیونکر رہوں ؟"

برآمدے میں لالٹین کا شعلہ بھڑک رہا ہے ۔

در کی اوٹ سے میں بابا کو غصہ میں بھرا ہوا دیکھ رہا ہوں ۔

"منو سے کہہ دو کہ ہم اس کی یہ خواہش ضرور پوری کریں گے لیکن اس بدبخت سے کہنا کہ ہماری بھی ایک خواہش ہے اور وہ یہ کہ وہ ہمارے شہر سے چلا جائے اور پھر کبھی اپنی منحوس صورت ہمیں نہ دکھائے ۔"

پلنگ کی پٹی پر بیٹھی اماں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہیں ۔

"الٰہی ! یہ اچھے خاصے پُرسکون گھر پر کیسی بپتا آ پڑی ۔"

کتنے دنوں سے میں انگاروں پر چل رہا ہوں ۔ میرے پیروں میں آبلے بن بن کر پھوٹ رہے ہیں ۔ میں نے رضیہ کو دکھ دیا ہے ۔ میں نے بابا کی خواہش کا گلا گھونٹا ہے ۔ میں نے اماں اور خالہ بی کو رنج دیئے ہیں ۔

اور اب جب میرے ساتھ کوئی نہیں تو زرینہ نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے ۔ چچا جان اپنی وسیع النظری کے باوجود پرانی قدروں سے علیحدہ نہیں ہو سکے ۔ انہوں نے اور بابا نے ہم دونوں کو انگاروں پر دھکیل دیا ہے اور ہمارے پیروں میں سے جوتے نکال لیے ہیں اور ہمارے جسموں سے لباس نوچ لیا ہے ۔ معاشرے کی بے شمار کوڑھ زدہ انگلیاں ہماری طرف اٹھی ہوئی ہیں ۔

"زرین ! تم ڈریں تو نہیں ۔۔۔؟"

"نہیں ! تم جو ساتھ ہو ۔"

سورج کی کرنیں ، جاڑوں کی کہر کا دبیز غلاف اتار رہی ہیں ۔

میں آہستہ آہستہ رضیہ کے کمرے میں داخل ہوا ہوں ۔ وہ آنکھیں موندے بستر پر نڈھال پڑی ہے ۔ اس کے کالے ریشم کے ایسے خوبصورت بال تکیہ پر بکھرے ہوئے ہیں ۔ اس کا چہرہ زرد ہے ۔ بیماری نے سارا خون جسم سے نچوڑ لیا ہے ۔ میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں ۔ دھیرے سے پٹی پر سر رکھ کر میں رونے لگتا ہوں ۔ وہ ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے ۔

"کیا بات ہے منو۔۔۔؟"

"رضیہ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔" جذبات سے میری آواز بھرائی ہوئی ہے۔ "تمہارے اور بابا اور اماں اور خالہ بی کے شہر سے۔ یہ شہر جو کبھی میرا بھی تھا۔ اس کی سڑکیں سمٹ کر میرے سینے تنگ کر دی گئی ہیں۔

"رضیہ میں اب یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔ زندگی میں ہم تم شاید کبھی نہیں مل سکیں گے۔ رضیہ میں تمہیں خدا حافظ کہنے آیا ہوں اور یہ بھی کہنے، کہ میں تمہیں اب بھی پسند کرتا ہوں۔ میں تمہیں اب بھی چاہتا ہوں لیکن زرینہ میری زندگی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ میں زرینہ کا ہاتھ تھام لوں اور میں وقت کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ وقت خدا ہے۔

"رضیہ اپنی سکھیوں سے کہہ دینا کہ مجھے ہرجائی نہ کہیں۔ میں نے اپنے دل کو جلا کر روح میں اجالا کیا ہے۔ اجالا سب کو نظر آ رہا ہے۔ دل پگھلتا ہوا کوئی نہیں دیکھتا ۔۔۔ اچھا خدا حافظ۔"

"منو ۔۔۔ منو ۔۔۔"

میں رضیہ کو چیختا ہوا پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ آج وہ آخری زنجیر بھی میں نے توڑ دی جو اب تک میرے دل کے گرد لپٹی تھی۔

ریل چھک چھک کرتی، پٹریاں بدلتی ہوئی اسٹیشن سے نکل رہی ہے۔ مسافر کھڑکیوں اور دروازوں میں سے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے دوستوں اور عزیزوں کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ میں گردن کھڑکی سے باہر نکال کر دیکھتا ہوں۔ میں کس کو ہاتھ ہلاؤں، میں کس کو پکاروں۔۔؟ کوئی بھی تو مجھے چھوڑنے نہیں آیا، کوئی بھی تو شناسا چہرہ دور دور نہیں۔ کوئی آنکھ میری جلاوطنی پر نم نہیں۔ لیکن نہیں، اچانک میں زور زور سے ہاتھ ہلانے لگتا ہوں۔ میں پیچھے رہ جانے والے پلیٹ فارم کو الوداع کہہ رہا ہوں۔ میں یارڈ میں کھڑے ہوئے مال گاڑی کے ڈبوں کو الوداع کہہ رہا ہوں۔ میں سامنے بھاگتے ہوئے مکانوں کی دیواروں اور منڈیروں اور بجلی کے کھمبوں کو سلام کر رہا ہوں۔ میں پٹری کے ساتھ ساتھ سڑک پر چلنے والی بسوں، تانگوں اور ریل گاڑیوں کو رخصت کر رہا ہوں۔ میں ان چھوٹے چھوٹے نیم برہنہ معصوم بچوں اور خارش زدہ کتوں کو خدا حافظ کہہ رہا ہوں جو گاڑی دیکھنے کے لیے پٹری کے قریب اکٹھے ہو گئے ہیں۔

"خدا حافظ، میرے شہر!
خدا حافظ، میری زمینو!
خدا حافظ، میری فضاؤ!"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔

"منو ۔۔۔!"

میں مڑ کر زرینہ کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میں ہنس کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیتا ہوں۔ وہ رو پڑتی ہے۔

"منو! دیکھو تو تم رو بھی رہے ہو اور ہنس بھی رہے ہو۔"

گاڑی پٹریاں بدلتی ہوئی دوڑ رہی ہے۔ وقت کا پہیہ اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا ہے اور میں اور زرینہ اور سارا زمانہ اس کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔ وقت کا پہیہ نہ کبھی رُکا ہے اور نہ رُکے گا۔ میں اس کے ساتھ اسی طرح دوڑتا رہا ہوں اور دوڑتا رہوں گا۔ میں' جو منٹو نہیں — ہیں، جو فرد نہیں — ہیں، جو ایک نسل ہوں — ہیں، جو زندگی ہوں۔

فضا میں سمندر کے پانیوں کی سرسراہٹ ہے۔ ہوا کے رُکتے ہی کہر میری آنکھوں میں اتر آئی ہے اور دور تک پھیلی ہوئی کیاری کی روشنیاں دھندلی ہو گئی ہیں۔ میرے سامنے رکھی ہوئی کافی ٹھنڈی ہو گئی ہے اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے سینے کے زخم پھر سے مہک اٹھے ہوں۔

ایک مہمل کہانی

بلراج مین را

لوہے کا صدر دروازہ پھولوں سے لدا ہوا تھا ——— پھول، گندھے ہوئے، مرجھائے ہوئے، شبنم سے بھیگے ہوئے۔ پھولوں کی پتیاں سرخ بجری پر جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔

[جب کوئی مریض ڈسچارج ہوتا ہے (نئی زندگی پاتا ہے)، وارڈ کے باقی تمام مریض اسے پھولوں سے لاد دیتے ہیں اور اسے صدر دروازے تک چھوڑنے آتے ہیں ——— ڈسچارج ہونے والا مریض ہوسٹل سے باہر پہلا قدم رکھتا ہے، روایت کے مطابق پھول لوہے کے صدر دروازے کی بھینٹ کرتا ہے اور گھر (نئی دنیا) لوٹ جاتا ہے]

"...... تو کل پھر کسی نے نئی زندگی پائی ......!"

بجری اس کے پاؤں کے نیچے چرمرا رہی تھی۔

ایک فرلانگ پرے، مورچری کے باہر، بجری پر پھولوں کی ان گنت پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔

[جب کوئی مریض مرجاتا ہے (نجات پاتا ہے)، وارڈ کے باقی تمام مریض اسٹریچر پر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی لاش کو پھولوں کی پتیوں سے لاد دیتے ہیں اور روایت کے مطابق اسے مورچری تک چھوڑنے آتے ہیں]

"...... تو کل پھر کوئی اٹھ گیا......!"

سرخ بجری اس کے دھیمے دھیمے اٹھتے ہوئے قدموں کے نیچے چرمرا رہی تھی۔

فی میل وارڈ نمبر ایک کے لان میں لوہے کا پلنگ پڑا ہوا تھا۔

[جب کوئی مریض ڈسچارج ہوتا ہے یا مرتا ہے، اس کا پلنگ وارڈ سے باہر لان میں آجاتا ہے]

"...... کسی نے نئی زندگی پائی یا ...... یا کوئی اٹھ گیا؟" اس کے لرزتے ہوئے لبوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اشوک!" اس نے مڑ کر دیکھا۔

"اشوک! کلدیپ سے ملاقات ہوئی......!"

"نہیں...... !" اس نے دھیمے سے کہا۔

"کلدیپ مورچری میں تمہارا انتظار کر رہا ہے......!"

"ڈونٹ بی سلی!"

"کلدیپ واقعی مورچری میں ہے.....!"

[مورچری آرام گاہ ہے]

اُس نے دھیمے دھیمے انفرمری وارڈ کی جانب قدم بڑھائے۔

"اسٹاف! مورچری کی چابی دیجیے!" اُس نے نرس سے کہا۔

"مسٹر اشوک! کلدیپ آپ کا گہرا دوست تھا.....!" نرس نے چابی اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسٹاف! کلدیپ میرا دوست ہے.... تھا نہیں!"

[جسم کی دوستی بھی کوئی دوستی ہے]

اُس نے مورچری کا دروازہ کھولا ـــــ صاف شفاف، دُھلی ہوئی مورچری، ٹھنڈی مورچری۔

کلدیپ چپس کے سلیب پر چپ چاپ پڑا ہُوا تھا۔

اُس نے سفید چادر ہٹائی اور کلدیپ کا مُنہ ننگا کیا ـــــ یخ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ کلدیپ سویا رہا۔

[نیند کا موہ جان لے لیتا ہے]

اُس نے چادر سے کلدیپ کا مُنہ ڈھک دیا اور باہر آگیا۔

[کچھ لوگوں کے لیے زندگی جونک ہے اور کچھ کے لیے کمبل اور کچھ کے لیے ـــــــ ہم پی بھی گئے، چھلکا بھی گئے۔]

سُرخ بجری چُرمُرا رہی تھی۔

اُسے دُھوپ اچھی لگ رہی تھی ـــــ دسمبر کا مہینہ، دھیمے دھیمے بہتی ہوئی خنک ہوا اور تیز، اُجلی دُھوپ ـــــ موسم کا ظلم؟

[موسم نے مار ڈالا، رُت نے چھُری چلائی......]

لیبارٹری تک پہنچنے کے لیے ـــــ جلد پہنچنے کے لیے (بے کار کی عجلت پسندی) وہ میل وارڈ نمبر دو میں داخل ہوگیا۔

"اشوک صاحب! نمستے!"

"آداب عرض ہے اشوک صاحب!"

"مسٹر اشوک! گُڈ مارننگ!"

"اشوک بابو! کل مورچپے پر جا رہا ہوں.....!"

[آوازیں ـــــ آوازیں (پرچھائیاں) اور ـــــ بس آوازیں ـــــ لوہے کا صدر دروازہ اور پھول، مورچری اور پھولوں کی پتیاں!]

"اشوک صاحب! کل مورچے پر جا رہا ہوں . . . . !"

وہ مسکرایا (آپ سے آپ مسکرا دیا)۔

"گھبرا رہے ہو کیا؟"

"نہیں تو!"

"پھر!"

"کچھ نہیں!"

"گھبراؤ نہیں، آپریشن کامیاب رہے گا . . . . . تم مورچے سے صحیح سلامت لوٹو گے . . . . . !"

[مورچے سے صحیح سلامت لوٹو تو لوہے کا صدر دروازہ ہے اور پھول ——— مورچے پر دم توڑ دو تو مورچری ہے اور پھولوں کی پتیاں۔]

میل وارڈ نمبر دو میں آوازیں لٹکتی رہیں، وہ باہر آ گیا۔

سامنے لیبارٹری تھی [زندگی کے، جوانی کے آٹھ سال لیبارٹری میں، ایک جار میں، سولیوشن نمبر تین میں بحفاظت رکھے ہوئے ہیں، رکھے رہیں گے۔]

"گڈ مارننگ ایوری باڈی . . . . !"

"گڈ مار ———

گڈ ———

——— ننگ

——— مارننگ . . . . . گڈ مارننگ!" آوازیں یکدم گیند کی طرح اچھلیں۔

"اشوک . . . . ! وہ . . . . . . !"

"میں اُس سے مل چکا ہوں . . . . . . !"

"نہیں اشوک! وہ . . . . !"

"وہ مورچری میں ہے . . . . . سو رہا ہے . . . . . . میں نے اُسے جگانا مناسب نہیں سمجھا . . . . آؤ چائے پئیں!"

میڈیا سیکشن میں چائے بن رہی تھی۔

چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ایک نے کہا۔

"کل دیکھتے دیکھتے کلدیپ کا دم اُکھڑ گیا . . . . . !"

"یا ہو! جو مر گیا ہے اُس کی بات مت کرو . . . جو مر رہا ہے اُس کی بات کرو" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چائے لذیذ ہے . . . . . . !"

[جسم گرم ہے]———[جسم ٹھنڈا بھی ہوتا ہے]

"آؤ دھوپ کھائیں !"

"تم دھوپ کھاؤ ! میں وارڈ میں جارہا ہوں . . . . . . !"

اُس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے ختم کرڈالی اور پرائیویٹ کاٹیج کی طرف چل پڑا۔

پرائیویٹ کاٹیج کے لان میں لوہے کا پلنگ پڑا ہوا تھا———[کلدیپ کا پلنگ]

اُس نے لوہے کا پلنگ چھوا۔

[پلنگ دو دن خالی رہتا ہے اور پھر بھر جاتا ہے (دُنیا میں کسی کی جگہ خالی نہیں رہتی، تاریخ میں جگہیں خالی رہتی ہیں)]

"ہیلو اسٹاف !" اُس نے گوری چِٹی نرس سے کہا۔

"کیسے ہیں مسٹر اشوک آپ !" نرس کی آواز ڈھلی ہوئی تھی اور دھوپ کی طرح گرم تھی۔

(سالی ! پھنستے نہیں پھنستی !)

"ہی اِز ڈیڈ !"

"یس آئی نو !"

"آج شام میں آپ کا انتظار کروں گا !"

"پانچ بجے . . . . . !"

(ہی اِز ڈیڈ . . . . . پھنس گئی سالی !)

"ریگل . . . . . !"

"ٹھیک پانچ بجے . . . . !"

"ٹھیک پانچ بجے . . . !"

("ہی اِز ڈیڈ . . . . . سالی پھنس گئی ! چھاتیاں . . . . اُف . . . . آج کی رات . . . . آج کی رات . . . .)

وہ پھر لیبارٹری میں آگیا۔

"اشوک ! کلدیپ کے گھر والے سورچری کی طرف گئے ہیں . . . . . تم جاؤ گے نگم بودھ گھاٹ . . . . !"

"نہیں ! جو مرگیا سو مرگیا . . . . . . !"

[جب کوئی مرجاتا ہے، دوست، یار، رشتہ دار اسے نگم بودھ گھاٹ پر لے جاتے ہیں اور پھونک دیتے ہیں]

"اچھا کھنّی ! اپن چلے، کوئی ارجنٹ کام آئے تو سنبھال لینا !"

[وقت کاٹے نہیں کٹتا ———— (بات بنتے نہیں بنتی)]

[زندگی کیا ہے؟]

[موت کیا ہے؟]

لوہے کے صدر دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اُسے محسوس ہوا ———— لوہے کا صدر دروازہ زندگی ہے اور موہ چری موت ہے۔

[کلدیپ موت ہے اور اشوک زندگی]

[کل شام تک کلدیپ بھی زندگی تھا]

[کل شام تک اشوک بھی موت ہو سکتا ہے]

اکیس نمبر بس کی سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا ———— پھنس گئی سالی! گورا اچٹّا رنگ، کالے بال، اُبھری ہوئی ڈانواڈول سی چھاتیاں، اُف!

بس تیزی سے بھاگ رہی تھی ———— اور

اور ———— اور ———— اُف! چاندی کے تھال میں سونے کی کٹوری ———— کٹوری میں دُودھ ———— دُودھ میں چالیس فی صدی مقدار پانی کی ———— پانی میں ڈی بی جیٹریا ———— دُنیا کو کیا ہو گیا ہے ———— ایک سو اٹھاون آدمی مر گئے، ہوائی جہاز گر پڑا ———— شادی پور میں بھائی نے بھائی کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا ———— ماں شیر خوار بچے کو گود میں لیے کنوئیں میں کود گئی ———— فٹ بال اسٹیڈیم میں تماشائیوں نے بے ایمان ریفری کا سر پھوڑ دیا ———— ڈی ایم کے کی ایجی ٹیشن ———— رام منوہر لوہیا کو پاگل کتے نے کاٹ کھایا ———— اُف! گورا اچٹّا رنگ، کالے بال، اُبھری ہوئی ڈانواڈول سی چھاتیاں، اُف! پھنس گئی سالی! ہی از ڈیڈ، آج کی رات۔

[کتنا کمزور ہے آدمی (موت کے سامنے اکڑ فوں نہیں چلتی) کتنا کمزور ہے آدمی]

بس تیزی سے بھاگ رہی تھی ———— اور

اُس کے برابر کی سیٹ خالی ہوئی اور فوراً ہی کوئی اور بیٹھ گیا۔

وہ بھرپور جوانی تھی، کسا ہوا جسم تھا، لال لال آنکھیں تھیں، سوکھے سوکھے لب تھے۔

(پھنس گئی سالی ———— پھنس گئی)

اُس نے کندھے جھٹکے اور کہنی سے چھاتیاں ٹٹولیں۔

لڑکی نے زیرِ لب کہا ———— اُس نے سُنا۔

"ایڈیٹ ۔۔۔۔!"

(ہی از ڈیڈ) اور

اُس کی کُہنی تھی، لڑکی کی چھاتیاں تھیں، دبی دبی سی، گھٹی گھٹی سی آواز تھی ———— "ایڈیٹ" اور بس کی رفتار۔
ایک جھٹکے سے بس رُک گئی۔

"پلازہ!"

"کہاں سے؟"

"۳۲ نئے پیسے!"

زندگی بس ہیں رہ گئی، وہ اُتر پڑا (کہ اُترنا تھا)۔

کناٹ پلیس کے برآمدوں کا چکر کاٹتا ہُوا وہ ٹی ہاؤس پہنچ گیا۔

"جانے کب پانچ بجیں گے؟"

"چار کب بجے، کیسے بجے، ؟ کب اور کیسے؟"

"آج نہیں چھوڑوں گا؟ سب کچھ کر گزروں گا..... سب کچھ!"

ایوننگ نیوز خریدنے کے بعد اُس نے سرسری نظروں سے اخبار دیکھا ———— بُجھی بُجھی سی، باسی خبریں۔

"ہی اِز ڈیڈ..... اور نگم بودھ گھاٹ!"

"نہیں زندہ ہوں.... پھنس گئی سالی!"

پانچ بجے کے قریب اس نے ریگل کا رُخ کیا۔

وہ موجود تھی۔

[زندگی میں کبھی نہ کبھی لڑکی پھنس جاتی ہے (مچھلی جو ٹھہری!)]

"کہاں چلیں؟"

"ہاؤ ڈیر یو لائک!"

"تو چلو، کمرے میں چلتے ہیں!"

اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

اروِن روڈ پر اُس کا کمرہ تھا۔

اُس نے دروازہ کھولا۔

دونوں اندر داخل ہوئے۔

اُس کا دل زوروں سے دھک دھک کر رہا تھا۔

[دل زوروں سے دھک دھک کرتا ہے ———— یہ زندگی ہے]

"زندگی.....!"

"زندگی ..... بھینس گئی سالی!"

"زندگی ..... لعنت ہے!"

اُس نے اُس کے بلاؤز کے بٹن کھولے اور ——— اور ——— اور اُس کے منہ پہ بھرپور طمانچہ جڑ دیا۔

"گیٹ آؤٹ ....." ——— (زندگی ؟؟؟) (لعنت ؟؟؟)

[ہم سب پاگل ہیں]

[زندگی پاگلوں کے لیے ہے]

"ہی از ڈیڈ ......" اور

اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا تھا، آنکھیں چمک رہی تھیں اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

"ہی از ڈیڈ ......" اور

اس کا چہرہ خوفناک ہوگیا تھا ——— اور پھر ایک دلخراش چیخ سُنائی دی۔

"آئی ول ڈائی ٹُومارو ....."

کمرے میں گہرا سنّاٹا تھا اور ایک دل دھڑک رہا تھا۔

ابوالکلام آزاد کی ادبی تخلیقات

مولانا عبدالماجد دریابادی

"سب سے پہلا مسئلہ باورچی کا پیش آنا تھا، اور پیش آیا۔" یہ کب؟ اور کہاں؟ جب مولانا، شاہی قیدی کی حیثیت سے اور ایک شاہانہ آن بان کے ساتھ قلعۂ احمد نگر میں اگست سنہ ۴۲ء میں نظر بند ہوئے اور یہ فقرہ خود مولانا نے اپنے قلم سے اپنے حبیبِ صمیم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ۱۹ اگست کے مکتوب میں لکھا ہے۔ پورا بیان اب انھیں کی زبان سے سنیے:

> دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جیتا جاگتا انسان اندر لایا گیا۔ معلوم ہوا کہ طباخِ موعود یہی ہے۔ مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا، لیکن کچھ ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑا ہو، اور وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا۔"

عبارت مولانا ابوالکلام کے قلم جادو رقم کی ہے اور ان کی کتاب غبارِ خاطر کے ص ۵۵ سے نقل ہوئی۔ مولانا دہلی کے تھے لکھنؤ کے نہ تھے، بول چال، محاورہ، روزمرہ، سارا ٹھاٹھ دہلی والوں کا۔ لیکن دیکھ لیا آپ نے لکھنؤ کا رنگ بھی کس بانکپن سے اپنا لیا! اور باورچی سے کیسا بے ساختہ اس کے ہوش و حواس کا مسالہ کھڑے کھڑے کُٹوا لیا! سبحان اللہ! اور ابھی کیا ہے اس مسالے کا چٹپٹا پن آگے ملاحظہ ہو:

> "قید خانے میں جو اسے ایک دن رات قید و بند کے توے پر سینکا گیا، تو بھوننے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپیہ کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا، قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ ہی تیار ہو گیا۔"

اور میں عرض کرتا ہوں کہ اگر کہیں مولانا نے اس سے قلیہ تیار کرنے کی فرمائش کر دی ہوتی، تو عجب نہیں کہ اسی دم اس کی قلیا تمام ہو جاتی! غالب کی طرح مولانا بھی رعایتِ لفظی اور صنعت مراعاۃ النظیر کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے والے تھے۔ لیکن آخر ذوقِ زبان کے مارے ہوئے تھے اور لطفِ بیان کے گھائل، ایسے چٹخاروں سے بچ کر جا کہاں سکتے تھے۔ بہ قول شخصے کہ

> غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے!

غالب ہی کی طرح جب کبھی اس شجرِ ممنوعہ کو ہاتھ لگایا تو جسدِ بے جان میں روح پھونک دی، پتھر کو ہیرا بنا دیا، آبنوس کو کندن کی طرح چمکا دیا۔ ذرۂ بے نوا کو آفتاب کی تپش و تابش دے دی!

ادبِ عالیہ یا کلاسیکس کی اصطلاح تو اردو میں بعد کو چلی ہے، باقی یہ کلاسیکل یا عالی قدر ادب تو مولانا کا جیسے حصہ تھا۔ ان کے

قلم کا شروع سے ایک امتیازی خاصّہ تھا۔

تیور مردانہ، لہجہ شریفانہ، ترکیبوں میں جزالت، الفاظ میں جلالت، تشبیہوں میں جدّت، استعاروں میں نُدرت، خیال میں بلندی، بیان میں صفائی، مطالب فکر انگیز، اسلوب ولولہ خیز۔ نثر ہر جگہ ادیبانہ، کہیں خطیبانہ، خطابت کا مزاج شاہانہ، عبارت کی سطح کہیں حکیمانہ کہیں حاکمانہ۔ حکمت کی جگہ حکمت۔ ظرافت کے محل پر ظرافت۔ حکایت غم و حُزن ہو یا داستان سرور و نشاط، لطافت و شادابی سطر سطر سے عیاں، اور آمد اور بے ساختہ پن لفظ لفظ سے نمایاں۔ مطالعہ میں گہرائی، مشاہدہ میں گیرائی۔ بات میں بات پیدا کرنے کا وہ سلیقہ اور معمولی جزئیات سے دُور رس نتائج نکالنے کا وہ ملکہ، کہ دھوکا حضرت رومی کی مثنوی کے دفتروں کا ہونے لگے!

دین و مذہب مولانا کے قلم کا موضوع خصوصی سالہا سال تک رہا۔ الہلال، البلاغ کے سارے صحافتی، اور کتاب تذکرہ کے تصنیفی دور کا حرفِ اوّل بھی یہی ہے، اور حرفِ آخر بھی یہی۔ بائے بسم اللہ بھی یہی اور تائے تمّت بھی یہی۔ خشکی مذہبی تحریروں کا ایک لازمی جزو سمجھ لی گئی ہے۔ مولانا کا قلم اس علّت سے کوسوں کیا منزلوں دُور رہا۔ یہاں تک کہ جن فقہی عنوانات پر مولانا نے قلم اٹھایا ہے، انھیں بھی گُل و گلزار بنا کر چھوڑا ہے۔ قادر الکلام کا لفظ ہمارے ہاں شاعروں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نثر نگاروں میں کسی پر اس کا اطلاق اگر پوری طرح ہو سکتا ہے، تو وہ ابوالکلام کی ذات ہے۔ مضمون خوشی کا ہو یا غم کا، داستان رزم کی ہو، یا بزم کی، موضوع علمی ہو یا شعری۔ عنوان سیاسی ہو یا فلسفیانہ، یہ سدا بہار قلم ہر انداز بیان، ہر اسلوب نگارش، ہر پرداز فکر پر یکساں قادر۔ غبارِ خاطر کہنا چاہیے کہ ان کی سب سے آخری کتاب ہے، اُسے جو کھولا، تو اتفاق سے صفحہ ۲۶۴ و ۲۶۵ کھل آیا۔ تو لیجیے اسی کا ایک ٹکڑا ساعت میں لے آئیے:

"غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سر و سامان کار ہمیشہ باہر ہی سے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے، خود ہمارے اندر موجود ہے۔ عیش و مسرّت کی جن گُل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈتے رہتے ہیں اور نہیں پاتے، وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی، کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے، مگر خود اپنی خبر نہیں، وفی انفسکم افلا تبصرون۔ جنگل کے مور کو کسی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوتی، اس کا چمن خود اس کے بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پروں کو کھول دے گا، ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا۔ قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی و غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی، اور شام جب شفق کی نیلگوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سرائوں ہی کے دریچوں سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کی دیواروں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔"

اخذ و اقتباس کے اس ننھّے سے آئینے میں آپ نے انشائے ابوالکلام کی دلآویزیوں کی جھلک دیکھ لی۔ ان کے ہزارہا صفحات کے

دفترِ انشا میں سب اسی کی بسط و تفصیل ملے گی۔ ان کا قلم ہر رنگِ تحریر پر قادر بے شبہ رہا، لیکن ایک چیز کا استثنارہ ہی گیا۔ وہ اب سن لیجیے۔ جس میدان میں ان کا رہوارِ قلم دوڑنے کیا، چلنے سے بھی معذور رہا، اُس کا نام ہے کرختگی۔ نہیں کہ انھیں غصہ آتا نہ ہو۔ آتا، لیکن عتاب بھی لطفِ خطاب سے خالی، اور رنگِ جلال پرتوِ جمال سے عاری نہ ہوتا۔

ایک خیال یہ ہے کہ مولانا کے مرقع میں درد و الم، غم و حزن کی مصوری درجۂ کمال کی نہیں ملتی۔ لیکن یہ خیال کچھ یوں ہی سا ہے۔ اظہارِ غم کے طریقے ہم سب میں یکساں کب ہیں؟ کوئی بے اختیار ہو کر چیخنے چلانے لگ جاتا ہے، کسی کو داڑھیں مار کر رونا آتا ہے لگتا ہے۔ اور کسی کے منتہائے غم کی مقدار ہے چند سسکیاں اور پھر خاموشی۔ مولانا کے بھی دلی غم و حزن کی ترکیب میں عنصر اسی متانت و خودداری کے شامل ہیں۔ آپ رفیقۂ حیات بی بی زلیخا کو بیمار چھوڑ کر قلعہ احمد نگر میں نظر بند ہوئے۔ خبرِ انتقال پا کر اپنے ایک عزیز دوست کو لکھتے ہیں، تو دیکھیے کس خاموش پُر اسرار انداز میں:

"۳۱ اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا، تو وہ حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ اُس نے خدا حافظ کے سوا کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشکبار تھا۔ گزشتہ ۲۵ برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی بار گرفتاریاں ہوئیں، لیکن اِس درجہ افسردہ خاطر میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی، کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ وہ خود سفر کرنے والی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالآخر ۹ اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح ہماری ۳۶ برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، مگر اس دیوار کی اوٹ سے۔ یہاں ایک احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے، نہیں معلوم کس کی ہے۔ جب سے آیا ہوں، سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اُسے دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ایک نئی طرح کا اُنس اُس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہے۔ کل شام کو دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔" (ص ۲۸۲ ص ۲۸۳)

لیجیے وقت مقررہ میں سے ساڑھے نو منٹ ختم ہو گئے۔ باقی آدھے منٹ میں بس اتنا سن لیجیے، کہ خدانخواستہ اگر ادبیاتِ اُردو کا سارا ذخیرہ جل کر خاکستر ہو جائے، اور تنہا ابوالکلام کی "تخلیقات" (یہ لفظ میرا نہیں ہے) باقی رہ جائیں تو ان شاء اللہ ادبِ اُردو کی عظمت و جلالت کا اندازہ لگانے کے لیے وہ بس ہوں گی اور خدانخواستہ ابوالکلامیات کے دوسرے اجزا معدوم

ہو جائیں، تو اُن کا بھی سارا عطر کھنچا کھنچایا ایک غُبارِ خاطر کے اندر موجود ملے گا اور خود یہ غبارِ خاطر عطیہ کس کا ہے؟ جیل کا! یوسف علیہ السّلام تو پیغمبر تھے، مگر اُن کے بھی جوہر کی جِلا جا کر کہاں ہوئی؟ قید و زندان کی چار دیواری کے اندر! تو حیرت نہ کیجیے کہ اس سنّتِ یوسفی کا حق اپنی بساط بھر بی بی زلیخا کی ہم نام کے شوہر نے ادا کیا، جو اپنی نوجوانی میں خود یوسف جمال مشہور رہا!

———

"داغِ حسرت" کا تعارف

مولانا غلام رسُول مہر

(۱)

کاظمی شعر میں اپنا انداز
ہر سخنور سے جُدا ہے کہ نہیں

"داغِ حسرت" سید شفقت کاظمی کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے۔ جس کے پیش لفظ یا مقدّمے کی ترتیب کے لیے قرعۂ فال محض اتفاقات کی بنا پر مجھ ہیچ میرز کے نام نکل آیا۔ حالانکہ میری اور کوئی حیثیت لائق توجہ یا قابلِ ذکر ہو یا نہ ہو لیکن شعر و ادب میں مجھے کوئی بھی مقام حاصل نہیں کاظمی صاحب کے پہلے دو مجموعوں ــ حسرت کدہ اور نغمۂ حسرت ــ کے لیے تعارف یا پیش لفظ وہ ممتاز اہلِ قلم لکھ چکے ہیں، جو دُوسرے دائرِ علوم کے علاوہ ادب میں بھی مدارجِ عالیہ پر فائز ہیں۔ یقین رکھیے کہ مجھے اس خدمت کے قبول میں بے حد تامّل تھا۔ جب دیکھا کہ امتثالِ امر کے سوا چارہ نہیں تو اس تصوّر سے تسکینِ خاطر کا سامان بہم پہنچا لیا کہ

بہ ایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

(۲)

مجھے یہ بھی صاف صاف عرض کر دینا چاہیے، کاظمی صاحب کا کلام میں نے اتنا کم دیکھا تھا کہ نہ دیکھنے کے برابر تھا۔ رسائلِ ادب یا مجموعہ ہائے کلام پڑھنے کی فرصت ہی بہت کم ملتی ہے۔ "داغِ حسرت" کا مسودہ مجھے ملا تو اوّلاً ادائے فرض کے تقاضے سے اُسے بغور پڑھا۔ ثانیاً کلام کی لذّت و گیرائی مجموعے کو بالاستیعاب اور جستہ جستہ کئی مرتبہ پڑھنے کا موجب ہوئی۔ اس کے بعد موصوف کے سابقہ مجموعے بھی دیکھے۔ اس مطالعہ سے جو اثرات دل پر پڑے، مَیں صرف انھیں قلمبند کر دینے پر اکتفا کروں گا۔ میرا ادبی مطالعہ اتنا وسیع نہیں کہ اس دائرے سے باہر قدم رکھوں اور اہلِ علم و ادب پہلے جو کچھ فرما چکے ہیں اُسے دُہرا دینے میں کوئی لُطف نہیں۔

(۳)

کاظمی صاحب کے کلام کی پہلی ــــ اور سب سے نمایاں ــــ خوبی یہ دیکھی کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں زیادہ سے زیادہ صفائی، سادگی اور سلاست کے باوصف، حد درجہ پُر تاثیر، پُر معنی اور پُر کیف ہوتا ہے۔ "داغِ حسرت" میں ایک سو سے اُوپر غزلیں ہیں، لیکن مجھے کوئی حصہ ایسا نظر نہ آیا جو اس عام اسلوب و انداز سے ذرا بھی مختلف ہوتا۔ زیادہ تر چھوٹی چھوٹی بحریں، نہایت سہل الفاظ، بالکل سادہ اور سلیس انداز، تکلّف، تصنّع اور تزئین سے پاک، جیسے کوئی شخص یک رنگ احباب کی محفلِ خاص میں باتیں کر رہا ہو۔ اس سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کی تازگی اور معانی کی دل گدازی، گیرائی اور گہرائی ایسی خصوصیتیں ہیں، جو میرے محدود علم کے مطابق موجودہ عہد میں بالکل نایاب نہیں تو حد

درجہ کمیاب ضرور ہیں۔

(۴)

کاظمی صاحب کا کلام جتنی مرتبہ میں نے پڑھا یہی احساس رہا کہ پائے نگاہ ہموار فرشِ گل پر پڑ رہا ہے، جس میں کوئی اونچ نیچ، کوئی نشیب و فراز، کوئی پیچ و خم نہیں۔ کہیں کوئی خلش یا کھٹک محسوس نہیں ہوتی۔ ان شعروں کو نثر کا لباس پہنایا جائے تو شاید ہی کسی لفظ کو آگے پیچھے کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ پھر موصوف شاذ ہی تشبیہ، استعارے یا تلمیح کا سہارا لیتے ہیں مثلاً:

اس زباں سے ترا گلہ کیوں ہو؟ جس زباں سے تری ثنا کی ہے
درد اپنا دوا پذیر نہیں، اب ضرورت تری دعا کی ہے

یہ درد یہ رنج بے کسی کے شاید ترے پیار کے صلے ہیں

عمر کٹی پردیس میں شفقت کس منہ سے اب دیس کو جاؤں

نکلا بھی تو جوان سے کے نکلا سودا جو سما گیا تھا سر میں

بیت گئے جو آنکھ جھپکتے لوٹ کے وہ ایام نہ آئے

غیر کو غیر نہ سمجھی اب تک کتنی سادہ ہے طبیعت میری
کھو گئیں آج کہاں وہ یادیں جن سے منسوب تھی راحت میری

یوں چپ ہیں وہ میری بات سن کر جیسے نہ سنی ہو بات میری

ہم پہ گزری ہے جو وہ ہم ہی نے کب کبھی اور کو خبر کی ہے

بھولی نہیں ان دنوں کی راحت جو بیت گئے تری لگن میں

(۵)

اس سادگی کے باوصف معانی کی وسعت و گہرائی یقیناً معجز نما ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو معاملات و معمولات کے

…ئرے سے باہر ہو:

نکلے ہیں وطن سے منہ اندھیرے　　　معلوم نہیں کہاں چلے ہم

کچھ بس نہ چلا تری جفا پر　　　دیکھا کیے سوئے آسماں ہم

اک فسانہ تھا حالِ بد اپنا　　　چارہ سازوں کی مہربانی کا
یاس و اُمید ہیں جو ختم ہوئی　　　دل پہ ہے داغ اس جوانی کا

ایسی بھی کوئی نوا مُغنّی　　　گزُرے ہوئے دَور لوٹ آئیں

اکثر مرے حال کا فسانہ　　　اغیار بھی سُن کے رو دیے ہیں

ہم اُن کے سوا نہ تھے کسی کے　　　اتنا بھی نہ دوستوں نے جانا

کم نہ تھے فیض تیرہ بختی کے　　　کیوں مرے گھر میں چاندنی آئی

(۶)

کاظمی صاحب کا ہر شعر زندگی کی کسی نہ کسی حقیقت کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور ان حقائق میں تنوع بھی ہے: آفاقیت بھی۔

غمِ حیات پہ جب کوئی بس نہیں چلتا　　　بروئے کار ترا نام آہی جاتا ہے

گزرا ہیں ہزار مرحلوں سے　　　لے کر تری یاد کا سہارا
کچھ اور بھی آسرے تھے لیکن　　　جب وقت پڑا تجھے پکارا

یوں تیری نگاہ سے گرے ہیں　　　گویا تھے متاعِ رائیگاں ہم

دُنیا نے تیری یاد کی لذت بھی چھین لی　　　لے دے کے رہ گئی تھی یہی اپنی کائنات
اپنی سی ہم نے سعیٔ مدادا تو کی مگر　　　بڑھتا گیا کچھ اور بھی شفقت غمِ حیات

دلا رہے ہیں وہ اُمیدِ التفات بہت — کوئی امنگ ہوئی پھر جواں تو کیا ہوگا
گزار دیں گے شبِ غم بیادِ یار مگر — بلا نہ پھر بھی سحر کا نشاں تو کیا ہوگا

سلسلہ وقت کا جسے سمجھا — وُہ بھی تھی رَو ترے خیالوں کی

دلکشی راہِ وفا کی ہے وُہی — کارواں پر کارواں گزرا کیے

اُس نے شفقت مزاج یوں پوچھا — مجھ کو بے ساختہ ہنسی آئی

اِتنا تو اپنا قصّۂ غم بے اثر نہ تھا — یہ اور بات ہے کہ تری آنکھ تر نہ تھی
دامن کشِ نگاہ تھا گو حُسنِ کائنات — مجھ کو ترے خیال سے فرصت مگر نہ تھی

اے ساکنانِ باغ یہ کیا حادثہ ہُوا — پھولوں کا ذکر ہے نہ بہاروں کی بات ہے
یارب مرے نصیب میں شاید سحر نہیں — جس جس طرف نگاہ اُٹھاتا ہُوں رات ہے

(۷)

بعض شعر تو اتنے پاکیزہ اور "تہ دار" ہیں کہ زبان اُن کی تعریف سے قاصر ہے مثلاً:

طُوفانِ برق و باد کا شکوہ بجا سہی — لیکن تھی یوں بھی کب مری کھیتی ہری بھری

ہم اپنی روش بدل نہ پائے — ہر چند حریف تھا زمانہ

آلامِ روزگار کی حد ہو چکی مگر — دِل ہے کہ ڈھونڈتا ہے کسی کی رضا ہنوز

کیوں ذوقِ طلب دیا ہے مجھ کو — مِلتا تھا اگر محال تیرا

لگتا ہے یُوں کہ جیسے ابھی دِل کی دِل میں ہے — حالانکہ اُن سے قصّۂ غم بارہا کہا

گزری ہے قفس میں عمر لیکن   بھولے نہیں یادِ آشیاں ہم

فرق ان کے خلوص میں نہ آتا   ہم آپ اگر بدل نہ جاتے

ذوقِ منزل جو گھٹ گیا شفقتؔ   ہو گئی راہ خود بخود معدوم

ظلم ان کا بحدِ ظلم رہا   اور مجھ کو وہ شاد کیا کرتے

"بحدِ ظلم" میرے محدود علم کے مطابق نئی ترکیب ہے اور جس مطلب کی وضاحت کر رہی ہے اس کے لیے موزوں تر ترکیب کیا ہو سکتی تھی؟
میں چاہتا تھا کہ ان میں سے کم از کم چند شعروں کے متعلق اپنے تاثرات ذرا تفصیل سے بیان کروں اور ان میں سے بعض میں جو دقیق نفسیاتی کیفیتیں بیان کی گئی ہیں ان کی توضیح کروں مگر یہ سوچ کر رُکنا پڑا کہ اگر یہ رشتہ ایک مرتبہ کھل گیا تو سمیٹا نہ جا سکے گا اور میری تحریر اس مجموعے کے ساتھ توازن و تناسب کی حد سے تجاوز کر جائے گی۔

(۸)

کاظمی صاحب کے اشعار میں ایک بات عجیب دیکھی، جس پر شاید اب تک توجّہ نہیں دی گئی اور یقین ہے کہ خود انھیں بھی اس سے آگاہی نہ ہو گی۔ اُن کے بعض اشعار کے مضامین و مطالب بہ اعتبار اصل و اساس بعض مشاہیر اساتذہ کے بہترین اشعار سے ملتے جلتے ہیں اور کاظمی صاحب نے انھیں جس انداز میں باندھا ہے۔ وہ بالکل اچھوتا اور میرے تاثر کے مطابق زیادہ پُر تاثیر ہے۔ یہ ان کے فکرِ رسا کا ایک ایسا کرشمہ ہے جس کے لیے دل کے ساز سے بے اختیار ستائش کی نوا بلند ہوتی ہے۔ میں اس کی بھی چند مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مرزا غالب کا ایک شعر ہے:

نومیدیِ ما گردشِ ایّام ندارد   روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

دن صرف روشنی کی بنا پر رات سے ممیّز ہے اور دن رات تداول و گردشِ زمین کا نتیجہ ہیں، جسے گردشِ ایّام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر دن تاریک ہو جائے تو اس میں اور رات میں یا صبح اور شام میں کیا فرق باقی رہ سکتا ہے۔

اسی طرح غالب نے ایک اور مقام پر کہا:

گشتہ در تاریکیِ روزم نہاں   کو چراغے تا بجوئیم شام را

دن تاریک تھا، شام بھی اس میں گم ہو گئی، گویا ایک اندھیرا دُوسرے اندھیرے کے دامن میں جا چھپا۔ اب کونسا چراغ ہے جسے لے کر شام کی تلاش میں نکلیں اور اس کا سراغ دن کی تاریکی میں لگائیں؟

کاظمی صاحب فرماتے ہیں:

دن کی صُورت نہ دیکھ پائیں گے   رات آئے گی رات جائے گی

دیکھیے ایک چھوٹا سا سادہ لخت مصرع ہے، دو ٹکڑوں میں صرف "آئے" اور "جائے" کا فرق ہے، لیکن غور فرمائیے کتنی اہم حقیقت اور کس درجہ موثر انداز میں پیش کر گئے ہیں یعنی ان کے لیے دنیا سراسر اندھیرا ہے۔ گردش ضرور جاری ہے، مگر صرف اتنی کہ ایک رات جاتی ہے اور دوسری آجاتی ہے۔ پھر دن کی صورت کیونکر نظر آسکتی ہے؟

ایک اور جگہ کہا:

اپنی دنیا میں جب اندھیرا تھا ۔۔۔ فرقِ لیل و نہار کیا کرتے

لیکن "رات آئے گی، رات جائے گی" کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ایسے شعر ہر وقت نہیں کہے جا سکتے۔

سحرِ چشمِ بُت بکار است و دعائے برہمن ۔۔۔ گبر ہر تارے کہ بندد بر میاں زنّار نیست

(۹)

۱۔ عرفی کا ایک شعر ہے:

گلوئے تشنہ بہ دریا رسا ندنی دارد ۔۔۔ تمام عمر فریبِ سراب نتواں خورد

پیاسے کو بہرحال دریا پر پہنچنا ہی چاہیے عمر بھر سراب کا فریب نہیں کھایا جا سکتا۔ سراب کی فریب آرائی کا طلسم صرف اس وقت تک قائم رہ سکتا ہے، جب تک کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی پانی بھی میسر آجائے۔ اگر پانی یک قلم ناپید ہو جائے تو سراب میں فریب دینے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے گی۔

کاظمی صاحب نے اپنے انداز میں کہا ہے:

سادگی ہم وفا شعاروں کی ۔۔۔ اُن سے کب تک فریب کھائے گی

اس سادہ سے شعر میں وہی حقیقت بیان کی گئی ہے، جسے عُرفی نے اپنے خاص انداز میں حد درجہ پُر تاثیر بنا دیا اور اس کا اطلاق زندگی کے ہر دائرے پر ہو سکتا ہے۔

(۱۰)

۲۔ نظیری کا یہ شعر بہت مشہور ہے اور اس کے بہترین اشعار میں شمار ہوتا ہے:

تا منفعل ز رنجشِ بے جا نہ بینمش ۔۔۔ مے آرم اعترافِ گناہِ نبودہ را

یعنی عاشق سے کوئی گناہ تو سرزد نہیں ہوا تھا محبوب خواہ مخواہ بگڑ بیٹھا اور بے وجہ اظہار خفگی پر اتر آیا۔ حقیقت آشکارا ہونے پر یہ رنجشِ بے جا محبوب کے لیے شرمندگی کا باعث ہو سکتی تھی۔ عاشق کو اس صورتِ حال کا اندازہ ہوا تو اپنی بے گناہی بھول گیا اور محبوب کو شرمندگی سے محفوظ رکھنے کے لیے اقبال کر لیا کہ واقعی میں گناہ گار تھا۔

کاظمی صاحب فرماتے ہیں:

اپنے شکووں پہ خود ہوئے نادم ۔۔۔ ہم تجھے شرمسار کیا کرتے

شکوے یقیناً اس بنا پر کیے تھے کہ ان کے لیے محکم بنیادیں موجود تھیں۔ اس وقت عاشق کے سامنے معاملے کا دوسرا پہلو تھا ہی نہیں۔ جب

یہ پہلو سامنے آیا کہ اس طرح محبوب کے لیے شرمساری کے اسباب مہیا ہو گئے ہیں تو معاً شکووں پر ندامت ہوئی وہ خود دس ہزار مرتبہ ندامتوں کا پیکر بن سکتا ہے مگر یہ کیونکر منظور کر سکتا ہے کہ محبوب کی جبینِ ناز پر شرمساری کی خفیف سی کیفیت بھی نمایاں ہو۔

من و دل گر فنا شویم چہ باک　　　غرض اندر میاں سلامتِ اوست

کاظمی صاحب کے شعر کا ایک پہلو بہ طورِ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ یعنی عاشق نے شکوے اس خیال سے کیے ہی نہ تھے کہ محبوب کو شرمندگی لاحق ہو۔ ایسا امکان سامنے آیا تو اُسے ندامت ہوئی: "ہم تجھے شرمسار کیا کرتے" بڑا ہی بلیغ مصرع ہے۔

یہ شعر پڑھتے وقت شکوے کی وہ تعریف لازماً پیشِ نظر رہنی چاہیے جو مرزا غالب نے کی ہے۔ یعنی شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے مُنہ نہ موڑے لہذا دُوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔

(۱۱)

اور بھی متعدد مثالیں ہیں، لیکن مجھے اختصار ہی سے کام لینا چاہیے۔

۳۔ فارسی کا ایک شعر ہے:

آنکہ بے یادش دمے از غم نیاسایدمنم　　　وانکہ در عالم بہ یادِ اونمے آیدمنم

کاظمی صاحب فرماتے ہیں:

یاد رکھا تو اُنھیں کو رکھا　　　ہم جنھیں یاد نہ آنے پائے

۴۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب　　　خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

کاظمی صاحب:

کیا ختمِ سفر پہ یاد کرتے　　　گزریں جو مصیبتیں سفر میں

مرزا نے خدا اور ناخدا کے تقابل سے فائدہ اُٹھایا۔ کاظمی صاحب نے وُہی حقیقت حد درجہ سادہ انداز میں پیش کر دی۔

۵۔ مرزا غالبؔ:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

کاظمی صاحب:

جینے کی ہوس وہ کیا کرے گا　　　مرنے کو بھی جو ترس رہا ہے

مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ اس شعر کی ستائش سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے:

(۱۲)

ہر شاعر کے لیے یہ بڑے سے بڑا شرف ہے کہ زندگی کے وہ حقائق نہایت سہل، مؤثر اور بالکل انوکھے انداز میں پیش کرے جو مشہور اساتذہ کے لیے زیبا ہیں، لیکن یہ جزوی اشتراک وسیع تر دائرے میں اشتراک کی دستاویز نہیں بن سکتا۔ تاہم جزوی اشتراک بھی کم باعثِ فخر نہیں۔

کاظمی صاحب کے کلام میں ہر قسم کے مضامین ملتے ہیں۔ تغزل بھی ہے، وقوعہ گوئی بھی، تصوف و عرفان بھی اور ماحول سے متعلق قلبی گہرے محسوسات بھی یا کہہ لیجیے کہ ان کے کلام میں اک گونہ آفاقیت ہے، جس کی بنا پر بعض اشعار کی تاویل ایسے رنگ میں ممکن ہے، جس سے غالباً کاظمی صاحب آگاہ نہ ہوں۔

میرے اندازے کے مطابق ان کی شاعری دو وجہ سے شہرتِ عامہ کا بلند مقام اب تک حاصل نہ کر سکی، حالانکہ وہ ہر اعتبار اور ہر پہلو سے اس کی مستحق تھی۔

اوّل وہ اپنے استادِ جلیل سید الاحرار مولانا حسرت موہانی مرحوم و مغفور کی طرح "فقرِ غیور" کی متاعِ عزیز سنبھالے بیٹھے ہیں، دنیا اور اس کے ہنگاموں سے بے پروا، اپنے حال میں مست، ہر لحاظ سے قانع اور مستغنی، شہرت و گمنامی سے بے نیاز، ظہور و خفا سے بے تعلق، پھر اس پر کسرِ نفس کا اضافہ اور زمانہ ایسا آ گیا ہے کہ جب تک غلغلہ بلند کرنے والوں کا ایک طائفہ ساتھ نہ ہو کسی کا نام منظرِ عام پر آ ہی نہیں سکتا۔

دوم وہ ایسے خطے میں مقیم ہیں جسے وطنِ عزیز کا ایک بیرونی حاشیہ سمجھنا چاہیے اور حاشیہ بھی ایسا کہ مرکز میں اگر صور بھی پھونکا جائے تو حاشیے تک پہنچتے پہنچتے حدیثِ زیرِ لبی رہ جاتا ہے۔

لیکن میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں بے نیازی کی یہی ادا پسند ہے۔ میں نے کاظمی صاحب کو اب تک دیکھا نہیں صرف ان کے کلام اور بعض مکاتیب کے مطالعے کی بنا پر یہ تصور قائم کر لیا ہے۔ یقین ہے کہ نادرست نہ ہو گا۔

میری بہترین آرزوئیں اور دعائیں اُن کے ساتھ ہیں اور یہ ان کے کلام کی محبوبیت و دلآویزی کے لیے ایک نہایت حقیر خراج ہے۔

غالب کی نئی فارسی تحریریں

امتیاز علی عرشی

میرزا غالب نے فارسی کے مشہور لغت برہانِ قاطع پر جو تنقید کی تھی، وہ پہلے قاطعِ برہان کے نام سے اور پھر دُرفشِ کاویانی کے لقب سے اُن کی زندگی میں چھپ چکی ہے۔

یہ تنقیدیں اصل میں اُنھوں نے برہانِ قاطع کے اُس نسخے کے حاشیوں پر لکھی تھیں جو اُن کے مطالعے میں رہتا تھا۔ یہ کمتر اُردو میں اور زیادہ تر فارسی میں تھیں۔ جب اُنھوں نے اُن کو کتابی شکل دی تو از سرِ نو سب کو فارسی میں لکھا۔

بُرہانِ قاطع کا محولہ بالا نسخہ لوہارو میں تھا۔ وہاں سے وہ منتقل ہو کر رضا لائبریری رام پور میں آگیا ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بہت سے لفظوں پر نشان لگائے تھے، مگر سب پہ لکھ نہ سکے اور جن الفاظ پر تنقیدی نوٹ لکھے تھے، اُن میں سے بھی بہت سے ترتیبِ کتاب کے وقت چھوڑ دیے۔

چونکہ یہ عبارتیں اس لیے بہت اہم ہیں کہ بے ساختہ لکھی گئی ہیں، آج کی صحبت میں اُن میں سے ۵۲ کو غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ اُنھیں غالبیات میں معقول اضافہ شمار کیا جائے گا۔

میرے پیشِ نظر اسدی طوسی کے لغت فرس کے ساتھ بُرہانِ قاطع کا وہ نسخہ بھی رہا ہے، جو تہران سے ڈاکٹر محمد معین کے حاشیوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مناسب موقعوں پر میں ان دونوں کے حوالے دیتا گیا ہوں۔

۱۔ ب: باختر ـــ مغرب را گویند، (بمعنی مشرق ہم آمدہ است)۔

غ: باختر بمعنی مغرب مسلم۔ این بزرگوار این لفظ را از اضداد شمردہ، (بمعنی مشرق ہم آوردہ۔ خدا را ای خردمندان، این لفظ از اضداد چگونہ می تواند بود۔ فرق مغرب و مشرق نہ کم تر از تضاد نیست۔ مثلاً در کتابی دیدیم کہ فلان شہر باختر سوی فلان شہر است، حال آنکہ ما آن سرزمین و آن اقلیم را ندیدہ ایم۔ اکنون چسان دانیم کہ آن شہر بجانب مشرق است یا بجانب مغرب ۱۲۔

قاطعِ بُرہان اور دُرفشِ کاویانی میں اس کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے اور دُرفش میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ " جامع لطائف غیبی دریں بارہ سخنہای محققانہ آوردہ است۔ ہر کہ خواہد آن را بنگرد۔ اما انصاف ورزد، نہ تعصب۔"

۲ - ب : بادپران بہ تشدید رای قرشت بمعنی بادپراست - و آن شخصی باشد کہ پیوستہ از خود گوید -

غ : بادپران بہ تشدید رای قرشت مینویسید ، و معنی آن خودستای و خودنمای میداند - باید دانست کہ تشدید نہ ضروری است ، نہ ممنوع - اما معنی این لغت خوشامدگوست یعنی ستایندہ غیر ، نہ خودستای ، یعنی ستایندۂ خویش ۱۲ -

۳ - ب : بالان ——— بالانہ ——— دہلیز خانہ باشد -

غ : بالان و بالانہ در ضمیر باید داشت ۱۲ -

قاطع اور درفش میں ان دونوں لفظوں کو چھوڑ دیا ہے -

۴ - ب : بپرشید ——— یعنی پریشان کند و پراگندہ سازد -

غ : بپرشید را لغت قرار داد - داد ، داد ! پرشید مضارع مصنوعی است - بای موحدہ زاید است ، اصلی نیست ، محض بہر آن کہ بای عربی مع الیای فارسی لغتی چند یابد ، این رنگ بروی کار آوردہ است - ہمچنین بپسودن بمعنی لمس آمدہ است - این مرد کنی آن را بہ اضافۂ موحدہ نوشتہ - اکنون باید کہ رفتن را برفتن و آمدن را بیامدن نویسند ۱۲ -

اس اعتراض کو خوب بڑھا چڑھا کر لکھا ہے اور اس میں بیاگی ، بپسادیدن ، بپسودن اور بپکن ان چار لفظوں کو بھی شامل کر لیا ہے اور بپسودن کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ جنات کی بولی ہوگی ، کسی آدمزاد کی زبان پر تو یہ لفظ کبھی آیا نہیں ہے - لیکن ڈاکٹر محمد معین نے لکھا ہے کہ یہ لفظ بمعنی مصوری ——— صحیح ہے -

ڈاکٹر محمد معین نے لفظ باختر کے حاشیے میں لکھا ہے کہ باختر اوستا میں بمعنی شمال (اُتر) آیا ہے - نیز شیاطین اور دیووں کے مسکن اور دوزخ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے - پہلوی میں ان معانی پر ایک معنی یعنی سیارہ کا اضافہ ہوگیا ہے - فارسی میں آ کر بمعنی مغرب اور کبھی بالعکس بمعنی مشرق و خاور بھی بولا گیا ہے - چنانچہ عنصری بلخی کا شعر ہے :

چو خسرو آورد سوی خاور گریغ   ہم از باختر برزند باز تیغ

میں عرض کرتا ہوں کہ لغتِ فرس میں اسدی طوسی نے خاور کو بمعنی مغرب اور باختر کو بمعنی مشرق ہی لکھا ہے اور اول الذکر کی سند میں رودکی کا یہ شعر لکھا ہے :

مہر دیدم بامدادان چون بتافت   از خراسان سوی خاور می شتافت

فرہنگ جہانگیری میں ایک اور شعر بھی سند میں پیش کیا ہے اور وہ ہے :

از خراسان بر دمد طاوس وش   سوی خاور می شتابد شاد و کش

ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شعر رودکی نے کتابِ دوران آفتاب میں لکھے ہیں -

باختر بمعنی مشرق کے سلسلے میں اسدی نے عنصری کا یہ شعر درج کیا ہے :

چو روزی کے باشد بجا ور گریغ   ہم از باختر برزند باز تیغ

ان اسناد کے پیشِ نظر میرزا صاحب کا دعویٰ قابلِ پیش رفت نہیں رہتا -

۵- ب : بخس - پژمردہ الخ

غ : بخس، صیغۂ امر - بخسان الف نونِ حالیہ - بخساند صیغۂ مضارع از بحث متعدی بخسانیدن مصدر متعدی - بخسید ماضی لازمی، بخسیدن مصدر لازمی - بخسیدہ صیغہ مفعول از بحث لازمی - از یک لغت ہفت لغت بر آوردن و آن ہم بدین گونہ کوری کہ در لازمی و متعدی تفرقہ نکردن، و بخسانیدن و بخسیدن را یکی دانستن، لاحول ولا قوت الا باللہ ۱۲۔

اس لفظ پر بھی قاطع اور دُرفش میں دکنی کا خوب مذاق اُڑایا ہے، اور لکھا ہے کہ "کاش، آن حبنی کہ بوی این لعنت می آموخت، بمن آشنا شود، تا از دپرسم کہ این لغات آفریدۂ سپید دیو است یا بہم آوردۂ ارژنگ دیو۔"

۶- ب : بخش — (بمعنی برج ہم ہست، خواہ برج کبوتر و خواہ برج قلعہ و خواہ برج فلک۔

غ : بخش بمعنی بُرج ہرگز نیست - بیچارہ در کتب دیدہ است کہ آسمان را بہ دوازدہ بخش کردہ اند، گمان کردہ است کہ اسم برج است، حال آن کہ عبارت مذکور افادۂ معنی حصّہ و بہرہ می کند و بس - ۱۲۔

اس کے بعد لفظ برخ پر نقطہ بنا کر حاشیے میں لکھا ہے : "یہاں چور پکڑا گیا - وہ جو بخش کے معنی بُرج لکھ آیا ہے - اوس کا منشا یہ ہے کہ اس دل کے اندھے نے کہیں دیکھا ہے کہ بخش جو صیغۂ امر ہے بخشیدن میں سے - وہ بمعنی حصّہ و بہرہ و برخ بھی آتا ہے - اس نے برخ کو بُرج سمجھ لیا ۱۲۔

قاطع اور دُرفش میں انھیں دونوں عبارتوں کو دوبارہ لکھ دیا ہے اور اس اعتراض میں وہ حق پر ہیں۔

۷- ب : بزان بر وزن خزان۔

غ : بزان بر وزن خزان - در لغت اوّل موحدہ مفتوح - و در لغت ثانی زای نخذ مفتوح است - و این را ہموزن لو ۱۲ شنت

قاطع اور دُرفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا ہے۔

۸- ب : بزدائیدن بکسر اول بمعنی پاک کردن زنگ از روی آئینہ و تیغ و امثال آن - بزادون بر وزن بر بودن بمعنی بزدائیدن است الخ

غ : بزدائیدن و بزدودن بہ اضافۂ بای زاید مگر فارسی دکن است مصدر اصلی زدودن و مصدر مضارعی زدائیدن۔

قاطع اور دُرفش میں تقریباً انھیں الفاظ میں اپنا اعتراض درج کیا ہے اور درست حرف گیری کی ہے۔

۹- ب : بزرکار با کاف بر وزن شرمسار برزیگر از زراعت کنندہ را گویند۔

غ : بزرکار و بزرگ شش لغت نوشتہ است - الحال بہ تقدیم زای ہوز بر رای قرشت لغت ہفتمین آورد - و این غلط محض است ۱۲۔

قاطع اور دُرفش میں اس اعتراض کو خوب تفصیل سے لکھا ہے اور کہا ہے کہ دکنی نے برزہی کو بزر پڑھ لیا ہے - لیکن ڈاکٹر محمد معین نے لکھا ہے کہ از روی شرح قاموس "بزر" "عربی میں" دانہ ایست کہ انداختہ شود در زمین بجز دیدن - "اس بنا پر گفتۂ دکنی کو درست ہونا چاہیے - میں عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ لفظ بزر (عربی) اور کار (فارسی) سے مرکب ہو، تو پھر اسے بجای شرمسار کے

کردگار کے وزن پر کہنا چاہیے، کیونکہ بزر عربی بمعنی دانہ بکسر اول ہے۔ ملاحظہ ہوا قرب الوارد۔

۱۰ - ب : بزرا بروزن صفرا بلغت ژند و پاژند تخم زراعت را گویند مطلقاً۔

غ : بزرا تخم زراعت را گویند، واللہ غلط، باللہ غلط۔ اصل این است کہ تخم را در عربی بذر بہ ذال گویند، و در پارسی برز، و این اتفاقی است، ہرگز در فارسی تقدیم زای معجمہ بر رای مہملہ نایدہ است ۱۲۔

و از ینجاست کہ بعض نویسندگان مزارع را بذرگر نویسند۔ چون ترکیب لفظ عربی با فارسی در اکثر جا مستعمل است، بدینقدر مضائقہ نتوان کرد۔ لیکن برزرا بزر نتوان نوشت ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی خوب تفصیل سے لکھا ہے اور یہی فیصلہ کیا ہے کہ دکنی نے برز کو بزر پڑھ لیا، اور یہ غلط ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد معین نے لکھا ہے کہ ہزاروش زبان میں bazraq کے معنی تخم ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ چونکہ اسی زبان کو دکنی لغت ژند و پاژند کہتا ہے، اس لیے اس کا بیان درست ہے اور اعتراض غلط۔

۱۱ - ب : بوشاسپ — بوزن لہراسپ بمعنی خواب دیدن باشد۔

غ : بوشاسپ بمعنی رویا، یاد باید داشت، و در کاف فارسی مع الواو باید دید ۱۲۔

بعد ازان لفظ گوشاسپ پر لکھا ہے : گوشاسپ بمعنی رویا۔ بنبیندہ در بای موحدہ مع الواو بیند کہ بوشاسپ بمعنی رویا آوردہ۔ اکنون کدام لغت را صحیح دانیم ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس لفظ کے ساتھ " بوشپاس " کو بھی شامل کر لیا ہے اور پھر کہا ہے کہ بوشاسپ اور بوشپاس تو قلب یکدیگر ہیں۔ لیکن "گوشاسپ (گوشاسپ ہذیان) بمعنی کابوس غلط" (بمعنی احتلام وسوسہ شیطان۔")

لیکن ڈاکٹر محمد معین نے لکھا ہے کہ لغت فرس اسدی اور فرہنگ جہانگیری میں لکھا ہے کہ گوشاسب اور بوشاسب کے معنی خواب آتے ہیں۔ بوشکور بلخی کہتا ہے :

شنیدم کہ خسرو بہ گوشاسب دید   چنان کاتشی شد بدورش پدید

نیز زرتشت بہرام کہتا ہے :

نہ در بیدار گفتم نے بہ بوشاسب   نگویم جز بہ پیش تخت گشتاسب

۱۲ - پاچا بہ فتح تحتانی بلیدی (نجاست ہر او راہ را گویند کہ بول و غایط باشد۔

غ : پاچا یہ معنی مستراح است۔ چنانکہ اکنوں بہ تصحیف زبان زد خاص و عام است، یعنی پاخانہ۔ اسم بول و غایط نیست ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کا آغاز اس جملہ سے کیا ہے : "ہیچ کس نمی بیند کہ از دہان این مرد چہ فرو میرود " اور یہی بات دہرائی ہے جو اس جگہ بیان کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد معین نے بحوالہ فرہنگ ایران باستان مولفہ ابراہیم پورہ داؤد ج ۱ ص ۴۷ و فرہنگ دساتیر ص ۲۳۰ لکھا ہے کہ یہ لفظ دساتیری ہے۔

۱۳ - ب : پاد - بہندی پای را گویند۔

غ : پا و می گوید بهندی پای را گویند - پای را در ہندی پانو میگویند یا پاو، ہاں، پاو ربع را گویند ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس جگہ بھی اچھے الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔ دکنی کے بارے میں فرماتے ہیں: "یارب، این چند کدام ویرانہ وغول کدامین بیابان است۔" تاہم اعتراض درست ہے کہ پای فارسی کے لیے ہندی لفظ پانو یا پانوں ہے۔ غالب (اور خود میں بھی) پہلے املا کو پسند کرتے ہیں۔

۱۴ - ب : پپرشید، یاران اندیشد بمعنی پریشان کند الخ

غ : پپرشید، یاران ہمان مضارع جعلی را کہ با بای موحدہ آوردہ بود، این جا بہ بای فارسی نوشت، و این قدر نمی داند کہ مصدر بر مضارع مقدم است، و از ہر مضارع استخراج صیغۂ امر لاید۔ تنہا پپرشید بمعنی پریشان کند، یعنی چہ ۱۲۔

۱۵ - ب : پذرفت، پذرفتگار، پذرفتن، پذرفتہ، پذیر، پذیرا، پذیرش، پذیرفت، پذیرفتگار، پذیرفتن، پذیرفتہ، پذیرہ۔

غ : سبحان اللہ۔ زہی لغت دانی۔ از مشتقات یک مصدر دہ و دو لغت تراشیدن، و آنہم بعد قبول این مغالطہ کہ بجای ای ہوز ذال شخذ آوردن۔ غالب ۱۲۔

قاطع اور درفش میں یہ اعتراض شامل نہیں کیا ہے۔

۱۶ - ب : پری افسای افسون گر باشد، یعنی صاحب تسخیر، شخصی کہ از برای تسخیر جن افسون خواند۔

ب : پری خوان باخان نقطہ دار و واو معدولہ بروزن پریشان افسون اگر شخصی کہ تسخیر جن کردہ باشد۔

غالب نے ان دونوں لفظوں پر "قط" لکھ کر حاشیے میں تحریر کیا ہے: "پری افسای و پریخوان بمعنی واحد است، یعنی مُلّائی کہ علاج آسیب کند۔

قاطع اور درفش میں بھی یہی بات لکھی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ مولف نے پری گرفتہ اور پریدار کے معنی غلط بتائے ہیں۔

۱۷ - ب : پشبان بفتح اوّل بروزن و معنی جشبان است۔ و معنی جشبان را در یک فرہنگ لفظ گذر نوشتہ بود بہ با ذال نُقطہ دار، و در دو فرہنگ دیگر گزر با زای نُقطہ دار۔

غ : گذر با ذال نقطہ دار و گزر با زای نقطہ دار ہر دو یکی است۔ اختلاف املاست و بس۔ آری در صورتی کہ بہ زای ہوز نویسند، بہ تقدیم رای قرشت بر زای ہوز گُرز می شود۔ جامع بُرہان ازیں ہر سہ صُورت گزشتہ در "ہزار جشان" بفتح جیم می نویسد کہ جشان بمعنی گز باشد ۱۲۔

قاطع اور درفش میں یہ اعتراض چھوڑ دیا ہے۔

۱۸ - ب : پشنگ بروزن پلنگ، نام پدر افراسیاب است۔

غ : در بحث زای منقوطہ با الف زادشم نام پدر افراسیاب نوشتہ است۔ و این جا پشنگ نام پدر افراسیاب می نویسد، حقیقت این را در تحت لغت زادشم نوشتہ ایم۔ اینجا این قدر نوشتن کافی است کہ واقعی پشنگ نام پدر افراسیاب ہست بہ

بای فارسی مفتوح بر وزن درنگ ۱۲- بعدازاں حسبِ وعدہ زادشم پر یہ حاشیہ لکھا ہے : " نام پدر افراسیاب زادشم ہرگز نیست - نام جدِّ وی زادشم ابن تور است - و نام پدر افراسیاب پشنگ ۱۲-

قاطع اور درفش میں ان دونوں لفظوں سے بھی بحث نہیں کی ہے -

۱۹- ب : پندہ بکسر اول ـــ قطرہ را گویند الخ

رغ : پندہ بہ بای فارسی مکسور غلط است - بُندہ بہ بای موحدہ مضموم قطرۂ آب را گویند - و بُوند در ہندی از توافق لسانین است ۱۲-

قاطع اور درفش میں بھی یہی بات دُہرائی ہے - ڈاکٹر محمد معین نے اس لفظ کے سلسلے میں فرہنگ دساتیر ص ۲۳۹ کا حوالہ دیا ہے)

۲۰- ب : پورہ ـــ بزبان ہندی بمعنی تمام باشد -

رغ : آن بہ الف است ، نہ بہ ہای ہوّز ۱۲-

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی شامل نہیں کیا ہے -

۲۱- ب : پول بروزن نمول معروف است و بعربی فلوس گویند - (بمعنی پل رود خانہ ہم آمدہ است) الخ

رغ : پل ترجمہ جسرِ بی واو ہست - و این لغت فارسی است - و این کہ پُول بمعنی فلوس است ، لفظ ترکی است - وچون در ترکی اعراب بالحروف است ، واو می نویسند - اما نمی خوانند ، چنانکہ در تیمور بای تحتانی علامتِ کسرہ ، و واو علامت ضمہ است - در نوشتن این چنین نویسند ، لیکن تمر خوانند بہ تای مکسور و میم مضموم ۱۲-

قاطع اور برہان میں یہ اعتراف بھی شامل نہیں ہے -

۲۲- ب : پولہ ـــ بایائے مجہول ـــ خربزۂ مضمحل شدہ را گویند (ہندوانہ و میوہ ہای دیگر را نیز گفتہ اند کہ درون آنہا نرم و ضائع شدہ باشد -

رغ : در ہندی نیز ہمین معنی دارد و عجب از جامع برُہان کہ اشعار بدین نکرد ۱۲-

قاطع اور درفش میں بھی یہی بات دُہرادی ہے -

۲۳- ب : پیرا باثانی مجہول بر وزن گیرا بمعنی پیرایندہ باشد -

رغ : پیرا باثانی مجہول بر وزن گیرا ، سبحان اللہ ! در لغتِ گیرا یای مجہول کجاست - دیگر پیرا خود بہ کسرۂ یای فارسی چراست کہ یای مجہول و معروف محل داشتہ باشد - بای فارسی مفتوح است ، دیگر این سادہ مردگمان کردہ است کہ الف پیرا مانند الف گیرا الف فاعل است - و این نیز غلط است و پیرا مخفف پیرای ہست و آن صیغۂ امر است از پیراستن - چون رسمی در اوّل آن در آرند مُفید معنی فاعلیت گردد - دیگر پیرا ، پیراستن ، پیرای ، پیرایش ، پیرایندہ ، ہر لفظ را المعنی جداگانہ قرار دادہ - پیرایہ نیز اگرچہ از مشتقات این مصدر است لیکن چون خود بصورتِ اسمِ جامد معروف است ، آن را شمار نکردیم ۱۲ غالب ۱۲-

قاطع اور درفش میں یہی بات مختصر الفاظ میں ادا کی ہے۔ نیز "دیگر پیرا، پیراستن الخ کو خارج کردیا ہے۔

۲۴۔ ب: پیشی — بمعنی مقدمہ ہم ہست۔

غ: پیشی ترجمۂ مقدمہ نمی تواند شد۔ در دساتیر پیش رُو بجای مقدمہ و رہبر بجای دلیل آوردہ است ۱۲، غالب ۱۲۔

قاطع اور درفش میں یہی بات باختلاف الفاظ دُہرادی ہے۔

۲۵۔ ب: بیوگ — بمعنی عروس باشد۔

غ: بَیُو بہ بای موحدہ مفتوحہ عروس را گویند و این کمتر بای فارسی نوشتہ و کاف در آخر افزودہ، نمی توانم گفت کہ چہ خوردہ است بَیُو عروس، بَیُوگانی عروسی ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو پھیلا کر لکھا ہے، مگر زیر نظر عبارت کے الفاظ "نمی توانم گفت کہ چہ خوردہ است" کو حذف کردیا ہے۔ جہاں تک اس لفظ کے معنی اور آخری "گ" کا تعلق ہے، تو اسدی طوسی نے اپنی فرہنگ میں اُردو کی کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے۔

بس عزیزم، بس گرامی، شاد باش — اندرین خانہ بسان نو بیوگ

۲۶۔ ب: تدو، بفتح اول و ثانی بواو کشیدہ، نام مرغی است صحرائی شبیہ بخروس، و در غایت خوش روئی و خوش رفتاری۔

غ: در بحث تای قرشت با دال نُقطہ دار حرفہ تمسخر بکار بردہ است۔ تدرو را کہ با دال بے نقطہ است، در تای قرشت با دال نو نوشت۔ و یک لُغت از بہر بحث دال نقطہ دار نگہداشت۔ باز در دغگو را حافظہ نباشد، در بحث ذال نُقطہ دار می نویسد کہ تذرج معرب تذرو است۔ باز تذرو را با دال نقطہ دار نوشت۔ و ایں غلط محض و محض غلط است۔ باز تذرو لفتح اوّل و ثانی مجہول الحرکت در بحث دال آوردہ است۔ و مکرر آن را در بحث ذال گنجاندہ، و نگفتہ کہ معرب است۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گرفتیم کہ آمدن دال نقطہ دار در لُغات فارسی ادا می دارد۔ آخر در لُغت یک حرف باید، خواہی دال مہملہ، خواہی معجمہ۔ بہر دو صورت نوشتن یعنی چہ۔ اگر خود متردد بود، می نوشت کہ ہم بدال می نویسند و ہم بذال۔

از ہمہ بگزر، و تفرقۂ دال و ذال را بجیونہ تذرو با تذرو ہر چہ باشد، حرکت ثانی چرا ظاہر نکرد۔ الحال برای تحقیق بکتاب دیگر رجوع باید کرد۔ و چون چنین است، این کتاب بچہ کار آید۔

۲۷۔ ب: تذد بفتح اوّل و ثانی ——— جانوریست الخ

غ: تذد نیز اگر باشد عربی باشد، فارسی خود نیست ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کے سلسلے میں میرزا صاحب کا لہجہ بہت زیادہ درشت ہوگیا ہے۔ چنانچہ وہ تدو کی حقیقت بتانے سے پہلے فرماتے ہیں کہ "چنانکہ خدا پرستان خدا را از غلط نگاہ می دارد، این اہرمن پرست را اہرمن از گفتن کلمۂ حق صیانت می کند۔" اور اس کے بعد بتایا ہے کہ تدو اور تذد ایک کیڑا ہوتا ہے جو حمام میں پیدا ہوا کرتا ہے اور یہ دونوں لُغت عربی زبان کے ہیں۔ فارسی نہیں ہیں۔ اور تذرو اور اس کا معرب تذرو تیہو کا ہم معنی ہے۔ رہا تذرج تو وہ نہ عربی ہے اور نہ فارسی۔

میں عرض کرتا ہوں کہ قاطع میں میرزا صاحب نے صاف صاف ٹبیر لکھا ہے لیکن درفش میں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاپی کی اصلاح کے وقت اسے تبتر بنایا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ تذرو کبک کو کہتے ہیں اور وہ تبتر ہی کی قسم ہے۔

۲۸۔ ب : تر، بفتح اوّل و سکون ثانی ــــــ و کنایہ از مردم ملوث و مردار و فاسق ہم ہست۔

غ : دیگر در بحث تای قرشت بارای قرشت خود شرح لفظ تر می نگارد : بفتح اوّل و سکون ثانی خدایا! در لفظ ثنائی یعنی دو حرفی توضیح سکون ثانی چہ معنی دارد ۱۲۔

تر آمدن بمعنی شرمنده شدن است، و دیگر ہیچ، و آن مستعار از پدیدار آمدن عرق است در وقت شرم ۱۲

قاطع اور درفش میں اسے شامل نہیں کیا ہے۔

۲۹۔ ب : ترایبیدن بابای حطّی بوزن و معنی تراویدن و تراوش کردن باشد۔

غ : ترائیدن غلط است۔ ہمان تراویدن بہ واو و ترابیدن بہ بای موحدہ بس ۱۲۔

قاطع اور درفش میں یہی لکھا ہے کہ غالباً مؤلف نے لفظ ترائی سے (جو ہندی لفظ ہے) اس لفظ کو بنا لیا ہے۔

۳۰۔ ب : ترشدن کنایہ از اعراض شدن و آزردہ گردیدن باشد بسبب ظرافت کردن کسی۔

غ : ترشدن ہمان شرمگین شد لست ۱۲

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی شامل نہیں کیا ہے۔

۳۱۔ ب : ترک بکسر اوّل بروزن خرسک بمعنی قساوت باشد۔ و آن آنست کہ چون زحمتی بدیگری برسد، بر و آسان گزرد، در دل او رحمت و شفقت نباشد

غ : از کلام اساتذہ سند می خواہد ۱۲۔

یہ اعتراض بھی قاطع اور درفش میں نہیں ہے۔

۳۲۔ ب : تردوہ با واو مجہول بروزن اندوہ جفت را گویند بعربی زوج خوانند۔ و بہ وزن شگوفہ نیز بایں معنی آمده است۔

۳۳۔ ب : تردہ، بضم ثالث بروزن اندہ بمعنی تردوہ است۔

غ : ہر دو لغت بی سند مقبول و مسموع نیست ۱۲۔

اس اعتراض کو بھی واپس لے لیا ہے۔

۳۴۔ ب : ترہات بضم اوّل و فتح و تشدید ثانی بروزن امہات بمعنی بیہودہ و ہرزہ و خرافات و مہملات باشد۔ گویند عربی است۔

غ : ترہات بہ تای مضموم غلط و عربی بودن این لفظ نیز غلط۔ لغت فارسی است مرکب از ترّہ و آت۔ ترّہ بمعنی بقول، و آت افادہ معنی شبیہت کند، یعنی سخنان بی سود و بی قدر، مانند ترّہ ۱۲۔

قاطع اور درفش میں "ترّہ" کے معنی "پودینہ و گندنا و امثال اینہا" لکھے ہیں، اور اسے فارسی لفظ ہی قرار دیا ہے اقرب الموارد میں ترہات کو "ترّہتہ" کی جمع بتایا ہے اور بضم اوّل و تشدید تا ہونے کی صراحت کی ہے اور فارسی سے اسے

معرب بنایا ہے۔ معنی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اُن چھوٹے چھوٹے راستوں کو کہتے ہیں جو کسی پگڈنڈی یا راستے سے پھوٹتے ہیں۔ بعد از آں باطل چیزوں کو بھی ترہات کہنے لگے ہیں۔

۳۵۔ ب : تریوہ بفتح و رابع کہ داد باشد و کسر ثانی و سکون تحتانی مجہول راپشتہ پشتہ ناہموار پست و بلند را گویند۔

غ : آن را گر یوہ گویند، نہ تریوہ ۱۲

یہ اعتراض بھی شامل قاطع و درفش نہیں ہے، نیز لُغت فرس ص۴۸۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ " تریوہ راہی بود بر شبہ پشتہ "

۳۶۔ ب : تژدک با دال ابجد بر وزن نغزک کرم گندم ضائع کُن را گویند۔

غ : در بحث رای قرشت ہم نوشتہ است ۱۲۔

درفش اور قاطع میں اسے بھی حذف کر دیا ہے۔

۳۷۔ ب : تژم بر وزن عزم مبنج را گویند۔

غ : تژم بمعنی مبنج غلط محض است۔ نژم و نژم بنون است ۱۲

قاطع اور درفش میں لکھا ہے تژم ارنائیس دیو کی زبان ہو سکتی ہے۔

۳۸۔ ب : تسبلخ ——— سجادہ و جانماز را گویند۔

غ : فارسی نیست۔ عربی اگر باشد، گو باش ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو پیش نہیں کیا ہے۔ اسدی طوسی نے لُغت فرس (ص۷۷) میں اسے معنی سجادہ لکھا ہے لیکن علامہ قزوینی مرحوم کا ایک بیان ڈاکٹر محمد معین نے نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ جو دو شکلوں میں مروّج ہے : تسلیخ اور تشلیخ، یا تو کسی سامی زبان کا لفظ ہے اور یا تسبیح کا بگاڑ ہے۔ فارسی بہر حال نہیں ہے۔

۳۹۔ ب : تکاب ـــ تکاپوی ـــ تکاو ـــ تکاور۔

میرزا صاحب نے متن میں ان چاروں لفظوں کے مقابل آتا ہے کا ہندسہ لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے : " این ہر چہار لُغت بکاف فارسی است، نہ بکاف عربی ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اسی بات کو دُہرایا ہے۔

۴۰۔ ب : تلک بفتح اوّل و ثانی و سکون کاف الخ

غ : ہر گاہ فتح اوّل و ثانی گفت، سکونِ کاف چرا گفت ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

۴۱۔ ب : تنہ بفتح اوّل و ثانی ——— بمعنی قبول و رضا ہم ہست۔

غ : تنہ بمعنی قبول و رضا غلط است ۱۲

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

۴۲۔ب : تورا بضم اوّل و ثانی مجہول بر وزن حورا بلغت ژند و پاژند گاو را گویند۔

غ : حورا بفتح است۔ پس بضم اوّل نوشتن و بہ وزن حورا آوردن لغو است۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو ایک صفحے سے بھی زائد عبارت میں لکھا ہے اور اپنے حسب و نسب کو بھی بیان کیا ہے، اور مؤلف نے آگے چل کر ہندی بمعنی کم بتایا تھا۔ اس پر بھی ریمارک دے کی ہے۔

۴۳۔ب : تُوشک ——— در مؤید الفضلا بمعنی گربہ نوشتہ اند۔

غ : بمعنی گربہ پوشک است، بہ بائے فارسی مضموم، نہ بہ تای قرشت ۱۲۔

قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی ترک کر دیا گیا ہے۔

۴۴۔ب : تومن با اوّل بثانی مجہول رسیدہ و میم مفتوح بنون زدہ الخ

غ : آہ ازیں بیچارہ کہ چقدر ہا کج میرود۔ تومن را بہ واؤ مجہول می نویسد، و این قدر نمی داند کہ رسم الخط ترکی اعراب بالحروف است۔ پس نوشتہ می شود بہ واو و خواندہ می شود تُمن، بہ تای مضموم۔ بلکہ شایستہ آنست کہ تُومان نویسند۔ واو علامت ضمہ تا الف علامت فتحۂ میم چنانکہ تیمور در اصل تمر است بہ تای مکسور و میم مضموم۔ بعض برادران این حکیم دکنی تیمور را با بگور و مذکور قافیہ کردہ اند۔ حاصل کلام تُمَن در ترکی لسبت را گویند ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو دُہرایا ہے مگر اس میں سے تیمور کو حذف کر دیا ہے۔

۴۵۔ب : تہم۔ شخصی را گویند کہ در بزرگی جثہ و ترکیب و قد و قامت و شجاعت و مردی و دلیری و دلاوری عدیل و نظیر نداشتہ باشد و تہمن مرکب ازین است۔ و سکون ثانی ہم بدیں معنی آمدہ است۔

۴۶۔ب : تہمتن — یکی از القاب رستم زال و بہمن است۔ و مردم قوی جثّہ و شجاع بی نظیر را نیز گویند، چہ معنی ترکیبی این لغت "بی تہماتن" است یعنی تنے کہ عدیل و نظیر نداشتہ باشد۔ و بمعنی سپہدار و لشکرکش و خداوند سپاہ ہم ہست۔

غ : تہم بہر دو فتحہ تنہا شخص فربہ و تنومند را نگویند۔ این خود از قیاسات باطلۂ حکیم دکنی است۔ تہم در پارسی قدیم اسم فلک نہم است کہ آن را بلسان شرع عرش گویند۔ تہمتن مرکب از بیست مثال پیلتن و روئین تن و سیمتن۔ و دریں صورت تہمتن مرد قوی ہیکل را گویند، نہ تنہا تہم۔ و چون رستم از روی خلقت جسیم بود، تہمتن اسم توصیفی آن قرار یافت۔ تہم گفتن و مرد توانا مراد داشتن حماقت است۔ و این کہ حکیم دکنی بی ہمتا تن معنی تہمتن نوشتہ است، نمی گویم کہ چہ خوردہ است۔ کجا بی ہمتا و کجا تہم۔ سپہدار و لشکرکش را نیز نگویند بسا سپہداران باشند کہ لاغر باشند ۱۲۔

قاطع اور درفش میں ان دونوں لفظوں پر مذکورہ بالا اعتراض کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ تہم بر وزن وہم غلط ہے۔ لیکن قاطع میں دکنی کو ریچھ قرار دیا تھا اور لکھا تھا کہ "وای بر روزگار من کہ با کدام خرس در جوال شدہ ام"۔ درفش میں "خرس" کی جگہ "مَس" بنا دیا ہے۔ نیز اس عبارت میں جو لکھا ہے کہ "نمی دانم کہ چہ خوردہ است" قاطع اور درفش میں اس کو حذف

کردیا ہے۔

بہرحال میرزا صاحب کے اس پر یہ دو اعتراض کہ (۱) تہم فربہ اور تنومند کو نہیں کہتے (۲) اور تہم بر وزن وہم غلط ہے، درست نہیں ہیں۔ تہم فارسی قدیم اور اوستا میں 𐬙𐬀𐬑𐬨𐬀 کی شکل میں بھی قوی اور تنومند ہی بولا جاتا ہے نیز یہ لفظ اصل میں بسکون ثانی ہی ہے اور اس سے مرکب ہیں: تہماسپ، تہمورث اور تہمتن۔ فردوسی نے تہم اور تہمتن بحرکتِ ثانی ضرورۃً استعمال کر لیا ہے۔ ملاحظہ ہو لغت فرس مولفہ اسدی طوسی اور ڈاکٹر محمد معین کا حاشیہ بر لغت تہم د بُرہان قاطع ایرانی ایڈیشن۔

۴۷۔ ب: نہی بکسر اول و ثانی ——— و بفتح اوّل و ضم اوّل ہم گفتہ اند۔

غ: نہ بہ فتح اوّل است، نہ بہ ضم اول۔ نہی بر وزن نہی بمعنی خالیست و بس ۱۲

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو چھوڑ دیا ہے۔

۴۸۔ ب: تیرکش بر وزن پیش کش الخ۔

غ: تیرکش بر وزن پیشکش چگونہ می تواند بود۔ در تیر یای معروف است و پیش با یای مجہول۔ و این کہ اہل زبان ہر تحتانی را معروف خوانند، امری دیگر است ۱۲۔

قاطع اور دُرفش میں یہ اعتراض بھی شامل نہیں کیا گیا ہے۔

۴۹۔ ب: تیرماہی ——— بر وزن نیک خواہی الخ۔

۵۰۔ ب: تیرہ بر وزن خیرہ الخ

غ: تیرماہی بر وزن نیکخواہی غیر از ین عالم است۔ ہاں، تیرہ بر وزن خیرہ صحیح است۔ اما این خود از حماقت حکیم دکنی گواہ دیگر است۔ یعنی یای مجہول و یای معروف را از ہم نمی شناسد ۱۲

قاطع اور درفش میں یہ اعتراض بھی موجود نہیں ہے۔

۵۱۔ ب: تیریز با ثانی مجہول بر وزن بی چیز شاخ جامہ را گویند الخ

غ: تیریز با ثانی مجہول، مہین قدر کافی بود۔ بر وزن بی چیز کلام را از اعتبار ساقط کرد۔ مگر چیز را بہ یای مجہول پنداشتہ است ۱۲۔

قاطع اور درفش میں اس اعتراض کو داخل نہیں کیا ہے۔

۵۲۔ ب: تیزی بکسر اوّل و ثالث و سکون ثانی مجہول و تحتانی بمعنی عربی است۔ و مراد از ان عربی نژادان فارسی زبانان باشند عموماً، و ایشان را تازیک و تاجیک نیز خوانند الخ۔

غ: تیزی املائہ تازی است، ورنہ لفظ تیزی بذاتِ خود این ہمہ معنی ندارد۔ و آن کہ عربی دانان فارسی زبانان نوشتہ است، غلط کردہ است۔ تنہا عربی نژاد را گویند۔ فارسی دان باشد یا نباشد۔ ۱۲۔

پہلے تو یہ کہہ دوں کہ میرزا صاحب نے بجائے "عربی نژادان" کے "عربی دانان" سہواً لکھ دیا ہے اور پھر یہ عرض کروں گا کہ قاطع اور درفش میں اس اعتراض کے اندر یہ اضافہ کیا ہے کہ "عربی نژادان فارسی دانان" غلط ہے۔ یہاں "فارسی دان" ہونا چاہیے تھا۔

دنیائے عرب

بصیر عالم

دنیائے عرب پر مغرب کا اثر

دنیا کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت دُنیائے عرب پر مغربی سامراج کا غلبہ دیر میں ہوا اور اور جلد ہی ختم بھی ہوگیا۔ تاہم دُنیائے عرب کے ممالک مغرب سے اُتنے ہی متاثر نظر آتے ہیں جتنے وہ ملک جن پر مغربی طاقتوں نے دو سو سے لگا کر چار سو سال تک حکومت کی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے دُنیائے عرب مغرب سے بہت نزدیک رہی ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی دُنیا کی طرف مغرب کا راستہ دُنیائے عرب سے ہو کر جاتا ہے چنانچہ زمانۂ قدیم، از منۂ وسطیٰ اور جدید دور میں مشرقی اور مغربی اقوام کا ٹکراؤ اور ملاپ زیادہ تر دُنیائے عرب کے علاقوں ہی میں ہوا ہے ۱۸۳۰ء میں الجیریا پر فرانس کے قبضہ سے مغرب کے سیاسی اقتدار کی ابتدا ہوئی اور پہلی جنگِ عظیم کے اختتام تک تقریباً تمام دنیائے عرب پر یورپ کا سیاسی غلبہ مکمل ہوگیا۔ مغرب کے یونانی اور نو افلاطونی فلسفیوں نے پہلے ہی مسلمانوں میں نظریاتی انتشار پیدا کر دیا تھا اور اور اس انتشار کے سبب دُنیائے اسلام پہلے ہی نسلی، مذہبی اور قبائلی تفرقوں کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لئے مغرب کا سیاسی غلبہ تعجب خیز نہیں بلکہ ایک متوقّع بات تھی۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں ڈینیوب کے بیسن سے ترکوں کا اخراج اور مصر پر نپولین کا حملہ —— یہ ایسے واقعات تھے جن سے ترکوں اور مصریوں کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ چنانچہ سلطنتِ عثمانیہ، مصر اور ایران کے حکمرانوں نے مغرب کی عسکری قوت اور جدید اسلحہ کے راز پانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ لیکن مغرب کی برتری کا راز ان کی سمجھ سے بالا تھا۔ مغرب کے جدید اسلحہ کا راز سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں پوشیدہ تھا۔ مگر عثمانی، مصری اور ایرانی حکمراں جاگیری نظام کے پروردہ تھے۔ وہ اپنے جاگیردار طبقہ کو ختم کر کے ہی یہ راز پا سکتے تھے اور یہ کام ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اُنھوں نے مغرب سے فوجی استادوں اور ماہروں کی خدمات حاصل کیں۔ یہ استاد اور ماہر اپنے ساتھ جدید اسلحہ تو لائے لیکن ان کے بنانے کی مشینیں اور مشینیں بنانے والے فولاد کے کارخانے اپنے ملکوں ہی میں چھوڑ آئے۔ مغربی ملکوں میں طلباء بھی بھیجے گئے لیکن اس سے بھی کام نہیں بنا کیونکہ ان طلباء کو اپنے وطن میں تحقیق و ایجاد کے وہ لوازمات فراہم نہیں کئے گئے جو مغرب میں میسّر تھے۔ ان طریقوں سے اگر کسی مشرقی ملک نے مغربی ترقی کا راز پایا تو وہ جاپان تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ جاپانیوں میں قومی اتحاد پہلے سے ہی موجود تھا اور قومی جذبہ نے ان میں مغرب سے سبقت لیجانے کی لگن پیدا کر دی تھی۔ اور اس لگن نے اُنھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ جاگیری نظام ترک کر کے سرمایہ داری نظام کی راہ اختیار کر لیں۔ یہ صحیح ہے کہ مصر میں محمد علی، ترکی میں محمود دوئم اور رشید پاشا اور طیونس میں خیرالدین نے وقت کے نئے تقاضوں کے پیشِ نظر معاشی و معاشرتی ترقی کے لئے بہت کچھ کیا کیونکہ اُنھیں معلوم تھا اگر ان کے ملکوں نے ترقی نہ کی تو مغربی حملوں کی تاب نہ لا سکیں گے۔ مصری مصنف شیال نے لکھا ہے۔ کہ "اٹھارویں صدی کے آخر میں ثقافتی احیاء کے آثار رونما

ہو چکے تھے اور یہ تحریک مصر میں کسی بیرونی اثر کے بغیر پیدا ہوئی تھی " ایک روسی مصنف کا دعویٰ ہے کہ "اٹھارویں صدی کے آخر میں مصر کے روئی پیدا کرنے والے علاقوں میں سرمایہ دارانہ نظامِ پیداوار رائج ہو چکا تھا۔ ممکن ہے کہ اگر عربی معاشرہ پر بیرونی غلبہ نہ ہوتا تو وہ اپنے طور پر معاشی اور معاشرتی ترقی کی ان منزلوں کو تیزی سے طے کر لیتا جنہیں مغربی معاشرہ پہلے ہی طے کر چکا ہے۔ اگر مغرب کا سیاسی غلبہ نہ ہوتا تو شاید بہت پہلے دُنیائے عرب کے قدم جاگیرداری نظام سے سرمایہ داری نظام کی طرف اُٹھ چکے ہوتے اور اس میں اتنی تاخیر نہ ہوتی جتنی کہ اب ہو گئی ہے۔" کارل مارکس کا بھی یہی خیال تھا کہ مغرب کے نو آبادیاتی اقتدار نے ہندوستان اور چین جیسے مہذب ملکوں کے فطری ارتقا کو روک دیا ہے۔ گو قطعی اور حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مغربی غلبہ نہ ہونے کی صورت میں دُنیائے عرب کے ملک بھی مغرب کی طرح ترقی کر لیتے البتہ یہ بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ مغرب کے تسلّط کی وجہ سے دُنیائے عرب کے فطری ارتقاء میں رکاوٹ پیدا ہو گئی اور اب یہ ارتقا ایک طویل اور خونریز جدوجہد آزادی کے بعد تاخیر سے شروع ہوا ہے۔

دراصل ہوا یہ کہ جس وقت مغرب میں صنعتی انقلاب آیا دُنیائے عرب جاگیرداری نظام کے سائے میں غفلت کی نیند سوتی رہی اور جب عربی معاشرہ نے انگڑائی لیکر اپنا چولا بدلنا چاہا تو مغربی سامراج نے اُسے آدبوچا۔

مغرب کے زیرِ اثر دُنیائے عرب کی معیشت اور معاشرہ میں جو تبدیلیاں آئیں تو ان سے ایک افراتفری پھیل گئی۔ سیاسی اعتبار سے دُنیائے عرب پر مغرب کا غلبہ دوسرے مشرقی ملکوں کی بہ نسبت زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشی اور سیاسی اقتدار کے باوجود مغربی طاقتوں نے دُنیائے عرب کے بہت کم ملکوں میں براہِ راست سیاسی ذمہ داری قبول کی۔ یہاں اُنہوں نے شیوخ اور بادشاہوں کے ذریعے سیاسی چالبازیوں اور سازشوں کا کھیل کھیلا جس کا سیاسی اور معاشرتی اخلاق پر اتنا بُرا اثر پڑا کہ آج بھی دُنیائے عرب کے عوام اس سے نجات نہیں پا سکے ہیں۔ گو زرعی معیشت تجارتی معیشت میں تبدیل ہو گئی لیکن تجارتی معیشت کی اساس (یعنی مشینیں اور بھاری صنعتیں) دانستہ طور پر دُنیائے عرب میں نہیں رکھی گئی۔ مغربی سرمایہ داری نے عربوں کو مجبور کیا کہ وہ ان صنعتوں اور مشینوں کے لئے گندم کی جگہ روئی اور انگور پیدا کریں۔ مصر کی روئی سے برطانیہ کی پارچہ بافی پروان چڑھی اور الجیریا، طیونس اور مراکش کے انگوروں سے فرانس میں شراب سازی کو فروغ حاصل ہوا۔ عربوں نے مغرب کی صنعت و تجارت کے لئے روئی اور انگور پیدا کئے اور خود گندم کے دانوں کے لئے دوسروں کے محتاج ہو گئے۔ انہوں نے روئی اور انگور سستے داموں بیچے اور ان سے بنی ہوئی مغربی مصنوعات مہنگے داموں خریدیں۔ پیٹ بھرنے کے لئے گندم بھی مغرب سے خریدا اور وہ بھی مہنگے داموں خریدا۔

گو عرب اب بھی زمین سے ہی اپنی روزی پیدا کرتے تھے لیکن مغرب کی رائج کردہ تجارتی معیشت کے باعث ایک طرف زرعی معیشت کی اخلاقی اقدار ختم ہو گئیں اور دوسری طرف تجارتی معیشت کی بُرائیوں نے جڑ پکڑ لی۔ بنیادی صنعتوں کی غیر موجودگی کے سبب معاشی فارغ البالی ناممکن تھی اور فارغ البالی کے بغیر تجارتی معیشت کی اخلاقی اقدار کا رواج پانا محال تھا۔

مغرب کے اکثر مصنف مشرقی نو آبادیوں پر یہ احسان ضرور جتاتے ہیں کہ اُنہوں نے ذرائع حمل و نقل کو ترقی دی اور جدید طریقِ علاج اور دواؤں سے عوام کو بیماریوں سے بچایا۔ ذرائع حمل و نقل اور رسل و رسائل کی ترقی یقیناً ایک حد تک مغرب کی دین ہے۔ لیکن صرف ایک حد تک۔ اس حد تک حمل و نقل اور رسل و رسائل کی ترقی مغرب کے تجارتی اور نو آبادیاتی تقاضوں کے پیشِ نظر

ناگزیر تھی۔ اور جدید طریقِ علاج اور دواؤں کا رواج بھی دراصل مغرب کے تجارتی تقاضوں کا ہی ایک رُخ ہے۔ اگر مغرب اپنا طریقِ علاج رائج نہ کرتا تو آج مشرقی ملکوں میں کروڑوں پونڈ کی مغربی دوائیں درآمد نہ کی جاتیں۔ گو یہ مغرب کا احسان نہیں لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغرب کے عطا کردہ ذرائع حمل و نقل اور طریقِ علاج سے مشرق کے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچا ہے۔ بیماریوں کے انسداد سے البتہ یہ مسئلہ ضرور پیدا ہوگیا کہ آبادی میں اضافہ کی شرح بڑھ گئی لیکن سامراجی تسلط اور استحصال کے باعث آمدنی اور پیداوار کے ذرائع نہ بڑھ سکے۔ مغربی تسلط سے پہلے آبادی میں اضافہ کی شرح ایک فیصد سالانہ تھی اور اس کے بعد یہ ۲ سے ۳ فیصد سالانہ ہوگئی۔ آبادی میں اس اضافہ کی وجہ سے بیکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور مغربی سرمایہ داروں کو سستے مزدور ملنے لگے خصوصاً دیہات میں بیکاری زیادہ بڑھ گئی۔ ویسے عام طور پر بیکاروں کی تعداد میں اضافہ آبادی میں اضافہ کی وجہ سے ہوا۔ لیکن خصوصاً الجیریا، طرابلس، طیونس، مراکو اور فلسطین میں بیکاری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ زراعتی اراضی کا زیادہ تر حصہ مغربی نوآبادکاروں نے یا تو خرید لیا تھا یا مکر و فریب سے حاصل کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ مغربی حکمرانوں نے عربوں کو جدید طریقِ زراعت سے بھی محروم رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زراعتی پیداوار بڑھتی ہوئی آبادی کی کفالت نہ کر سکی اور دیہاتی باشندے شہروں کی طرف جانے لگے۔

ادھر شہروں میں دیہات سے بھی زیادہ بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ دیسی دستکاریاں مغرب کی مشینی مصنوعات کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکیں۔ دستکاری تباہ ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی دستکاروں کی انجمنیں بھی ختم ہوگئیں۔ اس تباہی کے نتیجہ میں لاتعداد بیکار یا نیم بیکار مزدوروں کا ایک بڑا طبقہ پیدا ہوگیا اور اس طبقہ میں دیہات سے آنے والے بیکار بھی شامل ہوگئے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جب مغربی ملکوں نے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں پر سامراجی غلبہ حاصل کیا تھا اس وقت مغربی ملک نیم سرمایہ داری اور نیم جاگیرداری نظام کے حامل تھے چنانچہ ان نوآبادیوں میں ابتدا سے ہی مکمل سرمایہ دارانہ استحصال نہیں کیا گیا۔ یہ استحصال اسی وقت شروع ہوا جبکہ خود مغربی ملکوں میں سرمایہ دارانہ نظام اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اس لئے عرب شروع سے ہی شدید سرمایہ دارانہ استحصال کے شکار ہوگئے اور بہت جلد عرب ملکوں میں وہ حالات پیدا ہوگئے جو دیگر مشرقی ملکوں میں سالہا سال کے سامراجی استحصال کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیائے عرب بہت جلد ایک طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہوگئی اور سرمایہ دارانہ استحصال نے ایک انقلابی صورتِ حال پیدا کر دی۔ مغربی تعلیم پانے والے وہ نوجوان جنہوں نے اب تک قومیت، جمہوریت، دستوریت اور آزاد خیالی کے سبق سیکھنے تھے اب سوشلزم اور کمیونزم کی باتیں بھی کرنے لگے۔

عرب قومیت اور جدوجہدِ آزادی

مغربی سامراج کے خلاف آزادی کی لڑائی مغرب کے دیئے ہوئے نظریاتی اسلحہ سے ہی لڑی گئی اور آج بھی لڑی جارہی ہے۔ یہ جنگ اسلام اور عیسائیت کے درمیان نہیں بلکہ عرب قومیت اور مغربی سامراج کے درمیان ایک طویل اور خونریز معرکہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ معرکہ شدت اختیار کر گیا اور تقریباً پندرہ سال کے عرصہ میں دنیائے عرب کے تقریباً تمام ملک مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہوگئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ملک مغرب کے معاشی اقتدار اور ثقافتی اثرات سے بھی آزاد ہوگئے ہیں۔ پٹرولیم کی تمام

کمپنیاں اب بھی مغربی ملکوں ہاتھوں میں ہیں پاپ لائنیں اور بحری نقل وحمل کے ذرائع اب بھی مغرب کے ہیں۔ مصنوعات اور اسباب بھی اکثر ملکوں میں مغرب سے آتے ہیں مغربی لباس اور طرز زندگی خصوصاً شہری ثقافت پر چھائے ہوئے ہیں اور مغرب کے دیئے ہوئے نظریات تو گویا بھل پھول رہے ہیں۔ چنانچہ آج دُنیائے عرب میں عرب قومیت کو اولیت حاصل ہے اور اسلام کم از کم سیاسی معاملات میں محض ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ نظریاتی اعتبار سے عرب قومیت وسیع تر اتحاد ملتِ اسلامیہ کے مقابلہ میں تنگ نظری پر دلالت ہے۔ لیکن محض ملکی قومیت کے مقابلہ میں یہ نظریہ وسیع تر یکجہتی اور اتحاد کا حامل ہے۔ اگر صدر ناصر کے فلسفۂ انقلاب کا مطالعہ بغور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ عرب قومیت کو اتحادِ اسلامی کا حریف نہیں سمجھتے بلکہ اسے عالمِ اسلام کے اتحاد کی طرف ایک عملی قدم خیال کرتے ہیں۔ اسرائیل کو وجود میں لاکر مغربی سامراج نے جہاں ایک طرف دنیائے عرب کے پہلو میں ایک مستقل خطرہ پیدا کر دیا ہے وہاں دوسری طرف عرب قومیت کے نظریہ کو بھی بڑی تقویت دی ہے لیکن اس کے باوجود فی زمانہ ملکی قومیت اور طبقاتی مفاد کی دیواریں اتنی مضبوط ہیں کہ عرب اتحاد کا خواب مستقبل قریب میں شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔

عربوں میں قومیت کا جذبہ سلطنت عثمانیہ کے دور میں ہی پیدا ہو چکا تھا۔ عثمانی خلافت بھی بنو امیہ اور بنو عباسیہ کی خلافتوں کی طرح موروثی ملوکیت تھی اور اس کا عروج و زوال بھی تاریخ کے اُنہیں اصولوں کے مطابق ہوا جو ملوکیت کے لیے ناگزیر ہیں۔ زوال کے دور میں عثمانی خلافت کے نظام کی ترکیب ترکی زیادہ اور اسلامی کم تھی۔ خود ترک مغرب سے متاثر ہو کر قومیت کی راہ پر چل پڑے تھے۔ اور اس طرح غیر شعوری طور پر انہوں نے عربوں میں قومیت کا ردِ عمل پیدا کیا تھا۔

مغربی تعلیم پانے والے ترک اور عرب برطانیہ کے پارلیمانی نظام اور فرانس کے قومی نظریات سے بہت متاثر تھے۔ سب سے پہلے ترقی پسندوں نے ایک اخبار لندن سے ۱۸۶۷ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۴ء میں بمقام پیرس اتحاد و ترقی کی کمیٹی بنائی گئی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد عربوں کی حبِ وطن لیگ اور عرب عثمانی اخوت جیسی جماعتیں قائم کی گئیں۔ ۱۹۰۵ء میں نجیب عصوری نے پیرس سے دوریل دی لانیشن عرب، نامی اخبار شائع کیا اور ۱۹۱۲ء میں عرب قومی کانگریس کا اجلاس پیرس میں منعقد ہوا۔ بیروت اور دمشق میں عرب کمیٹیاں بنائی گئیں جو بظاہر بیداری، لامرکزیت اور اصلاحات کی طالب تھیں لیکن در پردہ عربوں کی آزادی کے لئے کام کر رہی تھیں۔

۱۹۰۸ء میں جوانانِ ترک کی تحریک نے استنبول پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے ایک پارلیمنٹ قائم کی جس میں کچھ عرب ممبر بھی شامل تھے لیکن یہ تجربہ کامیاب نہ ہو سکا۔ دراصل جمہوریت کے نام پر ایک نئی آمریت برسر اقتدار آ گئی۔ اِن ہی دنوں ۱۹۱۲ء میں اٹلی کے ہاتھوں ترکی نے طرابلس میں شکست کھائی اور بلقان میں بلقانی ریاستوں کی متحدہ طاقت کے سامنے ترکی کا ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا اور اس غلطی کے نتیجہ میں سلطنتِ عثمانیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں نے عربوں کے قومی جذبہ کو ترکوں کے خلاف استعمال کیا۔ اس سلسلہ میں لارنس نے جو کام کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ انگریزوں نے اپنی تحریک محض شہروں کے تعلیم یافتہ عربوں تک محدود نہیں رکھی۔ وہ دیہات میں گئے اور عرب

شیوخ اور بدوؤں کو ترکوں کے خلاف ابھارا۔ انہوں نے شریف مکہ کو یہ لالچ دیا کہ خلافتِ عثمانیہ کے کھنڈرات پر شریف مکہ کی خلافت کا محل تعمیر کیا جائے گا۔ سر ہنری میکموہن نے شریف مکہ کے نام اپنے خطوط میں یقین دلایا کہ عدن، عراق کے زیریں علاقہ اور لبنان کے ساحل کو چھوڑ کر تمام عرب علاقے آزاد کر دیئے جائیں گے۔ لیکن بعد میں انگریزوں نے بدعہدی کی اور عربوں کو آزادی نہیں ملی۔ البتہ یہ ہوا کہ آقا بدل گئے۔ ترکی ملوکیت کے استحصال اور ترک دعرب ترقی پسندوں کے نظریات نے عرب قومیت کا جو پودا لگایا تھا انگریزوں کی بدعہدی نے اسے ایک تناور درخت بنا دیا۔

مصر میں قومی تحریک کی کہانی بقیہ عرب علاقوں سے ذرا مختلف ہے۔ محمد علی کے زمانہ میں مصر ترکی ملوکیت سے آزاد ہو کر قومی آزادی کا مزہ چکھ چکا تھا۔ اس زمانہ میں انگریزوں نے مصر پر حملہ کیا اور محمد علی کے ہاتھوں شکست کھائی۔

انیسویں صدی کے وسط میں فرانسیسی انجینئر ڈلاسپ اور خدیو مصر نے مل کر نہر سوئز کی تعمیر کی جس کے نتیجہ میں مصر کی تجارتی اور فوجی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ بعد میں انگریزوں نے خدیو مصر کو قرض کے جال میں پھانسا اور اس سے سوئز کمپنی کے مصری حصے خرید لئے۔ اس طرح نہر سوئز فرانس اور برطانیہ کی مشترکہ ملکیت بن گئی۔ کیونکہ نہر سوئز نے مغربی تجارت کے لئے شہ رگ کی حیثیت حاصل کر لی تھی اس لیے مصر پر مغرب کا اقتدار ضروری تھا چنانچہ ۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ کر لیا لیکن اس قبضہ سے دوسری مغربی طاقتیں چنداں خوش نہ تھیں اور ان کا مطمئن کرنا ضروری تھا۔ اس لئے ۱۸۸۸ء میں نہر سوئز کے متعلق ایک مشترکہ معاہدہ پر دستخط کئے گئے۔ اس معاہدہ میں آسٹریا، ہنگری، برطانیہ، جرمنی، اسپین، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، روس اور ترکی شریک تھے۔ معاہدہ کی رو سے سبکو نہر سوئز سے آزادانہ گذرنے کی ضمانت مل گئی اور نہر سوئز پر مصر کی علاقائی سرداری تسلیم کر لی گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد تک مصر کی قومی تحریک بقیہ عرب ملکوں کی قومی تحریک سے علیحدہ تھی۔ ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو امیر فیصل نے پیرس امن کانفرنس کے سامنے جو مطالبات رکھے تھے ان میں مصر کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ مصر کی وفد پارٹی کے رہنما سعد زغلول پاشا نے بھی امن کانفرنس کو جو یادداشت پیش کی تھی وہ مصر کے قومی مطالبات پر مشتمل تھی اور اس میں کہیں بھی لفظ "عرب" استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس یادداشت میں مصر کو ایک ایسی علیحدہ قوم قرار دیا گیا تھا جس میں مختلف بیرونی عناصر مصری قومیت میں ضم ہو چکے تھے۔ یادداشت میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر حجاز کو جو کہ کل تک سلطنتِ عثمانیہ کا محض ایک صوبہ تھا آزادی مل سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مصر کو جو حجاز سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے اور جو پہلے سے اندرونی طور پر خود مختار ہے آزادی نہ دی جائے۔

مندرجہ بالا یادداشت سے واضح ہوتا ہے کہ مصر میں تحریک آزادی کی ابتدا مصری قومیت سے ہوئی اور عرب قومیت کا تصور بعد میں پیدا ہوا۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کو مصر نے جو آزادی حاصل کی اس نے عرب قومیت کا نہیں بلکہ مصری قومیت کا ہی پرچم لہرایا تھا۔ لیکن اس آزادی کے باوجود مصر پر برطانیہ کا اثر قائم تھا۔ رسل و رسائل اور دفاع اب بھی برطانیہ کے اختیار میں تھے۔ مصطفےٰ نحاس پاشا کی رہنمائی میں برطانوی اثر سے مکمل نجات حاصل کرنے کی جو تحریک شروع ہوئی اس کا نتیجہ ۲۶ اگست ۱۹۳۶ء کے معاہدے کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے مصر مکمل طور پر آزاد ہو گیا البتہ نہر سوئز کے علاقہ میں فوجیں رکھنے اور جنگ کی صورت میں اس علاقہ کو استعمال کرنے کا اختیار برطانیہ کو حاصل رہا۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ مصری سیاستدان اپنے ملک کی قدیم فرعونی تہذیب و ثقافت پر فخر کرتے تھے اور محض مشترک زبان کے واسطہ سے مصر کو عربی سمجھتے تھے۔ لیکن بعد میں زبان اور مذہب کی کڑیاں مصری قومیت سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئیں اور خصوصاً ۱۹۳۰ء کے بعد سے مصری قوم پرست دُنیائے عرب کے ہمنوا ہو گئے۔ اور ان کی جدوجہد سامراج کے خلاف عربوں کی مشترکہ جدوجہد کا ایک حصّہ بن گئی۔

مصر کے ساتھ برطانوی حکمرانوں کا رویّہ سخت تھا لیکن اس کے برعکس عراق سے ان کا برتاؤ بہت نرم تھا۔ دراصل برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ عراق کو عرب قومیّت کا لیڈر بنا کر عرب قومیّت کو سامراجی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ ۲۳ اگست ۱۹۲۱ء کو برطانیہ نے امیر فیصل کو عراق کا بادشاہ اور لارنس کے معتبر دوست نوری السعید کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ بعد میں بغداد کو عرب قومیّت کا مرکز بنایا گیا۔

انگریز خوش تھے کہ وہ دُنیائے عرب پر عراق کی لیڈری کے پردے میں اپنے مقاصد پورے کر سکیں گے۔ لیکن لیڈری کے لئے عراق کی آزادی ضروری تھی کیونکہ برطانیہ کے حلقہ بگوش عراق کو عربی عوام مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ ۳۰ جون ۱۹۳۲ء کو عراق کو مکمل آزادی دے دی گئی اور اسے لیگ آف نیشنس کا ممبر بھی بنا لیا گیا۔ آزادی ملتے ہی نوری السعید نے اردن، نجد، حجاز اور عراق کے درمیان دوستی کے معاہدہ کی تجویز پیش کی۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو عرب ریاستوں سے انفرادی معاہدوں کو ہی غنیمت سمجھا گیا۔

اُدھر شاہ سعود نے حجاز فتح کرنے کے بعد تقریباً تمام جزیرہ نمائے عرب پر قبضہ کر لیا حتیٰ کہ یمن کے امام نے بھی ابنِ سعود کے ہاتھوں شکست کھائی اور بعد میں اخوتِ اسلامیہ کے دوستانہ معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ ابنِ سعود ایک چالاک اور طاقتور بادشاہ تھا اسے فریب دے کر انگریزوں کے حلقۂ اثر میں لانا نوری السعید کے بس کی بات نہ تھی۔ عرب اتحاد کے متعلق نوری السعید کی تجویز صرف اُن ملکوں میں قبول کی گئی جو مغربی طاقتوں کے قبضہ میں یا اِن کے زیرِ حفاظت تھے۔ نوری السعید کی تحریک کے مقابلہ میں عرب اتحاد کی تحریکیں مصر اور سعودی عرب میں بھی شروع کی گئیں۔ جن کا خاص مقصد یہ تھا کہ غیر ملکی اثر و اقتدار سے نجات حاصل کی جائے۔

شام اور لبنان میں مغربی اثرات پہلے ہی سرایت کر چکے تھے۔ فرانس کے دورِ اقتدار میں یہ اثرات اور بھی گہرے ہو گئے۔ فرانس نے تعلیمی ترقی پر زیادہ زور دیا لیکن سیاسی ارتقا کو نظر انداز کر دیا۔ یہاں مغربی اثرات کے تحت جو جدید قومیّت وجود میں آئی تھی اُسے فرانسیسی حکومت نے اہمیّت نہیں دی۔ اِس روّیہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۵ء قوم پرستوں نے مسلّح بغاوت کی اور ۱۹۳۶ء میں ملک گیر فسادات رونما ہو گئے۔ قومی تحریک کے دباؤ سے مجبور ہو کر فرانسیسی حکمرانوں نے مذاکرات کئے اور ایک معاہدہ پر سمجھوتہ بھی کر لیا۔ لیکن یہ معاہدہ فرانسیسی مقننہ کے سامنے توثیق کے لئے پیش نہیں کیا گیا۔

فلسطین اور اردن پر انگریزوں کی تولیت قائم تھی۔ انگریز نے عربوں اور یہودیوں سے متضاد وعدے کئے تھے۔ وہ دونوں کو خوش بھی رکھنا چاہتے تھے اور اُنہیں لڑا کر اپنا اُلّو بھی سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ عربوں کی خوشنودی کے لئے انہوں نے شریفِ مکہ کے فرزند عبداللہ کو اردن کا امیر بنا دیا اور یہودیوں کو خوش کرنے کے لئے اُنہیں فلسطین میں آنے اور اراضیات خریدنے کی اجازت دے دی۔ ۱۹۳۳ء میں جرمنی پر ہٹلر کے اقتدار کے بعد سے فلسطین میں یہودیوں کے آنے کی شرح یکایک بڑھ گئی۔ ابتدا میں انگریزوں نے یہودیوں کی ہجرت میں رخنے ڈالے لیکن بعد میں عالمی حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ایکبار پھر برطانیہ کو جرمنی کے خلاف جنگ کی تیاری کرنی پڑی اور سرمایہ دار یہودیوں کی خیر سگالی ضروری ہو گئی۔ اب برطانیہ نے ایک نئی حکمت عملی اختیار کی۔

وجہ یہ کہ ہجرت پر قانونی پابندیاں جوں کی توں رہنے دی جائیں لیکن یہودیوں کی بڑھتی ہوئی ہجرت سے چشم پوشی کی جائے۔ ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ شروع ہوئی تو یہودی نہ صرف جرمنی بلکہ تقریباً تمام یورپی ملکوں سے فلسطین آنے لگے اور یہ سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا۔

فلسطین میں یہودیوں کے داخلے سے جو ردِ عمل ہوا وہ ابتدا میں قومی نہیں بلکہ مذہبی تھا۔ یہودیوں کے داخلہ کے خلاف سب سے پہلے جس شخص نے آواز بلند کی وہ فقیہ اسلام الحاج مفتی امین الحسینی تھے۔ یہودیوں اور عربوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات ۱۹۲۰ء سے شروع ہو گئے تھے۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر دسمبر ۱۹۳۱ء میں مفتی امین الحسینی نے یروشلم میں ایک اسلامی کانفرنس منعقد کی جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ کس طرح بیت المقدس کو یہودیوں کی یلغار سے بچایا جائے۔ گویہ کانفرنس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس کی وجہ سے دُنیائے عرب صیہونیت کے خطرے سے خبردار ضرور ہو گئی اور اس مشترک خطرے نے عربوں پر قومی اتحاد کی اہمیت واضح کر دی۔

۱۹۳۶ء میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان بڑے پیمانے پر خونریز فسادات ہوئے۔ ان فسادات نے پہلی بار انگریز حکمرانوں کو احساس دلایا کہ ان کے متضاد وعدوں اور دوغلی پالیسی نے ایک ایسا مواد تیار کر دیا ہے جو عنقریب پھٹنے والا ہے۔ چنانچہ ۲ جولائی ۱۹۳۷ء کو لارڈ پیل کی صدارت میں ایک خاص تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں پہلی بار فلسطین کی تقسیم کا خیال پیش کیا۔ کمیشن نے کہا کہ عرب قومیت کو اپنی حدود میں رکھنے اور ضرورت پڑنے پر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے یہودیوں کی قومی ریاست کا قیام ضروری ہے۔ کمیشن کے خیال میں کسی بھی قومیت کا وطن نصف قومی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ تجویز پیش کی گئی کہ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کی خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں جو معاہدوں کے ذریعہ برطانیہ سے وابستہ ہوں۔ مقاماتِ مقدسہ کے متعلق کمیشن نے سفارش کی کہ انہیں مستقلاً برطانیہ کے قبضہ میں رکھا جائے۔

کمیشن کی مندرجہ بالا سفارشات عربوں کے لئے قطعی ناقابل قبول تھیں۔ البتہ امیر عبداللہ ضرور ان سفارشات پر غور کرنے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ وہ عرب فلسطین کو اردن میں شامل کر کے اپنی ہوسِ ملک گیری کی تسکین چاہتے تھے۔ یہودیوں کو بھی یہ سفارشیں چنداں پسند نہ تھیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی ہجرت پر کوئی بھی پابندی عائد کی جائے لیکن وہ اس بات سے ضرور خوش تھے کہ پہلی بار یہودیوں کی خود مختار ریاست کے قیام کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔

فلسطین کی تقسیم کے خطرے سے تمام دُنیائے عرب میں بےچینی پیدا ہو گئی اور ستمبر ۱۹۳۸ء میں بمقام قاہرہ ایک اور کانفرنس منعقد کی گئی۔ یہ کانفرنس بھی صیہونیت کے خلاف مکمل عرب اتحاد کے حصول میں ناکام رہی۔ دراصل عرب عوام اتحاد کے لئے تیار تھے لیکن شیوخ اور شاہوں کی غیر جمہوری حکومتیں مغربی سامراج کے زیر اثر عوام کے مفاد کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھیں۔ اکثر عرب ملکوں میں عنانِ حکومت جاگیرداروں اور نئے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اپنے طبقاتی مفاد میں غیر ملکی سامراج سے کچھ بہتر شرائط حاصل کرنی چاہتے تھے اور سامراج پر دباؤ ڈالنے کے لئے قومی تحریک کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس لئے میانہ روی، دستوریت اور سمجھوتہ ان کی حکمتِ عملی کے خاص اجزا تھے۔ لیکن جب اور جہاں بھی قومی تحریک نے عوامی اور انقلابی رنگ اختیار کیا ان طبقوں نے اس کی باگیں کھینچ لیں اور اکثر تو غداری کر کے غیر ملکی سامراج سے سمجھوتہ کر لیا۔ مصر میں ایسا

کئی بار ہوا۔ شاہ فاروق عوام کی حمایت حاصل کرنے اور برطانوی سامراج پر دباؤ ڈالنے کے لئے قلمدانِ وزارت وفد پارٹی کے سپرد کردیتے تھے۔ مگر جب وفد کے عام ممبر حکومت کو سامراج دشمن قدم اُٹھانے کے لئے مجبور کردیتے تھے تو شاہ فاروق وفدی وزارت توڑ دیتے تھے۔ اُدھر وفد پارٹی کے کچھ رہنما بھی اُبھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقہ کے نمائندہ تھے جو پارٹی کو عوامی انقلاب کا رہنما بنانے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے برطانوی سامراج کے خلاف تھے لیکن برطانوی سامراج کے سب سے بڑے دوست اور اس کے دیسی کارندے یعنی شاہ فاروق کی طرف سے اُنہوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ چنانچہ وفد پارٹی دستوریت کے جال سے نکل کر انقلاب کی سرحدوں میں قدم نہ رکھ سکی اور مصر کو غیر ملکی سامراج سے اُسی وقت نجات حاصل ہوئی جب فوجی رہنماؤں نے شاہی نظام کا تختہ اُلٹ دیا۔

۱۹۳۹ء کے ابتدائی مہینوں میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ جلد یا بدیر عالمی جنگ شروع ہو جائے گی۔ حالات غیر یقینی تھے برطانیہ چاہتا تھا کہ کسی طرح فلسطین کے مسئلہ کو التوا میں ڈال کر ایکبار پھر جنگ کے دوران عربوں اور یہودیوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ۱۷ مئی ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے ایک قرطاس ابیض شائع کیا جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دس سال بعد فلسطین میں ایک ایسی ریاست قائم کی جائے جس میں عرب اور یہودی مشترکہ طور پر حکمراں ہوں۔ اور آئندہ پانچ سال میں صرف پچھتر ہزار یہودیوں کو فلسطین آنے کی اجازت دی جائے۔

یہ تجویز عرب اور یہود۔ دونوں کے لئے ناقابلِ قبول تھی۔ لیکن ہجرت پر پابندی سے یہودی بہت برہم تھے اور جرمنی اور آسٹریا کے یہودی تو اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور تھے۔

دوسری جنگِ عظیم سے قبل اور اس کے دوران عربوں کا رویہ خالص عرب قوم پرستی کا حامل تھا۔ یہ رویہ مندرجہ ذیل تین مقاصد پر مبنی تھا۔

۱۔ دُنیائے عرب سے مغربی طاقتوں کی افواج کا انخلا

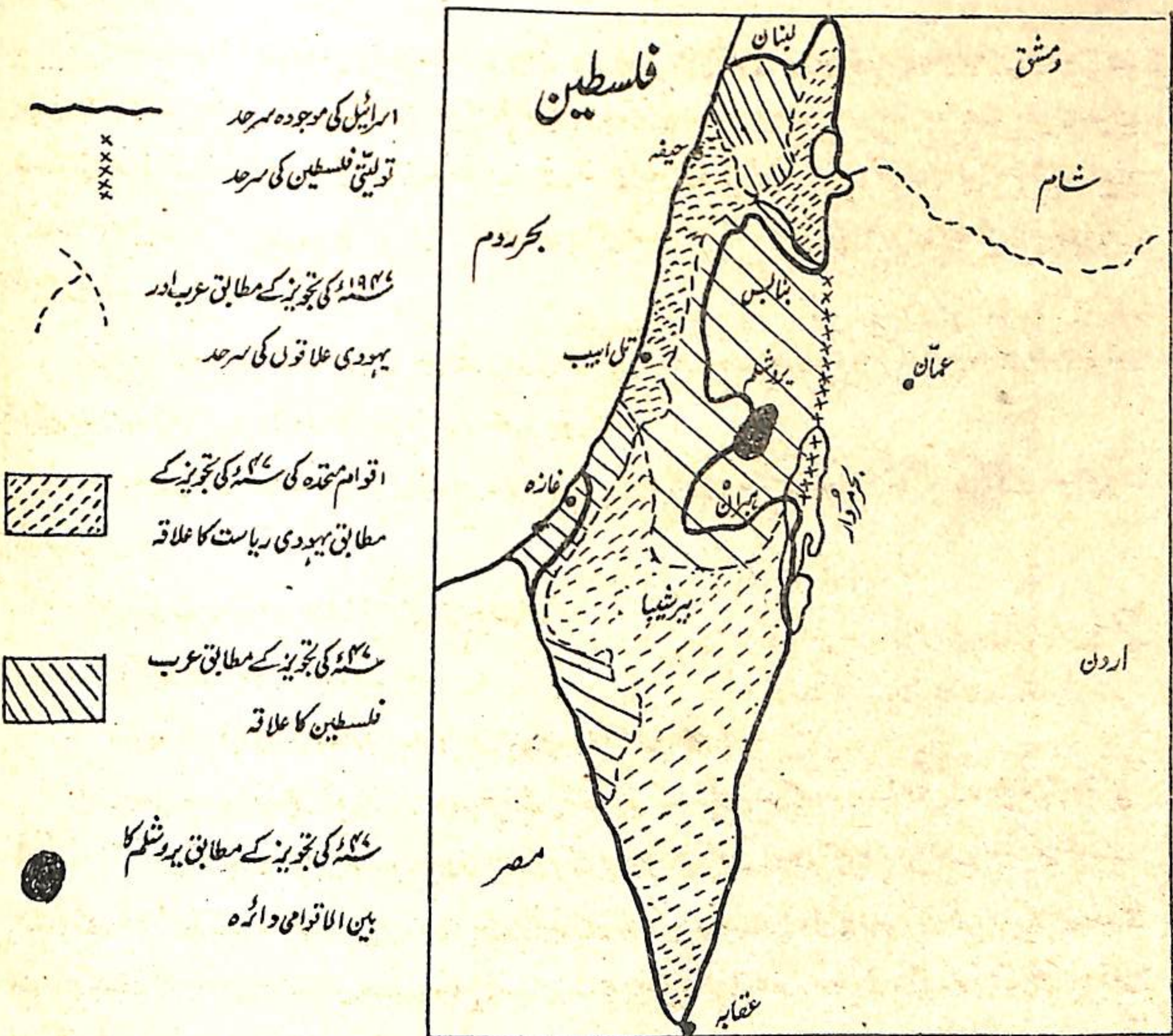
۲۔ صیہونیت کے خلاف جدوجہد

۳۔ ان تمام بیرونی اثرات کا خاتمہ جو عربوں میں پھوٹ ڈال رہے تھے۔

عرب بجا طور پر دوسری جنگِ عظیم کو ایک سامراجی جنگ سمجھتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران اُنہیں یہ توقع تھی کہ مغربی طاقتیں اُنہیں ترکی کی غلامی سے نجات دلائیں گی۔ لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ اب عرب تمام بیرونی اثرات کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ اس لئے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اِن کا رویہ غیر جانبدارانہ رہا۔ البتہ عراق میں رشید علی نے بغاوت کی جسے انگریزوں نے سختی سے کچل دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے عرب اتحاد کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ انگریز چاہتے تھے کہ عرب اتحاد کی حمایت کرکے عربوں کی خیرخواہی حاصل کریں اور مغرب زدہ عرب رہنماؤں کی مدد سے اپنے مقاصد اور عزائم کی تکمیل کرتے رہیں۔

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں شام، لبنان، اردن، سعودی عرب، یمن اور مصر نے بمقام اسکندریہ ایک معاہدے پر دستخط کئے

جس میں لبنان کو آزادی اور علاقائی یکجہتی کی ضمانت دی گئی، مسئلۂ فلسطین کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور فلسطین کے عربوں کی حمایت کی گئی۔ اس کے بعد ان ریاستوں نے بمقام قاہرہ ۲۵ مارچ ۱۹۴۵ء کو اس معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے عرب لیگ وجود میں آئی۔ اس جماعت کے قیام کا مقصد یہ قرار پایا کہ ممبر ریاستوں کے درمیان باہمی مفاہمت اور خیرسگالی کے رشتے مضبوط کیے جائیں اور ان کی پالیسیوں میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ قاہرہ میں عرب لیگ کا سیکرٹریٹ قائم کیا گیا اور اس کے پہلے سکرٹری عبدالرحمٰن عظام پاشا مقرر ہوئے۔ عرب لیگ کی کونسل میں تمام ریاستوں کو نمائندگی دی گئی اور قرار پایا کہ عرب لیگ کے فیصلوں کی پابندی صرف اس صورت میں لازمی ہو گی جبکہ وہ اتفاقِ رائے سے کیے جائیں۔



فلسطین کا مسئلہ

فلسطین کا فیصلہ اس وقت ہوا جبکہ امریکہ اور روس دو بڑی طاقتوں کی حیثیت حاصل کر چکے تھے اور برطانیہ کی چودھراہٹ ختم ہو چکی تھی، جرمنی، جاپان، اور اٹلی شکست خوردہ تھے اور فرانس کی حالت فتحمند ہونے کے باوجود شکست خوردہ قوموں سے چنداں بہتر نہ تھی۔ امریکہ نے سعودی عرب میں تیل کی اجارہ داری حاصل کر لی تھی اور امریکہ کے یہودی سرمایہ دار ریاستہائے متحدہ کی حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ فلسطین کا مسئلہ یہودیوں کے حق میں طے کیا جائے۔

جنگ نے برطانیہ کی [illegible] اب انگریز یہ چاہتے تھے کہ عربوں کی خیرسگالی اور خوشنودی حاصل کر کے

تیل اور نہر سوئز کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ان سے نہ عرب راضی تھے نہ یہودی خوش تھے۔ فلسطین میں فرقہ وارانہ فسادات روز بروز شدت اختیار کر رہے تھے۔ اُدھر یہودیوں کے حق میں امریکہ کا دباؤ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ بہ صورتِ حال برطانیہ کے لئے پریشان کن تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح فلسطین کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔ آخر کار برطانیہ کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ فلسطین کے مسئلہ کو اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا جائے۔ اس طرح گویا یہ مسئلہ انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل کر امریکہ کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اقوام متحدہ میں وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد ۲۸ نومبر ۱۹۴۷ء کو کثرتِ رائے سے یہ تجویز منظور کی گئی کہ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کی دو علیحدہ ریاستیں قائم کی جائیں جن کی اقتصادیات ایک دوسرے سے متعلق ہوں ہر ریاست تین تین ٹکڑوں پر مشتمل تھی جو نہایت تنگ ٹکڑوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ شہر یروشلم کے متعلق یہ تجویز منظور کی گئی کہ اسے مستقلاً بین الاقوامی تولیت میں دیدیا جائے۔

اقوام متحدہ کی مندرجہ بالا تجویز یہودیوں نے منظور کر لی لیکن عربوں نے شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ مئی ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا قیام نہ صرف دنیائے عرب بلکہ دُنیائے اسلام کے لئے ایک سانحہ تھا۔ دشمنانِ اسلام نے ایک طرف دُنیائے عرب کے سینہ میں یہودیت کا خنجر پیوست کر دیا اور دوسری طرف یہ کہہ کر مذاق اُڑایا کہ یہودیوں سے متعلق پیغمبر اسلام کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی پیغمبر اسلام نے یہودیوں کی فطرت کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور اس مشاہدہ کی بنا پر وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ یہودیوں کا کوئی مستقل وطن نہ ہو گا یہ بات آج اس حقیقت کے باوجود صحیح ہے کہ یہودیوں کو ایک نام نہاد وطن حاصل ہو گیا ہے کیونکہ :-

۱۔ اسرائیل بن جانے کے باوجود آج بھی یہودیوں کی اکثریت بیرونی ملکوں میں رہتی ہے۔

۲۔ یہودیوں کی رہائش بشمولِ اسرائیل ہر ملک میں غیر یقینی ہے۔

۳۔ تجارتی اور سیاسی تقاضوں کے سبب یہودی اکثر نقلِ مکانی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

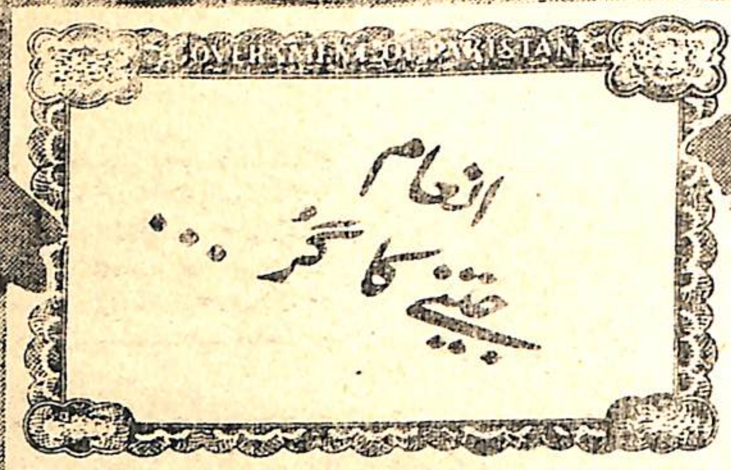
۴۔ وہ جس ملک میں بھی رہتے ہیں اس ملک کی اکثریت اُنہیں شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اکثر ان سے نفرت کرنے لگتی ہے۔

۵۔ خود اسرائیل کا وجود عارضی معلوم ہوتا ہے۔ یہودیوں کی یہ ریاست اس وقت تک ہی قائم ہے جب تک کہ اسے مغربی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہے اور عرب اقوام پس ماندہ اور غیر متحد ہیں۔ وہ دن دور نہیں جبکہ یہ حالات بدلیں گے اور ان حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہی اسرائیل کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو انگریزوں نے فلسطین کی تولیت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا اور اسی دن تل ابیب میں اسرائیل کے قیام کا اعلان بھی کیا گیا۔ اس اعلان کے سولہ منٹ بعد ہی امریکہ نے اسرائیل کی نئی ریاست کو تسلیم کر لیا۔ اسی دن اردن کی فوجوں نے اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ عراق نے کرد قبائلیوں کی بغاوت کا بہانہ بنایا اور اردن کی مدد کے لیے اپنی فوجیں نہیں بھیجیں۔ شام کی فوجیں سرحد کی صرف دو چوکیوں پر قبضہ کر کے بیٹھ رہیں لبنان کی فوج سرحد پر محض نقل و حرکت کرتی رہی اور مصر کی فوجیں تقریباً اُس وقت میدان میں اُتریں جبکہ اقوام متحدہ دخل اندازی کر کے جنگ بندی کا اعلان کرنے والی تھی۔ مصری فوج کی رسد کا انتظام ناقص تھا اور مصری سپاہیوں کو ہتھیار اور گولہ بارود بھی ناقص دیئے گئے تھے۔ اس طرح عرب اسرائیل کے ہاتھوں نہیں بلکہ خود اپنے غدار حکمران طبقوں اور اندرونی نا اتفاقی کے ہاتھوں شکست کھا چکے تھے۔

اس جنگ کے نتیجہ میں اسرائیل نے اُس علاقہ کا بھی تقریباً نصف دبا لیا جو اقوام متحدہ نے عربوں کو دیا تھا اس کے علاوہ تقریباً دس لاکھ عربوں کو فلسطین سے نکال کر باہر کیا۔ یہ لوگ آج تک مہاجرانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ شہر یروشلم کے لئے اردن کی فوج نہایت بہادری سے لڑی پھر بھی تقریباً نصف شہر اسرائیل کے قبضہ میں چلا گیا البتہ مقاماتِ مقدسہ عربوں کے قبضہ میں ہی رہے۔

(باقی آئندہ)



انعامی بونڈ کی ہر قرعہ اندازی پر ہُن برستا ہے...

یہ ہُن کی برکھا آپ کے گھر کیوں نہ برسے؟ اس کیلئے ہر سلسلے کے زیادہ سے زیادہ بونڈ خریدیں - اور انہیں سنبھال کر رکھیں

جب آپ 5 روپے والا ایک بونڈ بھی کیش کراتے ہیں تو آپ ۱۰۰ روپے سے ۱۰،۰۰۰ روپے تک کے انعامات جیتنے کے ۱۰۲ امکانات خود اپنے ہاتھوں گنوا دیتے ہیں۔

اس لئے اپنے بونڈ اپنے پاس رکھیں اور اگر کسی سلسلے کے بونڈ آپکے پاس نہ ہوں تو بہتر ہے کہ وہ بھی اب خرید لیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بونڈ پھر نہ مل سکیں۔ ہر سلسلے کے بونڈ ہر قرعہ اندازی میں شامل ہوتے ہیں۔

انعام جیتنے کا یہی ایک گُر ہے!



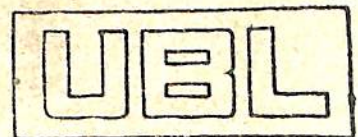
بچت کیجئے
اپنے وطن کے لئے

....ایک معزز کرم فرما!



ہم تصنّع کے قائل نہیں۔ ہمارے لئے چک پر انگوٹھے کا نشان بھی اُتنا ہی اہم ہے جتنے کہ خوشخط دستخط۔ ہم اپنے سب معززّ اکاؤنٹ ہولڈرز کی قدر کرتے ہیں یونائیٹڈ بینک میں سب ہی انفرادی توجہ کے مستحق ہیں۔

انفرادی خدمت ہمارا پہلا اُصول ہے



یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

UBL-25-193 65-UD.


١٩٦٦